# تاریخِ لبنان

تصنیف:- 
فلپ، کے حتیؔ

ترجمہ:- 
مولانا غلام رسول مہر


شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

کشمیری بازار لاہور — نذر باغ پشاور — ہسپتال روڈ حیدرآباد — بندر روڈ کراچی — اُردو بازار لاہور

# تاریخ لبنان

پروفیسر حتی نے اس کتاب میں آن تمام تاریخی واقعات کو نہایت خوبی سے قلمبند کر دیا ھے جو زمانہائے ماسبق میں لبنان کےعلاقے میں پیش آتے رھے نیز پروفیسر صاحب نے ان مختلف قوموں کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ھے جو اس خطے میں یکے بعد دیگرے آباد ھوتی رھیں -

ملک لبنان کے قدیم واقعات مصر ، بابل، اشور، کلدان، ایران ، مقدونیه اور رومه کی تاریخ سے وابسته ھیں - بعد ازاں ازمنه وسطیٰ میں اھل لبنان کو بزنطینیوں اور عربوں سے اور عہد حاضر میں آل عثمان اور اھل فرانس سے بھی سروکار رھا ھے - لبنان کی یه تاریخ گویا دنیا کے بہت سے مہذب ملکوں کی تاریخ کا ایک دلچسپ خلاصه ھے -

دنیا کی تاریخ میں لبنان کی اھمیت کے باوجود اس کے کسی دور کی تاریخ آج تک مفصل طور پر نہیں لکھی گئی تھی - دور حاضر تو خصوصاً نظر انداز ھوتا رھا ھے - اسی لیے بجا طور پر پروفیسر حتی کتاب کا ایک خاصا بڑا حصه اس دور کے لیے وقف ھے -

اس تاریخ کے اکثر واقعات قدیم اصلی سرچشموں سے ماخوذ ھیں - ان کے علاوہ زمانه حال کی تحقیق سے بھی استفادہ کیا گیا ھے اور مصنف کی پہلی کتابوں یعنی تاریخ عرب اور تاریخ شام کی طرح لبنان کی تاریخ میں بھی مولف کا روے سخن طلبا اور عام لوگوں کی طرف ھے -

لبنان ، ڈاکٹر حتی کا مولا و منشاء ھے انھوں نے اپنے ایام طفلی وھیں گزارے تھے - اس کے بعد بھی انھیں وھاں بار بار جانے کا اتفاق ھوتا رھا ھے اور اھل لبنان سے ان کا مسلسل میل جول رھا ھے -

۵ تصویروں اور ۱۱ نقشوں نے کتاب کو دلچسپ اور مولانا غلام رسول مہر کے سلیس اردو ترجمه نے اس کو سہل الفہم بنا دیا ھے -

Marfat.com

# تاریخِ لبنان

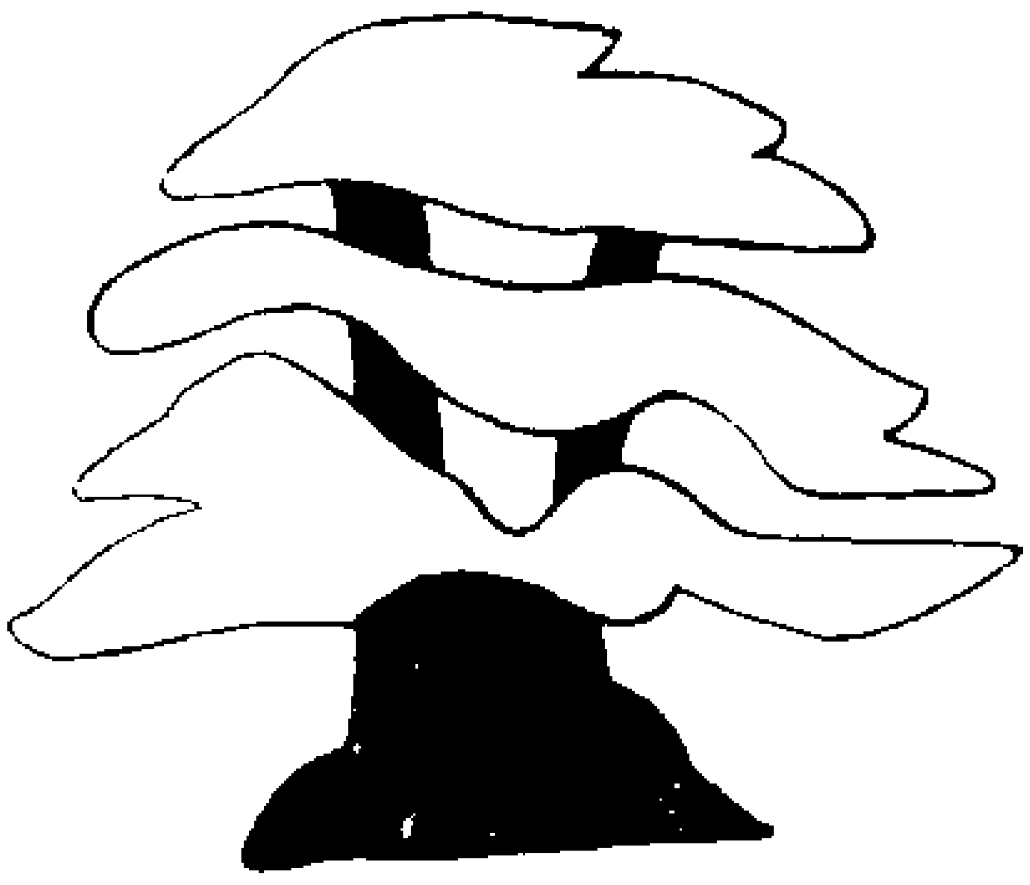

تصنیف:-

## فلپ، کے حِتّی

ترجمہ:-

## مولانا غلام رسول مہر


## شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| کشمیری بازار | نذر باغ | ہسپتال روڈ | بندر روڈ | اُردو بازار |
| لاہور | پشاور | حیدرآباد | کراچی | لاہور |


Marfat.com

Marfat.com

# تاریخ لبنان

## عہد قدیم سے دورِ حاضر تک

مرتبہ

ڈاکٹر فلپ کے حتی

استاذ ادبیات سامی (اعزازی)

پرنسٹن یونیورسٹی ریاستہائے متحدہ امریکہ

ذخیرہ محمد اقبال

مترجمہ

غلام رسول مہر

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، کشمیری بازار لاہور

برانچیں:- ہمدرد روڈ کراچی —— سول ہسپتال روڈ حیدرآباد —— نذر باغ پشاور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

This is an authorized translation of LEBANON IN HISTORY by Philip K. Hitti, by permission of the author. Copyright in all countries which are signatories to the Berne Convention. Published in 1957 by Macmillan & Company, Ltd., London, and St. Martin's Press, New York.

135127

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۱۴

| | |
|---|---|
| طبع اوّل | سنہ ۱۹۶۱ء |
| تعداد | دو ہزار ایک سو |
| طابع | شیخ نیاز احمد |
| مطبع | علمی پرنٹنگ پریس لاہور |

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور

بہ اشتراک

فرینکلن پبلیکیشنز لاہور ——— نیویارک

Marfat.com

# فہرست

## پہلا حصّہ

### تاریخ سے پیشتر کا دور


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | پہلا باب | امتیازی پہلو: جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی | ۱۳ |
| ۲ | دوسرا باب | پہاڑ اور میدان | ۲۴ |
| ۳ | تیسرا باب | آب و ہوا، نباتات اور حیوانات | ۳۵ |
| ۴ | چوتھا باب | تاریخ سے پیشتر کا دور | ۵۴ |
| ۵ | پانچواں باب | دورِ معدنیات | ۶۶ |


## دُوسرا حصّہ

### قدیم سامی دَور


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۶ | چھٹا باب | کنعانی: لبنان کی پہلی معتدبہ آبادی | ۷۵ |
| ۷ | ساتواں باب | دورِ آزادی، تجارت، فنون اور نوآبادیاں | ۹۹ |
| ۸ | آٹھواں باب | ادبیات، مذہب اور دوسرے ثقافتی پہلو | ۱۲۹ |
| ۹ | نواں باب | آشوریہ اور بابل کا دائرۂ اثر | ۱۴۶ |
| ۱۰ | دسواں باب | ایرانی اقتدار | ۱۵۷ |


## تیسرا حصّہ

### یونانی و رومی دَور


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۱ | گیارھواں باب | سکندر اور اس کے جانشین | ۱۶۷ |
| ۱۲ | بارھواں باب | اقتصادی اور ثقافتی پہلو | ۱۷۹ |
| ۱۳ | تیرھواں باب | رومیوں کا دورِ اقتدار | ۱۹۰ |
| ۱۴ | چودھواں باب | ذہنی رُجحانات | ۲۰۳ |


Marfat.com

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۵ | پندرھواں باب | لبنان میں مسیحیت | ۲۰۸ |
| ۱۶ | سولھواں باب | ہیلیو پولس اور بیروت | ۲۱۶ |


## چوتھا حصّہ

### عربوں کا دَور


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۷ | سترھواں باب | لبنان آغوشِ اسلام میں | ۲۳۵ |
| ۱۸ | اٹھارواں باب | دروزی اور دوسرے فرقے | ۲۴۵ |
| ۱۹ | اُنیسواں باب | عباسی خلافت اور جانشین سلطنتیں | ۲۶۴ |
| ۲۰ | بیسواں باب | صلیبی جنگوں کا دَور | ۲۷۸ |
| ۲۱ | اکیسواں باب | لاطینیوں اور لبنانیوں کے باہمی تعلقات | ۳۰۳ |
| ۲۲ | بائیسواں باب | چودھویں اور پندرھویں صدی | ۳۲۰ |
| ۲۳ | تیئیسواں باب | عثمانی اقتدار کی صبح اوّل | ۳۳۹ |


## پانچواں حصّہ

### عثمانی ترکوں کا دَور


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۴ | چوبیسواں باب | ہلال اور ستارے کا پرچم | ۳۴۹ |
| ۲۵ | پچیسواں باب | امرائے جبل: خاندانِ معن | ۳۶۲ |
| ۲۶ | چھبیسواں باب | امرائے جبل: خاندانِ شہاب | ۳۷۸ |
| ۲۷ | ستائیسواں باب | داخلی اور خارجی تعلّقات | ۳۸۹ |
| ۲۸ | اٹھائیسواں باب | اُنیسویں صدی | ۴۰۴ |
| ۲۹ | اُنتیسواں باب | بدنظمی کے بیس سال | ۴۲۴ |
| ۳۰ | تیسواں باب | متصرّفیۂ جبل لبنان | ۴۳۴ |
| ۳۱ | اکتیسواں باب | یورپ کا اثر اور نئی بیداری | ۴۴۳ |
| ۳۲ | بتیسواں باب | اقتصادی اور مجلسی انقلابات | ۴۶۰ |
| ۳۳ | تینتیسواں باب | دو عالمی جنگیں اور حکم داری | ۴۷۴ |
| ۳۴ | چونتیسواں باب | صنوبری پرچم کے سائے میں، مسائل واقدامات | ۴۸۸ |


Marfat.com

# نقشے



| نمبر شمار | نقشہ | نمبر صفحہ |
|---|---|---|
| ۱ | لبنان اور متصلہ علاقہ | ۲۵ |
| ۲ | لبنان اور متصلہ علاقوں کے مقاماتِ آثار قدیمہ | ۵۶ |
| ۳ | فونیقی نوآبادیاں | ۱۲۰ |
| ۴ | لبنان و شام کے قدیم تجارتی راستے اور بین الاقوامی شاہراہ | ۱۷۹ |
| ۵ | رومی سلطنت دَور عروج میں | ۲۰۱ |
| ۶ | اسلامی فتوحات | ۲۴۱ |
| ۷ | شام و لبنان کی صلیبی ریاستیں | ۲۸۶ |
| ۸ | سلطنتِ عثمانیہ دَور عروج میں | ۳۵۸ |
| ۹ | لبنان معنی اور شہابی امراء کے ماتحت | ۳۸۱ |



Marfat.com

# فہرست تصاویر


| نمبر شمار | تصویر | نمبر صفحہ |
| --- | --- | --- |
| ۱ | دریائے کلب کا دہانہ | ۱۵۲ |
| ۲ | معبد بعلبک | ۲۱۷ |
| ۳ | پارلیمنٹ کی عمارت | ۴۸۲ |
| ۴ | کلیۂ جمہوریۂ لبنان | ۴۸۶ |


Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

# مقدّمہ

## مترجم

یہ کتاب مترجم کی طرف سے کسی طویل و مبسوط مقدّمے کی محتاج نہیں۔ فاضل مصنّف کو "تاریخ عرب" اور "تاریخِ شام" کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے اور "تاریخ لبنان" کا علمی و تحقیقی مرتبہ مذکورہ بالا کتابوں سے بلند تر نہیں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہے۔

اس کتاب کی اہمیّت کے دو پہلو خود فاضل مصنّف نے واضح کر دیے ہیں۔ اوّل یہ کہ اگرچہ لبنان چھوٹا سا خطّہ ہے اور اس کی تاریخ سے وسیع دلچسپی کا بہ ظاہر کوئی امکان نہ تھا، مگر دنیائے قدیم و جدید کی متعدد عظیم الشان سلطنتوں اور شہرۂ آفاق فاتحوں سے اسے کسی نہ کسی نوع کا تعلق رہا۔ یہی وجہ ہے کہ لبنان کی سرگزشت، وسیع تر علقوں کی سرگزشتوں سے وابستہ ہو جانے کے باعث خاص اہمیّت اختیار کر گئی یا مصنّف کے الفاظ میں لبنان کی کہانی چھوٹے پیمانے پر مہذب دنیا کے بڑے حصّے کی کہانی بن گئی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ لبنان کے کسی بھی عہد (فونیقی عہد کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد) کے حالات سے عموماً اور دَورِ حاضر کے حالات سے خصوصاً بہت کم اعتنا کیا گیا۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں ان کوتاہیوں کی تلافی کا خاص خیال رکھا گیا۔

میرے نزدیک اس کی اہمیّت کے اور پہلو بھی ہیں، جن کی اجمالی کیفیّت درج ذیل ہے:

۱۔ لبنان عرب کا ایک حصّہ ہے۔ اس کی زبان عربی ہے۔ عام تمدّن اور ثقافت میں عربیت کے عناصر غالب ہیں۔ غالباً مصر کے بعد عربی علوم کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ دورِ حاضر میں مغربی علوم کی کتابوں کے عربی تراجم اور نئے انداز پر عربی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا آغاز لبنان ہی سے ہوا۔

۲۔ اس کی تقدیر عرب ہی سے وابستہ ہے اور بعض بڑی طاقتوں کی غرض آلود مداخلتوں کے باوجود وہاں کے باشندے (خواہ ان کا تعلق کسی مذہب، کسی فرقے اور کسی گروہ سے ہو) نہ عربیت کو

Marfat.com

چھوڑ سکتے ہیں اور نہ اس کے دامن سے وابستگی کا رشتہ توڑ سکتے ہیں۔ اس حقیقت کی ایک روشن دستاویز یہ کتاب بھی ہے۔

۳۔ اس کتاب میں عرب کی تاریخ کے بعض نہایت اہم ادوار پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ ایسی مختصر و جامع معلومات شاید ہی کسی دوسری کتاب میں مل سکیں۔

۴۔ صلیبی عہد اور دورِ حاضر کے حالات تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔

۵۔ میری آرزو مدت سے یہ تھی کہ عرب کے مختلف حصوں کی مفصل سرگذشتیں اردو میں منتقل ہو جائیں اور ان میں عہدِ قدیم کے متعلق وہ تمام معلومات شامل ہوں جو نادر تاریخی دستاویزوں نیز آثارِ قدیمہ سے حاصل ہوئیں۔ اس لیے انھیں قرآن مجید اور اسلامی تاریخ کے مطالعے کے لیے نہایت ضروری پس منظر کی حیثیت حاصل ہے۔ "تاریخ لبنان" بھی کم از کم جزوًا اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

یہی محرکات تھے، جن کی وجہ سے اس کتاب کا ترجمہ میں نے ضروری سمجھا۔ "تاریخ شام" کا ترجمہ اس سے پہلے ہو چکا ہے، اب اگر یمن، حضرموت اور دوسرے حصوں کی ایسی ہی سرگذشتوں کا ترجمہ ہو جائے تو اُردو خواں حضرات کے لیے نہایت مفید ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔

فاضل مصنّف مسیحی ہونے کے باوجود اس تعصّب اور تنگ نظری سے بالکل پاک ہے جس سے اکثر مستشرقینِ یورپ آلودہ رہے۔ اس کی ایک روشن شہادت یہ ہے کہ اس نے اپنے ہم مذہبوں پر نکتہ چینی میں قطعاً تامّل نہیں کیا۔ تاہم بعض امور و وقائع کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ ہم سے اور میں سمجھتا ہوں حقیقت و واقعیت سے مختلف و منحرف ہے۔ میں نے ایسے مواقع پر ضروری باتوں کی مناسب تصریح حواشی میں کر دی ہے۔ خوانندگانِ کرام ان حواشی کو پیشِ نظر رکھیں گے تو خود بخود اندازہ فرمالیں گے کہ مصنّف کو کہاں کہاں لغزش سے سابقہ پڑا۔

اس ترجمے سے مقصود صرف یہ ہے کہ ہماری قومی زبان کی علمی ثروت میں مستند، مفید اور بلند پایہ کتابوں کا اضافہ ہو، نیز اُردو خواں اصحاب کے لیے مطالعے کا وسیع تر دائرہ مہیا ہو جائے۔

مہر

مسلم ٹاؤن۔ لاہور
۹۔ مئی ۱۹۶۱ء

Marfat.com

# دیباچہ

جمہوریۂ لبنان آج جس علاقے پر مشتمل ہے، اس میں جو معنی خیز واقعات قرن بہ قرن پیش آتے رہے، ان کا خاکہ پہلی مرتبہ مرتب کرتا اور جو قومیں یکے بعد دیگرے اس علاقے پر متصرف ہوتی رہیں ان کے کارناموں اور نمایاں خدمتوں کو ضبطِ تحریر میں لانا بہت بڑی جسارت ہے۔ اس علاقے نے کُلّاً نہیں تو جزواً اپنا مخصوص تشخّص بحال رکھا، جس کے ممتاز پہلو یہ تھے: علاقے کی کوہستانی نوعیت، سمندر سے قرب، مغرب کی جانب رُجحان اور باشندوں کا کردار۔ معاصر صورتِ حال سے امکانی مناسبت اور واقعاتِ عالم سے تعلّق کی بنا پر اُس کا تعیّن ہوتا ہے، جسے معنی خیزی قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہی عام واقعات منتخب کیے گئے اور ماضی کے وہی حصّے معرضِ تحریر میں لائے گئے، جو زیرِ غور علاقے کے موجودہ مسائل سے دوچار ہونے اور حالیہ حوادث کو سمجھنے کے لیے کارآمد متصوّر ہو سکتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ واقعات پیشِ نظر رکھے گئے، جو معاملاتِ عالم کے ساتھ تعلّق کے نقطۂ نگاہ سے اہم محسوب ہوتے تھے۔ ان تاریخی واقعات کا تعلّق زمانہ ماضی کے لحاظ سے مصر، بابل، اشوریہ، کلدانیہ، ایران، مقدونیہ اور روما کے واقعات سے تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں بیزنطین، عرب اور دَورِ حاضر میں ان کا تعلّق عثمانی ترکوں اور فرانسیسیوں سے رہا۔ اس طرح یہ کہانی چھوٹے پیمانے پر مہذّب دُنیا کے بڑے حصّے کی سرگزشت بن گئی۔ بہ ایں ہمہ لبنان کی طویل و بوقلموں تاریخ کا کوئی دَور —— فونیقی دَور مستثنیٰ ہے۔ نیز وہ دَور، جس کا تعلق بائیبل کے عہد نامۂ قدیم سے ہے —— بہ طریق شایاں بیان نہیں ہوا۔ سب سے کم توجہ دَورِ حاضر پر مبذول ہوئی اور پیشِ نظر کتاب کا خاصا بڑا حصّہ اُسی کے لیے وقف ہے

اس کتاب کے لیے ذخیرۂ معلومات زیادہ تر ابتدائی ماخذ سے حاصل کیا گیا، جو دورِ حاضر کی تحقیق و تفتیش سے خاصا بیش قیمت بن گیا، لیکن پیش کش میں —— مصنّف کی "تاریخ عرب" اور "تاریخ شام" کی طرح، جن کی ہم قبیل یہ کتاب ہے —— اختصاص کا پیمانہ نہیں، متعلّم اور عام خوانندہ کا پیمانہ مدِّنظر رہا ہے۔ علاقہ ایسا ہے، جہاں مصنّف نے اپنی زندگی کا ابتدائی دَور گزارا۔ پھر وہ بار بار وہاں پہنچتا رہا

Marfat.com

اور باشندوں سے مسلسل ربط و تعلق قائم رکھا جس میں کبھی خلل نہ آیا۔ اگر یہ درست ہے کہ حال کو ذہن نشین کرنے کے لیے ماضی کا علم ناگزیر ہے تو یہ بھی یکساں درست ہونا چاہیے کہ حال سے بلا واسطہ آگاہی ماضی کی پوری قدر شناسی کے لیے ضروری ہے۔

ایجاز و توضیح کے تقاضے کی بنا پر مصنّف نے نزاعی اور پیچیدہ واقعات کے بیان میں دانستہ خاص حد تک آزادی سے کام لیا ہے۔ حواشی میں کتابوں کے حوالے شامل ہیں، جن سے نہ صرف متن کی توثیق ہوتی ہے بلکہ جو صاحب مزید معلومات کے آرزومند ہوں، یہ حوالے ان کے لیے بھی مفید ہیں۔ ہر کتاب کا مکمل حوالہ صرف اس جگہ دیا ہے، جہاں اس کا ذکر پہلی مرتبہ آیا ہے اور اشاریے میں کتابوں کے صرف مصنفین کے نام مذکور ہیں۔ بعض کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں سن ہجری مذکور ہے، جس کی ابتدا ۶۲۲ء میں ہوئی۔

ریورنڈ فادر جے فرینکلن یوئنگ[1] (فورڈہم یونیورسٹی) نے اس ذخیرۂ معلومات پر نظر ثانی کی، جس کا تعلق دورِ ما قبل تاریخ سے ہے (باب ۲۔ باب ۵)۔ پروفیسر رابرٹ ایچ پیفر[2] (ہارورڈ یونیورسٹی) نے وہ ابواب ملاحظہ فرمائے، جن کا تعلق کنعانیوں سے ہے (باب ۶۔ باب ۸) پروفیسر ایلن سی جانسن[3] (سابق پروفیسر پرنسٹن یونیورسٹی) نے یونانی و رومی دور سے متعلق حصہ دیکھا (باب ۱۱۔ باب ۱۶) اور میرے رفیق لیوس وی ٹامس[4] نے عثمانی دور پر ایک نظر ڈالی (باب ۲۴۔ باب ۳۶)۔ میں ان تمام فضلاء کا بصمیم قلب شکرگزار ہوں۔ ساتھ ہی متعلقہ معلومات میں کوتاہیوں کی ذمہ داری ان میں سے کسی پر بھی عائد نہیں ہوتی۔ میری بیوی کتاب کی اصلاح و درستی اور ترتیب و طباعت کی تیز رفتاری میں معاون ہوئی۔ میرے حلقے کے طلبہ میں سے، جنھوں نے قیمتی مشورے دیے، مندرجہ ذیل کا ذکر ضروری ہے:

سیزر فرح[5]، جان جوزف[6]، رابرٹ ڈبلیو کرافورڈ[7]۔ ابراہیم ابو الغد[8]، رچرڈ این ورڈری[9]، نارمن آر بینیٹ[10]، پیٹر بی ایڈمنڈ[11] اور جارج ٹی سکینلن[12]۔ الامیر مارس شہاب (محکمۂ آثار قدیمہ حکومت لبنان) پروفیسر دمتری سی برکی[13] (امریکی یونیورسٹی بیروت کا عجائب خانۂ آثار قدیمہ) اور ڈاکٹر جارج سی مائلز[14] (امریکی انجمن مسکوکات) کے لطف و نوازش سے کتاب کے لیے متعدد تصاویر مہیا ہوئیں۔

اپریل ۱۹۵۶ء　　　　فلپ، کے، حتی

---

[1] J. Franklin Ewing [2] Robert H. Pfeiffer [3] Allen C Johnson [4] Lewis V Thomas [5] Ceasar Farah [6] John Joseph [7] Robert W Crawford [8] Ibrahim Abu Lughod [9] Richard N. Verdery [10] Norman R Bennet [11] Peter B Edmonds [12] George T Scanlon. [13] Dimitri C. Baramki [14] George C Miles

Marfat.com

# پہلا حِصّہ

# تاریخ سے پیشتر کا دور

Marfat.com

Marfat.com

# پہلا باب

## امتیازی پہلو

### جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی

**ملک کی اہمیت** بیروت سے چند میل شمال میں نہر کلب کے دہانے پر پہاڑ سمندر میں کسی قدر آگے بڑھ کر ختم ہوتا ہے۔ اس مقام پر برہنہ چٹان کی پیشانی اُنیس کتبوں سے مزیّن ہے، جن میں آٹھ زبانیں استعمال کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے مصری، پھر اشوری اور بابلی، اس کے بعد یونانی اور لاطینی آتی ہیں۔ آخر میں فرانسیسی، انگریزی اور عربی۔ یہاں ایک تنگ درّہ ہے، جہاں حملہ آوروں کی کثرتِ تعداد بالکل نہیں تو بڑی حد تک بے اثر ہوجاتی رہی۔ یہی مقام ہے جہاں مقامی باشندے بیرونی حملہ آوروں اور فتح و تسخیر کے حریفوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جن حملہ آوروں نے اپنے فوجی کارناموں کو سنگ تراشی یا کتبات کے ذریعے سے لباسِ دوام پہنانے کی کوشش کی، ان میں سب سے پہلا شخص رعمسیس ثانی تھا، جو حتیوں کا جانی دشمن تھا اور تیرھویں صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔ اس کے بعد نینوا کے بادشاہ اسرحدّون[۵۱] (فاتح مصر زیریں) بنوکدنضر[۵۲] شاہ بابل (مخرّب سلطنت یہوداہ) سلطان سلیم (جس نے شام و مصر کو سلطنتِ عثمانیہ کا جزو بنایا) ایلنبی[۵۳] اور گوراؤ فرعونی[۵۴] مثال کی پیروی کرتے رہے۔ شہنشاہ مارکس آرلیس اینٹونینس[۵۵] نے لاطینی میں ایک کتبہ گال کی تیسری فوج کے کارناموں کی یادگار کے طور پر کندہ کرایا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جسے رومہ کے شاہی خاندان کا کیرا کلا کہا جاتا اور اجینٹ سمجھا جاتا ہے۔

---

۵۱ Esarhaddon اشوریہ کا سب سے زبردست بادشاہ ۶۸۱ ق م سے ۶۶۸ ق م

۵۲ بنوکدنضر کا ایک املا بنوکد غذرا بھی ہے۔ عربی میں اسے بخت نصر کہتے ہیں۔ میں نے بائیبل مترجم کے املا کو ترجیح دی۔

۵۳ Allenby برطانوی جرنیل جس نے پہلی جنگ عظیم کے وقت فلسطین و شام میں پیش قدمی کی تھی۔

۵۴ Gourand فرانسیسی جرنیل

۵۵ Marcus Aurelius Antoninus

Marfat.com

وہ الیگزانڈر سیویرس[1] کا چچیرا بھائی تھا اور اس کے باپ کی پیدائش لبنان میں ہوئی تھی۔ عالمگیر شہرت کی دوسری شخصیتیں بھی یہاں پہنچیں، مگر انھوں نے اپنی آمد کی کوئی یادگار نہ چھوڑی۔ مثلاً سکندر اعظم اور سلطان صلاح الدین۔ ۶۱-۱۸۶۰ء میں نپولین ثالث نے ایک فرانسیسی فوج اس غرض سے بھیجی تھی کہ متحارب مارونیوں اور دروزیوں میں امن قائم کر دے۔ وہ لوگ اتنے سست تھے کہ کوئی نیا کتبہ اس سرزمین پر عارضی تصرف کی یادگار میں کندہ نہ کرا سکے۔ البتہ انھوں نے پیشتر کے ایک ہیروغلافی کتبے کو نابود کر دیا۔ ۱۹۱۸ء میں برطانوی فوج نے جنوبی سمت سے بڑھتے ہوئے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور آئندہ سال اپنے اس کارنامے کی دستاویز کتبے کی شکل میں تیار کر دی۔ بعد ازاں ۱۹۳۰ء میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہندوستان، فرانس اور شاہ حسین کی عربی فوج کے نام بھی شامل کر دیے۔ ۱۹۲۰ء میں فرانسیسیوں نے بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کیا اور اپنی رجمنٹ کے نام کندہ کرائے، جن میں الجزائر اور سینیگال کے دستے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ اسی سال فاتحانہ دمشق میں داخل ہوئے تھے۔ سب سے آخری کتبہ عربی میں ہے۔ یہ جمہوریۂ لبنان نے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو حکمران فرانسیسی فوج کے کامل تخلیے کی یادگار میں کندہ کرایا تھا۔ دنیا کا اور کون سا مقام ہے، جہاں دیوتاؤں[2] اور بادشاہوں کی سنگ تراشیوں اور کتبوں کا زیرِ سما عجائب خانہ مل سکتا ہے؟ یہ دستاویزیں ناظر کے سامنے ایک دریچہ کھولتی ہیں، جو اگرچہ چھوٹا ہے، تاہم اس میں سے تاریخ کے رنگا رنگ، متنوع اور بوقلموں مناظر کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

## مہذب دنیا کی تاریخ کا خلاصہ

اسی سرزمین لبنان میں، جو بہ لحاظ مکان فرومایہ اور بہ اعتبارِ زمان گراں مایہ ہے، نہایت اہم تاریخی وقائع اتنی بڑی مقدار میں جمع کر دیے گئے کہ شاید ہی اس رقبے کی کسی دوسری سرزمین میں پیش آئے ہوں۔ تاریخ سرزمین لبنان سے ابتدائی دور ہی میں شناسا ہو گئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شناسائی کبھی نذرِ فراموشی نہ ہوئی۔ لبنان نام پانے سے ہزاروں سال پیشتر وہ لوگ اس کے ساحل اور اندرونی میدانوں میں رہتے تھے، جنھیں گھر بار بنانے کا شعور نہ تھا اور غاروں میں بسر اوقات کرتے تھے۔ اس وقت تک شہور و سنین کا وہ شمار بھی رائج نہیں ہوا تھا، جس سے ہم وقت کی

---

[1] Alexander Severus

[2] ہدایتہً اس سے مراد وہ بادشاہ ہیں، جو دیوتا مانے جاتے تھے، مثلاً فراعنہ مصر۔

پیمائش کرتے ہیں۔ دریائے کلب کی جن یادگاروں کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے قریب ہی آگے بڑھتے ہوئے حصّے سے ایسی چیزیں دستیاب ہوئیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجری ادوار کے آغاز میں یہاں کی چٹانوں نے آدمی کو پناہ دی تھی اور اس کے لیے زندہ رہنے کا موقع بہم پہنچایا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب آدمی پورا انسان نہیں بنا تھا اور اس حصے میں سخت بارشیں ہوتی تھیں۔ آب و ہوا نہایت سرد تھی۔ اس سرزمین کی تاریخی سرگزشت تقریباً پانچ ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے، گویا یہ سرگزشت بہ اعتبار مدّت ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے تین گنا زیادہ ہے۔ اہل لبنان کے سوا اور کون سی قوم ہو سکتی ہے، جو صحیح معنی میں تمام ادوار و عہود کی وارث سمجھی جا سکے؟

جمہوریۂ لبنان کا موجودہ صدر، جس کا انتخاب ستمبر ۱۹۵۲ء میں تقریباً تین ہزار نو سو ستتر مربع میل رقبے پر حکمرانی کے لیے ہوا تھا (اور یہ رقبہ جمہوریۂ امریکہ کی ریاست نیو جرسی[1] سے نصف ہے) دعویٰ کر سکتا ہے کہ فرانس کے "ناظم اعلیٰ"، سلطنت عثمانیہ کے "متصرّف"، عربوں کے "والی"، "عیلیبی دَور کے بادشاہ"، "بزنطین اور روما کے "لیگیٹ" (نائب الحکومہ)"، ایران کے صوبیدار، اشوریہ اور بابل کے گورنر اور مصر کے نائب السلطنت سب اس کے پیشرو تھے۔ دَورِ حاضر کا لبنانی طالب علم تاریخ کے ابتدائی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ ایسے ناموں سے بخوبی آگاہ ہو، جیسے شاہ فیصل، سلطان عبدالحمید ثانی، نپولین بوناپارٹ، امیر فخرالدین، بالڈون اوّل، تیمور، معاویہؓ، ہرقل، خالدؓ بن ولید، پومپی، دارا، سرجون ثانی اور تہوتمس ثالث[2]۔ لبنان کے سیچ پچھ فتوحات ظہور پذیر ہوئے، وہ محض مقدار ہی کے اعتبار سے اسے ہم پلہ ملکوں کے ساتھ دعوتِ مقابلہ کے قابل نہیں بناتے بلکہ عالمی اقدار و اہمیّت کے نقطۂ نگاہ سے ان کی

---

[1] جمہوریۂ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پچاس ریاستوں میں سے ایک جو نیو یارک کی ریاست سے متصل جنوب میں اوقیانوس کے ساحل پر واقع ہے۔ رقبہ ۷٬۵۲۲ مربع میل۔

[2] ان ناموں میں عہدِ قدیم سے دورِ جدید تک مختلف حکمران اور فاتح آگئے ہیں۔ فیصل سے مراد فیصل اوّل شاہِ عراق ہے، جو کچھ دن شام کا بادشاہ رہا تھا۔ عبدالحمید مشہور عثمانی سلطان۔ بالڈون اوّل عیلیبی عہد کا بادشاہ تھا۔ پومپی رومی جرنیل۔ دارا کیانی شاہنشاہ ایران، سرجون اشوریہ کا اور تہوتمس مصر کا بادشاہ تھا۔ واضح رہے کہ مختلف حکومتوں کی طرف سے جو صوبیدار مقرر ہو کر آتے رہے ان کے لقب مختلف تھے۔ مثلاً فرانس کے Laut Commissenes (ناظم اعلیٰ یا سرناظم)، عثمانی حکومت کے متصرّف، عرب حکومتوں کے والی، رومیوں کے Legote (سیز مختار، وزیر، نمائندہ) ایرانیوں کے Satraps (صوبیدار یا نائب السلطنت)۔

معنی خیزی میں کلام کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ اُن سرزمینوں میں سے ایک ہے، جو بہ لحاظ قامت بہت چھوٹی، مگر بہ لحاظ اثر سمجھا جائے تو ایک کائناتِ صغرا ہیں۔ اس کی سرگزشت درحقیقت ہماری مہذب دنیا کی تاریخ کے ایک بڑے حصے کی سرگزشت ہے۔

**فیصلہ کن عوامل**

لبنان کے دورِ حیات میں جن عوامل کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے، وہ یہ ہیں: سرزمین کی کوہستانی حیثیت، سمندر سے انتہائی قرب، گہوارۂ تہذیب میں اس کی مرکزی موقعیت، جہاں سے دنیا بھر کے راستے گزرتے تھے۔ اس عظیم بین الاقوامی شاہ راہ پر وقوع، جس کے ذریعے سے تین برِاعظم باہم ملے ہوئے تھے۔ سمندر سے مراد مشرقی بحیرۂ روم ہے، جس کے پانیوں نے سب سے پہلے تہذیب کی مادّی اور ثقافتی پیداوار باہر پہنچائی اور تقسیم کی۔ گہوارۂ تہذیب کے دو حلقے تھے، ایک دوآبہ دجلہ و فرات، دوسرا مصر۔ ان کے درمیان لبنان واقع تھا۔ جس سرزمین میں لبنان کو ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل ہے، اس کا رخ بحیرۂ روم کی طرف ہے، جس کے ذریعے سے زیادہ چیزیں باہر بھیجی گئیں اور کم چیزیں وصول کی گئیں۔ اس کے عقب میں شام کی کوہستانی سرزمین ہے، جو مشرقی جانب صحرا سے ملی ہوئی ہے۔ یہ صحرا وسط ایشیا تک چلا جاتا ہے۔ اوپر شمال کی طرف نظر ڈالیں تو وہ علاقہ سامنے آتا ہے، جو کسی زمانے میں حتّیوں کا مرکز تھا۔ یہ علاقہ ہندی یورپی ثقافت کے اوّلین مرکزوں میں سے تھا۔ جنوب میں فلسطین واقع ہے، جو یہودیت اور مسیحیت کا سرچشمہ تھا۔ خود لبنان کے حدود میں ساحلی میدان اور البقاع کی مرکزی سطح مرتفع ایسے خطے ہیں، جہاں مسلسل ربط و تعلق، مبادلت اور خیال، تغیر اور انقلاب کا عمل تاریخی نشوو ارتقا کی کلید بنا اور کلید رہا۔ یہ سب کچھ نشیبی علاقوں میں ہوا۔ باقی رہے کوہستانی علاقے، جہاں پہنچنا غیر ممکن نہ سہی مگر وہ عام راستوں سے الگ تھلگ ضرور ہیں، تو وہاں کی تاریخ سمجھنے کے لیے قدامت پسندی، استغنا، خودمختاری، انقطاع اور علیحدگی کو کلیدی الفاظ کی حیثیت حاصل ہے۔

**فونیقی اداروں کا عظیم ترین کارنامہ**

لبنان کے قدیم ترین باشندے، جن سے تاریخ آشنا ہے سامی کنعانی تھے، جو ہمسایہ خطوں میں سے شام اور بیشتر فلسطین میں بھی آباد ہوئے۔ کنعانی ثقافت ہی فلسطین کی اسرائیلی ثقافت اور شام کی ارامی ثقافت کی بنیاد تھی۔ عبرانی اور ارامی دونوں متاخر زمانے میں اس سرزمین کے اندر پہنچے اور دونوں نے پہلوں سے بہت سی چیزیں مستعار لیں۔ پھر وہ اس قابل ہوئے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے سروسامان

Marfat.com

مہیا کریں۔ پوری دنیا کی طرف سے عبرانیوں کے احسان کا نسلاً بعد نسلٍ اعتراف ہوتا رہا ہے، لیکن کنعانیوں کے احسان کا احساس حال ہی میں ہوا ہے اور وہ بھی محض جزوی۔ مذہب، زبان، فنون، تعمیر، ادب، زراعت اور صنعت و حرفت میں عبرانیوں نے بے تکلّف ان کنعانیوں سے بہت کچھ لیا، جنھیں یونانی آگے چل کر فونیقی کہنے لگے۔ تیسرے اور دوسرے ہزار قبل مسیح میں کنعانی ہی وہ واسطہ اور وسیلہ تھے، جن کے ذریعے سے مصر و بابل کی مادّی و ذہنی پیداوار دونوں جانب پھیلتی رہی۔

کنعانی تہذیب سے فائدہ اُٹھانے اور اس کی میراث سنبھالنے والے محض عبرانی اور ارامی ہی نہ تھے، جن کے ذریعے سے سرزمین مشرق مستفید ہوئی بلکہ یونانی بھی تھے، جنھوں نے تہذیب کی روشنی سرزمین مغرب تک پہنچائی۔ اس سلسلے میں صرف ان بائیس طلسمی علامتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے، جنھیں بجا طور پر انسان کی عظیم ترین ایجاد کہا جاتا ہے۔ جن کے ذریعے سے وہ اپنے افکار و جذبات کو معرضِ تحریر میں لانے اور آنے والی نسلوں کے حوالے کرنے کے قابل ہُوا۔ یونانیوں نے انھیں علامتوں کے ذریعے سے اپنے بیش بہا ادبی اور فلسفیانہ خزینے محفوظ کیے، پھر وہ علامتیں رومیوں کے سپرد کیں، جنھوں نے ان سے کام لے کر اپنے قوانین اور دوسرے علمی کارنامے منضبط کیے۔ اس اثنا میں ارامی اسی فونیقی ابجد کو ایرانیوں، ہندوستانیوں اور ارمنوں کے حوالے کر رہے تھے اور ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہی ابجد عبرانیوں تک پہنچی، جنھوں نے اپنا غیر فانی مذہبی ادب تحریر میں منتقل کیا۔ پھر یہ ابجد عربوں کے حوالے ہوئی، جس میں قرآن مجید محفوظ ہوا۔ اگر قدیم زمانے کے یہ لبنانی باشندے تحریر و نگارش کی غرض سے نظام ابجد کی ترتیب کے سوا اور کوئی کام انجام نہ دیتے تو محض اسی کارنامے کی بدولت وہ انسانیت کے سب سے بڑے محسنوں میں شمار ہوتے۔

فونیقی نوآبادیاں، جو کنعانی تہذیب کی روشنی کا سرچشمہ تھیں، بحیرۂ روم کے شمالی اور جنوبی دونوں ساحلوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ جنوبی ساحل پر ان کا بنیادی مرکز قرطاجنہ تھا، جسے "دخترِ صور"[۱] کا لقب ملا اور جس نے وسطی بحیرۂ روم میں اقتدار و تسلّط کے لیے رومہ سے پیہم آزمائی کی۔ اہل قرطاجنہ اپنے آپ کو کنعانی سمجھتے تھے اور پانچویں صدی عیسوی تک انھیں کنعانی ہی کہا جاتا تھا۔ فونیقیوں نے

---

[۱] Daugher of Tyre یعنی صور ساحل لبنان کا ایک مشہور مقام تھا، چونکہ فونیقیوں نے یہاں سے نکل کر قرطاجنہ Carthage آباد کیا تھا، لہٰذا اسے "دخترِ صور" کہتے رہے۔

لبنان کے دیوداروں سے جہاز تیار کیے۔ ان جہازوں میں سوار ہو کر وہ "ہرقل کے میناروں"[۱] سے گزر گئے اور ان کے مغرب میں نو آبادیاں قائم کیں۔ اس طرح وہ پردہ چاک کر ڈالا، جو معلوم سمندر اور اس سے آگے غیر معلوم سمندر کے درمیان حائل تھا۔ اوقیانوس کا انکشاف ایک عظیم ترین اور پائیدار ترین کارنامہ تھا۔ یقیناً یہ تمام ادوار کے بہت بڑے کارناموں میں سے ایک ہے۔

## ارضِ مقدس سے قرب

ظاہر ہے کہ لبنان محض اس علاقے ہی کا ایک حصّہ نہ تھا جس سے دنیا کے تاریخی عہد کا آغاز ہوا بلکہ اس چھوٹے سے خطّے کا بھی ایک ٹکڑا تھا، جسے عرفِ عام میں "ارضِ مقدس" کہا جاتا ہے۔ اس کے جلال و شکوہ، اس کے دیوداروں اور اس کی پیداوار کے ترانے پیغمبروں کے صحیفوں اور زبور کے گیتوں میں گائے گئے۔ اس کی برف پوش چوٹیوں کو دُور سے دیکھا جائے تو روحانیت کے پیکر نظر آتی ہیں۔ یہ مذہبی مصنّفوں کے نزدیک ہمیشہ روحانی بیداری کا پیغام بنی رہی ہیں۔ اس کے محفوظ مقامات، راہبوں اور پارساؤں کے لیے نہایت عمدہ مامن تھے۔ صور اور صیدا کے باشندے حضرت مسیحؑ کے وعظ سننے اور ان کے معجزانہ کارناموں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے جلیل[۲] پہنچے۔ خود حضرت مسیحؑ لبنان کے جنوبی ساحل پر تشریف لے گئے۔[۳] پولوس رسول نے ایک ہفتہ صور میں گزارا۔ ان کا جہاز صیدا کی بندرگاہ میں ٹھہرا، جہاں اُنھوں نے اپنے دوستوں سے ملاقات کی۔[۴] ہماری کتابِ مقدس کا نام یعنی بائبل خود لبنان کے ایک قصبے بیبلوس[۵] سے ماخوذ ہے، جسے آج کل جُبَیل کہتے ہیں۔

## نہ صحرا نہ بدو

پہاڑ اسی طرح لبنان کا ایک نمایاں پہلو ہے، جس طرح صحرا عرب کا، نیل مصر کا اور دجلہ و فرات دوآبے کے نمایاں پہلو ہیں۔ یہ پہاڑ لبنان کے لیے زندگی سے

---

[۱] Pillars of Hercules اس سے مراد وہ آبنائے ہے جسے تیرہ سو سال سے آبنائے جبل الطارق یا جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اسے "ہرقل کے مینار" کہتے تھے۔

[۲] مرقس کی انجیل باب ۳، آیت ۸، لوقا کی انجیل باب ۶، آیت ۱۷۔ فلسطین کی تقسیم (۱۹۴۷ء) سے پیشتر علاقہ جلیل یا گلیل فلسطین کا حصّہ تھا۔ ناصرہ اسی میں تھا۔ اس نام کا ایک بحیرہ بھی ہے، جسے ایک زمانے میں بحیرۂ کنّرت، بعد ازاں گنیسرت کہتے تھے۔ اس کا نام بحیرہ جلیل بھی تھا۔ عرب اسے بحیرہ طبریہ کہتے ہیں۔

[۳] متی کی انجیل باب ۱۵، آیت ۲۱۔ مرقس کی انجیل باب ۷، آیت ۲۴ و آیت ۳۱۔

[۴] رسولوں کے اعمال باب ۲۱، آیت ۳ و ۴، باب ۲۷، آیت ۳۔

[۵] Byblus

کم اہم نہیں۔ اس کے موقع اور محل نے آب و ہوا اور بارش پر گہرا اثر ڈالا۔ سطح کی بلندی نے اس کے سبزہ و گل، حیوانات اور مناظر میں تنوع پیدا کیا۔ اس کی طبعی ہیئت اندرونی علاقے کے ساتھ ربط و تعلق میں رکاوٹ بنی رہی۔ اس وجہ سے مشرقی سرزمینوں کے بجائے مغربی سرزمینوں سے تعلق بڑھا رہا۔ اگر اس کے باشندے مشرق کے بجائے مغرب کی طرف ہمیشہ راغب رہے تو اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ مراکش سے عراق تک لبنان کے سوا عربوں کی کوئی سرزمین نہیں جہاں صحرا نہ ہو اور جہاں خانہ بدوش بدوی بالکل ناپید ہوں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پہاڑوں نے باشندوں کے کردار میں اک گونہ سختی اور کرختگی پیدا کردی ہے۔ نیل نے مصر کو اور دجلہ و فرات نے عراق کو ہمیشہ اتحاد کی طرف مائل رکھا۔ اس کے برعکس لبنان میں وادیوں اور پہاڑیوں کے باعث باشندوں کے درمیان تفرقے کا رجحان نمایاں رہا۔ فونیقیہ میں شہری ریاستوں کا عام دستور تھا۔ قبیلوں سے بڑی حد تک بے نیاز قومی یا نیم قومی جمعیتیں دورِ حاضر کا دستور رہیں۔ تاریخ کے قدیم ترین نوشتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس خطے میں تارکین وطن کے سیل آتے رہے۔ مثلاً بحیرۂ روم کے جزیروں سے مختلف قومیں، سامی، ہندی و یورپی اور یہ دوگونہ وظیفہ انجام دیتا رہا: اوّل یہ تنگ سی گزرگاہ کرۂ ارض کے متعدد بڑے بڑے اور ممتاز حصوں کے درمیان زنجیرِ اتصال بنی رہی۔ دوم اس جائے امن میں مختلف گروہ ایک دوسرے سے الگ رہ کر پناہ لیتے رہے۔ گزرگاہ ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ پھر یہ سطح مرتفع میں سے ہوتی ہوئی دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان پہنچ جاتی ہے۔ جائے امن پہاڑوں کی بلندیاں ہیں۔ گزرگاہ میں ایک عجیب مخلوط معاشرہ وجود پذیر ہوا۔ ہر نیا گروہ باہر سے آکر پہلے پر مسلط ہوتا گیا۔ اس نے فروغ حاصل کیا اور پہلے گروہ کی حیثیت چنداں واضح نہ رہی۔ جائے امن کے معاشرے میں تنوع پورے مشرق قریب کا ممتاز پہلو ہے، لیکن لبنان میں اس کے مختلف رنگ زیادہ واضح اور الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ایسے معاشرے کے نظام میں مختلف گروہ پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی ممتاز قومی، مجلسی اور ثقافتی خصوصیات واضح کرتے رہتے ہیں۔

### اہل الجبل ہونے پر فخر

ہمت ور اور جفاکش لوگ پہاڑوں پر پہنچے ہیں تو ان کی سنگلاخ زمین کی چھان بین کرتے رہے اور ہر نئی مشکل کا مقابلہ کرکے اس پر قابو پاتے ہیں۔ خوشگوار آب و ہوا میں وہ استقامت، حوصلے اور زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنے کے جذبے سے کام کرتے ہیں۔ زندگی کے متعلق ان کے زاویۂ نگاہ میں انفرادیت پیدا ہو جاتی

Marfat.com

ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اندر بھی انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ جفاکشی اور اس قسم کی دوسری خصلتیں ان میں گھر کر جاتی ہیں، جو ہر جگہ کے کوہستانیوں کا خاصہ ہیں۔ اہلِ لبنان اپنا ذکر کرتے ہوئے بڑے فخر و ناز سے کہتے ہیں: "ہم اہلِ جبل ہیں"۔ ہر دور میں لبنان اپنی وادیوں اور پہاڑیوں کی بدولت ان افراد کے لیے مامن مہیا کرتا رہا، جن کے عقائد عوام سے مختلف تھے یا جو گروہ اقلیتوں کے نمائندے تھے۔ مسیحی راہب، مسلمان صوفی، دروزی درویش یہاں کے غاروں اور خلوت گاہوں کو دنیوی لذائذ پر ترجیح دیتے رہے۔ بے شمار خلوت گاہیں مریم عذرا اور دوسرے مسیحی پارساؤں سے مخصوص ہیں۔ مارونی مسیحی ساتویں صدی عیسوی میں یعقوبیوں کے ظلم و جور سے تنگ آ کر شمالی شام سے بھاگے تھے اور انھیں شمالی لبنان میں جائے امن مل گئی۔ دروزی عابدوں کو راسخ العقیدہ مسلمان مرتد سمجھتے تھے۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی میں سمتِ جنوبی سے لبنان پہنچے۔ شیعی گروہ سُنّیوں کے غیظ سے بچنے کے لیے مختلف اوقات میں مختلف مقامات سے آتے رہے۔ زمانۂ حال میں ارمنوں اور نام نہاد اشوریوں کے باقیات نے سلطنتِ عثمانیہ کی سختیوں سے بچنے کے لیے یہاں پناہ لی۔ ان سب کو موقع مل گیا کہ اپنے اپنے طور طریقے کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ جو گروہ میدان میں قلیل التعداد تھا، وہ پہاڑ پر پہنچ کر کثیر التعداد بن سکتا تھا اور ارتداد، رسوخ عقیدہ کا درجہ حاصل کر سکتا تھا۔ مارونی، دروزی اور شیعہ (متاولہ) قوموں یا قوم نما گروہوں کی شکل اختیار کر گئے اور اب تک موجود ہیں۔

**سیاسی حیثیت** لبنان صحیح معنی میں پہاڑی علاقہ ہے، لہٰذا یہ جزواً یا کلاً ہمیشہ کامل یا نیم خود مختاری کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کی طبعی ہیئت ایسی تھی کہ اجنبی حملہ آوروں کا جنگل اس پر سب سے آخر میں پڑتا رہا۔ حملہ آور اس پر قابض ہو جانے کے بعد جلد ہی اس نتیجے پر پہنچتے رہے کہ اس خطّے کو خود مختاری کی زندگی بسر کرنے دینا ہی مناسب ہے۔ بار بار حملہ آور اسے سراب کی طرح بسیر الحصول سمجھتے رہے لیکن یہ ان کے قبضے میں نہ آیا۔ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب فتح و تسخیر کے پرچم اڑاتے ہوئے لبنان پہنچے تو صاف معلوم ہوا تھا کہ یہ علاقہ اسلام کی آغوش میں پہنچ گیا، لیکن چند ہی قرن گزرے تھے کہ مارونیوں نے نہ محض جلیل القدر اموی خلیفوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی خوش رفتاری کے لیے ان سے رقمیں وصول کرنے لگے، حالانکہ اموی خلافت کا مرکز دمشق (لبنان سے) بہت قریب تھا۔ دریاؤں کے پانی سے سیراب ہونے والے مصر اور عراق دونوں

Marfat.com

عربی فتوحات کے وقت بڑی حد تک مسیحی تھے، لیکن دونوں اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ لبنان میں اب تک مسیحیوں کو اکثریت حاصل ہے[۱] سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں عثمانی ترکوں نے مغربی ایشیا کو مسخر کر لیا، مگر انھیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ مملوکوں کے عہد کی طرح لبنان کے کوہستانیوں کو داخلی خود مختاری کی زندگی بسر کرنے دیں۔ لبنانی اس پر قانع نہ رہے اور فخر الدین المعنی (وفات ۱۶۳۵ء) اور بشیر الشہابی (۱۸۵۰ء) جیسے امیر باب عالی سے سرتابی میں بھی متامل نہ ہوئے اور انھوں نے سیادت کا حلقہ عملاً گردن سے اتار دیا۔ ۱۸۶۰ء میں لبنان کے اندر جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی، اس کے نتیجے میں اس کے لیے داخلی خود مختاری بین الاقوامی حیثیت سے منظور کر لی گئی، جس سے لبنان پہلی جنگ عظیم تک مستفید رہا۔

## ترقیاتِ عالم میں حصہ

دنیا کی ترقی میں لبنان کے حصے کا آغاز کنعانیوں اور فونیقیوں سے ہوا، لیکن یہ سلسلہ عہدِ قدیم ہی میں ختم نہ ہو گیا۔ یونانی فلسفیوں، خصوصاً رواقیوں اور نو فلاطونیوں کی فہرست میں بعض نہایت عظیم القدر نام ان لوگوں کے ہیں، جو لبنان میں پیدا ہوئے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ فلسفہ یقیناً یونان کی حد درجہ ممتاز میراث تھا۔ شامی و لبنانی خاندان کے جو لوگ روما میں حکمراں رہے، انھوں نے لبنان کی سرزمین میں وہ معبد تعمیر کرایا، جو دنیا کے نہایت عظیم الشان معبدوں میں شمار ہوتا ہے یعنی ہیلیو پولس[۲] کا معبد، جسے آج کل بعلبک کہتے ہیں۔ اس معبد کے کھنڈر تمام عمارتوں کے کھنڈروں پر سبقت رکھتے ہیں، جو رومی عہد کی میراث سمجھے جاتے ہیں اور خود روما کے کھنڈر بھی مستثنیٰ نہیں۔ بیروت آج کل لبنان کا مرکز حکومت ہے۔ رومیوں کے عہد میں یہاں قانون کی ایک مشہور درس گاہ تھی، جو چھٹی صدی عیسوی میں زلزلے سے تباہ ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کی تمام صوبائی (رومی سلطنت کی صوبائی) درس گاہوں پر فائق تھی۔ اس کے دو ممتاز پروفیسر پیپینین[۳]

---

[۱] (مترجم) یہاں فاضل مصنف نے ایک حد تک مبالغے سے کام لیا ہے۔ لبنان موجودہ صورت میں زیادہ سے زیادہ ایک غلطی ہے۔ یورپی سامراجیوں نے شام پر قطع و برید کے کئی عمل جاری کیے۔ پہلے فلسطین کو الگ کیا۔ پھر شرقی اردن جدا ہوا۔ بعد ازاں اسکندرونہ کو کاٹ کر ترکوں کے حوالے کیا گیا۔ پھر باقی شام کے دو ٹکڑے کیے گئے، ان میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا لبنان ہے، جس کی حد بندی ہی زیادہ سے زیادہ مسیحیوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ بہ ایں ہمہ آبادی میں مسلمانوں اور مسیحیوں کا تناسب زیادہ سے زیادہ انچاس اور اکاون کا ہے۔

[۲] Heliopolis یعنی بعلبک۔ [۳] Papinian

اور اُلپین[۱] ان ممتاز لوگوں میں سے تھے جو جسٹینین کے قوانین ضوابط کی ترتیب میں شریک تھے قانونِ روما کی سب سے بڑی میراث تھا۔ خود جسٹینین نے بیریٹس[۲] (بیروت) کو "قوانین کی ماں اور انّا" قرار دیا تھا۔

**آبادکاری میں یگانگی**

قرونِ وسطیٰ میں تمام و لبنان کی نوآبادیوں کے تاجر اور صنعت کار اپنے فونیقی پیشروؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یورپ کے بہت سے شہروں میں فروغ حاصل کر چکے تھے۔ مثلاً آسٹیا[۳]، مارسائی[۴]، بوردو[۵]۔ مشرق و مغرب کے مال و اسباب کا مبادلہ انھیں کے ہاتھوں میں تھا۔ زمانۂ ماضی کی طرح آج بھی لبنان ایک تجارت پیشہ جمہوریت ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ آج بھی پُرجوش سرگرمی، نقل و حرکت اور تگ و دو کی وہی پرانی فضا محسوس کی جا سکتی ہے تشنگی اور استعجاب کا جو تیز احساس ابتدائی دور کے فونیقیوں کی گرم جوشیوں کا باعث بنا تھا، وہ کبھی سرد نہ ہوا اور نہ جدوجہد کا سرچشمہ خشک ہوا۔ دورِ حاضر کی لبنانی نوآبادیاں قاہرہ، پیرس، مانچسٹر، نیویارک، ساؤپالو[۶]، بیونس آئرس[۷] اور سڈنی میں برسرِ فروغ ہیں اور یہ صرف چند مقامات کے نام ہیں۔ عربی بولنے والی قوموں میں سے لبنانی پہلی قوم ہیں، جنھوں نے بہ صمیمِ قلب مغرب کے محرکات پر لبیک کہی۔ ان کی سرزمین نے فوراً مغرب کا اثر قبول کیا۔ کاروبار اور صنعت میں نئے طریقے، سائنس، حکومت اور تعلیم میں نئے افکار اختیار کر لیے اور ان کے ہاں نئے مجلسی و سیاسی ادارے بھی جاری ہو گئے۔ لبنانیوں ہی سے یہ طور طریقے، یہ افکار اور یہ ادارے باقی عرب دنیا تک پہنچے، جو صدیوں سے خوابِ گراں میں محو تھی۔ اس طرح دورِ حاضر کے دو روح افروز نظریے — قومیت اور جمہوریت — پذیرائی کے بعد معرضِ عمل میں آئے۔ لبنان ہی نے سب سے پہلے جمہوریت کا اعلان کیا۔ لبنان ہی کے دریچے سے شام فلسطین اور العراق نے مغربی دنیا کی پہلی صاف جھلک دیکھی۔

**بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر**

یہ تمام جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی خصائص لبنان کے لیے

---

[۱] Ulpian

[۲] Berytus

[۳] Ostia اٹلی کی ایک قدیم بندرگاہ۔

[۴] Marseille فرانس کی بندرگاہ بحیرہ روم میں۔

[۵] Bordeau فرانس کی بندرگاہ خلیج بسکے میں۔

[۶] Saopaulo (برازیل، جنوبی امریکہ)۔

[۷] Buenosaires ارجنٹائن، جنوبی امریکہ)۔

135127

Marfat.com

ایک ایسے امتیاز و اختصاص کے موجب ہیں، جن کی بنا پر حجم میں چھوٹا ہونے کے باوجود اس کا مستقل ذکر حق بجانب ہے۔ چھوٹے ملکوں کے معاملے کا فیصلہ آج سے بہت پہلے "بابائے تاریخ" نے فرما دیا تھا:

"میں چھوٹے ملکوں پر بھی ویسی ہی توجہ کروں گا، جیسی بڑے ملکوں پر، کیونکہ جو ملک زمانۂ ماضی میں بڑے تھے، ان میں سے زیادہ تر چھوٹے بن گئے ہیں اور جو میرے زمانے میں بڑے بن گئے ہیں، وہ پہلے بہت چھوٹے تھے۔ میں انسانی تقدیروں کی دائمی ناپائداری سے بخوبی آگاہ ہوں، اس لیے اپنے ذکر میں چھوٹے بڑے کا امتیاز روا نہیں رکھوں گا۔"[1]

---

[1] ہیروڈوٹس تاریخ کتاب اوّل، باب پنجم بحوالہ آر ملڈ جے ٹائنبی، یونان کا تاریخی فکر (مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۴ء) صفحہ ۵-۶۔

Marfat.com

## دوسرا باب

# پہاڑ اور میدان

**چار حصے** لبنان کی جغرافیائی ہیئت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں نشیب و فراز کا تبادل ہے اور یہ سلسلۂ تبادل شمال سے جنوب کی طرف متوازی چلا آتا ہے۔

بحیرۂ روم اور شام کے درمیان چار مختلف خطّے متعیّن ہیں: اوّل ساحلی میدان، دوم مغربی کوہستانی لبنان، سوم وسطی سطح مرتفع، چہارم مشرقی کوہستانی لبنان۔ یہ چار خطّے، جن کا سلسلہ مشرقی کوہستانی لبنان کے پن دھارے تک جاتا ہے موجودہ جمہوریۂ لبنان کے اجزاء ہیں، جو ۱۹۲۰ء میں وجود پذیر ہوئی تھی اور یہی علاقہ پیشِ نظر کتاب کا خاص موضوع ہے۔

**ساحلی میدان** ساحلی میدان بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ یہ ایک طویل خطّے کا درمیانی حصّہ ہے، جو شمال میں خلیج اسکندرونہ (عہدِ قدیم کا اسّوس[1]) سے شروع ہو کر جنوب میں جزیرہ نمائے سینا پر ختم ہوتا ہے۔ یہ خطّہ پہاڑ اور سمندر سے محصور ہے۔ موجودہ لبنانی اسے "ساحل" کہتے ہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی شمال میں طرابلس[2] کے قریب ہے۔ یعنی چار میل۔ چند میل جنوب میں جونیہ پر یہ چوڑائی صرف ایک میل رہ جاتی ہے۔ پھر پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے، جس کی بلندی ساحل سے چار میل ہٹ کر اڑھائی ہزار فٹ پر پہنچ جاتی ہے۔ ایک پہاڑی پر مریم عذرا کا مجسمہ ہے، جس کے نیچے ایک نہایت حسین و جمیل خلیج واقع ہے۔ دنیا بھر میں یہ اپنی نوعیت کی بہترین خلیج ہے۔ مزید جنوب کی طرف آئیں اور دریائے کلب کے دہانے پر پہنچیں تو وہ پہاڑیاں سمندر کے اندر چلی گئی ہیں، جن پر زمانۂ قدیم سے کتبے اور بت بنتے چلے آئے تھے۔ یہی اہم جنگی مقام ہے، جہاں مقامی باشندے حملہ آوروں کا راستہ روکتے رہے۔ ساحل کا زیادہ تر

---

[1] Issus یہی مقام ہے، جہاں سکندر نے دارا پر فیصلہ کن فتح حاصل کی تھی اور شام و مصر دارا کے قبضے سے نکل گئے تھے۔ (مترجم)۔

[2] اس سے مقصود طرابلس الشام ہے۔ ایک طرابلس لیبیا (افریقہ) میں بھی ہے (مترجم)۔

Marfat.com

Marfat.com

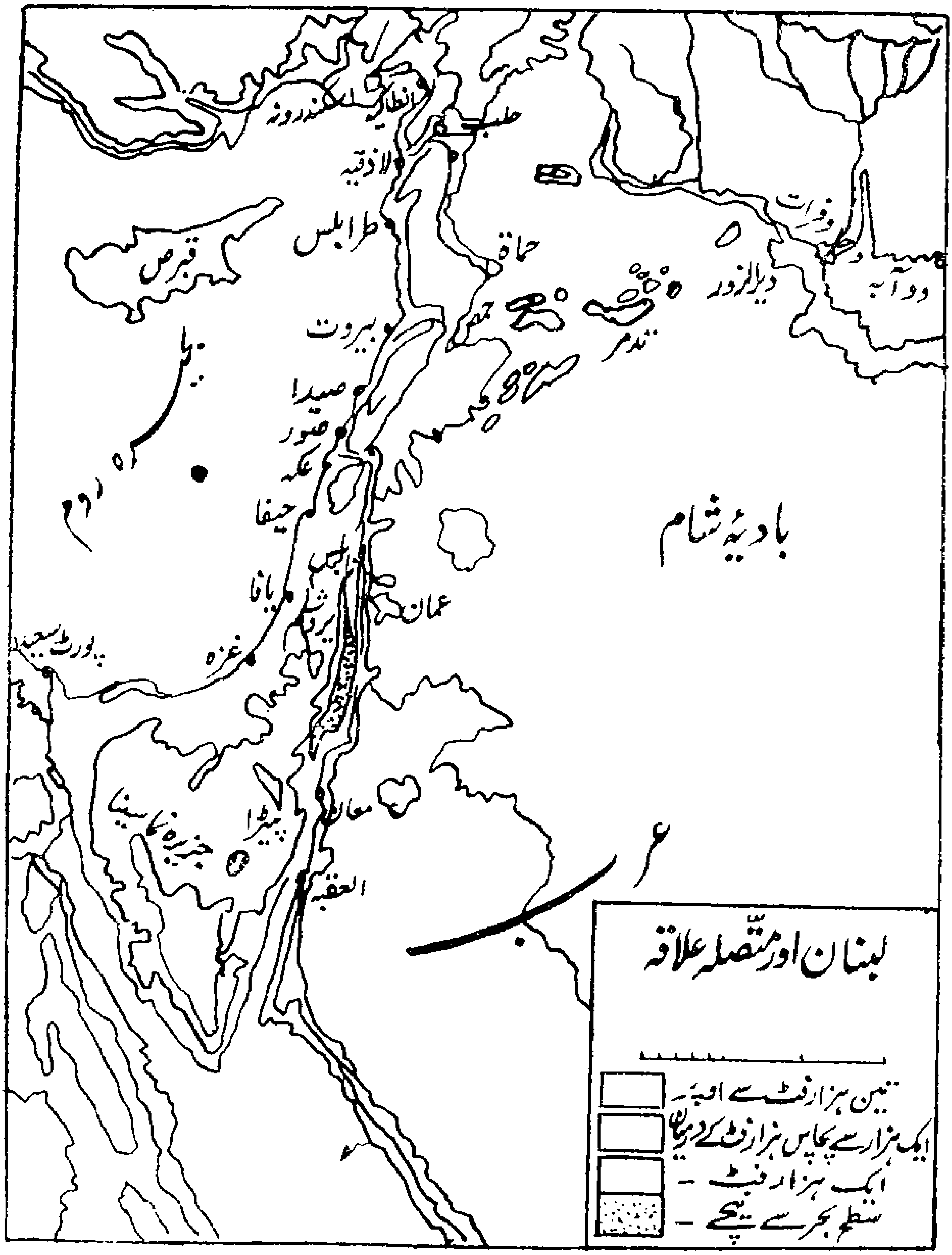
لبنان اور متصلہ علاقہ
تین ہزار فٹ سے اوپر
ایک ہزار سے پچاس ہزار فٹ کے درمیان
ایک ہزار فٹ
سطح بحر سے نیچے
انطاکیہ
اسکندرونہ
حلب
لاذقیہ
طرابلس
قبرص
حماۃ
حمص
فرات
دیرالزور
دوآبہ
تدمر
بیروت
صیدا
صور
عکہ
حیفا
بحر روم
بادیہ شام
یافا
عمان
غزہ
پورٹ سعید
جزیرہ نما سینا
پیٹرا
معان
العقبہ
عرب

Marfat.com

حصّہ چٹانی ہے۔ یہ چٹانیں اچانک سمندر کے کنارے اُبھر آئی ہیں۔ نقشے پر نظر ڈالیں تو پورا ساحل بالکل مستقیم معلوم ہوگا۔ جس میں نہ کوئی خلیج ہے، نہ دہانہ۔ گویا لبنان کے ساحل پر کوئی بھی قدرتی بندرگاہ موجود نہیں۔ یہ حقیقت اس وجہ سے حد درجہ حیرت انگیز بن جاتی ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے یعنی فونیقی عہد عتیق کے بہترین بحر پیما تھے۔

ساحلی میدان کا زیادہ تر حصّہ اُس عہد قدیم میں سمندر کی تہ بلند ہو جانے سے وجود پذیر ہوا، جسے ارضیات کا دورِ ثالث کہا جاتا ہے۔ جو تہ اوپر آئی، وہ کھریا کے اجزا پر مشتمل تھی۔ پھر پہاڑوں کے اطراف سے بہنے والا پانی اپنے ساتھ مٹی لاتا رہا، جس سے کھریا کے اجزا پر مٹی کی ایک تہ جم گئی۔ بیروت کے اردگرد بحیرۂ روم کی لہریں ریت کے اجزا چھوڑتی گئیں۔ یہ ریت دریائے نیل سے آئی تھی۔ دریائے نیل اسے مصر بالا اور سوڈان سے لایا تھا۔ یوں ساحل پر ریت بچھتی گئی اور سمندر کی تہ بنتی گئی۔ دریائی اور بحری مٹی کی وجہ سے زمین زرخیز بن گئی۔ پہاڑوں سے جو ندیاں آتی تھیں، وہ آبیاری کا کام دیتی رہیں۔ اس طرح پورا ساحل غیر معمولی طور پر سیر حاصل بن گیا۔ یہاں پھل اور سبزیاں خصوصاً بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً کیلا، سنگترہ، مالٹا، کھجور، گنا بھی بہت کاشت کیا جاتا ہے۔

**اصل لبنان** مغربی سلسلۂ کوہ اصل لبنان ہے۔ رومیوں کے زمانے سے یہ نام اسی حصّے کے لیے مخصوص رہا۔ مشرقی سلسلۂ کوہ کے لیے اینٹی لبانوس[1] (لبنانِ مقابل) کا نام تجویز ہوا تھا[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو سلسلہ ہائے کوہ کسی زمانے میں ایک تھے۔ دراصل لبنان اس پہاڑی دیوار اور سطح مرتفع کے درمیانی حصّے کو کہتے ہیں، جو شمالی شام میں جبلِ نکام[3] سے شروع ہو کر جنوب میں جزیرہ نمائے سینا کی بلند چوٹیوں پر ختم ہوتا ہے۔ یہ درمیانی حصّہ سب سے زیادہ بلند، حد درجہ سنگلاخ، بڑا پُر ہیبت اور پورے سلسلے کا نہایت دلکش حصّہ ہے۔ اس کا نام یعنی لبنان (عربی لُبنان) ایک سامی لفظ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "دودھ کی مانند سفید"۔ یہ اشارہ برف پوش چوٹیوں کی طرف ہے، جو سال بھر میں چھ مہینے سفید نظر آتی ہیں اور یہ سفیدی برف کی وجہ سے ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اس سلسلے کی بالائی سطح پر چونے کے پتھر کی تہ جمی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چوٹیوں پر برف کی سفید دھاریاں تقریباً پورا سال باقی رہتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے

---

[1] Antllibanos یعنی وہ سلسلۂ کوہ جو لبنان کے بالمقابل واقع ہے (مترجم)

[2] دیکھیے، سترابو کا "جغرافیہ" کتاب نمبر ۱۶، باب نمبر ۲، پلینی کی "طبعی تاریخ" کتاب نمبر ۵ باب نمبر ۷، بطلیموس کا "جغرافیہ" کتاب نمبر ۵، باب نمبر ۱۴ +

[3] Amamus عربی نام نکام +

ہیں کہ لبنان ایک پنجرہ ہے، جس پر آس پاس کے میدانوں اور نشیبی علاقوں کو بہ طور گوشت بڑھا دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ بحیرۂ روم اور مشرقی جانب کی زمینوں کے درمیان رشتۂ اتصال میں پہلی رکاوٹ ہے اور یہ رکاوٹ کہیں بھی ختم نہیں ہوئی۔

پہاڑ واضح طور پر ایک معیّن اکائی ہے، جس کے چاروں جانب طبعی حدیں موجود ہیں۔ شمال میں اسے نہر کبیر[1] شام کے جبال نصیریہ سے الگ کرتی ہے۔ اس کے جنوب میں دریائے قاسمیہ واقع ہے۔ اس طرح سلسلۂ کوہ کی پوری لمبائی ایک سو پانچ میل ہوتی ہے۔ اس کی چوڑائی میں بڑا اختلاف ہے۔ طرابلس کے قریب یہ پینتیس میل چوڑا ہے لیکن جنوبی سرے پر اس کا عرض صرف چھ میل رہ گیا ہے۔ طرابلس سے جنوب مشرق میں اس کی بلندی کمال پر پہنچ گئی ہے، جہاں ایک چوٹی قرنتہ السّود سطح بحر سے گیارہ ہزار چوبیس فٹ بلند ہے۔ اس کے قریب ہی ظہر القضیب نام ایک چوٹی ہے، جس سے دیودار کے درختوں کا سب سے بڑا جھنڈ ہے۔ اس کی بلندی دس ہزار اٹھارہ فٹ ہے[2]۔ دوسری جنگ عظیم میں پہاڑ پر ایک سڑک بنائی گئی تھی، جس کے ذریعے سے بعلبک کو طرابلس سے ملایا گیا تھا۔ وہ اس چوٹی کے قریب سے گزری تھی۔ پاس ہی ایک اور نمایاں چوٹی ہے، جسے فم المیزاب کہتے ہیں۔ یہ نو ہزار آٹھ سو چالیس فٹ بلند ہے۔ اس مقام پر دیودار کے جھنڈ کے پاس برف پر دوڑنے کے لیے ایک میدان بنایا گیا تھا تاکہ سردیوں میں شائقین اسے استعمال کر سکیں۔ سلسلے کے وسط میں ایک اور چوٹی ہے، جو آس پاس کی چوٹیوں سے منقطع ہے۔ اس کا نام صنّین ہے۔ یہ آٹھ ہزار آٹھ سو بیالیس فٹ اونچی ہے۔ صنّین کی ایک ہمسایہ چوٹی الکنیسہ چھ ہزار آٹھ سو نٹ اونچی ہے۔ آخری دونوں چوٹیاں میل ہا میل تک نمایاں ہیں۔ بیروت سے دونوں صاف نظر آتی ہیں "اہل الجبل" یا "جبلیوں" سے مقصود مغربی کوہستانی لبنان کے باشندے ہیں۔

## گھاٹیاں اور وادیاں

اس سلسلۂ کوہ کے شمالی حصے میں جو گھاٹیاں اور وادیاں ہیں ان کی حیثیت عمیق آبی ندوں سے ملتی جلتی ہے۔ یہ دراصل آبی گزرگاہیں ہیں، جن کے برہنہ طبقات کا تنوع نباتیات کے اختلاط سے ایک نہایت مؤثر اور

---

[1] پرانا نام Eleutherus اس کے معنی ہیں آزاد دیکھیے سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲ اور پلینی کتاب ۵، باب ۱۷۔

[2] دیکھیے رابرٹ ایچ ولیسٹ کا مقالہ Palestine Exploration Fund Quarterly Statement

Marfat.com

خوب صورت منظر پیش کرتا ہے۔ ایک ایسی گھاٹی وادی قادیشہ ہے، یعنی مقدّس وادی۔ اس کا قدیم سریانی نام اب تک باقی ہے۔ یہ لبنان کی تمام وادیوں سے زیادہ تند رو اور شاندار ہے۔ دیوداروں کے ایک جھُنڈ کے پاس سے شروع ہوتی ہے۔ پس منظر میں بلند پہاڑ ہیں اور تیزی کے ساتھ چٹانوں پر سے گزرتی اور مُڑتی ہوئی میدان میں پہنچتی ہے، طرابلس کے قریب سمندر میں داخل ہو جاتی ہے۔ بعض مقامات پر اس کی گہرائی سترہ سو فٹ تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے اپنے نام کی مقدّس حیثیت قرونِ وسطیٰ میں حاصل کی، جب مارونی راہبوں اور درویشوں نے اس کے غاروں میں پناہ لی۔ قنوبین[1]، جو مارونیوں کے اسقفِ اعظم کا پہلا مرکز تھا، دراصل ایک خانقاہ تھی، جو اس وادی کی ایک سخت چٹان کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ آج کل مارونی پیشوائے اعظم کا گرمائی مقام ایک وسیع محل ہے، جو الدیمان میں ہے۔ یہ وادی قادیشہ کے بالائی حصّے کے پاس واقع ہے، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قادیشہ ندی کا منبع دیوداروں کے جھُنڈ کے پاس ہے۔ اہدن میں ایک اور ندی مار سرکیس[2] آبشار بناتی ہوئی اس میں شامل ہوتی ہے اور جب سمندر سے صرف پانچ میل دور رہ جاتی ہے تو اس ندی کا نام ابو علی ہو جاتا ہے۔ اس کے منبع پر دیوداروں کا جو جھُنڈ ہے وہ دریائے الکلب کے منبع کے جھُنڈ کی طرح لبنان کے قابلِ دید مناظر میں سے ہے۔ اس ندی سے آس پاس کے قصبوں کے لیے بجلی بھی مہیّا ہوتی ہے اور کھیتوں کے لیے آبپاری کا انتظام بھی ہے۔ قصبوں میں طرابلس بھی شامل ہے، جو اس کے دہانے پر واقع ہے۔ پہاڑ کی بلندیوں پر دونوں طرف جا بجا گاؤں نظر آتے ہیں۔ دور سے دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہاڑ کے ساتھ لٹک رہے ہیں کیونکہ اطراف بے حد ڈھلوان ہیں اور یہ اتنی بلندی پر واقع ہیں، جہاں پہنچنا بظاہر دشوار ہے۔ جہاں کوئی اونچائی آجاتی ہے، وہاں کوئی خانقاہ یا مذہبی درس گاہ یا گرجا بنا ہوا ہے۔ ارد گرد درختوں کے جھُنڈ ہیں۔ ان کے درمیان گرجوں کے مینار یا گھنٹوں کے بُرج نظر آتے ہیں، جن سے پورے منظر میں متانت کی ایک شان پیدا ہو جاتی ہے۔

چند میل جنوب میں ایک اور ندی ہے، یعنی نہر ابراہیم[3]۔ قدیم زمانے میں اس کا نام ایڈونس تھا۔

---

[1] یونانی لفظ خانقاہ سے بنایا ہوا سریانی لفظ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خانقاہ شہنشاہ تھیوڈوسیس (۳۷۹ء۔ ۳۹۵ء) نے قائم کی تھی۔

[2] Saint S[illegible]ius

[3] کہا جاتا ہے ابراہیم نام ایک مارونی امیر نے قرونِ وسطیٰ میں اس ندی پر ایک پل بنوایا تھا، جس کی وجہ سے یہ نام پڑا۔

یہ ندی اور اس کی پوری وادی اپنے مناظر کی خوب صورتی کے لیے بہ طور خاص قابلِ ذکر ہے۔ اس کے منبع کے پاس جو بلند پہاڑ ہیں، انھوں نے قدرتاً ایک ایمفی تھیٹر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ایک مشہور مقدس مقام تھا، جسے افاکہ کہتے تھے[1]۔ آج کل یہ افقہ کہلاتا ہے۔ ملٹن نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "نرم رو ایڈونس" اپنے پہاڑ سے نکل کر ارغوانی رنگ میں سمندر تک پہنچتا ہے[2]، یہ تعبیر قطعاً درست نہیں مانی جا سکتی۔ بہرحال نہر ابراہیم لبنان کی ندیوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ رومیوں کے زمانے میں اس کا پانی ایک آبی گزرگاہ کے ذریعے سے جُبَیل (بیبلوس) پہنچایا گیا تھا جس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں۔ جُبَیل سے چھ میل جنوب میں اس ندی پر بجلی پیدا کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا ہے، جو بیروت اور اس کے حوالی کے لیے بجلی مہیا کرتا ہے۔ لبنان کے بعض بہترین مناظر نہر قادیشہ اور نہر ابراہیم کے حلقوں میں واقع ہیں۔

**البقاع** لبنان کے دونوں سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان جو سطح مرتفع ہے، اسے ایک خانہ سمجھنا چاہیے، جس نے ایک بڑے پہاڑ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی مشرقی اور مغربی۔ یہ سطح مرتفع تقریباً ایک سو دس میل لمبی اور چھ میل سے دس میل تک چوڑی ہے۔ اس کی بلندی کا اوسط اڑھائی ہزار فٹ ہے۔ دونوں سروں کے مقابلے میں وسطی حصّہ زیادہ چوڑا ہے۔ موسم بہار میں ہوائی جہاز پر سوار ہو کر اسے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ رنگ برنگا مشرقی قالین ہے، جس میں مختلف خانے بنے ہوئے ہیں۔ طولاً اسے ایک خط قطع کر رہا ہے، یعنی خط لیطانی۔ یہ کتاب یشوع (باب ۱۱، آیت ۱۷) کی وادی لبنان ہے۔ رومیوں اور یونانیوں نے البقاع کا نام نشیبی شام[3] رکھا تھا۔ یہ نام سکندر کی فتح شام کے بعد تجویز ہوا تھا۔ بعد ازاں سلوکیوں اور بطلیموسیوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہوئیں تو نشیبی شام کا نام پورے جنوبی شام کے لیے استعمال ہونے لگا، لیکن رومیوں کے عہد حکومت میں یہ نام صرف نشیبی شام، حوران اور شرق اُردن کے ایک حصّے تک محدود رہا۔ ارضیات کے نقطۂ نظر سے البقاع اس درمیانی نشیب کے وسطی حصّے کے لیے مخصوص ہے، جو شمال میں دریائے عاصی (شام) کے مغربی موڑ سے جنوب میں اُردن اور وادی عربہ سے عقبہ تک آتا ہے یعنی بحیرۂ قلزم کے مشرقی بازو تک۔ عرب مصنفین البقاع کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی کی اور عزیزی۔ بقاع عزیزی کا نام سلطان صلاح الدین کے بیٹے العزیز

---

[1] Aphaca ؎ [2] فردوس گم شدہ۔

[3] Coele-Syria ؎ سٹرابو، کتاب ۱۶، باب ۲، پلنی کتاب ۵، باب ۱۷، بطلیموس، کتاب ۵، باب ۱۵۔

(وفات ۱۱۹۸ء) یا عزیز نام فاطمی خلیفہ (وفات ۹۹۶ء) کی نسبت سے نہیں بلکہ قدیم زمانے کے ایک سامی دیوتا سے ہے جس کا نام عزیزو تھا (عربی میں بمعنی غالب و مقتدر)۔ حوران، تدمر اور آس پاس کے مقامات میں اس کی پوجا ہوتی تھی۔ بقاع بقعہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ٹھہرا ہُوا پانی۔

البقاع میں نشیب و فراز ہیں، لیکن فی الجملہ یہ ایک ہموار میدان ہے۔ اس میں کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ آبیاری کا بھی اچھا انتظام ہے۔ اسے دو ندیاں سیراب کرتی ہیں، جن کے سرچشمے بعلبک کے قریب ہیں۔ دونوں کے سرچشموں کے درمیان صرف ایک میل کا فصل ہے۔ ان میں سے ایک کا نام عاصی ہے، جو منبع سے نکل کر شمالی جانب بہتی ہوئی شام کا سب سے بڑا دریا بن جاتی ہے۔ دوسری ندی لیطانی[۵۱] ہے اور جنوبی جانب بہتی ہے۔ پھر حروب صلیبیہ کے زمانے کے ایک قلعہ بلفورٹ[۵۲] کے نیچے سے یکایک مغربی جانب مُڑ جاتی ہے۔ یہاں سے اس کا نام قاسمیہ[۵۳] ہو جاتا ہے اور یہ صور و صیدا کے درمیان سمندر میں گرتی ہے۔ البقاع میں لیطانی ندی بہت گہری ہو گئی ہے اور وہاں سے اس کا رخ مغرب کی جانب ہوتا جاتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں امریکہ اور لبنان کی حکومتوں کے درمیان ۴ پروگرام کے تحت ایک معاہدہ ہو گیا تھا، جس کا مدعا یہ تھا کہ اس ندی سے بجلی پیدا کی جائے اور آبیاری کا انتظام عمل میں لایا جائے۔ البقاع ملک کا سب سے بڑا مزروعہ خطہ ہے۔ زیادہ تر غلہ پیدا ہوتا ہے۔ رومیوں کے زمانے میں اسے "اناج گھر" کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اوپر دریائی مٹی اور زرخیز چکنی مٹی کی تہ جمی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے پورے خطے میں یہ سب سے اچھی چراگاہ بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی حفاظت کے خاص انتظامات کیے گئے تھے۔ اس کا اندازہ ان بے شمار برجیوں سے ہوتا ہے، جن کے کھنڈر بیروت و دمشق کی شاہراہ سے جا بجا نظر آتے ہیں۔ یہ شاہراہ البقاع کے میدان کو شرقاً غرباً قطع کرتی ہے۔

**مشرقی لبنان**

مشرقی سلسلہ کوہ حمص کے جنوب میں شروع ہوتا ہے۔ یہ بلندی اور طول میں تقریباً مغربی لبنان کے برابر ہے۔ کوہ حرمون کے بعد اس کی بلندی یکایک گھٹ جاتی ہے، جہاں حوران کی سطح مرتفع واقع ہے۔ پھر یہ شرق اُردن میں سے ہوتا ہوا بحیرۂ لوط کے

---

[۵۱] قدیم Leontes دیکھیے رینے دساؤ کی فرانسیسی کتاب نیز ہینری سیمنز کی شائع کردہ کتاب تصریح الابصار فی ما یحتوی لبنان من الآثار طبع دوم بیروت ۱۹۱۲ء جلد ۲ صفحہ ۲۰-۲۳۔

[۵۲] Belfort عربی میں اسے قلعۃ الشقیف کہتے ہیں۔

[۵۳] یہ نام اس وجہ سے پڑا کہ اس کے دہانے کے پاس قاسم نام ایک مسلمان بزرگ کا مزار ہے۔

Marfat.com

جنوب کی طرف چلا جاتا ہے۔ کوہ حرمون لبنان شرقی کا جنوبی گوشہ ہے۔ اس پہاڑ کے ڈھلوان گہرے سبز یا بادامی رنگ کے پتھر کے ہیں۔ مشرقی جانب اس سلسلے کی متعدد شاخیں صحرائے شام میں چلی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کوہ قلموں ہے اور دوسری معلولہ کوہ۔ اسی طرح اور پہاڑ بھی ہیں۔ قرون وسطیٰ کا عربی نام سنیر[۵۱] ابتدائی سامی نام تھا، جو بعض اوقات صرف حرمون کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔

لبنان شرقی کو دریائے بردہ (قدیم ابانہ) قطع کرتا ہے۔ اس کے شمالی حصے کی مغربی طرف بہ مشکل کوئی گاؤں ہوگا اور ایک جنوبی حصہ حرمون ہے، جس کی بلندی نو ہزار تین سو تراسی فٹ ہے۔ اس کے مغربی ڈھلوانوں پر بہت سے دیہات ہیں، جن میں سے بعض دروزیوں کے ہیں۔ لبنان غربی کے مقابلے میں لبنان شرقی خشک اور بنجر ہے، خصوصاً اس کے شمالی و مغربی حصے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیداوار کم ہے اور آبادی بھی زیادہ نہیں، صرف چند ندیاں ہیں، جو سال بھر جاری رہتی ہیں۔ موجودہ جمہوریہ لبنان کی مشرقی حد حرمون پر سے گزرتی اور زبدانی وبلودان[۵۲] کی سیدھی ڈھلوان پہاڑیوں کے گرد گھومتی ہوئی شمالی لبنان شرقی کی چوٹی کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ بردہ کا رخ جنوبی و مشرقی جانب ہے۔ یہ شام کے اس حصے کو سیراب کرتا ہے، جو اس کے بغیر بالکل بنجر رہتا۔ دمشق دراصل اسی ندی کے باعث آباد ہوا! اسے صحرا میں تہذیب کی ایک چوکی سمجھنا چاہیے اور وہ شہرۂ آفاق باغات بھی اسی کی وجہ سے وجود میں آئے، جنھیں الغوطہ کہا جاتا ہے۔

حرمون اپنی وضع و ہیئت اور محل و موقع کے اعتبار سے حد درجہ اہم اور باوقار پہاڑ ہے۔ اس وسیع حلقے میں اسے بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ نام عبرانی ہے، بمعنی مقدس۔ اموری اسے شنیر کہتے تھے اور نوسیقی سریون[۵۳]۔ یہ پہاڑ اس وجہ سے مقدس تھا کہ یہاں ایک بت کا مرکز تھا، جسے بعل حرمون کہتے تھے اور اس کی پرستش عہد نامۂ قدیم کے بعد بھی مدت تک جاری رہی[۵۴]۔ اس کا موجودہ عربی نام الجبل الشیخ[۵۵] ہے۔ عرب جغرافیہ دان اسے جبل الثلج (برف کا پہاڑ) کہتے تھے، جو مشیتر کے ارامی نام "طور تلجیہ" سے ملتا جلتا تھا۔ ادبیات عرب میں اس پہاڑ کا ذکر پہلے پہل حسان[۵۶] بن ثابتؓ کے

---

[۵۱] یاقوت جلد سوم ص۱۷۰ نیز ابوالفدا تقویم البلدان ص۹۵ لیکن یہ بتا دینا چاہیے کہ جغرافیۂ لبنان کے متعلق عربوں کی معلومات نہ جامع تھی، نہ ہر لحاظ سے درست + [۵۲] العمری کی مسالک الابصار فی ممالک الامصار شائع کردہ احمد زکی جلد اوّل طبع قاہرہ سنہ ۱۹۲۴ء ص۳۵۸ + [۵۳] کتاب استثناء باب ۳، آیت ۹ +

[۵۴] کتاب قضاۃ باب ۳، آیت ۳، کتاب تواریخ حصہ اوّل باب ۵، آیت ۲۳ +

[۵۵] بول چال میں جبل الشیخ کہتے ہیں، اس وجہ سے مترجمین نے اس کا ترجمہ "بوڑھے آدمی کا پہاڑ" کیا جو صحیح نہیں دیکھیے ابیل کی فرانسیسی کتاب جغرافیۂ فلسطین جلد اوّل مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۳۳ء ص۳۴۷ + [۵۶] دیوان شائع کردہ ہارگوگ ہرشفیلڈ ص۲۶ +

ایک قصیدے میں آیا، جو محمدؐ رسول اللہ (صلعم) کا شاعر تھا۔ اس پہاڑ کی چوٹی سے اردگرد پہاڑیوں اور وادیوں کا ایک پُرپیچ جال نظر آتا ہے۔ اس کی چوٹی سال بھر برف کی دستار سے مزین رہتی ہے اور اس سے برف کی سفید لہریں ان وادیوں میں گرتی رہتی ہیں[۱]، جو اس کے دامن میں واقع ہیں۔ فلسطین کے بعض مقامات سے یہ صاف نظر آتا ہے۔ عرب شاعر دریائے اُردن کو "لبنان کا فرزند اکبر" کہتے تھے۔ یہ دریائے حرمون کے دامن ہی سے نکلتا ہے۔ مطلع صاف ہو تو اس کی چوٹی سے دمشق اور اس کے باغات، صور، جبل مار الیاس (کارمل)، جلیل کے میدان اور پہاڑیاں، جھیل مولہ اور بحیرۂ جلیل صاف نظر آتے ہیں۔ ایک دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ جس بلند پہاڑ پر حضرت مسیحؑ کی صورت تبدیل ہوئی تھی، وہ یہی ہے، لیکن اس مسئلے کو مابہ النزاع سمجھا جاتا ہے۔

## پہاڑوں کی ساخت

لبنان کے دونوں سلسلوں کی چٹانوں کے سب سے اوپر اور سب سے نیچے کے طبقے چونے کے ہیں۔ بیچ میں ریت کے پتھر کی تہیں موجود ہیں۔ سب سے اوپر کی تہ کسی جگہ موٹائی میں صرف چند سو فٹ ہے، کسی جگہ یہ موٹائی چند ہزار فٹ تک پہنچی ہوئی ہے۔ سب سے نیچے کی سطح نمایاں نہیں، لہٰذا اس کی موٹائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وادیوں کی تہ چونے ہی کے پتھر کی ہے، لیکن بعض مقامات پر یہ پتھر تہ بہ تہ خاصی بلندی پر پہنچ گیا ہے، مثلاً کسروان میں چار ہزار فٹ، توامات نیحا (صیدا کے مشرق میں جزین کے قریب دو توام چوٹیاں) میں سات ہزار فٹ اور کوہ حرمون میں نو ہزار فٹ۔ چونے کے پتھر کی نچلی تہ میں کچے لوہے کے ڈھیلے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان ڈھیلوں کو عام بھٹیوں میں زمانہ حال تک پگھلایا جاتا رہا ہے۔ درختوں سے پہاڑوں کے بڑی حد تک خالی ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے[۲]۔ چونے کے پتھر کی نچلی تہ میں بادامی رنگ کے پتھر کی رگیں بھی ملتی ہیں۔ وادیوں اور گھاٹیوں میں ہر قسم کے اجزا بکھرے ہوئے ہیں یعنی آتشی پتھر بھی، فطری نشوونما سے بدل جانے والا پتھر بھی اور مٹی ملا ہوا پتھر بھی۔

بالائی طبقے کا چونے کا پتھر لبنان میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے اور اس سے منظر میں ایک گونہ پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں جہاں سے سطح کٹ گئی ہے،

---

[۱] کتاب یرمیاہ باب ۱۸، آیت ۱۴۔

[۲] الیفرڈ ای ڈے کی کتاب ارضیات لبنان (انگریزی مطبوعہ بیروت ۱۹۳۰ء) ص ۲۹-۳۰۔

وہاں کھیتی باڑی کا انتظام کر دیا گیا ہے موسم گرما میں سڑکوں پر گرد اڑنے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یہ پتھر مکان بنانے کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ چونے کے پتھر کی بالائی سطح سے بارش کا پانی جذب ہو کر نیچے جاتا ہوا ریت اور مٹی کی ملی جلی تہ تک پہنچ جاتا ہے، جو چونے کی نچلی سطح کے اوپر چھائی ہوئی ہے۔ یہی پانی چشموں کی شکل میں جا بجا پھوٹ نکلا ہے، جو پہاڑوں کے اطراف، میدانوں اور وادیوں میں زندگی کی لہریں بن کر دوڑتا ہے۔

ریتیلے پتھروں کی تہ چونے کی نچلی اور بالائی تہ کے درمیان آ گئی ہے۔ نچلی تہ وہ ہے، جسے ارضیات کی اصطلاح میں کھریا کی تہ قرار دیتے ہیں اور بالائی تہ کا نام اصل چونے کی تہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر، سینا، عرب اور شرق اردن کے ریتیلے پتھر کی رگیں شمالی جانب بڑھ آئی ہیں۔ لبنان کے سلسلۂ کوہ میں اس تہ کی موٹائی چند سو فٹ سے تقریباً ایک ہزار فٹ تک ہے۔ ان تہوں میں کوئلہ بالکل نہیں ملتا، البتہ بھورے رنگ کے کوئلے کی ایک مہین سی تہ پائی جاتی ہے جسے نکال کر ریشم کے کارخانوں میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ریلیں بھی اسی کوئلے سے چلتی رہیں۔ کسروان اور المتن کے ضلعوں میں سطح کے کٹ پھٹ جانے سے چونے کی بالائی سطح بالکل غائب ہو گئی۔ اس وجہ سے ریتیلے پتھر کی تہ اور چونے کی نچلی تہ برہنہ ہو گئیں۔ چونے کی نچلی سطح کا رنگ سرخی مائل خاکی ہے۔ اس میں بہت سے رنگ ملائے جاتے ہیں، جن کا بہترین منظر لبنان اور سیبڑا ہیں۔ لبنان غربی نیز لبنان شرقی کے بعض حصوں میں سطح کے انحلال سے چونے کے پتھر، آتشیں پتھر اور ہیئت بدلی ہوئی چٹانیں بہ کثرت نمودار ہو گئی ہیں، لہٰذا سطح کو زرخیز بنانے کے لیے کھاد وغیرہ کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے۔ ان چٹانوں کے اجزاء مٹی میں مل کر آبیاری سے زمین کو خوب زرخیز بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ پھلوں اور شہتوتوں کے باغوں کی کثرت نے ساحلی میدان کی خوش حالی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

لبنان کا منظر اپنے حسن کی بدولت دنیا کے سب سے زیادہ شاندار مناظر میں سے ہے۔ ایک طرف رنگ برنگ پہاڑیاں ہیں، دوسری طرف سمندر، جس کا اصل رنگ گہرا نیلا ہے، سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو اس کی کیفیت بوقلموں ہو جاتی ہے۔ منظر میں امتیاز مطلع کی صفائی سے پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ بریں افق دور دور تک صاف نظر آتا ہے۔ فضا ہر تکدر سے پاک ہوتی ہے۔ طبعی خط و خال کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ بحر و بر اور کوہ و وادی کے منظر میں اختلاط کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ یہ طبعی حسن ہمیشہ عبرانی اور عربی

Marfat.com

موسیقاروں اور شاعروں پر جادو کا اثر ڈالتا رہا۔ لبنان کے باشندے وطن سے نکل کر دوسری سرزمینوں میں جا بستے ہیں۔ تو اسی جادو کی بدولت وطن سے ان کی انتہائی محبت بدستور قائم رہتی ہے۔

## ارضیاتی کیفیت

لبنان کی شمالی چوٹیوں کے دامن میں جو ایمفی تھیٹر ہے۔ وہاں دیودار کے شہرۂ آفاق جھنڈ بہ کثرت موجود ہیں۔ دانایان ارضیات کا فیصلہ یہ ہے، کہ یہی مقام تاریخ سے پیشتر کے برفستانی دور کا منتہا تھا۔ اس عہد کی برف امریکہ میں تو یادکا تک پہنچی ہوئی تھی۔ شمالی یورپ کو بھی برف کی تہوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن یہ برف کہیں بھی لبنان کے قریب نہیں پہنچی تھی۔ البتہ سردی کی شدت نے مقامی برفستان پیدا کر دیے تھے، اور ایک برفستان اس مقام پر بھی تھا۔ جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔ برف کی اس دبیز چادر کے پھیلاؤ سے بھی بدرجہا زیادہ اہم واقعہ یہ ہے، کہ اس عہد کے متعلق ایسے اجزاء جا بجا ملے۔ جن سے انسان کے وجود کے متعلق پہلی شہادت ہاتھ آئی ہے۔ برفستانی عہد کا آخری اور غالباً سب سے بڑا سلسلہ کوئی دس لاکھ سال پیشتر کا واقعہ سمجھنا چاہیئے، اس دور میں آخری مرحلے پر موسم اتنا گرم ہو گیا تھا۔ کہ برف عارضی طور پر پیچھے ہٹ گئی اور پہلا انسان یورپ میں نمودار ہوا۔ اگر پہلے نہیں تو تقریباً اسی زمانے میں لبنان اور مشرق قریب کے بعض دوسرے حصوں میں بھی انسان کے وجود سے پردہ اٹھا۔

جو کچھ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس سے کئی دور پیشتر بحیرۂ روم کا پانی لبنان سے شمالی ہند تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے، جب زمین ارضیات کے نقطۂ نگاہ سے چونے اور کھریا کے دَور میں تھی۔ طویل مدت تک اس پانی میں شمالی اور جنوبی زمین کے اجزاء گھل گھل کر ملتے رہے۔ یہاں تک کہ پانی کی جگہ زمین نمودار ہوئی اور موجودہ بحیرۂ روم کا مشرقی ساحل سامنے آ گیا۔ لبنان میں چونے کے پتھر کی جو چٹانیں ملتی ہیں۔ وہ بیشتر اسی دور کی ہیں۔ کھریا کے دور کے بعد وہ دور آیا جسے ارضیات کی اصطلاح میں دورِ ثالث کہا جاتا ہے۔ اس دور میں زمین کے اندر وسیع تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جو بحیرۂ روم دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے حدود کم ہو گئے، سمندر کی سطح سمٹ کر اوپر اٹھ آئی، اس طرح نصیریہ کے پہاڑ نیز لبنان غربی و لبنان شرقی اور یہودیہ و عرب کی سطح مرتفع نمودار ہو گئی۔ گویا سمجھنا چاہیئے کہ لبنان کے دونوں کوہستانی سلسلوں کی عمر زیادہ نہیں اور کم عمر

---

[1] جی اد موفین کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ پیرس ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۵۲-۱۵۳۔ ڈے صا ۲

پہاڑوں کی طرح یہ زیادہ ڈھلوان اور سنگستانی ہیں۔ یہی دور ثالث ہے جس میں نہ محض وسیع جغرافیائی تغیرات پیش آئے بلکہ دودھ پلانے والے جانور بھی زمین میں بکثرت نمودار ہوئے۔ ان جانوروں کے جو بچے کھچے اجزاء متحجر ہو کر رہ گئے تھے۔ ان سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کب پیش آیا۔ متحجر مچھلیوں کے جو ڈھانچے ملے ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ وہ ہیں جو ساحل علما (نزد جونیہ) اور حاقل (جبیل[1] سے شمال میں) میں ملے ہیں۔ متحجر مچھلیوں کے متعلق ادبیات میں دو اولین واضح اشارے ایک صلیبی کے سوانح حیات میں ملتے ہیں (۱۲۴۸ء)[2] جس کا موقع اور محل صیدا تھا۔

## پناہ گیروں کے لیے امن

لبنان کے طبقات عموماً مائل، خمیدہ، پیچ در پیچ اور اکثر عمودی، کمتر افقی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جا بجا پہاڑیوں، چٹانوں، ٹیلوں اور ندی نالوں کا انبوہ فراہم ہو گیا۔ اس وجہ سے ملک کے مختلف حصوں کے درمیان آمدورفت اور ربط ضبط میں مشکلات رونما ہو گئیں۔ مزید پیچیدگی اس سبب سے پیدا ہوئی کہ پورا خطہ کٹا پھٹا تھا۔ اور ارضیاتی ادوار میں سطح کے انقباض و انجماد سے زمین کے مختلف حصے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ ایسی سرزمین ان جماعات و افراد کے لیے پناہ گاہیں مہیا کرتی رہی جو رائج معتقدات کے قائل نہ تھے یا اپنے مخصوص معتقدات کی بنا پر طبعی زندگی بسر نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں یہاں بلند وادیوں کے غیر معمولی طور پر بڑے حصے اور ندی نالے تھے۔ جو آس پاس کی آبادیوں کے جفاکش، حریت پسند اور طالع آزما لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے رہے۔ عام مسیحیوں یا عام مسلمانوں سے الگ عقیدہ رکھنے والے مسیحیوں اور مسلمانوں یا ان کے گروہوں کو ان پہاڑوں میں حفاظت کی جگہیں مل گئیں، جب میدان ان کے لیے تنگ ہو گئے تھے۔ وہ ان پہاڑوں میں اب تک موجود ہیں۔ مثلاً مارونی دروزی، شیعہ (متاولہ)۔ نہ صرف مسیحی راہب بلکہ بہت سے مسلمان عابد اور زاہد[3] بھی ان خلوت گاہوں میں پہنچ گئے جنہیں چار سرفراز اور ممتاز پہاڑوں (سادۃ الجبال) کی خلوت گاہیں سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک لبنان ہے۔ دوسرا کوہ سینا اور دو پہاڑ حجاز کے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے، کہ کعبہ پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے تعمیر ہوا تھا۔ ان میں ایک کوہستان لبنان بھی تھا[4]۔

---

[1] جی زوموئین کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ پیرس ۱۹۲۶ء، صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳

[2] جائن دل کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ پیرس ۱۸۶۸ء

[3] المقدسی احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم شائع کردہ گوئیجے مطبوعہ لائیڈن ۱۸۷۷ء، صفحہ ۱۸۸

[4] ابن الفقیہ کتاب البلدان شائع کردہ گوئیجے، لائیڈن ۱۸۸۵ء، صفحہ ۱۹

## تیسرا باب

# آب وہوا، نباتات اور حیوانات

### ہوائیں اور بارش

لبنان کی آب وہوا کا خاصہ یہ ہے۔ کہ وسط نومبر سے وسط مارچ تک بارشیں ہوتی ہیں، باقی سال موسم خشک رہتا ہے۔ ان دو موسموں کے درمیان تھوڑی مدت کے لیے عبوری موسم آتے ہیں جنہیں بہار و خزاں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بارش دسمبر، جنوری اور فروری میں زیادہ ہوتی ہے۔ مارچ میں گھٹ جاتی ہے۔ خشک موسم میں شاذ ہی مینہ برستا ہے۔ اور دریائے نیل میں طغیانی شروع ہونے کے بعد بادل زیادہ ہو جاتے ہیں۔ سال بھر میں موسموں کی یہ واضح تقسیم بحیرۂ روم کے پورے خطے کا خاصہ ہے۔ اصل اس کا سبب یہ ہے۔ کہ یہ خطہ باعتبار بارش دو متضاد خطوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک طرف جنوب میں افریقہ کا صحرائی خطہ، جہاں سے خشک تجارتی ہوائیں آتی ہیں۔ دوسری طرف شمالی خطہ جہاں سے مغربی ہوائیں چلتی ہیں۔ مغربی ہوائیں سمندر سے آتی ہیں۔ اور یہ عموماً اوقیانوس سے شروع ہوتی ہیں۔ اور بحری راستے سے لبنان پہنچتی ہیں۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ جو اپنے ساتھ نمی کے خزانے لاتی ہیں۔ اور عموماً موسم خزاں میں مشرقی بحیرۂ روم تک پہنچتی ہیں۔ سرما میں ان کا زور ہوتا ہے۔ یہ لبنان کے پہاڑوں سے ٹکرا کر اوپر اٹھتی ہیں۔ اُٹھنے سے پھیلتی ہیں۔ اور وہ اپنے ساتھ نمی کی جو متاع لاتی ہیں۔ اُسے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے یہ ہوائیں اندرون ملک کی طرف بڑھتی ہیں۔ ان کی نمی کمتر ہوتی جاتی ہے یوں لبنان کو ان ہواؤں کی نمی کا بہت بڑا حصہ مل جاتا ہے۔ جو کچھ باقی رہتا ہے۔ وہ مشرقی جانب ایران میں کوہ زغروس، کوہ البرز اور عمان میں جبل الاخضر تک پہنچ جاتا ہے۔ خود لبنان میں پہاڑ کی جو ڈھلانیں مغربی جانب واقع ہیں۔ یہ مغربی ہواؤں کے سامنے ہیں، لہذا وہاں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ مشرقی ڈھلانیں آڑ میں واقع ہیں۔ اس لیے بارش کم ہوتی ہے۔ لبنان کے معمار بھی مکان تعمیر کرتے وقت ان ہواؤں کا خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ جنوبی و مغربی دیوار دلا

Marfat.com

میں خوب خشکی پیدا کرتے ہیں، کیونکہ یہ بارش لانے والی جنوبی و مغربی ہواؤں کی زد میں ہوتی ہیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بارش کا اوسط تینتیس انچ ہے، جو برطانوی جزائر کے بعض حصوں کے اوسط سے بڑھا ہوا ہے[1]۔ اور جنوبی کیلیفورنیا کے ساحلی اوسط سے دگنا ہے۔ اختلاف کا ایک اور پہلو بھی ہے، اور وہ یہ کہ لبنان میں پوری بارش چھ مہینے کے اندر اندر ہو جاتی ہے۔ بیروت میں بارش کا سالانہ اوسط ۳۵۶۷۵ انچ ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارش کا درجہ ۱۵۱۶۴ انچ اور کم سے کم ۲۳۶۲۳ انچ ہے۔ الشویر چار ہزار فٹ بلند ہے۔ وہاں ان پچیس سال کا اوسط، جو جولائی ۱۹۲۶ء میں ختم ہوئے، ۵۹۶۷ انچ تھا۔ کسارہ (البقاع) میں بیروت کی یسوعی یونیورسٹی نے موسموں اور ستاروں کی چھان بین کے لیے ایک مرکز قائم کر رکھا ہے۔ وہاں بارش کا سالانہ اوسط ۲۸۶۴ انچ ہے۔ دمشق اور سمندر کے درمیان لبنانی کوہستانوں کی دوہری دیوار حائل ہے۔ وہاں صرف دس انچ بارش ہوتی ہے[2]۔ بارش کا زیادہ زور عموماً جنوری میں ہوتا ہے۔ سمندری ہوا پہنچتی ہے، تو کہرا اور دھند پیدا ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس سے وادیاں اٹ جاتی ہیں۔ اور بلندی سے دیکھا جائے تو وادیاں وسیع جھیلوں کا منظر پیش کرتی ہیں۔ موسم سرما میں سرد ہوا کی لہریں برفستان یوریشیا سے جنوب کی جانب نکلتی ہیں۔ شمالی جانب سے آنے والی ہوائیں، بالخصوص وہ، جو مرکزی اور مشرقی یورپ سے چلتی ہیں، اپنے ساتھ برف لاتی ہیں۔ جو لبنان اور متصل خطوں میں گرتی ہے۔ پہاڑوں پر برف گرنے کا سالانہ اوسط پورے آٹھ مرتبہ ہوتا ہے۔ ۲۹-۱۹۲۸ء میں کسارہ کے مرکز نے اٹھارہ مرتبہ برف گرنے کا ریکارڈ پیش کیا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ دسویں صدی عیسوی کے عظیم القدر عرب شاعر المتنبی کی ایک بیت اکثر سنائی جاتی ہے۔ وہ صحرا سے نیا نیا آیا تھا۔ اور معذرت کے طور پر کہتا ہے: "میں ان بلند پہاڑوں کو سرما میں کیوں کر عبور کر سکتا ہوں۔ جن کے گرما بھی سرما ہوتے ہیں[3]۔" برف عموماً پانچ سو فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے، لیکن زیادہ دیر باقی نہیں رہتی اور سمندر تک نہیں پہنچتی البتہ ۱۹۲۰ء میں ایک غیر معمولی صورتِ حال پیش آئی تھی۔ جب بیروت دو دن برف سے ڈھنپا رہا تھا[4]۔

---

[1] ڈبلیو بی فشر کی انگریزی کتاب شرق اوسط (لندن ۱۹۵۰ء) صفحہ ۹

[2] دیکھیے ڈی ایشبیل کی کتاب "بارش کا نقشہ" فلسطین، شرق اردن، جنوبی شام، جنوبی لبنان تیسرا ایڈیشن، یروشلم ۱۹۴۳ء؛ البنان (بیروت ۱۹۱۶ء) صفحات ۲۰۱-۲۰۲۔ برجرڈ تفومن کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ پیرس ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۲۔

[3] العرف الطیب شائع کردہ ناصیف الیازجی، بیروت ۱۸۸۲ء، صفحہ ۱۲۴۔

[4] چارلس کومبر کی فرانسیسی کتاب، بیروت ۱۹۲۵ء، صفحہ ۱۹۔

## درجہ حرارت

سرما کی بارش اور گرما کی خشکی کے درمیان حدِ فاصل ایک موسم میں بحری ہوائیں ہیں۔ جو مغرب سے آتی ہیں۔ دوسرے موسم میں برّاعظم کی ہوا ہے۔ جو جنوب اور جنوب مشرق سے آتی ہے۔ گرما میں حدت کی لہریں استوائی خطے سے شمالی جانب بڑھتی ہیں۔ یہ بہت خشک ہوتی ہیں۔ اور شمالی و مغربی افریقہ، نیز جزیرہ نمائے عرب میں اپنی گرم و خشک حیثیت قائم رکھتی ہیں۔ مشرقی بحیرۂ روم کی آب و ہوا کا ایک خاصہ یہ ہے۔ کہ مطلع بالکل صاف رہتا ہے۔ فضا میں بادل قطعاً نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے حدت بڑھ جاتی ہے۔ جب یہ ہوا زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ تو لبنانی عام بول چال میں اسے "شلوق" کہتے ہیں۔ یعنی پھاڑنے اور تکلیف دینے والی ہوا۔ مصر میں اس کے ساتھ عموماً ریت بھی آتی ہے اور اسے "خمسین"[1] کہا جاتا ہے۔

مشرقی ہوا بھی ایسی ہی خشک اور گرم ہوتی ہے۔ یہ بحر ہند سے اٹھتی ہے۔ لیکن لبنان تک پہنچتے پہنچتے اس میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ جب یہ نمی سے بالکل خالی ہو جاتی ہے۔ تو پیش نظر خطے کی تمام ہواؤں سے بڑھ کر تکلیف دہ بن جاتی ہے۔ اس کا عربی نام سموم ہے۔ یعنی زہریلی ہوا۔ لبنان میں اسے ترقیہ کہتے ہیں۔ وہاں یہ شاذ ہی تین دن سے زیادہ چلتی ہے۔ شرقیہ ہی سے اطالوی لفظ سرد[2] تو بنا۔ یہ ہوا بعض اوقات بہت شدت اختیار کر لیتی ہے۔ اور گرد و غبار کا طوفان ساتھ لاتی ہے۔ یہی آندھی ہے جس کا ذکر اس خطے کے فوجی تذکروں میں آیا ہے۔ اور مشرق قریب کے صحراؤں میں یہ آندھی موجودہ زمانے کے ہوا بازوں کے لیے ایک ہیبت انگیز آفت کی حیثیت رکھتی ہے۔

بلاشبہ یہ ہوائیں گرما میں مشرقی بحیرۂ روم کا خاصہ ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف یہی ہوا میں چلتی رہتی ہیں۔ خوش نصیبی سے موسم گرما میں جو ہوائیں زیادہ چلتی ہیں۔ وہ شمالی و مغربی ہوتی ہیں۔ مزید برآں سمندر کی وجہ سے اس خطے کا درجہ حرارت معتدل رہتا ہے۔ سمندر گرما میں بہ مقابلہ زمین سرد اور سرما میں گرم ہوتا ہے۔ لبنان کے پہاڑ چونے کے پتھر سے بنے ہیں۔ (آفتاب کی حدت کے باعث) یہ بحیرۂ روم کے پانی سے جلد تر گرم اور غروب کے بعد اسی تیزی سے سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ دن کے وقت زمین سے گرم ہوا اٹھتی ہے۔ پھر سمندر کی سرد ہوا اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ غروب کے بعد ہوائیں دن کے مقابلے میں مخالف سمت سے چلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بیروت میں تقریباً روزانہ بحری ہوائیں آتی رہتی ہیں۔ خصوصاً سرما میں یہ نو بجے صبح پہنچتی ہیں۔ غروب کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد

---

[1] اس کا پورا نام ریح الخمسین ہے۔ کیونکہ یہ پچاس دن چلتی ہے۔ بول چال میں صرف خمسین بولتے ہیں۔

[2] SIRCCO ہے۔

Marfat.com

کبھی چلنے لگتی ہیں۔ اور رات کا زیادہ تر حصہ چلتی ہی رہتی ہیں۔ لبنان کے کسان گرما کے اوائل میں تمام علاقہ کر لیتے ہیں۔ جب شمال مغربی ہوائیں چلتی ہیں۔ لبنان مغربی کی بلندیوں اور ڈھلوانوں پر سطح بحر سے ڈیڑھ ہزار فٹ کی بلندی تک گرما اس درجہ معتدل اور خوشگوار ہوتا ہے۔ کہ یہ خطہ مشرق قریب کا سوئٹزرلینڈ بن گیا ہے۔ شام، فلسطین، مصر، العراق، کویت، البحرین اور سودی عرب سے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ ایک عرب شاعر کوہستان لبنان کا ذکر کرتے ہوا کہتا ہے۔

اس نے سرما کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔
بہار کو کندھوں پر،
خزاں اس کے سینے پر ہے۔
اور گرما اس کے پاؤں میں محو خواب ہے۔

بیروت میں جولائی کا مہینا سب سے زیادہ گرم سمجھا جاتا ہے۔ وہاں فارن ہیٹ کا درجہ ۸۲ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قاہرہ میں ۸۵، اور بصرہ میں ۹۷، لیکن بیروت کے اندر دن اور رات کے درجہ حرارت میں گیارہ سے زیادہ تفاوت شاذ ہی پایا گیا ہے۔ بیروت میں ایک اور قابل ذکر ہے۔ کہ وہاں نسبتہً مرطوبیت زیادہ ہوتی ہے۔ گرما میں بارش قطعاً نہ ہونے کے باوجود مرطوبیت کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس وجہ سے لبنانی دارالحکومت (بیروت) میں انتہائی درجہ حرارت ۹۰، اور مرطوبیت ۳۰ فی صد ہے۔ گویا بیروت دمشق کے مقابلے میں گرما کے اندر کم آرام دہ ہوتا ہے۔ جنوری کا مہینا سب سے زیادہ سرد ہے۔ اس وقت بیروت میں درجہ حرارت ۵۷ فارن ہیٹ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قاہرہ میں ۵۵ کا، اور یروشلم کا ۴۷ ہے۔[1]

**ندی نالے**

بارش کا بہت سا پانی لبنانی چٹانوں کے بڑے بڑے شگافوں میں سے گزرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس میں سے کچھ زیر زمین غاروں میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس طرح قدرتاً ذخیرۂ آب کا انتظام ہو جاتا ہے۔ یہی پانی چشموں کی شکل میں پھوٹ نکلتا ہے۔ اسی قسم کے چشموں پر چھوٹی چھوٹی آبادیاں قائم ہوئیں۔ جو پہاڑ بیروت کے عقب میں ہے۔ اس پر تین میل کے دائرے کے اندر اندر پانچ آبادیاں ایسی ہیں۔ جن کے ناموں میں کسی نہ کسی طرح عین (چشمہ) شامل ہو گیا۔ مثلاً عین الزمانہ، عیناب، عین عنوب، عین کسود

---

[1] دیکھیے لبنان صفحہ ۹۹-۱۰۰

Marfat.com

اندرونی داخیل۔ اسی طرح پھلوں کے باغات بھی پہاڑوں کے قلب میں اسی قدرتی ذخیرۂ آب کے بے شمار چشموں سے سیراب ہوتے ہیں۔ جو آبادیوں کے اندر یا ان کے قریب بہتے ہیں۔ یہ بے شمار چشمے، جو مغربی ڈھلوانوں سے نکلتے ہیں۔ زرخیزی کا ایک یقینی سامان ہیں۔ مشرقی ڈھلوانوں کی کیفیت ایسی نہیں۔ ادھر بکھری بکھری سی چند آبادیاں ہیں۔ یہی کیفیت لبنانِ مشرقی کے دونوں ڈھلوانوں کی ہے۔ اور ان کا بیشتر حصہ آبادی کے قابل بھی نہیں۔

بارش کا جو پانی چوسنے کی زمینوں میں جذب نہیں ہوتا، وہ چوٹیوں اور اطراف سے بہ کر وادیوں میں آگرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ندی نالوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو بارش کے موسم میں تو بڑے زور شور سے بہتے ہیں۔ لیکن گرما آجانے پر بالکل خشک نہیں ہوتے تو کم از کم ان کی حیثیت نہایت معمولی رہ جاتی ہے۔ بلندیوں سے پانی بے پناہ زور کے ساتھ گرتا ہے۔ تو ساتھ ہی زمین کٹ پھٹ جاتی ہے۔ اور ہر قسم کی نباتات جڑ سے اکھڑ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو زمینیں کسی وقت خاص زرخیز تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بالکل بنجر ہو گئیں۔ بارش ہو جائے تو میلوں تک بحیرۂ روم کے ساحلی نالوں کا پانی گدلا نظر آتا ہے۔ اور یہ کیفیت گھنٹوں قائم رہتی ہے۔ پانی میں ملحقہ پہاڑوں کے گوناگوں خطوں کے اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں — درخت جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ پھر جانوروں، خصوصاً بکریوں کے چرانے پر کوئی پابندی نہیں۔ اس طرح زمینوں کا بالائی حصہ نباتی جڑوں کے اس جال سے محروم ہو گیا جو زمین کے مختلف اجزاء کو سنبھالے رہنے کا ذمہ دار تھا۔ ان عوامل پر مستزاد یہ کہ زمین کی کاشت کے دقیانوسی طور طریقے اب تک باقی ہیں۔ جو دورِ قدیم سے زیرِ کاشت چلی آتی ہے —

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ نظریہ درست نہیں کہ مشرقِ قریب میں زمین کی زرخیزی آب و ہوا کے تغیرات کے باعث خشک سالی سے انحطاط پذیر ہوئی۔ تاریخ اس کا کوئی معقول ثبوت پیش نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ پہاڑوں کے اطراف ہواؤں اور بہنے والے پانیوں نے برہنہ کر دیے۔ جنگل کٹ گئے۔ اس وجہ سے وسائل آب و ہوا میں بھی کمی واقع ہو گئی۔

جن ندیوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کے علاوہ دریائے کلب کا خاص ذکر ضروری ہے جو بطانی کے بعد ساحلی علاقے کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اور بیروت کے لیے اس سے پینے کا پانی آتا ہے۔ رومیوں کے زمانے میں شہر کے لیے پانی نہر بیروت سے آتا تھا[1]۔ پرانی نہر کے نشان

[1] اس کا نام اس زمانے میں MAGORAS تھا۔

Marfat.com

اب تک قناطیر زبیدہ میں نظر آتے ہیں۔ اس دریا کا نام دریائے کلب اس لیے پڑا کہ اس کے کنارے کتے کا ایک سنگین مجسمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ جو دہانے کے تاریخی درّے کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ دشمن کی آمد پر یہ کتا چیخ پکار سے پوری آبادی کو متنبہ کر دیتا تھا۔ غالباً عرب "فتوحات" کے بعد بُت شکن مسلمانوں نے یہ مجسمہ پانی میں گرا دیا اور ۱۹۴۲ء تک یہ ڈوبا رہا۔ پھر آسٹریلیا کی سفر مینا نے اسے کھود کر نکال لیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ کتا نہیں بھیڑیا تھا۔ آج کل یہ مجسمہ بیروت کے قومی عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ یونانی اور رومی عہد میں دریا کا نام لائیکس[4] تھا۔ جس کے معنی بھیڑیے کے ہیں۔ سٹرابو[5] کا بیان ہے کہ ارواد کے ملاح اس دریا میں اوپر کی طرف کشتیاں لے جاتے تھے۔ یہ امر قابلِ یقین نظر نہیں آتا، کیونکہ موقع اور محل کشتی رانی کے لیے موزوں نہیں۔ البتہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں دریا کا ڈیلٹا زیادہ طویل تھا۔ دہانے سے مغارۂ جعیتہ تک جو اس کا منبع ہے۔ دریا کا چٹانی بہاؤ پانچ میل سے زیادہ نہیں جعیتہ لبنان کا سب سے بڑا غار ہے۔ جس میں بڑے بڑے ایوان اور ستون موجود ہیں۔ بعض ستونوں کی اونچائی پان سو فٹ ہے۔ حال ہی میں تین میل تک اس کی چھان بین کی جا چکی ہے۔ ایک انگریز پادری سنہ ۱۶۹۶ء[6] میں اس جگہ سے گزرا تھا۔ وہ دریا کا نام ایک مجسمے سے اخذ کرتا ہے۔ جو کتے یا بھیڑیے کا تھا۔ اور لوگ اس کی پوجا کرتے تھے۔ ممکن ہے ابتدائی دور میں کوئی مصری دیوی جانور کی شکل میں یا جانور والے سر کے انسان کی شکل میں دریا کے دہانے پر نصب ہو۔

چند میل جنوب میں نہر ابراہیم[7] بہتی ہے۔ یہ نام قریب کے ایک قصبے کے نام پر رکھا گیا۔ قصبے کا نام دانوراس تھا۔ جو فونیقیوں کے دیوتا ملکرت کا باپ تھا۔ یہ ندی، جس کا منبع عین زحلتہ کے قریب الصفا ہے، دہانے کے محدود میدان کی زرخیزی کا خاص ذریعہ ہے۔ زمانۂ حال تک وہاں شہتوت کے درخت بہ کثرت موجود تھے۔ الصفا سے لبنانی امیر بشیر الشہابی (وفات ۱۸۵۰ء) اس دریا کا پانی بذریعہ نہر

---

[1] یہ غالباً مصری ملکہ زنوبیہ تھی، جسے لوگ کہانیوں میں ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ بنا لیا گیا۔

[2] LYCUS [3] کتاب ۱۶، باب ۲

[4] ہینری منڈریل کی کتاب حلب سے یروشلم تک، ایک سفر" دوسرا ایڈیشن آکسفورڈ ۱۷۰۷ء صفحہ ۳۶

[5] کتاب کے سرورق پر ۱۶۹۷ء درج ہے۔ یہ تفاوت جولین کی تقویم میں گریگوری کی اصلاح کے باعث ہوا۔

[6] مترجم: عجیب انگریز پادری نے ۱۶۹۶ء میں یہ مجسمہ دیکھا تھا تو معلوم نہیں مصنف نے اسے غرق کرنے کا الزام مسلمانوں پر کیوں لگایا۔ [7] تیمیراس TAMYRAS کی بگڑی ہوئی شکل۔ سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲

اپنے دار الحکومت بیت الدین میں لے گیا، جو دیر القمر کے نزدیک ہے اور یہ نہر اب تک جاری ہے۔ مزید جنوب میں الاولی نام ایک ندی بہتی ہے، جس میں پہلے الباروک چشمہ شامل ہوتا ہے۔ آگے چل کر جزین ندی اس میں مل جاتی ہے، جس کی آبشار لبنان بھر میں بہترین ہے۔ قرون وسطیٰ میں اس ندی کا عربی نام الفرادیس اور کلاسیکی نام باسٹرینوس[1] تھا۔ صیدا کے سنگتروں اور مالٹوں کے باغ پورے مشرق قریب میں مشہور ہیں۔ ان کی آبیاری اسی ندی کے پانی سے ہوتی ہے۔

## نباتات

لبنان کی بلندی سطح، زمین کا تنوع، سورج اور بارش سے اس کا تمتع اور عام آب و ہوا، یہ سب چیزیں یہاں قسم قسم کے پودے اور گوناگوں نباتات کے پیدا ہونے کا موقع بہم پہنچاتی ہیں۔ نباتات کا اتنا تنوع ایسے چھوٹے سے خطے میں کہیں نہ ملے گا۔ بعض زاویوں کا رُخ شرقاً غرباً ہے، بعض کا شمالاً جنوباً۔ گویا ان کے مختلف پہلو دھوپ اور بارش سے مختلف درجوں میں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس وجہ سے انواع و اقسام کے پودوں اور جڑی بوٹیوں کی پیداوار کے لیے یہ زمین حد درجہ موزوں ہے۔ ہر دَور میں پیداوار کی فراوانی، اس کے حسن اور اس کے فوائد نے سیّاحوں اور عالموں کے دل میں اس کی مدح و ستائش کا جذبہ اُبھارا۔ عرب جغرافیہ دانوں میں سے الدمشقی[2] نے تیرہ سو عیسوی کے قریب لکھا تھا کہ "کوہستانِ لبنان، خصوصاً اس کی ڈھلانوں اور اس کے دامن میں تقریباً نوّے قسم کے پودے اور جڑی بوٹیاں زراعت کے بغیر قدرتاً ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض بڑی بیش قیمت ہیں، لیکن لوگ مفت حاصل کر سکتے ہیں.... پھلوں کے درخت بہ طور خاص بہ افراط موجود ہیں۔" ہمارے زمانے میں پوسٹ[3] پہلا صاحب علم ہے، جس نے اس موضوع کے متعلق پوری توجہ سے چھان بین کی۔ اس کا اندازہ ہے کہ لبنان اور دو ہمسایہ ملکوں میں ساڑھے تین ہزار مختلف اقسام کے نباتات ہیں۔ پھول والے پودوں میں شقائق النعمان، ڈیزی، گل فردوس (بردق)، پہاڑی کنول اور دفلا[4] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے گوناگوں

---

۱ Bos'renus یہ نام پاس کے ایک گاؤں بسری سے بنایا گیا۔ فرادیس فردوس کی جمع ہے یعنی باغات۔ اولی یعنی پہلا مطلب ہے علاقے کے اوّلین شہر صیدا کے پاس کا دریا۔ صیدا سولھویں صدی عیسوی میں جنوبی لبنان کا مرکز حکومت تھا۔

۲ نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر شائع کردہ اے ایف مہرن سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۵-۶۶ء ص ۱۹۹-۲۰۰

۳ POST جارج ای پوسٹ نے شام، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پھولوں پر ایک کتاب لکھی ہے جس کی پہلی جلد کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

۴ یہ ایک پودا ہوتا ہے جس میں ایک بڑا سا پھول کھلتا ہے۔

Marfat.com

اور چمکتے دمکتے رنگ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ موسم بہار میں ایسی جھاڑیاں اور پودے پیدا ہوتے ہیں جن میں جلد نہایت تیز خوشبو والے پھول نکل آتے ہیں۔ گویا زمین پر جھاڑیوں اور پودوں سے ایک قالین بچھ جاتا ہے۔ پھر اطراف کوہ کے درجہ بدرجہ سبز اور روغنی قطعے خاص شان پیدا کر دیتے ہیں۔ عہد نامۂ قدیم کا ایک غنائی شاعر کہتا ہے: "تیرے لباس میں لبنان کی خوشبو سی ہوئی ہے" اور ایک نبی فرماتا ہے: "اس میں "لبنان کی سی خوشبو" ہوگی"[1] پھول کھلنے کے موسم میں جو چیز حد درجہ دلکش ہوتی ہے، وہ موسم بہار کا پس منظر ہے۔ جب شگوفے حسن کے شباب پر ہوتے ہیں۔ پھر گرما میں حدت کی شدت روئیدگی کو جلا دیتی ہے۔ زمانہ قدیم کا عوامی شاعر اپنی محبوبہ سے التجا کرتا ہوا کیسے پُرتاثیر انداز میں کہتا ہے:

"دیکھو، سرما گزر چکا،
بارشیں ختم ہوئیں، برسات کا موسم جا چکا،
پھول زمین سے نمودار ہو گئے،
طائروں کی زمزمہ سرائی کا وقت آ گیا،
قمری کی صدا ہماری سرزمین میں گونج رہی ہے،
انجیر سے ہرے پھل نکل آئے ہیں،
انگور کی بیل میں چھوٹے چھوٹے دانے بڑی عمدہ خوشبو بکھیر رہے ہیں،
اُٹھ میری محبوبہ! میری پہاڑی محبوبہ! اور یہاں سے چل۔"

## نباتات اور پھولوں کے حلقے

نباتات کے متعدد حلقے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ساحلی میدان اور مغربی ڈھلانوں کے نشیبوں میں وہ پھول بہ افراط نظر آتے ہیں جو بحیرۂ روم کے قریبی علاقوں سے مختص ہیں۔ درختوں میں زیادہ نمایاں کھجور، صنوبر، "ازدرخت"[2] جمیز[3]، ببول، شہتوت، انگور، انجیر، زیتون، کیلا، سنگترہ، مالٹا اور پھلوں کے دوسرے درخت۔ صنوبر یا صنوبر بری نہایت خوش وضع درخت ہے۔ اس کی چوٹی پر گول چھتری ہوتی ہے۔ اہل لبنان اس کی لکڑی سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً ہلکے درختوں کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور بھاری شہتیروں کو ان کچے مکانوں میں چند سال پیشتر تک استعمال کرتے تھے، جن کی چھتیں مسطح ہوتی تھیں۔ کیلا در اصل ملایا اور ہند چینی کا درخت ہے۔ پھر یہ آہستہ آہستہ ہندوستان اور ایران ہوتا ہوا

---

[1] ہوسیع کی کتاب باب ۱۴، آیت ۶ +
[2] Pride of India ایک بلند درخت +
[3] ایک قسم کا انجیر +

Marfat.com

دنیائے عرب میں پہنچا۔ بہشت کے جس شجر کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے،[1] بعض مفسرین اس سے کیلا ہی مُراد لیتے ہیں۔ ادبیات عرب میں اس کی طرف سب سے پہلا اشارہ المسعودی (وفات ۹۵۶ء) میں ملتا ہے۔[2] اس کا عربی نام "موز" دراصل سنسکرت نام "موکا" کا بگاڑ ہے۔ عرب کیلے کو افریقہ کے راستے مغربی ساحل پر لے گئے۔ پھر پرتگیزوں نے اسے "نئی دنیا" (امریکہ) میں پہنچا دیا۔

ماضی قدیم میں پھلوں والے جن درختوں کی کاشت ہوئی ہو گی، جو خشک سالی کا مقابلہ کر سکتے تھے، یعنی انجیر، انگور اور زیتون، یہ تینوں درخت لبنان یا آس پاس ہی کے علاقوں میں موجود ہوں گے، جہاں اب بھی جگہ جگہ خود رو ملتے ہیں۔ کوہستان لبنان کے اطراف میں اکثر حصے ایسے ہیں جہاں یہ دامن سے چار یا پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک پائے جاتے ہیں۔ ماضی قریب تک چوتھا درخت شہتوت تھا۔ انگور کو قدیم لبنانیوں یعنی فونیقیوں نے یونان کی سرزمین میں پہنچایا، وہاں سے یہ اٹلی پہنچا۔ عبرانی نبی نے شراب لبنان کی خوشبو کو سراہا تھا۔[3] انگور کے ساتھ ساتھ زیتون بھی مشرق سے مغرب میں پہنچا۔ پہلی جنگِ عظیم تک شہتوت کی کاشت لبنانیوں کا ایک نفع بخش پیشہ تھی۔ یہ درخت بھیڑ بکری اور گائے بیل ہی کے لیے نہیں بلکہ ریشم کے کیڑے کے لیے بھی غذا بہم پہنچاتا تھا۔

دوسرا حلقہ وہ ہے، جو ایک ہزار چھ سو فٹ کی بلندی سے ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی تک ہے۔ اسے جنگل کا خاص حلقہ کہنا چاہیئے، لیکن آج وہاں درخت کم ہیں۔ اس حلقے میں صنوبر اور شاہ بلوط ہوتے ہیں۔ یہ دونوں سدا بہار ہیں۔ خزاں میں پت جھڑ شروع ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بید، شمشاد، اخروٹ، خرنوب[4] اور ایسے ہی دوسرے درخت موجود ہیں۔ مرطوب مقامات میں ببول بھی ہوتا ہے۔ المتن کی فضا لبنان کے تمام اضلاع میں سب سے بڑھ کر صحت بخش اور خوشگوار ہے۔ اس میں چیڑ کے درخت پائے جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد پھل والے درختوں کی کاشت کو خاص فروغ حاصل ہوا، خصوصاً سیب اور ناشپاتی کی نئی قسمیں امریکہ سے لائی گئیں۔ ساتھ ہی کاشت کے نئے طریقے بھی اختیار کر لیے گئے۔ آج کل شہتوت کے باغات کی جگہ سیب کے باغات نے لی ہے اور تیسرے پھلوں کے لیے مصر، عرب، العراق وغیرہ

---

[1] مصنف نے سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ کی آیات کا حوالہ دیا ہے، جن میں اس شجر کا ذکر ہے جس کا پھل کھانے سے حضرت آدمؑ کو منع کیا گیا تھا۔

[2] مروج الذہب۔ [3] ہوسیع باب ۱۴، آیت ۷۔

[4] ایک خاردار درخت، جس میں سیب جیسا پھل لگتا ہے مگر بدمزہ ہوتا ہے۔ انگریزی میں Carob کہتے ہیں۔

Marfat.com

میں نئی منڈیاں مہیّا ہو گئی ہیں، جہاں تیل کی برآمد اور دوسری صنعتوں کے باعث درجۂ معیشت تدریجاً بلند ہو رہا ہے۔ چونکہ گرما میں بارش بالکل نہیں ہوتی، لہٰذا ان فصلوں کے لیے آبیاری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سورج کی تیز کرنیں لفسیدہ زمین پر روزانہ پہنچتی ہیں اور خشک موسم میں یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، اس لیے پھل خوب پک جاتے ہیں اور ان میں ایک خاص لذّت پیدا ہو جاتی ہے، جس کے باعث وہ اپنے اصل وطن کے پھلوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ جس حلقے کا ذکر ابھی کیا گیا ہے، اس سے کوئی ایک ہزار فٹ کی بلندی پر لبنان کے دو نہایت خوبصورت درخت پائے جاتے ہیں، یعنی سرو اور دیودار۔ وادیٔ قادیشہ میں سرو بہ کثرت ہوتے ہیں۔ جن دیوداروں اور صنوبروں کو عہد نامۂ قدیم کی متعدد آیات میں لبنان سے منسوب کیا گیا ہے[۵۱]، وہ اسی حلقے میں ہوتے ہیں۔

پہاڑوں کا جو حلقہ ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہوتا ہے، وہاں زیادہ درخت نہیں پائے جاتے، البتہ چھوٹے چھوٹے سرو اور دیوار، چھوٹے چھوٹے شاہ بلوط، چھوٹے چھوٹے سدا بہار صنوبر، معمولی جھاڑیاں ہوتی ہیں اور ایک قسم کی بوری یعنی چھوٹی سی جھاڑی، جس میں خوش نما پھول کھلتے ہیں۔

دونوں کوہستانی سلسلوں کے درمیان جو زرخیز سطحِ مرتفع ہے، اسے ایک الگ خطّہ سمجھنا چاہیے۔ یہاں پہلے نیز دوسرے حلقے کے بڑے حصّے کی طرح وہ جنسیں پیدا ہوتی ہیں، جو انسانوں کی خاص خوراک ہیں، مثلاً گیہوں، جَو (شعیر) اور باجرہ (ذرۂ عیفیہ) حزقی ایل نبی کے زمانے کی طرح آج بھی ان تین غلّوں کو پیس کر روٹی کے لیے ملا لیا جاتا ہے[۵۲]۔ البقاع اور شام و فلسطین میں اب بھی گندم اور جَو خود رو ہوتے ہیں۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہیں ان کی کاشت شروع ہوئی ہو گی۔ مکئی (ذرۂ صفرا) بعد میں امریکہ سے لائی گئی۔ مسُور، مٹر اور دوسری دالیں اب بھی مشرقِ قریب کی عام خوراک ہیں۔ لہسن، پیاز، کھیرا، ککڑی اور دوسری سبزیاں ابتدا ہی سے مشرقِ قریب میں عام رہی ہیں۔ ٹماٹر، آلو اور تمباکو امریکہ سے آکر رائج ہوئے۔ دوسرے نباتات میں سے جو مسالے اور دواؤں کے طور پر مستعمل ہیں، قابلِ ذکر یہ ہیں: سویا، خطمیہ، پودنا، صعتر اور پوست (خشخاش)۔ چارے کے لیے باقیہ، کرسنّہ، برسیم اور قصیلہ استعمال ہوتے ہیں۔

---

۵۱ سلاطین حصّہ اوّل، باب ۵، آیت ۸، حصّہ دوم باب ۱۹، آیت ۲۳۔ کتاب زکریاہ باب ۱۱، آیت ۱ +

۵۲ کتاب حزقی ایل باب ۴، آیت ۹ +

لبنانِ شرقی کے حلقوں کی کیفیت جداگانہ ہے۔ یہاں خصوصاً بلند مقامات پر دھوپ تیز ہوتی ہے اور بارش زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے سطحِ مرتفع کی سی کیفیت نمایاں ہے۔ درخت بالکل نہیں ہوتے گھاس کی مختلف قسمیں عموماً خاص موسم میں پائی جاتی ہیں، البتہ چھوٹے چھوٹے پودے اور جھاڑیاں بالعموم موجود رہتی ہیں۔

زمانۂ قدیم میں دونوں لبنان کوہستانوں، خصوصاً مغربی کوہستان پر گھنے جنگل تھے۔ وہ سب ایندھن، مکانوں کی تعمیر اور دوسرے مقاصد کے سلسلے میں کٹ گئے۔ یہی سبب ہے کہ اونچے خطوں کے لیے زمانۂ حال میں لفظ "جرود" رائج ہوا، یعنی بنجر۔ چٹانی کتبات سے واضح ہوتا ہے کہ رومی شہنشاہوں نے خاص علاقوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی، لیکن درخت پہلے بھی کٹتے تھے اور بعد میں بھی کٹتے رہے۔ چونکہ یہاں کے جنگلات تک پہنچنا آسان تھا اور طاقتور ہمسایہ سلطنتوں، مثلاً وادیِ نیل اور وادیِ دجلہ و فرات میں درخت ناپید تھے، اس وجہ سے حملہ آور لبنان کی طرف بطورِ خاص کھچے آتے رہے اور انھیں کی ضرورتیں پوری کرنے میں درخت ناپید ہو گئے۔ گزشتہ صدی کے تیسرے عشرے میں محمد علی پاشا (خدیو مصر) اسی طرح لبنان کے درختوں سے مسحور ہوا تھا جس طرح اس کے فرعون پیشرو چار ہزار سال سے بھی پیشتر مسحور ہوئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں درختوں کی کٹائی اس وجہ سے اور بڑھ گئی کہ عثمانی کارفرما ریلیں چلانے کے لیے بھی لبنان کی لکڑی بے پروایانہ استعمال کرتے رہے۔ اندازہ یہ ہے کہ جنگ کے پہلے تین سال میں لبنان کے ساٹھ فی صد درخت کٹ گئے۔[1] دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ اور فرانس کے کارفرما عکار کی بلندیوں پر متوجہ ہوئے، جہاں درخت موجود تھے۔ انھوں نے یہ درخت کاٹ کر ساحل کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن بنائی۔

**زیتون**

تاریخ اور ادب میں دو درختوں کو لبنان سے خاص وابستگی رہی، یعنی زیتون اور دیودار۔ زیتون مشرقِ قریب کا مقامی درخت ہے۔ اس کے متعلق پہلا ذکر اغاریت (راس الشمرہ) میں پندرھویں صدی قبلِ مسیح میں ملتا ہے۔ تیل کے جو مرتبان تدفین میں استعمال ہوتے رہے، وہ بھی اسی عہد سے متعلق ہیں۔ حضرت نوحؑ نے جو فاختہ اپنی کشتی سے گرد و پیش کا حال معلوم کرنے کے لیے اڑائی تھی، وہ زیتون ہی کا ایک پتا چونچ میں لے کر لوٹی تھی، اسی وقت سے زیتون نشانِ امن چلا آتا ہے۔ بائیبل کے ایک مرتب کے نزدیک فلسطین لودھن زیتون کی

---

[1] لبنان صفحہ ۳۸۳۔

Marfat.com

سرزمین[1] ہے۔ زیتون پر محنت و توجہ بہت کم صرف ہوتی ہے اور فائدہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا پھل نچلے طبقے کی خاص خوراک پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ ایک عوامی مثال ہے: "الزیت عماد البیت" یعنی زیتون کنبے کی زندگی کا ستون ہے۔ روغن زیتون مکھن کی جگہ کھانا پکانے میں مستعمل ہے۔ اسے چراغوں اور لیمپوں میں جلایا جاتا ہے[2]۔ اس سے مرہم اور عطریات بنائے جاتے ہیں[3] اور یہ دیگر دواؤں میں بھی کام آتا ہے[4]۔ چونکہ اسی تیل سے بادشاہوں کا مسح ہوتا تھا اس لیے یہ مقدس سمجھا جانے لگا[5]۔ اس کا گودا جانوروں کو کھلاتے ہیں اور گٹھلیاں جلائی جاتی ہیں۔ عہد قدیم کے ایک نبی نے اس درخت کی خوب صورتی کی تعریف کی تھی[6]۔ اس کی نزاکت و ثمرآوری کا ذکر زبور میں آیا ہے[7]۔ ایک مرتبہ اشجار کی انجمن منعقد ہوئی تھی، جس میں زیتون کی برتری تسلیم کرتے ہوئے اسے سب سے پہلے اشجار کا بادشاہ مانا گیا[8]۔ قرآن مجید میں اسے شجرۂ مبارکہ فرمایا ہے[9]۔ اندازہ یہ ہے کہ موجودہ لبنان کے چونتیس ہزار ایکڑ کے رقبے میں زیتون کے چھ لاکھ درخت ہیں[10]۔ زیتون کا ایک وسیع جھنڈ ضلع کورہ میں ہے؛ دوسرا شویفات میں، جو ہسپانیہ اور جنوبی کیلیفورنیا کے بعد دنیا کے سب سے بڑوں جھنڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس جھنڈ اور سمندر کے درمیان سرخ ریت کا ایک حلقہ آتا ہے، جو لوگ مشرقی جانب کے ٹیلے پر رہتے ہیں، فخریہ کہا کرتے ہیں کہ ہمارے گھروں سے تین سمندر نظر آتے ہیں۔ ایک سبز (زیتون کا جھنڈ)، دوسرا سرخ (ریت) تیسرا نیلا (سمندر)۔

## دیودار

لبنان کے درختوں میں سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ شاندار دیودار ہے، لیکن اب اس کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ رہ گئے ہیں۔ گویا لبنان کے برہنہ سینے پر گلدستے رکھے ہیں۔ دو جھنڈ اُن بلندیوں پر ہیں، جو باروک ندی کے پاس ہیں، وہاں انہیں "ابہل[11]" کہا جاتا ہے۔ ایک عین الزحلتہ اور معاصر کے قریب ہے، دوسرا حدّۃ الجبّہ

---

[1] کتاب استثنا باب ۸، آیت ۸ (مترجم۔ قرآن مجید میں بھی تمام فلسطین کو انجیر و زیتون کی سرزمین کہا گیا ہے)۔ [2] کتاب خروج باب ۲۵، آیت ۶، متی کی انجیل باب ۲۵، آیت ۳۔ [3] خروج باب ۳۰، آیت ۲۵، سموئیل حصہ دوم باب ۱۴، آیت ۲، زبور ۲۳، آیت ۵۔ [4] سموئیل حصہ اول باب ۱۰، آیت ۱، یسعیاہ باب ۱، آیت ۶، مرقس کی انجیل باب ۶، آیت ۱۳، لوقا کی انجیل باب ۱۰، آیت ۳۴۔ [5] زبور ۸۹، آیت ۲۰۔ [6] ہوسیع باب ۱۴، آیت ۶۔ [7] زبور ۱۲۸، آیت ۳۔ [8] قضاۃ باب ۹، آیت ۸۔
[9] سورۂ نور آیت ۳۵۔ [10] علی الطاہر شجرۃ الزیتون ص ۱۳۲، روحی جمیل بیروت الجمہوریۃ اللبنانیہ ص ۶۰۔
[11] یہ لفظ اصل میں سدا بہار صنوبر کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اسے ارز کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

اور اہدین کے اوپر ہے، لیکن تسلیم کر لینا چاہیئے کہ آج یہ درخت لبنان میں اس شان و شوکت سے محروم ہے، جو اسے یسعیاہ نبی کے زمانے میں حاصل تھی (تقریباً ۷۴۳ ق م) :

"اس میں کثرت سے کلیاں نکلیں گی۔ وہ شادمانی سے گا کر خوشی کرے گا۔
لبنان کی شوکت ...... اسے دی جائے گی"[1]

"لبنان کا جلال تیرے پاس آئے گا۔ سرو اور صنوبر اور دیودار سب آئیں گے تاکہ میرے مقدس کو آراستہ کریں"[2]

سب سے زیادہ مشہور جھنڈ لبشاری کے پاس ہے، جس کے نیچے قادلیشہ ندی بہتی ہے۔ یہ تقریباً ساڑھے چار سو درخت ہیں، جو جلالت شان سے سر اٹھائے کھڑے ہیں[3] ہزاروں سیاح اور شائقینِ مناظر دنیا کے مختلف حصوں سے ہر سال ان تک کھنچے چلے آتے ہیں۔ سب سے پہلا سیاح، جس نے ان دیوداروں کا ذکر کیا، ایک فرانسیسی تھا، جو سولھویں صدی کے وسط میں آیا اور ان سے بظاہر متاثر ہوتے ہوئے اس نے کہا: "بلند دیودار ویسے ہی تھے، جن سے سلیمان نے ہیکل تعمیر کیا تھا"[4] ۱۵۷۳ء میں ایک جرمن عالم نباتات نے یہ جھنڈ دیکھا تھا اور اسے صرف چوبیس درخت ملے تھے[5] پھر پوپ کا ایک یسوعی نمائندہ دندینی[6] مارونیوں کے پاس آیا تھا اور ۱۵۹۵ء سے ۱۵۹۶ء تک یہاں رہا۔ اس نے گنتی کی تو صرف تئیس درخت نکلے۔ ۱۶۶۰ء میں ایک فرانسیسی کا شمار بھی یہی تھا[7]۔ اس سے چند سال پیشتر ایک سیاح نے یہ چوبیس درخت دیکھے تھے اور کہا تھا: "یہ جنگلوں کے سب سے بڑے مجاہد ہیں، جن کی چوٹیاں بادلوں کے دامن چومتی ہیں۔ ان کی عظمت کے سامنے دوسرے درختوں کی اونچائیاں ماند پڑ جاتی ہیں"[8]۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں کہا گیا تھا کہ ان وسیع الجحم درختوں میں سے صرف اکیس باقی ہیں[9]۔ والنے[10] ۱۸۶۲ء میں یہاں آیا تھا، لیکن دیوداروں سے بہت

---

[1] یسعیاہ باب ۳۵، آیت ۲ + [2] ایضاً باب ۶۰، آیت ۱۳ + [3] جارج پوسٹ کی انگریزی کتاب "شام و فلسطین کا نباتی جغرافیہ" ص ۳۷۳۶ نیز ردھی کی کتاب ص ۴۲،۴۱ + [4] پیٹر بیلوں دومان کی فرانسیسی کتاب ص ۱۵۳ + [5] لیون ہارڈ راولف کی کتاب ص ۲۲۹ + [6] جیروم دندینی کی کتاب ص ۴۱ +
[7] لاشولیردا آرویو کی فرانسیسی کتاب جلد دوم ص ۴۹ + [8] ولیم لتھگو کی کتاب صفحہ ۱۹۰-۱۹۱ +
[9] ڈے لاراک کی کتاب جلد اوّل ص ۶۸ + [10] والنے کی فرانسیسی کتاب جلد اوّل ص ۲۶۴، جلد دوم ص ۱۶۲ +

Marfat.com

ہی کم متاثر ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ صرف چار پانچ درخت قابلِ توجہ ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کا ایک سیاح برک ہارٹ[51] ۱۸۱۰ء میں یہاں پہنچا تھا، اس نے گنتی کی تو گیارہ یا بارہ درخت بہت پرانے تھے، پچیس بہت بلند تھے، پچاس درمیانے قامت کے، تین سو سے زیادہ چھوٹے اور نوعمر تھے۔ ایک اور یورپی عالم نے ۱۸۵۵ء میں گنتی کی تو کل تین سو ننانوے دیودار نکلے[52]۔ اس سے ایک سال پیشتر ایک امریکی مشنری نے تین سو نوّے درخت گنے تھے، جن میں سے دس یا بارہ بہت بھاری تھے، لیکن ان میں سے بلند ترین درخت بھی اسّی فٹ سے زیادہ اونچا نہ تھا[53]۔ ۱۸۷۰ء کے اواخر میں لبنان کے گورنر جنرل رستم پاشا نے اس جھنڈ کے گرد پتّھر کی دیوار کھچوا دی جس کے مصارف تعمیر میں ملکہ وکٹوریہ نے بھی حصّہ لیا تھا اور بکریوں کی غارت گری سے انھیں محفوظ رکھنے کے لیے محافظ مقرر کر دیے۔ صرف چند ہی درخت ہیں، جن کی عمر ایک ہزار سال ہوگی۔ ان میں سب سے بڑے چھوٹے مارونی گرجے کے قریب ہیں۔ ان میں بلند ترین اسّی فٹ ہے۔ ۱۶۹۶ء میں مانڈریل نے عظیم ترین درخت کی موٹائی ناپی تھی۔ اس کے تنے کا محیط بارہ گز چھ انچ تھا اور اس کی شاخیں ارد گرد سینتیس گز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی درخت کو جمہوریۂ لبنان نے اپنا نشان بنایا۔ زبور میں دیوداروں کے لیے احترام کا اظہار کیا گیا ہے:

"خداوند کے درخت شاداب رہتے ہیں۔
یعنی لبنان کے دیودار جو اس نے لگائے[54]"

لبنان کے موجودہ باشندے بھی انھیں ارز الرّب یعنی خداوند کے دیودار کہتے ہیں، گویا یہ زبور ہی کے احترام کی صدائے بازگشت ہے۔ اس احترام نے ان درختوں کے لیے ایک گونہ تقدّس پیدا کر دیا، جو ان کی حفاظت کا ایک سبب بنا۔ مسیحی جماعتیں ہر سال ان کے سائے میں دعائیں مانگتی ہیں۔ آس پاس رہنے والے کسان ان کے تنوں کو مہلک جراثیم سے محفوظ رکھتے ہیں اور تھم ان کی شاخوں کے نیچے کھڑے کر دیتے ہیں، تاکہ وہ برف کا بوجھ سنبھال سکیں۔ غالباً دیودار ہی کی لکڑی ازمنۂ قدیمہ میں تطہیر[55] کی تقریبوں پر جلائی جاتی تھی۔ اس لکڑی سے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی

---

۵۱ برک ہارٹ کا سفرنامہ شام و فلسطین ص ۱۹ ۔ ۵۲ لیو آنڈر لینڈ کی جرمن کتاب جلد ۱۰ صفحہ ۹۲ +
۵۳ ہنری جیسپ کا بیان بہ حوالہ کرنل ولسن جلد ۲ ص ۲۲ ، نیز جارج ایبرس اور ہرمن گوتھے کی جرمن کتاب جلد ۲ ص ۱۴ + ۵۴ زبور ۱۰۴، آیت ۱۶ + ۵۵ کتاب احبار باب ۱۴، آیت ۴، گنتی باب ۱۹، آیت ۶ +

Marfat.com

علیلیں بنائی جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ ایک راہب بڑے درخت کے تنے میں جا بیٹھا اور اس میں سے جو عرق ٹپکتا تھا، اسی پر زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ خلا اب تک زائروں کو دکھایا جاتا ہے۔ یہی دیودار تھے، جن سے زمانہ قدیم کے لبنانی باشندے بہترین بحری جہاز بناتے رہے۔ شاعروں، نبیوں اور مورخوں نے ان کی عمدگی کے گیت گائے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں، مثلاً قوت کے لیے (زبور ۲۹، آیت ۵)، پائداری کے لیے (یرمیاہ کی کتاب باب ۲۲، آیت ۱۴)، جلال و عظمت کے لیے (سلاطین حصہ دوم، باب ۱۴، آیت ۹، نیز زکریاہ باب ۱۱، آیت ۱-۲)، منبت کاری کی موزونیت کے لیے (یسعیاہ باب ۱۴، آیت ۱۴ و ۱۵)، بلندی کے لیے (یسعیاہ باب ۲، آیت ۱۳، حزقی ایل باب ۱۷، آیت ۲۲)۔ ایک ماہر آثار قدیمہ نے نینوا کے کھنڈروں میں کھدائی کراتے وقت دیودار کا ایک شہتیر نکلوایا۔ اسے جلایا گیا تو درخت کی خوشبو ڈھائی ہزار سال گزر جانے کے باوجود قائم تھی[۱]۔ "کتاب مقدس" میں دیوداروں کے متعلق کئی حوالے ملتے ہیں، مثلاً "بلند اور اونچے دیودار" (سلاطین حصہ دوم باب ۱۹ آیت ۲۳) "اونچے اونچے دیودار" (حزقی ایل باب ۱۷، آیت ۲۲)، "دیودار کی مانند چوٹی" (یسعیاہ باب ۲ آیت ۱۳)۔ یہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ لبنانی اشجار کے اس بادشاہ کو پہلے بھی بہت نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل تھی اور آج بھی حاصل ہے۔

**جانور** مشرقی بحیرۂ روم کے حلقے میں جو جانور عام ہیں، وہ تقریباً سب کے سب لبنان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو امتیاز حاصل نہیں۔ پالتو جانوروں میں سے گدھا، خچر، گھوڑا، بکری، بھیڑ اور گائے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ گھوڑے کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد یہ تمام ایشیائی جانور ہیں۔ اسی طرح مرغے مرغیاں، کتے اور بلیاں ایشیائی جانور ہیں، جن کی تربیت مغربی ایشیا میں ماضی قدیم سے ہو رہی ہے۔ یہیں سے یہ جانور پہلے یورپ، پھر نئی دنیا (امریکہ) میں پہنچے۔ گھوڑا اصل میں امریکہ کا جانور تھا۔ پہلے اس کی تربیت بحیرۂ قزوین کے مشرق میں کسی مقام پر ہوئی۔ پھر یہ حتیوں کے پاس پہنچا۔ مسیح سے ایک ہزار سات سو سال پیشتر اسے ہکسوس نے حتیوں سے لے کر شام، لبنان اور مصر میں متعارف کرا دیا۔ جب تک دور حاضر کی مشینری نے بھاری کاموں کی ذمہ داری نہیں اٹھائی تھی، گدھا ہی حمل و نقل کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ پہاڑی علاقوں میں گدھے کو وہی درجہ حاصل ہے، جو اونٹ کو صحرائی علاقوں میں حاصل ہے۔ گدھے کے

---

[۱] آسٹن لیرڈ کی کتاب متعلق نینوا و بابل ص ۳۵۷۔

Marfat.com

قدم پھسلتے نہیں۔ یہ بڑا مستقل مزاج، قابلِ اعتماد اور صابر جانور ہے۔ کانٹوں اور جھاڑیوں کی معمولی غذا اور تھوڑے سے پانی پر گزارہ کر لیتا ہے اور پہاڑی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اونٹوں کے قافلے بھی قیادت و رہنمائی میں اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔

بکریاں تعداد میں تمام دوسرے پالتو جانوروں سے زیادہ ہیں۔ یہ بھی جنگل میں چل پھر کر گزارہ کر لیتی ہیں۔ سخت اور تلخ پودے بھی چر لیتی ہیں۔ بلکہ وہ ڈنٹھل بھی کھا جاتی ہیں، جنھیں کوئی دوسرا جانور چھوتا تک نہیں، البتہ اونٹ کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ بکریاں بھی قدم جما کر رکھتی ہیں ساتھ ہی بڑی سبک رفتار ہوتی ہیں۔ اتنی بلندیوں پر بے تکلف چڑھ جاتی ہیں، جہاں پہنچنے کا گدھے کو خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی اُون، دودھ اور گوشت پہاڑی باشندوں کے معتدبہ حصے کا واحد ذریعۂ معاش ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بکری زمین کی طبعی دولت بیدردی سے ضائع کر دیتی ہے۔ وہ نو دمیدہ پودے بے تکلف نگل جاتی ہے، جس کے بغیر جنگل قائم ہی نہیں رہ سکتے۔ ۱۹۴۹ء میں لبنان کے کُل جانوروں کی تعداد چار لاکھ اسّی ہزار تھی۔ ان میں سے چار لاکھ صرف بکریاں تھیں۔

بکریوں کے علاوہ لبنان میں دُنبے بھی ہیں، جن کی اُون خاصی لمبی ہوتی ہے۔ یہ نوع زمانۂ قدیم میں ایشیا کے گرم حصے سے براہِ عرب لبنان پہنچی۔ ان کا ذکر "کتابِ مقدس" اور کلاسیکی ادبیات میں بھی آیا ہے[1]۔ مختلف لوگ انھیں سدھا کر ہر وقت ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ انھیں فربہ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ شہتوت کے پتے ہاتھ میں لے کر حلق سے نیچے اتارتے ہیں۔ مصر میں چھٹے شاہی خاندان کے مقبروں پر ایسے پتھر ملے جن پر ان جانوروں کی شکلیں کندہ تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فربہ کرنے کا یہ طریقہ مصرِ قدیم میں بھی رائج تھا۔

جنگلی جانوروں میں سے شامی ریچھ اب تک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں پہاڑی چوٹیوں پر نظر آ جاتے ہیں، خصوصاً لبنان شرقی میں۔ بھیڑیا اور لگڑ بگڑ شاذ ہیں۔ لومڑی اور گیدڑ عام ہیں۔ جن جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے، ان میں سے بہت کم باقی رہ گئے ہیں، مثلاً خرگوش، سیّہ اور کتر ہرن۔ جن پرندوں کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان میں سے تیتر اور جنگلی کبوتر بہ کثرت موجود ہیں۔ اُلو، کوّے، چنڈول اور چڑیاں ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ عقاب اور گدھ کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ خزاں اور بہار کے موسم میں لبنان قسم قسم کے پرندوں سے بھر جاتا ہے۔ ان میں سے خاصی بڑی تعداد موسمی

---

[1] خروج باب ۲۹، آیت ۲۲، احبار باب ۳، آیت ۹، ہیروڈوٹس کتاب ۳، باب ۱۱۳۔

پرندوں کی ہے، جو مشرقی یورپ سے خزاں میں جنوبی جانب نکل پڑتے ہیں تاکہ قدرے گرم فضا میں پہنچ جائیں۔ بہار میں پھر شمالی سمت پلٹ جاتے ہیں۔ لق لق، سلوی، ہوپو، مگس خور (وروار) گلابی رنگ کا ملخ خور، یہ تمام پرندے موسمی ہیں۔ ابابیل اور چیل بہار اور گرما میں مقیم رہتے ہیں۔ دوسرے پرندے مثلاً بٹیر، طائر سیاہ، رابن، لال چڑیا (ابو الحن) وغیرہ صرف خزاں اور سرما میں رہتے ہیں اور مارچ میں شمال کی طرف چلے جاتے ہیں۔ لبنان کے جانوروں میں عقاب سب سے بڑا ہے اور مگس خور سب سے زیادہ خوب صورت۔ ایک کمیاب پرندے کا نام جوز خورہ (خازن البندق) ہے، جو چٹانوں میں رہتا ہے۔ تتلیوں کی دو نہایت دلآویز قسمیں لبنان کی چوٹیوں پر ملتی ہیں، جن میں سے ایک کی مثالیں سائبیریا میں پائی جاتی ہیں، دوسری کی یورپ میں۔ اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قسمیں یکایک برف کے اندازہ پڑ جانے سے یہاں رک گئیں، پھر موسم بدلے، برف پگھلی تو شمال کی طرف جا کر ہم جنسوں میں شامل نہ ہو سکیں۔[1]

مختلف مقامات کے ناموں اور "کتابِ مقدس" نیز ادبیات کے استعاروں سے اس مفروضے کی توثیق ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں یہاں مختلف قسموں کے جانور بہ کثرت موجود تھے۔ مثلاً شیروں کے غار کوہستانِ لبنان و حرمون سے منسوب کیے جاتے ہیں، جنھیں چیتوں کے پہاڑ بھی کہا جاتا ہے۔ عبرانی بادشاہی کے زمانے کے ایک نامعلوم مورخ نے ایک تمثیل بیان کی تھی، جس میں لبنان کے جنگلی جانوروں کا ذکر آیا ہے۔ تمثیل یہ ہے:

> "لبنان کے اونٹ کٹارے نے لبنان کے دیودار کو پیغام بھیجا کہ اپنی بیٹی میرے بیٹے سے بیاہ دے۔ اتنے میں ایک جنگلی جانور، جو لبنان میں تھا، گزرا اور اونٹ کٹارے کو روند ڈالا۔"[2]

شیر، چیتا، تیندوا اور لگڑبگڑ صلیبی دور میں بھی عام تھے۔ مثلاً حما کے میدان میں، جو البقاع سے متصل ہے۔ "اسامہ کی کتاب"[3] سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ تیرھویں صدی کے اختتام پر حرمون میں ایک شیر کے وجود کا ذکر ہوا۔[4] حرمون بیروت کے جنوب مشرق میں ہے۔ ماندریل بیروت میں سے گزرا تھا (۱۶۹۷ء) اس نے فخر الدین کے محل کے سلسلے میں شیر کے ایک غار کا ذکر کیا ہے۔ انسانوں کی آبادی بڑھ گئی تو

---

[1] لبنان صفحہ ۸۵ - ۸۸ ۔ [2] سلاطین حصہ دوم باب ۱۴ آیت ۹ ۔

[3] اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار شائع کردہ فلپ کے حتی صفحہ ۱۰۴ ۔

[4] صالح بن یحییٰ کی کتاب تاریخ بیروت صفحہ ۸۱ - ۸۲ ۔

Marfat.com

جانوروں اور پرندوں کی بعض قسموں کا یا تو استیصال ہو گیا یا وہ ملک کے اندرونی حصّوں میں چلی گئیں۔

**طبعی وسائل** لکڑی اور پانی کے علاوہ لبنان میں اور کوئی قابلِ ذکر طبعی ذخیرہ نہیں پتّھر بے شک ہیں، جنھیں بہ آسانی عمدہ تعمیری سامان کی شکل دی جاسکتی ہے۔ چونے کے پتّھر کو بھٹیوں میں جلا کر گچ بنائی جاسکتی ہے۔ لبنان کے لوگ پہلے بھی ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا نیا کتب خانہ بنا تو اس میں جلا کیا ہوا پتّھر استعمال کیا گیا، جس کی ظاہری وضع سنگِ مرمر کی سی بن گئی۔ اب جگہ جگہ سے ایسے پتّھر نکالے جارہے ہیں۔ مشینیں آگئی ہیں، جن سے پتّھر کاٹنے اور صاف کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یوں اس کام کی طرف لوگوں کی توجّہ زیادہ ہو گئی ہے، لیکن اس قسم کے پتّھروں میں دھاتیں نہیں پائی جاتیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ زمانۂ قدیم میں شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا زیرِ آب تھے۔ جب لبنان اُبھر کر سطح پر آیا تو یہاں چونے اور ریت کے پتّھر کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ رومیوں کے عہدِ حکومت میں لوہا اور کمتر پیمانے پر تانبا لبنان کی کانوں سے نکالا جاتا تھا۔ کتابِ مقدس (بائبل) میں لوہے کے متعلق ایک اشارہ بظاہر لبنان کی جانب ہے[۱]۔ عرب جغرافیہ دانوں نے لکھا ہے کہ بیروت کے پہاڑوں میں لوہا پایا جاتا ہے[۲]، یعنی قریب تک مرجیا سے لوہا نکالا جاتا تھا، جو وادی میں عنتین سے جانب غرب واقع ہے۔ کلاسیکی مصنّفوں[۳] نے عبیدا کے نزدیک اسفالٹ اور رال کا ذکر کیا ہے۔ تانبا بھی عبیدا کے قریب نیز راجمع (کسروان) میں پایا جاتا تھا۔ دھاتوں کو پگھلانے کے لیے جو کوئلہ استعمال کیا گیا، وہ بھی جنگلات کے ناپید ہونے کا ایک سبب تھا۔ رال والا چونے کا پتّھر اور اسفالٹ موجودہ زمانے میں حاصبیّہ کے مقام پر پائے گئے، جو حرمون کے دامن میں جنوب مغرب کی جانب واقع ہے۔ ریت کے پتّھر کی تہوں میں، جن کی موٹائی چند سو فٹ سے ایک ہزار فٹ تک ہے، بھُورے رنگ کے کوئلے کی ایک تہ موجود ہے، جسے زمانۂ حال میں مقامی ریشمی کارخانوں کے اندر ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا۔ نیز پہلی جنگِ عظیم میں اس کوئلے سے ریلیں چلتی رہیں۔ کسروان اور المتن میں چونے کے پتّھر کی بالائی تہ بالکل کٹ پھٹ گئی۔ نیچے سے ریت کے پتّھر کی تہ نکل آئی۔ اس

---

[۱] استثناء باب ۸، آیت ۹ [۲] مقدسی ص ۱۸۴، الادریسی نزہۃ المشتاق ذکر الشام ص ۱۶
[۳] پلنی کتاب ۱۵، باب ۵۱، سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲

سبب سے کوئلہ نکالنے میں آسانی پیدا ہوگئی۔ اس کوئلے کی ایک بڑی کان حیطورہ میں تھی، جو جزین کے جنوب میں ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں پچاس ٹن سے ایک سو ٹن تک کوئلہ روزانہ جنوبی لبنان کی کانوں سے اور تیس ٹن سے چالیس ٹن تک شمالی لبنان کی کانوں سے نکالا جاتا تھا[1]۔ ۱۸۷۰ء میں بھورے رنگ کے کوئلے اور اسفالٹ کی کان کا ٹھیکہ اس ضلع میں دیا گیا تھا۔ لیکن اس کوئلے کی حیثیت اتنی خراب نکلی کہ یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔

---

[1] برطانوی بحریات کی شائع کردہ کتاب متعلق شام ص ۹۲، لبنان ص ۳۸۵۔

## چوتھا باب

# تاریخ سے پیشتر کا دور

**ماحول** مغربی ایشیا اپنے موقع و محل، آب و ہوا اور مقامی پیداوار کے اعتبار سے انسانی نشوو ارتقاء کے لیے ایک مثالی ماحول تھا۔ یہاں گیہوں، جَو اور دوسرے نباتات خود رو تھے۔ اسی طرح وحشی جانور موجود تھے۔ مثلاً بھیڑ، بکریاں اور گائے بیل بھی تھے جنھیں بہ آسانی زیرِ تربیت لایا جاسکتا تھا۔ یہاں چقماق، لوہا اور دوسری سخت چیزیں موجود تھیں، جنھیں بنیادی صنعت و حرفت کے لیے کام میں لایا جاسکتا تھا۔ ابتدائی دور کے انسان کو جو بلند ترمرتبہ حاصل کرنے میں کوشاں تھا، اس سے بڑھ کر سازگار ماحول کی آرزو کیا ہوسکتی تھی۔ پھر یہ ایسا علاقہ تھا، جہاں تین تاریخی برِ اعظم ملتے تھے۔ یہیں انسان نے زرعی، صنعتی اور ذہنی زندگی کی بالکل ابتدائی داغ بیل ڈالی اور اپنی معنوی تکمیل کے نہایت کٹھن سفر کا آغاز کردیا۔ عہدِ حاضر کا ایک عالمِ آثارِ قدیمہ مغربی ایشیا کو انسانِ عاقل کی تربیت گاہ قرار دیتا ہے[۱]۔ لبنان مغربی ایشیا کا ایک مرکزی مقام ہے۔

آثارِ قدیمہ سے اب تک جو کچھ دریافت ہوسکا ہے، اسے پیشِ نظر رکھ لینے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جب سے انسانی زندگی کی ابتدا ہوئی، اس خطّے میں انسان ضرور موجود ہے۔ پتھر کے اوزار بہ کثرت جابجا بکھرے ہوئے ملے، جن میں سے بعض بالکل ابتدائی دور کے تھے۔ وہ سب انسانوں کے وجود کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ انسان غالباً چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے تھے، پورے علاقے میں منتشر تھے اور بڑی مدّت تک اسی حالت میں زندگی بسر کرتے رہے، جس کا صحیح اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔

---

[۱] دیکھیے ہینری فیلڈ کی کتاب شائع کردہ جارج میلوناس جلد اوّل صفحہ ۲۳۶۔

**قدیم حجری دور** تاریخ سے پیشتر کے اس انسان کی ابتدائی جھلک دیکھنے کی ہم کوشش کرتے ہیں تو یہ بطور فرد ہماری گرفت میں نہیں آتا۔ لیکن اس نے مختلف غاروں میں یا روئے زمین پر جگہ جگہ جو آثار و باقیات چھوڑے، وہ اس کی کہانی بخوبی بیان کر رہے ہیں۔

آثار و باقیات حجری اوزاروں کی شکل میں ہیں۔ سب سے پہلے جو اوزار اور ہتھیار اس نے استعمال کیے ان کی شکل بڑی ناشپاتی کی سی تھی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ پتھر کے ٹکڑے کاٹ کر انھیں چھیل لیا گیا تھا اور ان کی دو طرفیں قدرے ہموار کر لی گئی تھیں۔ اسی سبب سے ان کا نام دو منھے مشہور ہوا۔ دستی کلہاڑیوں کے برعکس (جو ان کا پہلا نام تھا) دو منھے نوکدار ہوتے تھے۔ یہ اوزار جنوب میں دریائے اُردن کے طاس سے شمال میں راس الشمرہ (اغاریت) تک جا بجا ملے۔ ان کی دھار سے درختوں کی شاخیں کاٹی جاتی تھیں، کھوپریاں توڑی جاتی تھیں یا ان پر سے کھال اُتاری جاتی تھی۔ انھیں کے ذریعے سے زمین بھی کھودی جاتی تھی۔ یہ عام سنگی اوزار ابتدائی حجری دور کے آخری حصے سے متعلق ہیں۔ جو دو لاکھ سال سے بھی پہلے گزر چکا ہے۔ اسی عہد سے وہ اوزار تعلق رکھتے ہیں، جو پتھر کی تہوں کے ٹکڑوں سے بنائے گئے، یا ممکن ہے ان کا تعلق بعد کے دور سے ہو۔ اوزار بنانے کی ترکیب یہ تھی کہ کوئی چوڑا پتھر دیکھ کر اس پر ضربیں لگائی جائیں، جو ٹکڑا الگ ہوتا، اس کے تیز حصے سے کام لیا جاتا۔ لبنان کے کم از کم تین مقامات اب تک دریافت ہو چکے ہیں، جہاں ابتدائی حجری دور کے باقیات ملے ہیں۔ ایک عقبیہ (عور و صیدا کے درمیانی ساحل پر)، دوسرا کفرتیہ اور تیسرا مدوخہ، جو البقاع میں کوہستان لبنانِ شرقی کے نیچے واقع ہے[1]۔ لیکن وہ مقامات زیادہ ہیں جہاں پہلے حجری دور کے متاخر زمانے کے اوزار ملے، مثلاً عدلون کے غار، جو عور و صیدا کے عین درمیان واقع ہے۔ انطلیاس، نہر الکلب اور نہر ابراہیم کے خطوں میں زموفن نے موجودہ صدی کے اوائل میں چھان بین کی تھی[2]۔ تاریخ سے پیشتر کے اُن شکاریوں نے جو اوزار استعمال کیے، اُن کا تعلق وسطی حجری دور کے اواخر سے تھا۔ اسی زمانے سے جبل مار الیاس (کوہ کرمل) کا تعلق ہے[3]۔ آخری مقام پر ۱۹۲۳-۲۲ء میں جو کھدائی ہوئی، اس سے یہ انکشاف ہوا کہ اس زمانے

---

[1] جی زموفن کی کتاب جلد سوم صفحہ ۴۳۲ - ۴۳۵ +

[2] دیکھیے زموفن کی فرانسیسی کتابیں +

[3] ڈورد تھی گیروڈ اور ڈی، ایم، اے بیٹ کی کتاب جلد اوّل، ابواب ۴-۸، نیز حتی کی تاریخ شام +

Marfat.com

میں مشرقی بحیرۂ روم کے ساحل پر نیانڈرتھل[۱] کی وضع کے لوگ رہتے تھے، لیکن ان کے باب میں کوئی یقینی شہادت دستیاب نہیں ہوسکی۔ جن جانوروں پر ان کی گزارہ تھا، ان کے ڈھانچے متعدد مقامات پر ملے ہیں۔ ان میں سوروں، ارنے بھینسوں، بکریوں، ہرنوں، ریچھوں، گینڈوں اور دوسرے جانوروں کی متحجر ہڈیاں اور دانت بھی ملے، جو اب لبنان سے ناپید ہوچکے ہیں۔ بری اور بحری گھونگے بھی دوسرے باقیات کے ساتھ دستیاب ہوئے ہیں۔ انطلیاس کے غاروں اور نہرالکلب کے منبع سے وہ اوزار ہاتھ آئے ہیں، جن کا تعلق ابتدائی حجری دور کے ابتدائی حصے سے ہے[۲]۔ نہرالکلب کے غار جن کی حیثیت ایک چھتے کی سی ہے، بارہا چھانے جاچکے ہیں۔ ان میں قدیم اور متقابلۃً جدید وضع کی شہادتیں بھی پائی گئی ہیں۔ مزید شمال میں نہرالجوز پر البترون کے قریب اور نہرابوعلی پر نزد طرابلس بھی دیکھ بھال کی جاچکی ہے۔ طرابلس کے نزدیک جو باقیات ملے، ان کا تعلق بھی ابتدائی حجری دور کے آخری حصے سے ہے۔ وہاں سے بارہ سنگے، غزال اور بھیڑیے کی ہڈیاں بھی ملیں۔

## قدیم ترین انسانی ڈھانچا

آثارِ قدیمہ میں سے جو چیزیں اب تک ملیں، ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ایک انسانی ڈھانچا تھا، جو ایک چٹان کی پناہ گاہ میں ملا۔ یہ چٹان انطلیاس سے اوپر کسر عقیل میں ہے، جو بیروت سے چھ میل شمال میں ہے[۳]۔ یہ ڈھانچا ۱۹۳۸ء میں ملا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک ہشت سالہ لڑکے کا تھا، جو پچیس یا تیس ہزار سال پیشتر کا ہونا چاہیے۔ ڈھانچے سے واضح ہوتا تھا کہ یہ موجودہ عہد کے تندرست بچے کے ڈھانچے سے ملتا جلتا تھا۔ چہرہ ویسا ہی تھا، جیسا مشرقی بحیرۂ روم کے باشندوں کا ہوتا ہے۔ لبنان کی سرزمین میں اس سے زیادہ پرانا انسانی ڈھانچا اب تک دریافت نہیں ہوا۔ انطلیاس کے غاروں میں ہرن، لگڑبگڑ، لومڑی، گائے بیل اور بکری کے ڈھانچے بھی ملے ہیں۔ قدیم ترین ڈھانچے گینڈے کے تھے یا موجودہ زمانے کے بعض جانوروں کے، جن کی شکلیں اب سے جزءً مختلف تھیں۔ ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ملیں، جو غالباً گودا نکالنے کے لیے توڑی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ گھونگوں کے خول بھی تھے۔ معلوم ہوتا ہے گھونگے اس سے بہت پہلے کھانے میں مستعمل تھے، جب مذکورہ لڑکے کو دفن کیا گیا تھا۔ بری گھونگے بھی تھے اور بحری بھی۔ شکاری لوگ چقماقی ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ وادی انطلیاس میں

---

[۱] ایک انسانی ڈھانچا فرانس کے ایک مقام نیانڈرتھل سے ملا تھا۔ ویسے ڈھانچوں کو جہاں بھی ملیں، اسی نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

[۲] دیکھیے ایلفرڈ ڈے الکلیہ میں جلد ۱۲ صفحہ ۴۹۶ - ۴۹۹ ؛ [۳] فرینکلن یوانگ رسالہ تھاٹ میں جلد ۲۲ صفحہ ۲۵۵ - ۲۸۸ نیز امریکی جرنل جلد ۴ صفحہ ۲۵۲ - ۲۵۳ - اور المشرق انطلیاس غالباً یونانی ماخذ سے ہے۔ مقامی لوگ اس کا ماخذ الیاس قرار دیتے ہیں۔

Marfat.com

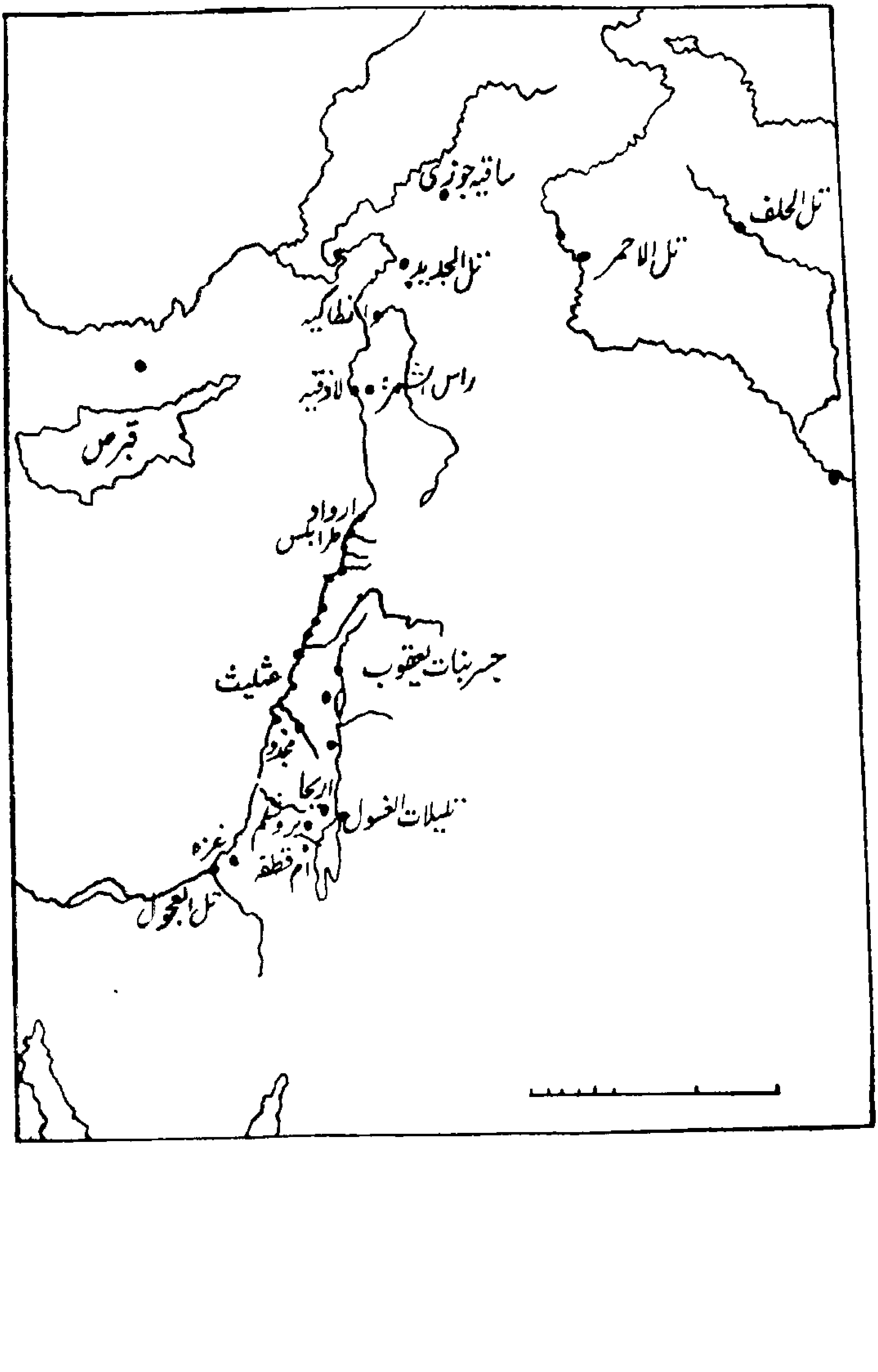
ساقیہ جوزی
تل الجدیدہ
انطاکیہ
راس الشمرہ
لاذقیہ
تل الحلف
تل الاحمر
قبرص
ارواد
طرابلس
جسر بنات یعقوب
عثلیث
مجدو
اریحا
یروشلم
تلیلات الغسول
غزہ
ام قطفہ
تل العجول

Marfat.com

انسانی پونڈ و ماند کی شہادتیں مسلسل دستیاب ہوتی رہیں۔

## زندگی کے طور طریقے

لبنان و فلسطین کے ساحل پر بسنے والا ابتدائی حجری دور کا یہ انسان غاروں میں رہتا تھا۔ یہ پتا بھی چلتا ہے کہ ان انسانوں میں کسی نہ کسی نوع کی اجتماعی زندگی موجود تھی، اگرچہ اس کی حیثیت کتنی ہی معمولی ہو، یعنی وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں یا "گلوں" کی شکل میں رہتے تھے۔ ان کا گزارہ شکار پر تھا، یا وہ چل پھر کر درختوں کے پھل جمع کر لیتے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسی حالت میں رہتے تھے، جس حالت میں قدرت نے انھیں پیدا کیا تھا۔ تاہم ابتدائی دور کے ان انسانوں میں مردم خوری کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ اس دور کی صنعت کاری میں پہلے دور کی صنعت کاری سے کوئی خاص فرق نہ تھا، البتہ ہتھیاروں اور اوزاروں کی جسامت کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ قرن ہا قرن بعد یہ بہت چھوٹے رہ گئے۔ اس زمانے کے انسان اپنے سنگی اوزاروں اور ہتھیاروں کے لیے لکڑی یا ہڈی کے دستے استعمال کرنے لگے تھے۔ غاروں اور چٹانوں میں پناہ لینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ وحشی جانوروں اور دشمنوں سے محفوظ رہیں۔ آب و ہوا کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ابتدائی حجری دور کے انسان نے جو اوزار بنائے، ان کا خاص مقصد تھا اور وہ تمدنی اعتبار سے قدرے بہتر درجے کا پتا دیتے ہیں۔ یہی زمانہ ہے، جس میں ہمیں ایک وضع کے اوزاروں کا ابتدائی سراغ ملا۔ ضرورت نے انھیں مجبور کیا کہ اوزار بنانے کے فن کو ترقی دیں۔ پھر یہ فن نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہا۔ یہ کارنامہ اس وجہ سے حد درجہ دشوار معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس عہد کے انسان کو لکڑی کے میل سکتے کا علم ہو گیا، جس سے وہ مسلسل کام لیتا تھا۔

## آگ اور زبان

ابتدائی حجری دور کی ثقافت میں انسان کے دو اور کارنامے ہیں، جنھیں عہد آفریں کہنا چاہیے۔ ایک آگ کی دریافت، دوسرا اپنے خیالات بولی کے ذریعے سے منتقل کرنے کا نشو و ارتقا۔ ابتدائی دور کے انسان نے شروع ہی میں دیکھ لیا ہو گا کہ بجلی کے گرنے یا شہاب ثاقب کے ٹوٹنے سے آگ لگ جاتی ہے۔ ممکن ہے کسی نہ کسی موقع پر اس نے اس آگ سے فائدہ اٹھایا ہو، لیکن یہ دریافت کرنے میں غالباً ہزاروں سال صرف ہو گئے کہ وہ خود بھی چقماق کے دو ٹکڑوں یا دو سخت پتھروں کو رگڑ رگڑ کر آگ پیدا کر سکتا اور اسے خاص مقاصد کے لیے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اشتعال و التہاب کی قدر و قیمت محض اتنی

ہی نہ تھی کہ اس کے ذریعے سے کھانے تیار ہو سکتے تھے بلکہ سردی زائل کرنے اور وحشی درندوں کو دور رکھنے کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ جلے ہوئے کوئلے کے جو ابتدائی اجزاء مشرقی بحیرۂ روم کے حلقے میں ملے ہیں، وہ جبل مارالیاس کے غار کی نچلی تہ میں تھے۔ ان کا تعلق ابتدائی حجری دور سے تھا، جو اسٹلیاس والے ڈھانچے سے پیشتر گزر چکا تھا۔

آگ کی دریافت کی طرح زبان کا نشوونما ارتقا بھی انسان کے بالکل ابتدائی اور انقلابی کارناموں میں سے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ نشوونما ارتقا کی رفتار بڑی دھیمی ہوگی اور اس میں لمبے اندازہ وقت صرف ہوا ہوگا۔ جب یہ نشوونما پا کر ایک انسان کے خیالات دوسرے تک پہنچانے کا مستقل ذریعہ بنی تو دوسرے کارناموں کے مقابلے میں انسان کی معاشرت پر اس کا اثر سب سے زیادہ پڑا۔ زبان میں علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ انسان کے "حیوانِ ناطق"[۱] بننے سے پیشتر یہ ایسا کارنامہ تھا کہ اس کی اہمیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس عمل کا ایک خاص مقصد و مدعا تھا کہ انسانوں کے درمیان ذہنی تعلق پیدا کیا جائے، چنانچہ زبان نے متفرق افراد کو نہ محض گروہوں کی شکل دی بلکہ انسانوں کے ذہنی اور روحانی نشوونما ارتقا کو بھی بنیادی فائدہ پہنچایا، لیکن اس فائدے کو اس وقت تک ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا تھا، جب تک لکھنے کا فن ایجاد نہ ہوا، اور یہ فن ہزاروں سال بعد وجود میں آیا۔ لہذا زبان کے آغاز کے متعلق چھان بین کے لیے کسی قسم کے آثار نہیں ملے۔

**وسطی اور آخری حجری دور** حجری دور میں مشرق قریب کے انسان کی رفتارِ ترقی جاری رہی اور اس کا یورپی ہم جنس اس سفر میں بہت پیچھے رہ گیا۔ یہ ترقی صرف ابتدائی حجری دور میں نہیں بلکہ وسطی اور آخری حجری دور میں بھی زیادہ تیزی سے جاری رہی۔ باقی خطوں کے انسانی طبقوں نے بھی ترقی کی اور ان میں یورپی خطہ بھی شامل ہے، جس کی آب و ہوا اس وقت تک سازگار نہیں ہوئی تھی اور وہاں کے انسانوں کا انحصار مشرق قریب کی میراث پر تھا۔

وسطی حجری دور ابتدائی اور آخری دوروں کے درمیان ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں انسان نے پتھر کے صیقل کیے ہوئے اوزار کا استعمال کیا۔ مشرق قریب میں حجری دور بہ مقابلہ یورپ پہلے

---

[۱] اس کا مطلب بولنے والا انسان نہیں۔ یہ ناطق یونانی لفظ لوگاس کی تعریب ہے، جس کے معنی ہیں عقیل و فہیم حیوان، صاحبِ ادراک حیوان یعنی انسان۔

شروع ہو گیا، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دونوں باہم اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ انھیں ٹھیک ٹھیک جدا کرنا مشکل ہے۔ وسطی حجری دور تقریباً چھ ہزار سال جاری رہا اور اس کی ابتدا ۱۲۰۰۰ ق م کے آس پاس ہوئی۔ فلسطین میں متاخر وسطی حجری دور کو نطوفی کہتے ہیں۔ نطوفی سے مراد وادیٔ نطوف کے آثار ہیں، جو یروشلم کے شمال مغرب میں واقع ہے اور جس کے غار شقبہ کی کھدائی ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی[۱] اس وقت سے یہ نام (نطوفی) پورے علاقے کے معاصرانہ آثار کے لیے مستعمل ہے۔ نطوفی انسان کی مصنوعات طرابلس اور کسر عقیل کے قریب ملی ہیں۔ ان کا زمانہ وہی ہے، جب پھل والے اوزار بننے لگے تھے۔ پتھر یا چقماق کا پھل لمبا اور متوازی الاطراف ہوتا ہے اور کنارے تیز ہونے کے باعث اس کی شکل چھری کی سی بن جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پھل مختلف ہندسی شکلوں کے بنائے جاتے تھے۔ ان میں تیروں کے پیکان بھی ہوتے تھے اور بعض ایسی چیزیں، جن سے ہڈیوں پر نقش بنائے جاتے تھے[۲] یہ مصنوعات ان جانوروں کی ہڈیوں کے ساتھ ملیں، جو وضع و ہیئت میں ہمارے عہد کے جانوروں سے قریب تر تھے۔ غزال اب بھی بہ کثرت موجود تھے مگر چکارا اب کم رہ گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آب و ہوا میں خشکی بڑھ گئی تھی۔ لگڑ بگھڑ کے جسم پر چتیاں ہوتی تھیں۔ اب اس نوع کا جانور افریقی صحرا کے جنوب میں ملتا ہے۔ خار پشت بھی تھا، لیکن جو چھوٹے کانوں والی نسل اب ملتی ہے، اس سے مختلف تھا[۳]۔ اب نیاندرتھل جیسے انسان کی جگہ ایک نئے نمونے نے لے لی تھی، جس کا قد نسبتہً چھوٹا اور سر لمبوترا تھا۔ نیز اس کا جسم سابقہ انسان جیسا بھاری بھرکم نہ تھا۔ گویا نیا نمونہ جسمانی اعتبار سے حجری و برنجی دور کے اس انسان سے قریب تر تھا، جو آگے چل کر ریلوس میں نمایاں ہوا یا شاہی خاندانوں کے وجود سے پیشتر مصر میں موجود تھا۔ یہ سب انسان غالباً ایک نسل کے تھے۔ اسے سفید فام انسانوں کی وہ شاخ قرار دینا چاہیئے، جو بحیرۂ روم کے آس پاس تھی۔ بعد کے حامیوں اور سامیوں کا تعلق اسی نسل سے تھا[۴]۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے آب و ہوا اور زمین کے طبعی حالات میں زبردست تغیر پیدا ہو چکا تھا، جس نے اسے ویسا ہی بنا دیا تھا جیسی یہ اس وقت ہے۔ وسطی حجری دور کے آخری اور آخری حجری دور کے ابتدائی حصے میں

---

[۱] ڈوروتھی گیروڈ کا مقالہ (۱۹۲۸ء) صفحہ ۱۸۲ - ۱۸۵۔
[۲] دیکھیے ڈوروتھی میکے بیروت یونیورسٹی کے عجائب خانۂ آثار قدیمہ ص۳۔
[۳] گیروڈ اور بیٹ ص۱۵۳۔
[۴] دیکھیے البرائٹ ص۷ اور فلسطین و بائبل کے آثار قدیمہ ص۶۱ و ص۲۳۱۔

Marfat.com

عیقل شدہ اوزار استعمال کیے جاتے تھے، جو چقماق، بسالت اور دوسرے پتھروں سے بنتے تھے۔ یہ چیزیں زیادہ کارآمد تھیں۔ یہی زمانہ ہے، جس میں انسان نے گردوپیش کے طبعی وسائل سے نمایاں حد تک استفادہ شروع کیا۔ مثلاً جو جانور اور پرندے اس کے قریب تھے، ان سے حسبِ منشا کام لینا شروع کیا۔ یہ بھی انسان کا ایک اعلیٰ کارنامہ ہے۔

## جانوروں اور پودوں کی تربیت

وسطی حجری دور کی تہذیب میں انسان نے دو بڑے کارنامے انجام دیے۔ ایک وحشی جانوروں کی تربیت، دوسرا خودرو پودوں کی کاشت۔ اس امر کا کوئی قطعی ثبوت نہیں مل سکا کہ انسان نے خانہ بدوشی کے مرحلے پر پہلے جانور پالے، پھر کھیتی باڑی شروع کی۔ مشرق قریب میں وسطی حجری دور کے کسی آدمی کو غالباً اتفاقیہ جانور پالنے کا خیال سوجھا، لیکن اسے عمل میں لانے پر بڑا وقت صرف ہوا۔ مثلاً ممکن ہے انسان نے کسی جانور کو کھانا کھلایا اور اس کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ جانور نے بدلے میں اپنی خدمات انسان کے حوالے کر دیں۔ مثلاً شکار میں مدد دی، بوجھ اٹھالیا یا دودھ مہیا کر دیا۔ بلاشبہ کتا ہی وہ جانور ہے، جو انسان کے ساتھ سب سے پہلے مانوس ہوا۔ اس وقت انسان کا گزارہ شکار پر تھا۔ شکار اور چوکیداری کے علاوہ کتا شکار کیے ہوئے جانوروں کی اوجھڑیاں بھی کھا لیتا تھا۔ جانور پالنے کی سب سے پہلی شہادت یہ ملی کہ کوہ ماراپاس کے غار میں ایک مکمل کھوپڑی دستیاب ہوئی جو کتے کی تھی[1]۔ اس کے بعد مویشی کی تربیت شروع ہوئی یہاں تک کہ گلے اور ریوڑ بن گئے اور انسان کے لیے تنہا شکار پر گزارہ کرنے کے بجائے خوراک کی فراہمی زیادہ یقینی ہو گئی۔

جب انسان کا گزارہ شکار پر تھا تو ان جانوروں کے پیچھے پیچھے جا بجا پھرتا رہتا تھا، جو شکار کے لائق تھے۔ جانوروں کی تربیت کے ساتھ زندگی کا نسبتہً اعلیٰ درجہ شروع ہو گیا، یعنی گلہ بانی کا دور آ گیا۔ اس میں بھی انسان کو ادھر ادھر پھرنا پڑتا تھا، لیکن اس کی نقل و حرکت محدود ہو گئی اور اسے صرف اس وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا تھا، جب گلے کو چرانے کی ضرورت لے جاتی۔ وسطی حجری دور کے اواخر اور آخری حجری دور کے اوائل میں انسان نے وہ مشغلہ شروع کیا، جس کی وجہ سے نقل و حرکت کی جگہ اس کے طرزِ زندگی میں سکون و استقلال پیدا ہو گیا یعنی کھیتی باڑی شروع ہوئی۔ خودرو پودوں کی کاشت کا امکان

---

[1] گیرووڈ اور بیٹ صفحہ ۱۷۵ — ۱۷۷۔

Marfat.com

بھی اتفاقیہ دریافت ہوا ہوگا۔ غالباً انسان کے پاس خوراک کے لیے کچھ غلہ ہوگا۔ اس میں سے بعض دانے نادانستہ زمین پر اس جگہ گر گئے، جہاں انسان ٹھہرا ہوا تھا۔ کسی عقیل و فہیم آدمی نے موسم بہار میں دیکھا کہ اس جگہ روئیدگی نمودار ہوگئی ہے۔ اس نے یا کسی زیادہ دانش مند انسان نے اپنے ساتھیوں کو اس امر پر راضی کر لیا کہ تھوڑے سے بیج بچا کر نئی نسل کے لیے زمین میں ملا دینے چاہئیں۔ اس طرح دریافت تکمیل پر پہنچ گئی*

نطوفی عہد میں چقماق کی درانتیاں یا چھوٹے چھوٹے پھل ہڈی یا لکڑی کے دستوں میں لگے ہوئے ملے ہیں ان سے گندم کی فصل کاٹی جاتی تھی، البتہ یہ یقینی نہیں کہ یہ بوئی ہوئی تھی یا خود رو۔ آخری حجری دور میں بیل پال کر ہل چلانے کا کام لیا گیا۔ گندم اور جو کی کاشت کے بعد دوسرے غلوں کی کاشت شروع ہوگئی، مثلاً مکئی۔ بعد ازاں پھلوں کے درخت لگائے گئے مثلاً زیتون، انگور اور انجیر۔ اسی طرح مختلف سبزیوں کی کاشت شروع ہوگئی۔ یہ سب چیزیں یہاں میں خود رو موجود تھیں اور ان کی کاشت تاریخی زمانے سے پیشتر شروع ہوگئی تھی، جو انسان پہلے پھر پھر کر خوراک جمع کیا کرتا تھا، وہ اب ایک جگہ بیٹھ کر خوراک پیدا کرنے لگا۔ زندگی کے جس بنیادی تغیر کو انقلابی درجہ حاصل ہے، وہ مشرق قریب ہی کے کسی مقام پر پہلے پہل رونما ہوا تھا۔ مشرق قریب سے غذائی جنسیں پیدا کرنے کا فن یورپ پہنچا۔[۵]*

**حضری زندگی** جانور پالنے کے بجائے کھیتی باڑی انسانی ترقی کی راہ میں زیادہ بڑا انقلابی اقدام تھا۔ زراعت کی ترقی کے ساتھ انسان نے غاروں میں رہنا چھوڑ دیا اور خیموں یا مٹی کی جھونپڑیوں میں رہنے لگا۔ جائے پناہ مل جائے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ نقصان رساں چیزیں روکی جاتی ہیں اور گرد و پیش کے مفید عناصر سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ آبادی بڑھ گئی تو خوراک کے نئے وسائل اور نئی سکونت گاہوں کی ضرورت پیش آئی۔ جھونپڑیوں میں رہنے کے بجائے پتھر کے مکان بننے لگے۔ البتہ یہ پتھر ان گھڑ تھے، گویا جس حالت میں ملے، اسی حالت میں لگا لیے گئے۔ یوں پتھروں کی عمارتیں بنانے کا فن ایجاد ہوا۔ ساتھ ہی زمین کی ملکیت کا تصور رونما ہوا۔ جب تک انسان کا گزارہ شکار پر تھا۔ یا وہ خانہ بدوش گلہ بان کی زندگی بسر کرتا تھا، ایک جگہ جم کر نہیں رہتا تھا اور کسی ماحول کا اس پر کوئی خاص اثر نہ تھا، لہٰذا اس کے تصورات منتشر تھے اور ان میں یکسانی بھی نہ تھی۔ جب وہ جم کر ایک جگہ رہنے لگا تو اس کے تجربات جمع ہونے لگے اور انھیں دوسروں کی طرف منتقل کیا جانے لگا۔ اب ثقافتی روایات نے

---

[۵] "تاریخ سے پیشتر کا انسان" مرتبہ بریڈوڈ صفحہ ۸۰-۹۶*

Marfat.com

ایک نئی شکل اختیار کی۔ وسطی حجری اور ابتدائی حجری دور کے عصری انسان نے غذائی جنسوں کے لیے نہ محض گودام بنانے ہی پر توجہ کی بلکہ افکار بھی آئندہ نسلوں کے لیے میراث میں چھوڑے، آبادی بڑھ گئی۔ خوراک کی بہم رسانی بخوبی ہونے لگی اور انسان کو خاص سرگرمیوں پر متوجہ ہونے کے لیے فرصت مل گئی۔ اس طرح مختلف پیشوں میں اختصاص کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لبنان میں غالباً سب سے پہلی بستی جبیل تھی، فلسطین میں اریحا اور شام میں الجدیدہ ❖

## اعلیٰ زندگی

اجتماعی زندگی کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی افکار کے نشو و ارتقاء کو تحریک ہوئی۔ کسی دیوتا یا دیوتاؤں کا اعتقاد زمین یا قبیلے سے وابستہ ہوگیا اور موت کے بعد بھی کسی قسم کی زندگی کے مبہم تصوّر میں زیادہ وضاحت پیدا ہوگئی۔ نطوفیوں کے قبرستانوں میں خوراک کے برتن اور تبرّدوں کی تعداد میں ملتی ہیں، جن سے حیات بعد الموت کے عقیدے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ یقیناً اس قسم کے تصورات بہت پہلے بھی موجود تھے، اگرچہ مبہم تھے۔ مشرق قریب کا انسان گلّہ بانی کے دور میں چندر دیوتا کا پجاری تھا، جس کی خنک چاندنی میں اس کے جانور بہ اطمینان چرتے رہتے تھے۔ زرعی دور شروع ہوا تو اس کا ذہن فصلوں کے سلسلے میں سورج اور نشو و نما کے تعلق کی طرف متوجہ ہوگیا۔ چنانچہ سورج کی دیوی کے علاوہ خود زمین کی پوجا شروع ہوگئی۔ یہ پوجا زرخیزی کی دیوی سے متعلق تھی۔ زرخیزی کی دیوی کے ساتھ مذہبی نشانات اور اساطیر کا سلسلہ جمع ہونے لگا۔ جس نے فونیقیوں کے زمانے میں ایڈونس اور اشتار کی شکل میں اعلیٰ صورت اختیار کی +

روحانی ارتقاء کے ساتھ وسطی حجری دور کے انسان نے فنی ترقی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہ محض کارآمد چیزوں پر قانع نہ رہا اور ان میں فنی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہڈی یا بحری گھونگوں کے صیقل کیے ہوئے ٹنکے یا آویزے ملے، جن میں سوراخ تھے۔ نیز بادامی رنگ کی مٹی کے ڈھیلے دستیاب ہوئے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کی آرائش کے لیے تھیں۔ مردوں اور عورتوں دونوں نے آرائش کو نصب العین بنا لیا تھا۔ فن کا ابتدائی ظہور جادو اور مذہب دونوں سے وابستہ تھا۔ جانوروں کی مورتیوں کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہوگیا تھا کہ مورتیاں بنانے والوں کو ان چیزوں پر قدرت حاصل تھی۔ ماراباس کے غار سے ایک سانڈ کا سر ہڈی کا بنا ہوا ملا تھا۔ یہ حجری دور کے انسان نے بنایا تھا۔ دیہاتیوں اور کسانوں کو نئے نئے دیوتاؤں کی ضرورت محسوس ہونے لگی، جو ان کے گلّوں اور فصلوں کی نگرانی کر سکیں جن، بھوت اور جادو ٹونے کو اس دور میں زیادہ کارآمد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم ان کے اثرات خود ہمارے زمانے تک مختلف مذاہب میں موجود ہے ❖

Marfat.com

جدید حجری دور اور قدیم حجری دور کے درمیان ہزاروں سال کا فصل ہے۔ اس اثناء میں سطح ارض پر بھی تغیرات رونما ہوئے اور انسان نے بھی ہنرمندی میں خاصی ترقی کر لی۔ جدید حجری دور کے انسان نے اپنے آلات سے بہترین طریق پر کام لینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کے ساتھ مضبوط دستے لگائے، ان کے پھل خوب صیقل اور تیز کرنے شروع کیے اور اپنے میں بعض افراد پر خاص توجہ شروع کی، جس کی بدولت وہ لوگ صنعت میں خاصا اونچا درجہ حاصل کر گئے۔ اب صرف ضرورت ہی بنیاد کار نہ رہی بلکہ جمالیات کے نئے احساسات کی تسکین بھی لازم ہو گئی۔ امریکی یونیورسٹی (بیروت) کے عجائب خانے میں جدید حجری دور کی چیزیں موجود ہیں، جو اس دریائے کلب سے ملی تھیں۔ کچھ ہڈیوں کی مصنوعات صیدا سے ہاتھ آئیں ان میں جا بجا گہرے خط موجود ہیں، جو پتھر کی صیقل شدہ نوکوں سے کھینچے گئے۔ اس زمانے میں انسان نے جانور پالنے، کھیتی باڑی کرنے اور حضری زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں بہت مہارت پیدا کر لی۔ مثلاً وہ جن جانوروں کو شکار کرتا تھا، ان کے چمڑے سے کر پوستین بنانے کا ڈھنگ اس نے سیکھ لیا۔ محض یہی نہیں۔ اس نے نئے راستوں پر گامزنی کی۔ جدید حجری دور میں مشرق قریب کے انسان نے دو اور نئے کارنامے انجام دیے، جو ۵۰۰۰ ق م سے شروع ہو کر تقریباً دو ہزار سال کار آمد رہے۔ مغربی یورپ بہت مدت بعد ترقی کی اس منزل پر پہنچا۔ ان میں سے ایک کارنامہ یہ ہے کہ مٹی کے برتن بننے لگے دوسرا یہ کہ دھات دریافت کر لی گئی۔

## ظروف گلی

مٹی کے برتن بنانے کا خیال غالباً اس طرح آیا ہو گا کہ مٹی سے بنائی ہوئی جھونپڑی میں آگ لگ گئی۔ جب آگ بجھ گئی اور دیکھا گیا تو دیواروں کی مٹی آگ کی تپش سے سخت ہو چکی تھی اور اس میں سے پانی نفوذ نہیں کر سکتا تھا۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ سلسلہ وسطی حجری دور میں شروع ہوا۔ دوسری ایجادات کی طرح اس ایجاد میں بھی اصل قابل توجہ شے یہ نہ تھی کہ اس کا سلسلہ کیوں کر شروع ہوا۔ یہ تھی کہ ان ایجادات کی اہمیت کا اندازہ کر لیا گیا۔ ان سے مسلسل فائدہ اٹھایا جاتا رہا اور اصل ایجاد نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی گئی، جن چیزوں کو جمع رکھنا منظور ہوتا تھا، ظروف گلی کی ایجاد سے پیشتر ان کے لیے بڑے بڑے کدو یا ایسے پتھر استعمال کرتے تھے، جو اندر سے خالی ہوتے تھے۔ تاہم یہ چیزیں ضرورت ٹھیک ٹھیک پوری نہیں کرتی تھیں۔ مٹی کے برتن بننے لگے تو چیزیں ان میں بھر دیتے تھے۔ اس ایجاد نے انسان کے لیے یہ موقع بھی بہم پہنچا دیا کہ ذخیرۂ آب سے کسی قدر فاصلے پر بھی مستقل حضری زندگی بسر کر سکتا تھا۔

Marfat.com

کیونکہ پانی مٹی کے برتنوں میں محفوظ رکھا رہتا تھا۔ وہ غذائی چیزیں کچی کھانے کے بجائے پکا کر کھا سکتا تھا اور جو چیزیں بچ رہتیں انھیں دوسرے وقت کے لیے محفوظ رکھ لیتا تھا۔ پہلا قدم یہ تھا کہ اس نے خوراک مستقل طور پر مہیا کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ اب خوراک کے تحفظ کا انتظام بھی ہو گیا۔ اس اقدام کو ترقی کے راستے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ گلہ بانی کے زمانے میں چل پھر کر غذائی جنسیں فراہم کرتا تھا۔ پھر غذائی جنسیں پیدا کرنے لگا یعنی کاشتکار بن گیا۔ اب اس میں خوراک ذخیرہ کرنے کا بھی سروسامان بہم پہنچا لیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پورا وقت ماکولات کی تلاش کے لیے بھاگ دوڑ میں صرف کرنے کی ضرورت نہ رہی، انسان کو فرصت مل گئی اور یہ وقت اس نے زندگی کے اعلیٰ پہلوؤں ذہنی، فنی، روحانی — ترقیوں پر صرف کرنے لگا۔ پورا معاشرہ اَن پڑھ تھا، لہٰذا شخصیتوں کے درمیان داخلی تصادم کا موقع شاذ ہی پیدا ہو سکتا تھا اور خود بخود ثقافتی تحسین کے بڑے مواقع پیدا ہو گئے۔

فلسطین میں ظروف گری کی ابتدا اریحا کی آبادی کے سب سے نچلے طبقے میں پائی گئی۔ (۵۰۰۰ ق۔م یا اس سے بھی پیشتر)۔ یہاں کھدائی گارسٹانگ[1] نے کرائی، جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ظروف سازی کا فن فلسطین میں ایجاد ہوا۔ اریحا اور بعض دوسرے مقامات کی کھدائی سے جو ظروف برآمد ہوئے، ان کی بدولت فلسطین کے ظروف گری بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ پہلے پہل معمولی برتن بنائے جاتے تھے، جن پر چونے جیسی ایک تہ چڑھا دی جاتی تھی۔ پھر سادہ مرتبان بننے لگے۔ ان کے کنارے بالکل معمولی اور تلے چپٹے ہوتے تھے اور ان میں معمولی موٹھیں لگا دی جاتی تھیں۔ شمالی شام کی ظروف سازی بھی خاصی معروف ہے۔ مٹی کے برتن یہاں پہلے پہل اس حصے سے برآمد ہوئے، جو دجلہ و فرات کے درمیان ہے۔ یہ بھی سادہ ہی تھے اور ان کی ابتدا بھی تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح ہوئی۔ تل الجدیدہ[2] سے، جو انطاکیہ کے شمال مشرق میں ہے، منقش ظروف برآمد ہوئے۔ یہ ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح بنائے گئے تھے۔ ان پر جو نقش و نگار تھے، وہ بہت ہی معمولی اور ابتدائی وضع کے تھے۔ پھر فن ظروف سازی حجری دور کے انسان کی حسِ جمالیات کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔ یہ تمام ظروف ہاتھ سے بنائے جاتے تھے۔ کمہاروں کا چاک کوئی چار ہزار سال قبل مسیح ایجاد ہوا، لیکن اس کے استعمال میں ہنرمندی اور ہمہ گیری کا معاملہ کوئی دو ہزار سال

---

[1] جان گارسٹانگ اور جے بی ای گارسٹانگ کی کتاب اریحہ کی کہانی (The Story of J[illegible]o) صفحہ ۵۲-۵۳۔

[2] رابرٹ بریڈوڈ کی کتاب "میدان انطاکیہ کے تودے" (Mound [illegible] of A[illegible]och) صفحہ ۷۔

Marfat.com

قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اگرچہ صیدا اور جبیل سے برآمد شدہ ظروف سے متعلق ابتدائی چھان بین ہو چکی ہے لیکن لبنانی ظروف کے متعلق ہماری معلومات معمولی ہیں، خواہ اُن کا تعلق بقاع کی چیزوں سے ہو یا ساحلی علاقوں کی چیزوں سے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری ابتدائی لبنانی ثقافت کے متعلق ہمارا علم لبنانی خطے سے باہر برآمد شدہ چیزوں پر مبنی ہے۔ اب تک جن مثالوں کا بخوبی معائنہ ہو چکا ہے، ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ لبنان کے فن ظروف سازی میں کوئی خاص جدت تک نہ تھی۔ یہاں یا تو شمالی ملکوں کے بعض نمونوں کی پیروی کی گئی یا جنوبی ملکوں کی۔ جن شکلوں کے ظروف فلسطین یا شمالی میں بنتے تھے، ویسے ہی ظروف فونیقیہ[۱] میں بننے لگے۔ لبنان سے ابتدائی ظروف کے جو ٹکڑے ملے ہیں، اُن کا تعلق جدید حجری دور سے ہے اور وہ جبیل[۲] سے ملے۔ یہی مقام ہے جو ابتدائی دستاویزوں کے مطابق لبنانی تاریخ کا مرکز تھا۔

ظروف گلی انسان کے لیے خانہ داری کی ضرورتیں پوری کرنے کے علاوہ ضمناً علمی چھان بین کے لیے بھی بے حد مفید ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سراپا فنا نہیں ہوتے، خواہ انھیں توڑ پھوڑ کر بے شمار ریزے بنا دیے جائیں۔ ان کی وضع و ساخت اور آرائشوں سے خاص عہد کے مذاق و مشرب کا مظہر ہے۔ پھر ان ظروف کے پھیلاؤ سے ابتدائی تجارتی تعلقات کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے لہٰذا ان ظروف کا تحقیقی مطالعہ موجودہ دور کے اہل علم کے لیے ایک ایسا دریچہ کھول دیتا ہے جس سے وہ ماضی قدیم کے تاریک ایوانوں کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ظروف سازی اور معدنیات ہمیں اقبل تاریخ کے دور سے اصل تاریخی دور پہنچا دیتے ہیں۔ حقیقی تاریخی دور اس وقت شروع ہوا، جب فن تحریر وجود میں آیا۔

---

[۱] ووے (Wooley) صفحہ ۹۔

[۲] مارس دونا (Maurice Dunand) کی فرانسیسی کتاب جلد اوّل صفحہ ۳۹۰۔

Marfat.com

# پانچواں باب

# دَورِ معدنیات

**نیا عہد** دھات کی دریافت اور بعدازاں اس کے استعمال نے انسان کی ترقی میں ایک نئے اور اہم دور کا دروازہ کھولا۔ یہ معدنیات کا دور تھا۔ دھاتوں میں سب سے پہلے تانبے کا استعمال شروع ہوا، لیکن ہتھیاروں کی ساخت میں خاصی مدت تک پتھر ہی رائج رہا اور تانبے نے پتھر کی جگہ آہستہ آہستہ رواج پایا۔ چونکہ تانبا پتھر کے مقابلے میں نرم تھا اور کوٹ کوٹ کر ہی بے لوچ بنایا جاسکتا تھا۔ اس لیے یہ پتھر پر اُس وقت تک فوقیت حاصل نہ کرسکا، جب تک اس میں دوسری دھات شامل کرکے برنج کی شکل نہ دے دی گئی۔

**برنجی و حجری دَور** مشرق قریب میں دھاتیں ظروف سازی کی ایجاد سے تھوڑی ہی دیر بعد دریافت ہوئیں، لیکن یہ ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک رواج نہ پاسکیں۔ شام و فلسطین میں تانبا چار ہزار سال قبل مسیح کے قریب عام طور پر رائج تھا، لیکن یہ اوزاروں اور ہتھیاروں کے لیے مزید ایک ہزار سال تک پتھر کی جگہ نہ لے سکا۔ چنانچہ چار ہزار سال قبل مسیح اور تین ہزار سال قبل مسیح کی درمیانی مدت کو تانبے اور پتھر کا مشترکہ دور سمجھنا چاہیے۔ اس دور میں تانبا بھی ترقی پسند گروہ استعمال کرتے رہے، لیکن چقماق کی برتری بھی بحال رہی۔ اگرچہ تانبا اپنی خصوصیات کے اعتبار سے پتھر پر فائق تھا، مثلاً یہ زیادہ لچکیلا، تشکیل پذیر اور محکم مادہ تھا۔ غاریت اور شمالی شام کے دوسرے مقامات تیز بیلوس (فونیقیہ) اور تلیلات الغسول میں حجری و برنجی ثقافت کے بہت سے آثار ملے ہیں اور یہی کیفیت متعدد دوسرے مقامات کی ہے۔

تانبے کی کانیں جزیرہ نمائے سینا، عمان اور شمالی شام میں دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ غالباً آخرالذکر مقام میں پہلے پہل تانبا دریافت ہوا، بعدازاں رواج پاگیا۔ غالباً کسی شخص نے خیمہ لگایا اور آس پاس سے مٹی کے ڈھیلے اکٹھے کرکے آگ جلائی۔ ان ڈھیلوں میں تانبے کے

ایجاد تھے۔ دوسرے روز صبح کو وہ جگہ دیکھی، جہاں آگ جلائی گئی تھی تو چھوٹے چھوٹے منکے چمکتے دمکتے نظر آئے۔ یوں اتفاقیہ تانبا دریافت ہوا۔ منکے زیورات کے طور پر پہنے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ اس دھات کے خصائص و فوائد کا اندازہ ہو گیا۔ پھر انسان نے اس سے عام کام لینا شروع کر دیا۔ لیکن ابتدا میں کسے احساس ہوگا کہ یہ ایک انقلاب انگیز سلسلے کی ابتدا ہے، جو پوری ثقافت کی سطح بہت بلند کر دے گی۔ تانبے کے بعد برنج دریافت ہوا۔ پھر لوہے کا سراغ ملا اور فولاد کی مختلف قسمیں بننے لگیں۔ برنجی دور ۲۶۰۰ ق۔م کے آس پاس شروع ہوا۔ بعض لوگ اس کی ابتدا ۳۰۰۰ ق۔م بتاتے ہیں۔ اور یہ ۱۲۰۰ ق۔م تک باقی رہا، پھر وہ آہنی دور شروع ہو گیا جو ۳۰۰ ق۔م پر ختم ہوا۔ ایک لحاظ سے معدنی دور عہدِ حاضر تک باقی رہا، جس سے بجلی اور جوہری توت دریافت ہوئی۔ جدید حجری دور کی طرح برنجی و حجری دور میں بھی شمالی شام ـــ خصوصاً وہ علاقہ جو اسکندرونہ سے منبع فرات تک پھیلا ہوا ہے ـــ مشرق قریب کی ثقافت کا اہم مرکز رہا یہیں سے تانبے کا علم مشرقی جانب ایران، جنوبی جانب فلسطین و مصر پہنچا۔ بیشتر اسی علاقے میں کھیتی باڑی شروع ہوئی تھی اور اسی میں ظروف سازی کا فن ایجاد ہوا +

مشرقی بحیرۂ روم کے علاقے میں انسان کے جو باقیات ملے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے پہل تانبا جنگی ہتھیار بنانے کے لیے استعمال ہوا۔ بعد ازاں اس سے وہ اوزار بننے لگے، جو دورِ امنی کے مقاصد پورے کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہتھیار بنانے کی ابتدا بہت چھوٹے پیمانے پر ہوئی ہوگی، یعنی معمولی ہتھیار بنتے اور چند آدمیوں کو ملتے ہوں گے۔ جب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جن قبیلوں اور گروہوں کے پاس تانبے کے ہتھیار ہوتے تھے، وہ پتھر کے ہتھیار والوں پر غلبہ پا لیتے تھے۔ اس وجہ سے تانبے کے ہتھیاروں کی مانگ بڑھ گئی۔ اسی طرح مقاصدِ امنی کے لیے بھی ان کا استعمال چھوٹی چھوٹی چیزوں میں شروع ہوا ہوگا، مثلاً منکے یا پن۔ رفتہ رفتہ استعمال کا دائرہ وسیع ہوا۔ زراعت کا فائدہ پہنچا۔ ظروف سازی میں چاک نے رواج پایا۔ فنِ تعمیر میں نمایاں اصلاح ہوئی۔ ذرا بڑی عمارتیں بننے لگیں۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں گھر مستطیل بنائے جاتے تھے اور مدفن مدوّر +

**غسولی ثقافت**

تلیلات الغسول[۱] برنجی و حجری دور کا شہر ہے۔ یہ بحیرۂ لوط کے شمال میں تھا۔ اس کے گھروں کی دیواریں رنگی اینٹوں کی تھیں۔ بنیادیں ان گھڑ پتھروں کی

---

[۱] یہاں کھدائی الیکسس میلون (Alexis Mallon) نے کرائی۔ دیکھیے تلیلات الغسول ۱، نیز رابرٹ کوپل (Robert Koeppel) کی تلیلات الغسول ۲ +

Marfat.com

اور چھتوں پر سرکنڈے ڈال کر انھیں مٹی سے لیپ دیا جاتا تھا۔ گھر کا جو پہلو زیادہ طویل ہوتا تھا اس کے آگے صحن رکھتے تھے۔ بچوں کو بڑے بڑے مرتبانوں میں رکھ کر فرش کے نیچے دفن کرتے تھے۔ بعض لاشوں کو جلا دیتے تھے۔ یہ ایسا عمل تھا، جس کی کوئی مثال سامی النسل قبیلوں میں نہیں ملتی۔ مردہ جسموں والے مرتبان سیدھے رکھے جاتے تھے۔ ان میں لاش کو سکیڑ کر ناحل کر دیتے تھے، سر اوپر رہتا تھا۔ جدید حجری دور سے حجری و برنجی دور تک ایسے مرتبان ببلوس میں بھی ملے ہیں[۱]۔ اس وضع کے دوسرے مقامات پر بھی کھدائی ہوئی ہے اور برنجی و حجری دور کی چیزیں نکلی ہیں۔ مثلاً ببلوس اور اغاریت۔ جس محقق[۲] نے ببلوس کے کھنڈروں میں کھدائی کرائی، اُس کا اندازہ ہے کہ یہ ۳۲۰۰ ق۔م کے ہیں اور اس کے نزدیک نہ صرف مشرق بلکہ پوری دنیا میں ممتاز سنگی تعمیرات کا بالکل ابتدائی نمونہ ہیں۔ ببلوس کا شہر خموشاں چوتھے ہزار سال کے نصفِ اوّل کا ہے۔ غسولی ثقافت نے زراعت اور پرورش حیوانات میں خاصی ترقی کی۔ انسان نے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے اور اسے اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ گائے بیل اور بھیڑ بکریوں کی پرورش جدید حجری دور میں شروع ہوئی تھی۔ اب ان سے فائدہ اُٹھانے کا سلسلہ عام ہو گیا، جیسا کہ مختلف مجسموں اور مورتیوں سے واضح ہوتا ہے۔ اسی دور میں فصلوں کے لیے آبیاری کا سلسلہ شروع ہوا، نیز مختلف قسم کی سبزیاں کاشت ہونے لگیں، مثلاً سلاد، پیاز، لہسن، مٹر، لوبیا اور مختلف مسالے۔ غذائی جنسوں میں تنوع اور مقدار کے اعتبار سے جو اضافہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برنجی و حجری دور کے انسان کا قد بڑھ گیا۔ چونکہ اس دور کے آدمیوں کی زیادہ تر آبادی وادیوں یا دریائی میدانوں میں تھیں، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنی فصلیں پانی سے سیراب کرتے تھے۔

**نسلی روابط** شمالی شام، فلسطین اور لبنان کی آبادی کی نسلی ترکیب جدید حجری دور سے بنیادی طور پر وہ رہی، جسے بحیرۂ روم کی نسل کہا جاتا ہے۔ اس کے جو آثار الشقبہ، مغارۃ الوادی (پانچ ہزار سال قبل مسیح سے بیشتر) تل الجدیدہ (چار ہزار سال قبل مسیح سے بیشتر) اور ببلوس (۳۵۰۰ ق۔م تا ۳۲۵۰ ق۔م) سے نکلے ہیں۔ ان سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مشرقی بحیرۂ روم کے حلقے کا یہ سب سے پہلا اور بنیادی نسلی عنصر تھا۔ دراصل

---

۵[۱] کلاڈ ایف، اے شیفر ( Schaeffer ) کا مقالہ سیریا ( Syria ) جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۱-۱۱۲ +

۵[۲] دونا ( Dunand ) کی فرانسیسی کتاب جلد اوّل صفحہ ۲۹۵ - ۲۹۶ +

یہی نمونہ ہے، جس سے شمالی افریقہ (مصری حامی) اور جنوبی یورپ (ہسپانیہ و پرتگال، فرانس، اٹلی، یونان اور آس پاس کے جزیروں کے وہ باشندے جو ہندی یورپی نسل سے پہلے موجود تھے) کے قدیم سفید فام باشندوں کا تعلق تھا۔ یہ نسل ان انسانوں سے بالکل مختلف ہے، جن میں سے ایک کی لاش کوہ ماراس سے ملی تھی، یعنی انسٹلیا یاسی آدمی۔ یہ آدمی مشتیر کے زمانے کا تھا اور اس کے خط و خال ایک حد تک ہیولی تھے۔ بحیرہ روم کی نسل کا انسان سفید فام تھا اور اس کا تعلق قفقازی نسل سے تھا۔ قد عموماً چھوٹا، اڑ بلکا پھلکا یا درمیانہ اور ٹانگیں دھڑ کے مقابلے میں لمبی، سر لمبوترا، بال سیاہ یا سیاہی مائل اور سر کا بالائی حصہ شاذ ہی سر کے بالوں سے خالی دیکھا گیا۔ سامیوں کا تعلق بھی اسی نسل سے تھا، لیکن وہ ابھی یہاں پہنچے نہ تھے، البتہ ان میں ایک رگ ایسی تھی، جسے اس نسل سے مختلف سمجھنا چاہیئے۔ یہ رگ ارمنی نمونے سے متعلق تھی، جسے الپائنی نسل کی مشرقی شاخ کہنا چاہیئے۔ یہ وہ کوہستانی نمونہ ہے، جو کوہستان الپس سے قفقاز تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں حوریوں، حتیوں اور اشوریوں کے قدیم نمائندے بھی شامل ہیں اور موجودہ دور کے یہودی، کرد اور ارمن بھی۔ یہ قفقازی نسل ہے، لیکن ناکیں نمایاں، کھوپڑی چوڑی اور چھوٹی۔ جزر (تل الجزر[1])، فلسطین کے دوسرے مقامات، نیز کرشمش (جرابلس) اور شمالی شام کے مختلف مقامات پر جو کھدائیاں ہوئیں، ان سے برآمد شدہ باقیات مذکورہ نمونے سے بالکل مشابہ ہیں۔ اغلب ہے، بعض ارمن گروہ برنجی و حجری دور میں الشیائی کوہستانوں سے اتر کر جنوبی سمت چلے آئے ہوں اور یہاں بحیرہ روم کی جو نسل موجود تھی، اس پر مسلط ہو گئے ہوں۔ یہ لوگ ان کے پیشرو تھے، جو تاریخی زمانوں میں آتے رہے۔ دمشق یا ارواد (ارادوس) کے ناموں کا سامی اشتقاق یقینی نہیں۔ یہ مقامات پندرھویں صدی قبل مسیح سے پیشتر ادبیات میں مذکور نہ ہوئے۔ غالباً یہ سامیوں سے پہلے کے اسماء کا بقایا ہیں۔

اگرچہ بعد میں بھی مختلف نسلوں سے امتزاج کا سلسلہ جاری رہا، مثلاً حتیوں سے، تاہم ارمنی نمونے کے ممتاز خط و خال اب بھی نمایاں ہیں، خصوصاً لبنانی کوہستانوں میں۔ کھوپڑیوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارونیوں اور دروزیوں کے سر عموماً چھوٹے اور گول ہوتے ہیں، (سر کا انڈکس ۸۰-۸۷) اور اکثر صورتوں میں سر کا پچھلا حصہ واضح طور پر چوڑا[2]۔ سر کے پچھلے حصے کو

---

[1] آر۔ ایچ میکالسٹر (Macalister) کی کتاب (The Excavation of Gezer) جلد اول صفحہ ۵۸، ۵۹۔

[2] ولیم ایم شینکلن (Shanklin)، امریکن اورینٹل سوسائٹی کے رسائل کا سلسلہ ۹، ص۳، کارلٹن کون کی کتاب The Story of the Middle East Caravan صفحہ ۱۵۸، صفحہ ۱۶۳۔

Marfat.com

دیوار جیسی شکل مل جانے کی ایک وجہ گہوارے میں بچے کا ڈالنا بھی ہے۔ قرن ہا قرن گزر گئے کہ لبنانی ماں نے بچے کو گہوارے کی سطح سے باندھ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا، تاکہ اٹھ کر گر نہ جائے۔ یہ سلسلہ اب بھی موجود ہے۔ آج کل کے لبنانی کا جسم گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ دھڑ لمبا، ٹانگیں چھوٹی اور ہاڑ چوڑا چکلا۔ جو قصبے شام کی مشرقی سرحد پر واقع ہیں یا جو آبادیاں صحرائی علاقے میں ہیں، وہاں کے باشندے بدیہی طور پر مختلف ہیں۔ ان کے سر اور چہرے زیادہ لمبوترے ہوتے ہیں، ناکیں محدب ہونے کے بجائے سیدھی اور جلد قدرے سیاہی مائل۔ وسطی عرب کے بدو ایک طرف بحیرۂ روم کی نسل کا صحیح نمونہ ہیں۔ دوسری طرف سامی نسل کا۔ ان کے سر لمبوترے ہوتے ہیں اور خط و خال نازک۔ دوسرے عرب خصوصاً جو جزیرہ نما کے محیط میں رہتے ہیں، دوسری نسلوں سے خلط ملط ہو گئے۔

سامی نسل پرانی و حجری دور کے آخری حصے میں "ہلالی زرخیز" کے اندر پہنچی، یعنی عرب کا وہ ہلال نما زرخیز حصہ جس کی مشرقی نوک خلیج فارس پر ہے اور مغربی نوک جزیرہ نمائے سینا پر، اس وقت سے یہاں ثقافتی زندگی کے نئے باب کا افتتاح ہوا۔ اس وقت تک فن تحریر ایجاد ہو چکا تھا اور حقیقی تاریخ کی صبح اولیں طلوع ہو چکی تھی۔ ساموں سے پیشتر جو لوگ آباد تھے، ان کے کارناموں کا نقشہ پیش کیا جا چکا ہے؟ یہ نقشہ بجائے خود ہی اہم نہ تھا بلکہ اس اعتبار سے بھی خاص توجہ کا مستحق تھا کہ یہ سب کچھ سامیوں نیز یورپ کے ابتدائی باشندوں کو میراث میں مل گیا۔ اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ابتدائی یورپی ثقافت کا ایک معمولی سا پرتو تھی۔ یورپ بجائے خود مغربی ایشیا سے ایک جزیرہ نما کی شکل میں نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک برطانوی ماہر آثار قدیمہ لکھتا ہے:

> "میں تسلیم کرتا ہوں کہ مغرب نے فنون و ہنرمندی کے وہ اجزا مشرق سے اخذ کیے، جن کی بدولت انسان نے ماحول کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے قدم اٹھایا اور مشرق ہی میں ان روحانی روابط کی بنیاد رکھی گئی، جن سے انسانی جدوجہد میں ارتباط پیدا ہوا[1]"

یورپ میں تاریخ سے پیشتر کا دور دراصل نقل و تقلید ہی کا کرشمہ ہے یا یہ سمجھ لیجیے کہ مشرق کے کارناموں کو لے کر اپنی ضروریات کے سانچوں میں ڈھال لیا گیا۔[2] ایک امریکی عالم آثار قدیمہ کا

---

[1] گارڈن چائلڈ ( The Dawn of European Civilization (Childe) ) نیز ڈی اے ای گیروڈ ( کا مقالہ جرنل آف ورلڈ ہسٹری جلد اول +

[2] گارڈن چائلڈ کی کتاب ( New light of the most Ancient East ) +

Marfat.com

بیان زیادہ واضح ہے:

"دنیا کے کسی دوسرے خطے نے عالم انسانیت کے فائدے کے لیے اتنے بڑے کارنامے انجام نہیں دیے۔ جنوبی و مغربی ایشیا ہی سے زراعت، پرورش حیوانات، چاک کا استعمال، فن تحریر، ہیئت، علمی جہان بین، ابتدائی ضابطۂ قوانین، تعمیرات، آبیاری اور انسانی روابط کے دوسرے بڑے کارنامے دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچے۔"[1]

---

[1] ہنری فیلڈ کا مقالہ: (Studies Presidua to Drvid M. Rawinson) صفحہ ۳۷۵۔

Marfat.com

Marfat.com

# دُوسرا حِصّہ

# قدیم سامی دَور

Marfat.com

# چھٹا باب

# کنعانی

## لبنان کی پہلی معتدبہ آبادی

**دھندلا آغاز** بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر تحریری تاریخ کی صبح نمودار ہوئی تو ۳۰۰۰ سنہ ق م کے آس پاس لبنانی ساحل، مغربی شام اور جنوبی شام (فلسطین) میں ایک سامی گروہ آباد تھا، جسے "کنعانی" کہتے تھے۔ یہ تحریر کے دو بالکل ابتدائی اور کار آمد نظاموں کی ایجاد وارتقا کے دو سو سال بعد کا واقعہ ہے، ان میں سے ایک دوآبۂ دجلہ و فرات کے سمیریوں کا پیکانی یا میخی رسم الخط اور دوسرا مصریوں کا ہیروغلافی یا تصویری رسم الخط تھا۔ تیسرے ہزار سال کے نصف اول میں لبنان کا ذکر تصریحاً یا ضمناً شروع ہو گیا تھا اور یہ اکادیوں، مصریوں، اشوریوں اور نو بابلیوں کے عہد اقتدار میں جاری رہا۔ مصر کا فرعون سنفرو[1] چوتھے شاہی خاندان کا بانی تھا (قریباً ۲۶۵۰ سنہ ق م) اس کی ایک دستاویز میں بحری سفر کا ذکر ہے، جس میں دیودار کے شہتیروں کے چالیس جہاز بھر کر لائے گئے۔ یہ سفر صریحاً لبنان کی طرف ہوا۔ ایک دستاویز میں دیودار کی لکڑی سے جہاز بنانے کا بھی ذکر ہے[2]۔ سنفرو کو دہشور[3] کے جنوبی "ہرم" میں دفن کیا گیا تھا۔ کھدائی میں اس کا مدفن نکل آیا تو اس میں سے دیودار کے شہتیر نکلے، جو اچھی حالت میں محفوظ تھے۔ اور وہ اب بھی تھموں کا کام دے رہے ہیں۔ دنیائے قدیم کی ایک اور جھلک ۱۹۵۴ء کے موسم بہار میں دیکھی گئی، جب مصر کے ایک جواں سال ماہر آثار قدیمہ کو جیزہ کے بڑے ہرم کے قریب ساٹھ فٹ لمبی کشتی مل گئی، جو چونے کے پتھر میں محفوظ کر دی گئی تھی۔ اس

---

۱؎ (Snefru)

۲؎ جیمس، ایچ۔ بریسٹڈ (Breasted) کی کتاب (Ancient Records of Egypt) جلد اول صفحہ ۱۴۷۔

۳؎ دہشور دریائے نیل کے مغربی کنارے پر جیزہ سے تھوڑی دور جنوب میں ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

کشتی میں سنفرد کے جانشین فرعون خوفو[1] کی لاش رکھ کر دفن کے لیے لے گئے تھے۔ یہ دیودار سے بنائی گئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس میں دیودار کی خوشبو باقی تھی۔ کشتی کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کی روح سورج کے ساتھ ساتھ اپنا ابدی سفر طے کرتی رہے۔ لبنانی دیوداروں کے باقیات میں سے اس کشتی کو دوسرا قدیم ترین اثر سمجھنا چاہیے۔ قاہرہ کے مصری عجائب خانے میں دیودار کے متعدد تابوت بڑی اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔

لوگل زگیسی[2] دو آبہ دجلہ و فرات کی پہلی سلطنت کا سومیری بانی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جن ملکوں کو میری قوت نے تہ و بالا کیا" وہ مقام طلوع آفتاب سے مقام غروب آفتاب تک پھیلے ہوئے ہیں[3] وہ "جنوبی سمندر سے شروع ہوتے ہیں اور دجلہ و فرات کے ساتھ ساتھ بالائی سمندر تک جاتے ہیں[4]"

سرجون اکادی پہلا سامی فاتح ہے، جس کا ذکر تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔ اس نے تھوڑی مدت کے لیے سومیری سلطنت کو بھی تہس نہس کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو "شاہنشاہِ عالم" کہتا ہے۔ اس زمانے میں عالم سے مراد وہ علاقہ تھا، جو خلیج فارس اور بحیرۂ روم کے درمیان واقع تھا۔ اس کے دعاوی میں دیودار کے جنگل اور چاندی کے پہاڑوں کا بھی ذکر ہے۔ ممکن ہے، یہ اشارہ لبنان کے بجائے جبل لکام کی طرف ہو۔

کنعانی بھی نقل وطن کے اسی سیل کی ایک لہر تھے جس نے اموریوں کو صحرائے عرب سے نکالا۔ اور وہ "ہلال زرخیز" میں جا بجا پھیل گئے۔ غالباً وہ خانہ بدوش بدویوں کی حیثیت میں البقاع اور شمالی شام کے راستے پہنچے۔ ان کے ریوڑ اور گلے بھی ساتھ تھے۔ اہل مصر البقاع کو امورو (امور) کہتے تھے[5]۔ ان لوگوں کے لیے اموری نام ان کے مشرقی ہمسایوں یعنی سومیریوں نے رکھا تھا، لہٰذا اسے غیر سامی نام سمجھنا چاہیے۔ اموریوں کا دارالحکومت ماری (موجودہ تل الحریری) دریائے خابور سے نیچے فرات کے کنارے تھا۔ از روئے اشتقاق یہ اصل ملک کے نام سے مشابہ ہے یعنی امورو (A-MUR-RU)۔ مارتو (MAR-TU) کے معنی ہیں مغربی سرزمین۔ شمالی لبنان کا ایک گاؤں "عمریت" (مصری MRT اور کلاسیکی MARATHUS مارتھوس) عہد قدیم کے نام کی یادگار

---

[1] Cheops جس نے جیزہ کا سب سے بڑا ہرم بنوایا۔ [2] Lugal-zaggise

[3] دیکھیے جارج بارٹن (Barton) کی کتاب (The Royal Inscriptions of Sumer and Akkad صفحہ ۹۹۔

[4] ایضاً صفحہ ۱۰۹۔

[5] جی سٹائن ڈورف (Steindorff) اور کیتھ سی سیل (Keith C. Seele) کی کتاب When Egypt Ruled the East) صفحہ ۳۵-۳۶۔

Marfat.com

ہے۔ اموری شرقی جانب پھیلے اور انھوں نے بابل میں ایک ممتاز سلطنت کی بنیاد رکھی، جس کا ایک فرمانروا حمورابی تھا (وفات قریباً ۱۷۵۰ق م)۔ تاریخ میں وہ پہلا بادشاہ ہے، جس نے مجموعہ قوانین جاری کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لبنان، عبیدا (سائڈون) اور عسقلان کے درمیان (ساحل کے آخری حصے) اموری ہیں۔ کنعانیوں — جنھیں آگے چل کر یونانیوں نے "فونیقی" کہا — اور اموریوں کے درمیان کوئی نسلی اختلاف نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اموریوں نے رفتہ رفتہ چوڑے سر والے سومیریوں اور حوریوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ فونیقیوں نے دوسرے مقامی عناصر کو اپنا لیا، جن میں بحیرۂ روم والی نسل کے لوگ بھی شامل تھے۔ ثقافتی اختلاف کا اصل سبب مقامیت ہے۔ اموریوں کا مرکز شمالی شام میں تھا اور وہ سومیری و بابلی اثر کے دائرے میں رہے۔ کنعانیوں کا جغرافیائی مرکز لبنان کا ساحلی علاقہ تھا۔ اس وجہ سے ان کا جھکاؤ طبعی مصر کی جانب تھا۔ مذہبی اختلاف مقامی ماحول سے تطابق کا نتیجہ تھا۔ لسانی اختلاف محض بولی اور لب و لہجہ کا تھا، ورنہ دونوں زبانیں (اموری اور کنعانی) مغربی سامی شاخ سے متعلق تھیں اور اسی شاخ سے عبرانی زبان کا تعلق تھا۔

## سرزمین کنعان

کنعان پہلا دیسی نام تھا، جس کا اطلاق شام و فلسطین پر ہوتا رہا۔ عہد نامہ قدیم (بائبل) میں فلسطین کو "کنعان" کہا گیا ہے۔ ایک زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ کنعان کے معنی نشیبی زمین[1] کے ہیں اور لبنان سطح مرتفع یا بلند زمین کو کہتے ہیں، لیکن اب خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ غیر سامی ہے۔ نئے اشتقاق کے مطابق اسے حوری زبان کے لفظ کنگی[2] سے نکلا ہوا مانا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں سرزمین ارغواں سے متعلق۔ اسی سے اکادی لفظ کنخنی[3] ہے۔ تل العمارنہ کے پیکانی خط میں اسے کنخ[4] کہا گیا ہے، فونیقی میں "کنع"[5] اور عبرانی میں کنعان[6]۔ اگر یہ سب کچھ درست ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ارغوانی رنگ کی صنعت یہاں اٹھارویں یا سترھویں صدی قبل مسیح میں خاصی فروغ یافتہ تھی، جب دوآبہ دجلہ و فرات کے بالائی حصے کے حوریوں نے بحیرۂ روم کے ساحل سے تعلق پیدا کیا تھا۔ اسی طرح لفظ فونیقی یونانی لفظ فونکس[7] سے ہے، جس کے معنی ہیں "ارغوانی سرخ"۔ یہ بھی مذکورہ بالا صنعت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ یونانیوں نے پہلے پہل یہ نام ان کنعانیوں کے لیے استعمال کیا، جن سے ان کے تجارتی تعلقات پیدا ہوئے۔ بارھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں یہ کنعانی کا مترادف بن گیا۔ کلاسیکی

---

ف۱ یہ لفظ "کنع" سے ہے جس کے معنی پست کے ہیں۔ دیکھیے جارج سمتھ کی کتاب ارض مقدس کا تاریخی جغرافیہ طبع یازدہم ص ۴-۵ نیز کلاڈ کونڈر (Conder) کی کتاب اور آرمن کی فرانسیسی کتاب فینیقی۔ ف۲ (Knaggi)۔ ف۳ (KINAKHNI)۔ ف۴ Kinakhkh۔ ف۵ Kina۔ ف۶ (Kena'an) دیکھیے ایلبرائٹ کا مقالہ تاریخ تہذیب میں کنعانیوں کا حصہ جو (Studies in the History of Culture) میں شائع ہوا ص ۲۵۔ ف۷ (Phoenix)۔

Marfat.com

مصنفوں نے ایک روایت محفوظ کی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ فونیقی دراصل خلیج فارس کے خطے سے آئے تھے۔ ہیروڈوٹس[1] کا بیان ہے کہ فونیقی بحیرہ ارتھریا[2] کو اپنا اصل وطن قرار دیتے تھے۔ سٹرابو[3] خلیج فارس میں ٹائر (صور) اور ارادوس (ارواد) نام جزیروں کا ذکر کرتا ہے، جہاں فونیقیوں کے معبدوں جیسے معبد موجود تھے اور یہ بھی کہتا ہے کہ فونیقیوں کے نزدیک فونیقیا میں ان ناموں کے جتنے شہر یا جزیرے ہیں، وہ ان کی نو آبادیاں ہیں۔ جزائر بحرین میں جو سب سے بڑا ہے، اس میں بہت سے مقابر موجود ہیں، جن کی چھان بین ابھی تک پوری طرح نہیں ہوئی، مگر اتنا ظاہر ہے کہ ان کی وضع قطع فونیقی مقابر کی سی ہے اور ان کے مدخل بھی فونیقیوں کی طرح مغربی جانب ہیں۔ سکندر اعظم کے امیر البحر نیارکس جزیرۃ العرب کے مشرقی ساحل پر ایک شہر میں گیا تھا، جس کا نام عیدا تھا۔

## شہری ریاستیں

تاریخ کے بالکل ابتدائی دور میں بھی لبنان کی طبعی حیثیت رہی تھی، جو رومیوں کے عہد تک محفوظ رہی، یعنی ساحل کے ساتھ ساتھ قصبوں اور شہروں کا ایک زنجیرہ تھا۔ ان کے عقب میں گھنے جنگل تھے، جن میں آبادی بہت کم تھی۔ ہر شہر اور قصبہ اپنے سامنے کی اندرونی زمین سنبھال لیتا تھا۔ لیکن وہ کبھی کسی مرکزی طاقت کے ماتحت متحد نہ ہوئے۔ اس بنا پر فونیقیوں کے شہر کو ان کی تاریخ کی کلید سمجھنا چاہیئے۔ معاشرہ شہری تھا، جس کے اقتصادی اور صنعتی نظام میں ہر فرد کو کاروبار شروع کرنے اور اس کے فروغ کے لیے جدوجہد عمل میں لانے کے یگانہ مواقع حاصل تھے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہری ریاستیں وجود میں آ گئیں تاہم وہ طبعاً فوجی لحاظ سے کمزور اور سیاسی اقتدار سے ناپائدار وغیر مستحکم تھیں۔ ان کے رقبے محدود تھے اور ان کا انحصار وسائل درآمد و برآمد کے تحفظ اور تجارت پر تھا۔ لہٰذا ان شہری ریاستوں میں باہم نمایاں رقابت تھی، حالانکہ ان کے درمیان صرف ایسی جغرافیائی حدیں حائل تھیں، جو قابل توجہ ہی نہ تھیں۔ مصر کی حالت ان سے بالکل مختلف تھی، جہاں اوّل دریائے نیل ملک کے مختلف حصّوں کو متحد کرتا تھا، دوم وہاں بادشاہی قائم ہو چکی تھی اور بادشاہ کو زندہ دیوتا مانا جاتا تھا۔ اس مرکزیت کے تحت امن اور استواری پیدا ہو گئی۔ چار شہری ریاستیں تھیں، جن کے اردگرد لبنان کی ابتدائی تاریخ چکر لگاتی ہے — شمال میں ببلوس (جُبَیل) اور ارادوس (ارواد) اور جنوب میں سیڈون (صیدا) اور ٹائر (صور) — یہی ار سما کا ایک درخشاں مجموعہ ہے، جو ایلیڈ اور بائیبل کے صفحات پر چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ ان میں سے جبیل کے موقع و محل پر خاصی کھدائی

---

۱۔ کتاب ۷، باب ۸۹۔ ۲۔ (Erythrean Sea) یعنی بحیرۂ عرب۔
۳۔ کتاب ۱۶، باب ۳۔

ہو چکی ہے۔[51] واقعہ یہ ہے کہ کنعانی شہروں کے آثار قدیمہ کے متعلق ہماری معلومات بہت قریبی زمانے کی ہیں، جو موجودہ صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے کی کھدائی پر مبنی ہیں۔ ہم جو کچھ اب تک جان سکے ہیں، اسے غیر معلوم سے کوئی مناسبت نہیں۔ ساحلی علاقے سے ہٹ کر کنعانی آثار بہت کم ملے۔ اس کا سبب یہ ہُوا کہ اندرونِ ملک کی جانب زیادہ تر گڈریے اور لکڑہارے آباد تھے۔ جنوبی لبنان کے اطراف کوہ میں جو گاؤں تھے، ان سے تانبے کے بہت ہی معمولی ہتھیار اور چھوٹے چھوٹے مجسمے ملے ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں غیر سامی لوگ منتشر طور پر آباد تھے، جن کا تعلق اناطولی گروہ سے تھا انھوں نے دوسرے ہزار سال کے اوائل میں ساحل پر بسنے والے کنعانیوں سے قرض کا تانبا حاصل کیا۔[52]

## مصر سے تعلق

پہلا لبنانی شہر جو ابھر کر تاریخ کی پوری روشنی میں آیا، "جبلہ" تھا جسے بائیبل میں "جُبل" کہا گیا ہے۔ یہ سامی نام اب جُبیل (چھوٹا پہاڑ) کی شکل میں باقی ہے۔ مصری اسے کپنا کہتے تھے۔[53] اس کے یونانی نام "بیبلوس"[54] کے معنی لفظ بائیبل کی شکل میں پیپرس، کتاب اور سوانح حیات کے بن گئے۔ اس شہر کا ذکر حزقی ایل (باب ۲۷، آیت ۹) اس کے باشندوں کا ذکر جبلیوں کی حیثیت سے یشوع (باب ۱۳، آیت ۵) سلاطین اول (باب ۵، آیت ۱۸) اور امریکہ کے ترمیم شدہ ترجمے کے مطابق "سنگ تراش" کی حیثیت میں آیا ہے۔ یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں جبلیوں کے تجارتی تعلقات مصر زیریں سے تھے اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب پہلے شاہی خاندان کے زمانے میں مصر زیریں، مصر بالا سے متحد نہیں ہوا تھا۔ اس خاندان[55] کے شاہی مقبروں میں جو شہتیر استعمال کیے گئے، نیز شہتیر کے مقبروں سے لکڑی کے جو ٹکڑے ملے، وہ اس امر کی شہادت ہیں کہ یہ لکڑی لبنان سے درآمد کی گئی تھی۔ اس شاہی خاندان کے مقبروں سے کنعان کے ظروف گلی بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ کھدائی سے یہ حقیقت بھی بروئے کار آگئی کہ جس جگہ "جبلہ" شہر آباد ہوا، اس جگہ جدید حجری دور کے ماہی گیر اور دہقان رہتے تھے، نیز یہ آبادی پے در پے متعدد مراحل سے گزری۔ دوسرے دور میں "جبلہ" ایک ایسا گاؤں تھا، جس کے مکان ٹیڑھی یا سیدھی لائن میں تھے۔ اس کی گلیاں پختہ تھیں۔ پورے گاؤں کا

---

[51] یہ کھدائی پیئر مونتے (Montet) نے ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۲۴ء میں کرائی۔ پھر مارس دونانے یہ کام شروع کیا۔ سب سے پہلے ارنسٹ رینان نے اس پر خاص توجہ کی۔

[52] (Henry's Syria) رسالہ سیریا جلد ۳۰، صفحہ ۲۴ — ۵۰۔

[53] (Kupna) یہاں جس جبلہ کا ذکر ہے، اسے اغاریت کے کتبات کا جبلہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ شمال میں ہے۔

[54] لاطینی (Byblus) یہ لفظ پیپرس PAPYRUS سے بنایا گیا ہے۔ پیپرس مصر کی ایک خاص نبات تھی، جس کے پتے لکھنے کے لیے بطور کاغذ استعمال کیے جاتے تھے۔ اسی سے انگریزی کا لفظ پیپر (کاغذ) بنا۔

[55] ایس، آر، کے گلینول (Glanville) "میراث مصر" انگریزی (The Legacy of Egypt) صفحہ ۹۔

Marfat.com

رقبہ ڈھائی ایکڑ کے قریب تھا[۱]۔ اس آبادی سے تانبے کے جو ہتھیار اور چاندی کے جو زیور ملے، ان میں دوآبۂ دجلہ و فرات کے اثر کا کوئی نشان نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ صنعت گروں کی یہ ایک مستقل شاخ تھی، اسی صنعت سے بحیرۂ ایجہ کے صنعت گروں نے فائدہ اُٹھایا[۲]۔ "جبلہ" کی تیسری آبادی میں مکانوں کا نقشہ بدل گیا۔ اس طبقے سے ظروفِ گلی کے جو اجزا دستیاب ہوئے، ان سے واضح ہوتا ہے کہ ظروف کی صنعت ترقی کر گئی تھی اور چاک کا استعمال شروع ہوگیا تھا۔ "جبلہ" کی یہ آبادی اور اس سے بعد کی آبادی اُسی زمانے کی ہے، جس میں مصر کے اندر پہلے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی گئی۔ کیونکہ اس شہر میں ایک معبد بھی تھا، جس میں مصر کے دوسرے شاہی خاندان کی نذریں آتی رہیں۔ لبنان کی اس بندرگاہ سے نہ صرف لکڑی مصر بھیجی جاتی تھی بلکہ مرغوب شراب، زیتون کا تیل، لکڑی کے سامان کے لیے روغن اور سفید گوند بھی بھیجا جاتا تھا۔ یہ گوند صنوبر کے قسم کے درختوں کے تنوں اور شاخوں سے نکلتا تھا اور لاشوں کے حنوط میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لکڑی سے جہاز بنائے جاتے تھے۔ قصروں اور معبدوں کی چھتیں تیار ہوتی تھیں۔ خوان، تابوت، معبدوں کے پرچموں کے ڈنڈے، کرسیاں اور گھر کا دوسرا سامان بنایا جاتا تھا[۳]۔ آثار قدیمہ کے کسی عجائب خانے میں شاید ہی مصری آثار کا کوئی کمرہ ہوگا، جس میں دیودار کی لکڑی کے کم از کم چند ٹکڑے موجود نہ ہوں۔ لکڑی کے بدلے میں اہل جبلہ سونا، مختلف دھاتوں کی بنی ہوئی چیزیں، لکھنے کی غرض سے پیپرس اور وادی نیل کی دوسری زائد از ضروریات پیداوار لیتے تھے +

تجارتی تعلقات بدستور قائم رہے بلکہ مصر کی قدیم سلطنت کے زمانے میں (تقریباً ۲۷۰۰ تا ۲۲۰۰ ق۔م) بری اور بحری تجارت کا سلسلہ غالباً زیادہ بڑھ گیا اور مزید جنسوں کی خرید و فروخت شروع ہوگئی۔ چھٹے شاہی خاندان کے جو کتبات ملے ہیں، ان میں مصری جہازوں کو "جبلہ کے جہاز" بتایا گیا ہے۔ قافلے اس بڑی بین الاقوامی شاہراہ پر چلتے تھے، جو ڈیلٹا کے علاقے سے شروع ہوتی تھی اور جزیرہ نمائے سینا میں ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھی۔ جزیرہ نمائے سینا میں اس سے ایک شاخ پھٹ کر جنوبی جانب تانبے اور فیروزے کی کانوں کو جاتی تھی، جو جزیرہ نما کی مشہور کانیں تھیں اور آگے بڑھ کر ایک شاخ ساحل کے ساتھ ساتھ جنوبی عرب پہنچ جاتی تھی، جہاں سے لوبان آتا تھا۔ اصل شاہراہ شمال کے رُخ مڑ جاتی تھی اور فلسطینی ساحل کے

---

[۱] قدیم ترین ستی کی تصویروں کی تعبیر کے لیے دیکھیے مارس دونا کا مقالہ ریویو جلد ۵۷ +

[۲] چائلڈ (Child) کی کتاب نیو لائٹ (New Light) صفحہ ۲۲۴ +

[۳] دیکھیے مونتے صفحہ ۲۲۶ و ۲۷۰ +

ساتھ ساتھ جنوبی لبنان میں داخل ہو جاتی تھی۔ یہاں یہ دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک بدستور ساحل کے ساتھ ساتھ صور، صیدا، جبلہ اور دوسرے شہروں سے گزرتی ہوئی شمالی سمت نکل جاتی تھی۔ دوسری شاخ مؤرخانہ وادی لیطانی اور البقاع میں سے گزرتی تھی۔ یہاں سے اس کی ایک شاخ دمشق چلی جاتی تھی۔ البقاع والی شاخ اور ساحلی شاخیں نہر کر کے راستے قدلیش پر مل جاتی تھیں۔ اسی راستے کے ساتھ ساتھ اب ریلوے لائن بھی ہے۔ اصل شاہراہ میں سے ایک شاخ شمالی شام ہوتی ہوئی اس مشہور درے سے گزر کر ایشیائے کوچک میں داخل ہو جاتی تھی، جسے ابواب سیشیا[۱] کہتے تھے۔ پھر یہ مشرقی جانب فرات کی طرف مڑ جاتی تھی اور وہاں سے جنوبی رُخ اختیار کر کے خلیج فارس پہنچ جاتی تھی۔ یوں یہ ایک شاہراہ قدیم تہذیب کے مختلف اہم مقامات کو ملاتی تھی۔ یہی شاہراہ ہے، جس سے رعمسس، اسرحدون اور سکندر اعظم گزرے۔ یہی شاہراہ ہے جسے "مقدس خاندان"[۲] نے طے کیا اور یہی شاہراہ ہے، جس سے نپولین بوناپارٹ نے فائدہ اٹھایا[۳]۔ جبلہ میں بہت سی ایسی چیزیں ملی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں مصری تاجروں اور کاروباری آدمیوں کی ایک نوآبادی قائم ہو گئی تھی۔ اس قسم کے تعلقات مصریوں نے لبنان کے دوسرے شہروں سے بھی قائم کر لیے ہوں گے۔ چنانچہ آگے چل کر ایک مصری نوآبادی اغاریت میں قائم ہوئی تھی۔ مصریوں اور لبنانیوں کے درمیان یہ تجارتی اور ثقافتی تعلقات امن و خوشگواری پر مبنی تھے۔ جبلہ کے امیر اور مصر کے فرعون ایک دوسرے کو قیمتی تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ مصر کے بڑے "ہرم" کی تعمیر فرعون خوفو نے کرائی تھی۔ پتھر کا ایک آرائشی ظرف ملا ہے، جس پر خوفو کا نام کندہ تھا۔ یہ ظرف بعلہ جبلہ کی نذر کیا گیا تھا، جس کے معبد میں پیشتر کے فراعنہ اور بعد کے فراعنہ کی نذریں آتی رہیں۔ مصر کی مشہور دیوی ایزیز[۴] کا معبد بھی بن گیا تھا اور یہ دونوں معبد پہلو بہ پہلو قائم رہے۔ آہستہ آہستہ بعلہ اور ایزیز ایک دیوی کے دو مختلف روپ بن گئے۔ جبلہ کے امرا اپنے ہتھیاروں اور جواہرات کی آرائش میں مصری نمونے کی

---

۱؎ (The Gates of Cilicia) وہ درہ، جو شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان آمدورفت کا ذریعہ تھا۔

۲؎ (Holy Family) مراد ہے حضرت مریمؑ، ان کے شوہر اور حضرت عیسیٰؑ۔ یہ ابتدائی دور میں مصر چلے گئے تھے۔

۳؎ نپولین نے مصر پر حملہ کیا تھا تو ایک مرتبہ شام کی تسخیر کے لیے نکلا تھا، لیکن عکہ سے واپس ہو گیا۔ مصنف کی مراد یہ ہے کہ ان اصحاب نے بیان کردہ شاہراہ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور طے کیا۔

۴؎ قدیم مصر کی مشہور دیوی، جسے روح بخشنے والی دیوی سمجھا جاتا تھا۔

Marfat.com

پیروی کرتے تھے بلکہ بعض فخریہ کہا کرتے تھے : ہم رع کی اولاد میں۔ رع مصر میں سورج دیوتا کو کہتے تھے اور یہ مصریوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا +

**مصری اقتدار** جو تعلقات تجارت اور ثقافت کی بنا پر شروع ہوئے، آگے چل کر انھوں نے سیاسی حیثیت اختیار کر لی۔ درمیانی دور کی سلطنت ( ۱۹۰۲ق م تا ۱۶۲۸ق م) کے فرعونوں، خصوصاً بارھویں شاہی خاندان کے حکمرانوں کا دور تاریخ مصر کا شاندار ترین دور ہے۔ ان فرمانرواؤں نے نہ صرف لبنان بلکہ فلسطین نیز شام کے بڑے حصے پر اقتدار کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ ہم مان سکتے ہیں کہ اقتدار کا یہ سلسلہ ڈھیلا ڈھالا سا تھا۔ مکانوں کی آرائش کے لیے جو تصویریں بنائی گئیں، ان میں یہ دکھایا جاتا تھا کہ ایشیا سے نمائندے تحفے یا خراج لے کر آئے۔ ایشیائی اسیر بھی ان تصویروں میں دکھائے جاتے تھے۔ ان میں بالکل ابتدائی تصویریں وہ ہیں جو بنی حسن کے شاہی مقبروں میں ملتی ہیں۔ ان کا زمانہ فرعون سنوسرت[۱] ثانی (تقریباً ۱۷۵۰ق م) کا ہے۔ مصریوں نے جن مقامات کا ذکر کیا ہے، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آمن نہت ثالث کے عہد حکومت (۱۹۴۰ق م۔۱۹۲۲ق م) کے اواخر میں پورا ساحلی علاقہ نہر کبیر تک نیز حوران، دمشق اور البقاع کا بڑا حصہ مصری سیاسی اثر کے دائرے میں شامل ہو چکے تھے۔ اس خاندان کے ایک فرعون کے عہد سے ایک دلچسپ قصہ متعلق ہے، جس میں اس علاقے کی مجلسی زندگی اور نظم ونسق کی کیفیت بیان کی گئی ہے +

**داستان سنوحی** داستان گو مصری دربار کا ایک فرد تھا، جس کا سنوحی نام تھا۔ وہ فرعون سنوسرت کے جلوس پر (تقریباً ۱۸۰۰ق م) کسی وجہ سے ملک چھوڑ کر بھاگا اور رتنو[۲] نام ایک مقام پر بدویوں کے درمیان رہنے لگا۔ اس نے سالہا سال وہیں گزار دیے۔ پھر اسے دربار میں بلا لیا گیا۔ وطن واپس جا کر اس نے اپنی جلا وطنی کے عہد کے تمام حالات ایک نظم کی شکل میں مرتب کر دیے۔ وہ لکھتا ہے کہ ابتدا میں میں بدوؤں کے ایک سردار کے پاس پہنچا، جو مصری سرحد کے قریب رہتا تھا۔ اس نے میری جان بچائی۔ میرے لیے گرم دودھ کا انتظام کر دیا اور اپنے قبیلے میں رہنے کی اجازت دے دی +

پھر سنوحی جُبلہ پہنچا۔ وہاں سے مشرقی جانب روانہ ہو گیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ البقاع کے خطے میں پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مقامی لباس اور طور طریقے اختیار کر لیے اور ایک قبیلے سے وابستہ

---

[۱] Senwosret ، اسے سیسوٹرس بھی کہتے ہیں +

[۲] Retenu ، یہ سامی لفظ بتایا جاتا ہے، لیکن اس کا ماخذ معلوم نہیں۔ مصری کتبات میں یہ شام کے لیے مستعمل تھا +

ہو گیا، جس کے شیخ کا نام اموری تھا۔ سنوحی نے قدم جما کر آس پاس کے مقامات پر چھاپے مارے۔ مختلف گروہوں کو ان چراگاہوں اور کنوؤں سے محروم کر دیا۔ ان کے جانور لوٹ لیے اور بہت سے آدمی قید کر لیے۔ وہ کتوں سے شکار کھیلتا تھا۔ بدویوں کے دستور کے مطابق لوگوں کی خاطر داری کرتا تھا۔ کوئی پیاسا آتا تو اُسے پانی پلاتا۔ کوئی راستہ بھول جاتا تو اس کی رہنمائی کا انتظام کر دیتا۔ سنوحی نے شیخ کے پاس اپنے وطن کا پروپیگنڈا بہت کیا، لیکن شیخ اپنی آزادی کھو کر اجنبی حکومت کا اقتدار قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخری سنوحی نے شیخ کی بڑی بیٹی سے شادی کر لی، اُسے کھیتی باڑی کرنے اور ریوڑ چرانے کے لیے اچھی زمین دے دی گئی۔ وہاں انجیر کے درخت بھی تھے اور انگور بھی۔ پانی سے زیادہ شراب ملتی تھی، شہد کی فراوانی تھی اور زیتون کے درختوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ قسم قسم کے پھلوں سے درخت لدے رہتے تھے۔ جَو بھی بہت تھے۔ مویشی کی بھی کثرت تھی۔[۱ھ] پھر ایک زبردست آدمی سے سابقہ آپڑا، جو اس سرزمین کے تمام آدمیوں کو شکست دے چکا تھا۔ لڑائی ہوئی، جس میں خنجر، بھالے، کلہاڑیاں اور تیر کھلے بندوں استعمال ہوئے۔ مرد سنوحی کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، عورتوں میں چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ بہرحال سنوحی اس مقابلے میں کامیاب رہا۔

آخر سنوحی اُداس ہو گیا اور یہ غم اس کے دل کو کھا گیا کہ اجنبی سرزمین میں موت آئے گی اور بھیڑ کی کھال میں اسے کفنا دیا جائے گا۔ چنانچہ سن رسیدہ سنوحی نے بڑے بیٹے کو تمام چیزیں سونپ دیں۔ اس کے اپنے قول کے مطابق "صحرا" ان لوگوں کے حوالے کر دیا، جو اس میں رہتے تھے اور درختوں کے پھلوں سے نکلنے والا تیل اسے دے دیا، جسے اس تیل سے مسح کر کے سردار بنا گیا تھا اور وہ وطن لوٹ گیا، جہاں عیش و راحت کی زندگی بسر کرتا تھا اور جہاں اس کے لیے عمدہ حمام اور اعلیٰ بستر کا انتظام تھا۔

سترھویں صدی میں، جب درمیانی دور کی سلطنت ختم ہو رہی تھی، ایسے امراء کا ظہور ہوا، جن کے نام کنعانی تھے، مثلاً یپ، شمو، اِب اور اِنتن (جو مینتھن) اور ان کے القاب مصری تھے (ہتے۔ یعنی امیر) ایک بلوری صندوقچی، جس میں سنہری بیل بوٹے تھے، بیروت کے قومی عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس پر آمی مہنت چہارم کا نام ثبت ہے اور یہ یپ، شمو، اِب کو تحفۃً دیا گیا تھا۔[۲ھ] اس زمانے میں مصریوں کے سیاسی کارکن اور نمائندے جابجا موجود تھے۔ فنی اور ذہنی

---

ا ھ جیمز پریچرڈ (James Pritchard) کا مجموعہ مشرق قریب کے قدیم متون (Texts) صفحہ ۱۹۔

۲ ھ پریچرڈ صفحہ ۲۲۹۔ ۳ ھ ایضاً ایضاً

دائروں میں مبادلہ روبہ ترقی تھا۔ کنعان کے کاریگر دھات کی بنی ہوئی چیزوں کی آرائش کے لیے مصریوں کے تصویری رسم الخط سے کام لیتے تھے۔

**ہکسوس کا اقتدار** سترھویں صدی کے اختتام سے پیشتر مصر و لبنان کے تعلقات میں خلل واقع ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مختلف جنگجو گروہوں کا ایک جتھا برسرِ اقتدار آ گیا۔ یہ پُراسرار لوگ پہلے پہل شام کے بڑے حصّے پر قابض ہوئے۔ پھر انھوں نے مصر کو پامال کر ڈالا اور وہاں کی سرزمین کے مالک بن گئے۔ یہ ہکسوس تھے، جنھیں اہلِ مصر اجنبی سرزمین کے حکمران کہتے تھے، لیکن مصر کا مشہور مورّخ مینتھولے، جس نے سب سے پہلے ہکسوس کا نام استعمال کیا، انھیں "چرواہے بادشاہ" کہتا ہے۔

یہ جتھا، جس کے اجزائے ترکیبی کا نسلی تعین نہ ہو سکا، مشرقی بحیرۂ روم کی کٹھالی سے اچھل کر مصر میں داخل ہو گیا۔ ہکسوس کے جتھے میں زیادہ تر لوگ سامی النسل تھے (کنعانی، اموری اور عرب)، لیکن اس میں حوری، حتّی اور لیطانی بھی شریک تھے، بلکہ خبیرو کے شمول کا بھی سراغ ملتا ہے، لیکن اکثریت کنعانیوں کی تھی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس خاندان کے ابتدائی بادشاہوں کے نام، جو مصری یادگاروں پر کندہ ہیں، کنعانی تھے۔ ان کے باقیات کریٹ جیسے دور افتادہ مقام پر بھی ملے۔ وہاں ایک آرائشی ظرف دستیاب ہوا، جس پر ایک ہکسوس بادشاہ کا نام ثبت تھا۔ وہ کنعانی دیوتاؤں ہی کی پرستش کرتے تھے۔ انھیں لوگوں کے ساتھ زبردست غیر سامی عناصر آئے، جو لبنان اور فلسطین کی آبادی میں شامل ہو گئے۔ انسانی ڈھانچوں کی چھان بین سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں بحیرۂ روم والی نسل کی جگہ ایک حد تک ارمن نسل نے لے لی تھی۔ ہکسوس ہی کی بدولت شام و مصر میں گھوڑے کا رواج ہوا، لیکن اس سے سواری کا کام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ جنگی رتھوں میں جوتا جاتا تھا۔ گھوڑے کی پرورش بہت مدّت پہلے بحیرۂ قزوین کے مشرق میں ہندی یورپی خانہ بدوشوں نے کی تھی۔ پھر یہ دوآبہ دجلہ و فرات میں پہنچا۔ وہاں سے شام گیا اور عیسوی سن کے آغاز پر عرب میں داخل ہوا۔ ہکسوس نے اسے جنگی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اس کی بدولت شام، لبنان اور فلسطین کے باشندوں پر غلبہ پا لیا۔ گھوڑے والے جنگی رتھ پہلے پہل میدانِ جنگ میں نمودار ہوئے ہوں گے تو فریقِ مخالف پر ویسا ہی اثر پڑا ہو گا، جیسا

---

لے Josephus اقتباس کے لیے دیکھیے جوزیفس، ایپیئن Apion کتاب اول، باب ۱۴۔

پہلی جنگ عظیم میں ٹینکوں، زہریلی گیسوں یا ایسے ہی دوسرے پر اسرار ہتھیاروں سے پڑا۔[1] گھوڑے کے علاوہ ہکسوس اپنے ساتھ خمدار تلوار اور مرکب کمان بھی لائے، جو پہلے پہل بابل میں استعمال ہوئی تھی۔ ہتھیاروں میں فوقیت کے علاوہ ہکسوس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اُنھوں نے برنج سے فائدہ اُٹھایا۔ ان کی سرپرستی میں معدنیات کے استعمال نے بڑی ترقی کی اور فن آرائش نے بہت اونچا درجہ حاصل کر لیا۔ قطنہ (مشرفہ) ان کا شامی مرکز تھا، جو حمص کے شمال مشرق میں ہے اور یہ مقام البقاع کے شمالی گوشے سے زیادہ دور نہیں +

ہکسوس نے اپنے وسیع مفتوحات میں جاگیردار طبقے کو دیسی آبادی پر مسلّط کر دیا تھا۔ ان کے جاگیردارانہ معاشرے کا نظم ڈھیلا ڈھالا تھا۔ ثروت و اختیار ان امراء کے ہاتھ میں تھا، جو زیادہ تر جنگی رتھوں کے مالک ہوتے تھے۔ پورے نظام کی حیثیت سراسر عسکری تھی۔ قدیم کنعانی امراء یا تو تاجر تھے یا کاروباری آدمی۔ ان کی جگہ اجنبی جنگی امراء نے لے لی۔ مشرقی بحیرۂ روم میں ہکسوس کے ثقافتی اور سیاسی اقتدار کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ صدی کا ہے۔ یہ مدت سنہ ۱۵۷۰ ق م پر ختم ہوئی۔ یہ لوگ مصر پہنچے تو اُنھوں نے اپنے سامی دیوتا بعل کو مصریوں کے دیوتا سیتھ کی شکل دے دی۔ چنانچہ اس کی پوجا بعد کے خاندانوں کے فرعون کرتے رہے۔ بعلہ (عشتارت) کو ایزیز بنا لیا گیا۔ غالباً ہکسوس ہی کے دورِ اقتدار میں حضرت یوسفؑ نے مصر میں اقتدار حاصل کیا اور بنی اسرائیل وہاں آباد ہوئے +

نفرت انگیز ہکسوسی اقتدار پر صرف تین عشرے گزرے تھے (تقریباً سنہ ۱۶۰۰ ق، م۔ سنہ ۱۵۷۰ ق م) کہ تھیبز کے ایک امیر اہموس اول (سنہ ۱۵۷۰ ق م۔ سنہ ۱۵۴۵ ق م) نے آزادیٔ مصر کے لیے جنگ شروع کر دی۔ یہی شخص اٹھارھویں شاہی خاندان کا بانی تھا اور اسی نے نئی بادشاہی کی داغ بیل ڈالی۔ وادیٔ نیل سے ہکسوس کے اخراج نے ردّ عمل کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا، جو ہکسوس کی آمد کے مقابلے میں مغربی ایشیا کی قوموں کے لیے زیادہ اہم تھا۔ مصر اب تک امن کی راہ پر چلا آ رہا تھا۔ ضرورت کی تمام چیزیں ملک میں موجود تھیں۔ اب یکایک اس نے سامراجی طور طریقے اختیار کر لیے۔ مصریوں نے اجنبی حکمرانوں کو اپنے وطن سے نکالنے ہی پر قناعت نہ کی بلکہ تعاقب میں خود اُن کے وطن پہنچ جانے کا تہیّہ کر لیا۔ اس طرح وہ پہلے فلسطین، پھر لبنان پہنچے۔ تھوتمس اول نے سنہ ۱۵۲۰ ق م کے آس پاس

---

[1] گھوڑے کا نہایت عمدہ اور بالکل ابتدائی بیان بائیبل کے صحیفہ ایوب میں ہے، دیکھیے باب ۳۹، آیت ۱۸-۲۵ +

پوری سرزمین پامال کر ڈالی اور وہ اس خطے میں پہنچ گیا، جو دریائے فرات کے پار تھا یعنی "دو دریاؤں (نہرین) کی سرزمین"۔ اس طرح اہموس اور اس کے جانشینوں نے بحیرۂ روم کے مشرق کی سرزمینوں میں مہمات کا سلسلہ شروع کیا اور مصر کے خارجی معاملات میں نئی پالیسی کی بنیاد رکھی۔ تہوتمس ثالث (تقریباً ۱۴۹۰ق م سے ۱۴۳۶ق م) نے شام میں ہکسوس کی فرمانروائی پر کاری ضرب لگائی اور ہکسوس کے جاگیرداروں کی جگہ مصری آقاؤں نے لے لی۔

## لبنان مصر کے ماتحت

تہوتمس ثالث کو مصر قدیم کا سکندر کہنا چاہیے۔ اس نے پے در پے سولہ مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ حملے کیے اور نہ محض لبنان بلکہ پورا شام اُبھرتی ہوئی مصری سلطنت کا جزو بن گئے۔ فرعونی اقتدار کم و بیش ایک سو سال مستحکم رہا۔ ۱۴۶۸ق م میں مشہور کنعانی شہر مجدو[1] کے سقوط نے فلسطین کی تقدیر پر آخری مُہر ثبت کر دی۔ اس جنگ میں تین سو تیس شامی رئیس، امیر قدیش[2] (دریائے عاصی کے کنارے) کی سرکردگی میں شریک تھے۔ ہکسوس امراء کا سرجوش بھی شامل تھا۔ مصری فوج نے مجدو کی جنگ میں یہ پورا جتھا تباہ کر دیا۔ پھر جواں ہمت تہوتمس پچھتر میل شمال کی طرف بڑھ کر لبنان پہنچ گیا۔ لبنان کے جنوبی حصے میں اس نے تین شہر مسخر کر لیے، جن کا صحیح مقام ابھی تک متعین نہیں ہو سکا اور وہاں لبنانی سرداروں کے علاقوں کے درمیان ایک مستحکم حصار تعمیر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین شہر ایک حکمران کے ماتحت ایک سیاسی وحدت کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ اس حکمران کا ذکر "اس دشمن" کہہ کر کیا گیا ہے۔ گھر کا جو سامان لوٹ میں آیا، اس میں رکابیاں، قاب، دوسرے برتن، چھریاں اور دیگچیاں دیگچے بھی تھے۔ یہ پورا سامان سنہری تھا۔ سونے اور چاندی کی انگشتریاں اور مجسمے بھی تھے۔ دو ہزار انتیس آدمی قید ہوئے:

> "اس دشمن سے چھ کرسیاں ہاتھ آئیں، جو ہاتھی دانت، آبنوس اور خرنوب کی بنی ہوئی تھیں اور ان پر سنہری کام کیا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ چھ پائدان تھے۔ ہاتھی دانت اور خرنوب کے چھ بڑے میز تھے۔ ایک عصا خرنوب ہی کی لکڑی کا تھا۔ اس میں سونا لگا ہوا تھا اور قیمتی جواہرات سے اسے مرصع کر دیا گیا تھا۔ "اس دشمن" کا ایک مجسمہ آبنوس کا تھا جس کا

---

[1] اسے اقوام کا میدان قتال بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا موجودہ نام مجون ہے جو رومی نام لیجیئن (لشکر) سے اخذ کیا گیا۔ رومی لیجیئن ایک مرتبہ وہاں ٹھہرا تھا۔

[2] عرب جغرافیہ نگار اسے قدس قرار دیتے ہیں۔ اس کا موجودہ نام تل النبی مند ہے۔ جھیل حمص کے جنوب میں۔ دیکھیے دساؤ کی ٹوپوگرافی صفحہ ۱۰۵-۱۰۸

سونا چڑھا دیا گیا تھا اور اس کا سر لاجورد کا تھا۔"[1]

یہ فہرست دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان تین شہروں کے کم از کم امراء کا معیارِ زندگی کتنا بلند تھا۔ یہ تھوتمس کا پہلا حملہ تھا۔ پانچویں حملے میں ارادوس (ارواد) پہنچ گیا، جو فونیقی شہروں میں انتہائی شمالی شہر تھا۔ اس وقت سے ارواد نے تاریخ میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ اس شہر نے جو جزیرے میں واقع تھا جبلہ کی جگہ لے لی۔ یہ ڈیڑھ میل سمندر کے اندر تھا اور اپنے موقع و محل کے لحاظ سے ہر حملہ آور کا مقابلہ بہ آسانی کر سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے اس پر مصریوں نے حملہ کیا، پھر اشوریوں نے، بعدازاں سکندر یونانی نے اور سب سے آخر میں صلیبی جنگجوؤں نے۔ صحیفہ تکوین (یعنی بائبل کا پہلا صحیفہ جسے کتاب پیدائش بھی کہتے ہیں) کے دسویں باب میں سلسلہ ہائے نسب بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں ارودیوں کو بالکل بجا طور پر کنعانیوں میں شمار کیا گیا ہے (باب ۱۰- آیت ۱۸)۔ کرناک (مصر بالا) کے معبد کی دیواروں پر جو سرکاری بیان ہے مکتوب ہے، وہ اس باب میں بالکل واضح ہے:

"حضور شاہنشاہ نے شہر اراد کو اس کے ذخائر اجناس کے ساتھ تباہ کر دیا۔ تمام خوش نما درخت کٹوا دیے۔ حضور شاہنشاہ جاہی[2] کی پوری سرزمین پھلوں والے درختوں سے لبریز نظر آئی۔ ان کے انگور بڑی بڑی ناندوں میں بھرے ہوئے تھے۔ انھیں پانی کی طرح بہا دیا گیا۔ غلے کھلیانوں میں تھے، انھیں پیس ڈالا گیا۔ غلہ کنارے کی ریت سے بھی زیادہ تھا۔ فوج کو بے اندازہ سامان ہاتھ لگا۔"[3]

پھر اس بیان میں خراج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یعنی اکاون غلام اور لونڈیاں، تیس گھوڑے، دس خوان چاندی، لوبان اور روغنِ زیتون کے، چار سو ستر مرتبان شہد کے، چھ ہزار چار سو اٹھائیس مٹکے (شراب کے)، تانبے، سیسے، لاجورد اور سبز رنگ کی قلمی دھات کے، چھ سو سولہ بڑے مویشی (یعنی گائے بیل) تین ہزار چھ سو چھتیس چھوٹے مویشی (غالباً بھیڑ بکریاں)، روٹیاں، غلہ بھوسے کے ساتھ بھی اور پیسا ہوا بھی اور ملک کے تمام عمدہ پھل۔ دیکھو حضور شاہنشاہ کی فوج روزانہ شراب پیتی تھی اور اسے تیل سے مسح کیا جاتا تھا، جیسا کہ مصر کے خاص جشنوں کے مواقع پر دستور تھا۔[4] مسلمانوں کے سوا اور کون سی فوج ہو سکتی تھی، جو ان رنگ رلیوں سے فائدہ نہ اٹھاتی!

---

[1] بریسٹڈ جلد دوم۔ [2] یہ لفظ دراصل زاہی ہے، یعنی کنعان کا ساحلی علاقہ۔
[3] پرچرڈ (PRITCHARD) صفحہ ۲۳۹۔ [4] بریسٹڈ جلد دوم۔

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آور اس موقع پر یہاں پہنچا تھا، جب پھلوں کی بہار عہدِ شباب پر تھی، اور ان علاقوں کی زرخیزی سے بہت متاثر ہوا۔ ارواد اب طول میں گیارہ سو گز اور عرض میں سات سو گز ہے۔ پوری آبادی سات ہزار بتائی جاتی ہے۔ باشندوں کا گزارا ماہی گیری اور کشتی سازی پر ہے مصری حملے کے زمانے میں بہت بڑا شہر ہوگا۔ اس پر بار بار حملے ہوئے اور باشندوں سے سخت تشدد کا سلوک روا رکھا گیا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ مصری اقتدار کے خلاف بار ہا بغاوتیں ہوئیں۔ فرعون نے فونیقی جہازوں پر قبضہ کر لیا اور واپسی کا سفر جہازوں ہی میں طے کیا۔ بعد کی مہموں میں ارواد کے شمالی ہمسائے عمیرا[۱] سے بھی وہی برتاؤ ہوا۔ یہ بعض اوقات ارواد کے تابع بھی رہا۔ عمیرا کے قریب ہی الازا[۲] ایک ساحلی مقام تھا۔ اس پر بھی حملے کی بلا نازل ہوئی۔ پھر قدیش کی باری آئی، جو ہکسوس کی فتنہ انگیزی کا مرکز تھا۔ اس کے ساتھ عام رسم کے مطابق سلوک ہوا یعنی شہر تباہ کر دیا گیا۔ درخت کٹوا دیے گئے۔ غلہ برباد کر ڈالا گیا۔[۳] چند سال بعد پھر تھوتمس نے اس پر حملہ کیا، ان تمام شہروں کے اردگرد فصیلیں تھیں اور حفاظت کے عمدہ انتظامات کر لیے گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری بیانات میں اہلِ مصر کو متاثر کرنے کے لیے مبالغہ آمیزی کی گئی تھی۔ بعض اوقات "خراج" بہ طور تحفہ ادا کر دیا جاتا تھا تاکہ حملہ آور فوج کے داخلے کی مصیبت سے اہلِ شہر بچے رہیں۔ اس بڑے مصری فاتح کی وفات پر اس کے بیٹے اور جانشین امن ہوتپ ثانی نے پھر فلسطین و شام میں مہمات کا آغاز کر دیا۔ مورخ کا بیان ہے کہ فرعون نے غیظ آلود آنکھوں والے ببر شیر کی طرح لبنان کے علاقوں کو تباہ کر ڈالا۔[۴]

## شام میں میتانیوں کی آمد

یہ حقیقت اپنی جگہ بجا ہے کہ مصری سلطنت کی قوت سب پر آشکار ہو گئی اور اس کا وقار چودھویں صدی قبل مسیح کے موڑ تک بحال رہا، البتہ اس میں اضافہ کوئی نہ ہوا اور نئی سلطنت میں زوال کے آثار شروع ہوئے تو صورتِ حال بدل گئی۔ شام میں صرف میتانیوں کی سلطنت دائرۂ اقتدار سے باہر رہی، جن کا مرکز دریائے خابور پر اُس جگہ تھا، جہاں سے دریائے فرات خم کھا کر جنوب کی طرف مڑتا ہے۔ حوری ہکسوسی جتھے میں شامل تھے۔ میتانی علاقے کی اکثریت انھیں پر مشتمل تھی، لیکن بادشاہوں اور امیروں کے ذاتی ناموں نیز ان کے دیوتاؤں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق ہندی یورپی گروہ سے تھا۔ حوریوں کی آبادی اس زمانے میں اتنی پھیل گئی تھی کہ مصریوں نے کنعان کو "خورو" کہنا شروع کیا۔

---

[۱] مصری سرگزشت میں (...) کلاسیکی سیمیروس (...) صحیفہ تکوین (بائیبل) باب ۱۰، آیت ۱۸
[۲] ۱۹۵۶ء میں ساحل سے تین میل اندر کی طرف کھدائی ہوئی تو یہ برآمد ہوا۔ [۳] (...) غالباً یہ مقام طرطوس ہے۔ [۳] برچرڈ صفحہ ۲۳۹۔ [۴] بریسٹڈ جلد دوم۔

Marfat.com

جن حوریوں کا ذکر عہد نامۂ قدیم (بائبل) میں آیا ہے، انھیں ماضی قریب تک ابتدائی زمانے کا ایک معمولی اور ناقابلِ ذکر قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب ثابت ہو گیا ہے کہ ان سے مراد یہی حوری تھے ابتدا میں اس نام کا ترجمہ "غاروں میں بسنے والے" کیا گیا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ترجمہ غلط تھا اگرچہ فرعون احموس اوّل نے تہرین پر حملے کا آغاز کر دیا تھا۔ تھوتمس ثالث اور اس کے جانشینوں نے بھی یہ سلسلہ قائم رکھا، لیکن میتانی سلطنت بحال رہی۔ ایک مہم کی تیاری میں تھوتمس نے ان دیوداروں کی کشتیاں بنوائی تھیں جو جبیلہ کے عقبی پہاڑ پر تھے اور انھیں بیل گاڑیوں پر رکھ کر دریائے فرات میں اس گھاٹ پر پہنچایا گیا تھا، جہاں سے فوج عبور کا قصد رکھتی تھی[۱]۔ پھر رشتۂ ازدواج کے ذریعے سے مصری اور میتانی فرمانرواؤں کے درمیان دوستی پیدا ہو گئی مثلاً امنوتپ ثالث (۱۴۱۳ق م۔ ۱۳۷۷ق م) کی ماں ایک میتانی شہزادی تھی۔ اس کی ایک بیوی بھی میتانی تھی۔ اس کے بیٹے امنوتپ رابع (۱۳۷۷ق م۔ ۱۳۵۸ق م) کے حرم میں بھی ایک میتانی شہزادی موجود تھی، جو تشرتہ بادشاہ کی بیٹی تھی۔ شام کی جانب سے میتانیوں کو مصریوں کے ساتھ دوستی کے بعد اطمینان ہو گیا، لیکن شمالی جانب سے خطرے کے نئے بادل تند و تیز سے اٹھے۔ یہ حتی تھے۔ کوہ طارس کی دیواریں ان کا راستہ نہ روک سکیں۔

## ایک نئی عالمی قوت

جن لوگوں کو سرسری طور پر حتّی کہا جاتا ہے، یہ اصلاً اناطولیہ کے ایک غیر معروف قبیلے کے لوگ تھے، جو دریائے ہلیس[۲] (قزل ارماق) کے علاقے میں رہتے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کا نام حتّی رکھ لیا تھا۔ سولھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں انھوں نے ایک سلطنت کی بساط بچھائی، جس میں پورا اناطولیہ نیز شام اور عراق کا بڑا حصہ شامل تھا۔ حوریوں کی طرح ان کے سر بھی چوڑے تھے۔ ناکیں ابھری ہوئی، پیشانیوں کا رجحان پیچھے کی طرف تھا اور چہرے کے خطّ و خال ایسے ہی تھے جیسے الپائی نمونے کے ہوتے ہیں۔ مشرقی اناطولیہ اور آرمینیا میں اب بھی اس نمونے کے لوگوں کی کثرت ہے۔ تھوڑی ہی مدت بعد ان لوگوں کا امتزاج حتّی یورپی نسل سے ہو گیا۔ عبرانی لوگ انھیں حتّی کہتے تھے، جس سے انگریزی کا لفظ حتّی بنا۔

حتّی سلطنت شبیلولیوما[۳] (۱۳۸۰ق م۔ ۱۳۵۵ق م) کے عہد میں اوجِ کمال پر پہنچی۔

---

[۱] برسٹڈ جلد دوم نیز سٹینڈارف اور سیل صفحہ ۵۹۔

[۲] جس کا ترکی نام آج کل قزل ارماق ہے۔ [۳] Shubbliuma۔

یہ شخص عہدِ قدیم کا بہت بڑا جنگجو تھا۔ اسی نے اشترتہ پر حملہ کیا تھا اور اس کے بیٹے کے عہدِ حکومت میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ میتانی سلطنت کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی۔ حتی بادشاہ کی پیش قدمی نے میتانی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا اور شمالی شام میں ایک پائدار و استوار حکومت قائم کر دی۔ تاہم ساتھ ہی فراعنۂ مصر سے مقابلہ آپڑا۔ مصریوں سے اس نے شمالی فونیقیہ جبیلہ کے جنوب تک چھین لیا۔ چھینے ہوئے علاقے میں اغاریت بھی شامل تھا جو اس زمانے میں فونیقیہ کی ممتاز شہری ریاست بن گیا تھا اور جس کے امیر نقمد نے نئے آقا کو خراج دینا فی الفور منظور کر لیا۔ شبیلو لیوما نے طارس کے جنوب کرشمش نام (جسے آج کل جرابلس کہتے ہیں) ایک مستحکم فوجی مرکز قائم کیا۔ بہرحال حتی سلطنت مغربی ایشیا میں بہ اعتبار قوت سب پر فوقیت لے گئی اور مصر کو نئے دشمن سے دو چار ہونا پڑا۔

## بین الاقوامی ہنگامہ

حتیوں کی سلطنت تازہ دم اور قوی و طاقتور تھی۔ اس کے برعکس مصری سلطنت معرضِ زوال میں آچکی تھی۔ پھر بدقسمتی سے اس نازک موقع پر اس کے نظم و نسق کی باگ ڈور ایسے بادشاہ کے ہاتھ میں آئی، جسے سلطنت کے دفاع سے کہیں زیادہ مذہبی امور کے ساتھ دلچسپی تھی۔ یہ امن ہوتپ چہارم (۱۳۷۵ء ق م۔ ۱۳۵۸ء ق م) تھا جو اخناتون کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے محبوب دیوتا "آتون" (قرص خورشید) کے نام کا جزو بنا لیا تھا۔ اس نے محض نام بدلنے پر قناعت نہ کی، بلکہ پائے تخت بھی تبدیل کر دیا یعنی تھیبز کو چھوڑ کر (جو آمن دیوتا کا مرکز اور مصر کی مذہبی سرگرمیوں کا سرچشمہ تھا) شمال میں اس نے نئے مقام پر تخت گاہ بنالی جس کا نام "اخناتون" رکھا۔ آج کل یہ تل العمارنہ کے نام سے شہرت پذیر ہے۔ اسی شہر کے کھنڈروں میں مصر کی ایک دہقانی خاتون نے ۱۸۸۷ء میں ایک ایسی دریافت کی کلید مہیا کی، جو مشرق قریب کے آثارِ قدیمہ میں اب تک ممتاز سمجھی جاتی ہے۔ یعنی مٹی کی وہ تختیاں جن پر بابلی رسم الخط میں اس فرعون (اخناتون) اور اس کے باپ امن ہوتپ ثالث کے کارنامے ثبت ہیں۔ ان تختیوں میں کنعانی شہری ریاستوں کے امیروں کی طرف سے قریباً تین سو خط بھی ملے جو مصری دربار میں بھیجے گئے تھے۔ یہ مجموعۂ خطوط پورے علاقے کے متعلق اس عہد کی معلومات کا نہایت اہم سرچشمہ ہے۔ اس زمانے میں اکادی زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی، لیکن

Marfat.com

صرف ونحو اور الفاظ میں کنعانیت سے بالکل ظاہر ہے کہ خط لکھنے والے اجنبی زبان استعمال کر رہے تھے۔ کنعان دو دائرہ ہائے اثر میں منقسم تھا۔ ایک میں مصریت کا زور تھا، دوسرے میں حتیت کا۔ شہری ریاستوں کے امراء بین الاقوامی سطح پر سازش میں مصروف تھے۔ وہ ایک بڑی طاقت کو دوسری بڑی طاقت کے خلاف استعمال کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ تاہم قومی سطح پر ان کے درمیان چھوٹی رقابتیں ہی نہیں خاصے بڑے تنازعات بھی موجود تھے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ سیر و گردش کرنے والے جتھے جنھیں "خبیرو"[۱] کہتے تھے (انھیں عبرانی نہ سمجھنا چاہیے، جنھیں عبریم کہتے تھے) شہری گروہوں پر حملے کر رہے تھے اور یہ امر عام عدم تحفظ میں ایک عامل کا اضافہ کر رہا تھا[۲]۔ خط و کتابت سے واضح ہے کہ جبلہ، بیروت، عمور، صیدا اور عکہ نے ایک ڈھیلی ڈھالی نیم خود مختار جمعیت بنالی تھی۔ جبلہ کو اس جمعیت کا رئیس بنایا گیا تھا۔

## سیاسی دغابازی

ایک اموری رئیس کا نام عبد عشرق تھا اور اس کا صدر مقام دریائے عاصی کے بالائی حصے میں واقع تھا۔ اس نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ کبھی حتیوں سے تعاون کا رشتہ جوڑ لیتا اور کبھی مصریوں کے روبرو اطاعت کا یقین دلاتا۔ اس کا اصل مدعا صرف یہ تھا کہ جس طور پر بھی ممکن ہو حکمرانی کے دائرے کو وسعت دیتا چلا جائے۔ ساحلی علاقے اور اندرون ملک کے قصبے اور شہر یکے بعد دیگرے عبد عشر اور اس کے بیٹے عزیرو کے قبضے میں آتے گئے یا ان قصبوں کو وہ خود اور ان کے معاون لوٹتے رہے۔ مصر کے بعض خراج گزاروں کو روپیہ دے کر ساتھ ملا لیا گیا، بعض کو ختم کر دیا گیا۔ قطنہ اور حماہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ آگے چل کر دمشق بھی انھیں کے تصرف میں آ گیا۔ جو شہر ساحل پر واقع تھے، ان ہی سے ارادس (ارواد) شگاتا (غالباً وہی مقام جسے آج کل شکہ کہتے ہیں)[۳] امیی (زاتقہ) اور بترونہ (البترون) مسخر ہو گئے۔ ارقت سے ایک خط امن ہوتپ ثالث کو لکھا گیا تھا جس میں باشندوں کو غیر متزلزل وفاداری پر خاص زور دیا گیا تھا۔ اس کی ابتدائی عبارت یہ تھی:

"شہر ارقتہ اور اس کے شرفا اپنے شاہنشاہ اور آقا کے قدموں میں سات مرتبہ، پھر سات مرتبہ زمین بوس ہو کر عرض پرداز ہیں ...."[۴]

---

[۱] Apiru [۲] ساہرس گارڈن کی کتاب Introduction to Old Testament Times ص ۲۶

[۳] کلاسیکی ارقہ موجود عرقہ (یاقوت عرقہ) طرابلس سے بارہ میل شمال مشرق میں ہے۔ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں بھی یہ مذکور ہے۔ شگاتا کو بعض لوگ موجودہ زمانے کا زغرتا سمجھتے ہیں۔ امیی اشوریوں کا امپا ہے۔ عربوں کا انفہ، صلیبیوں کا نفین۔ یہ شکہ اور طرابلس کے درمیان ہے۔

Marfat.com

اسی شہر سے عبد عشرتا نے ایک خط فرعون کو بھیجا تھا۔ جس کا اسلوب عبارت آج یقیناً بہت پست اور ذلت خیز بھی ہو گا، تاہم اس عہد میں سیاسی تحریرات کا طریقہ یہی تھا۔ خط مظہر ہے:

"بادشاہ، سورج دیوتا اور آقائے محترم سے اس کا غلام عبد عشرتا عرض پرداز ہے، جو اس کے قدموں کی خاک ہے۔ وہ اپنے بادشاہ آقائے محترم کے پاؤں پر سات مرتبہ، پھر سات مرتبہ گرتا ہے۔ ہاں، میں بادشاہ کا غلام ہوں، اس کے گھر کا کتا ہوں۔ میں اموریوں کی پوری سرزمین کی حفاظت بادشاہ، آقائے محترم کے لیے کر رہا ہوں[۱]۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اہل ارواد تھوتمس کے زمانے میں مصریوں کے سخت خلاف ہو گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھیں جبیلہ سے تجارتی رقابت تھی۔ صرف صمیرا (جہاں مصری نائب السلطنت مقیم تھا) اور جبیلہ (جہاں کا کنعانی گورنر اب عدی مصریوں کا حامی تھا) مخالفوں کے مقابلے پر ڈٹے رہے۔ اب عدی کا دائرہ حکومت اندرون ملک میں پھیل کر صمیرا تک پہنچا ہوا تھا۔ آخر کار صمیرا بھی مقابلے پر ٹھہر نہ سکا اور مسخر ہو گیا۔ جب جبیلہ کا رشتہ اندرون ملک سے منقطع ہو گیا اور مصر کے ساتھ لکڑی کی تجارت تعطل میں آ گئی (کیونکہ لکڑی اندرون ملک ہی سے دستیاب ہو سکتی تھی) تو جبیلہ کے لیے بھی مقابلہ جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔ وہاں کے وفادار امیر نے یکے بعد دیگرے قریباً پچاس خط بادشاہ مصر کو لکھے۔ ان میں بار بار فریاد کی گئی تھی، بتایا گیا تھا کہ عبد عشرتا (جسے کتا کہا گیا ہے) اور اس کا بیٹا عزیزو غداری پر کاربند ہیں، پرزور التجائیں کی گئی تھیں کہ کمک بھیجی جائے۔ مگر کسی خط کا اطمینان بخش جواب نہ ملا۔ بیروت (بی۔ رو۔ تا) اور صیدا (صی۔ رو۔ تا) سے بھی اپیلوں پر اپیلیں کی گئیں کہ وہ اپنی ہمسر شمالی شہری ریاست (جبیلہ) اور اس کے حکمران کا ہاتھ بٹائیں، جو بری طرح شکنجے میں کسا جا چکا تھا، لیکن اپیلیں بھی بے نتیجہ رہیں۔ ایک تختی میں جو ٹھیک طرح محفوظ نہ رکھی جا سکی، مصری کارندے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے جنگجوؤں سے بھرے ہوئے جہاز اموریوں کے خلاف امداد کے لیے جلد سے جلد پہنچانے کا وعدہ کیا۔ مگر یہ وعدہ بھی ایفاء سے محروم رہا۔

ایک موقع پر امن ہوتپ نے تھوڑی سی سرگرمی دکھائی اور ایک فوج بھیج دی — خود فوج لے کر نہ پہنچا، جیسا کہ اس کے پیشرو تھوتمس کا شیوہ تھا — اس فوج نے صمیرا کو دشمن کے قبضے سے واپس لے لیا اور عارضی طور پر بغاوت کی آگ فرو ہو گئی۔ تاہم یہ فوج اس زبردست خطرے سے کیوں کر

---

[۱] جے۔ اے۔ کنڈزن (Knudtzon)

Marfat.com

عہدہ برآ ہوسکتی تھی، جو حتیوں کی پیش قدمی کے باعث سیل کی طرح شمالی جانب سے بڑھا چلا آرہا تھا۔

عبد عشرتا مارا گیا۔ اس طرح عامل تو دائرے سے خارج ہوگیا، لیکن عمل بدستور جاری رہا۔ اس کے بیٹے عزیرو نے باپ کی فریب کارانہ پالیسی بدستور قائم رکھی۔ ۱۳۷۷ھ ق.م میں اخناتون مصر کے تخت پر بیٹھا۔ اس سے مصر میں صورتِ حالات پہلے سے بدتر ہوگئی۔ رب عدی نے فرعون کے سامنے مصائب کی داستان کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ وہ لکھتا ہے:

"پہلے ایک مصری کو دیکھتے ہی کنعانی فرمانروا راہِ گریز اختیار کر لیتے تھے، لیکن اب عبد عشرتا کے بیٹے مصریوں کا مذاق اُڑاتے ہیں اور خونریز ہتھیاروں سے مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔"[۱]

اُلّازہ اور اردا تا[۲] پر جلد عزیرو قابض ہوگیا۔ اغاریت کا نصف حصہ آگ سے جل گیا۔ عمیرا پھر مصریوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور اسے تباہ کر ڈالا گیا، کیونکہ عزیرو کو خیال تھا، کہیں حتی اس پر قابض نہ ہوجائیں۔ جب فرعون نے اس شہر کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا حکم عزیرو کو بھیجا تو اس نے حکم کی تعمیل کا وعدہ کر لیا، لیکن کہا کہ اس کام میں ایک سال صرف ہو جائے گا۔ کیونکہ میں بادشاہ کے دوسرے شہروں کو حتیوں کے تصرف سے محفوظ رکھنے میں بے طرح مصروف ہوں۔ اس نے دوسرے خطوں میں بتایا کہ حتیوں ہی کی پیشقدمی کے باعث میں بادشاہ نا عیبۂ جمال کی زیارت کے لیے دربار میں نہیں آسکا ورنہ خود حاضر ہو کر پورے حالات سناتا اور اپنی کیفیت بیان کرتا۔[۳]

## رب عدی کی داستانِ درد

اس اثناء میں رب عدی کے حالات مایوس کُن نہیں تو بدتر ضرور ہو رہے تھے۔ اس نے بہت سے قاصد مصر بھیجے، مگر وہ سب خالی ہاتھ واپس آئے۔ پھر اس کے بھائی نے جُبیلہ کی حوالگی کے لیے عبد عشرتا سے ساز باز شروع کر دیا۔ وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ پرندے کی طرح جال میں پھنس گیا ہے۔ اس نے اپنی بہن اور بچوں کو پناہ کے لیے صور بھیج دیا۔ صور کا امیر ابی ملکی غیر مطمئن اور باغی گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی رب عدی کی طرح دردناک خطوط بھیج رہا تھا۔ آخر تنگ آکر بہادر اور وفادار امیر جُبیلہ سے بھاگ کر

---

۱؎ تذری ۱۰۹ ۔

۲؎ اُلّازہ کلاسیکی ارتھوسیا، موجودہ ارض ارتوسی۔ یہ نہر الباردو کے دہانے پر طرابلس کے شمال میں ہے۔ اردا تا، اردہ ہے جو غزۃ کے قریب ہے۔

۳؎ تذری ۱۲۶-۱۲۷ ۔

Marfat.com

بیروت[1] چلا گیا، جہاں کے حاکم امونیرہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ تھا۔ اس کی بیویاں اور بیٹے عزیرو کے حوالے کر دیے گئے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ بیروت نے معاملاتِ عالم میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ اس کا دورِ عروج آگے چل کر رومیوں کے عہد میں شروع ہونے والا تھا۔ امونیرہ نے بھی دوسرے خراج گزار امیروں کی طرح اپنے "بادشاہ"، اپنے "مالک"، اپنے "سورج دیوتا"، اپنے "معبود" اور اپنی "روحِ حیات" سے عاجزانہ التماسیں کیں، بلکہ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں نے اپنے "بادشاہ" اور اپنے "مالک" کی فوجوں کے لیے گھوڑے، رتھیں اور جو کچھ میری دسترس میں تھا، مہیا کر رکھا ہے[2]۔ جب اس کی التجائے امداد کا کوئی جواب نہ آیا تو اس نے عالمِ اضطرار میں لکھا:

"اگر میرے بادشاہ اور میرے آقا کا حکم یہ ہے کہ میں اپنی اور بادشاہ کے اس شہر کی حفاظت کروں، جو میری تحویل میں دیا گیا ہے تو فرمایا جائے اپنی اور شہر کی حفاظت کیوں کر کروں۔ پہلے بادشاہ کی ایک فوج یہاں میرے پاس رہتی تھی اور بادشاہ ایاری ہوتا[3] سے فوج کے لیے غلہ بھیجا کرتا تھا، لیکن عزیرو نے بار بار مجھ پر حملے کیے اور اب میرے پاس نہ مویشی ہیں اور نہ کھانے پینے کا سامان ...... میرے شہر عزیرو کے قبضے میں چلے گئے اور اب وہ مجھ سے اطاعت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ میں کیوں اس کی اطاعت کروں؟ عزیرو کے بیٹوں کو کتے سمجھتا ہوں۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے بیدردی سے کام کر رہے ہیں اور وہ جہاں پہنچتے ہیں، شہروں سے شعلے اٹھنے لگتے ہیں[4]۔"

بیروت کو خطرہ پیدا ہوا تو رب عدی وہاں سے جنوب کی طرف بھاگ گیا۔ عیدا پہنچا تو وہاں کا امیر زمریدہ عموریوں سے اتحاد کا پیمان استوار کر چکا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی رب عدی عزیرو کے چنگل میں پھنس گیا اور لبنان کی ابتدائی تاریخ کی ایک نہایت الم انگیز شخصیت اپنی وفا کیشی کی پاداش میں ختم ہو گئی۔

---

[1] فونیقی میں بیروت کے معنی کنوؤں کے ہیں۔ اس شہر کا ذکر تاریخ میں پہلے پہل تھوتمس ثالث کی فہرست میں آیا تھا۔ عہد نامہ قدیم میں کوئی ذکر نہیں۔ صحیفہ یشوع میں مذکور ہے، باب ۹، آیت ۱۷۔ باب ۱۸، آیت ۲۵۔

[2] سٹینڈارف اور سیل صفحہ ۱۰۹۔

[3] یہ مقام ابھی تک متعین نہیں ہوا۔ صحیفہ یشوع میں یرموت نام ایک مقام آیا ہے، جسے خربہ یرموک کہتے ہیں۔ یروشلم سے جنوب مغرب میں سولہ میل کے فاصلے پر ہے۔

[4] سٹینڈارف اور سیل صفحہ ۱۰۷۔

Marfat.com

یوں مصر کو محض شمالی شام ہی نہیں بلکہ فونیقیہ سے بھی دست بردار ہونا پڑا، جو خام اشیا کا نہایت اہم مرکز تھا۔ شام، لبنان اور فلسطین زیادہ سے زیادہ باہمدگر علیحدہ ہونے لگے۔ عموری اور حتی شمالی و وسطی شام اور ساحلی علاقے میں قدم جما چکے تھے۔ خبیرو فلسطین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تقریباً بارہ سال یا زیادہ مدت کے بعد بدنظمی کا دور ختم ہو رہا تھا۔ اخناتون کے بعد جو فرعون تخت پر بیٹھا۔ اس نے مغربی ایشیا کی کھوئی ہوئی سلطنت کو بحال کرنے کے لیے زبردست مہم کی تیاری شروع کر دی +

## آخری فیصلہ

سلطنت مصر کا ایشیائی علاقہ تھوتمس ثالث نے حاصل کیا تھا، اخناتون نے اسے کھو دیا۔ پھر فرعون سیتی اول (۱۳۱۲ ق م - ۱۲۹۸ ق م) نے جس کا تعلق انیسویں شاہی خاندان سے ہے، چھینی ہوئی سلطنت کی بازگیری کے لیے قدم اٹھایا۔ اس فرعون نیز رعمسس ثانی کی حنوط شدہ لاشیں قاہرہ کے مصری عجائب خانے میں موجود ہیں۔ یہ اتنی اچھی حالت میں ہیں کہ اگر ان کی رعایا کا کوئی فرد زندہ ہوتا تو چہرے دیکھتے ہی دونوں کو پہچان لیتا۔ سیتی کے کارناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسطین ہوتا ہوا لبنان پہنچا، جہاں ساحلی علاقے کے مقامی امرائے اطاعت کا اقرار کیا۔ اس طرح مصری معبدوں کے دیودار کی بہم رسانی کا انتظام ہو گیا۔[۱] پھر اس نے شمال کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ وہ صیرا اور آرادہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیشرو تھوتمس ثالث نے بھی ساحلی علاقے ہی پر پہلے پہل قبضہ جمایا تھا۔ اس قبضے کے بعد سیتی کو اطمینان ہو گیا کہ اب مصر سے سمندر کے راستے مزید مہمات کے لیے فوجیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ غالباً یہ عام فوجی چالیں تھیں۔ جبلہ کے بحری مرکز کو بعض اوقات جہاز سازی کے لیے استعمال کیا گیا۔ ان جہازوں کے لیے دیودار کی لکڑی کام میں لائی جاتی تھی۔ لبنان کے بڑے بڑے رئیس حاضر ہوتے اور فرعون سے عرض کرتے: آپ تو اپنے باپ رع کی مانند ہیں۔ آپ کے دیدار سے جسم میں روح تازہ ہوتی ہے۔[۲] مہم کا اختتام یوں ہوا کہ حتیوں سے صلح کا معاہدہ ہو گیا، لیکن ظاہر ہے کہ اس صلح کا صاف مقصد یہ تھا کہ اصل سرزمین کی سیادت ابھی تک معرض بحث میں ہے۔ التوائے جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حتیوں کے بادشاہ موتلش[۳] نے شام، عراق اور ایشیائے کوچک کے تمام حصوں سے تیس ہزار فوج جمع کی۔ ادھر

---

[۱] برسٹڈ جلد سوم + [۲] ایضاً ایضاً +
[۳] Muwattalish

مبنی کے بیٹے اور جانشین رعمسس ثانی (۱۳۰۱ ق م تا ۱۲۳۴ ق م) نے اتنی ہی فوج جنگی رتھیں اور غیر ملکی تنخواہ دار فراہم کیے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ لبنان پہنچا۔ پھر وادی لیطانی میں سے مشرق کی جانب مڑ گیا اور وادی عاصی کے بالائی حصے میں پہنچ گیا۔ قدیش میں حتیوں کی ایک چوکی تھی۔ اس سے قریب مصری فوج پر اچانک کمین گاہ سے نکل کر حملہ کیا گیا (تقریباً ۱۲۹۶ ق م) جس میں مصری فوج تباہی کے قریب پہنچ گئی۔ صرف رعمسس کی ذاتی جوانمردی اور اعلیٰ قیادت نے اسے بچا لیا۔ دستاویزیں مظہر ہیں کہ رعمسس نے دشمن کو دریائے عاصی کی طرف دھکیل دیا۔ "انھیں دریا میں اس طرح گرایا، جیسے مگرمچھ گرے ہوتے ہیں۔ وہ اوندھے منہ گرے، ایک کے اوپر ایک اور جسے چاہا موت کے گھاٹ اتار دیا۔"[1] واقعہ یہ ہے کہ رعمسس بمشکل جان بچا سکا۔ پھر بار بار کوششیں کی گئیں لیکن کوئی قطعی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر ۱۲۸۰ ق م میں مصریوں اور حتیوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہو گیا، جس پر رعمسس اور حتوشلش[2] نے دستخط کیے۔ آخر الذکر موتلش کا بھائی اور حتیوں کا دوسرا بادشاہ تھا۔ ایک دوسرے پر حملے نہ کرنے کا یہ معاہدہ مصری رسم الخط (ہیروغلافی) اور حتی رسم الخط (پیکانی) میں اب تک محفوظ ہے اور یہ اپنی نوعیت کی ایک اولین دستاویز ہے۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے امن اور اچھا برادرانہ تعلق پیدا ہو جائے۔ اس کے رو سے شمالی شام بشمول عموری حتی مقبوضہ مان لیا گیا۔ جنوبی شام، شمالی فلسطین مصریوں کے قبضے میں باقی رہا۔ فونیقی ساحل پر بھی مصریوں کی سیادت بحال رہی

انھیں مہموں کے دوران میں رعمسس نے اپنے فوجی کارناموں کو سنگ تراشی یا کتبات کی شکل میں محفوظ کر دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ انھیں میں سے وہ کتبے ہیں جو دریائے کلب کے دہانے پر ہیں۔ ممکن ہے یہ سرحد کا ایک نشان ہو، یعنی اس جگہ سلطنت مصر کی شمالی حد ختم ہوتی تھی۔ تین کتبوں میں سے ایک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک قیدی کو اپنے دیوتا "تاہ" کے لیے قربان کر رہا ہے۔ ایک اور کتبے میں اس نے ایک قیدی کو اپنے دیوتا "آمن راع" کے روبرو بالوں سے پکڑ رکھا ہے۔ یہی کتبہ ہے، جسے ۱۸۶۰ء میں فرانسیسی فوج نے رگڑ کر خراب کر دیا تھا۔ ان کتبوں اور نئی سلطنت کے دور کی ان تصویروں سے، جو تھیبز کے مقبروں کی

---

[1] سٹینڈارڈ اور سیل صفحہ ۲۵۱ +

[2] Hattushilish +

دیواروں پر ہیں۔ اس خطے کے باشندوں کے چہروں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، جو دو ہزار سال کے نصف آخر میں یہاں تھے۔ تصویروں پر مرقوم ہے: "یہ رئیس لبنان ہے"۔ لباس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ سادہ سا تہبند لپیٹ رکھا ہے، جو کمر سے گھٹنوں تک ہے۔ دوسرا لباس سفید رنگ کا ہے، لمبی آستینوں والا۔ یہ ٹخنوں تک پہنچتا ہے۔ کنارے نیلے اور سرخ رنگ کے فیتوں سے مزین ہیں۔ اکثر تصویروں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مردوں کے بال بالکل گھٹے ہوئے نہیں تو باریک ترشے ہوئے ضرور ہیں۔ عورتوں نے لمبا، رنگین اور پھولدار لباس پہن رکھا ہے، جو آج کل کے لباس شب خوابی سے زیادہ مختلف نہیں +

**مصری اقتدار کا خاتمہ** بیسویں صدی کے فراعنہ میں سے کسی نے بھی ان مقبوضات کو محفوظ رکھنے کا عزم ظاہر نہ کیا، جو انیسویں خاندان کے پیشروؤں نے دشمن سے واپس لے لیے تھے۔ مصر کے قبض و تصرف میں انحطاط آ گیا۔ ۱۱۰۰ ق م کے آس پاس فرعونی دربار سے ایک شخص وین آمن کو لکڑی لانے کے لیے لبنان بھیجا گیا تھا۔ اس نے صورت حالات کے متعلق ایک نہایت عمدہ روداد تیار کی۔ جبیلہ کے رئیس نے اس سے کوئی اچھا برتاؤ نہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لبنان کے رئیس فرعونی نمائندوں سے عزت کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ وین آمن لکھتا ہے:

"میرا جہاز انیس دن (جبیلہ کی) بندرگاہ میں ٹھہرا، اور رئیس کی طرف سے روزانہ پیغام آتا تھا کہ دیکھنا، بندرگاہ سے دور ہی رہنا، حالانکہ تل العمارنہ کی تختیوں سے واضح ہوتا ہے کہ فونیقی بندرگاہوں کے امراء فراعنہ کے روبرو بہت ہی ذلت خیز طریقے اختیار کرتے تھے۔ اس سفیر کو جس کام کے لیے بھیجا گیا تھا، اس سے اک گونہ مایوسی ہو گئی بلکہ اسے اپنی جان کے متعلق خطرہ محسوس ہوا۔ بہرحال فرعون کا سفیر مقامی حکمران زکربعل کے سامنے بالکل بے بس تھا۔ وہ کنارے ہی پر پڑا اپنی تقدیر پر آنسو بہاتا رہا۔ غالباً اس کے پاس کاغذات نمائندگی بھی موجود نہ تھے، جن کے بغیر دیودار کی قیمت ادا کرنی لازم تھی۔ ایک موقع پر فونیقی حکمران آئے ایک مصری مغنیہ کو نمائندے کی تفریح کے لیے بھیج دیا۔ حاکم کے ایک ملازم نے بڑے جوش سے مصری نمائندے کے حق میں تقریر کی۔ آخر زکربعل کے دل میں رحم کی لہر پیدا ہوئی۔ وہ صبح کے وقت معبد میں مذہبی رسوم ادا کر کے لوٹا اور اپنے بالائی ایوان میں کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سمندر کی لہریں نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس موقع پر اضطراب زدہ

Marfat.com

اور پریشان حال نمائندے کو بار یابی کا موقع ملا۔ اس نے سفیر سے کہا:

"بانی رہا میں تو میں نہ تیرا نوکر ہوں نہ اس شخص کا نوکر ہوں، جس نے تجھے بھیجا۔ اگر میں ایک صدا لگاؤں تو آسمان کے دروازے کھل جائیں اور لکڑی کے شہتیر سمندر کے کنارے پر آکر پہنچیں[1]"

نمائندے نے فرعون کے حقوق پیش کرتے ہوئے کہا: یہ سمندر اسی کا ہے۔ لبنان بھی اسی کا ہے، جسے تو اپنا بتا رہا ہے[2]، لیکن یہ سب کچھ بالکل بے اثر ثابت ہوا۔ جُبلہ کے امیر نے مصر کی تہذیبی برتری تو مان لی لیکن اقتدار اعلیٰ سے صاف انکار کر دیا۔ جب پوری قیمت وصول ہو گئی، جس میں پانسو بلندے پیرس کے بھی تھے تو زکر بعل نے تین سو آدمیوں کو بھیجا کہ شہتیر کاٹیں اور بیل گاڑیوں میں لاد کر نمائندے کے حوالے کر دیں +

یہ حالات تھے، جب پوری رنگا رنگ سیاسی تصویر میں نمایاں تغیر پیدا ہو رہا تھا۔ ایک نئی سامی قوم یعنی ارامیوں نے شام کے اندرونی حصے میں قدم جما لیے تھے۔ دمشق ان کا مرکز تھا۔ یہ لوگ ابتدا میں صحرا سے آئے تھے۔ ایک اور سامی گروہ یعنی عبرانی جنوبی شام پر قابض ہو چکے تھے، جسے آگے چل کر فلسطین کہا گیا[3]۔ ہنری یورپی گروہ میں سے ایک کامل اجنبی جتھے نے ساحلی علاقے کو پامال کر ڈالا تھا اور وہ مغربی حصے پر قابض ہو گئے تھے۔ گویا اس وقت سے لبنان کے معاملات میں حتیوں اور مصریوں کی کارفرمایانہ حیثیت باقی نہیں رہی تھی +

---

ا برسٹڈ جلد ۴ + ۲ ایضاً ایضاً +

۳ ہیروڈوٹس (کتاب ۱، باب ۱۰۵) پہلا شخص تھا جس نے فلسطین نام استعمال کیا +

Marfat.com

## ساتواں باب

# دورِ آزادی

# تجارت، فنون اور نو آبادیاں

**ارامی** چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح میں عراق کا بڑا حصہ نیز شمالی اور وسطی شام کو سامیوں کے ایک اور گروہ نے پامال کر ڈالا۔ یہ ارامی تھے۔ رفتہ رفتہ تمام مقامی باشندے خواہ وہ اموری تھے یا حوری یا حتی، یا تو نئے حملہ آوروں کے تسلط میں دب گئے اور باہر دھکیل دیے گئے۔ لبنان کی کوہستانی دیوار نے اس سیل کو مغربی جانب نہ بڑھنے دیا۔ اس طرح کوہستانی علاقے میں قدیم اموری اور حتی گروہ بہ اطمینان زندگی بسر کرتے رہے اور ساحلی میدان کی کنعانیوں کی بستیاں بالکل محفوظ رہیں سنہ قدم کے آس پاس دمشق میں نئے سامی آباد ہو چکے تھے اور یہی مقام آگے چل کر قائم ہونے والی ارامی سلطنت کا مرکز بنا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نووارد لوگ ان اموریوں اور کنعانیوں کی اعلیٰ ثقافت سے مستفید ہوتے گئے، جن کے درمیان وہ آ بسے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنی ثقافت کی ایک اہم چیز انھوں نے محفوظ رکھی، یعنی زبان۔ اسرائیلی اور فلسطینی تیرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر اور بارھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں آ کر ارامیوں کے جنوب میں آباد ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے برعکس ارامیوں نے اپنی ابتدائی بولی نہ چھوڑی یہی بولی آگے چل کر حضرت مسیح علیہ السلام کی مادری زبان بنی اور پورے ایشیا کی لسانی زندگی میں اس نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ارامیوں کے پھیلاؤ میں یہ امر بہ طورِ خاص مستحق توجہ ہے کہ یہ پھیلاؤ سیاسی نہ تھا بلکہ تجارتی سرگرمی کا ایک کرشمہ تھا۔ مسیح سے آٹھویں صدی پیشتر کنعانی کی جگہ ارامی زبان پورے شام کی زبان بن چکی تھی اور یہ ساتویں صدی عیسوی تک بدستور قائم رہی، یہاں تک کہ شام کو مسلمانوں نے مسخر کر لیا پھر اس کی بجائے عربی اس خطے کی زبان بن گئی +

ارامی سلطنت گیارھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں قائم ہوئی اور یہی زمانہ ہے جب عبرانی

Marfat.com

سلطنت معرض وجود میں آئی۔ اس میں شام کا وہ پورا علاقہ شامل تھا جو کوہستان لبنان کے مشرق میں ہے۔ نیز شمالی شام اور بسن[1] اس کے اجزا تھے۔ اس سلطنت کا مرکز دمشق تھا۔ جو یونانیوں کے عہد میں شام کا مترادف بن گیا اور عہد نامہ قدیم میں بھی اسی مفہوم کے مطابق استعمال کیا گیا۔

**فلسطینی**

تیرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر اور بارھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں ایشیائے کوچک اور بحیرۂ ایجیہ کے باشندوں میں ایسی نقل و حرکت شروع ہوئی جس کی صحیح کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اس نقل و حرکت کی وجہ سے تمام قبائل نے اپنی جگہیں چھوڑ کر بحر پیمائی شروع کر دی اور نئے ماملوں کی تلاش میں نکل پڑے، جہاں مقابلۃً اضطراب کے اسباب کم تھے۔ یہ بحری لوگ ہند یورپی نسل سے تھے۔ ممکن ہے، اس سے پیشتر بھی ایسے وہاں آئے ہوں۔ بہرحال مذکورہ بالا تارکین وطن بری اور بحری راستوں سے شام کی جانب چلے، حتیٰ سلطنت کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی۔ ساحلی علاقے کے مقامات یکے بعد دیگرے برباد کر ڈالے گئے۔ اغاریت کنعانیوں کا انتہائی شمالی شہر تھا۔ یہ ۱۳۶۵ ق م میں زلزلے اور آگ سے تباہ ہو چکا تھا۔ اب بالکل کھنڈر بنا دیا گیا اور تاریخ کے صفحات سے ناپید ہو گیا۔ ۱۱۹۱ ق م کے آس پاس یہ بحری لوگ مصر کے ساحل تک پہنچ چکے تھے، جہاں رعمسس ثالث نے انھیں شکست دے کر پیچھے ہٹایا۔ ان کے باقیات شام کے جنوبی ساحل پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فلسطی[2] (فلسطینی) یہاں سے فلستیہ نام پڑا، جو آگے چل کر فلسطین مشہور ہوا۔

جس ساحلی علاقے پر فلسطینی قابض ہوئے، وہ غزہ سے جہاں انھوں نے ایک اہم مرکز قائم کیا، یافہ کے جنوب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس خطے میں قدم جما کر وہ تدریجاً اندر کی طرف بڑھنے لگے اور کنعانیوں کو بے دخل کر کر کے توسیع میں مصروف رہے۔ مصری فراعنہ کی بے شمار تعزیری مہموں اور آمد و رفت کے پے در پے ہنگاموں کے باعث کنعان کی پوری سرزمین قلاش بن چکی تھی۔ لوگ ہمت ہار بیٹھے تھے اور صحرائی یورشوں یا بحر پیماؤں کے چھاپے کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں رہے تھے۔ مشرقی بحیرۂ روم میں بحری قزاقی کا سلسلہ یونان اور ایشیائے کوچک کے بحر پیماؤں میں جاری تھا۔ اب ان میں ایک نئے گروہ کا اضافہ ہو گیا۔ فوجی اعتبار سے فلسطینیوں کو جو برتری حاصل تھی، وہ ان کے اعلیٰ جنگی ہتھیاروں کی وجہ سے تھی۔ ان لوگوں کو

---

[1] Bashan + [2] یہ نام سب سے پہلے رعمسس ثالث کے کتبے میں آیا۔ برسٹڈ جلد ۴ +

ایک نئی دھات پگھلانے اور استعمال کرنے میں مہارت حاصل تھی — لوہا — ان کے جارحانہ اور مدافعانہ ہتھیار لوہے ہی سے بنتے تھے۔ ہمارے سامنے جالوت[1] کی مثال ہے، جو دھات کا خود اور دھات کی زرہ پہنے ہوئے تھا۔ گویا وہ فلسطینی جنگجوؤں کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ فلسطینی زبان میں خود کو قبعہ[2] کہتے تھے۔ یہ نام عبرانی اور عربی میں بھی باقی رہا اور آج کل ٹوپی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فلسطینیوں کے ظہور سے پیشتر اس علاقے میں لوہے کے عام استعمال کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ درست ہے کہ حتیوں کو اس وقت سے لوہے کے متعلق علم تھا، جب وہ ۳۰۰۰ ق۔م سے پہلے بحیرۂ اسود کے کناروں پر آباد تھے، لیکن تانبے کی طرح اس وقت یہ دھات محض شوقیہ استعمال کی جاتی تھی اور اس کا رواج بہت محدود رہا۔ تل العمارنہ کے دور میں لوہے کو بڑی قیمتی دھات بتایا گیا ہے۔ لوہے کا ایک خنجر اور چھلے جن پر سونا چڑھا ہوا تھا میتانیوں کے بادشاہ تسترتا نے فرعون امنہوتپ[3] (وفات ۱۳۷۵ ق م) ثالث کے پاس بطور تحفہ بھیجے تھے۔ حتیوں اور فلسطینیوں نے اس دھات کے متعلق عام معلومات دوسروں سے مخفی رکھنے کا انتہائی اہتمام کیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، فونیقیوں نے جہاز اور رتھ بنانے میں لوہے کا استعمال سیکھ لیا۔ اس طرح اجارہ داری ٹوٹ گئی۔ رفتہ رفتہ لوہے نے برنج کی جگہ لے لی اور یہی استعمال کی عام دھات بن گئی۔ غرض یہ ہندی یورپی حملہ آور ثقافتی سطح کو عہد برنج سے اٹھا کر عہد آہن تک بلند کرنے کے موجب ہوئے۔

**عبرانی** جب ارامی اندرون ملک میں اور فلسطینی جنوبی ساحلی علاقے میں مستقل قدم گاہیں تلاش کر رہے تھے تو تقریباً اسی زمانے میں عبرانی مصر سے باہر نکل رہے تھے اس سے پیشتر عبرانیوں کی ایک حرکت شمالی جانب سے حضرت ابراہیمؑ کی سرکردگی میں ہوئی تھی اور وہ لوگ یہاں آ بسے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اصلاً ارامی (شامی) تھے۔[4] اپنے ہم قوموں سے ارامی میں بات چیت کرتے تھے۔ وہ ایل الیون (خدائے عزوجل) کے معتقد ہوئے اور وہی عبرانی قوم کے جدامجد ہیں، جن کے خدا کو آگے چل کر یہواہ کہا گیا۔ جن عبرانیوں کا ذکر تاریخ میں آیا ہے، وہ دو سامی شاخوں کا مرکب ہیں۔ ایک مصر اور صحرائے شام سے، دوسری شمال کی طرف سے۔ ساتھ ہی ان میں حتی، حوری اور دوسرے غیر سامی عناصر شامل ہو گئے۔

---

[1] صحیفہ سموئیل باب ۱۷، آیت ۵-۷ + [2] ایضاً ایضاً + [3] ملاحظہ ص ۲۲ +
[4] "کتاب پیدائش" باب ۲۵، آیت ۲۰ - باب ۲۸، آیت ۵ - باب ۳۱، آیت ۲۰، ۲۴، صحیفہ استثنا، باب ۲۶، آیت ۵ +

Marfat.com

ان کی زبان کنعانی تھی، جو اُنھوں نے نئے وطن پہنچ کر سیکھ لی اور اسی میں اپنے ہمیشہ زندہ رہنے والے مذہبی علوم محفوظ کیے۔ عبرانیوں نے نئے وطن پہنچنے کے بعد مقامی کنعانیوں اور اموریوں کو بے دخل کر دیا، یا اپنے اندر جذب کر لیا۔ فلسطینی ہمسایوں کے خلاف جنگی سرگرمیوں نے ایک آزاد عبرانی سلطنت کی ضرورت پیدا کی اور عبرانیوں نے حضرت داؤدؑ کے ماتحت ایک مستقل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ ۱۰۰۰ ق م کا واقعہ ہے۔ یوں کنعانیوں کی وسیع سرزمین نوواردوں ــ ارامیوں، فلسطینیوں اور عبرانیوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ صرف لبنانی حصہ اصل شکل میں بحال رہا۔

## سُنہری دور ــ کامل استقلال

اس اثنا میں مصری اور حتی سلطنتیں زوال پذیر تھیں اور اشوریہ کا اخترِ اقبال ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا۔ یوں فونیقیہ کو اپنی آزادی بر سرِ کار لانے کا زرّیں موقع مل گیا۔ تقریباً تین صدیوں تک ــ ۱۲۰۰ ق م سے ۹۰۰ ق م ــ سرزمین لبنان میں مقابلتہً امن رہا۔ صرف چند عارضی اختلافات کو چھوڑ کر یہ سرزمین کامل استقلال سے بہرہ مند رہی اور کوئی بیرونی طاقت اس پر مسلط نہ تھی۔ لیکن افسوس کہ اس دور کے متعلق ہماری معلومات کے ذرائع ناکافی ہیں، کیونکہ ہمسایہ طاقتوں کی دستاویزوں میں کوئی خاص ذکر نہیں اور فونیقیوں نے یا تو کوئی دستاویز چھوڑی ہی نہیں یا ان کا پورا ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ اس وقت لبنان کی حدیں بھی ٹھیک ٹھیک متعین نہ تھیں، جو ارواد سے کوہ ماؤنٹ کارمل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ابتدا میں کنعانیوں نے پورے ساحل کے ساتھ ساتھ آبادیاں قائم کر لی تھیں، لیکن شمال میں جبل اُکّام اور جنوب میں فلسطینی سطح مرتفع کی طرف سے حملوں کا خطرہ مسلسل رہتا تھا۔ صرف لبنان کی بلند کوہستانی دیوار محکم حفاظت کا ذریعہ تھی۔ لہٰذا اس کوہستان کے دامن میں مستقل آبادیاں قائم ہوئیں اور فروغ پذیر رہیں۔ انھیں نے شہری ریاستوں کی حیثیت حاصل کی۔

ان کامل آزاد شہری ریاستوں کی حکومتیں ویسے ہی دستور کے مطابق عمل پیرا رہیں جیسا کہ پہلے جاری تھا اور بعد میں جاری رہا۔ سب سے بڑے حاکم کو بادشاہ کہا جاتا تھا۔ وہ خدا کے عطا کردہ استحقاق کی بنا پر حکمرانی کا کاروبار چلاتا تھا۔ اسی طرح اس کی خاندانی حکومت کا سلسلہ استوار رہ سکتا تھا۔ ممکن ہے، بعض شاہی خاندانوں نے عام انسانوں سے بالاتر نسل ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہو، تاہم بادشاہ کے اختیارات پر ایک سے زائد پابندیاں عائد تھیں۔ سب سے

Marfat.com

پہلے دولت مند تاجروں کے خاندان تھے، پھر تجارات کے رئیس تھے، جنھیں بڑا اثرورسوخ حاصل تھا اور معاشرے میں انھیں معزز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے بعد بزرگوں اور دانشمندوں کی مجلس شوریٰ تھی۔ بیبلوس میں ابتدا ہی سے اس مجلس شوریٰ کا سراغ ملتا ہے[۱] شاہ اغاریت کی مجلس شوریٰ ستر امراء پر مشتمل تھی۔ ایرانیوں کے عہد حکومت میں عیدا کی مجلس شوریٰ کے رکن ایک سو تھے[۲]۔ ایک ایسی مجلس صور میں بھی تھی۔ جب ملک نئی بابلی سلطنت میں شامل ہوا تو شہر صور کے باشندوں نے جمہوری نظام حکومت قائم کرلیا، جس کے مختلف حاکموں کو قاضی کہا جاتا تھا (جمع قضاۃ) عبرانیوں نے بھی ابتدائی دور میں ایسا ہی سلسلہ جاری رکھا تھا، لیکن ان شہری ریاستوں میں کبھی کسی اعلیٰ سیاسی وحدت کا احساس نشوونما نہ پاسکا۔ ان کا سب سے بڑا مشغلہ تجارت تھا اور تجارت میں باہم کر مقابلہ رہتا تھا، اس وجہ سے ان کا قومی جذبہ بلدیاتی سطح سے بلند نہ ہوسکا۔

**سیاسی جمعیتیں** یہ شہری ریاستیں سیاسی اعتبار سے الگ الگ تھیں۔ ان کا وجود سرزمین لبنان کے پارہ پارہ ہونے کی عکاسی کررہا تھا۔ یہ شہری ریاست کا ایک مقامی دیوتا تھا۔ ان کے درمیان تجارتی رقابت موجود تھی۔ یہ اختلافی عوامل صرف عارضی طور پر دبائے جاسکتے تھے۔ مشترکہ فوائد انھیں رضامندانہ وفاق پر وقتاً فوقتاً آمادہ کرتے رہے اور وہ سب کسی ایک شہر کی سرکردگی میں سیاسی وحدت کی شکل اختیار کرتی رہیں۔ سولھویں صدی قبل مسیح میں اغاریت، چودھویں صدی قبل مسیح میں جبیلہ اور ارواد، بارھویں صدی قبل مسیح میں عیدا، گیارھویں صدی سے نویں صدی تک صور اور پانچویں صدی میں طرابلس کو منصب قیادت حاصل رہا۔ یہ شہری ریاستیں اپنے پورے دورۂ حیات میں امن پسندی کے مسلک پر قائم رہیں۔ جنگی ذہنیت کبھی پیدا نہ کی اور ان کی سرگرمیوں کا خاص دائرہ جنگ نہ تھی بلکہ تجارت تھی اور فنون حرفہ ہیں۔

سرزمین کنعان پارہ پارہ ہوچکی تھی۔ لبنان کو نئی آزادی ملی تو نئے فرائض بھی سامنے آگئے جن کی بجاآوری کے لیے اس سرزمین کے باشندوں نے نئے جوش وخروش اور مستحکم عزم کا مظاہرہ کیا۔ اسی عہد میں تجارت، فنون لطیفہ اور دستکاری کے نشوونما ارتقا میں وہ بلند درجہ حاصل ہوا، جو پہلے کبھی حاصل نہ تھا۔ انھوں نے بحیرۂ روم کے طاس کی دونوں طرفوں میں نوآبادیاں قائم کرلیں اور وہ نظام زیادہ سے زیادہ مکمل کرلیا، جو عالم انسانیت کے لیے ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا یعنی ابجد۔

---

[۱] صحیفہ حزقی ایل باب ۲۷، آیت ۹۔
[۲] ڈیوڈورس سکولس (        ) کی تاریخ، کتاب ۱۶، باب ۴۵۔

Marfat.com

انھوں نے بحر پیمائی کی سرگرمیاں پہلے سے تیز تر کر دیں۔ مختلف حصّوں کی چھان بین کی۔ نئی سرزمینوں سے تعلقات استوار کیے۔ اپنی اور اپنے ہمسایوں کی مصنوعات و پیداوار کے لیے وہ منڈیاں تلاش کر لیں، جن سے کم ربط و ضبط تھا۔ سمندر کے خطرات ان کے عناں گیر نہ ہو سکتے تھے۔ وہ نامعلوم سمندروں سے خوف زدہ ہونے کے برعکس ان کی کشش سے مسحور تھے۔ انھوں نے بہت پہلے سواحل کے ساتھ ساتھ جہاز رانی شروع کر دی تھی، جہاں جاتے اپنے ہاں کی مچھلیاں، بلور، ظروف گلی اور دوسری چیزیں لے جاتے۔ اب انھوں نے کھلے سمندر کا راستہ اختیار کیا اور شرقاً غرباً بحری راستوں کا سلسلہ قائم کر دیا، جس کے وہ صدیوں تک اجارہ دار رہے۔ معمولی ملاحوں سے وہ ملوک التجار بن گئے۔ تاجروں نے آبادکاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی آبادکاری اجنبیوں نے خوش دلی سے قبول کر لی۔ اس طرح انھوں نے سامی دنیا کی مادّی، ذہنی اور روحانی ثقافت کے عناصر جابجا پھیلا دیے۔ وہ اپنے جہازوں کو خشکی کے تیرتے ہوئے ٹکڑے سمجھتے تھے۔ ان کی سرگرمیوں نے انھیں بارھویں صدی قبل مسیح کے بعد نسبتہً دنیا کے سب سے بڑے بحر پیما اور تاجر بنا دیا۔ دورِ حاضر کے ایک بڑے مورخ کی رائے ہے کہ یونانی اور لاطینی قوموں کے پہلو بہ پہلو فونیقی بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ تاریخ میں بطورِ خاص ان کی یادگار قائم رہے[1]۔

## بحری اور بری راستے

فونیقی بے سر و پا بحر پیما نہ تھے۔ انھوں نے راستوں کے باقاعدہ نقشے بنا رکھے تھے، جن کے مطابق آتے جاتے تھے۔ انھوں نے پہلے خوب چھان بین کر لی تھی، پھر ان پر چلنے لگے، بلکہ ان کے اجارہ دار بن گئے۔ بالکل ابتدائی بین الاقوامی راستے وہ تھے، جو جُبیلہ کو مصر کی بندرگاہوں سے ملاتے تھے اور جُبیلہ ان کی پہلی مشہور بندرگاہ تھی، جہاں سے بیرونی سفروں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ آگے چل کر صور و صیدا نے درجۂ قیادت حاصل کر لیا۔ ان شہروں سے مصر ہوتے ہوئے یا براہِ راست شمال کا رُخ کر کے قبرص پہنچ جاتے تھے، پھر طارس کی جانب مُڑتے تھے اور لیسیا کے پاس سے گزرتے ہوئے روڈس کی جنوبی سمت سے کریٹ اور کوسیرا[2] پہنچ جاتے تھے۔ سسلی سے ان کا راستہ کا رُخ جاتا تھا۔ پھر وہ شمالی افریقہ کی ان نو آبادیوں میں پہنچ جاتے تھے، جو انھوں نے جابجا قائم کر رکھی تھیں۔ وہاں سے ساحل کے ساتھ ساتھ مغربی جانب جاتے ہوئے اپنی ان نو آبادیوں میں پہنچ جاتے تھے، جو انھوں نے جابجا

---

[1] تھیوڈور مومسن (Momonaen) کی کتاب تاریخ روما جلد ۲، صفحہ ۱۳۲۔

[2] (Cossyra) عرب اسے قوصرہ کہتے تھے۔ آج کل اس کا نام پنٹی لیریا ہے، جو سسلی اور تیونس کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔

قائم کر رکھی تھیں۔ وہاں سے ساحل کے ساتھ ساتھ مغربی جانب جاتے ہوئے اپنی ان نوآبادیوں میں پہنچ جاتے تھے، جو ہسپانیہ کے ساحل پر بنالی گئی تھیں۔ ان بڑے راستوں کے علاوہ شمالاً جنوباً بھی متعدد گزرگاہیں موجود تھیں۔ چار بڑی چیزیں تھیں، جو بحیرۂ روم کے سواحل کی متعدد سرزمینوں میں موجود نہ تھیں اور فونیقی انھیں بہم پہنچاتے تھے، یعنی لکڑی، گیہوں، تیل اور شراب۔ یہ تمام جنسیں انھیں کی پیدا کردہ نہ تھیں۔ گیہوں اور تیل فلسطین سے لیتے تھے اور ان کے بدلے میں عیش و آرائش کی چیزیں دیتے تھے۔ لوبان اور مسالے جنوبی عرب اور ہندوستان سے آتے تھے۔ کاروانی تجارت کے راستے ان خطوں کو بحیرۂ روم کی بندرگاہوں سے ملاتے تھے۔ آگے چل کر فونیقیوں نے سامان تجارت میں اپنی وہ چیزیں بھی شامل کر لیں، جن کی صنعت میں انھیں درجۂ امتیاز حاصل ہو گیا تھا یعنی دھاتوں کی بنی ہوئی چیزیں اور پارچات۔ فونیقیہ کے دھاتی ظروف اور زناب، ان کے اُونی اور سُوتی پارچے ــــ جن میں سے بعض ارغوانی رنگ کے تھے ــــ آبنوس اور ہاتھی دانت کا منبّت کار گھریلو سامان ہر مقام پر مطلوب تھا اور اچھی قیمت پاتا تھا۔ گھریلو سامان اعلیٰ درجے کے کاریگر یا تو مقامی نمونوں کے مطابق بناتے تھے یا مصری نمونوں کے مطابق۔ یونان کے باشندے لبنان کے دیوداروں کو فونیقی دیودار کہتے تھے[1]۔ لبنان کے جنگلوں میں صنوبر، دیودار اور تارپین کے درخت تھے۔ لکڑی کے علاوہ یہاں سے تارکول اور گوند بھی بھیجا جاتا تھا۔ گوند اور رال جہازوں کو پانی سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے[2]۔ جیسے جیسے ان تاجروں کی منڈیوں میں اضافہ ہوا، ان کی پیداوار کے وسائل میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ شرق و غرب کے درمیان مبادلۂ اجناس کا واسطہ بن گئے۔ مشرقی مصنوعات اور دوسری چیزیں مغربی ملکوں میں پہنچاتے تھے اور مغرب کی چیزیں ــــ زیادہ تر دھاتیں اور ظروف گلی ــــ مشرق کی سرزمینوں میں لاتے تھے۔ غرض بحیرۂ روم یونانیوں اور رومیوں کی جھیل بننے سے پیشتر فونیقیوں کی جھیل بن گیا +

## صور و صیدا

ان دو شہروں میں سے ہر ایک نے اس دور میں ملکۂ بحر کی حیثیت حاصل کر لی۔ صیدا کو عموماً زیادہ قدیم مانا جاتا ہے بلکہ اسے صور کی ماں کہتے ہیں۔ یسعیاہ کے صحیفے میں صور کو "دخترِ صیدا"[3] کہا گیا ہے۔ صیدا کے پُرانے سکّوں میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ شہر

---

[1] تھیوفرسٹس Theophrastus کتاب سوم، باب ۱۲۔ کتاب ۹، باب ۲ +

[2] ایضاً کتاب ۴، باب ۲، اور کتاب خروج، باب ۲، آیت ۳ +

[3] صحیفۂ یسعیاہ، باب ۲۳، آیت ۱۲ +

Marfat.com

شمالی افریقہ کے مقام ہپو[1] اور قبرص کے مقام سیتیم[2] کی ماں ہے۔ غرض عیدا نے سب سے پہلے نمایاں حیثیت حاصل کی اور وہ جنوبی لبنان میں سرخیل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ غالباً اس کے سلسلہ اثرورسوخ میں عور بھی شامل تھا، جس طرح جُبیلہ اور اروا اس کے اثرورسوخ میں شمالی لبنان شامل تھا۔ راس الشمرا میں ایک نظم ملی ہے، جس میں عیدا کے بادشاہ کرت کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسے ایک جنگ پیش آگئی تھی، جس میں حملہ آوروں کا رئیس "تارح" تھا۔ تارح کے علاوہ اس نظم میں زبولون، عدوم اور عہدنامہ قدیم کے افراد و مقامات کے دوسرے نام بھی آئے ہیں۔ فونیقی بائبل کے مرتبین اور ہومر کے نزدیک عیدانی تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عیدا عور سے پہلے موجود تھا۔ کتاب پیدائش[3] میں عیدا کو کنعان کا پہلوٹھا قرار دیا گیا ہے[4]۔ دورِ فتوحات کے عبرانی مورخ اس شہر کو "بڑا عیدا" کہتے ہیں[5]۔

ہومر کی نظموں میں بھی یہ ذکر آیا ہے کہ فونیقی پارچات، تانبا، غلام اور دوسری چیزیں عیدا سے لاتے تھے۔ یہ بھی اس شہر کے عروج و اقتدار کی عدائے بازگشت ہے۔ ان نظموں میں عیدا کے دستکاروں کی بھی بڑی تعریف کی گئی ہے اور عور کا ذکر تک نہیں آیا۔ ایلیڈ[6] میں ایک جگہ ان پارچات کا ذکر ہے، جن پر عیدانی عورتوں نے اعلیٰ درجے کی زردوزی اور کشیدہ کاری کر رکھی تھی۔ اس سے یقیناً فونیقی عورتیں مراد ہیں۔ اس شہر کی بحری حیثیت اور تجارتی اقبال مندی اس کے موقع اور محل کا کرشمہ تھی۔ یہ ایک آگے بڑھے ہوئے تنگ خطے کے دامن میں واقع ہے، جس کی شمالی سمت ساحلی چٹان نے گھیر رکھی ہے۔ اس کے ساتھ ملے ہوئے نصف میل تک جزیرے چلے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے سمندری لہروں کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور جہازوں کی حفاظت کا نہایت عمدہ انتظام ہو گیا ہے۔ حال ہی میں اس شہر کے موقع اور محل کا معائنہ طیاروں میں بیٹھ کر کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ارواد اور عور کے خلاف یہاں کی بندرگاہ کے دو حصے تھے: ایک اندرونی، دوسرا بیرونی۔ دوسرے فونیقی شہروں کی طرح عیدا نے بھی اپنی حفاظت کے لیے بعل کا ایک بُت نصب کر رکھا تھا۔ ایک بُت اشمون دیوتا کا تھا، جسے شفا بخش مانا جاتا تھا۔ اس معبد کے کھنڈر ۱۹۰۰ء میں عیدا کے باہر دریلے اولی کے جنوب میں دریافت ہوئے تھے۔

عیدا کی طرح عور بھی خشکی کے ایک آگے بڑھے ہوئے حصے کے سلسلے میں آباد ہوا تھا اور اس کی حفاظت بھی ایک جزیرہ نما چٹان کے ذریعے سے ہوتی تھی جو قریباً ایک میل لمبی اور تین چوتھائی میل

---

[1] Hippo [2] Citium [3] کتاب پیدائش، باب ۱۰، آیت ۱۵ [4] صحیفہ یشوع باب ۱۹، آیت ۲۸ [5] کتاب ۶

چوڑی تھی[1]۔ یہ جزیرہ نما چٹان امن کے اوقات میں جہازوں کے لیے اور جنگ کے اوقات میں باشندوں کے لیے حفاظت کا بڑا عمدہ ذریعہ تھی۔ صور کی بھی دو بندرگاہیں تھیں، ایک کا رخ شمالی جانب تھا اور اسے صیدانی بندرگاہ کہتے تھے۔ دوسری کا رُخ جنوب کی طرف تھا اور یہ مصری بندرگاہ کہلاتی تھی[2]۔ سمندر کا مدخل اس کا محل وقوع تھا اور یہ بہت سے بحری لوگوں کے لیے تجارت گاہ تھی[3]۔ اس کی وضع قطع ایسی تھی۔ گویا ایک لبساطی شہر کے دروازے پر اپنا مال اسباب پھیلائے بیٹھا ہے۔ شہر کا جو حصہ ساحل پر واقع تھا، اسے خوب مستحکم کر لیا گیا تھا۔ اس کے لیے پانی اس چشمے سے آتا تھا، جسے آج کل "راس العین" کہتے ہیں۔ جب اہل شہر کی مروت میں اضافہ ہو گیا ساتھ ہی حملے کا خطرہ بھی بڑھ گیا تو جزیرے کو تجارتی مال کا گودام یا مامن ہی نہیں بلکہ شہر کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح صور بھی ارواد کی طرح ایک شہری جزیرہ بن گیا۔ ہیروڈوٹس[4] پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں صور پہنچا تھا۔ ملکوت دیوتا کے پجاریوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس وقت تک شہر کو آباد ہوئے دو ہزار تین سو سال گزر چکے تھے، لیکن جوزیفس[5] نے بیان کیا کہ شہر بہت بعد میں آباد ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ صور کی بنیاد ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے صرف دو سو چالیس سال پیشتر رکھی گئی تھی[6]۔ ہیروڈوٹس ملکوت معبد دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا اور اس کا نام ہراقلس بتاتا ہے۔ وہ اس معبد کی نذروں کا ذکر بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں دو نہایت بیش قیمت ستون تھے۔ ایک سونے اور دوسرا زمرد کا۔ آخری ستون خاصا بڑا تھا اور رات کی تاریکی میں بھی روشن نظر آتا تھا۔

دسویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں صور نے ایک زبردست اور قوی ریاست کی سرکردگی حاصل کر لی تھی۔ اس کے مقابلے میں صیدا کی عظمت ماند پڑ چکی تھی اور وہ دوسرے درجے کا شہر رہ گیا تھا۔ صیدا پر فلسطینیوں نے کاری ضرب لگائی۔ سنہ ۱۱۷۰ ق۔م میں اس کا بیڑا تباہ کر دیا اور شہر کو آگ لگا کر خاکستر بنا دیا۔ صور کے فرمانرواؤں میں سب سے زیادہ مشہور حیرام اوّل (احیرام ۹۶۹ ق۔م تا ۹۳۶ ق۔م) ابن ابی بعل تھا، جو حضرت سلیمانؑ کا دوست اور حلیف تھا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں شہر کمال عروج پر

---

[1] صور کے معنی سامی زبان میں چٹان کے ہیں۔ اسی وجہ سے شہر کا نام صور مشہور ہوا۔ [2] سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲۳ نیز صور پر اسے پوائدبارد (Poidebard) کی فرانسیسی کتاب۔ [3] صحیفہ حزقی ایل باب ۲۷، آیت ۳۔

[4] کتاب ۲، باب ۴۴۔

[5] باقیات یہود کتاب ۸ باب ۳۔

[6] سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲۔

Marfat.com

پہنچ گیا۔ جن بھاری فصیلوں کے باعث صور ایک مستحکم ترین نبرد گاہ بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حیرام ہی نے بنوائی تھیں۔ اُس وقت شہر کا بڑا حصّہ جزیرے کے اندر تھا۔ اسی حصّے میں ملکوت کا معبد، شاہی محل اور بازار تھے۔ صور کی سیادت دائرہ فونیقی ساحل سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ یوٹیکا نے بغاوت کی تو اسے بزور مسخر کیا گیا۔ بہ ظاہر اہل صور صیدانیوں سے بھی زیادہ مَن چلے تھے۔ وہ مغربی جانب بحر نوردی کرتے ہوئے اور آگے نکل گئے۔ حیرام کے بعد اس کا بیٹا بعل انسر تخت نشین ہوا۔ پھر اس کا بیٹا عبد عشترت حکمران بنا (۹۱۶ ق م ۔ ۹۰۹ ق۔م) جسے معزول کر دیا گیا۔ کچھ مدّت تک افراتفری کا دور رہا۔ آخر اِت بعل کے ماتحت بادشاہی بحال ہوئی (۸۸۷ ق۔م۔ ۸۵۶ ق۔م)۔ اسی اِت بعل کی بیٹی ایزبل سے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب (۸۷۵ ق۔م۔ ۸۵۳ ق۔م) نے شادی کی تھی۔ اِت بعل کی سلطنت شمال میں بیروت تک پہنچی ہوئی تھی اور قبرص کا حصّہ بھی اس کے ماتحت تھا۔ سلاطین اوّل میں اسے "صیدانیوں کا بادشاہ" کہا گیا ہے[۱]۔ صیدانیوں سے مراد فونیقی ہیں۔ خود فونیقی بعض اوقات دونوں اصطلاحیں مترادف کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ایزبل کی بیٹی عتالیاہ یہوداہ کے بادشاہ یہودوم کی بیوی تھی۔ وہ خود باپ (اخی اب) کی سلطنت پر قابض ہوگئی اور چھ سال تک حکمران رہی[۲]۔ ایزبل نے ملکوت کا مذہبی سلسلہ شمالی اسرائیل میں جاری کیا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں اشوریوں نے ساحلی علاقے پر تسلّط قائم کر لیا تو صور کی عظمت و شان کا دور بھی افسانۂ ماضی بن گیا۔

## زراعت

فونیقیوں کا مالی نظام زمین اور اس کے وسائل پر مبنی تھا۔ زراعت، ماہی گیری اور تجارت سب سے بڑے ابتدائی پیشے تھے۔ ان میں سے کھیتی باڑی کو اہم ترین حیثیت حاصل تھی اور اس نے مذہبی عقائد و رسوم پر بھی اثر ڈالا۔ بیج ابتدا میں ہاتھ سے بویا جاتا تھا۔ بعد ازاں دوآبۂ دجلہ و فرات سے ہل پہنچ گیا اور اس کے ذریعے سے تخم ریزی ہونے لگی۔ راس الشمرہ کی کھدائی میں ایک پھالی نکلی جو برنجی تھی۔ فصل درانتی سے کاٹی جاتی تھی۔ یہ درانتی پتھر کی بناتے تھے اور اس میں دندانے بنا لیے جاتے تھے۔ دستہ ہڈی یا لکڑی کا بناتے تھے۔ ۱۰۰۰ ق۔م کے آس پاس سنگی درانتی کی جگہ لوہے کی درانتی رائج ہوگئی۔ غلّے اور بھوسے کو

---

[۱] فونیقی میں "اتو بعل"، جس کے معنی ہیں "بعل اس کے ساتھ ہو"۔ صور و صیدا کے دوسرے بادشاہوں کے لیے ملاحظہ ہو کانتی نیو Contenau کی فرانسیسی کتاب۔ [۲] سلاطین اوّل (بائبل) باب ۱۶۔ آیت ۳۰۔ ۳۳۔ سلاطین دوم باب ۸، آیت ۱۸ و ۲۶۔ باب ۱۱ آیت ۳۔

Marfat.com

الگ الگ کرنے کے لیے لکڑی کے دوشاخے سے کام لیا جاتا تھا۔ آٹا پتھر کی چکیوں میں پیسا جاتا تھا، جنھیں ہاتھ سے چلاتے تھے۔ روٹیاں مٹی کے تنوروں میں پکائی جاتی تھیں، جن کی وضع اسطوانے کی سی ہوتی تھی۔ یہ چیزیں زمانہ حال تک دیہاتی آبادیوں میں رواج پذیر رہیں۔

فصلوں میں بھی زمانۂ قدیم سے اب تک کوئی خاص تغیر پیدا نہ ہوا۔ چونکہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ ممکن ہے بارش کافی نہ ہو، اس وجہ سے فصل پر بُرا اثر پڑے۔ اس اندیشے کے سدِّباب کا طریقہ یہ سوچا گیا کہ بعض کھیتوں کو ایک سال نا کاشتہ رکھتے اور دوسرے سال ان کھیتوں میں فصل نہ بوتے، جن میں پہلے سال بو چکے ہوتے۔ کنعانی معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے جو زمین کے مالک نہ تھے مگر اس کے ساتھ وابستہ تھے اور اس کی حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھی تھے جو غلام نہ تھے مگر ان کا پیشہ مزارعت تھا۔ یعنی دوسروں کی زمین کاشت کر کے گزارہ کرتے تھے۔

مویشی بھی عموماً وہی تھے جو آج کل ہیں۔ گوشت کھلے منہ والے دیگچوں میں پکا کر صرف خاص موقعوں یا خوشی کی تقریبوں میں کھایا جاتا تھا۔ پینے کا پانی ذخیرہ ہائے آب یا چشموں سے لیتے اور برتنوں میں یا مشکیزوں میں سر پر اُٹھا کر لاتے۔ چراغ جلانے کی مٹی کی معمولی سی طشتریاں مستعمل تھیں، جن کے ایک حصے میں بتی رکھنے کی جگہ ہوتی اور ان میں تیل ڈال کر جلاتے۔

## دستکاری اور فنون

دستکاروں اور تاجروں کو کنعانی معاشرے میں درمیانہ درجہ حاصل تھا۔ ایک طرف جاگیردار امراء، بڑے بڑے زمیندار اور جنگی رتھوں کے مالک تھے، جنھیں اونچا طبقہ سمجھنا چاہیے۔ دوسری طرف نچلا طبقہ یعنی غلام اور بدوے تھے۔ عام دستور یہی تھا کہ دستکاروں کے بیٹے آباواجداد کا پیشہ اختیار کر لیتے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ ور اور دستکار جمعیتوں کی صورت میں منظم ہوتے تھے اور ان میں باہم رشتہ داریاں بھی تھیں۔ رہنے کے مقامات بھی الگ تھے۔

ظروف سازی بالکل ابتدائی دور کی صنعت تھی اور حد درجہ کامیاب صنعت تھی۔ یہ دوسرے ہزار سال قبل مسیحؑ میں کمال پر پہنچی۔ کمہار کے چاک کا استعمال دوسرے ہزار سال قبل مسیحؑ کے اوائل میں شروع ہوا۔ اس سے کنعانی ظروف سازوں کو بالکل نئی حیثیت کے اور حد درجہ موزون و متناسب ظروف بنانے کا موقع مل گیا۔ ابتدا میں بیرونی ظروف کے نمونوں مثلاً مصر، کریٹ، مائی سینا اور قبرص کے نمونوں کی نقالی عام رواج پا چکی تھی۔ اغاریت اور دوسرے مقامات سے جو نمونے ملے،

Marfat.com

ان سے واضح ہوتا ہے کہ بحیرۂ ایجیہ کے مختلف ظروف کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ ۱۵۰۰ ق م کے بعد [1]
برص اور مائی سینا کا اثر بہ طور خاص بڑھ گیا۔ ٹین کو ظروف میں جلا پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح برتنوں میں خاص چمک دمک پیدا ہو جاتی تھی۔ مذہبی مقاصد اور معبدوں کی نذر وغیرہ کے لیے خاص وضع کے ظروف بنائے جاتے تھے۔ مقبروں سے ان ظروف کے جو باقیات ملے ان سے خاص حسن ذوق اور فنی مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔ ظروف سازی کی طرح سنگ تراشی نے بھی سولھویں صدی قبل مسیح میں انتہائی بلند درجہ حاصل کر لیا۔

جو دور زیر غور ہے، یعنی دوسرے ہزار سال قبل مسیح کا آخری حصّہ اور پہلے ہزار سال قبل مسیح کا ابتدائی حصّہ، اس میں کنعانیوں نے فنون و دستکاری میں بھی نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔ دھاتیں صاف کرنے کے فن میں کوئی ان سے بڑھا ہوا نہ تھا۔ تانبے اور برنج کا کام وہ بڑی چابک دستی سے کرتے تھے۔ چودھویں صدی قبل مسیح کی کلھاڑی کا ایک پھل راس الشمر سے ملا تھا۔ اس کے کیمیاوی تجزیے سے ثابت ہوا کہ وہ لوگ لوہے کو صرف پگھلانا ہی نہ جانتے تھے بلکہ اس میں دوسری دھاتوں کی آمیزش کر کے فولاد سازی میں بھی مشّاق تھے۔ [2] سونے اور چاندی کے علاوہ فونیقیوں کو ٹین اور ایسی دوسری دھاتوں کی بھی خاص ضرورت تھی، جنھیں تانبے میں ملا کر سخت کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان دھاتوں کی تلاش میں انھوں نے اوقیانوس میں دور دراز تک سفر کیے۔ حملہ آور فراعنہ نے لبنان سے جو مال غنیمت حاصل کیا، اس میں چاندی اور سونے کے ظروف بھی تھے۔ راس الشمرہ سے ایک جوہری کا کانٹا اور باٹ دستیاب ہوئے۔ تجارت میں عموماً جنسوں کا مبادلہ ہوتا تھا، لیکن بعض اوقات چاندی غیر مسکوک صورت میں تول کر بہ طور قیمت ادا کی جاتی تھی۔ اسی صورت کو مغربی ایشیا میں نقد رقم ادا کرنا سمجھا جاتا تھا۔ اوائل ہی میں کنعانی تاجروں نے مصر سے تعویذ، بھونرے (بھونرے جیسا متبرک نشان) مُہریں، منکے، ظروف، آرائشی سامان، ہتھیار اور دوسری اشیاء کی درآمد شروع کر دی تھی۔ کنعانی کاریگروں نے انھیں دیکھ کر ویسی ہی چیزیں بنانی شروع کر دیں۔ فونیقیہ کے کاریگر دھاتوں کی چیزیں اتنی عمدہ بناتے تھے کہ یونانی انھیں بہت پسند کرتے تھے۔ جیسا کہ ہومر کی نظموں سے واضح ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چاندی کا ایک پیالہ صیدا کے کاریگر دستکاروں نے ایسی ہنرمندی سے بنایا تھا کہ وہ دنیا بھر کی چیزوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ [3] فونیقیوں کی دستکاری

---

[1] کلاڈ ایف اے شافر Schaeffer کی کتاب اغاریتیکا ✦ [2] ایضاً ایضاً ✦

[3] پیر مونتے کی فرانسیسی کتاب متعلق مصر صفحہ ۱۷۹ ✦

Marfat.com

سے جو چیزیں محفوظ رہ گئیں، ان میں سے چاندی اور سونے کے ظروف نیز جواہرات بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، جن پر بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔

فونیقی دستکاری کی اہمیت اس وجہ سے بہت بڑھ گئی کہ ان کی بنائی ہوئی چیزیں وسیع تجارتی تعلقات کے باعث دور دراز مقامات پر پہنچ گئیں۔ مصر سے جو باقیات دستیاب ہوئے وہ اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جب مصر میں جدید مصری سلطنت کا زمانہ تھا تو لبنان و شام میں نہایت عمدہ چیزیں بہ کثرت بنتی تھیں۔ کنعانی کاریگر بڑے قیمتی اور مرصّع ہتھیار، زرہ وزرہ لباس، سباب آرائشی ظروف اور فرنیچر کے علاوہ ایسے رتھ تیار کرتے تھے، جس پر سونے چاندی کا کام ہوتا تھا۔ کنعانیوں نے آرائش کے لیے کنول اور پیپرس کے پھول نیز شوکت الیہود مصریوں سے مستعار لیے، ان آرائشی چیزوں میں انھوں نے گل داؤدی، سوسن اور خطمی کا اضافہ کر لیا۔ اس وجہ سے ان کی آرائشیں دوسروں پر سبقت لے گئیں۔ وہی لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے دھات کے ظروف پر مصنوعی بیل بوٹے بنانے شروع کیے۔ فونیقی تاجر رال، گوند، شہد اور تیل کی برآمد کے لیے بڑے بڑے مرتبان استعمال کرتے تھے، جن کے پیندے نوکیلے ہوتے تھے۔ ان کے بچے کھچے اجزا بھی جبیلہ اور مصر میں ملے ہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں مصر کے اندر فنون کا احیاء ہوا تو مصری کاریگروں نے فونیقی فنون کے بہت سے اجزا لے لیے۔ آئندہ صدی میں ان فنون کی جدت ختم ہو گئی۔

فونیقیوں کے فنونِ لطیفہ نے یونان کے فنونِ لطیفہ کی ہیئت بالکل بدل دی۔ آخر الذکر فنون پانچویں صدی قبل مسیح تک فونیقی فنون پر برتری حاصل نہ کر سکے۔ فونیقی فنون کی پہلی یونانی نقالی کی مثال آٹھویں صدی قبل مسیح سے متعلق ہے۔ اس دائرے نیز تہذیب کے دوسرے دائروں میں یونانیوں نے فونیقیوں کو ہر چیز سکھانے پر ہمہ تن آمادہ پایا۔ اسی طرح عبرانی کاریگروں اور فن کاروں نے نویں صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی قبل مسیح تک فونیقی نمونوں کی پیروی جاری رکھی اور انھیں کے اصولِ ساخت پر عمل پیرا رہے۔ وہ آلات و اسلحہ، جواہرات وغیرہ میں اپنے ہمسایوں ہی کی نقل کرتے رہے۔ ابتدائی اسرائیلی فن، فونیقی فن کے ایک خاص مرحلے کا عکاس ہے[1]۔ فونیقیوں نے مصریوں سے ہاتھی دانت کی چیزیں بنانا سیکھا اور اس کاریگری کو نئی بلندیوں پر پہنچا دیا[2]۔ سامریہ میں اشواب کا محل ہاتھی دانت کے جس کام سے اعلیٰ پیمانے پر نہایت اچھی طرح آراستہ تھا، وہ فونیقیوں

---

[1] ولیم البرائٹ کی کتاب ( ... ...iog... & ... ...ge... ...f ... ) ص ۱۳۔

[2] رینی دساؤ کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۸۳، ۸۴۔

Marfat.com

ہی کی کاریگری کا کرشمہ تھا۔ اسی وجہ سے اس محل کو "قصرِ عاج" (ہاتھی دانت کا گھر)[1] کہتے تھے۔ یہاں سے کھدائی میں ہاتھی دانت کا ایسا کام ملا ہے، جس پر سونے کے ورق چڑھے ہوئے تھے[2]۔ اس شاہی محل کی ملکہ صور کی شہزادی تھی۔ اغلب ہے کمرے کے اندر دیواروں کے ساتھ ساتھ دیودار کی لکڑی لگی ہوئی ہو اور اس پر ہاتھی دانت جا بجا لگا دیا گیا ہو۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے مقبروں میں بھی یہی نمونہ ملحوظ رہا ہو گا۔ مجدّو میں بارھویں صدی قبل مسیحؑ کا ایک محل برآمد ہوا۔ اس میں بھی ہاتھی دانت کی کاریگری کے نمونے موجود تھے، جو فونیقیوں نے تیار کیے تھے۔ ہاتھی دانت کی بعض فونیقی چیزیں اتنی خوب صورت تھیں اور ان کا کام اتنا اعلیٰ تھا کہ انھیں مشرقِ قریب کے بہترین فن پاقیات میں شمار ہونا چاہیے۔

## تعمیرات

فونیقیوں کی تعمیری یادگاروں کے لیے ہمیں لبنان سے باہر نظر ڈالنی چاہیے۔ اس قسم کے نمونوں میں سب سے زیادہ معروف ہیکلِ سلیمانی (حضرت سلیمانؑ ۹۶۳ تا ۹۲۳ ق م) تھا۔ ابتدا میں یہ شاہی معبد کے طور پر بنایا گیا تھا اور قصرِ شاہی سے متعلق تھا۔ اس کی تعمیر میں سات سال صرف ہوئے، پھر یہ یہوداہ اور یہودیوں کا قومی معبد بن گیا، لیکن شمالی اسرائیلی ان یہودیوں سے الگ تھے۔ صور کے معماروں اور کاریگروں نے یہ بنایا تھا اور اس میں لبنان کے دیودار استعمال کیے گئے تھے[3]۔ اس تعمیر کے لیے حضرت سلیمانؑ نے حکم دے دیا تھا کہ رعایا میں سے تیس ہزار آدمی باری باری ایران کے آدمیوں کے ساتھ لبنان میں کام کریں اور دو مہینے اپنے گھروں میں معمول کے مطابق کام کرتے رہیں۔ کٹے ہوئے دیودار پہلے سمندر میں پہنچائے جاتے تھے۔ وہاں سے شہتیروں کو باہم باندھ کر ٹھاٹ کی شکل میں یافا پہنچاتے تھے، وہاں سے یروشلم لے جاتے تھے۔ حیرام کو لکڑی کے بدلے میں گیہوں اور جَو کے علاوہ شراب اور خالص تیل دیا جاتا تھا۔ پتھروں کو آرے سے کاٹا جاتا تھا۔ چنانچہ کسی جگہ ضرب کی آواز نہ سُنی گئی۔ ضرورت کی جن چیزوں میں موڑ اور پیچ زیادہ تھے، وہ برنج کی ڈھالی گئیں۔ ڈیوڑھی کے سامنے دو ستون تھے۔ وہ پیتل کے بنائے گئے تھے[4]۔ ان کے ذکر سے ہیروڈوٹس کا وہ بیان ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے، جو اس نے ملکرت کے مندر واقع صور میں دیکھا تھا۔ ہیکل کی آرائش میں وقت کی کنعانی خصوصیات پیشِ نظر رکھی گئیں۔ اس عظیم القدر مقدس عمارت کی خدمت کے لیے

---

[1] سلاطین اول باب ۲۲، ص ۲۹، نیز عاموس باب ۳، آیت ۱۵، باب ۶، آیت ۴۔

[2] ولیم کرونٹ اور گریس کرونٹ (Crowfoot) کی کتاب (Early Ivories from Samaria) ص ۱، ۲۔

[3] سلاطین اول باب ۵، آیات ۵، ۱۱۔ تواریخ دوم باب ۲، آیات ۱، ۱۶۔

[4] سلاطین اول باب ۷، آیت ۱۵، ۲۱۔

Marfat.com

کنعانی غلام مقرر ہوئے، بلکہ نام ہیکل بھی کنعانی زبان سے ماخوذ ہے[1]۔

حضرت سلیمانؑ کا محل بھی فونیقی معماروں ہی نے تعمیر کیا تھا۔ اس میں بھی لبنان کے دیودار استعمال کیے گئے۔ دیوداروں کے ستون اس میں اتنے زیادہ استعمال ہوئے تھے کہ اسے "لبنانی بن کا گھر" کہتے تھے۔ یہی لکڑی حضرت سلیمانؑ نے اپنے جنگی رتھوں کے لیے استعمال کی۔ آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی فلسطین میں درخت کمیاب تھے۔ تھوڑی مدت گزری، مجدو میں کھدائی کرتے ہوئے گھوڑوں کے اصطبل برآمد ہوئے تھے۔ کہا گیا تھا کہ یہ حضرت سلیمانؑ نے بنوائے تھے اور یہ بھی فونیقی معماروں ہی کا کارنامہ تھے۔ حیرام کے کاریگروں نے حضرت سلیمانؑ کے لیے بیڑا تیار کیا۔ عبرانیوں کی تاریخ میں یہ پہلا بیڑا تھا۔ یہ بیڑا بحیرۂ قلزم (کی دہنی شاخ) کے سرے پر عصیون جابر[2] میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ عبوری افسر اس بیڑے کے ساتھ عرب اور مشرقی افریقہ کے ساحلی مقامات پر بحری مہمیں سر کرتے رہتے[3]۔ بیڑے کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوبان، صندل، ہاتھی دانت، سونا اور جواہرات مختلف مقامات سے فلسطین پہنچایا جاتا رہے۔

**موسیقی**

سامی گروہوں میں سے کسی نے فن موسیقی کو اتنی بلندی پر نہ پہنچایا، جتنی بلندی پر کنعانی پہنچا گئے۔ انھوں نے مشرق قریب کی سابقہ نغمہ آرائیوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور تمام معاصر ترانہ ریزیوں پر سبقت لے گئے۔ ہیکل کی عبادت میں بھی موسیقی کی ضرورت پیش آتی تھی۔ کنعانیوں کے سرا دوان کے آلات موسیقی بحیرۂ روم کے پورے حلقے میں پہنچ گئے۔ مردوں اور عورتوں دونوں میں گانے بجانے کے ماہرین موجود تھے اور مصر کی نئی سلطنت میں انھیں بڑے شوق سے بلایا جاتا تھا۔ مصری سازوں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اصل سامی تھی۔ ستار مصر میں تھوتمس ثالث کی فتوحات کے بعد پہنچی۔ مصری کتبات میں اس کی پہلی تصویر ایک ایسی عمارت پر ہے، جو اٹھارھویں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور ایک سامی اسے بجا رہا ہے۔ اس طرح یونانیوں نے بھی موسیقی کے سرچشمے سے فائدہ اٹھایا۔

---

[1] یہ لفظ سومیری زبان کا ہے، جس کے معنی ہیں بڑا گھر۔ عربی میں بھی ہیکل معبد کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

[2] سلاطین اول باب ۷، آیت ۲، باب ۱۰، آیت ۱۷، تواریخ دوم باب ۹، آیت ۱۶، ۲۰۔

[3] Eziongeber یہ مقام بحیرۂ قلزم کی اُس خلیج میں تھا، جسے آج کل خلیج عقبہ کہتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ جس جگہ عقبہ ہے، وہاں کوئی آبادی بنی اسرائیل کے خروج مصر کے وقت موجود نہ تھی۔ عصیون جابر اسرائیل کی موجودہ بندرگاہ ایلات کے قریب تھا۔ مصنف نے آگے چل کر عصیون جابر اور ایلات کو ایک مقام قرار دیا، یہ غالباً صحیح نہیں (مترجم)۔

[4] سلاطین اول، باب ۹، آیات ۲۷، ۲۸، باب ۱۰، آیت ۱۱، تواریخ دوم، باب ۹، آیت ۱۰۔

[5] ابرائٹ ص ۱۲۱۔

Marfat.com

کنعانیوں نے سُر اور ساز ہی نہ لیے، بلکہ ان کے نام بھی اختیار کر لیے۔ اس موسیقی کی نقالی سب سے بڑھ کر عبرانیوں نے کی۔ مقدس عبرانی موسیقی کی ابتدا حضرت داؤدؑ نے کی اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں اسے خوب نشوونما ہوئی۔ خود عبرانیوں کے پاس اپنے شمالی ہمسایوں کے سوا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ شروع میں ہیکل کے سازندے اور موسیقار یا تو کنعانی تھے یا انھوں نے سب کچھ کنعانیوں کی سرپرستی میں سیکھا تھا۔ اس طرح موسیقی اور ساز سب سے پہلے مذہبی اغراض کے لیے استعمال ہوئے۔ آگے چل کر مذہبی اور غیر مذہبی کی تفریق باقی نہ رہی۔ صحیفہ سموئیل میں ہے کہ "داؤد خداوند کے حضور اپنے سارے زور سے ناچنے لگا"[۱]۔ یہ دراصل کنعانیوں کے ایک رقصِ زرخیزی کا عکس تھا اور اس کے باقیات اب تک مسلمان درویشوں کے وجد و حال کی متناسب حرکات میں موجود ہیں۔ آگے چل کر اسرائیلیوں کے جو طائفے تیار ہوئے، وہ اپنی اصل و نسل ان خاندانوں سے ملاتے تھے، جن کے نام کنعانی تھے۔

**صنعت و حرفت** فونیقیوں نے جن فنون میں بہت اونچا درجہ حاصل کیا، ان میں سے ایک بنیادی فن شیشہ گری بھی تھا۔ کلاسیکی روایات میں بتایا گیا ہے کہ شیشہ گری کی دریافت کا سہرا فونیقیوں ہی کے سر ہے، لیکن زیادہ شہادتیں مصریوں ہی کے حق میں جاتی ہیں۔ پلینی[۲] کہتا ہے کہ کچھ تاجر عکّہ کے نزدیک کنارے پہ کھانا پکا رہے تھے۔ انھوں نے چولھے بنانے کے لیے مٹی کے جو ڈھیلے استعمال کیے ان میں شورہ بھی تھا۔ جہازوں میں سامان رکھا جا چکا اور کھانا پکانے کے برتن اٹھائے تو مٹی کے ڈھیلوں میں شورے کی شفاف رگیں نظر آئیں۔ انھوں نے شورہ گھلا کر ریت اس میں شامل کر دی۔ اس طرح شیشہ بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فونیقی مدت تک اپنے بنائے ہوئے شیشوں اور مصر سے لائے ہوئے شیشوں کی تجارت کرتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنے شیشوں کو رنگ دینا شروع کیا اور اس فن کو تکمیل کے قریب پہنچا دیا۔ لبنان و شام کے مختلف شہروں میں ایسے ڈھیلے ملے ہیں، جو شیشے کے تھے، مگر انھیں صاف نہیں کیا گیا تھا[۳]۔ بہرحال شیشہ اور چینی کے ظروف بنانے میں فونیقی کاریگر برابر مصریوں کے ہم پلّہ رہے۔

**پارچہ بافی** کاتنے اور بُننے کا فن ابتدا ہی میں رائج ہو گیا تھا۔ مختلف چیزیں کھدائی میں دستیاب ہوئیں جن کا تعلق تیسرے ہزار سال قبل مسیح کے ابتدائی دور سے تھا، مثلاً تکلے کے چھوٹے چھوٹے حلقے، جو پتھر اور ہڈی کے تھے۔ نیز پتھر اور مٹی کے وہ وزن جن سے کپڑا بُنتے وقت کام لیا جاتا تھا۔ شروع میں یقیناً اُونی کپڑے بُنے جاتے تھے۔ نوزی[۴] دستاویزیں لقریباً ۱۵۰۰ ق۔م کی ہیں۔ ان میں کنعانی اُون کا

---

[۱] صحیفہ سموئیل ۲، باب ۶، آیت ۱۴ ۔ [۲] کتاب ۳۶، باب ۶۵ ۔ [۳] ہیکے کا گائیڈ ص ۹۶ ۔

[۴] صحیح نام نوزی ہے جو کرکوک سے دس میل مشرق کی طرف دو آبہ دجلہ و فرات کے شمالی حصے میں ہے۔ یہ دستاویزیں بیکانی خط میں لکھی گئی تھیں۔

Marfat.com

ذکر ہے۔ فونیقیہ کے ساحلی شہروں کے ساتھ ساتھ اندرونِ ملک کی جانب پہاڑی علاقے بھیڑوں اور اُون والے دوسرے جانور پالنے کے لیے بہت موزوں تھے۔ گھر کی اُون ہاتھ سے کات کر جو کپڑا بنتا، اسی سے سرِلوں کے لیے ہر آدمی کا لباس تیار ہوتا۔ کپاس ہندوستان میں پیدا ہوتی تھی۔ یہیں سے یہ آگے چل کر مشرقِ قریب پہنچی۔ ابتدائی زمانہ میں یہ زیادہ عام نہ تھی۔ فونیقیوں نے اسے یونانیت کے ابتدائی دور میں یونانی دنیا کے اندر پہنچایا اور اس کا سامی نام بھی ساتھ ہی رہا[۱]۔ مصر نے کتانی پارچے کے لیے خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے، کتان کی پیداوار جنوبی شام کے اندر دسویں صدی قبل مسیح میں شروع ہو گئی تھی۔ اس زمانے کی ایک تقویم مقام جزر سے برآمد ہوئی۔ اس میں ایک مہینے کا نام کتان کاٹنے کا مہینا بتایا گیا ہے۔ سن کے گڈے کے پھول آج کل کی طرح زمانۂ قدیم میں بھی بڑے خوش رنگ ہوتے تھے۔ موسم بہار میں مشرقی بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ پورے منظر کو پھولوں سے رنگ دیتا ہے۔ اگر صحیفۂ حزقی ایل میں مستعملہ لفظ کا ترجمہ درست ہے (دیکھیے باب ۱۶، آیت ۱۰، ۱۳) تو سمجھ لینا چاہیے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں صور کے باشندے ریشم سے واقف تھے[۲]۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ریشم خود بخود پیدا ہونے والے ریشمی کیڑوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

**ارغوان** ساحل کے ساتھ ساتھ ماہی گیری بھی خوب فروغ پر تھی۔ صیدا کا نام اسی پیشے کی بنا پر رکھا گیا[۳]۔ زمین بعض مقامات پر ناقص تھی یا مختلف اوقات میں بارش کافی نہ ہوتی تھی۔ اس وجہ سے کھیتی باڑی کرنے یا جانور پالنے کا معاملہ عقدے میں پڑ جاتا تھا، لیکن سمندر میں مچھلی کی کثرت تھی، خصوصاً بڑی ماکرِل قسم کی مچھلی، جس کا گوشت قدرے نمکین اور رنگ ارغوانی ہوتا تھا۔ ارغوانی رنگ کی صنعت فونیقیوں کی خاص صنعت تھی[۴] ۔ نہ صرف مشرقی بحیرۂ روم کے حلقے میں بلکہ اسی سمندر کے تمام ساحلوں پر صدفِ ماہی ملتی تھی، جس سے ارغوانی رنگ کا سیال مادّہ نکالا جاتا تھا۔ فونیقیوں کو چھوڑ کر دوسری قوموں مثلاً منوییوں اور یونانیوں نے صدف نما بحری جانوروں سے ارغوانی رنگ نکالا۔ یونانی اساطیر میں بیان کیا گیا ہے کہ ہیلن ٹرائے پہنچ گئی تو ایک روز ساحل کی ریت پر ٹہل کر اسیری کا وقت گزار رہی تھی تو دیکھا کہ اس کا کُتّا صدف نما مچھلی پکڑ کر نگل گیا ہے اور اس وجہ سے اس کا مُنہ گہرا ارغوانی ہو گیا ہے۔ یہ رنگ اسے اتنا دلکش معلوم ہوا کہ فیصلہ کر لیا گیا جو بھی شخص اس کی نظرِ لطف کا خواہاں ہو، اُسے چاہیے کہ سب سے پہلے

---

[۱] عربی قطن، جو قدیم سامی لفظ کا ہم جدّ ہے۔ انگریزی کاٹن (COTTON) جو قطن سے بنا۔

[۲] ریشم کے متعلق سب سے پہلا اشارہ ارسطو کی کتاب میں ملتا ہے۔

[۳] اس کا ماخذ صود ہے، جس کے معنی ہیں مچھلی پکڑنا اور شکار کرنا۔

[۴] ان کا نام ہی فونیقی اس لیے پڑا کہ وہ ارغوانی رنگ کی صنعت میں مہارت تامّہ

اس رنگ کا لباس میری نذر کرے۔ زمانہ قدیم کے رنگوں میں سے صور کا ارغوانی رنگ سب سے زیادہ مشہور تھا اور سب سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ صور اور صیدا کے حوالی میں صدف کی مچھلیوں کی ایک اعلیٰ قسم بہ کثرت موجود تھی۔ فونیقی چاہتے تھے کہ اپنے ہاں کا یہ ذخیرہ محفوظ رکھیں چنانچہ وہ اس مچھلی کی تلاش میں جا بجا پہنچے اور ارغوانی رنگ دور دور سے درآمد کرتے، مثلاً سپارٹا کی بندرگاہ سے یا تر طاجنہ اور پونیکا کے آس پاس سے اس مچھلی کے ٹوٹے ہوئے گھونگے اغاریت کی بندرگاہ الیپا البیدا سے ملے، ان کا تعلق پندرھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح کے زمانے سے تھا۔ ارغوانی رنگ کے لیے جو لفظ استعمال ہوتا تھا، اس کا ذکر پہلی مرتبہ اغاریت کی دستاویزوں میں آیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ غلاموں کو اون کی ایک خاص مقدار دی گئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ اسے "ارگمن"[۱] بنا دیں۔ اساطیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صور کے ارغوانی رنگ کا تیار کیا ہوا کپڑا فونیقیہ کے ایک شخص عشتارت کی نذر کیا تھا۔ صور کے لڑکوں کے حافظے میں اب تک اس رنگ کی یاد تازہ ہے۔ جب تک وہ جتنی کھیں کھیلتے ہیں تو صدف ماہی کے لعاب سے رنگ لیتے ہیں۔ اس میں سوڈیم پانی کاربونیٹ یا لیمو کا عرق بھی ملا لیتے ہیں[۲]۔ صیدا کے جنوب میں ساحل کے ساتھ ساتھ ٹوٹے ہوئے گھونگوں کا ایک پشتہ بن گیا ہے۔ یہ ارغوانی رنگ کی صنعت ماہی کا بقیہ ہے۔

یہ مچھلی بہت چھوٹی ہوتی ہے اور اس میں سے صرف چند قطرے نکلتے ہیں۔ پھر اس سے رنگ تیار کرنے میں بڑی محنت و مشقت دکھانی پڑتی تھی، لہٰذا اس رنگ کی قیمت بہت زیادہ تھی اور اس صنعت کا اجارہ کسی کے ہاتھ میں نہ تھا۔ ہومر کے زمانے میں نیز یونانیت کے دور میں ارغوانی لباس بادشاہوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ رومی شہنشاہ ارغوانی چغہ نشانِ اقتدار کے طور پر پہنتے تھے۔ مصر کی قلوپطرا، ٹرائے کی ہیلن سے ارغوانی رنگ کی کم مشتاق نہ تھی۔ روایات مظہر ہیں کہ بیزنطینی ملکائیں بچے جنتی تھیں تو انھیں ایک خاص کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا، جو ارغوانی رنگ کے پارچوں سے آراستہ ہوتا۔ اسی سے انگریزی کا محاورہ "ارغوانی رنگ میں پیدا ہونا" ایجاد ہوا۔ یہودیوں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوائی کے خاص نشان کے طور پر ارغوانی لباس پہنتا تھا۔ یہی لباس ہیراپولس (منبج، شمالی شام) کا ارامی پیشوا اور ایشیائے کوچک

---

[۱] Argmn، عربی میں ارجوان، جو غیر سامی لفظ ہے۔ غالباً اس کی اصل ہندی یورپی ہے۔

[۲] لوئی لورتے کی فرانسیسی کتاب ص ۱۲۷۔

Marfat.com

ہیں مگنیشیا کے معبد شمس (جوپیٹر) کا پیشوا استعمال کرتا تھا۔ کیتھولکوں کے اسقف اعظم نے بھی یہی ردا ابائی لباس اختیار کیا۔

یہ بات ابھی تک راز ہیں ہے کہ رنگ تیار کیوں کر کیا جاتا تھا۔ کم از کم فونیقیوں کے رسائل معلومات میں اس کے متعلق کچھ مذکور نہیں۔ پلینی[1] نے رنگ بنانے کے بارے میں ایک بیان چھوڑا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ صدف ماہی کو زندہ پکڑتے تھے۔ اگر یہ مر جائے تو رنگ فوراً اگل دیتی ہے۔ ایک رگ میں سے رنگ نکال لیتے تھے اور اس میں نمک ملا کر تین روز رکھ چھوڑتے تھے۔ پھر اسے معتدل حرارت پر جوش دیتے تھے۔ جوش دیتے وقت رنگ کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ملتے بھی رہتے تھے۔ جب رنگ ہوتا دسویں روز دیگ میں خوب تحلیل ہو کر یک جان ہو جاتا۔ پھر اس میں اون ڈبو کر نکالتے اور پانچ گھنٹے خشک کرتے۔ بعد ازاں اون کو خوب صاف کر کے دوبارہ رنگ میں ڈال دیتے تاکہ خوب رنگین ہو جائے۔ جب اون منجمد خون کا رنگ اختیار کر لیتی تو اسے بہترین مانا جاتا۔

پہلی صدی قبل مسیح میں روم کی ثروت بہت بڑھ گئی تھی اس وجہ سے ارغوانی پارچات کا استعمال بھی زیادہ ہو گیا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹلی اور دوسرے ملکوں میں نقلی ارغوانی رنگ تیار کرنے لگے۔ مشرق میں اس نقلی صنعت کا سلسلہ اسلامی فتوحات تک جاری رہا۔ وینس تاجروں نے اٹھویں صدی عیسوی میں عیش و راحت کا جو سامان باہر سے منگوایا اس میں صور کے ارغوانی پارچات کا بھی ذکر ہے۔ بیز نطینی دور حکومت میں ارغوانی رنگ بنانے کا سلسلہ ایک چھوٹے سے گروہ تک محدود تھا۔ بیز نطینی سلطنت کے سقوط پر مشرق میں یہ فن بالکل ناپید ہو گیا۔ انگلستان میں ارغوانی رنگ بنانے کا فن مشرق سے پہنچا تھا اور سترھویں صدی تک یہ صنعت مختلف مقامات پر جاری رہی۔

ارغوانی رنگ کے علاوہ قدیم لبنانیوں نے قرمز[2] بھی دنیا کی تجارتی منڈیوں میں پہنچایا تھا۔ "عہد نامہ قدیم" میں جس رنگ کو "سرخ"[3] کہا گیا، وہ یہی ہے۔ یہ رنگ ان کیڑوں سے بنایا جاتا تھا، جو شاہ بلوط کی ایک خاص قسم پر پیدا ہوتے تھے[4] اور یہ قسم مشرقی بحیرۂ روم کے کنارے

---

[1] کتاب ۹، باب ۳۱

[2] انگریزی Crimson، عربی قرمز۔ یہ لفظ یا تو اصلاً ارمنی ہے یا ایرانی

[3] ملاحظہ فرمائیے صحیفۂ احبار (بائبل) باب ۱۴، آیت ۴۔ گنتی باب ۱۹، آیت ۶

[4] کتاب ۳، باب ۱۶ (Theophrastos)

پائی جاتی ہے۔ کیڑوں کو خشک کر لیتے، پھر کسی تیزاب میں حل کرتے تو سُرخ یا قرمزی رنگ بن جاتا۔ پہلے یہ کیڑے خود رو درختوں سے پکڑ پکڑ کر جمع کر لیتے تھے۔ آگے چل کر ایرانیوں اور ارمنوں نے یہ کیڑے پالنے شروع کر دیے۔

## بحر پیمائی

بحر پیمائی کے منظم مطالعے اور چھان بین کے بغیر بحری تجارت کو وسیع پیمانے پر ترقی دینا ممکن ہی نہ تھا۔ اس سلسلے میں فونیقیوں نے قطب تارے کی افادی حیثیت دریافت کر لی۔ یونانیوں نے اس تارے کا نام ہی فونیقیوں کے نام پر رکھا اور دوسرے اجرامِ سماوی کی طرح اس کا مدار بھی متعیّن کر لیا۔ دیودار کے نہایت پختہ اور پائدار لٹھ کاٹ کاٹ کر ندیوں میں ڈال دیے جاتے تھے۔ طغیانی آتی تو یہ لٹھ بہہ کر قریب ترین بندرگاہ تک پہنچ جاتے۔ وہاں یا تو ان سے جہاز بنائے جاتے، یا انھیں باہر کے ملکوں میں بھیج دیا جاتا۔ صور اور صیدا کی بندرگاہوں میں صنوبر اور دیودار کے لٹھ زیادہ تر کوہ حرمون (جبل الشیخ) سے آتے تھے۔ سنہ ۱۲۰۰ ق م سے فونیقی جہازوں کے خاکے مصر کی یادگاری عمارتوں پر نمودار ہونے لگے۔ ان کی شکل آدھے چاند کی سی ہوتی تھی۔ پچھلا حصّہ اوپر اٹھا ہوا ہوتا۔ دو بڑے چپّو ہوتے تھے، جن سے یہ جہاز چلتے تھے اور مستولوں کے ساتھ دو گز لگا دیے جاتے تھے، جن میں ایک مربّع بادبان ہوتا۔ جہازوں میں خاصا سامان رکھنے کی گنجائش نکالنے کے لیے انھیں زیادہ چوڑا بنایا جاتا۔ غیر معمولی طور پر لمبا بنانا مناسب نہ سمجھا جاتا۔ آگے چل کر یہ نمونہ تبدیل ہو گیا۔ اشوریوں کی یادگاری عمارتوں پر فونیقیوں کے تجارتی اور جنگی جہازوں کے جو نقشے پائے گئے، ان میں اگلا حصّہ بہت اونچا ہوتا اور اسے نکیلا رکھا جاتا تاکہ لڑائی میں مفید کام دے سکے اور اس میں دو درجے ہوتے۔ فونیقی جہاز سازوں نے اوپر نیچے دُہرے یا زیادہ پتوار لگانے کا طریقہ جاری کیا۔ نچلے عرشے پر چار چار پانچ پانچ پتواروں کی دو قطاریں ہوتیں اور سولہ یا بیس آدمی کھینے کے لیے رکھے جاتے۔ بعد کے زمانے میں کھینے والوں کی تعداد بڑھ کر پچاس تک ہو گئی۔ بادبان کتان کے بنائے جاتے تھے۔ اور انھیں یا تو اس وقت کھولا جاتا تھا جب جہاز لنگر انداز ہوتا یا اس وقت جب موسم ناسازگار ہو جاتا۔ اس نمونے کو ابتدائی دور کے یونانیوں نے اختیار کر لیا، جیسا کہ آرائشی سامان کی نقاشی سے ثابت ہوتا ہے۔ غالباً اسی نمونے کے جہاز حضرت سلیمانؑ کے لیے "ان ملاحوں نے بنائے تھے، جو سمندر سے واقف تھے"[1] یہ ملاح سلیمانؑ کے دوست حیرام شاہ صور نے بھیجے تھے۔

---

[1] سلاطین اوّل، باب ۹، آیت ۲۷۔

Marfat.com

جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے سلیمان کی بندرگاہ عصیون جابر تھی، جس کا نام بعد میں ایلات رکھا گیا۔ اسی نام کو رومی آئلہ[1] کہتے رہے اور عرب ایلہ۔ یہ بندرگاہ بحیرۂ قلزم کی خلیج عقبہ کے کنارے ہے۔ اس بندرگاہ تک راستہ زیادہ لمبا نہ تھا۔ یہاں سے سلیمانی جہاز لکڑی اور تانبا لے جاتے اور ان کے بدلے میں اوفیر (غالباً عمان) سے سونا نیز عرب کے حار اور نیم حار خطوں کی دوسری پیداوار لیتے۔ اس طرح انھیں خاکنائے سویز کا سفر نہ کرنا پڑتا[2]۔ جنوبی و مغربی عرب میں قوم سبا کا دارالحکومت مارب تھا۔ وہاں سے حال ہی میں ایک برنجی بت نکلا ہے۔ یہ ایک دیوتا کا بت تھا، جسے شیر کی کھال پہنائی گئی تھی۔ اس بت کو عمریت کے اس بت سے گہری مشابہت ہے، جو صور کے دیوتا ملکرت کا ہے۔ مصر کے ساتھ خاص تجارتی جنسوں کے علاوہ غلاموں کی تجارت بھی ہوتی تھی اور ان کی قیمت مقامی پیداوار لی جاتی تھی۔ جو فونیقی تاجر بیسویں شاہی خاندان (سنہ ۱۲۰۰ ق م۔ سنہ ۱۰۹۰ ق م) کے ماتحت مصری ڈیلٹا کے شہروں میں رہتے تھے۔ انھیں خاص اہمیت حاصل تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی قبل مسیح میں انھیں ممفس[3] شہر کے اندر ویسے ہی حقوق دے دیے گئے تھے، جیسے سلطنت عثمانیہ نے مختلف یورپی ملکوں کو مراعات کے نام سے دے رکھے تھے۔

بلاشبہ فونیقیوں کی تجارت زیادہ تر بحری تھی، لیکن وہ بری تجارت میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ بحیرۂ روم میں ان کی جتنی بندرگاہیں تھیں، وہاں سے خلیج فارس کے مختلف مقامات تک بری آمد و رفت جاری تھی، بلکہ خلیج فارس میں بھی انھیں ناموں کے شہر تھے، جن ناموں کے شہر فونیقیہ میں تھے۔ اندرون ملک میں ان کے مختلف تجارتی مرکز تھے، مثلاً اُرفہ یا الرّوحا[4] اور نصیبین[5]۔ حزقی ایل کے صحیفے کے ستائیسویں باب میں بحری اور بری آمد و رفت کی کیفیت نہایت دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ وہ لوگ ہسپانیہ سے چاندی، لوہا، ٹین اور سیسہ۔ آئی او نیا[6] سے غلام اور پیتل کے ظروف، مصر سے کتانی پارچات اور عرب سے بھیڑ بکریاں درآمد کرتے تھے۔ ان کے قافلے ہر جگہ پہنچتے تھے۔

---

[1] Aila۔

[2] معلوم ہوتا ہے کہ نہر سویز کی تعمیر سے پیشتر بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کے درمیان آبی اتصال نہ تھا اور خشکی کے خطے کو خاکنائے سویز کہتے تھے۔ نہر سویز کی تعمیر ۱۸۵۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۷ نومبر ۱۸۶۹ء کو اس کا افتتاح ہوا (مترجم)

[3] (Memphus) مصر کا ایک قدیم دارالحکومت جس کے آثار جیزہ (قاہرہ) سے تھوڑے فاصلے پر موجود ہیں، دیکھیے عمل کھنڈر (مترجم)

[4] (Edessa) جس کا موجودہ نام الرّوحا ہے۔

[5] اس کا پرانا نام Nisebis تھا۔

[6] Jonia۔

Marfat.com

**افریقہ کے گرد چکّر** فونیقیوں کی بحر پیمائی کا ایک ممتاز کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پرتگیز ملاّحوں سے ایک ہزار سال پیشتر پورے برّاعظم افریقہ کے گرد چکّر لگایا۔ تعجّب اس امر پر ہے کہ اس بڑے برّاعظم کے گرد بحری سفر کا اعزاز پرتگیزوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کٹھن راستے میں فرعون نیکو (۶۰۹ تا ۵۹۳ ق م) کے ایما پر قدم رکھا گیا تھا، جس نے ایک پرانی نہر از سر نو کھدوا کر نیل کی دائیں شاخ کو بحیرۂ قلزم کے سرے پر ملا دیا تھا۔ اس آبی راستے سے فونیقی ملاّح جنوبی سمندر میں پہنچ گئے۔ راستے میں خزاں کا موسم شروع ہو جاتا تو ساحل پر اُتر کر گندم کاشت کر لیتے، فصل پک جاتی تو غلّہ جہازوں میں بھر کر پھر سفر شروع کر دیتے۔ تیسرے سال وہ ہرقل کے میناروں (آبنائے جبل طارق) سے گزر کر مصر پہنچ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ لیبیا (افریقہ) کے گرد چکّر لگا رہے تھے تو سورج ان کے دائیں ہاتھ تھا۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے صحیح سمجھ لیں، میں نہیں سمجھتا۔[1] تاہم جو تفصیل دیکھ کر ہیرودوٹس کے دل میں کہانی کی صداقت کے متعلق شبہ پیدا ہوا، وہی اس کی توثیق و تصدیق کا ثبوت ہے، کیونکہ جہاز راس امید کا چکّر کاٹ کر مغربی جانب بڑھے ہوں گے تو جنوبی نصف کرے کا سورج یقیناً ان کی دائیں جانب ہو گا۔

**نوآبادیاں** فونیقی جہاں بھی پہنچے، انھوں نے تعمیرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ایک چھوٹی سی عسکری قوم کے نمائندے تھے اور کسی بھی نئی سرزمین میں داخل ہونے، ان کے بارے میں کسی کو شبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کسی مستقل سیاسی نظام کے پابند نہ تھے، لہٰذا جہاں پہنچتے، کسی تکلّف کے بغیر نئے حالات سے مطابقت پیدا کر لیتے۔ بالکل یہی طرز لبنانیوں کا ہے، جو دورِ حاضر میں موجود ہیں۔ انھوں نے بحر پیمائی اور تجارت میں جو کمال حاصل کیا، آبادکاری اور تنظیم میں ان سے کم کمال حاصل نہ تھا۔ دنیا بظاہر ساکن معلوم ہوتی تھی، اس کا اُفق بہت تنگ تھا۔ فونیقیوں نے اس میں زندگی کی حرکت اور روح پیدا کی۔ ساتھ ہی افق کو بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ ان کی ایک ایک نوآبادی میں یکے بعد دیگرے تجارتی مرکز بننے لگے۔ ایک کے بعد ایک نوآبادیاں قائم ہونے لگیں، یہاں تک کہ تمام نوآبادیاں مصر کے ڈیلٹے سے ساحل سلیشیا کے ساتھ ساتھ یونان تک نیز بحیرۂ روم کے دوسرے حصّوں تک ان کے وطن سے وابستہ ہو گئیں

---

[1] ہیرودوٹس کتاب ۴، باب ۴۲۔

Marfat.com

Marfat.com

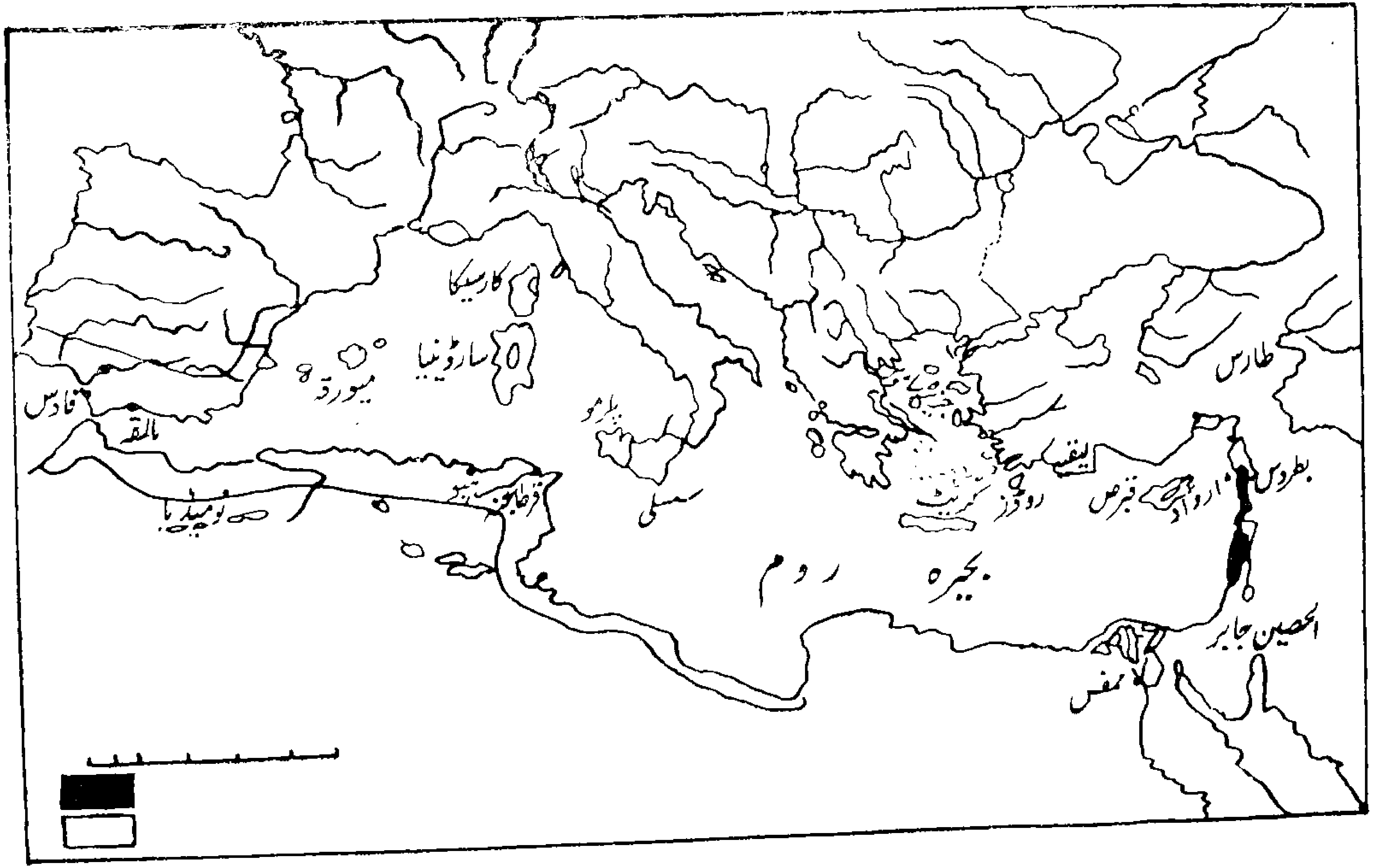
بحیرہ روم
طارس
بطروس
اروا
قبرص
الحصین جابر
منفس
روڈز
کریٹ
سسلی
قرطاجنہ
نومیڈیا
مالقہ
قادس
میورقہ
سارڈینیا
کارسیکا
بلرمو

Marfat.com

بحیرۂ روم واقعی "بحیرۂ متوسط"[۱] بن گیا ۔

ہم فرض کر سکتے ہیں کہ قبرص، روڈس، کریٹ اور مشرقی بحیرۂ روم کے دوسرے حصوں میں فونیقی نو آبادیاں پہلے بنیں، پھر ان کا سلسلہ مالٹا، سسلی، سارڈینیا اور وسطی بحیرۂ روم کے دوسرے مقامات تک پہنچا۔ آخری شمالی و مغربی افریقہ اور جزیرہ نمائے ہسپانیہ و پرتگال میں آبادیاں قائم ہوئیں۔ ہسپانیہ میں کیڈز[۲] اور ٹیونس میں یوٹیکا کی نو آبادیاں ۱۱۰۰ء ق۔م کے آس پاس قائم ہوئیں۔ گویا یہ سب سے زیادہ پرانی تھیں۔ کیڈز ایک فونیقی لفظ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی فصیل ہیں۔ نیز یہ ان مقامات کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو فصیل سے محصور ہوں۔ یوٹیکا کی اصل وہ لفظ ہے، جس کے معنی ہیں پرانا[۳]۔ سارڈینیا اور قبرص میں نویں عدی قبل مسیح سے پیشتر کوئی فونیقی کتبہ نہیں ملا۔ قبرص کے مشہور لعل لبنان کا تعلق آٹھویں عدی قبل مسیح کے وسط سے ہے[۴]۔

قرطاجنہ صور کی شہرہ آفاق دختر فونیقی نو آبادیوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ اس کی بنیاد ۸۱۴ء ق۔م میں پڑی۔ قرطاجنہ کے معنی ہیں نیا شہر۔ گویا یہ یوٹیکا (قدیم شہر) کے مقابلے میں نیا تھا۔ قرطاجنہ اپنے مغربی ہمسر ہیپو کے بھی بعد آباد ہوا، جو (ہیپو) کسی زمانے میں بادشاہ کی قیام گاہ تھا۔ پھر سینٹ آگسٹائن کے زمانے میں یہ اسقفی مرکز بن گیا۔ ہیپو کا تعلق لیبیا سے ہے۔ یونانیوں نے پہلے پہل شمالی افریقہ کا نام لیبیا رکھا تھا۔ آگے چل کر یہ پورے برِ اعظم کا نام بن گیا۔ اساطیری روایات مظہر ہیں کہ لیبیا سمندر کے دیوتا پوسیڈون[۵] کی بیوی اور فونیقیہ کے بادشاہ اجنور[۶] کی ماں تھی ۔

دسویں عدی قبل مسیح کے وقت سے آٹھویں عدی قبل مسیح کے وسط تک نو آبادیوں کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری رہا۔ اگر شمالی افریقہ کی آبادی میں سامی تارکینِ وطن موجود نہ ہوتے تو ان نو آبادیوں کی غیر معمولی کامیابی کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا۔ جس ہجرت نے سامیوں کو چوتھے ہزار سال

---

[۱] اس کا انگریزی نام Mediterranean Sea ہے یعنی خشکیوں کے بیچ کا سمندر، بحیرۂ روم مشہور ہو گیا۔ وہ عرب اسے بحیرہ متوسطی، کہتے ہیں ۔

[۲] عام ہسپانی نام Cadiz، عربی نام "قادس" اور پرانا نام (Gadex) گیڈس یا جیدس اور عربی جیادیم اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں قادس نے اپنے قیام کی تین ہزار سالہ سالگرہ منائی تھی اور یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ یہ مغرب کا سب سے پرانا شہر ہے ۔

[۳] یوٹیکا کا تعلق عتق سے ہے یعنی پرانا ۔

[۴] جی اے کک (Cooke) کی کتاب A Text Book of North-Semite Inscriptions صفحہ ۵۲ ۔

[۵] Poseidon ۔ [۶] Agenor ۔

قبل مسیح میں مصر پہنچایا تھا۔ ممکن ہے وہ اس سے بھی پیشتر شروع ہو چکی ہو۔ کلاسیکی اور عربی ماخذ میں ایک روایت سرسری طور پر چلی آتی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ سامی بہت پہلے مغربی بحیرۂ روم کے خطّوں میں پہنچ گئے تھے[۱]۔

ہرقل کے ستونوں سے گزر کر کیڈز کی بنیاد پڑی تو فونیقی اوقیانوس سے روشناس ہوئے۔ اس "بحرِ ظلمات" میں (جیساکہ عربوں نے اسے نام دیا) کچھ معلوم نہ ہو سکا، وہ کہاں تک پہنچے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ٹین کی تلاش میں انگلستان کے ساحل کارنوال جا پہنچے تھے، لیکن اس کی تصدیق ابتدائی ماخذ سے نہیں ہوتی۔ ہیروڈوٹس ٹین والے جزائر[۲] کے متعلق خاص معلومات سے انکاری ہے، جہاں سے ٹین لایا جاتا تھا۔ یہ اشارہ جزائر سِلّی[۳] کی طرف ہے، جو کارنوال کی نوک سے قریب واقع ہے۔ سٹرابو سنہ ۱۸ ق م[۴] میں لکھتا ہوا بتاتا ہے کہ ٹین کے جزائر میں ٹین اور سیسہ موجود ہے اور مقامی باشندے یہ چیزیں دے کر ظروفِ گلی، نمک اور تانبے کے برتن لے لیتے ہیں۔ ساتھ ہی کہتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں فونیقی کیڈز سے سلّی پہنچتے تھے اور راستہ سب سے مخفی رکھتے تھے۔ سٹرابو یہ بھی کہتا ہے کہ ایک مرتبہ رومیوں کے جہازوں نے فونیقیوں کے پیچھے چلنا شروع کیا تاکہ اس نامعلوم منڈی کا راستہ مل جائے تو فونیقی جہاز کے مالک نے دانستہ اپنا جہاز پایاب پانی میں پہنچا دیا۔ حکومت نے اس نقصان کا معاوضہ ادا کیا کیونکہ ٹین کی تجارت کے اجارہ دار وہی تھے اور انھیں ایک حکومت کی جانب سے بیمے کا یقین دلا دیا گیا تھا۔ ڈیوڈوراس سکولیس[۵] نے سٹرابو سے پچھتر سال بعد اپنی کتاب مرتب کی وہ کہتا ہے کہ ٹین برطانیہ سے مقابل کے ساحل (گال، فرانس) تک لایا جاتا تھا۔ پھر خشکی کے راستے اسے مسیلیا[۶] (مارسائی) پہنچاتے تھے۔ یہاں یونانیوں کی نو آبادی تھی، جو غالباً کسی فونیقی آبادی کی جگہ قائم تھی۔ صرف ایک فونیقی کتبہ برطانیہ میں برآمد ہوا ہے۔ یہ غالباً قرطاجنہ والوں کا ہے اور اس کا تعلق رومی تعرّف کی پہلی صدی سے ہے۔ جو رومی اور یونانی سکّے ازورس[۷] سے ملے، ان سے یہ نتیجہ

---

[۱] دیکھیے قیساریہ کے پروکوپیس کی کتاب (History of the War) کتاب ۴، باب ۱۰، ادریسی صفتہ المغرب ابن خلدون کی تاریخ جلد ۴۔

[۲] Cassiterides، اس کے معنی ہیں ٹین والے جزیرے۔ یونانی میں ٹین کو کسیٹروس کہتے ہیں۔ دیکھیے ہیروڈوٹس کتاب ۳، باب ۱۱۵۔ [۳] Scilly Isles۔ [۴] کتاب ۳ باب ۵۔ [۵] Diodorus Saculus، کتاب ۵ باب ۳۸۔ [۶] Massilia۔ [۷] Azores، یہ اوقیانوس میں امریکہ اور یورپ و افریقہ کے درمیان جزیرے ہیں، جو ہسپانیہ سے جمہوریۂ امریکہ جاتے وقت راستے میں ملتے ہیں۔

Marfat.com

نکلتا ہے کہ یہاں اہلِ قرطاجنہ پہنچے تھے۔ کیونکہ رومیوں اور یونانیوں کو ان دور افتادہ جزیروں کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ادقیانوس کی دریافت دنیا کی ترقی میں فونیقیوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے[51]۔

## آئی بیریا یعنی ہسپانیہ و پرتگال

ہسپانیہ و پرتگال میں فونیقی نو آبادیاں زیادہ تر ترشیش[52] میں بنی تھیں۔ خصوصاً اس خطے میں، جو ہسپانوی قرطاجنہ اور کیڈز کے درمیان ہے۔ ان تمام مقامات نیز بہت سے دوسرے مقامات کے نام سامی الاصل ہیں۔ ترشیش[53] کا ذکر بائیبل اور اشوری ادبیات میں بھی آیا ہے۔ اس کے معنی غالباً "کلان کنی کا مقام" ہیں۔ طرطوس (سلیشیا) کو پولوس کا مولد ہونے کی عزت ملی۔ یہ بھی دراصل ایک فونیقی نو آبادی[54] تھی۔ قرطاجنہ وہی نام ہے، جو ٹیونس میں فونیقیوں کی سب سے بڑی نو آبادی کا نام تھا۔ مالقہ[55] کے معنی کارخانے کے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہاں مچھلیوں کو نمک لگانے کے کارخانے تھے۔ فونیقیوں نے قرطبہ[56] کی بنیاد نہیں رکھی تھی لیکن اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں سے جو قدیم ترین سکے برآمد ہوئے، ان پر فونیقی حروف ثبت ہیں۔ کچھ مدت بعد فونیقی حروف کی جگہ پیونی[57] حروف نے لے لی۔ قرطبہ اور ہسپانیہ و پرتگال کے دوسرے شہروں سے ہینی بال کے باپ ہیملکار بارقا نے رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے فوج بھرتی کی تھی۔ اس کا لقب بارقا فونیقی لفظ باراق (بجلی) سے متعلق ہے۔ بارسلونا[58] (برسلونا) بھی غالباً اسی سے نکلا۔ ان نو آبادیوں نے بحیرۂ روم کے مغربی طاس میں لبنانی ثقافت کے لیے نئے وطن مہیا کر دیے۔

جزائر بلیارک[59] کے باشندے آئی بیریا کی نسل سے ہیں۔ یہاں فونیقیوں نے محض تجارتی کوٹھیوں پر قناعت کی اور کسی مستقل نو آبادی کی بنیاد نہ رکھی۔ جزیرہ منورقہ کے دارالحکومت ماہن[60] کا ذکر پہلے پہل میگو کی شکل میں آتا ہے اور یہ قرطاجنہ کے ایک جرنیل کا نام تھا۔ کا...

---

[51] آرنلڈ ٹائن بی، مطالعۂ تاریخ جلد دوم صفحہ ۵۰، ۵۲، ۳۸۶۔ [52] Tartessus۔ [53] عربی لفظ رشّ ہے جس کے معنی ٹپکنا اور چھڑکنا ہے۔ [54] فونیقی لفظ مالقہ۔ [55] سٹرابو کتاب ۳ باب ۴۔ [56] Cordova۔ [57] (Punic) یہ قرطاجنہ کے فونیقیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ [58] Barcelona۔ [59] وہ جزیرے جو ہسپانیہ کے جنوب میں بحیرۂ روم کے اندر واقع ہیں۔ ان میں سے دو مشہور ہیں، منارقہ اور میورقہ۔ [60] ، فونیقی لفظ مجن جس کے معنی ڈھال کے ہیں انگریزی لفظ (Mayonnes) بھی غالباً اسی سے نکلا اور فرانسیسی سے ہوتا ہوا برطانیہ پہنچا۔

Marfat.com

اور سارڈینیا میں بھی ایسی ہی کوٹھیاں تھیں۔ سسلی کا دارالحکومت پلرمو اس مقام پر آباد ہوا، جہاں پہلے ایک فونیقی آبادی تھی +

تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مالٹا کا نام سامی ہے۔ یہ ملاط سے ہے، جس کے معنی بچ نکلنے کے ہیں۔ بحیرۂ روم میں یہ ایک بہترین بندرگاہ تھی، لہٰذا تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ جزیرے کو "پناہ گاہ" کہنے لگے۔ ڈیوڈورس[1] کہتا ہے کہ اس کے باشندے فونیقی ہیں۔ مالٹا کی زبان میں بہت سے فونیقی الفاظ محفوظ ہیں۔ بعد ازاں شمالی افریقہ سے عربی الفاظ کا اضافہ ہوا اور بعض سابقہ الفاظ کی شکل بدل گئی +

## یونان

یونان میں بھی فونیقیوں کی تجارتی اور عمرانی سرگرمیوں کے آثار اسمائے امکنہ کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ایک یونانی افسانے میں کارتھ کو فونیقی الاصل دیوتا (ملکیت[2]) سے وابستہ کیا گیا ہے۔ آگے چل کر اس دیوتا کو ہرقل کہا گیا۔ فونیقی دیوتا نے منطقۃ البروج کے بارہ دشمن حیوانوں سے لڑائیاں کیں۔ یہی قصہ یونانی ہیرو (ہرقل) کی بارہ مشقت خیز مہموں کا ماخذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صور کے ایک شخص کیڈمس[3] نے ابجد یونان میں رائج کی۔ اسی نے تھیبز تعمیر کیا، جس کے بارہ حصار کا نام اس کے نام پر کیڈمیا[4] رکھا گیا۔ یونان کے شمال میں تھریس کے اندر کیڈمس نے سب سے پہلے کان کنی شروع کی تھی۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں فونیقی کان کن سونا تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کیڈمس کے بیٹے ایلیریس[5] کے نام پر ایک علاقے کا نام ایلیریا رکھا گیا، جسے آج کل البانیا سمجھنا چاہیئے۔ کیڈمس کو اس کے باپ نے یورپ نام بہن کی تلاش میں بھیجا تھا۔ یہی نام پورے برّاعظم کے لیے مخصوص ہو گیا۔ غرض یونانیوں کی اساطیری تاریخ میں بہت سی داستانیں ہیں، جو فونیقی الاصل ہیں اور یونانی انھیں فخریہ پیش کرتے ہیں +

دوسرے جزیروں کے علاوہ ساموس اور کریٹ بھی فونیقیوں کی نوآبادیاں بطور خاص ممتاز ہیں۔ ان دونوں کے نام سامی الاصل بتائے جاتے ہیں، لیکن یہ امر مشتبہ ہے[6]۔ کریٹ برّاعظم یورپ سے پہلے ایک بڑی تہذیب کا مرکز بن چکا تھا۔ یہاں زیوس نے ایک سانڈ کی شکل اختیار کی

---

[1] کتاب ۵، باب ۱۲ + [2] فونیقی لفظ ملک قت یعنی شاہ شہر، شہریار +

[3] Cadmus، غالباً قادم سے ہے، نو وارد یا مشرقی + [4] Cadmea +

[5] ILLYRIUS + [6] ساموس کو شمس سے ماخوذ بتایا جاتا ہے بمعنی سورج اور کریٹ کو کارت سے جس کے معنی کاٹنا ہیں +

Marfat.com

اور فونیقی بادشاہ اجنور کی حسین و جمیل بیٹی یوروپا کو بچھڑے کی شکل میں منتقل کر کے ساحلِ لبنان کی چراگاہ سے لے آیا، کیونکہ وہ (یونانی دیوتا) یوروپا پر عاشق ہو گیا تھا۔ کریٹ پہنچ کر زیوس نے اپنی اصل شکل اختیار کر کے یوروپا سے شادی کر لی۔ اسی شادی سے منوس پیدا ہو گیا، جو کریٹ کا نہایت مشہور بادشاہ اور مقنن تھا۔ اسی کے ماتحت کریٹ نے ثقافت میں بلند رتبہ حاصل کیا۔

ہومر کے زمانے میں فونیقی جہاز جو سامان بحیرۂ روم کے پورے علاقے میں پہنچاتے تھے، اس میں پودے بھی تھے اور پیداوار بھی۔ گلاب، کھجور، انجیر، انار، مُر (لوبان کی مانند ایک خوشبودار گوند)، آلوچہ اور بادام۔ زیتون کے درخت مشرق قریب کی خاص پیداوار تھے۔ یہیں سے یہ یونان، اٹلی، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ و پرتگال پہنچے۔ ساتھ ہی ان پودوں سے پیدا ہونے والی چیزیں جگہ جگہ بھیجی جانے لگیں یعنی زیتون کا پھل اور تیل۔ یورپی زبانوں میں اب تک ان سامی ناموں کے آثار موجود ہیں۔ یہی فونیقی جہاز تھے، جو یونان سے لارل[۱]، اولیانڈر[۲] سوسن، عشق پیچاں، پودینہ، نرگس مشرقی بحیرۂ روم میں پہنچاتے اور جن میں سے بعض کے یونانی نام اب تک سامی زبانوں میں محفوظ ہیں۔ مسالوں کی تجارت جو بحیرۂ روم میں بہت نفع بخش تھی، تقریباً پوری کی پوری فونیقیوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مسالے حاصل کرنے کے راستے سب سے مخفی رکھتے تھے اور ان گوناگوں خطروں کے متعلق مبالغہ آمیز افواہیں پھیلائے رہتے تھے، جو مسالوں کی زمینوں اور ان کی درآمد میں پیش آتے تھے۔ ابتدائی کلاسیکی زمانے میں شام کو مُر اور روغن بلسان کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ سکندر کی فتوحات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مُر کا مرکز جنوبی عرب اور سبائیوں کے قافلے اسے بحیرۂ روم کی بندرگاہ میں پہنچاتے ہیں۔

## قرطاجنہ

افریقہ میں فونیقیوں نے جو نوآبادی خاصی مدت بعد قائم کی، وہ قرطاجنہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نے سب سے زیادہ قوت حاصل کی اور حد درجہ کامیاب رہی۔ روایات مظہر ہیں کہ اس کی بنیاد ۸۱۴ ق م میں صور کے بادشاہ پگمیلین[۳] کی بہن ڈائیڈو[۴] نے رکھی تھی۔ اسے الیسا[۵] بھی کہتے تھے۔ ڈائیڈو ہی اس شہر کی خاص دیوی قرار پائی۔ قرطاجنہ فونیقیوں کا ایک ایسا مرکز بن گیا، جہاں سے فونیقی اثر و رسوخ کی کرنیں نکل نکل کر مغربی بحیرۂ روم کے علاقوں میں پہنچتی رہیں۔ آٹھویں صدی قبل مسیح تک اس کی تجارت اتنی ترقی کر چکی تھی

---

۱۔ Laurel، ایک پودا، جس کی پتیاں چمکیلی ہوتی ہیں۔ یونان میں دوڑوں اور کھیلوں کے اندر کامیاب ہونے والے کو اس کے تاج پہنائے جاتے تھے۔ ۲۔ Oleander، یہ ایک پودا ہوتا ہے، جو بحیرۂ روم کے سواحل پر پایا جاتا ہے۔ ۳۔ Pygmalion۔ ۴۔ Dido۔ ۵۔ Elissa۔

Marfat.com

کہ خود اصل وطن سے مقابلہ ہونے لگا اور اس پر زوال کا دور طاری ہو چکا تھا صیدا اور صور ہی نہیں بلکہ تمام وطنی شہروں کی عظمت و شوکت کا انحصار دور دور تک پھیلی ہوئی نوآبادیوں پر تھا، جو عملی اعتبار سے نہیں تو کم از کم نظری اعتبار سے اصل شہروں کی ماتحتی کا دم بھرتی تھیں اور خراج بھی بھیجتی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ نوآبادیاتی نظام یونانی نظام سے مختلف تھا۔ صور کے اقتدار میں آٹھویں صدی کے آخری دور کے اندر تیزی سے زوال آ گیا۔ اس کے دو سبب ہوئے۔ ایک یونانی نوآبادیاں جابجا قائم ہو گئیں اور دوسرا اسی زمانے میں اشوریوں نے فونیقی شہر مسخر کر لیے۔ پھر تمام نوآبادیوں پر مؤثر تصرف قرطاجنہ کے ہاتھ آ گیا جس کی جغرافیائی وضعیت اس کام کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ لیکن صور اپنی حیثیت سے دست برداری پر بہ آسانی آمادہ نہ ہوا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں صور نے جو سکے تیار کیے ان پر مادر قرطاجنہ کا افسانہ بھی ثبت تھا۔

اہل قرطاجنہ اہل صور کے فرزندان رشید تھے۔ اس کا ثبوت ہیرودوٹس[1] کی ایک کہانی سے ملتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قرطاجنہ کی تجارت کہاں کہاں تک پہنچ گئی تھی اور اہل قرطاجنہ نے مبادلۂ جنس کے کیسے عجیب و غریب طریقے پیدا کر لیے تھے۔ ہیرودوٹس لکھتا ہے کہ قرطاجنہ کے ملاح افریقہ کے مغربی ساحل پر پہنچتے ہیں۔ سامانِ تجارت ساحل پر اتارتے ہیں۔ پھر عام اطلاع کے لیے ایک الاؤ روشن کر کے خود جہازوں پر چلے جاتے ہیں۔ غیر مہذب دیسی باشندے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں تو سونا لے کر ساحل پر پہنچ جاتے ہیں اور سامان کے پاس سونا رکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ ہو چکتا ہے تو قرطاجنی ملاح پھر جہازوں سے ساحل پر آتے ہیں۔ اگر دیکھتے ہیں کہ مناسب قیمت ادا کی جا رہی ہے تو سونا اٹھا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ سامان کی مناسب قیمت نہیں ملی تو دیسی باشندوں کو مزید سونا لانے پر آمادہ کرنے کے لیے پھر جہازوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ غرض اس لین دین میں، جو چپ چاپ ہوتا ہے، کوئی بھی دوسرے فریق کو دھوکا نہیں دیتا۔ قرطاجنہ نے تجارت و سیاست میں ایسی برتری حاصل کر لی تھی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ ایک بڑی سلطنت کا مرکز بن گیا، جو سائرنیکا (موجودہ لیبیا) سے ہرقل کے میناروں تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں جزائر بلیارک، مالٹا، سارڈینیا بھی شامل تھے اور فرانس،

---

[1] کتاب ۴، باب ۱۹۶؂

ہسپانیہ اور پرتگال کے سواحل پر جو نوآبادیاں جابجا قائم تھیں، وہ بھی اسی سے وابستہ تھیں۔ صیدا اور صور، مصر و اشوریا کے دائرہ اقتدار میں تھے، لہٰذا انھیں سلطنت کی تعمیر کا موقع نہ مل سکا۔ قرطاجنہ کی غیر معمولی برتری نے وسطی بحیرۂ روم کی ایک اور ابھرتی ہوئی قوت سے تصادم کی صورت پیدا کر دی۔ یہ رومہ کی قوت تھی۔ نزاع کا باعث یہ ہوا کہ سمندر پر کسے اقتدار حاصل رہے۔ قرطاجنی بیڑے کو بحیرۂ روم پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ رومیوں سے صاف صاف کہہ دیا گیا، وہ اجازت کے بغیر اس سمندر میں ہاتھ بھی نہیں دھو سکتے۔ ان دو محارب قوتوں کے درمیان کش مکش کا آخری فیصلہ کن دور اس وقت شروع ہوا۔ جب ہینی بال[1] نے ۲۱۸ ق۔م میں وہ مہم شروع کی، جس کے لیے زندگی وقف کر دی تھی، یعنی ہسپانیہ اور کوہستان ایلپس میں سے گزرتے ہوئے اٹلی پر یورش کی۔ اطالوی سرزمین پر پندرہ سال تک ہینی بال کامیاب مہموں میں مصروف رہا۔ اس اثنا میں خود رومہ پر بھی حملہ کیا گیا۔ پھر اسے افریقہ بلا لیا گیا۔ وہاں ۲۰۲ ق۔م میں بمقام زاما[2] (جو قرطاجنہ کے جنوب مغرب میں ہے) فیصلہ کن شکست کھائی۔ ۱۹۶ ق۔م میں وہ بھاگ کر صور چلا گیا۔ پھر شام کے سلوکی بادشاہ انیٹیاکس[3] کے ساتھ ہو کر قرطاجنہ کے دائمی دشمن کے خلاف لڑتا رہا۔ فتح و نصرت نے یہاں بھی ساتھ نہ دیا۔ جب بچاؤ کی کوئی امید نہ رہی تو ایشیائے کوچک میں خودکشی کر لی (۱۸۳ ق۔م)۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے: "اس طرح مر جانے سے رومیوں کو اس انتظار کی زحمت سے نجات مل جائے گی کہ ایک سن رسیدہ اور نفرت زدہ آدمی کب وفات پاتا ہے"۔

قرطاجنہ کی تقدیر اس سے خوشتر ثابت نہ ہوئی۔ شکست کے بعد اس نے بہت جلد نقصانوں کی تلافی کر لی اور نئی عظمت و شوکت کا دور شروع ہو گیا۔ کیٹو[4] اور دوسرے ذی اثر رومیوں کی تنگ دلی یہ صورتِ حال گوارا نہ کر سکی اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ

---

[1] یہ لفظ اصل میں حنی بعل ہے، جس کے لفظی معنی ہیں لطف و نوازشِ بعل۔ چونکہ اسے سب ہینی بال لکھتے ہیں، اس لیے یہ معروف املا اختیار کیا گیا۔

[2] Zama۔

[3] Antiochus۔

[4] Cato۔

Marfat.com

قرطاجنہ کو ضرور تباہ کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۴۶ سنہ ق،م میں سترہ روز تک یہ عظیم القدر شہر ہولناک شعلوں کی جولان گاہ رہا، یہاں تک کہ جہاں یہ آباد تھا، وہاں خاکستر کے انبار لگ گئے۔ پھر اس زمین پر ہل چلائے گئے اور یہ ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پائی۔ اگر زمانہ قدیم کے معیار بھی پیش نظر رکھے جائیں تو یہ فعل ایسا نہ تھا، جو روما کے نام کے لیے عزّت و حرمت کا باعث ہو سکتا ⁂

Marfat.com

# آٹھواں باب

## ادبیات، مذہب اور دوسرے ثقافتی پہلو

**ذہنی اور روحانی واسطہ** فونیقی جس طرح تجارت کے سلسلے میں مشرق و مغرب کے درمیان واسطہ بنے، اسی طرح ذہنیات و روحانیات میں بھی واسطہ بنے رہے۔ ان کے جہاز اور قافلے محض سامان ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ پہنچاتے تھے بلکہ وہ غیر محسوس چیزیں بھی ساتھ لیے لیے پھرتے تھے، جو انسانی ارتقاء کے لیے زیادہ ضروری تھیں۔ انھیں میں گوناگوں تہذیبی اثرات بھی شامل تھے، جو فونیقی تاجر اور آبادکار دوسروں پر ڈالتے تھے۔ یونانیوں نے بحر پیمائی اور آبادکاری میں ان کی شاگردی اختیار کی، بلکہ ادبیات، مذہب اور فنی فنون کے دائروں میں بھی بہت کچھ ان سے مستعار لیا۔ فونیقیوں کی سرگرمیوں نے جزیرۂ روم کو گوناگوں ثقافتی تحریکات کا مرکز بنا دیا، جو محض ایران ہی سے نہیں بلکہ نیل و فرات کی وادیوں سے بھی اٹھی تھیں۔

**ابجد** انسانیت پر جو احسان کیے گئے، ان میں اہمیت کے لحاظ سے اعلیٰ ترین ابجد تھی۔ ابجد سب سے پہلے انھیں نے استعمال کی، جسے تحریر و نگارش کا ایک خاص ترقی یافتہ نظام سمجھنا چاہیے۔ پھر اسے جگہ جگہ پھیلایا۔ فونیقیوں نے ابجد کے بنیادی عناصر مصریوں کے ہیروغلافی (تصویری) نظام سے لیے اور یہ عناصر جزیرہ نمائے سینا سے ان کے پاس پہنچے۔ ہیروغلافی رسم الخط کی ابتدا تصویروں سے ہوئی تھی، لیکن آہستہ آہستہ چالیس صوتی نشان قائم کرلیے تھے، جنھیں اس رسم الخط کے حروف صحیح سمجھنا چاہیے۔ اہل مصر قدامت پسند تھے اور ان نشانوں کا استعمال شروع نہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سترھویں صدی کے اواخر اور سولھویں صدی کے اوائل میں کنعانی قیدی یا کان کن جزیرہ نمائے سینا میں تھے۔ وہ ہیروغلافی رسم الخط کی پیچیدگیوں پر قابو نہ پا سکے۔ چنانچہ مصریوں کے طریق تحریر کو یکسر نظرانداز

Marfat.com

کرکے وہ نشان استعمال کرنے شروع کیے، جنھیں حروف صحیح کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے لیے سامی نام اور سامی آغاز تجویز کرلیے۔ مثلاً ایک نشان بیل کے سر کا تھا۔ ان کنعانیوں نے یہ حقیقت نظر انداز کردی کہ مصری زبان میں بیل کے سر کو کیا کہتے ہیں اور سامی میں اس کا نام آلف رکھ لیا۔ پھر صوتیات کے اصول کی بنا پر ہر حرف کی ابتدائی آواز کو اس نشان کا نام دے دیا، جو اس کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہی آخری نشان تلفظ میں استعمال ہوا۔ صوتیات کا اصول ان گیتوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، جو کم سن بچوں کو بہلانے کے لیے گائے جاتے ہیں۔ مثلاً اے (A) آرچر (ARCHER) کے لیے ہے۔ یہی طریقہ نشانوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ مثلاً گھر کو بیت کہتے ہیں۔ اس نشان کے لیے ب مقرر کرلی گئی۔ ہاتھ ید ہے، اس کے لیے ی مقرر ہوگئی۔ پانی کے لیے جو نشان تھا، اسے میم کہتے ہیں، چنانچہ اس کے لیے م (M) استعمال ہونے لگا۔ سر کے لیے لفظ کنعانی میں ریش تھا۔ اس کی جگہ ر (R) رائج ہوگئی[۱] فونیقیوں نے اہل سینا سے تجارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے معلوم ہوتا ہے وہیں سے انھوں نے وہ حروف لیے۔ ان میں کچھ اضافہ کیا۔ پھر بائیس نشانوں کا ایک مکمل سلسلہ قائم کرلیا، لیکن یہ تمام حروف صحیح تھے +

ابجدی نظام میں بائیس حروف کو سطر وار دائیں سے بائیں جانب لکھنا بظاہر بابلی فونیقیوں کا کارنامہ تھا۔ دائیں سے بائیں جانب لکھنے کی ابتدا ان کتبوں سے ہوئی، جو پتھروں پر کندہ کیے گئے۔ اس میں کندہ کرنے والے کی سہولت پیش نظر رہی۔ بائیں سے دائیں جانب لکھنے کا دستور اس وقت شروع ہوا، جب قلم اور سیاہی سے کام لیا جانے لگا۔ اغاریت کے فونیقیوں نے مختلف خطوط پر ایک اور سلسلہ تیار کرلیا۔ انھوں نے ابجد لے لی اور ایک نوک دار چیز سے مٹی کی تختیوں پر لکھنے لگے۔ اس طرح پیکانی[۲] خط معرض وجود میں آگیا، جس سے وہ کام لیتے رہے۔ اغاریت سے جو تختیاں ۱۹۲۹ء یا اس کے بعد برآمد ہوئیں، وہ اسی غیر معروف رسم الخط میں ہیں۔ ان میں سے بعض چودھویں صدی قبل مسیح کی ہیں، بعض اس سے بھی پیشتر کی۔ ۱۹۲۹ء میں راس الشمرہ سے ایک چھوٹی سی تختی ملی تھی، جو اسی زمانے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم ترین ابجد کا نمونہ یہی ہے، جس میں بائیس حروف اسی ترتیب سے استعمال ہوئے، جو عبرانی اور ارامی رسم الخط

---

[۱] دیکھیے ڈیوڈ ڈانجر (Dinger) کی انگریزی کتاب ابجد صفحہ ۲۰۰، نیز رابرٹ ایچ فیفر (Pfeiffer) کی انگریزی کتاب قدیم ابجد +

[۲] جہینس فریڈرک کا جرمن مقالہ نیز ہیرس کی کتاب، فونیقی زبان کی ایک گرامر +

میں اختیار کی گئی تھی۔ عربی میں یہ ترتیب بدل گئی یعنی چھ حروف کا اضافہ ہوگیا۔ وہ بھی سب کے سب حروف صحیح تھے۔ مثلاً ت، د اور ط کا ذرا بدلا ہوا تلفظ ث، ذ اور ظ، ز کی تھوڑی سی ترمیم ض، خ اور غ۔[1] ان دو تحریری سلسلوں کے علاوہ جو کنعانیوں نے وضع کیے اور بھی کئی پیچدار سلسلے تھے، جن میں سے ایک کی ایجاد کے وہ ذمّہ دار ہیں۔ یہ سلسلہ ہجّا پر موقوف تھا، جو ۲۱۰۰ء ق۔م کے آس پاس وجود میں آیا۔ یہ ایک حد تک مصریوں کے نمونے پر مبنی تھا اور اس میں ایک سو نشان تھے۔ یہ نیم ہیروغلافی (نیم تصویری) رسم الخط ان تمام کتبات میں استعمال ہوا، خواہ وہ پتھر پر تھے یا تانبے پر، جو ۱۹۳۰ء میں ببلوس سے برآمد ہوئے[2] اور فونیقی بول چال کی قدیم ترین یادگار ہیں (تقریباً ۱۳۷۵ء ق۔م)۔ آگے چل کر اس رسم الخط کی جگہ سرکاری کاغذات میں اکادیوں کے پیکانی خط نے لے لی۔ اسی میں تل العمارنہ کی تختیوں والے حروف کندہ کیے گئے تھے۔ فلسطین کے اندر دوسرے ہزار سال کے دوران میں تحریری ابجد کے لیے اور کوششیں بھی ہوئیں، لیکن ایک ہزار سال قبل مسیح تک فونیقی ابجد کے سوا تمام ابجدیں گلدستہ طاقِ نسیاں بن چکی تھیں۔ فونیقیوں کو فتح کامل نصیب ہوئی۔ کنعانیوں کی ابجد کی جو قدیم ترین قابلِ فہم دستاویز دریافت ہوئی وہ دونا کی ببلوس کے بالا حصار سے ملی تھی۔ یہ پانچ سطروں کا ایک کتبہ ہے، جو پتھر پر کندہ کیا گیا تھا اور اس میں شفط بعل بن ابلی بعل بن یحیٰی ملک کی طرف سے ایک دیوار بنانے کا ذکر تھا۔ یہ تینوں شخص ببلوس کے بادشاہ تھے۔ اسے سترھویں صدی قبل مسیح کا بتانا غالباً ایک حد تک مبالغہ ہے۔ حروف بیشک اس طویل کتبے کے حروف سے زیادہ پرانے ہیں، جو احیرام سے منسوب ہے اور مونتے کو ۱۹۲۳ء میں ببلوس سے ملا تھا اور اسے گیارھویں صدی کا سمجھا جاتا ہے۔

## ادبیات

دوسرے ہزار سال میں دستاویزوں کی اس کثرت کے پیش نظر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ وہ تہذیبوں کی تکثیر و تقلیم کا دور تھا، جس میں دوآبۂ دجلہ و فرات، مصر اور فونیقیہ کے درمیان ملکی اور مذہبی افکار کا مبادلہ جاری رہا، البتہ اس دور کا ذخیرۂ ادب زیادہ مقدار میں محفوظ نہ رہا۔ فونیقیوں نے جو کچھ پیدا کیا، وہ پیپرس پر لکھا جاتا تھا اور پیپرس جلد فنا ہو جانے والی چیز تھی۔ نیز ان کی توجہ زیادہ تر کاروباری معاملات پر رہی۔ یہ کس درجہ عجیب

---

[1] ڈانجر صفحہ ۲۷۵۔

[2] ارس دونا کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۱۳۵۔

واقعہ ہے کہ جس قوم نے سب سے پہلے تحریر ابجد کا سلسلہ مکمل کیا، اس کی تحریری دستاویزیں بہت ہی قلیل تعداد میں باقی رہیں۔ زیادہ تر دستاویزیں آخری دور کی ہیں، یعنی پانچویں اور دوسری صدی قبل مسیح کے درمیان کی۔ مسیح کے بعد کا کوئی فونیقی کتبہ فونیقیہ میں نہ مل سکا۔ البتہ فونیقیوں کی مغربی شاخ میں جو زبان بولی جاتی تھی، یعنی پیونی زبان، وہ ظہور اسلام کے وقت تک بولی جاتی رہی۔ قبرص اور مالٹا میں یونانی اور فونیقی ملی جلی زبان دریافت ہوئی تو فرانس اور دوسرے ملکوں کے اہل علم نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کے حل کے لیے کوششیں شروع کیں اور جرمنی کے مستشرق جینیس[1] نے ۱۸۳۷ء میں دریافت شدہ دستاویزوں کا حل شائع کیا۔

**اُغاریت** یہ امر باعث مسرت ہے کہ کنعانی ادب میں جو بہترین چیزیں تھیں، ان میں سے زیادہ تر ان کے عبرانی بھائیوں اور دوسرے ہمسایوں نے لے لیں اور وہ مقدس نوشتوں میں محفوظ ہو گئیں۔ اس کی تصدیق بہ طور خاص ان غنائی ادبی ٹکڑوں اور حکیمانہ اقوال سے ہوتی ہے، جو امثال، زبور اور غزل الغزلات میں مستعار لیے گئے، نیز ان اساطیری نگارشات سے ہوتی ہے، جو کتاب پیدائش اور صحائف انبیاء میں شامل ہیں۔ یہ حقیقت اس وقت تک پوری طرح واضح نہ ہوئی تھی، جب تک فراموش شدہ شہر اغاریت دریافت نہ ہوا۔

۱۹۲۹ء میں بمقام راس الشمرہ[2]، جو لاذقیہ[3] کے شمال میں ہے، ایک شامی دہقان کو اتفاقیہ ایک چیز مل گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرانسیسی[4] دانائے آثار قدیمہ نے ایک بہت بڑے تودے پر کھدائی شروع کر دی۔ اس طرح کھنڈر دریافت ہوئے۔ یہ شہروں کا ایک سلسلہ تھا۔ ہر شہر دوسرے کے کھنڈروں پر آباد ہوتا رہا۔ اسی دریافت سے گم شدہ کنعانی ادب کا ایک اہم حصہ دستیاب ہوا۔ اس مقام پر سب سے پہلی آبادی جدید حجری دور کے آخری حصے میں ہوئی تیسرے ہزار سال کے اواخر تک کنعانی اغاریت اور اس کی بندرگاہ پر، جسے اب المیناء البیضاء کہتے ہیں، پوری طرح قدم جما چکے تھے۔ یہاں دو معبد تھے، ایک بعل کا، دوسرا دجون کا۔ یہ دوسرے ہزار سال کے آخری دور میں بنے تھے۔ سنہ ۱۴۰۰ ق، م کے آس پاس اغاریت کی خوش حالی

---

[1] Gesenius ۔ [2] راس الشمرہ کے معنی ہیں وہ راس جہاں سونا ہوتا ہے۔ اغاریت کے معنی ہیں کھیت۔ یہ لفظ سمیریوں سے لیا گیا۔ [3] Latakia ۔ [4] F.A. Schaeffer ، دیکھیے رسالہ سیریا جلد ۱۰، صفحہ ۲۸۵ - ۲۹۷ نیز مصنف مذکور کی کتاب اغاریتیکا۔

Marfat.com

نصف النہار پر پہنچ گئی تھی۔ یہ خوش حالی اس تجارت کا نتیجہ تھی، جو شہر اور اس کی بندرگاہ کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ کریٹ سے اس کے ثقافتی روابط نہایت مستحکم اور پائدار تھے اُس زمانے میں اغاریت کا بادشاہ نقمد (نقمد یعنی ہدد دیوتا کا انتقام) تھا۔ اس نے اپنے لیے جو قصر بنوایا تھا، اس کے ستونوں کی بنیادیں چاندی کی تھیں +

اس مقام سے جو چیزیں دستیاب ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ قیمتی چیز مٹی کی وہ تختیاں تھیں، جن پر تحریرات ثبت تھیں، لیکن ان میں جو ابجد استعمال ہوئی تھی وہ میخی نمونے کے انداز کی تھی۔ یہ تختیاں معبد کے حلقے سے ملی تھیں۔ اندازہ کیا گیا کہ اصل تحریریں بہت پیشتر کی تھیں، لیکن چودھویں صدی قبل مسیح میں ان تحریروں کی نقلیں تختیوں کی شکل میں محفوظ کی گئیں۔ ان کی زبان وہی ہے، جو کنعانی میں بولی جاتی تھی۔ مضمون زیادہ تر مذہبی ہے، یا اس کا تعلق مذہبی رسوم سے ہے۔ بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ایک نظم ہے جس میں نباتات کے دیوتا "علیان بعل" اور اس کے حریف موت کے درمیان سالانہ کشمکش کا ذکر ہے پہلے موت بعل کو شکست دے دیتی ہے جس سرزمین میں خشک گرما کے آتے ہی نباتات جل جاتی ہے، وہاں حالات کی صحیح تعبیر وہی ہو سکتی تھی جو اس نظم میں بیان کی گئی۔ پھر خزاں میں بارشیں شروع ہوتی ہیں تو بعل موت پر فتح پا لیتا ہے۔ اگر بنیادی اجزا پیشِ نظر رکھے جائیں تو ایڈونس[1] کی فنیقی کہانی اور اوزیرس کی مصری کہانی بالکل یہی ہے جو اس نظم میں بیان کی گئی ہے +

اغاریت سے جو ادبی ٹکڑے دریافت ہوئے، ان میں اور صحیفۂ ایوب (بائبل) میں فکر اور اسلوبِ بیان کے درمیان مشابہت دیکھانی موجود ہے۔ الفاظ، اور ادبی وضع و ترکیب میں ان تختیوں اور عبرانی بربط کے درمیان مطابقت حیرت انگیز ہے۔ گویا اغاریت اور عبرانی شاعری پہلو بہ پہلو رہیں +

یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ زمانۂ قدیم کی یہ بین الاقوامی منڈی خاص فنیقیہ کے دائرے میں تھی، لیکن فنیقی ثقافت کے دائرے میں ضرور شامل تھی۔ بیروت کے ایک بادشاہ کا ایک خط دستیاب ہوا ہے[2]، جو اس نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا اور وہ اغاریت کا حاکم تھا۔

---

[1] Adonis +

[2] Ch. Virolleaud، رسالہ سیریا میں جلد ۲۱، صفحہ ۲۴۷ +

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اغاریت بیروت سے وابستہ تھا۔ یہ پہلے زلزلے سے تباہ ہوا ۱۳۶۵ھ ق۔م میں آگ سے راکھ کا ڈھیر بنا ۱۲۰۰ھ ق۔م کے آس پاس بحری لوگوں نے اسے تباہ کیا، پھر یہ زندہ نہ ہو سکا +

**مذہب باروری** اغاریت کو الگ رکھا جائے تو کنعانیوں کے مذہب کے متعلق ہمارے ابتدائی ادبی وسائل بہت محدود ہیں۔ یونانی تحریرات جن میں ببلوس کے فلو[^۱] اور سموساتا (موجودہ سمیساط، شمالی شام) کے لوسیان کی تحریرات میں شامل ہیں، دور متاخر کی ہیں اور ان میں ابہام ہے۔ "عہد نامۂ قدیم" (بائیبل) کا ذخیرۂ معلومات عبرانی معتقول کی معاندانہ روش کا تختۂ مشق بنا۔ ابتدائی دور کے مسیحی مذہبی پیشواؤں سے جو کچھ ملا، وہ دوسروں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ ان تمام مسائل کے علاوہ آثار قدیمہ کی دریافت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کنعانی مذہب کی بنیاد توارد و تناسل اور قوائے نشو و ارتقاء کی پرستش تھی۔ جس سرزمین میں بارش محدود اور غیر یقینی تھی، وہاں رہنے والے لوگوں کا مدارِ حیات صرف زراعت اور تربیتِ حیوانات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ توارد و تناسل اور نشو و ارتقاء نے خاص اہمیت اختیار کی۔ تمام سامی مذاہب کی کیفیت بہ حیثیت عمومی یہی ہے۔ کنعانیوں نے غالباً یہ مذہبی افکار اپنے بابلی اور مصری ہمسایوں کے رسوم و عقائد سے مستعار لیے، لیکن اُنھوں نے دوسروں کو بھی مستعار دیے +

ساہیوں کے اس مذہب باروری کا نمایاں ترین پہلو یہ ہے کہ نباتات کے دیوتا کی وفات پر جو ماتمی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ اسے حریف ــــ موت اور تحت الثریٰ کا دیوتا ــــ پر فتح کے قابل بنا دے۔ اس طرح زندگی بخش بارش کی خاصی مقدار میں ہونا یقینی ہو جائے تاکہ نئے سال کی فصلیں خوب پھولیں پھلیں اور جس دیوتا کا ماتم کیا جا چکا ہے اس کے دوبارہ زندگی پا لینے پر خوشیاں منائی جائیں۔ چنانچہ ان کے ہاں از سر نو زندگی پائے ہوئے دیوتا بعل کی شادی باروری کی دیوی عشتار سے کی جاتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ موسم بہار میں زمین سبزے سے ڈھنپ جاتی تھی۔ اس متقدس شادی نے رفعت کا جامہ پہنا اور روحانیت کی شکل اختیار کی تو آگے چل کر یہی رشتہ یہوواہ اور اس کے خاص لوگوں کے درمیان پیدا ہو گیا۔ مر کر جی اُٹھنے والے معبود کا تصوّر مسیحی روایات کا اہم اور محبوب حصّہ

[^۱]: Philo +

Marfat.com

بن گیا +

**تموز اور عشتار** گرما کی حدّت میں نباتات کی وقتی موت اور موسم بہار میں اس کے احیاء کا تصوّر سورج کی تجدیدِ قوّت سے وابستہ تھا، جب وہ سرما کو شکست دے کر کامرانی کا تاج پہن لیتا تھا۔ تموز[۱] کے افسانے میں بھی بیشتر یہی حقیقت مضمر تھی۔ کنعانی اس دیوتا کو آذون کہتے تھے یعنی آقا و مالک۔ یہی لفظ یونانیوں نے لیا اور اسے ایڈونس بنا دیا۔ مصر میں اس نے اوزیرس کی شکل اختیار کی۔ ایڈونس کی حیثیت میں اس کی شہرت تمام دیویوں اور دیوتاؤں پہ سبقت لے گئی۔ اس کا مذہب پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کے اندر قدم جما چکا تھا۔ فونیقیوں نے اس کی داستان عشتار —— خاتون ببلوس —— سے وابستہ کر کے رفعتہ میں مقامی حیثیت دے دی، جو نہر ابراہیم کا سرچشمہ ہے۔ قصّہ یوں ہے کہ تموز لبنان کے پہاڑوں میں جنگلی سؤر کا تعاقب کر رہا تھا۔ سؤر نے اسے زخمی کر دیا۔ نزع کی حالت میں اسے غم دیدہ محبوبہ کے پاس لے گئے[۲]۔ اُسی وقت سے ہر سال موسم خزاں میں نہر ابراہیم کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ یہ تموز کے خون کا کرشمہ ہے (دورِ حاضر کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس داستان کی قدر و قیمت یہ کہہ کر گھٹا دی کہ موسم بہار میں بارشوں کے باعث پانی بڑھتا ہے تو سرخ رنگ کی مٹی تحلیل ہو کر اس میں مل جاتی ہے[۳])۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب تموز تحت الثریٰ میں چلا جاتا تھا تو زمین کی نباتات افسردہ ہو جاتی تھی اور اُس وقت تک مری رہتی تھی جب تک عشتار تحت الثریٰ میں پہنچ کر تموز کو نئی زندگی سے بہرہ مند نہ کرتی تھی۔ تموز کی موت پر جو رسمیں ادا کی جاتی تھیں، اُنھوں نے ببلوس میں فروغ حاصل کیا، جو نہر ابراہیم کے دہانے سے پانچ میل شمال میں ہے اور عورتوں کو اس کی تلاش کرنی پڑتی تھی۔ نئی زندگی پا لینے پر ہر سال جو جشن منایا جاتا، وہ سات دن جاری رہتا۔ شادمانی کی سرشاری میں عورتیں اپنی عزّت قربان کر دیتیں اور مرد اپنی قوّت سے دست بردار ہو کر معبد میں اس طرح جاتے، گویا وہ خواجہ سرا ہیں[۴]۔ ملٹن شیطان کے روبرو کنعانی دیوتاؤں کی تفصیل بیان کرتا ہوا ایڈونس کے مذہب کے بارے میں کہتا ہے:

---

۱؎ اکادی لفظ دموزی بمعنی وفادار بیٹا۔ یہ سمیری الاصل لفظ ہے۔ سامی سال کے چوتھے مہینے کا نام یہی ہے۔ موجودہ عربی تقویم کا یہ ساتواں مہینا ہے + ۲؎ الغینہ میں ایک چٹان ہے جو ساحل سے بارہ میل ہے۔ اس چٹان پر تموز اور جنگلی سؤر کی کشمکش کا نقشہ پیش کیا گیا ہے + ۳؎ اس افسانے کی ایک اور تعبیر بھی ہے، جس میں ایڈونس کو نعمان بتایا گیا ہے۔ عربی میں اب تک شقائق النعمان کو ایڈونس کے خون سے رنگین سمجھا جاتا ہے +
۴؎ فردوسِ گم شدہ کتاب اول حصّہ دوم +

Marfat.com

"ان کے بعد تموز کا رہا تھا، جس کے لبنان میں زخمی ہونے کی یاد میں شامی دوشیزائیں گریہ و ماتم کرتیں۔ ساتھ ساتھ لبریز محبت گیت گائے جاتے۔ یہ سب کچھ موسم گرما میں ایک خاص دن ہوتا تھا۔ ایڈونس اپنے پہاڑی مسکن سے ارغوانی رنگ میں سمندر کی طرف دوڑتا سمجھا جاتا۔"

ایڈونس اور عستار کا مذہبی سلسلہ رومیوں کے عہد تک فروغ پر رہا۔ لوسیان[1] شام کا ایک شگفتہ کار مصنّف اور سیاح گذرا ہے۔ اس نے ببلوس کے معبد کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی کتاب میں اس کے مراسم کا ذکر یوں کرتا ہے:

"..... اس حادثے کی یاد میں وہ ہر سال سینہ کوبی اور آہ و زاری پر مشغول ہوتے ہیں اور پورے علاقے میں ماتم کے مراسم خفیہ خفیہ ادا کرتے ہیں۔ جب ماتم اور گریہ و زاری ہو چکتی ہے تو سب سے پہلے ایڈونس کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔ گویا وہ بہارستانِ زندگی سے رخصت ہو گیا۔ پھر کہنے لگتے ہیں "دیکھو، وہ از سرِ نو زندہ ہو گیا" اور اس کی مورتی کی عام نمائش کی جاتی ہے۔ وہ اپنے سر منڈا لیتے ہیں، بالکل اس طرح جس طرح مصری اپنے "مقدس سانڈ"[2] کے چھن جانے پر منڈاتے ہیں۔ جو عورتیں سر منڈانے پر آمادہ نہیں ہوتیں، انھیں یہ سزا دی جاتی ہے کہ پورا دن تیار رہیں اور جو شخص ان کا پیسہ دے کر ان کی ذات سے فائدہ اٹھانا چاہے[3] انکار نہ کریں۔"

موت و حیات کا چکر صرف نباتات تک محدود نہ تھا بلکہ انسان بھی اس میں شامل تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی کے جنسی پہلو کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس کا ثبوت یوں مہیا ہوتا ہے کہ عصمت فروشی کا ایک مقدس ادارہ قائم ہو گیا، جس کا تعلق مراسم باروری سے تھا۔ یہ ایک قدیم سامی رسم تھی لیکن جنسی آزادی دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کی دوسری ابتدائی قوموں کے مذہبی مشغلوں کا نمایاں پہلو رہی۔ بابل،[4] قبرص، یونان، سسلی، قرطاجنہ اور دوسرے مقامات پر بھی یہ سلسلے برابر جاری رہے۔ عبرانیوں یعنی یہودیوں نے ہیکلوں کے ساتھ کسبیوں کا انتظام کر لیا۔[5] جنوبی عرب کے بعض قدیم معبدوں میں

---

ف۱ Lucian + ف۲ Apis + ف۳ ہربرٹ اے سٹرانگ (Strong) کی کتاب (The Syrian Goddess) صفحہ ۴۶ + ف۴ ہیروڈوٹس کتاب اوّل باب ۱۹۹، سٹرابو کتاب ۱۶ باب ۱، ۲۰، کتاب ۱۵ باب ۲ + ف۵ حزقی ایل باب ۸، آیت ۱۴۔ میکاہ باب ۱، آیت ۷، استثنا باب ۲۳، آیت ۱

عورتوں کی ایک بڑی تعداد خدمتگاری کے لیے رکھی جاتی تھی۔ کارنتھ (یونان) میں الفروڈائٹ[1] (وینس یعنی زہرہ) کے مندر کے ساتھ ایک ہزار کنیزیں رہتی تھیں۔ ان کی وجہ سے شہر نے بداخلاقی میں نمایاں شہرت حاصل کر لی اور یہ سلسلہ ظہور مسیحیت تک جاری رہا[2]۔ زہرہ دیوی کی حیثیت یونان میں وہی تھی، جو عشتار کو شام میں حاصل تھی۔ یونان میں یہ سلسلہ پانچویں صدی کے اوائل پر شروع ہوا اور ممکن ہے، مشرق سے وہاں پہنچا ہو۔ جس حد تک فونیقیوں کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ چونکہ خاصی لمبی مدت بحری سفروں میں گزارتے تھے، اس لیے بدکاری کے اس سلسلے نے ان میں فروغ پایا۔ شادی میں شامل ہونے والے لوگوں کا ایک حق یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ دلہن کا بوسہ لیں۔ یہ غالباً ابتدائی آزادی ہی کا بقیہ ہے۔ مسیحی راہبات اپنی زندگیاں آسمانی دولھا کے لیے وقف کرتی تھیں تو بال کٹوا دیتی تھیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اغلب ہے، یہ قدیم زمانے کی اسی رسم کا بقیہ ہو، جس کے مطابق عورتیں شادی سے پیشتر کی بدکاری کا داغ بال کٹوا کر یا منڈا کر دھو ڈالتی تھیں۔ ختنہ بھی ایک قدیم سامی رسم ہے۔ بہ ظاہر یہ بھی باروری کی دیوی کے لیے قربانی کے طور پر شروع ہوئی اور اسے قبیلے کا نشان سمجھا جانے لگا۔ لبنان اور دوسرے علاقوں کے سامیوں نے مسیحیت اختیار کر لی تو یہ رسم چھوڑ دی، لیکن اسلام اور یہودیت میں یہ بدستور جاری رہی۔

مصریوں نے بھی تموز و عشتار کے افسانے کی پیروی میں اوزیرس اور ایزیز کا ڈھانچا تیار کر لیا تھا۔ بہرحال اس افسانے کے سامی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لوسیان لکھتا ہے کہ اہل بابل سمجھتے تھے، اوزیرس مرنے کے بعد بابل میں دفن ہوا۔ اوزیرس کی کہانی تمام مصری داستانوں میں سب سے زیادہ مقدس ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے جسم کا ہر عضو الگ الگ کر کے جبلہ میں اثل فرنگی کی ایک جھاڑی کے نیچے دفن کر دیا گیا تھا[3]۔ نوکراٹس[4] غالباً ایک فونیقی الاصل آبادی تھی، وہاں ۶۸۸ء میں ایک معبد کے اندر الفروڈائٹ عشتارت کی مورتی تھی۔ کینوپس بھی ایک فونیقی بستی ہی تھی، جو مصر کی سرزمین میں بسائی گئی تھی۔ وہاں بھی ایک معبد ہرقل[5] کے لیے مخصوص تھا۔ بے شبہ یہ ہرقل وہی تھا جسے عورتیں ملکارت کہتے تھے۔

---

[1] Aphrodite ۔ [2] کارنتھیوں اوّل باب ۶، آیات ۹ – ۲۰، کارنتھیوں دوم، باب ۱۲ آیت ۲۱۔ [3] پلوٹارک — اثل کو مُردوں کے دیوتا سے وابستہ مانا گیا ہے۔ طالوت اور اس کے بیٹے اسی جھاڑی کے نیچے دفن کیے گئے تھے۔ (دیکھیے سموئیل اول باب ۲۱۔ آیت ۳۳)۔
[4] Nankratis ۔ [5] ہیروڈوٹس کتاب دوم باب ۱۱۳۔

Marfat.com

## دیوتا اور دیویاں

سامی مذہب کی ابتدائی کنعانی شکل اصولاً اور اساساً مظاہر قدرت کی پرستش تھی۔ اس میں دو معبودوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اوّل آسمان کا دیوتا جسے باپ سمجھا جاتا تھا، دوم زمین کی دیوی، جسے ماں کی حیثیت حاصل تھی۔ بہ حیثیت عمومی کنعانیوں کے جتنے بھی دیوتا تھے، اس کے سوا کچھ نہ تھے کہ قوائے فطرت کی مورتیاں تیار کر لی گئی تھیں، خصوصاً بارش اور نباتات کی مورتیاں۔ اغاریت میں آسمان کا ایک دیوتا تھا، جس کا خاص مقام افقہ تھا، اسے ایل کہتے تھے۔ دیوی کا نام اشیرت تھا۔ ایل جو کنعانی و عبرانی دنیا کا معبود بن گیا، خالق مانا جاتا تھا اور اسے تمام دیوتاؤں کا باپ سمجھتے تھے۔ اس کی مورتی ایسی بنائی جاتی تھی، گویا وہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ دارالاصنام میں سب سے اونچی جگہ اسی کو رکھا جاتا تھا۔ ارامی دارالاصنام میں ہد سب سے اونچا مانا جاتا تھا۔ یہ طوفانوں اور باروری کا دیوتا تھا۔ اسے بڑا خوش نما بنایا جاتا تھا۔ ایل کے بعد علیان کا درجہ تھا۔ یہ عمر میں جوان اور بڑا قوی اور طاقتور تھا۔ اسی علیان نے بعل کی حیثیت میں مقامی شان پیدا کر لی اور اسے شہروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ بارشیں اور فصلیں اسی کے دائرۂ اختیار میں تھیں۔ ندیوں اور دریاؤں کا نگران بھی وہی تھا۔ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جشنوں سے خوش ہوتا ہے اور قربانیاں اس کے دل میں لطف و رحم پیدا کرتی ہیں اصولاً قربانیوں کی حیثیت ایک ایسے جشن کی تھی، جس میں عابد اور معبود یکساں شریک ہوتے تھے۔ کنعان میں کوئی تراشا ہوا بت موجود نہ تھا۔ ستونوں اور پتھروں ہی کو دیوتائی کا خاص نشان مانا جاتا تھا۔

ایل کو اغاریت کی اشیرت کا شوہر سمجھا جاتا تھا۔ یہ اشیرت عشتارت سے الگ ایک وجود ہے۔ اغاریت اور تل العمارنہ کی عشتارت اصل میں اشور و بابل کی اشتار تھی۔ اسے ماں کا درجہ حاصل تھا اور دوسری دیویوں کے برعکس یہ مستقل وجود کی مالک تھی۔ یہودی اسے عشتارات اور یونانی استارتے کہتے تھے۔ یونانیوں نے اسے ایفراڈائٹ بنا لیا اور یہ باروری کی نہایت مشہور دیوی بن گئی۔ بعلہ کی حیثیت میں اسے مقامی بنا لیا گیا اور شہروں کی محافظ قرار دے دیا گیا۔ مثلاً بیروت کی نگران بھی ایک بعلہ تھی، لیکن اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ دیوتاؤں کی طرح دیویوں کے نام بھی ظاہر نہ ہونے دیے گئے، یہاں تک کہ بھول گئے۔

مگر جبیلہ کی بعلہ کا نام موجود ہے۔ یعنی استارت، جو شہر کے آذون کی بیوی تھی اور جسے اعلاً دوآبہ دجلہ و فرات کی دیوی مانا جاتا ہے۔ کنعانیوں کے اونچے مقامات پر عستارات کا نام تمام مقامی دیویوں کو دے دیا جاتا تھا، جو بعلوں کے ساتھ عبادت میں شامل ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی یعنی یہودی اس دیوی سے بہت مسحور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کو بار بار اس کی مذمت کی ضرورت پیش آئی[1]۔ ایلول یہاں کی تقویم کا چھٹا مہینا ہے۔ جب گرمی کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ مہینا عستارات ہی کے لیے مخصوص تھا کیونکہ اسی مہینے میں اس دیوی کی قوتوں کی بدولت فصلیں پکتی تھیں یعنی یہ تموز کی نمائندگی کرتی تھی۔ بعلات کی نمائندگی کے علاوہ عستارات کو "ملکہ" کا لقب بھی حاصل تھا، گویا یہ ملکۂ آسمان[2] کی یاد تازہ کرتی تھی۔ اس دیوی کے اوصاف و خصائص میں عنت بھی شریک تھی، جو علیان بعل کی بہن تھی اور جسے ایک کتبے میں خاتونِ آسمان قرار دیا گیا ہے۔ عنت کو دوشیزہ مانا جاتا تھا اور بڑی جنگجو سمجھا جاتا تھا۔ عنت عستارات ایک ہی وقت میں زندگی بخش بھی تھی اور زندگی کش بھی۔ اس کے اوصاف میں محبت اور جنگ دونوں کو یکساں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مصریوں نے اس فونیقی دیوی کو انتا[3] کا نام دے دیا۔

دیوتاؤں میں ایک اور نام زیادہ نمایاں ہے یعنی ملکارت، "شاہِ شہر"۔ شہر سے مراد صور ہے۔ ملک دیوتا کا لقب ہے اور ملکہ دیوی کا۔ یہ القاب مسیحیوں میں بھی منتقل ہو گئے۔ صور میں اس دیوتا کے لیے ہر سال ایک جشن منایا جاتا تھا۔ یہاں کے نہایت ممتاز بادشاہ حیرام اوّل نے اس کے لیے ایک معبد تعمیر کرایا۔ اہلِ صور کے زیرِ اثر یہ مذہب فونیقیہ میں سب پر فوقیت لے گیا، پھر دور دور تک پھیل گیا۔ فونیقیوں کی ایک نوآبادی قبرص میں تھی جسے سیتم کہتے تھے[4]۔ یہاں اس مذہب نے بڑا فروغ پایا۔ یونانیوں نے اسے اپنے دیوتا ہرقل کا مثنیٰ قرار دے دیا۔ "عہد نامۂ قدیم" (بائیبل) میں ملکارت کو مولک سمجھا گیا ہے، جس کے بچوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں، لیکن یہ معاملہ محلِّ نظر ہے۔ پہلوٹھے بچے کی قربانی سامیوں کی ایک

---

[1] قضاۃ باب ۲ آیت ۱۲-۱۳، یرمیاہ باب ۳۲، آیت ۳۵، سلاطین اوّل باب ۱۹، آیت ۱۸، سلاطین دوم باب ۲۳، سیموئیل اول باب ۷، آیت ۳ و ۴ ۔ [2] یرمیاہ باب ۷، آیت ۱۸، باب ۴۴ آیات ۱۷-۱۹، آیت ۲۵ ۔ [3] Anta ۔

[4] Citium ۔

قدیم رسم تھی۔ اموری اس پر عمل پیرا تھے۔ فلسطین اور دوسرے مقامات پر جو کھدائیاں ہوئیں، وہاں گھروں کی بنیادوں یا معبدوں کے اندر سے ایسے مرتبان نکلے جن میں بچوں کی میتیں رکھی گئی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پہلوٹھے بیٹے کی جگہ دُنبہ یا مینڈھے کی قربانی دے دی۔ یہ واقعہ سامی نشو و ارتقار کی ثقافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہے، جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اب انسانی قربانیاں مقصود نہیں، لیکن اس رسم کی صدائیں "عہد نامۂ قدیم" کے صفحات پر برابر گونجتی رہیں[1]۔ اگرچہ بڑا سخت قانون بنا دیا گیا تھا کہ بچوں کو مولاک کی خاطر آگ میں سے نہ گزارا جائے[2]۔ فونیقیوں کا معاملہ خاص تھا۔ انھیں خشکی اور تری کے سفروں میں غیر معمولی خطرات سے سابقہ پڑتا تھا اور وہ اس سخت گیر دیوتا کے لطف و رحم کا مورد بننے کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی چیز بے تکلف قربان کر دینے پر آمادہ رہتے تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں اُنھوں نے یہ رسم بالکل ترک کر دی، لیکن مغربی یورپ میں دیوتاؤں کو رام کرنے کے لیے انسانی قربانیوں کا سلسلہ حضرت مسیح کے بعد بھی صدیوں تک قائم رہا۔

دوسرے دیوتاؤں میں اشمون، رشفہ اور دجون کا ذکر ضروری ہے۔ اشمون کو صیدا میں بہ طورِ خاص محترم مانا جاتا تھا[3]۔ اس کا معبد وہی تھا، جہاں مارونیوں نے مارا لیاس کا گرجا بنایا۔ یہ صیدا کے جنوب مشرق میں ہے۔ کلاسیکی مصنفوں میں سے متعدد اصحاب نے اس دیوتا کو اسلیپنس[4] قرار دیا ہے، جو علاج و شفا کا دیوتا تھا۔ اس کا نشان یہ تھا کہ ایک عصا پر دو سانپ کنڈلی مارے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔ آج کل اسی کو طب کا نشان مانا جاتا ہے۔ سمیریا کے ایک معبودِ شفا کے لیے بھی یہی نشان استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے کی ابتدا یہ سمجھی جاتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دشت میں پیتل کا ایک سانپ بنوا کر بلی پر لٹکا دیا تھا[5]۔ حضرت مسیحؑ نے بھی سُولی دیے جانے کی پیشگوئی کرتے ہوئے سانپ کو بلی پر چڑھانے کا ذکر کیا تھا[6]۔ اشمون کا نام آخری

---

ف۱ پیدائش باب ۲۲، آیت ۶، سلاطین اول باب ۱۶، آیت ۳۴، سلاطین دوم باب ۳، آیت ۲۷، باب ۲۱ آیت ۶، زبور ۱۰۶، آیت ۳۸، یرمیاہ باب ۷، آیت ۳۱، حزقی ایل باب ۱۶، آیت ۲۱۔ ف۲ احبار باب ۱۸ آیت ۲۱، باب ۲۰، آیت ۱-۵۔ ف۳ یہ نام غالباً اسمون ہے۔ ف۴ ۔ ف۵ گنتی باب ۲۱، آیت ۸ و ۹، سلاطین دوم باب ۱۸، آیت ۴۔ بتایا گیا ہے کہ جہاں بنی اسرائیل پہنچے تھے، وہاں سانپ بے شمار تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے پیتل کا سانپ بنا کر لٹکا دیا۔ سانپ کے ڈسے ہوئے جس شخص کی نظر اس پر پڑ جاتی وہ بچ جاتا۔

ف۶ ظاہر ہے کہ یہ مسیحی عقیدہ ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ارشاد کے لیے ملاحظہ ہو یوحنا کی انجیل باب ۳، آیت ۱۴-۱۵۔

Marfat.com

دور کے فونیقی بادشاہوں نے اختیار کر لیا تھا، مثلاً اشمون عزر۔ قبرص اور قرطاجنہ میں اس کی پوجا خوب ہوتی تھی اور اسے اونچا درجہ حاصل تھا۔ اس کی شہادت یوں ملتی ہے کہ لوگوں کے ناموں میں اشمون شامل ہو گیا تھا۔ سارڈینیا کے ایک کتبے میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ممکن ہے، رشف کا تعلق آگ سے ہو کیونکہ اس لفظ کے معنی ہیں روشن، مگر یہ موت اور بیماری کا دیوتا تھا۔ بابل کے اموری فاتح بھی اس کی پرستش کرتے تھے اور اغاریت میں بھی اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ نئی سلطنت کے مصریوں نے اسے ارشوپ کی شکل میں اختیار کر لیا۔ یونانیوں نے اسے اپولو کا مثنیٰ مان لیا۔ فلسطین اور قبرص کے کتبوں میں یہ نام آیا ہے۔ موجودہ اسرائیلی حکومت نے ایک مقام کا نام ارسوف کے بجائے رشف رکھ دیا گویا انھوں نے فرض کر لیا کہ ارسوف قدیم دیوتا کے نام کا بگاڑ ہے۔

تیسرے ہزار سال قبل مسیح میں اموری دجون دیوتا کی پوجا کرتے تھے اور اغاریت کی کھدائی میں تو اس کا مندر بر آمد ہوا ہے۔ نام سے متبادر ہوتا ہے کہ دجون غلّے کا دیوتا تھا۔ فلسطینیوں نے اسے مچھلیوں کا دیوتا مان لیا اور اسے اپنا قومی دیوتا بنا لیا۔[51]

**معبد**

معبدوں کی تعمیر کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ دیوتاؤں کے لیے کوئی مسکن مہیا کیا جائے۔ معبدوں میں دیوتا اسی طرح رکھے جاتے تھے، جس طرح لوگ گھروں میں رہتے ہیں۔ انھیں میں انسانوں اور دیوتاؤں کے درمیان ذاتی تعلق کا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ اب تک جو قدیم ترین کنعانی معبد دریافت ہوئے ہیں، وہ اریحا اور مجدّو کے ہیں۔ یہ تیسرے ہزار سال قبل مسیح کے ہیں۔ قدیم ترین معبدوں کا نمونہ یہ تھا کہ صرف ایک کمرہ ہوتا تھا اور اس کی طویل سمت میں دروازہ رکھتے تھے۔ دوسرے ہزار سال کے وسط میں معبدوں کی تعمیر زیادہ پُر تکلّف ہو گئی۔ اغاریت سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کا مفاد یہ ہے کہ اس دور کے معبدوں میں چٹانی قربان گاہیں ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ مقدّس ستون، مقدّس کھمبا اور زیرِ زمین کوٹھڑیاں ہوتی تھیں۔ قربان گاہ میں قربانیاں کی جاتی تھیں۔ انھیں معبد میں بے شک و شبہ نمایاں ترین حیثیت حاصل تھی۔ مقدّس ستون یا پتھر[52] دیوتا کی نمائندگی کرتا تھا۔ حُبیلہ کے ایک مقدّس سے قریباً بیس ستون فراہم ہوئے (۱۹۳۶ء) جن کی وضع قطع مخروطی میناروں کی سی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بلندی تقریباً دس فٹ نکلی۔ مقدّس ستون کے علاوہ مقدّس کھمبا

---

[51] قضاۃ باب ۱۶، آیت ۲۳، سیموئیل اوّل باب ۵، آیت ۲ - ۷، تواریخ اوّل باب ۱۰، آیت ۱۰۔

[52] یوشع باب ۴، آیت ۹، سلاطین دوم باب ۱۰، آیت ۲۷، پیدائش باب ۳۵، آیت ۱۴، سیموئیل دوم باب ۱۸ آیت ۱۸۔

یا درخت ہوتا تھا۔[1] شاہ بلوط یا دیودار کے درختوں کا احترام اب تک شام، فلسطین اور لبنان کے مسلمان، مسیحی اور دروزی کرتے ہیں، خصوصاً ان درختوں کا، جو کسی چشمے یا کسی مقدس بزرگ کے مدفن کے پاس ہوں۔ افقہ کے مقدس درخت کے ساتھ چیتھڑے بندھی ہوئی اب تک دیکھی جا سکتی ہیں +

زیر زمین کوٹھڑیاں غالباً دار الاستخارہ[2] کے طور پر مستعمل ہوتی تھیں۔ کھدائی میں ایسے حوض ملے، جن میں چڑھاوے کی شراب گرائی جاتی تھی۔ جام دستیاب ہوئے، جن میں یہ شراب چڑھاوے کے طور پر پیش ہوتی تھی۔ ان چیزوں کی آرائش میں سانپوں کی شکلیں استعمال کی گئیں۔ علاوہ بریں بخوردان اور بخور کے اڈے ملے، جن سے واضح ہو گیا کہ یہ چیزیں کس غرض سے استعمال کی جاتی تھیں۔ ایسے فرش ملے، جن پر پجاری عبادت سے پیشتر پاؤں دھوتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت سے پیشتر وضو کا جو طریقہ اسلام اور یہودیت میں لازم سمجھا جاتا ہے، کنعانی اس سے ناواقف نہ تھے۔ بخور کے اڈے کنعانیوں سے یونانیوں اور اترسکنوں نے لے لیے +

**بُت**

جس حد تک کنعانیوں کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقدس ستون اور مقدس کھمبے کو کافی سمجھتے تھے اور انھوں نے بت بنانے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی، البتہ بعل کے چھوٹے چھوٹے برنجی بت عام تھے۔ ہر بت کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا رہتا تھا، جس میں بجلی چمکتی تھی۔ دیوی کا بت عموماً برہنہ ہوتا۔ اس کے دونوں بازو یا تو نیچے لٹکے یا چھاتیوں پر ہوتے۔ گویا وہ غذا بہم پہنچاتی۔ ایسے بہت سے بت ملے ہیں، دھاتوں کے بھی، اور مٹی کے بھی۔ معلوم ہوتا ہے یہ بت معبدوں کے لیے نہیں بلکہ گھروں کے لیے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ ان میں جادو کا اثر ہے۔ پڑھے لکھے پجاریوں کے نزدیک یہ بت محض دیوتاؤں کے مسکن ہوتے۔ عام لوگ خود انھیں دیوتا سمجھتے +

**اونچے مقامات**

شہری معبدوں کے علاوہ کنعانی لوگ مقامی زیارت گاہیں بھی بنا لیتے تھے۔ یہ عموماً زیر سما مقدس ہوتے تھے، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنائے جاتے۔ اکثر صورتوں میں محض پتھر کی ایک قربان گاہ قائم کر لی جاتی۔ اس کے ساتھ ایک مقدس پتھر ہوتا۔ یہی "اونچے مقامات" تھے، جن کی مذمت "عہد نامہ قدیم" میں بار بار اور بڑی سختی سے کی گئی۔[3] اسرائیلیوں نے اپنے مراسم

---

[1] سلاطین اول باب ۱۶، آیت ۳۳، سلاطین دوم باب ۲۳، آیت ۶-۷، یسعیاہ باب ۲۷، آیت ۹، ممانعت در استثناء باب ۱۲، آیت ۳، باب ۱۶، آیت ۲۱ +

[2] پرانے زمانے میں دستور تھا کہ لوگوں کو جب کوئی کام کرنا منظور ہوتا تھا تو وہ معبدوں میں جا کر پوچھا کرتے تھے کہ کریں یا نہ کریں، جو جواب ملتا، اس کے مطابق عمل کرتے۔ گویا یہ استخارے کا ایک طریقہ تھا۔ انگریزی میں اسے (Oracle) کہتے ہیں +

[3] سلاطین اول باب ۱۳، آیت ۲، یرمیاہ باب ۳۲ آیت ۳۵، ہوسیع باب ۱۰، آیت ۱۸ +

Marfat.com

اور حتّی فلسطین کے قدیم باشندوں یعنی کنعانیوں ہی سے لیے تھے، جو زیادہ مہذب تھے[۱] بعض پہلو مثلاً قربانیاں سامیوں کی عام چیزیں ہیں[۲]۔

## حیات بعد الموت

معاصر سامیوں کی طرح فونیقیوں نے بھی حیات بعد الموت سے کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہ کی اور یقیناً وہ اس بارے میں واضح تصورات قائم نہ کر سکے۔ ان کا تصور جزا و سزا جسمانی یا مادی منافع کے حصول و عدم حصول تک محدود تھا۔ یعنی یہ کہ انھیں اس زمین پر صحت، دولت، خوش حالی، اولاد اور ایسی ہی دوسری چیزیں ملتی ہیں یا نہیں ملتیں۔ پھر جزا و سزا ان کے نزدیک کسی خاص مجلسی روش پر موقوف نہ تھی، بلکہ چند مراسم پر کاربند ہونے یا نہ ہونے پر موقوف تھی۔ مُردے کو دفن کرتے تھے تو ساتھ ایک چراغ، ایک کوزہ، ایک قاب اور خورد و نوش کے دوسرے برتن رکھ دیتے تھے۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ ان کے دماغوں میں ایک مبہم سا خیال موجود تھا، مُردے موت کے بعد دنیا کی زندگی سے ملتی جلتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ان کے ہار اور دوسرے زیور، مَردوں کے ساتھ ہتھیار رکھ دیتے تھے۔ عیدا کی طرح ببیلوس میں بھی قبروں پر خاص توجہ مبذول رہتی تھی۔ مقبروں پر جو کتبات تھے ان میں قبروں کو "آرام گاہ" قرار دیا گیا ہے[۳]۔ شاہ احیرام کا جو بھاری تابوت برآمد ہوا، اس سے پتا چلتا ہے کہ جسموں کو محفوظ رکھنے کا خاص خیال تھا۔ اس تابوت پر ماتمی جلوس کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ جس میں عورتیں گریہ و زاری کرتی جا رہی ہیں۔ ملازموں نے تحائف اُٹھا رکھے ہیں نعشوں کو خوشبوئیں لگانے اور ممی کرنے کا دستور نہ تھا۔ البتہ جو بادشاہ مصریوں کے زیر اثر آ گئے تھے، ان کی نعشیں ضرور (مصریوں کی پیروی میں) ممی کی گئیں۔

## عبرانیوں پر کنعانی اثرات

واضح رہنا چاہیے کہ عبرانی یعنی یہودی بدویوں کی حیثیت میں کنعان کے اندر پہنچے۔ آبادکاری کے ابتدائی دور میں ان کے سامنے مقامی باشندوں کے سوا یہود و ماندکا کوئی نمونہ نہ تھا، جس کی پیروی کرتے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے انھوں نے زبان اور ابجد کنعانیوں سے لی۔ پھر انھوں نے ہمسایوں سے فنِ تحریر سیکھا۔ اس کے بعد خود اپنے ادبیات پیدا کرنے کے اہل ہوئے۔ یہودیوں نے جو ابتدائی سیکولر قوانین بنائے، وہ کنعانی الاصل تھے۔ کنعانیوں ہی سے یہودیوں نے زراعت سیکھی اور حضری زندگی کی دوسری ضروریات سے آگاہی حاصل کی۔ کھیتی باڑی اور باہم شادی بیاہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کنعانیوں نے اپنے وہ مذہبی طریقے یہودیوں تک پہنچا دیے

---

۱۔ Hitti صفحہ ۲۳۴۔ ۲۔ دیکھیے اینی دساؤ (Dussaud) کی فرانسیسی کتاب۔

۳۔ Cooke صفحات ۲۷، ۳۱، ۶۱، ۷۰۔

جو باروری اور فصلوں کی اچھائی کے لیے ان کے ہاں رائج تھے۔ اس طرح پرانی رتیں، رسمیں اور ادارے یہودیوں نے اختیار کر لیے۔ ان میں لکڑی کے کھمبے اور "اونچے مقامات" بھی شامل تھے بعل اور یہواہ کے درمیان سخت کش مکش شروع ہو گئی اور مدت تک جاری رہی۔ بے شک یہواہ کو خدائے عزّ و جلّ مان لیا گیا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان مقامی دیوتاؤں کو ترک کر دیا گیا، جنھیں زمین کی پیداوار کے ناظم و نگران سمجھا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہودیوں کے معبود سے بھی وہی صفات منسوب کر دی جاتی تھیں، جو بعل سے مخصوص تھیں، مثلاً آسمانوں کا خدا، بارش بھیجنے والا اور طوفانوں کو قبضے میں رکھنے والا۔ یہودی والدین پہلوٹھے کا نام یہواہ کے نام پر رکھتے تھے، لیکن چھوٹے بچوں کے نام کے ساتھ بعل کا نام شامل کر دیا جاتا تھا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ آگے چل کر انبیائے یہود خدا کی ذات و صفات اور اس کے ساتھ انسان کے تعلق کے متعلق فکر و نظر میں ان بلندیوں پر پہنچ گئے جہاں پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔ یقیناً وہی لوگ تھے، جنھوں نے انسانی فکر کی تاریخ میں سب سے پہلے خدا کی وحدت کا تصور کیا اور مجلسی راستبازی پر زور دیا اور عقیدے کے بجائے انسانی عمل کو مرکز الٰہیت بنایا۔

جو سامی گروہ "ہلال زرخیز" میں آباد تھے، ان کا عام عقیدہ یہی تھا کہ عبادت کا صحیح طریقہ جانوروں کی قربانی ہے یا زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں میں سے تحائف مقدس میں پہنچانا۔ حضرت سلیمانؑ کا ہیکل ہی فونیقیوں کا تجویز کردہ نہ تھا، بلکہ اس میں عبادت کے مراسم کا ایک حصہ بھی انھیں نے مقرر کیا تھا۔[1] اس میں عبادت کے جو گیت گائے جاتے تھے یا ان کے ضمن میں جو لَے اختیار کی جاتی تھی، ان کا نمونہ بھی کنعانی تھا۔ تورات میں بعض رسموں کی ممانعت کر دی گئی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے ہمسایوں سے کچھ رسمیں لے لی تھیں، جنھیں رہنماؤں نے یہودی مذہب کے رجحانات کے منافی قرار دیا۔ حلوان کو اس کی ماں کے دودھ میں پکانے کی حرمت کے متعلق پہلے بالکل غلط تاویل کی جاتی تھی۔ اغاریت کے ادبیات بروئے کار آئے تو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ وہاں رائج تھا۔

---

[1] جہاں تک فونیقیوں یا کنعانیوں کے اثرات کا تعلق ہے، ان بیانات کے باب میں اختلاف کی ضرورت نہیں، لیکن مصنف کے بیان سے خود حضرت سلیمانؑ علیہ السلام یا ان کے ہیکل کے بارے میں کوئی غیر مناسب خیال نہ پیدا ہونا چاہیے۔ ہیکل کی عمارت خواہ کسی نے بنائی ہو یا اس کا نقشہ کچھ ہو، عبادات کے طور طریقوں میں سے صرف وہی بدلے جاتے ہیں، جو نفس عبادت کے منافی ہوں اور اگر کنعانی یا فونیقی بعل کے لیے خاص طریقے پر عبادت کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کے طریقوں میں سے کوئی طریقہ جو غیر مناسب نہ تھا، خدا کی عبادت کے لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گیتوں کی حیثیت بھی یہی تھی۔ کنعانیوں کی گمراہی کہ وہ اپنے بنائے ہوئے یا تجویز کیے ہوئے بت کے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے جو صرف خدائے بزرگ و برتر کے لیے زیبا تھا۔ اس گمراہی کا دور ہو جانا لازم تھا۔ (مترجم)

Marfat.com

مذہبی اور لسانی انحصار کا لازمہ کنعانیوں کا ادبی اثر بھی تھا۔ مذہبی ریتوں اور رسموں کے ساتھ گیت اور نظمیں مستعار لی گئیں، ان کے ساتھ اسلوب بیان، تشبیہہ و تمثیل، خاص تراکیب بلکہ اقتباسات بھی آئے۔ غزال الغزلات، زبور اور امثال میں ان کے آثار بہ طور خاص موجود ہیں[1]۔ ادبیات اغاریت میں "بادلوں کا سوار" بعل کی ایک صفت ہے۔ یہودیوں نے یہی صفت یہواہ کے لیے اختیار کر لی (زبور ۶۸ - آیت ۴)[2] اغاریت کی ایک تحریر میں بجلی کی کڑک کو بعل کی صدا قرار دیا گیا ہے۔ اس زبور، نیز زبور ۱۸، ۸۸، ۸۹ (نیز سموئیل دوم باب ۲۲) میں کنعانیت کی خاصی شہادتیں موجود ہیں۔ آخری دو زبوروں کے عنوان میں کنعانی لوگوں کے نام درج ہیں۔ صحیفہ ایوب (۳۷: ۲-۵) اور زبور (۲۹: ۳-۵) میں بجلی کی کڑک کو خدا کی آواز کہا گیا ہے۔ زبور ۲۹ پورے کا پورا کنعانی الاصل ہے یعنی بعل کے لیے جو گیت تھا، اس میں ترمیم کر لی گئی[3]۔ "دریائی اژدہا" کو دونوں ادبیات میں "پیچیدہ سانپ" بنایا گیا ہے (یسعیاہ باب ۲۷ - آیت ۱)[4]۔ اس اژدہا کے سات سر تھے اور یہ صدیوں بعد ہرقل کے ہائیڈرا میں دوبارہ ظہور پذیر ہوا۔

علاوہ بریں فونیقی ادبیات کے ذریعے سے مصر کے ادبی نمونے اور نصیحت آمیز تحریرات منتقل ہوئیں۔ امثال میں بہت سی چیزیں مصری الاصل معلوم ہوتی ہیں، مثلاً باب ۱۵، آیات ۱۶-۱۷، باب ۲۷، آیت ۱۔ واعظ، باب ۴، آیت ۶ - باب ۲۲، آیات ۱۷-۲۳ - باب ۱۷ کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے[5]۔ خود مصری ادب میں تیرھویں صدی ق م میں پانسو سال تک اجنبی الفاظ کی بھرمار رہی، خصوصاً فونیقی الفاظ کی[6]۔

جب یونانی مقابلے پر آگئے تو فونیقیوں کی تجارتی سرگرمیوں میں کمی واقع ہوتی گئی۔ نیز اشوریوں کے حملوں نے فونیقی شہروں کی آزادی چھین لی۔ اس کے بعد بحیرہ روم کے حلقے میں فونیقیوں کے ثقافتی اثرات سمٹنے لگے۔

---

[1] البرائٹ کی کتاب (... Religion) صفحات ۱۵-۱۲۸ - ۱۲۹۔ [2] یہاں پر بتا دینا چاہیے کہ زبور کی محولہ بالا آیت میں "صحرا کا سوار" کہا گیا ہے، نہ کہ "بادلوں کا سوار"۔ اگر "بادلوں کا سوار" بھی کہا جاتا تو مضائقہ نہ تھا۔ یہ صفت خدائے تعالیٰ کی ہے، نہ کہ بعل کی بد۔ [3] سائرس ایچ گارڈن کی کتاب The Loves and Wars of Baal

[4] ملاحظہ فرمایئے ای، اے، والس بج کی کتاب The Teaching of Amen-em-apt ص ۱۰۳، نیز ڈبلیو، او، ای اوسٹر برے (Oestersbry) کی کتاب The Wisdom of Egypt and the Old Testament صفحات ۴۶، ۹۱۔ [5] Adolph E. Reman کی جرمن کتاب ص ۵۔

# نواں باب

## آشوریہ اور بابل کا دائرۂ اثر

### سومیریوں اور اکادیوں سے تعلق

تیسرے ہزار قبل مسیح میں مغربی ایشیا کے اندر جس گروہ کا تہذیبی اثر سب پر فائق رہا، وہ سومیری تھے، جو غیر سامی تھے۔ انھیں سے دریائے فرات کی تہذیب کا آغاز ہوا تھا۔ اس گروہ کا ایجاد کردہ میخانی رسم الخط، ترتیب دیے ہوئے خاص مذہبی و روحانی تصوّرات اور پیدا کردہ ادب کا ایک حصّہ، یہ سب چیزیں بابلی اور آشوری جانشینوں کے ذریعے سے شامیوں کی میراث میں شامل ہو گئیں۔ ان شامیوں میں فونیقی اور فلسطینی بھی شامل تھے۔ اکّادیوں (بابلیوں) کی زبان اور میخانی رسم الخط پورے مغربی ایشیا میں تجارت اور سیاسی روابط کا بین الاقوامی واسطہ بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ فونیقیوں کے جن بادشاہوں نے تلّ العمارنہ کے دور میں فراعنۂ مصر سے خط و کتابت کی، وہ اسی زبان اور رسم الخط سے کام لیتے رہے۔ تموز فونیقیوں کا نہایت دلکش اور محبوب دیوتا تھا۔ اس کا نام سمیری تھا۔ دوآبہ دجلہ و فرات میں دیوتاؤں کے متعلق جو افسانے رائج تھے، وہ بھی یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں کے ادبیات میں داخل ہو گئے۔ انھیں میں تکوین عالم اور طوفان کے افسانے بھی تھے۔ سمیریوں اور اکّادیوں سے مستعار الفاظ اب تک عربی زبان میں موجود ہیں[1]۔ قومی اور لسانی اعتبار سے لبنانیوں کو مصریوں کے مقابلے میں اہلِ دوآبۂ دجلہ و فرات سے قرب حاصل تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے وہ یقیناً دور تھے۔

---

[1] عربی لفظ ہیکل سمیری زبان سے کنعانیوں نے لیا۔ کرسی، نجّار، صندوق براہ راست سومیری یا اکّادی الفاظ ہیں۔ لوح بھی اکّادی ہے۔ (مترجم — لیکن اب تو محققین کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ سومیری، اکّادی، عبرانی و کلدانی بلکہ مصری زبان تک کا ماخذ عربی ہے اور عربی کی قدامت کے شواہد بہت پیچھے جا چکے ہیں)۔

Marfat.com

**بابلیوں سے ابتدائی روابط** سرجون اوّل اکادی[1] (تقریباً دو ہزار دو سو پچاس سال قبل مسیح) تاریخ میں پہلی عظیم القدر شامی شخصیت ہے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ "مجھے بالائی سمندر سے زیریں سمندر تک" اقتدار حاصل ہے اور میری سلطنت میں "دیودار کے جنگل اور نقرئی پہاڑ" شامل ہیں[2]، لیکن یہ اشارہ کوہستان لبنان کے بجائے غالباً جبل لکام کی طرف ہے۔ اس کے ایک جانشین نرم سن (تقریباً دو ہزار ایک سو ستر سال قبل مسیح) کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ دیودار کے جنگل تک پوری سرزمین میرے زیر فرمان ہے[3]۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی جانب سے سیاسی دباؤ اس وقت تک بروے کار نہ آیا، جب تک اولاً مصریوں اور حتیوں کی قومیں معرض زوال میں نہ آگئیں، ثانیاً آشوری سلطنت نے اقتدار کی کروٹ نہ لی۔ آشوری سامراج ہی کے زمانے میں دوآبۂ دجلہ و فرات کے حکمرانوں نے مغربی جانب پیش قدمی کی پالیسی اختیار کی اور غرض یہ تھی کہ بحیرۂ روم کی طرف جانے والی تجارتی شاہراہوں کے منتہا پر قبضہ کر لیا جائے۔

**آشوری اقتدار** آشوریوں نے دریائے دجلہ کے بالائی حصّوں سے اقتدار اعلیٰ کی راہ میں پہلا قدم اُٹھایا، جو قبل از وقت تھا۔ یہ ۱۰۹۴ ق م کا واقعہ ہے جب تگلت پلاسر اوّل نے بحیرۂ روم کے ساحل کی طرف پیشقدمی کی اور ارادوس (ارواد) پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے سمیرا تک سمندر کا سفر کیا، جو اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ راستے میں ایک ڈالفن کا شکار کیا، جسے وہ "بحری گھوڑا" قرار دیتا ہے۔ اس نے دو اور مشہور شہروں — جبل اور عیدا — سے خراج وصول کیا اور اپنے دیوتاؤں کے معبد کے لیے دیودار کے درخت کٹوائے[4]۔

تگلت پلاسر کی سلطنت کے یہ مقبوضات، جو دریائے فرات کے پار تھے، بہت جلد چھن گئے اور اشور نصر پال ثانی (۸۸۳ ق م – ۸۵۹ ق م) کے عہد تک ان چھنے ہوئے مقبوضات کی بازیافت کے لیے کوئی کوشش نہ ہوئی۔ اشور نصر پال ثانی کے عہد حکومت سے آشوریہ کی تاریخ میں عسکری اور سیاسی لحاظ سے نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس نے بھی ۸۷۹ ق م میں شمالی شام کے خلاف اقدام کے سلسلے میں وہی راستہ اختیار کیا، جو اس کے پیشرو نے اختیار کیا تھا اور دوآبۂ دجلہ و فرات کے علاقے سے

---

[1] یہ لفظ Agades سے ہے، جو بابل کے شمال میں ایک مقام ہے کتاب پیدائش باب ۱۰، آیت ۱۰۔

[2] دیکھو آرنو پوئبل (Poebel) کی کتاب ہسٹاریکل ٹیکسٹس یعنی تاریخی متون صفحہ ۱۷۵، ۱۷۸۔

[3] اگنیس جلیب (Gelb) کی کتاب حوری اور سمیری صفحہ ۳۵ – ۳۷۔

[4] لکنبل (Luckenbill) کی کتاب آشوریہ اور بابل کے قدیم ریکارڈ جلد اول۔

عام راستے اسی طرف جاتے تھے۔ وہ لبنان میں داخل ہوا اور ساحل کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ کسی جگہ اسے خاص مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا۔ دوابۂ دجلہ و فرات سے شام کے خلاف یہ پہلا زبردست حملہ تھا اور اس کی حیثیت ویسی ہی تھی، جیسے چھ سو سال پیشتر تھوتمس ثالث فرمانروائے مصر کے حملے کی۔ شاہ آشوریہ نے دولت مند اور خوش حال فونیقی شہروں سے رسمی خراج وصول کیا۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ عام اطاعت پر قناعت کر لی گئی اور ان علاقوں کو حقیقتہً مسخر نہ کیا گیا۔ اس نے اپنے دُور اُفتادہ مرکزِ حکومت کے معبد میں ایک پتھر پر فخریہ یہ عبارت کندہ کرائی :

"میں نے کوہستانِ لبنان کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا اور ملک اموروکے بڑے سمندر پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنے ہتھیار بڑے سمندر کے پانی میں دھوئے اور تمام دیوتاؤں کے لیے بھیڑوں کی قربانیاں دیں۔ میں نے پورے ساحلی علاقے سے سونا، چاندی، ٹین، تانبا، تانبے کے مرکبات، سُوتی لباس، جو گوناگوں آرائش سے مزیّن تھے، بڑے اور چھوٹے بندر، آبنوس، خاص قسم کی لکڑی، بحری گھوڑے کے دانت بہ طورِ خراج وصول کیے۔ یہ خراج صور، صیدا، ببلوس، محللۃ (؟)، میزہ (؟) کیزہ (؟) امورو اور ارواد کے باشندوں سے لیا گیا۔ آخرالذکر مقام سمندر میں ایک جزیرہ ہے۔ میں نے خراج وصول کیا اور اُنھوں نے میری پابوسی کی۔"[1]

اشور، نصر پال اور اس کے بیٹے اشور شلمنسر ثالث (۸۵۸ق م۔ ۸۲۴ق م) کے عہد میں آشوریہ ایک زبردست سامراجی قوت بن گئی۔ اس کے عسکریت پسند باشندوں نے محاصرے کے لیے سروسامان مکمّل کر لیا۔ مثلاً فصیل پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں، قلعہ شکن مشینیں اور وہ محاصرے کے وقت دیواروں اور برجوں میں نقب لگا کر ان کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتے تھے۔ انھوں نے شمالی شام کو بہ آسانی مسخر کر لیا، تاہم کچھ مدت تک کے لیے لبنانی پہاڑ ان کے اقدام کی آخری حد بنے رہے۔

۸۵۵ق م میں شلمنسر ثالث کو دریائے عاصی کے کنارے بمقام قرقر ایک زبردست جنگ پیش آئی۔ شام کے بارہ بادشاہوں نے دمشق کے ارامی فرمانروا ابن ہدد کی سرکردگی میں ایک متحدہ جمعیت فراہم کر لی تھی۔ اسرائیلی بادشاہ اخی اب نیز صور اور دوسری فونیقی شہری ریاستوں کے نمائندے بھی اس جمعیت میں

---

[1] پرچیرڈ (Pritchard) صفحہ ۲۷۶۔

Marfat.com

شریک تھے۔ بہ حیثیت مجموعی قرقر میں شلمنسر کے مقابلے پر ساٹھ ہزار جنگجو جمع ہو گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ بے نتیجہ رہی۔ اشوری بادشاہوں نے کتبوں میں اعلان کیا کہ مجھے فتح حاصل ہوئی، لیکن یہ فتح فیصلہ کُن نہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسے پوری سرزمین کی مکمل تسخیر کے لیے بار بار حملے کرنے پڑے ۸۴۲ق م میں فونیقی شہروں نے شلمنسر کی اطاعت برائے نام منظور کر لی۔ بادشاہ کے الفاظ ذیل میں درج ہیں:

"اپنی حکومت کے اٹھارویں سال میں نے سولھویں مرتبہ دریائے فرات کو عبور کیا۔ حزائیل ارامی کو اپنی فوج پر بھروسا تھا۔ اس نے بھاری تعداد کے ساتھ کوہ سنیر کو اپنا مستحکم مرکز بنایا۔ یہ کوہستان لبنان کے سامنے ایک چوٹی ہے .... میں نے اس کے باغات (الغوطہ) کاٹ دیے۔ میں نے کوہ حوران تک مشیقتی کی بے شمار شہر تباہ کیے، لوٹے اور جلائے۔ مالِ غنیمت جس کا عدو شمار نہ تھا، میں اٹھا لایا۔ میں کوہ بعلی رعسی تک گیا، جو سمندر کے اندر بڑھی ہوئی راس[۵] ہے۔ میں نے وہاں اپنا مجسمہ نصب کیا۔ عور اور صیدا کے باشندوں کے علاوہ یاہو بن عمری سے خراج وصول کیا[۵۲]"

## اہلِ صور کی جانبازی

فونیقی، جس طرح پہلے مصری اور حتی حملوں کے مقابلے میں سرِ تسلیم خم کرتے رہے، اسی طرح وہ مشرقی جانب سے اُٹھے ہوئے طوفان کے مقابلے میں بھی جھک گئے۔ انھوں نے خراج ادا کر کے غیر مناسب مداخلت سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور انھیں امید یہ تھی کہ حلقۂ تجارت کی توسیع سے زرِ خراج کی کم از کم ایک حد تک تلافی کر لیں گے۔ اس اثنا میں اشور نصرپال اور شلمنسر کی قائم کردہ سلطنت، جو شام و لبنان کی ریاستیں ختم کر کے وجود پذیر ہوئی تھی، معرضِ زوال میں آ گئی اور اس میں اس وقت تک نئی روح پیدا نہ ہوئی، جب تک ایک سو سال گزر جانے کے بعد تگلت پلاسر سوم (۷۴۵ق م - ۷۲۷ق م) اور اس کے جانشین شلمنسر خامس (۷۲۷ق م - ۷۲۲ق م) کا دور نہ آ گیا۔ ان دو بادشاہوں کے ساتھ آشوری سلطنت میں نیا دور شروع ہوا۔ شام کو از سرِ نو مسخر کر لیا گیا۔ تگلت نے ارواد کے حکمران متان بعل، بلوس کے حکمران سطی بعل اور عور کے حکمران حیرام ثانی سے خراج وصول کیا۔ یہ حیرام صیدا کا بھی بادشاہ تھا اور قبرص کی

---

۵۱ یہ اشارہ غالباً کارمل کی طرف ہے یعنی جبل ماراِلیاس۔ شلمنسر نے بھی ایک کتبہ نہر کلب کے دہانے پر کندہ کرایا تھا۔

۵۲ کنیل جلد اول۔ ۵۳ اسے تورات میں اشور پول لکھا گیا ہے۔ دیکھیے سلاطین دوم باب ۱۵، آیت ۱۹، نیز باب ۱۶، آیت ۱۹۔

فونیقی نوآبادیاں بھی اسی کے ماتحت تھیں۔ شامیوں کی جو سرگزشت جوزیفس[۵۱] نے پیش کی ہے، اس کے مطابق تگلت کے بیٹے شلمنسر نے فونیقیہ اور اس کے تمام شہر پامال کر ڈالے، جن میں صور بھی شامل تھا کیونکہ اس نے پھر بغاوت کی تھی۔ مصر مدت تک غفلت کی نیند سویا رہا تھا، اب یکایک اس کی آنکھ کھلی اور وہ بھی اشوری پیش قدمی کی روک تھام کے لیے حرکت میں آ گیا۔ داخلی مشکلات نے حملہ آور کے کام میں سہولت پیدا کر دی۔ صیدا، صور (ساحلی شہر) اور عکّہ نے مالی اقتدار اور جزائری صور کی قیادت سے آزادی کے اشتیاق میں آشوریہ کی سیادت تسلیم کر لی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ساٹھ جہازوں کا بیڑا فاتح کے لیے تیار کر دیا، جس میں آٹھ سو ملاح کام کرتے تھے۔ جزائری صور سے مقابلہ پیش آیا تو یہ بیڑا تتر بتر ہو گیا، تاہم فاتح کے پاس اتنی فوج تھی کہ ساحلی علاقے کی ناکا بندی کر لی گئی۔ پانچ سال تک مقابلہ جاری رہا۔ جزائری شہر کی فصیل کے اندر کنوئیں موجود تھے، جن سے ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہا۔ پنج سالہ محاصرہ شلمنسر کی وفات پر ختم ہوا (۷۲۲ق۔م) اور عزت مندانہ معاہدہ ہو گیا۔

صور کے محافظ بادشاہ کا نام ایلو ایلی (میرا خدا ہی خدا ہے)۔ اشوریوں نے اس کا نام لولی لکھا ہے (۷۲۵ق۔م تا ۶۹۰ق۔م) تھا۔ وہ اب ساحلی علاقے کی مقتدر شخصیت بن گیا۔ اس نے فونیقیہ کے متصل حصوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور قبرص کی حکومت بھی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جس پر آشوری بادشاہ سرجون ثانی (۷۲۲ق۔م تا ۷۰۵ق۔م) فونیقی بیڑے کی امداد سے قابض ہو گیا تھا۔ فونیقیہ کا باقی حصہ سرجون ہی کے قبضے میں رہا اور اس میں کوئی بدامنی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے جانشین سنہیریب (۷۰۵ق۔م تا ۶۸۰ق۔م) کو عہدِ حکومت کے ابتدائی حصے ہی میں ایک اور بغاوت سے سابقہ پڑ گیا اور بغاوتیں بار بار پیش آتی رہتی تھیں۔ یہ بغاوت بظاہر صور کے جوانمرد بادشاہ نے شروع کرائی ہو گی اور مصر نے اسے تقویت پہنچائی۔ اس بغاوت کا تعلق عسقلان اور عقرون سے تھا۔ آشوری فوج نے برق رفتار مہم میں مصریوں کو عقرون کے سامنے شکست دی (۷۰۱ق۔م) اور یہودیہ کو تباہ کر ڈالا ــــ اگرچہ اس کا بادشاہ حزقیاہ باغی جمعیت کا رکن نہ تھا ــــ ایلوایلی کا تعاقب کر کے اسے قبرص بھگا دیا۔ اس کی جگہ صیدا کے حکمران اتبول[۵۲] کو بادشاہ بنا لیا، جو آشوریوں کا حامی تھا۔ ایلوایلی نے موسم گرما کے لیے ایک محل کوہستانِ لبنان میں بنا رکھا تھا۔ حملہ آور نے اسے جلا ڈالا اور اس کے تاکستان برباد کر دیے۔ آشوری سپاہی برچھوں اور عصاؤں کے سہارے بلند پہاڑوں پر

---

۵۱ Antiquities کتاب ۹ ۔ ۹ باب ۱۴ ۔

۵۲ کیمبل جلد دوم ۔

Marfat.com

چڑھ گئے۔ انھوں نے دیوداروں کے نیچے آرام کیا۔ یہاں ایک قلعہ تھا، جس کے محافظوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر سنحیرب کے پاس لے گئے۔ غالباً سنحیرب ہی تھا، جس نے کلب کے دہانے پر آشوری کتبہ کندہ کرایا تھا۔ اس نے خلیج فارس میں مہموں کے لیے فونیقی جہازوں اور ملاحوں سے کام لیا۔

## صور و عیدا کی سرافگندگی

۷۰۱ق۔م میں عیدا نے بھی سنحیرب کی اطاعت قبول کر لی۔ ۶۷۵ق۔م میں اس شہر نے سنحیرب کے بیٹے اسرحدون کے خلاف بغاوت کی تو اسے تباہ کر ڈالا گیا۔ اس کی سربفلک عمارتیں زمین بوس کر دی گئیں اور فصیلیں توڑ کر سمندر میں ڈال دی گئیں۔ اس کا بادشاہ عبد ملکرت بھاگ کر سمندر میں چلا گیا، لیکن وہیں گرفتار ہوا اور اس کا سر قلم کر ڈالا گیا۔ عیدا کے قریب ایک نیا قلعہ تعمیر ہوا، جس کا نام کر اسرحدون تھا۔ یہاں آشوری گورنر رہتا تھا۔ اس کی پوری آبادی غیر ملکی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آس پاس کے علاقے کو خوف و دہشت سے مرعوب رکھا جائے۔[1] تباہی ایسی تھی کہ اس سے بڑھ کر تصور میں نہیں آسکتی۔ عیدا کے جو باشندے قتل اور جلاوطنی سے بچ گئے وہ آس پاس کے شہروں میں پناہ گزین ہوئے۔ ارواد کے بادشاہ ماتین بعل نے شہر اسرحدون کے حوالے کیا۔ ساتھ ہی بیٹی نذر کر دی۔ دوسرے فونیقی شہر بھی صور کے بادشاہ بعل کی قیادت میں اسرحدون کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ ایک تجارتی و اطاعتی معاہدہ ہو گیا، جسے شاہ صور نے اس وقت توڑا، جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اجنبی اقتدار کا جُوا اُتار پھینکنے کا مناسب وقت آگیا ہے، چنانچہ ۶۷۲ق۔م میں صور کے بہادروں نے پھر بغاوت کر دی۔ اب کے انھوں نے مصر کے حبشی بادشاہ ترہاقہ سے دوستی گانٹھ لی۔ آشوری فتح کی یاد وہ کتبہ تازہ کر رہا ہے، جو سنجرلی (شمالی شام) میں ہے۔ اس مقام کو زمانہ قدیم میں شمول کہتے تھے۔ یہاں دکھایا گیا ہے کہ اسرحدون بعل شاہ صور اور ترہاقہ شاہ مصر کے سر پر تازیانہ لیے کھڑا ہے۔[2] حقیقت یہ ہے کہ شاہ مصر گرفتار نہیں ہوا تھا اور غالباً صور کو بھی اس موقع پر کوئی گزند نہ پہنچا۔ کیونکہ ۶۶۴ق۔م میں اسرحدون کے جانشین اشوربنی پال کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس نے اسی طرح حملہ کیا جس طرح بھیڑیا ریوڑ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ بہرحال شہر پر حملہ ہوا اور اسے آخری ضرب لگا دی گئی۔ اس طرح بحیرۂ روم کی یہ ملکہ (صور) آشوری اقتدار کے ردّ و قبول کی منزلیں طے کرتی ہوئی سرافگندگی

---

[1] پرچرڈ، صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱ ۔ [2] اومسٹیڈ (Olmstead) کی کتاب تاریخ آشوریہ صفحہ ۳۸۴
ہال (Hall) کی کتاب تاریخ قدیم صفحہ ۵۰۹ ۔

Marfat.com

پر مجبور ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ صور کے مختصر تقدیر پر اُسی وقت آخری مُہر لگ چکی تھی، جب ارامی قوت کے مرکز دمشق کا تختہ اُلٹا تھا اور دس سال پیشتر اسرائیل کے دارالحکومت سامریہ پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ یہودی سلطنت دو حصّوں میں بٹ گئی تھی، ایک اسرائیل، دوسرا یہودیہ۔ یہ حصّے بعض اوقات حلیف بھی بن جاتے تھے، لیکن اکثر ایک دوسرے کے دشمن رہتے تھے۔ اس افتراق نے ان کی آخری تباہی کا راستہ ہموار کر دیا۔ پہلے آشوریوں کے ہاتھوں، بعد ازاں بابل کی نئی حکومت کے ہاتھوں۔ شام و فلسطین کی تسخیر کے بعد لبنان کی آزادی بحال ہونے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ آشوریوں کو مدّت سے آرزو تھی کہ مشرق و مغرب کی تجارت پر قبضہ کر لیں۔ یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب آشوری اپنے قدیم حریف مصر کے خلاف اقدام کے لیے تیار ہو گئے تاکہ مغربی ایشیا میں اقتدار کا قطعی فیصلہ ہو جائے۔ اسرحدّون نے مصر زیریں کو مسخّر اور فتح کی یادگار میں حمص کے کتبے کے پاس دریائے کلب کے دہانے پر ایک کتبہ کندہ کرایا، جس میں دکھایا گیا کہ وہ بڑی شان و شوکت سے کھڑا ہے اور ممفس و صور کی تسخیر کا اعلان کر رہا ہے[1]۔ آشور بنی پال (۶۶۸ ق م تا ۶۲۶ ق م) نے مصر بالا کو پامال کر ڈالا۔ اس طرح آشوری سلطنت کی توسیع آخری حد پر پہنچ گئی۔ نینوا کو جسے ناحوم نبی نے "خونریز شہر" قرار دیا تھا (باب ۳، آیت ۱) اب اس وسیع سلطنت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی، جو پورے مغربی ایشیا نیز افریقہ کے ایک حصّے پر مشتمل تھی۔

## آشوریوں کی جگہ کلدانی

مغربی ایشیا پر آشوریوں کا اقتدار ۶۱۲ ق م میں نینوا کی تباہی پر ختم ہو گیا۔ دوابۂ دجلہ و فرات میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی، جسے نو بابلی یا کلدانی قوت کہتے ہیں۔ نیو پلاسر (۶۲۵ ق م تا ۶۰۵ ق م) اس کا بانی تھا۔ نو بابلی آشوریوں کی میراث کے حامل تھے۔ اس بنا پر انھوں نے شام اور ساحلی علاقے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ اس اثنا میں مصر آشوری اقتدار سے آزادی حاصل کر چکا تھا اور از سر نو بحیرۂ متوسّط کے علاقے کے لیے دوآبۂ دجلہ و فرات کے مقابلے کی غرض سے تیار ہو گیا تھا۔ لبنان کے شہر زیادہ تر جنوبی ہمسایے کے دائرے کی طرف کھنچے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

پہلی ضرب کا انتظام مصر نے کیا۔ اس کے عساکر فرعون نکوہ کی سرکردگی میں فاتحانہ کرکمیوں (جرابلس) پہنچے، جو دریائے فرات کے کنارے پر تھا۔ وہاں ۶۰۵ ق م میں نیو پلاسر کے بیٹے

---

[1] دریائے الکلب کے چھ آشوری کتبوں میں سے یہی ایک کتبہ پڑھا جا سکتا ہے۔ کذیل جلد دوم، نیز جرمن اور فرانسیسی کتابیں۔

دریائے کلب کا دہانہ

Marfat.com

بنوکدنضر (بخت نصر) نے انھیں شکست فاش دی۔[1] بخت نصر نے جنوب کی جانب اقدام جاری رکھا اور ۵۹۷ ق۔م میں وہ یروشلم پر قابض ہوگیا۔ جو رسم پہلے سے چلی آتی تھی، اس کے مطابق فونیقی شہروں نے بادلِ نخواستہ بابل کی سیادت قبول کرلی، گویا ان کی داخلی آزادی بحال رہی۔ خراج ادا کرچکنے کے بعد وہ نیم خود مختار عنصر رہتے۔ ان کی حیثیت گندم کے کھیتوں کی تھی۔ تیز ہوا کے سامنے جھکتے رہے، لیکن کبھی نہ ٹوٹے۔ رفتہ رفتہ نئے حکمرانوں کے خلاف سرکشی اختیار کرنے لگے۔ انھیں مصر سے امداد کی پوری اُمید تھی۔ اسی بنا پر صور، صیدا، ادوم، موآب، عمون اور یہودیہ نے ایک متحدہ جمعیت نو بابلیوں کے خلاف بنالی۔ یرمیاہ نبی نے جو نصیحت فرمائی تھی، اس پر کان نہ دھرا گیا۔ بخت نصر پہلا مستعد تھا۔ وہ اس نئے خطرے کے مقابلے کے لئے خود ایک زبردست فوج لے کر آگیا اور ربلہ میں مرکز قائم کرلیا جو حمص کے جنوب میں دریائے عاصی کے قریب ہے۔ وہاں سے ایک فوج فونیقی شہروں کی تسخیر اور یہوداہ پر قطعی قبض و تصرف کے لیے روانہ کردی۔ نکوہ کے جانشین حفرا[2] کے ماتحت مصری فوج نے بابلیوں کے خلاف ایک سرسری مظاہرہ کیا، لیکن وہ جلد مقابلہ چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ گئی۔ گویا مصر پھر ایک مرتبہ "مسلا ہوا سرکنڈا"[3] ثابت ہوا۔ یروشلم پوری جمعیت کا عسکر تھا۔ ۵۸۶ ق۔م میں وہ فتح ہوا۔ ساتھ ہی یہوداہ کی سلطنت کا دور ختم ہوگیا۔ پھر صور کی باری آئی، جو فونیقی شہروں کی جمعیت کا سالار تھا۔ وہاں کے بادشاہ اتبعل ثانی نے مقابلے کے لیے تمام ممکن تیاریاں اعلیٰ پیمانے پر کیں۔ حزقی ایل نبی نے جو پیش گوئیاں کی تھیں، وہ جزواً ہی پوری ہوئیں اور ساحلی شہر صور کے تعلق میں:

> "وہ تیری بیٹیوں کو میدان میں تلوار سے قتل کرے گا اور تیرے اردگرد مورچہ بندی کرے گا اور تیرے مقابل دمدمہ باندھے گا اور تیری مخالفت میں ڈھال اُٹھائے گا (۸) وہ اپنی منجنیق کو تیری شہر پناہ پر چلائے گا اور اپنے تبروں سے تیرے بُرجوں کو ڈھادے گا (۹)۔
>
> "وہ اپنے گھوڑے کے سُموں سے تیری سب سڑکوں کو روند ڈالے گا اور تیرے لوگوں کو تلوار سے قتل کرے گا اور تیری توانائی کے ستون زمین پر

---

[1] یرمیاہ باب ۴۶، آیت ۲، نیز جوزیفس ایپین (Apion) کتاب اول، باب ۱۹ ۔ [2] ہیروڈوٹس نے اسے (Apries) لکھا ہے، کتاب دوم باب ۱۶۱ بحوالہ ڈکشنری مقدس کتاب اول باب ۶۸ ۔ [3] یرمیاہ باب ۳۷، آیت ۷ ۔ [4] یسعیاہ باب ۳۶، آیت ۶، سلاطین دوم باب ۱۸، آیت ۲۱ ۔

گر جائیں گے (ملاکی)۔[51]

شہر کا جو حصہ جزیرے میں واقع تھا، وہ محفوظ رہا۔ اہلِ صور انجام کار اس میں جا بیٹھے خشکی پر جو فوجی ذرائع استعمال کیے جا سکتے، وہ جزیرے والے شہر کے سلسلے میں موثر نہ رہے اور اہلِ صور تیرہ سال تک محصور رہ کر مقابلہ کرتے رہے۔ (۵۸۵ق م سے ۵۷۲ق م) ــــ یہ ایک ایسا واقعہ تھا، جس کی نظیر سرگزشت ہائے محاربات کے اوراق پر تلاش کرنا مشکل ہے۔[52] پھر بھی شہر پر حملے کی کوئی صورت نہ نکل سکی اور برائے نام اطاعت پر قناعت کر لی گئی۔ امراء میں سے ایک خاص تعداد کو یرغمال کے طور پر لے لیا گیا اور محاصرہ اُٹھ گیا۔ فوجی کارناموں کو زندہ رکھنے کے لیے دریائے کاب کے دہانے پر ایک کتبہ دو تختیوں پر کندہ کرایا گیا۔ یہ کتبہ ویسا ہی ہے جیسا بخت نصر نے ایلہ کے نزدیک وادی بریسا میں چٹان پر کندہ کرایا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کتبے میں حملہ آور کو دیوار کے پاس کھڑا دکھایا گیا ہے۔ دوسرے میں وہ چھلانگ لگا کر حملہ کرنے والے شیر کو روک رہا ہے۔[53] کتبہ کی عبارت یہ ہے:

"اپنے دیوتاؤں، نیر اور مردوک پر بھروسا کرتے ہوئے میں نے مہم لبنان کے لیے اپنی فوج تیار کی۔ میں نے اس ملک کے دشمنوں کا ہر جگہ سے استیصال کر دیا۔ اس طرح اہلِ ملک کے لیے مسرت کا سامان فراہم کر دیا.... میں نے بلند پہاڑوں کو چیرا، میں نے چٹانیں کاٹ دیں اور راستے پیدا کر لیے اس طرح دیودار لانے کے لیے سیدھی سڑک تیار کر دی..... میں نے اہلِ لبنان کو اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیا اور کسی کے لیے ان کے معاملات میں خلل پیدا کرنے کا موقع نہ چھوڑا۔ اس غرض سے کہ کوئی انھیں گزند نہ پہنچا سکے، میں نے ایک پتھر پر کتبہ کندہ کرا دیا، جس میں اپنے آپ کو اس خطے کا دوامی بادشاہ قرار دیا۔"[54]

بابل کی "دوامی حکمرانی" صرف اٹھاون سال قائم رہی۔ جن امراء کو یرغمال میں لے لیا گیا تھا ان میں سے ایک غالباً اتبعل کا بیٹا تھا، وہ بعل ثانی کے لقب سے صور کے تخت پر بیٹھا۔ یرغمال میں پکڑے

---

[51] یہ اقتباسات صحیفۂ حزقی ایل کے باب ۲۶ سے ۲۸ سے ہیں۔ [52] ہیرڈوٹس کتاب دوم باب ۱۶۱، نیز جوزیفس کتاب مذا باب ۱۱۔ [53] دیکھیے دساؤ صفحہ ۹۵۔

[54] پرچرڈ صفحہ ۳۰۷۔

Marfat.com

جانے والوں میں دو اور بادشاہ بنے۔ آخری بادشاہ ہیرام ثانی تھا۔ جس کے عہدِ حکومت کے چودھویں سال ایرانی شاہنشاہی کے بانی سائرس نے بابل کو فتح کر لیا (۵۳۹ ق م یا ۵۳۸ ق م) اور وہاں کے بادشاہ نبونی دس گرفتار ہو گیا[1]۔ اس طرح فونیقیہ اور اس کے ہمسایے کسی اہم واقعے اور تکلیف کے بغیر ایرانیوں کے ماتحت چلے گئے۔ نبونی دس کے عہدِ حکومت کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت لبنان کی معدنیات آہنی سے لوہا نکالا جاتا تھا[2]۔ دیودار کے جنگلوں سے درخت کاٹے جاتے تھے۔ مصر و فلسطین کی طرح دوآبہ دجلہ و فرات میں بھی یہی اعلیٰ درجے کے ساز و سامان اور گھروں کی چیزیں اسی لکڑی سے بنائی جاتی تھیں۔

## ثقافتی و تہذیبی اثرات

صور کی حوالگی کے ساتھ ہی فونیقیہ کی قومی زندگی کا گلا بے طرح گھونٹ دیا گیا۔ صرف سانس کی آمد و رفت باقی رہ گئی۔ بین الاقوامی تجارت میں کلیدی حیثیت اہل فونیقیہ کو حاصل نہ رہی۔ بحری تجارت میں یہ حیثیت یونانیوں اور قرطاجنیوں نے حاصل کر لی اور بری تجارت ارامی تاجروں کے حوالے ہو گئی۔ آٹھویں صدی قبل مسیح سے یونانیوں نے اٹلی، بحیرہ ایجہ، ایشیائے کوچک بلکہ مصر کے ڈیلٹا میں بھی نو آبادیاں قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے فونیقی دنیا، جو سرگرمیِ عمل، علم و فضل اور جوش و ولولہ کا مرکز تھا، حقیقتہً انجام کو پہنچ گئی۔ فونیقی زندگی کے اصل سرچشمے کیا تھے؟ طالع آزمائی اور خطرات سے بے پروائی کا عشق، نفع اور تجارت کے وسائل کی جستجو۔ پھر نئی سرزمینوں کی تگ و دو۔ اب یہ سرچشمے گدلے ہو چکے تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فونیقیوں نے اپنی انفرادیت ایرانی کے عہدِ اقتدار میں بھی قائم رکھی اور سکندر کی فتوحات تک اسے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ دنیا کی سٹیج سے رخصت ہونے سے پیشتر انھوں نے کئی پہلوؤں والی آشوری و بابلی تہذیب سے بے شمار عناصر حاصل کیے۔ پھر انھیں آگے منتقل کر دیا۔ یہ عناصر مادی تھے، مذہبی بھی اور لسانی بھی۔ فونیقیوں اور یونانیوں کی وساطت سے یورپ نے بہت سی نباتی و معدنی جنسیں حاصل کیں، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے۔ مثلاً یہ الفاظ: کیروب (خروبہ)، کیسیا (تیج پات)، چکوری (کاسنی)، کروکس (کرکم)، کیمن (زیرہ)، ہسپ (ایک خوشبودار پودا)، جیسپر (یشب)، مینڈریک (ایک نفے آور دوا اور خواب آور پودا)،

---

[1] جوزیفس Apeion کتاب اول باب ۲۱ نیز فلینگ کی تاریخ صور ۴۵-۴۷۔ نبونی دس کے بیٹے بیلشضر نے دیوار پر نوشتہ دیکھا تھا۔ (دیکھیے صحیفۂ دانیال باب ۵، آیت ۵ سے آگے)

[2] ریمنڈ پی۔ دوعرتی (Dougherty) کی کتاب Records from Erech

ناردُ (بال چھڑ)، سیفرون (زعفران)، سیسم (تل)، جیسم، نفتا (نفت)۔ ذفت کی پیمائش میں اب تک مشرق و مغرب کے باشندے اسی دوازدہ گانہ اور شش گانہ نظام پر کاربند ہیں، جو دوآبہ دجلہ و فرات میں ایجاد ہوا تھا۔ سال کو بارہ مہینے میں تقسیم کرنا اور ہفتے کے سات دن مقرر کر لینا بھی انھیں کا کام تھا۔ منطقۃ البروج کے بارہ نشان بھی قریباً وہی ہیں جو آشوریوں کے تھے۔ ناپ تول کے بیشتر مروّجہ نظام بھی وہی ہیں اور انھیں واسطوں سے ہم تک پہنچے ۔

Marfat.com

## دسواں باب

# ایرانی اقتدار

**سامی سیادت کا خاتمہ**

ایرانی نسلاً ہندی یورپی تھے۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر ان کے پہنچنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سامی سیادت ختم ہوگئی۔ یہ سیادت دوبارہ اُس وقت تک بروئے کار نہ آسکی، جب تک مسلمان عربوں کو عروج حاصل نہ ہوا۔ اس پر ایک ہزار سال سے زیادہ مدت گزرنے والی تھی۔ ایرانی سلطنت کی بنیاد سائرس[1] (۵۵۰ ق م - ۵۳۰ ق م) نے رکھی تھی۔ اس کے بیٹے کیمبی سس[2] اور (برادر زادے) دارا[3] نے سلطنت کو اتنا وسیع کردیا کہ یہ ہندوکش اور دریائے سندھ کے پار سے بحیرۂ ایجئین اور قفقاز سے بحر ہند تک پھیل گئی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ وسیع علاقہ ایک مرکزی سیاسی نظام کے تابع آیا اور یہ نہایت محکم نظام تھا۔ سلطنت کے دور افتادہ حصے سڑکوں کے نئے نظام نے ملا دیے اور شاہی قاصدوں کے لیے جابجا قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ تمام مقامات میں ایک سکہ رائج ہوگیا۔ ارامی زبان اتنی پھیل گئی کہ پوری سلطنت کی عام زبان بن گئی۔ اس عہد کی دو بڑی تہذیبوں ـــ سامی اور ہندی و ایرانی ـــ کو امتزاج نہیں تو ایک دوسری پر اثر و فشار کا موقع ضرور مل گیا۔

**شام کا ایرانی مرکز**

دارائے اول (۵۲۱ ق م - ۴۸۵ ق م) نے اپنی سلطنت بیس صوبوں میں تقسیم کی۔ ان میں سے پانچویں صوبے میں لبنان کے علاوہ

---

ف۱ Cyrus، یہ اس نام کی یونانی وضع ہے۔ یہودیوں نے اسے خورس قرار دیا۔ عربوں نے خسرو۔ کیانی یا ہخامنشی خاندان کا یہی شہنشاہ ہے، جسے شاہنامہ میں کیخسرو کہا گیا۔ اس کا اصل نام غالباً کورو یا گورودش تھا۔ اس کی تخت نشینی ۵۵۰ ق م میں نہیں بلکہ ۵۵۹ ق م میں ہوئی اور وہ وسط ایشیا کی ایک لڑائی میں مارا گیا، سال ۵۲۹ ق م۔

ف۲ (Cambyses) یہ بھی یونانی تلفظ ہے، پارسی اسے کمبوجیہ، یہودی اور عرب کیقباد کہتے تھے۔ یہی نام فردوسی نے اختیار کیا۔

ف۳ (Darius) یہ ایران کا مشہور شہنشاہ دارا گشتاسپ ہے۔

ف۴ صحیفہ آستر بائیبل باب ۸، آیت ۹، ۱۰۔

شام و فلسطین اور قبرص بھی شامل تھے۔ صیدا اس صوبے کا مرکز حکومت تھا۔ وہاں ایک شاہی محل تھا، جس میں صوبے کا حاکم رہتا تھا اور شہنشاہ دورے پر آتا تو اسی محل میں ٹھہرتا۔ محل کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے ایک نہایت پرفضا باغ تھا۔ اس مرکز حکومت کو ایک لحاظ سے خود مختار شہری ریاست کی حیثیت حاصل تھی اور یہ چار شہری ریاستوں میں سے ایک تھی۔ جس میں فونیقیہ منقسم تھا۔ دوسرے مقامات بہ لحاظ درجۂ اہمیت ذیل میں درج ہیں: صور، ارواد، ببلوس۔ یہ چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں مقامی حکمرانوں کے ماتحت تھیں، جو اپنے سکے رائج کرنے پر ہمیشہ مصر رہے۔ صیدا کا حکمران رسمی تقریبوں میں شہنشاہ کے بعد بہ لحاظ مرتبہ دوسرے درجے پر بٹھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد صور کا حکمران، پھر حسب ترتیب دوسری ریاستوں کے حکمران بیٹھتے[1]۔ اس طرح صیدا کو پھر ایک مرتبہ سب سے اونچا درجہ حاصل ہو گیا[2]۔

ایرانی سلطنت کے اس نظام سے فونیقی شہروں کو خاصا مالی فائدہ ہوا۔ آمد و رفت اور حمل و نقل کی نئی سہولتوں سے بھی وہ منتفع ہوئے اور ان کی اقتصادی زندگی خوش حال ہو گئی۔ نئی اور وسیع ترمنڈیوں کے دروازے ان کے لیے کھل گئے۔ ان کے ہمسایہ ارامیوں نے تجارت میں بڑا سخت مقابلہ کیا، لیکن فونیقیوں کے پرانے نقصان کی تلافی کم از کم جزواً ضرور ہو گئی۔ فلسطین میں فونیقیوں کی نو آبادیاں قائم ہونے لگیں اور ممفس (مصر) میں ایک علاقہ صوریوں کے لیے وقف تھا۔ یہاں سب فونیقی آباد تھے[3]۔ ایسی ہی لبنانی آبادیاں آج نیویارک (امریکہ)، ساؤ پالو (برازیل) اور بیونوس، آئرس (ارجنٹینا) میں بھی موجود ہیں۔ ان کے جنگلات سے بھی آمدنی کا سلسلہ جاری تھا، جو بظاہر لامتناہی معلوم ہوتا تھا۔ سائرس نے یہودیوں کو درخت کاٹنے کا اجازت نامہ دے دیا تھا اور صور و صیدا کے آدمی انھیں ادھر ادھر بھیجتے تھے[4]۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے جنگلات سرکاری ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ سوسہ میں شاہی محل بناتے وقت دارا نے ایک کتبہ کندہ کرایا تھا، جس میں فخریہ اعلان کرتا ہے: جس لکڑی کو دیودار کہتے ہیں اور وہ لبنان کے کوہستان سے آتی ہے، وہ (اس محل کے لیے) لائی گئی[5]۔

---

[1] ہیرو ڈوٹس کتاب ۸ باب ۶۷۔ [2] Eiselen، صفحہ ۶۱-۶۳۔ [3] ہیرو ڈوٹس کتاب ۲ باب ۱۱۲۔ [4] صحیفۂ عزرا، بائبل باب ۳، آیت ۷۔ [5] دی شیل (Scheil) کی فرانسیسی کتاب یعنی ایرانی آثار قدیمہ کے مشن کی یادداشتیں جلد ۲۱ صفحہ ۱۹۔

Marfat.com

چونکہ اہل فونیقیہ سب سے بڑے اور اعلیٰ درجے کے ساز و سامان سے لیس بیڑے کے مالک تھے، اس لیے ایرانیوں کی جنگی مساعی میں نمایاں حصّہ لیا۔ ان کے جہازوں کو ایرانی بیڑے میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل تھا۔ عیدا کے حکمران کو امیر البحر سمجھا جاتا تھا۔ کیم بی سس غالباً اہل فونیقیہ کی امداد کے بغیر مصر کو فتح نہیں کر سکتا تھا (۵۲۵ق،م)۔ جہازوں کی خدمات رضاکارانہ پیش کی گئیں۔ شہری ریاستیں اپنے آپ کو شہنشاہ کی حلیف سمجھتی تھیں، نہ کہ تابع۔ غالباً وہ جنگی خدمات کے لیے ذمہ اٹھا کر رقمیں وصول کرتی تھی اور ایرانی بیڑا ان کے پانیوں میں آکر ٹھہرتا تھا تو اس سے بھی محصول لیا جاتا تھا۔ جب کیم بی سس نے ان سے کہا کہ قرطاجنہ کے خلاف امداد دو، جو صور کی ممتاز ترین دختر تھی تو اہل صور نے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اہل قرطاجنہ سے ہمارا معاہدہ ہے اور ہم اپنے بھائیوں اور بیٹیوں پر حملہ نہیں کر سکتے[1]۔ البتہ ایران و یونان کی ان جنگوں میں انھوں نے نمایاں حصّہ لیا، جن سے دنیا بھر میں گونج پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ان کے پیش نظر معاملے کا یہ پہلو تھا کہ اپنے قدیم بحری حریفوں کے خلاف نقصان رساں ضرب لگانے کا جو موقع ملا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے چنانچہ انھوں نے یونان کے خلاف دو سو سات جہاز مہیا کیے اور پہلے اس بحری جنگ میں حصّہ لیا، جو ملیٹس کے سامنے ہوئی تھی (۴۹۴ق،م)۔ پھر سلیمس کی جنگ میں حصّہ لیا (۴۸۰ق،م) ان کے علاوہ وہ متعدد جنگوں میں شریک رہے، جن کی بدولت بحیرۂ ایجہ کے مختلف جزیرے اور یورپی ساحل کے شہر ایران کے قبضے میں آئے۔ پوری جنگ کو عموماً دو بحری طاقتوں — یونان اور فونیقیہ — کے درمیان آویزش ہی قرار دیا جاتا ہے۔ سلیمس کی شکست کے بعد زرکسیز[2] نے بالکل خلاف انصاف فونیقی افسروں کی ایک تعداد کے سر قلم کرا دیے تو باقی فونیقی رات کی تاریکی میں چھپ کر چلے آئے اور اپنے وطن پہنچ گئے[3]۔ اس کے بعد پندرہ سال تک کسی فونیقی جہاز نے ایرانیوں کی کسی خدمت میں حصّہ نہ لیا۔ یونانی مورخ کا بیان ہے کہ بہادری و جانفشانی کے کارنامے یونانیوں کے لیے اہل ایتھنز نے اور بربریوں (ایرانیوں) کے لیے اہل عیدا نے انجام دیے[4]۔ اہل عیدا فونیقیوں کا عام نام تھا۔

ان جنگوں میں فونیقیوں نے محض جنگجوؤں ہی کی حیثیت میں نہیں بلکہ انجینئروں اور فنکاروں کی

---

[1] ہیرودوٹس کتاب ۳ باب ۱۹۔ [2] Xerxes دارا گشتاسپ کا بیٹا اور جانشین۔
[3] ہیروڈوٹس کتاب ۸ باب ۸۹ و ۹۰۔ [4] ڈیوڈورس کتاب ۱۱ باب ۱۳۔

Marfat.com

حیثیت میں بھی درجۂ امتیاز حاصل کیا۔ مثلاً اُنھوں نے ہیلسپانٹ پر وہ پُل تعمیر کیا، جس پر سے گزرتی ہوئی زرکسیز کی فوج یورپ پہنچی[1]۔ جب اس خاکنائے میں نہر کھودی گئی، جو ماؤنٹ ایتھاس کو سرزمین یونان سے ملاتی ہے تو اہلِ فونیقیہ نے اپنے حصّے کی نہر اس طرح کھودی کہ جتنی چوڑی وہ اوپر سے تھی، اُتنی ہی چوڑی تہ میں تھی۔ اس طرح اُنھوں نے اپنی ہُنرمندی کا کمال ظاہر کر دیا اور وہ جس کام کا ذمہ اُٹھاتے تھے اس میں اپنے کمال کی نمائش ضرور کرتے تھے[2]۔

## اتحاد اور آزادی کے لیے جہاد

فونیقی شہری ریاستوں کی داخلی آزادی کی مزید شہادت یہ ہے کہ انھوں نے باہم وفاق قائم کر لینے کی کوشش کی اور اس موقع پر طرابلس کا ظہور ہوا۔ طرابلس کے مقام پر پہلے تین جداگانہ بستیاں تھیں، ایک اہل صیدا کی، دوسری اہل صور کی اور تیسری اہل ارواد کی۔ آرتا زرکسیز ثالث[3] (۳۵۹ء ق،م تا ۳۳۸ء ق،م) کی حکومت کے پہلے سال میں یہ تینوں مل کر ایک ہو گئیں اور اور اس مقام کے لیے ایک سامی نام تجویز کر لیا گیا جیسا کہ ۱۸۹ء ق،م سے ۱۸۸ء ق،م کے ایک مقامی سکّے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یونانی اس مقام کو ٹرائی پولس یعنی تین شہر کہنے لگے۔ عربوں نے اسی نام کو اطرابلس بنا لیا۔ عام بول چال میں طرابلس کہتے ہیں[4]۔ اس نئے شہر میں فونیقیہ کی چاروں شہری ریاستیں سالانہ مجلس شوریٰ منعقد کرتی تھیں، جس میں کم و بیش تین سو نمائندے شریک ہوتے تھے[5]۔ مجلسِ شوریٰ میں مشترکہ ضرورت کے مسائل و معاملات پر بحث ہوتی تھی۔ ایسے ہی ایک اجلاس میں، جو ۳۵۱ء ق،م میں منعقد ہوا، فیصلہ کیا گیا کہ کامل آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔

پورے دو سو سال تک ایرانی اور فونیقی باہم امن و سکون کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس میں دونوں کا فائدہ تھا، لیکن ۳۶۰ء ق،م سے فونیقیوں کی وفاداری متزلزل ہو گئی۔ صیدا کے ایک حکمران نے، جسے سٹریٹن[6] کہا جاتا ہے اور وہ عموماً ٹلیلین مشہور ہے، اہل ایتھنز سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے۔ اس وجہ سے اٹیکا میں صیدانیوں کو ان تمام محاصل سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

---

[1] ہیرودوٹس کتاب ۷ باب ۳۴۔ [2] ہیرودوٹس کتاب ۷ باب ۲۳۔
[3] Arta-Xerxes، تورات میں اسے ارتخششت لکھا ہے۔ عام طور پر اردشیر مشہور ہے۔
[4] جارج ہل کیٹیلاگ آف دی گریک کوائنز آف فونیقیہ۔ [5] سٹرابو کتاب ۱۶ باب ۲، ڈیوڈورس کتاب ۱۶ باب ۴۱۔ [6] Straton، فونیقی نام عبداشتارت تھا۔

جو غیر ملکیوں پر عائد تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں اور فونیقیوں کے تجارتی تعلقات ایک نئے دور میں داخل ہو رہے تھے۔ رقابت کی جگہ خوشگوار تعاون نے لے لی تھی۔ فونیقی بڑی تعداد میں یونان کے اندر آباد ہونے لگے تھے، خصوصاً پائیرائس میں، جہاں ان کی اپنی عبادت گاہیں تھیں اور اپنے جداگانہ قبرستان تھے۔ ایتھنز میں بھی فونیقی قبرستانوں سے کتبات دستیاب ہوئے ہیں، لیکن سڑیٹن نے ایرانی اقتدار کا جُوا اتار پھینکنے کی جو کوشش کی تھی، اس کے لیے مناسب سرگرمی کا اظہار نہ ہوا، لہٰذا وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ آئندہ دس سال میں شہری ریاستیں سرکشی کا اظہار کرتی رہیں۔ آرٹا زرکسیز کے صوبیداران سے جو ظالمانہ اور متکبّرانہ برتاؤ کرتے تھے، اس پر وہ بے حد رنجیدہ تھیں۔ ان کے علاوہ محاصل میں اضافہ بھی باعث مصیبت بنا ہوا تھا۔ اُس وقت تک فونیقیوں نے یہ اندازہ بھی کر لیا ہو گا کہ اب ایران کا آفتابِ اقبال لبِ بام ہے۔

آرٹا زرکسیز کے خلاف بغاوت کی ابتدا طرابلس کے اُس حصّے سے ہوئی جس میں صیدانی رہتے تھے، پھر یہ بغاوت تیزی سے لبنان کے پورے ساحلی علاقے میں پھیل گئی۔ معمول کے مطابق مصر نے اس بغاوت کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت جلد بغاوت کا مرکز صیدا میں منتقل ہو گیا۔ اُس وقت وہاں کا حکمران تنّس تھا۔ لوگوں نے شاہی باغ کے درخت کاٹ دیے ــــ یہ انتقامی حربہ لبنان میں اب بھی استعمال ہوتا ہے ــــ اور گھاس کے اُس انبار میں آگ لگا دی جو ایرانی رسالے کے لیے محفوظ تھا۔[۱] انھوں نے عجلت سے تنخواہ دار فوجیں، جنگی جہاز، ہتھیار، سامانِ رسد وغیرہ چیزیں فراہم کیں اور پیش آنے والی جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ آرٹا زرکسیز نے بھی وقت کا ایک لمحہ ضائع نہ کیا۔ تین لاکھ پیادے، تیس ہزار سوار، تین سو جنگی جہاز اور پانچ سو تجارتی جہاز لے کر بابل سے چل پڑا۔[۲] وہ راستے ہی میں تھا کہ شام اور سلیشیا کے گورنر لبنان سے باہر نکال دیے گئے۔ اور وہ بغاوت کی آگ فرو کرنے میں سرگرم تھے۔ نو مختار فونیقی شہروں نے ایرانیوں کو خارج کر کے کامل خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ جب حکمرانِ صیدا نے یہ سُنا کہ آرٹا زرکسیز خود بڑی بھاری فوج لے کر آ رہا ہے تو اس نے ہمت ہار دی اور ذاتی حفاظت کے لیے شہر سے غداری پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ لوگ آزادی کے لیے لڑ مرنے کا پختہ عزم کیے بیٹھے تھے۔ جب ان میں سے پانسو امراء زیتون کی شاخیں ہاتھ میں لیے صلح کے پیامی بن کر آرٹا زرکسیز کے

---

[۱] ڈیوڈورس کتاب ۱۶، باب ۴۱۔

[۲] ڈیوڈورس کتاب ۱۶، باب ۴۰۔

Marfat.com

پاس پہنچے، تو انھیں قتل کرا دیا گیا۔ اس کے بعد عزم میں تزلزل کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ اس نازک ساعت میں اہلِ شہر نے تمام جہاز بھی جلا دیے اور بندرگاہ بھی نذرِ آتش کر دی، تاکہ کسی شہری کو بچ نکلنے کا خیال ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ وہ اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے اور بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے خود انھیں اور ان کے املاک کو بھسم کر گئے۔[1] بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس ہزار سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے، جہاں لوگوں کو نذرِ آتش کیا گیا تھا، آرٹا زرکسیز نے اس کے لیے ایک خریدار پیدا کر لیا کیونکہ راکھ میں پگھلے ہوئے سونے اور چاندی کے ذخیرے تھے۔ تھوڑے سے صیدانیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گئے۔ جو شہر کسی زمانے میں بحیرۂ روم کی ملکہ تھا، وہ آگ کی نذر ہو گیا (۳۴۵ق، م) اور دنیا کو اس کے تحریری و علمی ذخیروں سے محروم ہونا پڑا۔ صیدا کی کامل تباہی کا یہ دوسرا دور تھا۔ اس کے تھوڑی مدت بعد صور بھی تباہ ہو گیا۔ گویا قومی زندگی کا آخری سانس بھی پورا ہو گیا۔ باقی شہروں نے اپنے قائد و سر عسکر کا دردناک انجام دیکھ کر ہتھیار ڈال دیے۔ ایرانیوں نے اتنی بڑی تباہی کے بعد ساحلی علاقے پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا مگر یہ عارضی ثابت ہوا۔ اٹھارہ سال میں مغرب کی طرف سے ایک غیر متوقع حملہ آور نمودار ہوا، جس کی ضربوں نے پوری سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

**تہذیبی پہلو** دو صدیوں کے اقتدار میں ایرانی تہذیب و ثقافت نے لبنان پر کیا اثر ڈالا؟ اس کا صحیح اندازہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس پورے دور کے متعلق ہماری معلومات کے ذرائع بے حد محدود ہیں، یعنی چند سکے ہیں۔ جا بجا بکھرے ہوئے کتبے ہیں یا عبرانیوں کی تحریرات کے اشارے ہیں یا کلاسیکی مصنفوں کی تصنیفات ہیں۔ تاہم ایک امر یقینی ہے اور وہ یہ کہ لبنانی تہذیب و ثقافت کی بنیادی سامی حیثیت بدستور باقی رہی۔ شامی بھی سامی ہی رہے، البتہ ان کا نمونہ ارامی وضع کا تھا اور غالباً ان میں مغرب ——— یونان ——— کا تداخل زیادہ ہوا، مشرق کا اتنا نہ تھا۔ صیدا کے ایک سرکاری ایرانی محل کے کھنڈروں سے جو مجسمے حال ہی میں دستیاب ہوئے، ان کی وضع و ہیئت وہی تھی، جن کے نمونے ایرانیوں کے مرکزِ حکومت پرسی پولس میں تھے۔ لیکن بہت سے مرمریں مجسمے اس شہر میں ملے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں اٹیکا کی سنگ تراشی اس علاقے میں خوب رائج ہو چکی تھی۔ اٹیکا کا درہم بھی معیاری سکہ بن چکا تھا اور پانچویں صدی قبل مسیح میں دُور دُور تک رائج ہو چکا تھا۔ ان دو صدیوں میں یونانیوں کے ظروف بحیرۂ روم کے مشرقی علاقوں میں رواج پا چکے تھے۔ ایرانیوں کو یونانیوں کے خلاف جنگ میں

---

[1] ڈیوڈورس کتاب ۱۶ باب ۴۰ ۲ ایضاً باب ۴۳-۴۵، الیلن صفحہ ۷۵-۷۷۔

شکست ہوئی تو مغربی علاقے میں فونیقیوں کی تجارت کا دائرہ کم ہو گیا مگر یونانیوں کی تجارت مشرق میں بڑھ گئی۔ ان جنگوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان وسیع فوجی میل جول کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ پھر سکندر نے یہی سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد پومپے، امیر معاویہؓ، سلطان صلاح الدین، رچرڈ شیر دل، نپولین اور ایلنبی ایک دوسرے کے نقشِ قدم پہ چلے۔ میل جول کے دوسرے پہلو مادی اور تہذیبی بھی قائم رہے۔ یونان ساتویں صدی قبل مسیح میں اس ثقافتی خط کے آخری سرے پر تھا، جو لبنان سے ہوتا ہوا جاتا تھا اور اس وقت تک یونان ثقافتی اثرات حاصل کر رہا تھا لیکن زیرِ نظر دور میں یہ حیثیت منقلب ہو گئی تھی، یعنی وہ ثقافتی و تہذیبی اثرات دوسروں تک پہنچا رہا تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں یونانیوں کی تجارتی نو آبادیوں کا سلسلہ شام و لبنان کے ساحلی علاقے پر شروع ہوا۔ سکندر کے ظہور سے کم از کم ایک صدی پیشتر یونان کے تاجر اور کاریگر تمام ساحلی شہروں میں پھیل چکے تھے۔

---

Marfat.com

Marfat.com

# تیسرا حصّہ

# یُونانی و رُومی دَور

Marfat.com

Marfat.com

# گیارھواں باب

# سکندر اور اُس کے جانشین

## فیلقوس کا منصوبہ

فیلقوس شاہِ مقدونیہ نے اپنے ملک کو یونانی ریاستوں کی قیادت کے درجے پر پہنچا دیا تھا اور اس نے بڑی دیدہ ریزی سے ایک منصوبہ تیار کیا تھا، جس کا مُدّعا یہ تھا کہ ایشیاے کوچک کے یونانی شہروں کو ایرانی اقتدار سے نجات دلائی جائے۔ اس حالت میں ایک قاتل کے خنجر نے اس کی زندگی کا رشتہ منقطع کر دیا۔ علاوہ بریں اس کی دلی آرزو تھی کہ جس طرح دارا گشتاسپ اور زرکسیز یونان آئے تھے، اسی طرح بہ طریقِ داد دید ایشیا جائے، لیکن اس منصوبے اور اس آرزو کی تکمیل قدرت نے اس کے بیٹے کے لیے مقدّر کر رکھی تھی، جو فیلقوس سے بدرجہا زیادہ گرم جوش اور بدرجہا زیادہ نامور تھا۔

## معرکۂ اسوس

سکندر سنہ ۳۳۴ ق،م کے موسمِ بہار میں پینتیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔ ایلسپانٹ کو عبور کر کے وہ بجلی کی تیزی سے ایشیاے کوچک میں سے گزر گیا، جو اس زمانے میں سلطنتِ ایران کا ایک صوبہ تھا۔ پھر کوہستانِ طارس کے اُن دروں سے گزرا، جنھیں ابوابِ سلیشیا کہتے ہیں۔ پھر اس نے شمالی شام کی نشیبی زمینوں کو طے کیا اور اسوس کے مقام پر دارا ثالث (سنہ ۳۳۶ ق،م۔ سنہ ۳۳۰ ق،م) سے مقابلہ پیش آیا، جس کی مختلف الاقوام فوج سکندر کی فوج سے کم از کم تین گنا تھی۔ اس معرکے کا ذکر کرتا ہوا یہودی مؤرخ جوزیفس سنہ ۹۳ء میں لکھتا ہے: ایشیا کے تمام باشندوں کو یقین تھا کہ اہلِ مقدونیہ ایرانی فوج کی کثرتِ تعداد پیشِ نظر رکھتے ہوئے مقابلے سے اعراض کر جائیں گے[1]۔ یونانی مورخ ڈیوڈورس باشندۂ سسلی نے بھی ایک صدی پیشتر فی الجملہ یہی رائے ظاہر

---

۱؎ Antiquties، کتاب ۱۱، باب ۸۔

Marfat.com

کی تھی۔[۵۱] ۳۳۳ ق، م میں یہ معرکہ پیش آیا۔ میدانِ جنگ ایک تنگ گھاٹی تھا، جہاں کثرتِ تعداد کچھ کام نہ دے سکتی تھی۔ پھر یونانیوں کی جنگی چالوں نے ایرانیوں کو بے بس کر دیا اور شکستِ فاش کھا گئے۔ دارا ایک عالی شان اور پُر تکلف رتھ پر بیٹھا ہوا حالاتِ جنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ جس میں برابر برابر چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ بچی کھچی فوج کے ساتھ وہ بھی سراسیمہ وار مشرق کی طرف بھاگا اور خیمہ و خرگاہ بلکہ حرم تک کو پیچھے چھوڑ گیا۔ اس فتح کی یادگار میں سکندر نے ایک شہر کی بنیاد رکھی، جس پر اب تک اس کے نام کی چھاپ لگی ہوئی ہے یعنی اسکندرونہ۔ اس فیصلہ کن فتح سے یونانی عظمت و شان کی دھاک بیٹھ گئی۔ جو کچھ آئندہ پیش آنے والا تھا، یہ اس کا پہلا پرتو تھا۔ ایرانی قلوب خوف و دہشت سے نہیں تو کم از کم شکوک و شبہات سے ضرور لبریز ہو گئے +

## فونیقیوں کی طرف سے استقبال

سکندر نے بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب کرنے کے بجائے جنوب کی جانب پیشقدمی جاری رکھی تاکہ سمندر پر قبضہ و تحکم میں کوئی رخنہ باقی نہ رہے اور نقل و مخابرت کے تمام وسائل محفوظ ہو جائیں۔ ساتھ ہی اس نے سواروں کا ایک جیش دریائے عاصی کے بالائی حصے کی جانب بھیج دیا تاکہ دمشق پر قبضہ کر لے۔ جو شام میں ایرانیوں کا مستقر تھا۔ وہ خود ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ لبنانی شہر یکے بعد دیگرے دروازے کھول کر اس کا استقبال کرتے رہے۔ ارادوس (ارواد) کے بادشاہ نے، جو میراتھیس اور آس پاس کے شہروں کا حاکم تھا، اپنے بیٹے کو فاتح کی پیشوائی کے لیے بھیج دیا، جس کے سر پر سکندر نے اپنے ہاتھ سے سنہری تاج رکھا۔[۵۲] بیلوس (جبیل) اور بریتیس (بیروت) پُر امن طریق پر مقدونیہ کے قبضے میں چلے گئے۔ صیدا تھوڑی ہی مدت پیشتر جل کر راکھ کا ڈھیر رہ گیا تھا۔ وہ کیا مقابلہ کر سکتا تھا؟ اس کے استحکامات صلیبی جنگوں کے زمانے میں از سرِ نو استوار ہوئے۔ سکندر نے شہر کی حکمرانی دو ممتاز شہریوں کو دینی چاہی، جنھوں نے مقدونوی سپہ سالار کی آؤ بھگت کی تھی، لیکن یہ اعزاز دونوں نے قبول کرنے سے اس بنا پر معذرت کر دی کہ شاہی خاندان کے رکن کے سوا کسی دوسرے شخص کا اس منصب پر فائز ہونا ملکی دستور کے منافی ہے۔ اس پر سکندر نے شاہی لباس اور لستان شاہی خاندان کے ایک فرد کو دے دیے، جس کا نام عبدلومینس[۵۳] تھا، جو اس وقت باغبانی کے ذریعے سے قوتِ لایموت

---

[۵۱] کتاب ۱۷ باب ۳۲ + [۵۲] آریان کتاب ۱۳ باب ۲، نیز کریٹس کتاب ۴ +
[۵۳] Abdalominus کتاب ۱۷ باب ۴۷ میں اسے غلط طریق پر حکمران ٹائر قرار دیا گیا +

Marfat.com

بہم پہنچا رہا تھا۔ اس نے یہ اعزاز قبول کر لیا۔

**صور کی بربادی** صرف صور نے حملہ آور کی آمد پر دروازے بند کر لینے کی ہمت کی۔ وہ اس وقت ساحل کی ملکہ سمجھا جاتا تھا اور قبل ازیں شلمنسر اور بخت نصر کا مقابلہ کر چکا تھا۔ کیا سابقہ تجربہ اہل صور کے دل میں یہ احساس تازہ رکھنے کے لیے کافی نہ تھا کہ مقدونیہ کا غیر معروف حملہ آور انھیں مسخر نہیں کر سکتا؟ صور کا جو حصہ سمندر کے اندر جزیرے پر آباد تھا، وہ ساحل سے تقریباً نصف میل پر تھا اور جزیرہ دو میل لمبا تھا۔ ساحل کی جانب اس حصے کی فصیل ڈیڑھ سو فٹ اونچی تھی۔ درمیان جو آبنائے حائل تھی، اس میں لہریں بڑی تیز اور خاصی خطرناک تھیں، خصوصاً اس وقت جب جنوبی جانب سے ہوا چلتی تھی۔ دفاع کے ان انتظامات پر صور کا بیڑا مستزاد تھا، جس کے جہاز مشرقی بحیرۂ روم کے لیے باعث افتخار تھے اور ایرانی بیڑے کا جوہری بیڑا تھا۔ اہل شہر کو بیڑے کی امداد پر پورا بھروسا تھا۔ لہٰذا اہل صور کو شمالی ہمسایوں کی طرف سے امداد کی اُمید تھی۔ قرطاجنہ سے مزید بحری امداد کا وعدہ ہو چکا تھا۔ یہ وعدہ ان سفیروں نے کیا تھا، جو معبد ملکرت کی سالانہ زیارت کے لیے آئے ہوئے تھے[1] لیکن یہ تمام چیزیں جن پر بھروسا کیا گیا تھا، یکے بعد دیگرے کالعدم ثابت ہوئیں۔ اس طرح ایک ایک اُمید مسلسل ٹوٹتی گئی۔ جزائری شہر کا محاصرہ یقیناً خاصا لمبا ہو گیا اور یہ تاریخ کے نہایت خوفناک محاصروں میں سے تھا۔ سکندر عزم بالجزم کر چکا تھا کہ جس شہر نے سب سے پہلے مقابلے کی جرأت کی ہے، اسے دوسروں کے لیے عبرت ناک مثال بنا دے۔ اس نے بھاری جانی نقصان برداشت کرتے ہوئے ساحل سے جزیرے تک ایک راستہ بنانا شروع کر دیا، جو دو سو فٹ چوڑا تھا۔ جنگی وقائع میں حملے کے لیے ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ شہر کا جو حصہ ساحل پر آباد تھا، وہ برباد ہو چکا تھا۔ سکندر نے راستہ بنانے کے لیے اس کا ملبہ استعمال کیا اور کوہستان لبنان سے درخت کٹوا کر منگائے، راستہ بنانے کے سلسلے میں ایک ایک انچ کے لیے اہل صور سے جنگ کرنی پڑی۔ مزدوروں اور کارکنوں کو محصوروں کے تیروں، پتھروں اور پھینکنے والی دوسری چیزوں سے بچانے کے لیے درمیان چمڑے لٹکا دیے گئے تھے۔ اہل صور میں سے تیر چلانے والے، منجنیقیں چلانے والے اور غوطے لگانے والے بھی مقدونوی کارکنوں اور مزدوروں کے لیے خاصی مصیبت کا باعث تھے اور ان کی وجہ سے کام میں یقیناً رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، مگر اس سے بھی

---

[1] بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نو آبادی کی طرف سے اصل وطن کو سالانہ خراج بھیجا جاتا تھا اور وطن کی نمائندگی ملکرت کرتا تھا۔ یہ ربط و ضبط ڈھیلا نہیں ہوا تھا۔

Marfat.com

بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ آتش بار جہاز وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے، جن میں تارکول، گندھک اور دوسرے آتش گیر مادّے بھرے ہوتے۔ یہ مادّے مزدوروں، کارکنوں اور ان کے سامان کے لیے خاص تباہی کا موجب ہوتے۔ تاہم جب انھیں علم ہوا کہ سکندر نے صیدا، بیلوس اور ارادوس سے اسّی جنگی جہاز حاصل کر لیے ہیں، نیز قبرص اور روڈس سے امدادی بیڑے آگئے ہیں تو انھیں یقین ہو گیا کہ ان کی بدبختی پر آخری مہر لگ گئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بیوی بچوں اور ان بوڑھوں کو، جو دفاع کے سلسلے میں کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے، پناہ کے لیے قرطاجنہ بھیج دیا۔ ادھر محاصرہ جاری تھا، ادھر سکندر نے ایک خطرناک مہم کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی ان عربی قبائل کی تادیب کے لیے حملہ کیا، جو مشرقی لبنان میں رہتے تھے۔

سات مہینے تک، جو ۳۳۲ ق، م کے وسط جولائی میں ختم ہوئے، بدنصیب شہر خشکی اور تری سے پیہم حملوں کی روک تھام کرتا رہا۔ آخر بے بس ہو گیا۔ آٹھ ہزار شہری جنگ میں مارے گئے، دو ہزار کو ساحل پر سولی دے دی گئی، تیس ہزار غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے۔ صرف چند ہزار بچے، جنھیں صیدائیوں نے عزیزداری کی بنا پر خفیہ خفیہ صیدا پہنچا دیا۔[۱] جن چند افراد نے معبد ملکرت کے احاطے میں پناہ لی تھی، انھیں چھوڑ دیا گیا۔ انھیں میں شہر کا بہادر حکمران اور مدافع بھی شامل تھا۔ فاتح اپنی مسلح سپاہ کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور معبد ملکرت میں قربانیاں کیں۔ یونانی ملکرت کو ہرقل کا ثانی سمجھتے تھے، جس کی نسل سے ہونے کا سکندر مدعی تھا۔ پھر فتح کا جشن منایا گیا، جس میں ورزشی کرتب بھی دکھائے گئے اور مشعلوں کی روشنی میں گھڑ دوڑ بھی ہوئی۔[۲] یوں صور کے جزیری حصار کا تاریخی کردار اختتام کو پہنچا۔ اس کا محاصرہ فونیقی شہروں کے ان محاصروں میں سے آخری تھا، جن میں مقامی باشندوں نے جوانمردی سے اجنبی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور تاریخ کے صفحات پر ایسے کئی محاصروں کی تفصیل ثبت ہے۔

## سلطنت کی تباہی

سکندر صور کو نیم سوختہ، زیادہ تر برباد شدہ اور تقریباً بے آباد چھوڑ کر غزّہ کی طرف بڑھا، جو کسی زمانے میں پانچ فلسطینی شہروں میں سب سے ممتاز تھا اور سکندر کے حملے کے وقت عرب کی پیداوار کا مرکزی مخزن بنا ہوا تھا۔ غزّہ نے بھی صور کی طرح بڑی جوانمردی سے مزاحمت کی، لیکن زیادہ دیر تک مزاحمت قائم نہ رہ سکی۔ دو مہینے کے

---

[۱] کرٹیس کتاب ۴ (اس تعداد کو خواہ مخواہ بڑھا کر پندرہ ہزار بنایا گیا ہے جو ناقابل یقین ہے) ڈیوڈورس کتاب ۱۷ باب ۴۶، آریان کتاب ۲ باب ۲۴، جوزیفس انیٹی کوئیٹز کتاب ۱۱ باب ۸۔

[۲] آریان کتاب ۲ باب ۲۴۔

Marfat.com

محاصرے میں شہر مسخر ہو گیا[۵۱]۔ اس دوران میں سکندر کو خفیف سا زخم بھی لگا۔ غزّہ کی آبادی بھی غلام بنا کر فروخت کر دی گئی۔ اب سکندر کے سامنے مصر کا راستہ کھلا تھا۔ وہاں کے باشندوں نے پُرامن طریق پر نئے حکمران کو قبول کر لیا۔ اس طرح مشرقی بحیرۂ روم کے اندر ایرانی اقتدار کے تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی گئی۔ مصر میں سکندر نے ایک اور شہر کی بنیاد رکھی، جو آج تک اس کے نام سے موسوم ہے یعنی الاسکندریہ، جو ندریجاً بین الاقوامی تجارت کا ایک فروغ پذیر مرکز، یونانی ثقافت کا محل خاص اور ایتھنز کا مشرقی جانشین بن گیا[۵۲]۔ مصر سے سکندر تیزی کے ساتھ واپس آیا۔ البقاع اور وادیٔ عاصی میں سے گزرتا ہوا فرات کے کنارے پہنچا۔ پھر دوآبۂ دجلہ و فرات کے شمالی و مشرقی حصے کو طے کرتا ہوا نینوا سے اوپر دریائے دجلہ کو عبور کیا۔ نینوا کے مقام اور اربیلا کے درمیانی میدان میں اخامنشیوں کی آخری فوج کے پرخچے اُڑا دیے گئے (۳۳۱ق،م)۔ اخامنشی وہی خاندان تھا جس میں سے سائرس اور دارائے اعظم جیسی شخصیتیں اُٹھیں۔ خود دارا ثالث میدانِ جنگ سے بچ نکلا۔ ایکبتانہ (مادہ کا قدیم دارالحکومت، موجودہ ہمدان) تک اس کا تعاقب کیا گیا۔ جہاں دو سازشیوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا (۳۳۰ق،م[۵۳])۔ مقدونوی حملہ آور نے اب اپنے آپ کو آخری ایرانی شہنشاہ کا جائز وارث تصور کر لیا۔

سکندر اس فتح پر قانع نہ ہوا اور مزید مشرق کی طرف بڑھا۔ اس نے سیر دریا، یعنی سیحوں کو عبور کیا، پھر جنوبی جانب کا رخ کر لیا اور کابل ہوتا ہوا شمالی و مشرقی ہندوستان پہنچ گیا[۵۴]۔ اس کی تکان زدہ فوج کے آدمیوں اور سالاروں کی شکایات پہنچنے لگیں، چنانچہ اس نے بابل کی جانب مراجعت کی، جہاں وہ خورد و نوش کی بدمستیوں میں نئی فتوحات کے منصوبے تیار کرتا رہا۔ بخار نے بخت نصر کے محل میں اس کی زندگی کا رشتہ کاٹ دیا (۳۲۳ق،م)۔ اس وقت اس کی عمر پورے پینتیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی[۵۵]۔ اپنے پیچھے جرأت و جوانمردی اور تحمل شدائد کے یگانہ کارنامے چھوڑ گیا۔ افسانوں میں وہ مختلف رومانی دوروں کا ہیرو قرار پایا۔ قرآن میں اسے سکندر ذوالقرنین قرار دے کر

---

۵۱ کرٹیس کتاب ۴۔ آریان کتاب ۲ باب ۲۷۔ ۵۲ ایضاً کتاب ۳ باب ۱، ۲۔ ۵۳ آریان کتاب ۳ باب ۱۲ (واقعہ یہ ہے کہ دارا ہمدان سے نکل کر مشرقی صوبوں میں پہنچ گیا تھا۔ سکندر نے تعاقب کیا۔ دارا اپنے آپ کو حوالے کر دینے پر آمادہ تھا۔ اس اثنا میں دو درباریوں نے اسے قتل کر دیا (مترجم)۔ ۵۴ (مترجم) سکندر شمالی و مشرقی ہندوستان نہیں بلکہ شمالی و مغربی ہندوستان پہنچا تھا یعنی سابقہ جغرافیہ کے صوبہ سرحد و پنجاب۔ شمالی و مشرقی ہندوستان آسام اور مشرقی پاکستان پر مشتمل ہے۔ ۵۵ وفات کے وقت سکندر کی عمر بتیس اور تینتیس کے درمیان تھی۔ خود مصنف نے لکھا ہے، وہ ۳۳۴ق،م میں مقدونیہ سے چلا اور بیس سال کی عمر تھی۔ تقریباً بارہ سال کے بعد اس نے وفات پائی۔

Marfat.com

ایک خدائی مشن کا حامل بنا دیا گیا۔[51]

## شرق و غرب کا اتّصال

یونانیوں اور فونیقیوں کے درمیان تجارتی تعلقات میں تعامل کا جو سلسلہ ایرانی دور میں شروع ہوا تھا، سکندر کے فتوحات کے نتیجے میں وہ تیزی سے بڑھ گیا۔ فونیقی تاجر گدروسیا (بلوچستان) کے خوفناک سفر میں بھی سکندر کے ساتھ تھے۔ فونیقی ملاحوں نے اپنی خدمات اس کے حوالے کر دیں۔ یونانیوں کی مصنوعات اور ثقافتی اثرات مشرق قریب کے پورے حلقے میں داخل ہو گئے۔ خود سکندر نے دارا کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اس نے اپنے سالاروں اور سپاہیوں کو بھی ایشیائی بیویوں کی ترغیب دی۔ زرکسیز کے برعکس اس نے ایشیا اور یورپ کو لکڑی کے لٹھوں اور بے معنی بندھنوں نہیں بلکہ جائز محبت اور بے داغ شادیوں کے ذریعے سے ملانے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ دونوں کا میل ملاپ مشترکہ بچّوں کے ذریعے سے پختہ ہو جائے۔[52] اس کا خواب یہ تھا کہ ایک عالمی سلطنت بن جائے، جس میں آفاقی قوانین، آفاقی زبان اور آفاقی سکّے رائج ہوں۔ اس خواب کی تعبیر کے سلسلے میں اس نے متعدد ٹولیوں کی ستر یا اس سے بھی زیادہ بستیاں بسائیں، جن کی تعداد اس کے سلوکی اور بطلیموسی جانشینوں نے مزید بڑھا دی۔ ان بستیوں میں یونانی تاجر، صنّاع اور کاروباری آدمی بس گئے تھے۔ اس وجہ سے یہ بستیاں ساحل شام سے ہندوستان تک یونان کے مذہبی، سیاسی فنّی اور علمی افکار کی روشنی کے مینار بن گئیں۔ ان کا اثر بے شک و شبہ کبھی مٹنے والا نہ تھا۔ خود ان شہر کے باشندوں کو بھی نئے افکار ملے۔ انھوں نے عجیب و غریب عقیدے جذب کیے۔ بیرونی تجارت کے طور طریقے سیکھے۔ بیرونی جنسوں، مال و اسباب اور بیش قیمت جواہرات سے شناسائی حاصل کی، جن سے وہ پیشتر بالکل ناواقف تھے۔ رفتہ رفتہ یونانی زبان نے مہذّب دنیا کے اس پورے حصّے میں علمی زبان کی حیثیت حاصل کر لی۔ تین سو سال بعد حضرت مسیحؑ نے اپنا پیغام وقت کی ارامی زبان میں پیش کیا تو اسے وسیع تر سے وسیع تر حلقے میں پہنچانے کے لیے یونانی زبان کا لباس پہنایا گیا۔ یونانی اور مشرقی افکار و ادارات کے درمیان امتزاج کے اس موقع کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی وضع کی ثقافت بروئے کار آ گئی، جسے یونانیت کی ثقافت کہنا چاہیے۔ عالمی تاریخ میں سکندر کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔

---

[51] یہ بالکل غلط ہے کہ قرآن مجید میں سکندر کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔ اگر بعض مفسرین نے تاریخ سے ناواقفیت کے باعث اسے ذوالقرنین سمجھ لیا تو اس کا ذمہ دار قرآن مجید نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے، مصنّف عربی جاننے کے باوجود ایسی فاحش غلطی کا مرتکب ہوا۔ [52] پلوٹارک جلد اول صفحہ ۱۶۴، آریان کتاب ۷ باب ۱۱۔

## دو پارٹیوں کے درمیان

سکندر نے جو وسیع سلطنت انتہائی تیزی سے پیدا کر لی تھی، اس کے مرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کے سالار بہترین حصے ہتھیانے کے لیے باہمی رزم و پیکار میں مصروف ہو گئے۔ اس ہنگامۂ عظیم سے چار سالاروں کے ماتحت چار سلطنتیں بروئے کار آئیں: بطلیموس سلطنتِ مصر میں، سلوکی سلطنت بابل میں، انٹی گونس کی سلطنت ایشیائے کوچک میں۔ باقی رہا مقدونیہ تو اس پر امنٹی پیٹر قابض ہو گیا۔ "بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے"[1]۔ اس اثنا میں فونیقی شہروں کی حالت نہایت عجیب تھی۔ وہ فٹ بال کی طرح کبھی ایک سالار کے پاس چلے جاتے، کبھی دوسرے کے پاس۔ سب سے پہلے لاؤمیڈون[2] نے شام کی حکومت حاصل کی[3]۔ لیکن ۳۲۰ سنہ ق، م میں لبنان اور نشیبی شام اس کے قبضے سے نکل کر بطلیموس اول کے قبضے میں چلے گئے، جس نے مصر میں یونانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پانچ سال بعد بطلیموس کو فونیقیہ انٹی گونس کے حوالے کرنا پڑا۔ ۲۹۶ سنہ ق، م میں سلوکس اول فونیقیہ پر قابض ہو گیا۔ یہ شامی سلطنت کا بانی تھا، جس کا مرکز انطاکیہ تھا۔ دس سال بعد فونیقیہ پر بطلیموس نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ پھر ۱۸۹ سنہ ق، م تک یہ علاقہ کُلّاً یا جزواً مصر ہی کے پاس رہا۔ شام و لبنان کے درمیان حدِ فاصل بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہی۔ بطلیموس اول کے ماتحت (وفات ۲۸۳ سنہ ق، م) یہ حدِ شمال میں ارادوس (ارواد) اور جنوب میں حمص پر تھی۔ ۲۵۰ سنہ ق، م کے آس پاس یہ بیروت کی طرف ہٹ آئی۔ پچیس سال بعد پھر شمال کی طرف بڑھ کر ارادوس پہنچ گئی۔ پہلے کی طرح اب بھی شمال اور جنوب کی متحارب قوتوں یعنی سلوکیوں اور بطلیموسیوں کے درمیان فونیقیہ پر قبض و تصرف کے لیے کشمکش جاری تھی۔

## عیدا کا تقدم

مصری اقتدار کے اٹھاسی برسوں (۲۸۶ سنہ ق، م۔ ۱۹۶ سنہ ق، م) میں عیدا نے پھر پہلی حیثیت حاصل کر لی یعنی وہ حوادث و وقائع کے سٹیج کے وسط میں پہنچ گیا۔ یہ عیدا کا تیسرا دور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے سکے رائج کیے۔ اپنے بادشاہ مقرر کیے، جن میں سے بعض اشمون اور اشتارت کے مذہبی پیشوا تھے[5]۔ شہری ریاست کے حاکم کو

---

[1] صحیفۂ دانیال باب ۸، آیت ۸۔ [2] Laomedon۔ [3] کرٹس کتاب ۱۰، ڈیوڈورس کتاب ۱۸، باب ۱، ایپیان کتاب ۹۔ [4] ... [5] اس خاندان کی تاریخ حکمرانی محل نزاع ہے۔ دیکھیے ریاں ذیل صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱۔ کانتی نیو صفحہ ۶۵، ۶۸۔

Marfat.com

اب بھی بادشاہ ہی کہا جاتا تھا۔ سلوکیوں نے صوبائی حکومتوں میں جو نظام جاری کیا، وہ ایرانی نظام کا چربہ تھا اور اس میں مقامی خود مختاری کے لیے گنجائش موجود تھی۔ صیدا کے بادشاہوں میں سے متعدد ایسے تھے، جن کے نام تبنی یا اشمون عزر تھے[۱]۔ تبنی اوّل اپنے آپ کو اور اپنے باپ اشمون عزر کو استارت کا مذہبی پیشوا کہتا ہے۔ اس کا نام اب تک ایک گاؤں کفر تبنی کی شکل میں زندہ ہے، جو صیدا کے جنوب مشرق میں ہے۔ اشمون عزر ثانی (سنہ ۲۸۰ ق.م) نے اپنا دائرہ اقتدار دور اور یافہ تک پہنچا دیا۔ یہ علاقے کسی زمانے میں صیدا ہی کے ماتحت تھے[۲]۔ اس کا نہایت خوب صورت تابوت سنہ ۱۸۵۵ء میں مغارت الیلون کے نزدیک قدیم بالا حصار سے ملا تھا جو شہر کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ اس کے علاوہ سکندرا اور بہت سے دوسرے آدمیوں کے تابوت تھے[۳]۔ چھ سال بعد ویناں نے یہاں وسیع پیمانے پر کھدائی کرائی۔ متعدد تابوتوں میں آدمیوں کے سر یا ثابت ہوئے جسم تھے۔ ان میں سے بعض چھٹی صدی قبل مسیح کے تھے۔ اشمون عزر کے سنگی تابوت پر اتنے طویل کتبے کندہ تھے کہ فونیقی قبروں پر اتنے لمبے کتبے کم دیکھے گئے۔ کتبوں کا مقصد یہی تھا کہ نعش کو نہ چھیڑا جائے۔ چھیڑنے والے کے لیے بد دعائیں بھی کی گئی تھیں اور یہ یقین بھی دلایا گیا تھا کہ نعش کے ساتھ کوئی خزانہ دفن نہیں کیا گیا[۴]۔

**سلوکی اقتدار** ایک سو سال سے زیادہ مدت تک (سنہ ۱۹۸ ق.م سے سنہ ۸۲ ق.م) فونیقیہ سلوکیوں کی شامی سلطنت میں شامل رہا۔ اسے شامل کرنے کی پہلی زبردست کوشش انٹیاکس ثالث (سنہ ۲۲۳ ق.م سے سنہ ۱۸۷ ق.م) جو یانی خاندان کے بعد بہت بڑا فاتح گزرا ہے اور اسے بجا طور پر انٹیاکس اعظم کہا جاتا ہے۔ اس نے فونیقیہ کو پامال کر ڈالا اور سلوکی فتوحات کا سلسلہ سرحد مصر تک پہنچا دیا، لیکن رفح (غزّہ کے جنوب میں) کے میدانِ جنگ میں شکست کھائی اور لبنان کی طرف ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ آگے چل کر دوبارہ جنگی کارروائیاں شروع کیں تو سنہ ۱۹۸ ق.م بمقام بانیاس[۵] زبردست فتح حاصل کی۔ اس کے نتائج زیادہ پائدار تھے۔ پھر روما سے جنگ پیش آئی تو انٹیاکس نے سکندرا اور زرکیسز کی

---

۱ ؎ دیکھیے سلاطین اوّل باب ۱۶، آیت ۲۱، ۲۲۔ ۲ ؎ کک صفحہ ۳۲، دوم یشوع باب ۱۱، آیت ۲) ۳ ؎ جھبیس تابوت بیروت کے قومی عجائب خانے میں ہیں۔ ۴ ؎ کک صفحہ ۳۰ – ۴۰۔ ۵ ؎ Paneas، اناجیل میں اسے سیزریا فلپی بتایا گیا ہے" ۔۔۔ دراصل البرج ہے، جو طنطورا کے قریب یافہ کے شمال میں ہے۔

طرح فونیقیہ کی بحری قوت سے فائدہ اُٹھایا۔ قبل ازیں سنیرب فونیقی کاریگروں کو بیڑا بنانے کے لیے لے گیا تھا، تاکہ دجلہ میں سے گزرتا ہوا خلیج فارس میں پہنچ جائے اور ایلام پر حملہ آور ہو۔

اینٹیاکس اعظم کے بیٹے اور جانشین اینٹیاکس رابع ایپی فینز[1] (۱۷۵ ق م۔ ۱۶۴ ق م) کو جب یہ معلوم ہوا کہ مصر نشیبی شام اور ساحل پر قبضہ کرنے کے لیے تیاریوں میں مصروف ہے — اور یہی دو علاقے دونوں سلطنتوں میں وجہ نزاع ہے — تو اس نے خود خشکی اور تری سے مصر پر حملہ کر دیا اور ۱۶۹ ق م میں پلوسیم[2] کے سرحدی قلعے پر دشمن کو شکست فاش دی، جس میں شاہ مصر گرفتار ہو گیا۔ چنانچہ پورا مصر زیریں اینٹیاکس کے قبضے میں آ گیا۔

اس حکمران کا جذبۂ خاص یہ تھا کہ سلطنت کی متفرق قوموں کو باہم ملا کر ایک ثقافتی وحدت پیدا کر دے۔ اس سلسلے میں اس نے سلوکی خاندان کی روایتی پالیسی پر عمل کیا۔ یونانیت ہی وہ قدر مشترک تھی، جس پر رعایا کے تمام طبقات کو اکٹھا کر لینے کی اُمید تھی۔ فونیقیوں کو ضروری مطابقت پیدا کر لینے میں کوئی مشکل محسوس نہ ہوئی۔ مثلاً صور نے یونانیوں کے انداز میں وقتاً فوقتاً جشن منانے کا سلسلہ شروع کر دیا، جن میں قربانیاں بھی دی جاتیں، جلوس بھی نکالے جاتے اور ورزشی کرتب بھی دکھائے جاتے۔ ۱۷۱ ق م میں خود اینٹیاکس نے ایک جشن میں حصہ لیا۔ وہیں اس نے یروشلم کے غاصب مذہبی پیشوا مینلاس کے خلاف الزام لگانے والوں کو موت کی سزا دی۔ الزام یہ تھا کہ اس نے ہیکل سے مقدس ظروف چرائے، انھیں اہلِ صور کے ہاتھ بیچا اور رشوت دے کر اپنی برأت کا انتظام کر لیا۔ اہل صور نے بے گناہ مقتولوں کے ماتم میں زبردست جلسے کیے[3]۔ لیکن یہودیوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اینٹیاکس کے دل میں یونانیت کے لیے خاص جوش و خروش تھا اور اس نے اپنے مظہر خدا ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس پر مکابیوں کی بغاوت شروع ہو گئی۔ یہ بغاوت اینٹیاکس سابع (۱۳۷ ق م۔ ۱۲۸ ق م) کے عہد تک فرو نہ ہوئی۔ یہ شخص خاندان کا آخری بڑا بادشاہ تھا[4]۔

---

ف۱ Epiphanes ف۲ Pelusium ؛ اسے عرب الفرما یا تل الفرما کہتے ہیں۔ یہ معروف جزیرہ نمائے سینا کی سرحد پر بحیرہ روم کے قریب واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ جالینوس کی قبر یہیں ہے۔ ف۳ جوزیفس اینٹی کوئٹیز کتاب ۱۲ باب ۵۔ ف۴ سلوکی بادشاہوں کی مکمل فہرست مع سنین کے لیے حتّی کی تاریخ شام ملاحظہ فرمائیے۔

Marfat.com

**داخلی خود مختاری**

سلوکیوں کی قوت معرضِ زوال میں آئی تو شام کے تجارتی شہروں نے خود مختاری کے لیے سرگرمی سے جدوجہد شروع کر دی۔ اس سلسلے میں پہلا مرحلہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی شہر نے مداخلت سے محفوظیت کا سرکاری فرمان حاصل کر لیا۔ اغلب ہے ایسے فرامین رقمیں دے کر حاصل کیے گئے ہوں۔ مثلاً صور نے یہی طریقہ استعمال کیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ محفوظیت کے سلسلے میں مختلف حقوق حاصل ہو جاتے۔ مثلاً خارجی حملوں سے بچاؤ کا انتظام۔ اس سلسلے میں بحری قزاقوں کو سب سے بڑھ کر دہشت ناک سمجھا جاتا تھا۔ پھر گراں قدر شاہی تحصیلات نیز یک طرفہ فیصلوں سے کلاً یا جزواً تحفظ، بادشاہ اور اس کے کارندوں نے سیاسی یا مالی جبر سے بھاگ کر آنے والوں کے لیے پناہ دہی کا حق۔ ایسے پناہ گیروں کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھتی تھی اور اس کے مال و ثروت میں اضافہ ہوتا تھا[1]۔

فونیقی شہروں میں سے جس شہر کو پناہ دہی کا حق سلیوکس ثانی کالینی کس (۲۴۶ ق م-۲۲۶ ق م) سے حاصل ہوا۔ وہ ارادوس (ارواد) تھا۔ جو لاذقیہ اور سلیوکیہ کا زبردست حریف تھا[2]۔ یہ حق حاصل کر کے ارواد نے چاندی کے سکے وسیع مقدار میں تیار کر لیے۔ صور کو سکندر بہت بری طرح برباد کر چکا تھا۔ اس نے یہ حقوق انیٹاکس رابع فینز سے حاصل کیے اور ۱۲۵ ق م سے کاملاً خود مختار ہو گیا۔ اس نے بھی بڑی مقدار میں سکے تیار کیے۔ کبھی کبھی سنہری سکے بھی تیار کیے جاتے تھے۔ ان کے ایک طرف یونانی زبان میں مقدونوی بادشاہوں کی برتری تسلیم کی جاتی تھی، دوسری طرف فونیقی میں آزادی و خود مختاری کا اظہار کیا جاتا تھا۔ پھر طرابلس، ببلوس، صیدا اور عکہ نے بھی اسی طرح آزادی حاصل کی۔ ان کے علاوہ مراتھوس اور بیروت نے بھی دو ہی زبانوں میں سکے جاری کیے اور ان پر سلوکی بادشاہوں کے چہرے بنائے جاتے تھے[3]۔ داخلی طور پر خود مختار شہری ریاستوں کی حیثیت میں یہ مقامی جھگڑے خود ہی طے کر لیتیں اور شاہی عدالت کی طرف رجوع نہ کرتیں۔ ایک موقع پر ارواد نے اپنے قریبی مدمقابل میراتھوس کو تباہ کر دیا اور اس کے املاک اہل ارواد میں تقسیم ہو گئے[4]۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کہ میراتھوس بہت جلد پھر بحال ہو گیا۔

---

[1] ایم راسٹرزلیف کی کتاب The Social & Economic History of The Hellenistic World

[2] سٹرابو جلد ۱۶ باب ۲۔ [3] بیون جلد اول صفحہ ۲۲۹۔

[4] سٹرابو کتاب ۱۶ باب ۲۔ راسٹرزلیف صفحہ ۸۴۷۔

Marfat.com

تاہم اب فونیقی خود مختاری کی حیثیت پہلے جیسی نہ تھی۔ نشتر باقی تھا اور مغز رخصت ہو چکا تھا۔ وہ محرک قوت، جسے جی چاہے قومی جذبہ کہہ لیجیے اور جی چاہے تو شہریت کا فخر و غرور کہیئے، باقی نہیں رہی تھی۔ قدیم روایات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہو چکی تھیں، ساتھ ہی وہ محرک روح بھی کم از کم عارضی طور پر زائل ہو گئی، جو تمام فونیقی سرگرمیوں کی طغرائے امتیاز تھی۔

## سلوکیوں کا آخری دور

سلوکیوں کی حکمرانی کے آخری ایک سو سال ہنگاموں، خانہ جنگیوں اور مختلف مدعیان سلطنت کے رزم و پیکار کی دردانگیز کہانی ہیں اس بدامنی اور بدنظمی سے لبنان کو بھی حصہ ملا۔ سلوکیوں کو بھی اپنے پیشروؤں کی طرح پہاڑی علاقوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جہاں جہاں سلوکی قوت کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی، وہاں صرف یہودی نہیں بلکہ جنوبی حاشیے کے نبطی، جنوبی و مشرقی سرحد کے پارتھی اور جنوبی و مشرقی سرحد کے عرب بھی پیش قدمی کر رہے تھے۔ ۸۵ ق۔م کے آس پاس ایک عرب قبیلہ اپنے شیوخ کو نئی ریاست کے حکمران بنانے میں کامیاب ہو گیا، جس کا مرکز حمص تھا اور جو برائے نام انطاکیہ کے تابع تھی۔ ایک اور قبیلے نے جو نسلاً عرب تھا لیکن ارامی زبان بولتا تھا، نشیبی شام میں قدم جما لیے۔ چالسس (طنجر) اس کا مستحکم مقام تھا[1]۔ یہ اتوریوں کا قبیلہ تھا۔ اتوریہ میں بعض اوقات مشرقی لبنان، حوران اور فلسطین بھی شامل ہوتے رہے[2]۔ ایسے مواقع پر اتوریوں نے ساحل لبنان پہنچنے کی بھی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے صیدا اور تھیوپروسوپون[3] کے بعض حصے پامال کیے۔ یہ وہی ڈھالو مقام ہے جو اب راس الشقعہ کہلاتا ہے اور بطرون[4] کے شمال میں واقع ہے۔ بیروت اور ببلوس کی فصلیں تباہ کیں۔ اس وجہ سے انہیں پیشہ ور قزاقوں کا لقب دے دیا گیا۔ دوسرے فونیقی شہر بھی ان حاکموں کی سرکردگی میں خود مختاری حاصل کر رہے تھے، جنہیں کلاسیکی مصنف "مستبد" قرار دیتے تھے۔ اس طرح شام کے اجزا تحلیل ہو رہے تھے۔

## شاہ آرمینیا اور پومپے

اس اثنا میں ایک دشمن نے غیر متوقع سمت سے حملہ کر دیا۔ یہ آرمینیا کا بادشاہ تگرانس[5] تھا۔ اس نے رومیوں اور پارتھیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھایا اور اپنے خسر متھراڈیٹیز (مہرداد) شاہ پانٹس (بحیرہ اسود کا جنوبی و مشرقی کنارہ) سے اتحاد کر لیا اور عراق و مادہ کو پامال کر ڈالا۔ ۸۳ ق۔م میں اس نے شمالی شام اور سلیشیا دونوں پر

---

[1] چالسس یونانی میں تانبے کو کہتے ہیں، یہ غالباً زوبہ ہے جو ایک قدیم ارامی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ [2] لوقا کی انجیل باب ۳، آیت ۱۔ [3] Theoprosopon [4] سٹرابو کی کتاب ۱۶ باب ۲ [5] Tigranes

قبضہ کرلیا[51] اور ان حصوں کی آبادی کمزور سلوکی حکمرانوں کے مقابلے میں ارمنیوں سے زیادہ قریب تھی۔ اہل شام کو داخلی کشمکشوں اور حکمران خاندان کے باہم جدال و قتال نے بالکل تھکا دیا تھا۔ وہ اس قابل نہ تھے کہ مزاحمت کرسکیں بلکہ یونانی شہروں نے بھی تگرانس کی پیش قدمی کا اس وجہ سے خیر مقدم کیا کہ از سر نو طبعی زندگی بسر کرنے کا امکان نظر آتا تھا۔ غرض سب نے نئی حکومت تسلیم کرلی تگرانس نے شام سے ساحلی شہروں پر حملے شروع کردیے اور وہ عکہ پہنچ گیا (سنہ ۶۹ ق،م) جسے اس زمانے میں بطلیموس اول کے نام پر بطلیموسیہ کہتے تھے۔ تگرانس اپنے آپ کو شاہنشاہ کہتا تھا۔ اس کے عہد میں ارمنی سلطنت انتہائے عروج پر پہنچ گئی۔ اسی زمانے میں متھراڈیٹیز النیاے کوچک کے رومیوں کے صوبوں کو یکے بعد دیگرے ہتھیانے لگا۔[52] آخر رومی عساکر نے ان کا تعاقب کیا اور اسے ملک سے نکال باہر کیا۔ داماد نے اسے (متھراڈیٹیز کو) اپنے پاس پناہ دے دی اور رومیوں کے حوالے کردینے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس پر رومہ نے تگرانس کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور اسے اپنی تمام فتوحات سے دستبردار ہونا پڑا (سنہ ۶۹-۶۸ ق،م) چنانچہ انطاکیہ کے ضلع پر پھر ایک سلوکی حکمران قابض ہوگیا یعنی انٹیاکس ثالث عشر ایشیاٹیکس، جس کے عہد حکومت (سنہ ۶۹-۶۵ ق،م) میں سلوکی خاندان کے ایک مدعی تاج و تخت فلپ ثانی (سنہ ۶۵-۶۴ ق،م) نے جنگ جاری رکھی۔ اس خاندان کے یہ دو آخری آدمی تھے جن کی پیشانیاں تاج سے مزین ہوئیں۔ سنہ ۶۴ ق،م میں گرم جوش رومی سالار پمپے نے پانٹس پر قبضہ کرلیا۔ متھراڈیٹیز بھاگنے پر مجبور ہوا۔ تگرانس کو صلح کرنی پڑی اور اس نے تمام مفتوحہ علاقے چھوڑ دیے ان میں شام بھی شامل تھا۔ اسی سال رومیوں نے فونیقیہ پر قبضہ کرلیا۔ آئندہ سال فلسطین مسخر ہوگیا۔[53] اب ایک نیا اور طویل دور حکومت شروع ہوا۔ یہ رومیوں کا دورِ حکومت تھا۔

---

[51] اپیان کتاب ۱۱ باب ۴۸۔ [52] سٹرابو کتاب ۱۶ باب ۲۔
[53] جوزیفس اینٹی کوئیٹیز کتاب ۱۴ باب ۴ ۔ اپیان کتاب ۱۱ باب ۷۰-۵۰۔

Marfat.com

Marfat.com

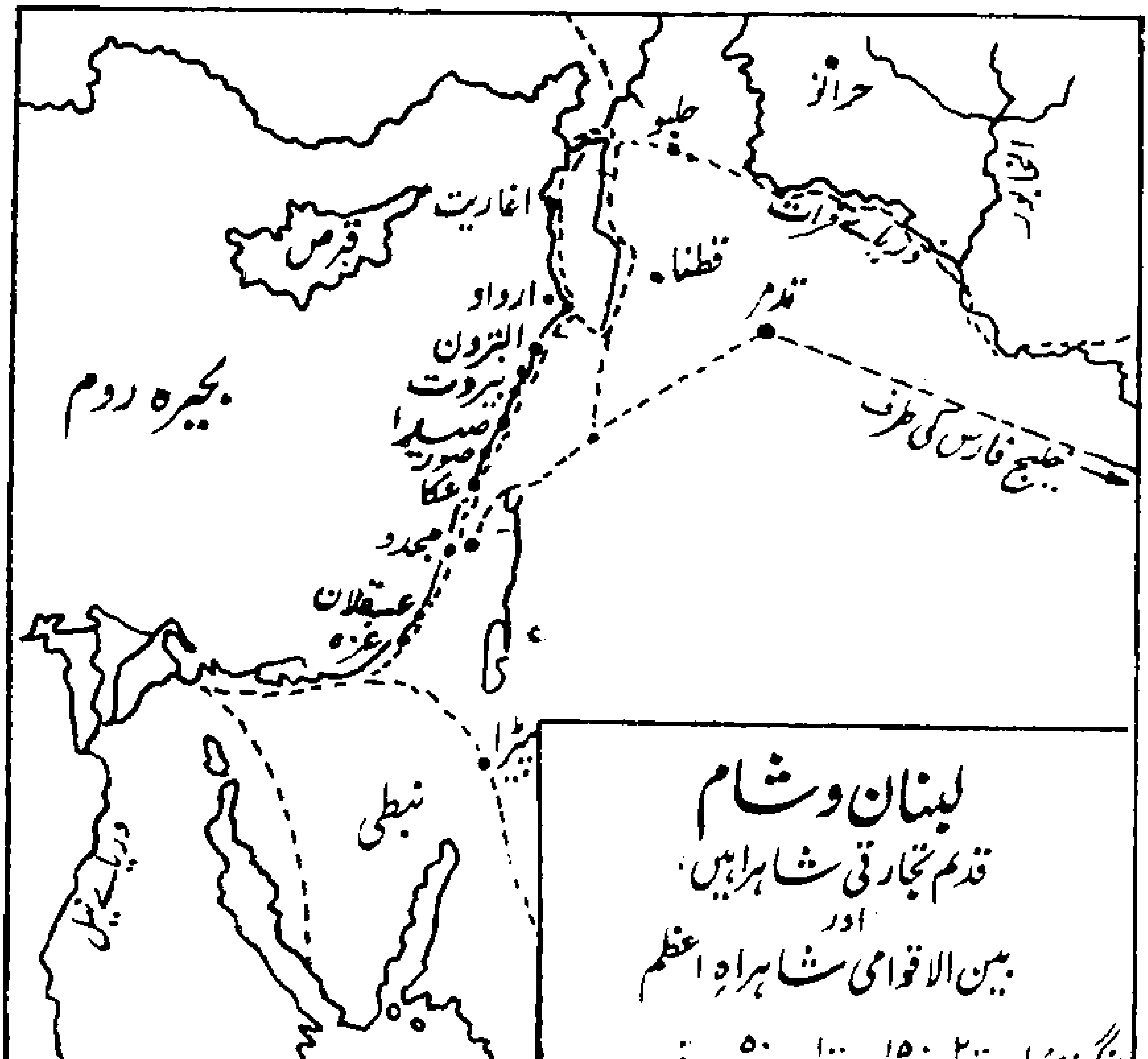
لبنان وشام
قدیم تجارتی شاہراہیں
اور
بین الاقوامی شاہراہ اعظم
انگریزی میل
۵۰ ۱۰۰ ۱۵۰ ۲۰۰
شاہراہ اعظم
حران
جلبو
اغاریت
قبرص
قطنا
ارواد
تدمر
البترون
بیروت
صیدا
صور
عکا
مجدو
عسقلان
غزہ
بحیرہ روم
دریائے فرات
خلیج فارس کی طرف
پیٹرا
نبطی
دریائے نیل
سبا

Marfat.com

# بارھواں باب

## اقتصادی اور ثقافتی پہلو

**عمومی کیفیت** سلوکی سلطنت دنیائے یونانیت ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس دنیا میں جغرافیائی اتصال اور علمی زبان کے اشتراک کے باعث ایک حد تک ثقافتی یکسانی موجود تھی۔ سکوں اور ناپ تول کے نظام عموماً یکساں تھے۔ سلوکی دائرۂ سلطنت میں عموماً وہی وسائلِ آمدورفت کا وہی نظام تھا، جو ساسانیوں کے عہد میں جاری ہوا تھا۔ اسے نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ اس کی اصلاح ہوئی۔ اس وجہ سے تجارت و صناعت کی ترقی کو تقویت پہنچی۔ سلوکیوں کی اپنی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان اور وسط ایشیا کا تجارتی سامان شام و لبنان پہنچے۔ اس سے مقامی لوگ بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا جائے۔ اس طرح مغربی علاقوں کے رہنے والے یونانیوں اور رومیوں سے تجارتی و صنعتی تعلقات بڑھ جائیں۔

**تجارت** مختلف ملکوں سے سامان پہنچتا تھا، مثلاً مشرق بعید سے ریشم، وسطی ایشیا سے بیش قیمت جواہرات، ہندوستان سے سیاہ مرچ اور دارچینی، عرب سے مُر اور لوبان۔ یہ چیزیں کسی زمانے میں عیش و راحت کا سامان تھیں، لیکن اب ضروریاتِ زندگی میں شامل ہو گئی تھیں۔ ساتھ ساتھ غلاموں کی تجارت میں بھی اضافہ ہوا۔ یونانی ریاستوں اور بیرونی دنیا میں اس تجارت کو بڑا فروغ حاصل تھا۔ پے در پے لڑائیاں ہوتی تھیں، جن میں جنگی قیدی پکڑے جاتے تھے۔ اس طرح تجارت کے لیے تازہ مال بکثرت ملتا رہتا تھا۔ بحری قزاق بھی مختلف لوگوں کو بے خبری میں پکڑ کر لے آتے تھے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ یونانی دنیا میں تجارت کے اضافے اور نفع اندوزی ہی نے رومیوں کی حرص پر تازیانے کا کام کیا اور تسخیرِ مشرق کی خواہش ان کے دلوں میں اُبھر آئی۔

تجارتی راستے وہی تھے، جو ماضی بعید سے چلے آتے تھے۔ قافلے جنوب ــــ مصر، پیٹرا، فلسطینی ساحل ــــ سے چل کر ساحل کے ساتھ ساتھ فونیقیہ میں سے گزرتے۔ ان کی پہلی منزل

Marfat.com

مقصود سلوکیہ ہوتی یا انطاکیہ یا وہ مجدو یا صور سے دمشق کی طرف پلٹ جاتے اور اس سلسلے میں قدیم بین الاقوامی شاہراہ سے گزرتے۔ جو قافلے فونیقیہ کے شہروں سے چلتے، وہ ساحلی راستے سے شمال کی طرف لاذقیہ چلے جاتے یا مشرق کی طرف پلٹ کر حمص پہنچ جاتے۔ اگر وہ شمال کا رخ کرتے تو صور کے قریب مشرق کی جانب پلٹ کر نشیبی شام سے ہوتے ہوئے اندرون ملک کے مراکز میں چلے جاتے۔ شمالی شام میں یہ شاہراہ دو شاخوں میں بٹ گئی تھی۔ مغربی جانب کی شاخ ایشیائے کوچک کو چلی گئی تھی اور مشرقی جانب کی شاخ دو آبۂ دجلہ و فرات اور ایران میں سے ہوتی ہوئی "شاہراہ ریشم" پر پہنچ جاتی اور ہندوستان، چین اور مشرق بعید پر منتہی ہوتی ؛

## زراعت اور صنعت وحرفت

سلوکی عہد کے شام و لبنان تجارت گزراں کے تعلق میں مصر کے زبردست حریف تھے۔ سکندریہ کی وجہ سے مقابلہ بہ طورِ خاص سخت ہو گیا تھا۔ پھر ایک نہر از سر نو جاری کر لی گئی تھی۔ جس نے دریائے نیل کی ایک شاخ بحیرۂ قلزم کے سرے سے ملا دی تھی۔ گویا یہ نہر، نہر سویز کی پیشرو تھی۔ اس کی وجہ سے مصر کی تجارت کو بڑی تقویت پہنچی اور سلوکی علاقے سے تجارتی مال اس طرف جانے لگا۔ کلاسیکی مورخوں کا بیان ہے کہ بطلیموس ثانی فلاڈلفس (۲۸۵ ق م-۲۴۶ ق م) نے بندرگاہ سکندریہ کے جزیرۂ فروس میں شہرۂ آفاق منارہ (لائٹ ہاؤس) تعمیر کرایا تھا اور نیل و سویز کو ملا دینے والی نہر میں ایک بند بھی بنوایا تھا (تاکہ کشتیاں اور جہاز بہ سہولت آ جا سکیں)۔ ان منصوبوں کے باعث مشرقی بحیرۂ روم میں مصر کا بحری اقتدار بہت بڑھ گیا ؛

یونانیت کے دور میں شام، لبنان اور مصر کی زرعی اور صنعتی پیداوار میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ نئے پودے اور درخت لگائے گئے۔ بعض پودوں میں مشرق و مغرب کے درمیان مبادلہ ہوا مثلاً پستہ ایران سے شام پہنچا، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اور جہاں اب بھی یہ بکثرت ہوتا ہے۔ وہاں سے یونان داخل کیا۔ انگوری شراب اور زیتون کے تیل کی صنعت زیادہ ترقی کر گئی۔ لکڑی کی صنعت کم از کم اس درجے پر ضرور تھی، جس درجے پر فرعونوں کے زمانے میں تھی۔ مصر میں جنگل تھے ہی نہیں اور بطلیموسی حکمران اپنی بحری قوت بحال رکھنے کے لیے لبنان سے لکڑی لیتے تھے۔ لبنانی جنگلات سے فائدہ اٹھانا بادشاہوں کا مخصوص حق تھا۔ تاہم یہ اجارہ داری صرف سرو، دیودار اور صنوبر تک محدود تھی۔ پارچہ بافی کے دائرے میں فونیقیہ کی برتری قائم رہی۔ ارغوانی رنگ کے کپڑوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ فونیقی صناع یہ رنگ رنگنے میں اپنی شہرۂ آفاق ہنرمندی سے

Marfat.com

ضرور کام لیتے رہے بلکہ مذاق کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ رنگ بھی تبدیل کرتے جاتے تھے تاکہ خریداری کا حلقہ وسیع تر رہے۔ عمورا اور صیدا کے بلوری سامان کی بہت مانگ تھی اور یہ بڑی قیمت پاتا تھا۔ رومیوں کے عہد تک یہ دو شہر دنیا بھر کی منڈیوں میں زیادہ تر بلوری ظروف پہنچاتے تھے اور ان کی ساحلی ریت بلور بنانے کے لیے بہت موزوں تھی۔ یہ شہر اور اس کے دوسرے ہمسر جو سامان بنا کر دساور بھیجتے تھے، وہ ڈھالا جاتا تھا۔ آبگینہ سازی کا فن پہلی صدی قبل مسیح کے اواخر میں ایجاد ہوا[۱]۔ آبگینے ابتدا میں مصر کے بجائے فونیقیہ کے اندر زیادہ رائج تھے یہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ یہ فن مصر میں ایجاد نہیں ہوا تھا +

معدنی مصنوعات کے فن نے بے اندازہ ترقی کی۔ بیروت کے حوالی میں خام لوہا بکثرت موجود تھا۔ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے یہ دھات بہت بیش قیمت تھی۔ بطلیموسیوں نے صرف لبنان کی معدنیات آہن ہی سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ تانبا بھی نکالا۔ ایک اور صنعت، جس نے اس زمانے میں امتیازی درجہ حاصل کیا، پیپرس کی تیاری تھی، جو چرمی کاغذ کے ساتھ تحریر کے لیے مٹی کی تختیوں کی جگہ لے رہا تھا۔ مصر اور اس کے بعد فلسطین دنیا بھر کی منڈیوں کے لیے پیپرس بہم پہنچاتے تھے۔ ہمارا لفظ بائیبل ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے، جس کے معنی پیپرس ہیں۔ یہ لفظ فونیقی شہر بلوس (جسے اب جُبیل کہتے ہیں) سے لیا گیا، جہاں سے پیپرس باہر بھیجا جاتا تھا۔ فونیقیہ سے پیپرس کی صنعت یونان پہنچی اور چھٹی صدی قبل مسیح تک یہ وہاں خوب رائج تھی +

## نو آبادیاں

بطلیموسیوں اور سلوکیوں کے ماتحت تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں نے نو آبادیاں قائم کرنے کا فونیقی جذبہ از سر نو تازہ کر دیا۔ ۲۵۰ ق، م کے آس پاس صیدا نے جنوبی فلسطین میں میریسہ[۳] نام ایک نو آبادی قائم کی۔ یہ بطلیموسیوں کے زمانے میں بڑا خوشحال تجارتی شہر تھا، لیکن مکابیوں کے ماتحت اسے نقصان پہنچا۔ یہ ان ادومی قصبوں میں سے تھا جس کے مردوں نے ۱۲۶ ق، م کے آس پاس جلاوطن ہونے کے بجائے یہودیت قبول کرتے ہوئے ختنہ کرا لیا تھا[۴]۔ شکیم کے صیدانیوں نے مکابیوں کی بغاوت کے دوران میں اجازت مانگی

---

۱؎ ملاحظہ ہو سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲، پلینی کتاب ۵، باب ۱۷ + ۲؎ راستوزلیف کی کتاب صفحہ ۶۹۸ +
۳؎ Marisa بائبل میں اسے مرشیہ کہا گیا ہے۔ دیکھو یشوع باب ۱۵، آیت ۴۴۔ اسے تل سندحنہ سمجھا گیا ہے، جو بیت جبرین سے ایک میل جنوب میں ہے + ۴؎ جوزیفس انٹی کوٹیز کتاب ۱۳ باب ۱۹ +

تھی کہ کوہ جنزیزیم میں جو سامری معبد ہے، اسے جوپیٹر کا معبد بنا لیا جائے۔ یہ لوگ بظاہر یونانیت آب فونیقی تھے[1]۔ بیروت کے تجارتی تعلقات بحیرۂ ایجیر کے جزیروں سے بہت زیادہ تھے۔ وہاں کے باشندوں کی ایک نوآبادی روڈس میں تھی۔ جزیرہ روڈس شرق و غرب کی بحری تجارت کے راستے پر واقع تھا اور ایک خاص مُدت کے لیے ممتاز تجارتی مرکز تھا۔ پوسیڈن (یونانیوں کا بحری دیوتا) فونیقی شہروں کا سرپرست دیوتا تھا۔ روڈس کی نوآبادی بھی اسی دیوتا کے نام پر قائم کی گئی تھی اور وہاں اس کا ایک معبد بھی تھا جس کے ملحقہ حجروں اور برآمدوں میں فونیقی تاجروں کا سامانِ تجارت رکھا جاتا تھا۔ ایک اور جزیرے ڈیلاس میں اہل بیروت کو تجارتی، مجلسی اور مذہبی حلقوں میں اطالویوں کے بعد دوسرا درجہ حاصل تھا اس جزیرے میں اپولو دیوتا کے نام پر ایک معروف مقدس موجود تھا۔

## ثقافت وتہذیب

ایشیائے کوچک کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد لبنان نے مغربی ایشیا کی تمام دوسری سرزمینوں سے پہلے یونانی دنیا کے ساتھ تہذیبی اور تجارتی تعلقات قائم کر لیے تھے اور انھیں بحال رکھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے تک لبنانی اپنی قومی روح کھو چکے تھے، تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی و سامی تہذیبی امتزاج کے لیے سہولت پیدا ہو گئی، لہٰذا جس یونانیت نے لبنان میں جڑ پکڑی، وہ ہمسایہ ارامی شہروں سے پیشتر یہاں پہنچ چکی تھی۔ اگرچہ شام میں یونانیوں کی کئی نوآبادیاں تھیں، مثلاً انطاکیہ، اس کی بندرگاہ سلوکیہ (سلوقیہ)، لاذقیہ، افامیہ، جو دریائے عاصی پر واقع ہے (قلعۃ المضیق) لیکن لبنان میں یونانیت زیادہ قوی، سرگرم اور نتیجہ خیز رہی۔ لبنان کی آبادی میں یونانی عنصر زیادہ نہیں ہو سکتا تھا، صرف عسکری، تاجر، فنکار اور اہل علم ساحل کے ساتھ ساتھ تھوڑی تعداد میں بکھرے ہوئے تھے۔ سلوکیوں نے لبنان میں بہت کم نوآبادیاں قائم کیں۔ لاذقیہ لبنان جیسے سکوں پر لاذقیہ کنعان بتایا گیا ہے، سلوکس اول نے اس مقام پر قائم کی تھی، جہاں زمانہ قدیم میں قدیش (برلب دریائے عاصی)[2] واقع تھا (تل النبی مند) اور اسے لاذقیہ لبنان اس لیے کہا گیا کہ لاذقیہ بندرگاہ سے یہ ممتاز ہے۔ سلوکی خاندان کے ایک غاصب ٹرائفون نے انیٹیاکس سابع کے ساتھ کش مکش کے دوران میں بیروت کو برباد کر دیا (۱۴۰ء ق م) اور اپنے نام کے

---

[1] جوزیفس اینٹی کوئٹیز کتاب ۱۲، باب ۵۔
[2] ایپل جلد اول صفحہ ۱۲۸، بوشے لکلرق صفحہ ۳۴، کک صفحہ ۳۵۰، ۳۵۱۔

Marfat.com

ساتھ ایک یونانی لفظ لاؤڈیسیا[1] کا اضافہ کرلیا۔ لاؤڈیسیہ سلوکس اوّل کی ماں کا اصلی نام تھا۔ سلوکی شاہی خاندان میں یہ نام بہت ہردلعزیز رہا۔ فونیقی شہروں نے بھی یونانی شہروں کی نقل میں تھیئٹر، حمام، ورزش گاہیں اور دوسرے ادارے رفتہ رفتہ اختیار کرلیے۔ یہی ادارے معاشرے کے کمال کے لیے اظہارِ فکر و نظر کا ذریعہ تھے۔ یونانیوں ہی کی پیروی میں ان شہروں نے بعض اہم تاریخی وقائع کو بعد کی تقویم کے لیے عنوان بنالیا۔ چنانچہ ارواد نے اپنی تقویم کا آغاز ۲۵۹ ق، م سے کیا، بیرت نے ۱۹۷ ق، م سے، صور نے ۱۲۶ ق، م سے۔ صور کے علاوہ متعدد شہروں نے یونانی جشن منانے شروع کیے۔ یونانی زبان اور تہذیب نے فاتحین کے میل جول سے مفتوحوں کی نظروں میں خاص شان و شکوہ حاصل کرلیا۔ یونانی تہذیب کی مطلق برتری اور ساتھ ہی یونانی ادبیات کی بلندی مسلّم مان لی گئی۔ انطاکیہ اور لاذقیہ کی طرح صور و صیدا میں بھی یونانی فلسفہ، سائنس اور ادبیات کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ سلوکیوں کے آخری دور کا تعلیم یافتہ فونیقی یونانی شہروں میں جاتا ہوگا تو کوئی اجنبیت محسوس نہ کرتا ہوگا۔ یونانی کسی فونیقی شہر گاہ میں آتا ہوگا تو اس کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ فونیقی یا شام کے ارامی اپنی سامی خصوصیات کھوچکے تھے۔ ارامی اسی طرح شام کی عام بولی رہی، جس طرح کنعانی لبنان کی عام بولی تھی۔ خصوصاً دیہاتی علاقوں کے متعلق تو یہ بیان بالکل درست ہے۔ شہری حلقوں میں بھی تعلیم یافتہ مقامی آدمی دو زبانیں ضرور جانتے تھے۔ گھروں میں اور عام کاروبار کے سلسلے میں وہ سامی بولی سے کام لیتے تھے، علمی مقاصد کے لیے یونانی استعمال کرتے تھے۔ البتہ یونانی نو آبادیوں میں صرف یونانی بولی جاتی تھی۔ عام لوگوں پر یونانیت کا رنگ غالباً اس سے زیادہ نہیں چڑھا تھا، جتنا آج کل کے لبنانیوں پر فرانسیسیت کا رنگ چڑھا ہے۔ بطلیموسیوں اور سلوکیوں کے ماتحت لبنان میں ارامی زبان نے کنعانی کی جگہ دیسی بولی کی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ کنعانی زبان ہی کی ایک بہن تھی اور تجارتی کاروبار میں اس نے غیر معمولی ترقی کرلی تھی۔ یہ تمام سمتوں میں پھیل گئی، خصوصاً مشرقی سمت میں، جہاں یہ ایرانی سلطنت کی دو سرکاری زبانوں میں سے ایک تھی، لیکن عوامی دستاویزوں میں فونیقی کا رواج سن عیسوی سے تھوڑی دیر قبل تک رہا۔ معبدوں کی درس گاہوں میں اس زبان کا مطالعہ چوتھی صدی عیسوی تک بھی ہوتا تھا جب مسیحیت ہر طرف پھیلی۔ واقعہ یہ ہے کہ فونیقیت بالکل معدوم نہ ہوئی۔ آج ایسے آدمی موجود ہیں، خصوصاً مارونی، جو پرانے بھوتوں کو تو نہیں اٹھاتے، لیکن اپنی ابتدائی میراث پر مزید زور دیتے ہیں اور دنیا کی

---

[1] Laodicea، سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۱۹۔

Marfat.com

ترقی میں اس نے جو کردار ادا کیا ہے، اس پر فخر کرتے ہیں۔ یونانی تارکینِ وطن نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برازیل میں جو مجلسی اور ادبی کلب قائم کیے، ان کے نام فونیقی رکھے +

مزید یہاں واضح رہنا چاہیئے کہ تہذیبی تعامل یک طرفہ نہیں تھا۔ یونانیوں پر مشرقیت کا اور مشرقیوں پر یونانیت کا رنگ چڑھا۔ یونانیوں نے سامی دیوتاؤں کو اپنا لیا۔ بعل زیوس بن گیا۔ ملکرت کو ہرقل بنا لیا گیا۔ تموز واشتارات کے پُراسرار اجزاء ایڈونس اور افروڈائٹ کے اجزاء بن گئے۔ آخری دور کے بعض سلوکی بادشاہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ سامی ناموں کا اضافہ کر لیا۔[51] یونانی دنیا کی مشرقیت آبائی بھی ویسی ہی حقیقی تھی، جیسی مشرقیوں کی یونانیت آبائی +

## فلسفی اور شاعر

سلوکیوں کے عہد میں شام و لبنان کے فونیقی و ارامی ادب کی شاید ہی کوئی چیز باقی رہی ہو۔ یونانی شاعری کے سامنے مقامی ادبی سرگرمیاں احساسِ پستی کے باعث سمٹ کر تقریباً درجۂ صفر پر پہنچ گئیں، لیکن ہم مان سکتے ہیں کہ اس عہد کے بہت سے مصنف، جو یونانی میں قلمکاریاں کرتے رہے اور ان کے نام بھی یونانی تھے، وہ اصلاً شامی یا لبنانی تھے۔ ان کے نام بھول گئے۔ اسی طرح آج کل کے متعدد لبنانی مصنف، جن کے نام فرانسیسی یا فرانسیسی نما تھے، یہاں تک کہ ان کے اصل عربی نام معلوم کرلینا مشکل ہے، فرانسیسی زبان میں کتابیں تصنیف کرتے رہے بلکہ شعر بھی اسی زبان میں کہے۔ رواقیت کا بانی زینو سلوکی دور میں یونانیت آب لبنان نے کوئی ممتاز سائنس دان پیدا نہ کیا، البتہ کچھ شاعر ضرور پیدا ہوئے، جن میں سے کوئی بھی اوّل درجے کے شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور خاصی بڑی تعداد فلسفیوں کی پیدا ہوئی، جن میں سے اکثر کا تعلق رواقی دبستان سے تھا۔ رواقیت ابتداء ہی سے شامی تصوّرِ حیات کے لیے خوشگوار ثابت ہوئی بلکہ اس کا بانی قبرص کا فونیقی تھا یعنی زینو (تقریباً ۳۳۳ ق، م ۔ ۲۶۱ ق، م)[52] زینو سٹیم میں پیدا ہوا، جو قبرص کی فونیقی نو آبادی تھا اور معاصرین اسے فونیقی ہی سمجھتے تھے۔ تیس سال کی عمر تھی، جب وہ ارغوانی پارچات کے ذخیرے کے ساتھ فونیقیہ سے جہاز پر سوار ہو کر پرایوس (یونان) روانہ ہوا۔ راستے میں جہاز تباہ ہو گیا۔ زینو ایتھنز چلا گیا، جو اس زمانے میں فلسفے کا سرچشمہ تھا۔ وہاں ایک عوامی ایوان میں، جسے منقش رواق کہتے تھے، فلسفے کا درس شروع کر دیا (۳۰۲ ق، م)۔ اسی رواق سے اس کے دبستانِ فلسفہ کا نام رواقی پڑ گیا۔ وہ غذا اور لباس میں زہد و اقتصاد پر عمل پیرا تھا۔ اس کا جسم کمزور تھا۔ جلد گندمی، چہرے پہ

---

[51] دیکھیے حتی کی تاریخ شام صفحہ ۲۵۶ +

[52] اس کا استاد ایک سقراطی فلسفی تھا، جو میدا کا باشندہ تھا۔ اس کا نام بھی زینو تھا +

Marfat.com

شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور پچکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سر ایک جانب خمیدہ رہتا تھا۔ وہ سبز انجیر کھانے اور دھوپ تاپنے کا بڑا شائق تھا۔[1] مقدونیہ کا بادشاہ اینٹی گونس (سکندر کے مشہور سالار کا پوتا) بھی اس کے فداکار شاگردوں اور مداحوں میں سے تھا۔ اینٹی گونس بادشاہوں میں سے پہلا شخص تھا جسے فلسفی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ جب کبھی ایتھنز آتا، اپنے استاد کے لیے گراں بہا تحفے لاتا، لیکن زینوان تحائف سے ہمیشہ استغنا برتتا اور یہی طرز عمل اس کی تعلیم کے اعتبار سے موزوں تھا۔ اسے بار بار بہ اصرار مقدونیہ کے دارالحکومت پیلا آنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن اس نے کوئی دعوت قبول نہ کی۔ عہد جوانی میں زینو نے ایک مشہور رسالہ "جمہوریت" کے نام سے لکھا تھا، جس میں اپنے خیال کے مطابق ایک مثالی حکومت کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قومی حدیں کوئی نہیں رکھی گئی تھیں۔ تمام آدمیوں کو یکساں شہری مانا گیا تھا۔ بیویوں اور جائدادوں کو مشترک قرار دیا گیا تھا۔ اس ابتدائی خیالی نقشے کی بنا پر امید تھی۔ کہ مختلف قوموں کے درمیان مصالحت ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ امید موہوم سی تھی۔ البتہ مقصد ایسا تھا۔ جس کے لیے نیک نہاد آدمی برابر کوشش کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ فونیقی فلسفی اس نئی دنیا کی پیداوار تھا۔ جو سکندر کی فتوحات اور کارناموں نے پیدا کی تھی۔

زینو نے علم یا فلسفے کا ایک جامع نظام پیش کیا۔ جس میں طبیعیات کو بنیاد قرار دیا گیا۔ منطق کو آلہ کار بنایا۔ اور اخلاقیات کو مقصد و نصب العین رکھا۔ اس کا اخلاقی نظریہ یہ تھا کہ خیر ہی حقیقی نیکی ہے، اور شر اخلاقی لغزش کے سوا کچھ نہیں۔ دکھ درد، افلاس اور موت میں سے کوئی بھی چیز قابل توجہ نہیں، لہٰذا دانشمند وہ ہے جس کے تمام اعمال اچھے ہوں۔ کوئی آدمی اسے اس متاع خیر سے محروم نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ ہمیشہ خوش اور مطمئن رہے گا۔ اس طرح ایک خیالی دانشمند آدمی کو نصب العین بنا کر اس کے حصول کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ یہ جان لینا بہت آسان ہے۔ کہ ایسا فلسفہ اس عہد کے دور مصائب میں لوگوں کو کس طرح اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اخلاق کے بین الاقوامی تصور کے ساتھ یہ اولین یونانی نظام تھا۔ اور عموماً مسیحیت سے پیشتر کی دنیا کا نہایت اعلیٰ اخلاقی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام نے پولوس رسول کو متاثر کیا اور اس کے ذریعے سے مسیحیت کے لیے یہ پائدار قوت بن گیا۔ اہل ایتھنز نے زینو کی زندگی میں اسے سنہری تاج پہنانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ مرا تو اس کا عام سوگ منایا گیا اور یادگار کے طور پر اس کا ایک برنجی بت نصب کیا گیا۔[2] دور حاضر کے ایک صاحب قلم نے زینو کو "اپنے عہد کا شریف ترین" آدمی قرار دیا۔ اس کی لوح تربت پر جو تحریر کندہ تھی۔ اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے۔

---

[1] ڈائیوجینز لارٹیس کی کتاب ۷" مشہور فلسفیوں کے سوانح حیات"

[2] ولیم ڈبلیو ٹارن "اینٹی گوناٹاس" صفحہ ۳۰۹۔ نیز ڈائیوجینز کی کتاب ۷

"اور اگر تیرا اصل وطن فونیقیہ تھا
تو اس سے تیری قدر و منزلت میں کیا کمی آسکتی ہے؟ کیا کیڈمس وہیں سے نہ آیا
جس نے یونان کو کتابیں دیں اور فنِ تحریر عطا کیا"[51]

دو اور فونیقی فلسفیوں نے رواقیت کے نشوو ارتقا میں حصہ لیا۔ ایک صیدا کا بوئیتھس[52] (دوسری صدی قبل مسیح) دوسرا عور کا اینٹی پیٹر (۹۵ ق، م ۔ ۴۶ ق، م)۔ بوئیتھس نے وحدتِ وجود کا عقیدہ رد کر دیا اور کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا، جن میں سے ایک عالمِ علوی تھا۔ یہ عالم ثوابت کے محوروں پر مشتمل تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو علمِ ہیئت کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا اور یہ علم رواقی نظام کا لاینفک جزو بن گیا۔ اینٹی پیٹر نے رومی محبِ وطن اور فلسفی کیٹو یوٹی سنس[53] (یوٹی کا باشندہ، جو شمالی افریقہ میں ہے) کو رواقیت سے آشنا کیا۔ عور کا ایک اور فلسفی ڈایوڈورس ایتھنز میں مشائی دبستان کا رئیس بن گیا اور ۱۱۰ ق، م میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔ مشائی دبستان کا نام ارسطو کے مقام خرام پر مبنی ہے۔ ایک اکیڈیمی میں یہ ایک مسقّف مقام تھا، جہاں ارسطو چلتا پھرتا ہوا درس دیتا تھا۔ ڈایوڈورس کا اقتباس سسرو نے بھی دیا ہے[54]۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ خیر نیکی اور عدم رنج کے اجتماع پر مشتمل ہے۔ اس فارمولے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے رواقیوں اور لذتیوں کے نقطہ ہائے نگاہ میں موافقت کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ فلسفہ فکر و روایت کے اعتبار سے سامیت کے بجائے یونانیت سے زیادہ مطابق تھا، تاہم لذتی فلسفے کی حمایت شامیوں اور لبنانیوں نے بھی کی۔ مثلاً صیدا کا زینو[55] ۱۵۰ ق، م میں پیدا ہوا۔ وہ ایتھنز کے لذتی دبستان کا رئیس بن گیا اور سسرو نے بھی اس کے خطبات سنے۔ زینو نے فلسفے کے علاوہ علم الہندسہ کے معانی پر بھی محنت و مشقت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے لبنانی مفکر اور مصنف اپنی سرگرمیوں کے لیے محدود سے وطن کے باہر وسیع دائروں کے خواہاں تھے۔ یہی کیفیت ان کے ہم وطنوں کی آج ہے۔

فونیقیہ کے یونانی ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جسے نمایاں جدت قرار دیا جا سکے۔ ان کی تمام چیزوں میں تنوع ہے، تمثیل و رنگینی کی کمی نہیں، لیکن نفسِ فکر کے اعتبار سے وہ فرومایہ ہیں۔

---

۵۱ ڈایوجینز یونانیت کی تہذیب صفحہ ۳۳۰۔
۵۲ Boett.us، ڈایوجینز کتاب ۷۔ ۵۳ جس کیٹو نے قرطاجنہ کو تباہ کرنے پر زور دیا تھا یہ اس کا پوتا تھا
۵۴ ڈی آریٹور کتاب ۱، باب ۱۱۔ ۵۵ عربی میں اسے زینون کہتے ہیں۔

Marfat.com

ان میں سے متعدد افراد بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بڑے مشّاق تھے۔ یونانیوں کے عوامی شاعروں کی ایک خصوصیت آج بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں عیدا کا ایک شاعر انیٹی پیٹر خاص توجہ کا مستحق ہے۔ وہ عیدا میں پیدا ہوا اور دوسری صدی قبل مسیح کے آخری حصّے میں اس نے شہرت پائی۔ سسرو[1] اسے بدیہہ گو قرار دیتا ہے۔ پلنی[2] کا بیان ہے کہ انیٹی پیٹر کو ہر سال بخار آتا اور یہ حالت اس کی موت تک باقی رہی۔ اس شاعر سے عموماً الواح مزارات اور انتسابات و نذور کی تحریرات لکھوائی جاتیں۔ یونانی مجموعۂ اشعار[3] میں انیٹی پیٹر کے ستّر اقتباسات موجود ہیں۔ اسے خطیبانہ اثر پیدا کرنے کا بڑا شوق تھا اور اس کا اسلوب تحریر زیادہ تر تکلّف، تصنّع اور نمائش پر مبنی تھا۔ یہی اسلوب ہے جو دور زوال کے اور مصنّفوں نے اختیار کیے۔ انیٹی پیٹر ان ان شاعروں سے بخوبی واقف تھا، جو رومی جمہوریت[4] کے ابتدائی دور میں تھے اور ان پر تھوڑا بہت اثر بھی ڈالا۔ یہاں اس کی الواح مزارات کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

"پھر چار بیٹوں کے ماتم سے فائدہ کیا ہے، جب
خود دیوتا بھی اپنے جگر بند دل کو موت کے ناخن
سے نہیں بچاتے[5]"

مندرجۂ ذیل نظم ایک نونیقی بندرگاہ میں اس کے قیام کی یاد تازہ کرتی ہے:

"وقت ہے کہ جہاز چلتا جائے سمندر کے سینے پر
کوئی تاریک طوفان لہروں کے تموّج کے ساتھ حائل نہیں۔
ابابیل چھت میں اپنا گھونسلا بنا رہی ہے
اور مرغزاروں پر نرم و نازک پتے ہنس رہے ہیں۔
ملّاحو! اپنی آبچکاں زنجیریں اٹھالو
وہ لنگر کھینچ لو، جو ریت میں دبے ہوئے ہیں
میری آواز پر اپنے عمدہ بادبان کھول دو
بیکس کے فرزند بندرگاہ کے مالک کا یہی حکم ہے[6]"

---

[1] کتاب ۷، باب ۵۱ ۔ [2] کتاب ۷، باب ۵۱ ۔ [3] کتاب ۷ و کتاب ۱۰ باب ۱۹۴ [4] ای، ایل بوشیرہ "شام رومی صوبے کی حیثیت میں" صفحہ ۱۹۳، یونانی مجموعۂ اشعار کتاب ۷۔

[5] بوشیر صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴، یونانی مجموعۂ اشعار کتاب ۱۰۔

Marfat.com

اسی شاعر سے ہمیں "ہفت عجائبات عالم" کی اوّلین فہرست ملتی ہے یعنی مصر کے اہرام، بابل کے معلّق باغ، کولمپیا میں زیوس کا مجسّمہ، افیسوس میں آرٹیمس کا معبد، ہلی کارناسس میں موسولس کا مقبرہ، روڈس کا کولوسس اور سکندریہ کا مینار۔

اینٹی پیٹر کا فلسفہ بداہتہً لذّتیت کا فلسفہ تھا۔ وہ کہتا ہے: "آؤ، شراب پئیں، حق یہ ہے کہ شراب سفر کے لیے گھوڑے کا کام دیتی ہے اور پیدل چلنے والا سیدھا جہنّم میں جاتا ہے۔"[۱]

ایک غیر شاعرانہ عہد میں ملیاگر ایک اور دلچسپ شاعر تھا (۱۴۰ق م - ۶۰ق م) یہ شخص غدارا میں پیدا ہوا اور زندگی کا بڑا حصّہ صور میں گزارا۔ وہ ارامی اور فونیقی دونوں زبانیں جانتا تھا، لیکن شعر یونانی میں لکھتا تھا۔ اینٹی پیٹر کی طرح وہ بھی بڑا بذلہ سنج تھا اور اپنے دوسرے اہل علم ہموطنوں کی طرح اسے سیاحت کا بھی شوق تھا۔ آخر وہ جزیرہ کوس میں مقیم ہو گیا۔ وہاں اس نے تمام لطائف کا ایک تنقیدی مجموعہ تیار کیا، جس کا نام "ہار" رکھا۔ اس میں پیشتر کے تمام شعرا کی منتخب نظمیں جمع کر دیں اور وہ ایک نظم میں ان تمام شعرا کو پھول یا درخت قرار دیتا ہے۔[۲] یونانی مجموعۂ اشعار میں اس کی ایک سو تیس نظمیں منقول ہیں۔ اور سب عشق و محبّت پر ہیں۔ اس کا اسلوب بھی پُرتکلّف اور پیچیدہ ہے۔ ان نظموں میں اس نے تمام روایتی عاشقانہ تمثیلات سے کام لیا ہے۔ ایک اور نظم میں ملیاگر نے صور کے سات خوب صورت بچّوں کو ہار قرار دیا ہے، جن سے براہِ راست وہ واقف تھا۔ ان بچّوں میں سے ایک کو دلکش سوسن، دوسرے کو خوش بو سفید بنفشہ، تیسرے کو گلاب، چوتھے کو شگوفۂ انگور، پانچویں کو سنہری لٹوں والی زعفران، چھٹے کو شاخِ صعتر اور ساتویں کو سدا بہار زیتون کہتا ہے۔ یہ ہار عشق نے افروڈائٹ کی نذر کیا تھا۔ ملیاگر اور دوسرے مصنفوں کی تحریرات سے ہمیں صور جیسے فونیقی شہر کی داخلی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ بالائی طبقے کے لوگ عیاشی کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ شراب پیتے اور پیشہ ور گانے والوں سے گانا سنتے۔ ان کی عورتیں الگ تھلگ رہتیں۔ باہر نکلتیں تو نوکر چاکر ساتھ ہوتے۔ فونیقیوں میں سے مردوں کی خاصی بڑی تعداد ہر سال کا بڑا حصّہ ملک سے باہر سمندروں میں گزارتی۔ ایسے معاشرے کے جنسی معاملات میں کجروی

---

[۱] یونانی مجموعۂ اشعار کتاب ۱۱ ص ۲۰ [۲] موجودہ اُمّ قیس، بحیرۂ جلیل کے جنوب مشرق میں نیز دیکھیے مرقس کی انجیل، باب ۵، آیت ۱، لوقا کی انجیل باب ۸، آیت ۲۶ (ہر دو میں یہ گراسینیو کا علاقہ لکھا ہے — مترجم)

[۳] یونانی مجموعۂ اشعار کتاب ۱۲ ص ۴ [۵] کتاب ۵ ص ۵

Marfat.com

اور بے پروائی کی مثالیں غیر معمولی طور پر زیادہ ہونی چاہئیں۔ ملیاگر کی دو لوحیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیے :

" جزیرہ صور میری اتّا ہے۔ میں غدارا میں پیدا ہوا جو تہذیبی اعتبار سے ایٹیکا ہے، اگرچہ شام میں واقع ہے ....."

" اگر میں شامی ہوں تو اس پر تعجب کیوں؟ ہم ایک ملک میں رہتے ہیں اور وہ دنیا ہے۔ ایک حادثے سے تمام فانی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ میں بڑھاپے میں اپنی لوحِ مزار کے لیے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ بڑھاپا اور موت قریبی ہمسایے ہیں"[1]

" اجنبی! تو چُپ چاپ چلا جا۔ بوڑھا آدمی پرہیزگار مُردوں کے درمیان محوِ خواب ہے، جو سب کے لیے مقدّر ہے۔ یہ ملیاگر کی قبر ہے، جو یوکرٹس کا فرزند تھا، جس نے دلکش، اشک آلود محبّت اور شاعری کو حسن و رعنائی سے پیوستہ کر دیا۔ آسمان سے اُترے ہوئے صور اور غدارا کے مقدّس خطّے نے اسے پال پوس کر جوانی کی منزل میں پہنچایا۔ پردیس کے محبوب کوس نے اس کے بڑھاپے کی دیکھ بھال کی۔ اگر تو شامی ہے تو سلام، اگر تو فونیقی ہے تو نائیجیس، اگر تو یونانی ہے تو خیرؔ (مرحبا)۔ تُو خود بھی یہی الفاظ دُہرا"[2]

ظاہر ہے کہ رواقی فلسفی زینو کی طرح اس شاعر نے بھی اپنی تصانیف میں اس نئے دَور کی عکاسی کی، جو سکندر کے ساتھ طلوع ہوا تھا، جس میں فکر و نظر ذہنیت کے دائرے سے نکل کر بین الاقوامی دائرے میں پہنچ گیا۔

---

[1] یونانی مجموعۂ اشعار کتاب ۷۔ [2] ایضاً۔

# تیرھواں باب

## رُومیوں کا دَورِ اقتدار

**ایک صوبے کا حصہ** ۶۴ سنہ ق،م میں پومپے نے شام کا الحاق کیا تو اسے ایک رومی صوبہ بنا دیا، جس کا نام پرووِنسیا سیریا رکھا۔ یعنی صوبۂ شام۔ لبنان و فلسطین کو اس میں شامل کر دیا۔ اس وقت سے فونیقیہ سرکاری طور پر ختم ہو گیا۔ یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اگر اس علاقے کو بدنظمی کے ان حالات سے محفوظ رکھنا ہے، جو حد درجہ کمزور اور سلوکی فرمانرواؤں کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے تو اسے براہِ راست رومی حکومت کے زیرِ انتظام رکھنا ضروری ہے۔ مزید برآں اس نئے صوبے کے باعث رومی مقبوضات کی حدیں اس کے واحد زبردست مشرقی حریف ایران سے مل گئیں اور ایشیائی مقبوضات کے سلسلے میں یہ مسئلہ بہ طورِ خاص اہم تھا۔ چنانچہ یہ صوبہ ایک اعلیٰ رومی افسر کی تحویل میں دے دیا گیا، جسے فوج بھرتی کرنے اور لڑائی چھیڑنے کا بھی اختیار تھا۔[۱] حاکم صوبہ انطاکیہ میں رہتا تھا، جو ختم شدہ بادشاہی کا دارالحکومت تھا۔ اس کی کمان میں چار فوجیں تھیں۔ پہلا حاکم اولس گبینیس[۲] (۵۷ سنہ ق،م۔ ۵۵ سنہ ق،م) تھا، جو پومپے کا قابل سپہ سالار تھا پھر کریسس[۳] اس کا جانشین مقرر ہوا، جو پہلی سہ گانہ حکومت[۴] کا رکن تھا۔ ۸۶ سنہ کے آس پاس صوبیدار کی جگہ نئے حاکم مقرر ہونے لگے، جنھیں نسبتہً زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ ممتاز لبنانی شہروں — صور، صیدا، طرابلس، ارواد — کے حدود اور داخلی خود مختاری کی توثیق کر دی گئی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی صلیبی جنگوں کے زمانے تک سیاسی معاملات میں کوئی اہم کردار ادا نہ کیا۔ خاص لمبی مدت تک پوری رومی سلطنت حصولِ اقتدار کے بڑے بڑے مدعیوں کی کشمکش کے باعث

---

۱ ایپیاں ۔ ۲ Aulus Gabinius ۔ ۳ Crassus ۔

۴ یعنی تین آدمیوں کی مشترکہ حکومت، پہلی حکومت کے رکن جولیس سیزر، پومپے اور کریسس تھے۔ رومی گورنروں کی فہرست کے لیے دیکھیے ہیرر (Harrer) کی کتاب ۔

Marfat.com

پریشان لغلی کی حالت میں رہی اور یہ سب لوگ کسی نہ کسی وقت بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر ضرور پہنچتے رہے۔ جولیس سیزر بھی شام میں ٹھہرا تھا (۴۷ سنہ ق، م)۔ اس نے بعض شہروں کو خاص حقوق عطا کیے۔ اس نے ایک فونیقی شہر کے نام ایک فرمان جاری کیا، جس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے: "گیئس جولیس سیزر میر عسکر رکن اعظم مجلس ڈکٹیٹر بار دوم کی طرف سے مجسٹریٹوں، مجلس شوریٰ اور اہلِ صیدا کو سلام پہنچے[1]" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ، بادشاہ نہیں رہا تھا بلکہ مجسٹریٹ یعنی حاکم بن گیا تھا۔ مارک انیٹونی دوسری سہ گانہ حکومت کا رکن تھا۔ اسے رومی سلطنت کی تقسیم میں مشرقی علاقے ملے، جن میں شام اور مصر بھی شامل تھے۔ اس نے دو ممتاز شہروں، صور اور صیدا کے حقوق کا احترام کیا۔ ۳۶ سنہ ق، م میں اس نے ملکہ قلوپطرہ کو جو آخری بطلیموسی فرمانروا تھی، بقاع اور تمام ساحلی قصبے، جو ایلوتھیرس کے جنوب میں تھے، مصری سرحد تک دے دیے تو ان دو شہروں کو مستثنیٰ رکھا، کیونکہ اس کے علم کے مطابق یہ شہر آباؤ اجداد سے آزاد چلے آتے تھے[2]۔ یہ تحفہ محبت کا تھا اور اعتراف کیا گیا ہے کہ قلوپطرہ نے اسے دامِ محبت میں اسیر کر لیا تھا[3]۔ کہا جاتا ہے کہ قلوپطرہ اپنے لیے اور اپنے رومی عاشق کے لیے لبنان کے کسی ایسے پہاڑ پر عشرت گاہ تعمیر کرنے کی خواہاں تھی، جس کے دامن میں سمندر موجزن ہوتا۔ خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر پارتھیوں نے شام پر حملہ کر دیا (۴۰-۳۸ سنہ ق، م) اور صور کے سوا پورے صوبے سے رومیوں کو نکال دیا۔ انیٹونی کے سالاروں نے فوراً پورا علاقہ واپس لے لیا۔ یروشلم پر ۳۷ سنہ ق، م میں قبضہ ہوا اور ادومی نسل کے ہیرودیس (اعظم) کو یہودا کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ کیونکہ وہی تنہا مدعی سلطنت رہ گیا تھا۔ چھ سال بعد آکٹیوین نے، جو دوسری سہ گانہ سلطنت کا رکن تھا اور آئندہ چل کر شہنشاہ بنا۔ شمالی و مغربی یونان میں ایکٹیم کے مقام پر فیصلہ کن بحری فتح حاصل کی، جس کی وجہ سے وہ بتیس سال کی عمر میں عملاً پوری رومی دنیا کا تنہا حکمران رہ گیا۔ آکٹیوین نے مصر تک انیٹونی اور کلوپیٹرا کا تعاقب کیا۔ ان دونوں نے خودکشی کر لی۔ پھر آکٹیوین شمالی جانب کوچ کرتا ہوا فلسطین، لبنان اور شام میں سے گزرا۔ امن و استواری کے آرزومندوں نے ہر جگہ اس کا استقبال کیا۔ ۲۷ سنہ ق، م میں رومی سینٹ نے آکٹیوین کو آگسٹس کا لقب دیا۔ آگسٹس سیزر (وفات ۱۴ئہ) شہنشاہ سے رومی سلطنت کے

[1] جوزیفس اینٹی کوئٹیز کتاب ۱۴ باب ۱۰۔ [2] ایضاً کتاب ۱۵ باب ۴۔
[3] ایضاً کتاب ۱۴ باب ۱۳۔

Marfat.com

طویل اور کامیاب دور کا آغاز ہوا۔

## لبنان کی نئی حیثیت

اسی زمانے میں دو تاریخی واقعے پیش آئے، جن کی وجہ سے مہذب دنیا کی پوری حیثیت میں تغیّر پیدا ہوگیا۔ اول رومی سلطنت کا ظہور، دوم مسیحیت کا آغاز۔ ان کے باعث لبنان کی ہیئت بدل گئی۔ رومی سلطنت سب سے زیادہ وسیع اور اپنی نوعیت کے سیاسی اداروں میں سب سے زیادہ قوی تھی۔ اس نے اوقیانوس اور بحیرۂ شمالی سے دریائے فرات تک اور دریائے رھائن و ڈینیوب سے صحرا تک پورے علاقے میں اک گونہ وحدت و یکجہتی پیدا کردی۔ سنہ ء کے بعد سے پوری رومی سلطنت میں طویل مدت کے لیے تمام اہم داخلی کشمکشیں ختم ہوگئیں۔ کم و بیش ایک سو سال تک جن کا سلسلہ مارکس آریلیس[1] کے عہد حکومت پر ختم ہوا (۱۶۱ء۔ ۱۸۰ء)۔ رومی سلطنت کے تخت پر خوش نصیبی سے مسلسل قابل بادشاہ جلوہ افروز ہوتے رہے۔ سڑکوں کے وسیع جال نے سلطنت کے تمام حصوں کو نسبتہً ایک متحد وحدت کی شکل میں مرتبط کردیا۔ یہ انتظامی اور ہندسی مہرمندی کا ایک ممتاز کارنامہ تھا۔ مشرقی بحیرۂ روم کے علاقوں میں پیشتر صرف کاروانی راستے موجود تھے۔ اب ان کی جگہ پختہ سڑکیں وجود میں آگئیں۔ ان پر سنگہائے میل نصب ہوگئے، جو آج بھی شام اور لبنان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بندرگاہوں، پلوں، آب رسانی کے سلسلوں اور کھیتی باڑی کے لیے نہروں کی تعمیر کے سلسلے پر خاص توجہ مبذول رہی۔ ان کے نشان بھی جابجا اب تک نظر آتے ہیں۔ آگسٹس کے ابتدائی دور ہی میں ڈاک کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، جس میں مرکزی حکومت اور صوبوں کے درمیان زیادہ قریبی تعلق پیدا کردیا۔ بحری قزاقی اور غارت گری سے حفاظت کے انتظامات بھی برابر قائم رہے۔ حالانکہ پیشتر یہ چیزیں عام تھیں۔ پورے بحیرۂ روم کو قزاقی سے پاک کردینے کے اقدامات پومپی نے شروع کیے تھے۔ اس نے دیودار کی لکڑی سے جہاز تیار کیے، جو بحری قزاقوں کے تعاقب میں سرگرم رہتے تھے۔ اس سرگرمی کے باعث قزاقی ختم ہوگئی۔ قزاقی سرداروں کا تعلق زیادہ تر اتوریوں اور عربوں سے تھا۔ وہ کوہستانِ لبنان کی بلند چوٹیوں پر جا بیٹھے[2]۔ چالسس میں اتوریوں کی جو ماتحت ریاست تھی، وہ ٹراجن کے عہد (۹۸ء۔ ۱۱۷ء) تک قائم رہی۔

شام مشرق قریب میں رومی سلطنت کی قوت کا مرکز تھا۔ وہاں رومی نظم و نسق کے ماتحت صحرا کے حاشیے کے ساتھ فوجی چوکیوں کا زنجیرہ قائم کردیا گیا تاکہ حضری اور مہذب حلقے کو چھاپوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔ شام کو شمالی اور مشرقی سرحدوں کو پارتھیوں کے حملوں اور بدوؤں کی یورشوں سے

---

[1] Marcus Aurelius۔ [2] سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲۔

محفوظ رکھنے کے لیے قلعوں نیز دیدبانی اور حفاظت کی چوکیوں کا جال بچھا دیا گیا۔ جگہ جگہ پانی کی بہم رسانی کے مراکز قائم ہو گئے اور نخلستانوں کے لیے استحکام کے انتظامات کر دیے گئے۔ بنجر زمینوں کے سلسلہ ہائے مخابرت میں جو مقامات اہم تھے اور جہاں پانی کے مرکز تھے، وہاں فوجی دستے بٹھا دیے گئے۔ رومی فوج میں مقامی لوگ بھی شامل تھے۔ انھیں اہم جنگی مقامات میں متعین کر دیا گیا۔ اندازہ یہ ہے کہ رومیوں کے زمانے میں شام کی آبادی ساٹھ ستر لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ آبادی کا بلند ترین درجہ ہے۔ ان دیہات کے کھنڈر آج جا بجا ملتے ہیں، جہاں کبھی کنوئیں موجود تھے۔ اسی طرح آبپاری کے لیے نہروں کے نشانات جا بجا پائے جاتے ہیں۔ اب وہاں کی زمینیں غیر مزروعہ پڑی ہیں، یا تو وہاں ریوڑ چرتے ہیں یا بارانی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ سٹرابو، بطلیموس اور پلینی نے لبنانی ساحل کے ساتھ ساتھ شہروں اور جزیروں کا ذکر کیا ہے، جو یا تو ناپید ہو گئے یا ابھی تک ٹھیک ٹھیک متعین نہیں ہو سکے[1]۔

لبنان میں اس وقت تک آبادی کا سلسلہ ساحلی علاقے سے آگے نہیں بڑھا۔ اب آہستہ آہستہ لوگ ٹیلوں کے دامن اور پہاڑوں کی ڈھلانوں پر آباد ہونے لگے، جہاں بیشتر گھنے جنگل تھے۔ صور اور ارواد جزائری شہر تھے۔ ان کی آبادی بڑھی تو اس نے افقی شکل اختیار کرنے کے بجائے عمودی شکل اختیار کی[2]۔ اہل ارواد امریکہ کے شہر نیو یارک کے حصے مَین ہٹن کے باشندوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کثیر المنزل مکانوں میں رہتے تھے۔ چھتوں سے بارش کا جو پانی گرتا تھا اسے حوضوں میں محفوظ کر لیتے تھے اور مزید پانی اس حصے کے زیر زمین چشموں سے لیتے تھے، جو ان کی جزائری آبادی اور خشکی کے درمیان تھے۔ اس غرض سے وہ کشتیوں میں سوار ہوتے اور سیسے کی ایک فراخ دہن نلکی استعمال کرتے، جس کے ساتھ چرمی پائپ وابستہ ہوتا۔ اس سے پہلے ایسی تدبیر کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ فونیقیوں کے زمانے کے ارواد میں چٹانیں کاٹ کاٹ کر حوض بنائے جاتے تھے۔ ایسے حوض آج بھی موجود ہیں[3]۔ صرف جنوبی و مغربی عرب میں کثیر المنزل عمارتیں ملتی ہیں، جو اس لیے بنائی جاتی تھیں کہ بدوؤں کے چھاپے سے حفاظت ہو سکے[4]۔

رومی شہنشاہی کے دور کے آثار اب تک پہاڑی علاقوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ دولت مند

---

ف[1] پلینی کتاب ۵ باب ۱۷۔ اس میں جیگارتہ اور ترائیرس کو بطریس (لبطرون) اور کالاموس (قلمون) بتایا گیا ہے۔

ف[2] سٹرابو کتاب ۱۶ باب ۲۔ ف[3] رینانی مشن صفحہ ۴۰۔

ف[4] حتی تاریخ عرب صفحہ ۵۷۔

فونیقیوں اور رومی آبادکاروں نے موسم گرما کے لیے بلند مقامات پر مکان بنانے شروع کیے اس سے بیشتر یہ مکانات شکاریوں، چرواہوں، درخت کاٹنے والوں اور خاص وضع کے عبادت گزاروں کا مرجع تھے۔ فونیقی دیوتاؤں کے پجاریوں نے معبدوں کے لیے زیادہ سے زیادہ بلند چوٹیاں منتخب کیں۔ ان بلند مقامات پر متعدد چیزیں ملیں۔ مثلاً چٹانوں پر کندہ کی ہوئی مختلف چیزیں، یونانی و لاطینی کتبے، تابوت اور مقبرے، معبدوں کے کھنڈر، نصف دفن شدہ سنگی ستون، یہ سب کچھ دور افتادہ دیہات میں ملا، مثلاً شملانہ، قرطابہ، الحقورہ، تنورین، احدث۔ ایک لاطینی کتبہ نیہا، جو لیجا یک جاتے ہوئے زحلہ کے شمال مشرق میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیروت کا ایک رومی عامل یہاں مرا تھا غالباً اس کی جاگیر اسی گاؤں کی جگہ واقع تھی[۵۱] لیکن جب تک مشرقی رومی یعنی بیزنطینی سلطنت کا دور شروع نہ ہوا، جو چوتھی صدی عیسوی کے اختتام کا واقعہ ہے، بھاری یا گھنی آبادی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ رومی مورخ ٹیسٹس[۵۲] (تقریباً سنہ ۱۰۰ء) کے زمانے تک کوہستانِ لبنان کی چوٹیاں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسیحی فرقے وطن چھوڑ کر شمالی لبنان میں پہنچنے لگے تو ان پہاڑوں کو سیاسی اہمیت کا آغاز ہوا۔ یہ فرقے دوسروں سے گھل مل گئے تو مارونی جمعیت وجود میں آئی۔ باقی رہا جنوبی لبنان تو وہاں یہ مرحلہ گیارھویں صدی عیسوی تک نہ آیا۔ اس وقت اسلامی جمعیت سے الگ ہونے والے فرقے وہاں پہنچے۔ وہ دوسرے طبقوں سے گھل مل گئے تو دروزی جماعت پیدا ہوئی۔

رومیوں کے زمانے میں لبنان کے اندر جو سیاسی تغیر ہوا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندرونِ ملک میں آبادی کی توسیع شروع ہو گئی۔ دوسری صدی عیسوی میں ضلع فونیقیہ صرف پہاڑوں تک ہی نہیں بلکہ ان کے مشرق تک پھیل گیا۔ سپٹمیس سیورس[۵۳] (سنہ ۱۹۳ء۔ سنہ ۲۱۱ء) نے

---

۵۱ کلرمون گینیو کا فرانسیسی رسالہ جلد ۴، پیرس سنہ ۱۹۰۱ء، نیز راسوزف صفحہ ۵۶۷۔

۵۲ تاریخ کتاب ۵، باب ۶۔

۵۳ Septionrus Severus، یہ لبیڈس (موجودہ لبدہ واقع طرابلس شمالی افریقہ میں پیدا ہوا۔ یہ مقام ایک فونیقی نوآبادی تھا۔ (متعلقہ شجرہ صفحہ ۱۹۵ پر دیکھیے!)

ایلاجبل[51] کے مذہبی پیشوا کی بیٹی جولیا ڈومنا سے شادی کرلی۔ اس سے روم میں شامی و لبنانی خاندان کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ اس نے ۱۹۴ء اور ۱۹۸ء کے درمیان سرزمین کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک حصہ مشرقی تھا، جسے نشیبی شام کہنے لگے، دوسرا مغربی، جس کا نام شمالی فونیقیہ تھا[52]۔ بیزنطینی دور میں پھر صوبوں کی حدود میں رد و بدل ہوا۔ قسطنطین اعظم کے ماتحت ۳۲۵ء میں چار صوبے تھے، یعنی عرب (شرق اردن)، فلسطین، فونیقیہ اور نشیبی شام۔ تھیوڈوسیس ثانی (۴۰۸ء - ۴۵۰ء) نے فونیقی لبنان کو فونیقی ساحلی علاقے سے الگ کرکے ایک مستقل صوبہ بنادیا اور حمص کو مرکزی شہر کے حقوق دے دیے۔ پھر شام تین حصوں میں بٹ گیا، جن میں سے ایک نشیبی شام تھا اور دو فونیقی علاقے تھے۔ یعنی اوّل فونیقیہ اولیٰ، جس کا مرکز صور تھا، بطلیموسیہ (عکہ) عیدا، بیروت، ببلوس، بترلیس، طرابلس، ارقہ اور ارواد بڑے شہر تھے۔ دوم فونیقیہ ثانی (لبانم لبانیسیہ)، اس کا مرکز حمص تھا۔ دوسرے شہروں کے علاوہ ہیلی پولس، دمشق اور تدمر اس میں شامل تھے[53]۔ عربوں کی فتوحات تک یہی تقسیم قائم رہی۔

رومیوں کے ماتحت جو تغیرات ہوئے، وہ زبان پر مشتمل تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں سکوں پر فونیقی افسانوں کے کندہ کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سکوں اور کتبوں میں یونانی زبان بدستور استعمال ہوتی رہی۔ مقامی زبان مقامی اداروں کے ساتھ ہی ناپید ہو گئی۔ اس کی جگہ ارامی زبان نے لے لی۔

(شجرہ متعلقہ ۱۹۴ء)

## شامی و لبنانی خاندان کا شجرہ نسب

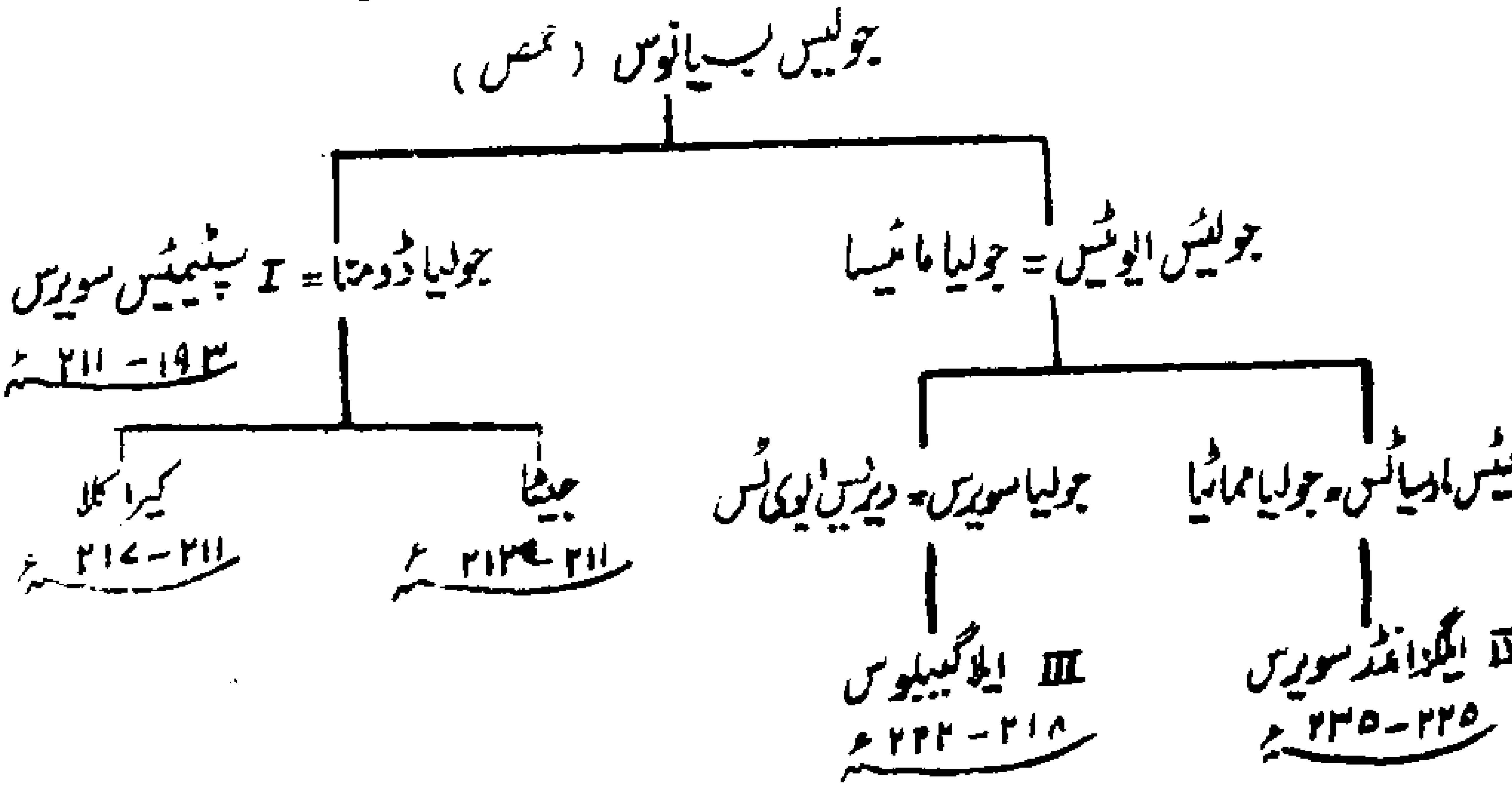


(جن ناموں کے آگے نمبر لگے ہیں، وہ شاہنشاہ ہوئے۔)

[51] یہ نام الہ الجبل معلوم ہوتا ہے۔ [52] ہیرر صفحہ ۸۰ - ۹۰۔ [53] دیکھیے مرکوارٹ جلد اول صفحہ ۲۲۵، نیز متفرق فرانسیسی کتابیں۔

Marfat.com

جو حضرت مسیح کی مادری زبان تھی۔ رومی حکومت کا خاصّہ ہی یہ تھا کہ ماتحت صوبوں کی قومیتیں ختم ہو جائیں اور قومی زندگی کے ممتاز خصائص مٹ جائیں، مگر لاطینی زبان رائج نہ ہو سکی۔ سپاہی اور سرکاری افسر مجبوراً لاطینی سیکھتے تھے اور بس یہیں اس کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ البتہ یونانی زبان لمبی مدّت تک ادب اور کاروبار میں برسرِفروغ رہی۔ اس وقت تک یونانی اور رومی تہذیبوں کے درمیان تطابق اور امتزاج پیدا ہو گیا بلکہ رومی تہذیب خود قدیم یونانی تہذیب کی وارث تھی اور اس سے مستفید و مستفیض ہوئی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے تکملے کی حیثیت حاصل تھی۔ یونانی، سیاسی اور تنظیمی اقتدار سے کمزور تھے۔ رومیوں کا سرمایۂ افتخار سیاست اور نظم و نسق تھا۔ وہ فلسفے اور فنون کے دائرے میں تسیمۃً فرمایہ تھے۔ ان کمالات میں یونانیوں نے بڑا اونچا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اس طرح لاطینی وضع کی یونانیت لبنان اور صوبۂ شام کے دوسرے حصّوں میں فروغ پذیر رہی +

عجیب امر یہ ہے کہ فونیقی زبان بیونی شکل میں شمالی افریقہ کے اندر پانچویں صدی عیسوی تک دیہاتی بول چال کی حیثیت سے قائم رہی۔ چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک شہر ہیپو کے حوالی میں رہنے والے لوگ اپنے آپ کو کنعانی کہتے تھے۔ اس فونیقی آبادی کا شہرۂ آفاق پیشوا سینٹ آگسٹائن (وفات ۴۳۰ء) اپنے مواعظ میں بیونی الفاظ بکثرت استعمال کرتا تھا۔ سرٹس مائینر[1] (خلیج قابس، تونیسیا) کے ایک الگ تھلگ مقام کے لوگ گیارھویں صدی[2] تک بیونی زبان استعمال کرتے رہے +

**اقتصادی سیر حاصلی** رومی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی جو سیاسی، لسانی اور ثقافتی انقلابات آئے، ان میں لبنان کے باشندے یہ تازہ اور محکم عزم لے کر اُٹھے کہ اپنی خصوصیتوں اور سرگرمیوں میں ایک نئی روح پیدا کر کے دنیا کی منڈیوں میں اپنا حصّہ لے کر رہیں گے۔ چنانچہ تجارتی شہروں میں خوشحالی کا دور ان بلندیوں پر پہنچ گیا، جو نہ پہلے حاصل ہوئی تھیں اور نہ بعد میں حاصل ہو سکیں۔ نہ محض لبنان بلکہ پورا علاقہ نشو و ارتقاء کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا، جس کا یہ ایک حصّہ تھا۔ ملک میں امن قائم ہو چکا تھا۔ حمل و نقل کے سلسلے بے مثال وسعت اختیار کر چکے تھے۔ تجارت کا دائرہ بہت پھیل چکا تھا۔ ان اسباب سے اقتصادی سیر حاصلی کو بہت تقویت پہنچی۔ زراعت و تجارت کو فروغ حاصل ہوا +

شہنشاہی کے دور میں مغربی منڈیوں کی اہمیت بڑھ گئی اور قابلِ فروخت اشیاء کی مانگ زیادہ

---

[1] Syrtis Minor +

[2] Momers ، جلد دوم صفحہ ۴۷۸ +

ہوگئی۔ لبنان اور مغربی ایشیا کے دوسرے علاقوں میں سن اور سنگترے کی کاشت جاری رہی۔ روئی ابتدا میں صرف ہندوستان میں ہوتی تھی اور غالباً عربوں کے عہد تک مغربی ایشیا میں نہ پہنچی۔ فونیقی شہروں سے شراب، روغن زیتون، کھجور، کھالیں، تانبا، سنجاب، سمور اور گندم کا بہترین آٹا باہر بھیجا جاتا تھا۔[1] بیروت نے کشمش اور منقّے میں وسیع شہرت حاصل کر لی تھی اور یہ چیزیں شیرینی میں کسی سے کم نہ تھیں۔[2] رومیوں کے نزدیک صور کی شراب بڑی قابلِ قدر تھی اور وہاں کے سُوتی کپڑے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شہنشاہ ڈایوکلیشن کے عہد میں بحری محاصل کا جو قانون بنا تھا، اس میں بیلوس، لاذقیہ اور صور کے سوتی پارچات کا ذکر اچھے انداز میں کیا گیا تھا۔[3] لاذقیہ کی شراب کے لیے پہلی صدی مسیحی میں ہندوستان اور افریقہ کے اندر بہت مانگ تھی۔[4] کوہستانی علاقے جنگلوں سے پٹے پڑے تھے۔ وہاں سے لکڑی ایندھن، جہاز سازی، تعمیر امکنہ نیز گاڑیاں، آلات اور منجنیقیں بنانے کے لیے اس پیمانے پر طلب کی جاتی تھی کہ بیشتر کے دور میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس وجہ سے ضروری ہوگیا کہ درخت اندھا دُھند نہ کاٹے جائیں بلکہ ان کے کاٹنے میں مناسب ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ چنانچہ ان کی حفاظت کے لیے موزوں وسائل اختیار کیے گئے۔ محفوظ جنگلوں کی حدیں متعیّن کرنے کے لیے جگہ جگہ پتھر نصب کر کے ان پر کندہ کرا دیا گیا کہ یہ شہنشاہی املاک ہیں۔ ایسے متعدد پتھر بلند مقامات پر ملے ہیں۔ ایک پتھر اس چوٹی پر نصب کیا گیا تھا جو الشویر اور زحلہ کے درمیان ہے۔ یہ پتھر اب بیروت کی امریکی یونیورسٹی کے لیے باعث زینت ہے۔ اس پر یہ کتبہ کندہ تھا: شہنشاہ ہیڈرین آگسٹس نے جنگل کی حد مقرر کی۔ ہیڈرین (۱۱۷ء-۱۳۸ء) ایک زمانے میں شام کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس لیے اسے صوبے کے طبعی وسائل کا پورا اندازہ تھا +

لبنان کے معدنی ذخائر کی بھی بڑی مانگ تھی۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ درجۂ معیشت بھی بلند ہوگیا اور مختلف افراد میں جواہرات کا استعمال بہت بڑھ گیا۔ زراعت، صنعت و حرفت، حمل اور نقل اور جہازرانی میں لوہے اور تانبے کی ضرورت دُگنی سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ۳۰۳ء سے ۳۱۳ء کے درمیان ڈایوکلیشین اور میکسیمین نے مذہبی ظلم و جور کا آغاز کیا۔ اس میں نئے مذہب یعنی مسیحیت کے جو پیرو ماخوذ ہوئے، انھیں لبنان کی کانوں میں مشقت پر لگایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے، ان کانوں سے مراد علاقۂ صیدا میں تانبے کی کانیں اور بیروت کے قرب و جوار میں لوہے کی کانیں تھیں۔[5] دھاتوں کا

---

۱؎ ایتھن پائس کتاب ۱۰، باب ۲۸ + ۲؎ پلنی کتاب ۱۵، باب ۱۷ + ۳؎ تھیوڈور مومسن کی کتاب "رومی سلطنت کے صوبے" مترجمہ ڈکسن جلد دوم صفحہ ۱۳۷ + ۴؎ ولفرڈ شاف کی کتاب صفحہ ۷۷ +

۵؎ یوسیبیس کی کتاب: "تاریخ کلیسا اور شہدائے فلسطین" مترجمہ ہیو لولر اور جان اولٹن جلد اوّل صفحہ ۳۹۶ نیز "قدیم روما کا اقتصادی سروے" جلد چہارم صفحہ ۱۵۶، ۱۵۷ +

Marfat.com

کام کرنے والے لوگ پہلے سے بھی زیادہ ہنرمندی دکھانے لگے۔ ان کی بنائی ہوئی چیزیں مقدار اور اچھائی کے اعتبار سے بہت اونچا پایہ حاصل کر گئیں۔ صیدا سے بلوری سامان دنیا بھر میں فروخت ہوتا رہا۔ پارچہ بافی کی صنعت و تجارت میں بھی صیدا کا درجہ خاصا اونچا رہا۔ صور سے سنگ مرمر بھی باہر بھیجا جاتا تھا۔ چاک کے ذخائر بعلبک کے قریب موجود تھے[۱]۔

لبنان کی صنعت پارچہ بافی اونی اور سوتی کپڑوں پر مشتمل تھی۔ وہاں خام مال کی کثرت تھی اور ان پارچوں کو بہترین طبعی رنگ یعنی ارغوان میں رنگا جاتا تھا اور فونیقی اس فن میں بے مثال مانے جاتے تھے۔ سٹرابو[۲] کے زمانے (وفات ۲۴ء) میں صور کے کارخانہ ہائے رنگ سازی اتنی ترقی کر گئے تھے کہ یہ مقام رہنے والوں کے لئے ناخوشگوار بن گیا تھا۔

## تجارتی روابط اور آبادکاری

شراب، نیل، لکڑی، خشک پھلوں اور پارچوں کے علاوہ کھالیں، قاقم سنجاب اور سمور بھی شامل ہو گئے۔ دوائیں، خوشبوئیں، عرق اور مرہم بھی باہر بھیجے جاتے تھے۔ صور، صیدا، ارواد اور دوسری بندرگاہوں میں جنوبی عرب، ہندوستان اور چین سے تجارتی سامان ارسال ہوتا رہا۔ اس وقت بھی تجارت گزاروں کا سلسلہ خاصا وسیع تھا جیسا کہ آج کل بیروت میں ہے۔ خشکی اور تری دونوں راستوں سے تجارت ہوتی تھی۔ البتہ خشکی کے راستے گراں خرچ ہونے کے باوجود زیادہ محفوظ تھے۔ شکر، چاول اور بیش قیمت جواہرات ہندوستان سے منگائے جاتے تھے۔ مسالے، عرق، صندل اور موتی عرب اور اس کے حوالی سے آتے تھے۔ ریشم چین سے آخری جنس مدت تک چین کے اجارے میں رہی اور امیر لوگ اسے استعمال کرتے تھے۔ دولت مند رومیوں میں اس کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ مغربی ایشیا میں ریشم کے کیڑے پائے نہیں جاتے تھے[۳]۔ لیکن جنگلات میں موجود تھے۔ ممکن ہے مقامی لوگ محدود پیمانے پر ان سے ریشم پیدا کر لیتے ہوں۔ حقیقی چینی ریشم ۱۱۵ ق م کے بعد درآمد ہونے لگا۔ چینی ریشم اور ریشم کے پارچات خشکی کے راستے پارتھیا میں سے تدمر پہنچتے تھے، جو بادیہ شام کا کاروانی شہر تھا۔ اس نے وسیع پیمانے پر دولت و ثروت حاصل کر لی اور بڑی قوت بن گیا۔ آرلین (۲۷۰ء-۲۷۵ء) نے اسے تباہ کیا۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ سامان سمندر کے راستے ہی سکندریہ (جسے آگے چل کر انٹیاکیہ چارکس کہا گیا) میں پہنچتا تھا۔ جو خلیج فارس کے سرے پر واقع تھا جہاں سے تدمر دورا یوروپس) یا پیڑا بھیجا جاتا تدمر اور پیڑا سے یہ فونیقی بندرگاہوں میں جاتا تھا۔ جہاں پہلے اسے رنگا پھر کپڑا بنتے یہی کپڑا ادھر کی منڈی میں مقبول تھا۔ بیروت اور صور کے کارخانوں میں ارغوانی رنگ کے لیے خام مال تیار ہوتا تھا۔

---

۱ ہیشل ہیم صفحہ ۱۵۷۔ ۲ کتاب ۱۶، باب ۲۔ ۳ دیکھئے حزقی ایل، باب ۱۶، آیت ۱۰، ۱۳۔

Marfat.com

ارغوانی رنگ کا ریشم بڑی قیمت پاتا تھا مشرق سے غلام بھی بحیرہ روم کی مختلف بندرگاہوں کے راستے مغرب پہنچتے تھے۔ غلام حاصل کرنے کے مختلف ذرائع تھے۔ پیشہ ور بردہ فروش آوارہ نوجوانوں کو پکڑ لیتے۔ بچوں کو اغوا کر لیتے یا جو بچے والدین کو مطلوب نہ ہوتے، انھیں خرید لیتے۔ جن مقروضوں کا دیوالا نکل جاتا، وہ اپنے آپ کو قرضہ دہندگاں کے حوالے کر دیتے۔ ایسے لوگوں کو بھی غلام بنا کر فروخت کر دیا جاتا۔

ایسے سرگرم بین الاقوامی تجارتی تعلقات کا تقاضا یہ تھا کہ لبنان کے تاجر اور کارندے یورپی شہروں میں مرکز قائم کرتے اور لوگ عموماً شامیوں کے ساتھ چلتے اور انھیں بھی شامی ہی کہا جاتا۔ یہ سلسلہ سیزر آگسٹس کے دور میں شروع ہوا۔ پھر شام و لبنان سے لوگ مسلسل جا جا کر مغربی لاطینی صوبوں میں پہنچتے رہے۔ ان میں سپاہی (باقاعدہ اور امدادی)، غلام، مذہبی لوگ، موسیقار، لطیفہ باز، رقاص، پہلوان، لباطی، بھٹیارے سب شامل تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں ان لوگوں کے باہر جانے کی رفتار تیز ہو گئی۔ شامی و لبنانی خاندان کے شہنشاہوں کے عہد میں یہ کمال پر پہنچ گئی (۱۹۳ء تا ۲۳۵ء)۔ یہ لوگ جو وقتی ضرورتوں کے ماتحت باہر گئے تھے، مستقل طور پر آباد کار بن گئے۔ روم کا طنز گو شاعر جووینل (وفات ۱۴۰ء) خفگی آمیز الفاظ میں کہتا ہے: "شام کے دریائے عاصی کا پانی مدت سے دریائے ٹائیبر میں شامل ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی وہاں کی زبان، وہاں کے طور طریقے، وہاں کی بانسریاں، وہاں کے تہ چھیڑے بربط پہنچ گئے ہیں[1]۔

ابتدائی فونیقیوں کے لائق اخلاف کے ترک وطن کی لہروں سے رومی دنیا لبریز ہو گئی[2]۔ یہ لوگ ان شامی و لبنانی تارکین وطن کے اجداد تھے، جو امریکہ پہنچے۔ انھیں تارکین وطن سے لاطینی صوبوں میں آباد کاری شروع ہوئی[3]۔ ہومر ہمیں بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہر جگہ پائے جاتے تھے[4]۔ سب سے پہلے یہ اطالوی بندرگاہوں میں پہنچے۔ پوٹیولی (اپزولی[5]) رومی شہنشاہی کی درآمد و برآمد کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہیں سے مشرق کی آئی ہوئی چیزیں حاصل کی جاتی تھیں۔ اس مقام میں اہل صور کی ایک خاصی بڑی اور خوشحال آبادی تھی، جس کے تعمیری آثار اب بھی کھنڈروں کے ساتھ میں نظر آتے ہیں[6]۔ ۱۷۴ء کا ایک خط اہل صور میں سے کسی کے نام لکھا گیا تھا۔ اس میں شکایت

---

[1] جووینل آر پرسیس مترجمہ رامزے صفحہ ۲۳۰۔ [2] فرانز کیومون، اسرار متھرا مترجمہ میک کورمیک صفحہ ۶۲۔ [3] ایضاً فرانسیسی کتاب صفحہ ۹۰۔ [4] موسن جلد دوم صفحہ ۱۳۹۔ [5] PUTEOLI۔ [6] بوشیر صفحہ ۲۸۵

کی گئی ہے کہ آبادکاروں کی تعداد میں تخفیف کے باعث جلائے اجتماع کرایے پر لینے کے لیے رقم مہیا نہیں ہو سکتی اور نہ مذہبی مراسم ادا کیے جا سکتے ہیں[۱]۔ اس کے علاوہ رومہ اور آسٹیا (دہانہ دریائے ٹائبر) میں بھی اہل صور کی آبادیوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دوسری عدی عیسوی میں پیوٹیولی کی خوشحالی کی وارث بنی۔ پیوٹیولی میں بیروتی دیوتا بدو سے انتساب کے نشان بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ہیلیوپولس کا جوپیٹر تھا۔ ایک نشان ٹراجن کے عہد کا ہے[۲] (۱۱۶ء)۔ دمشق کا ایک مذہبی پیشوا پیوٹیولی کی مقامی سینٹ کا عدد تھا[۳]۔ رومہ کے ایک بنگلہ شیارہ نام کے باغ میں سنگ مرمر کی چھوٹی سی قربان گاہ ملی، جو لبنان کے بدو سے منسوب تھی۔ اس قسم کے انتسابات عموماً لاطینی میں ہوتے تھے، کمتر یونانی میں۔ ہرامی انتساب کی مثال بہت کم ملی۔ دورِ حاضر کے لبنانی تارکین وطن جو امریکہ پہنچے، انھوں نے اپنے گرجے اور عبادت گاہیں بنا لیں جو "ہماری خاتونِ لبنان" سے منسوب تھیں۔ آگسٹس کے عہدِ حکومت سے تموز رومہ میں خاص آداب و مراسم کا مرکز بن گیا۔ البتہ وہاں اس کا نام ایڈونس تھا۔ شامی و لبنانی خاندانِ شاہی کے ماتحت یہ رسمیں زیادہ عام ہو گئیں۔ ایڈونس کے باغات جا بجا بن گئے، یہاں تک کہ اس کی پرستاری ہسپانیہ میں اشبیلیہ تک جا پہنچی۔ رومہ اور اس کی بندرگاہیں میپلز اور میسینم میں بھی ایسی آبادیوں اور انتسابات کے آثار باقی ہیں۔ مقدونیہ اور یونان، نیز جزائر ایجیہ کی یہی کیفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شام و لبنان کے باشندے مغرب کے تمام بحری مقامات میں کاروبار کرتے تھے[۴]۔

ساحلی مقامات سے یہ آبادکار تجارتی شاہراہوں اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ اندرونِ برِ اعظم میں پھیل گئے۔ جہاں کہیں نفع کی اُمید نظر آتی تھی، یہ لوگ پہنچ جاتے تھے۔ ساتھ ہی اپنی ثقافت کے اقتصادی، مجلسی اور مذہبی مراسم لے جاتے تھے۔ اٹلی میں ان کے نشان ریونا، ٹریسٹ، اکویلیا (ایڈریاٹک کے سرے پر)، سارڈ کینور اور میسینا (سسلی)، سالون (ڈلمیشیا) قرطبہ (ہسپانیہ) میں بھی ملتے ہیں۔ القہ (ہسپانیہ) میں دوسری عدی عیسوی کا ایک کتبہ ملا جس میں بتایا گیا ہے کہ وہاں ایک شامی جماعت موجود تھی۔ وادی ڈینیوب میں وہ ایولم (ڈلیشیا) اور سرمیم، دارالحکومت پینونیا (مشرقی آسٹریا و ہنگری) تک پہنچ گئے۔ دریائے جیرونڈ کے ساتھ ساتھ

---

[۱] لاطینی سکے جلد ۱۰ نمبر ۱۶۰۱ ۔ [۲] ایضاً نمبر ۱۶۳۴ ۔ [۳] ایضاً نمبر ۱۵۷۶ ۔
[۴] کیومنو اسرار صفحہ ۱۰۶ ۔

Marfat.com

Marfat.com

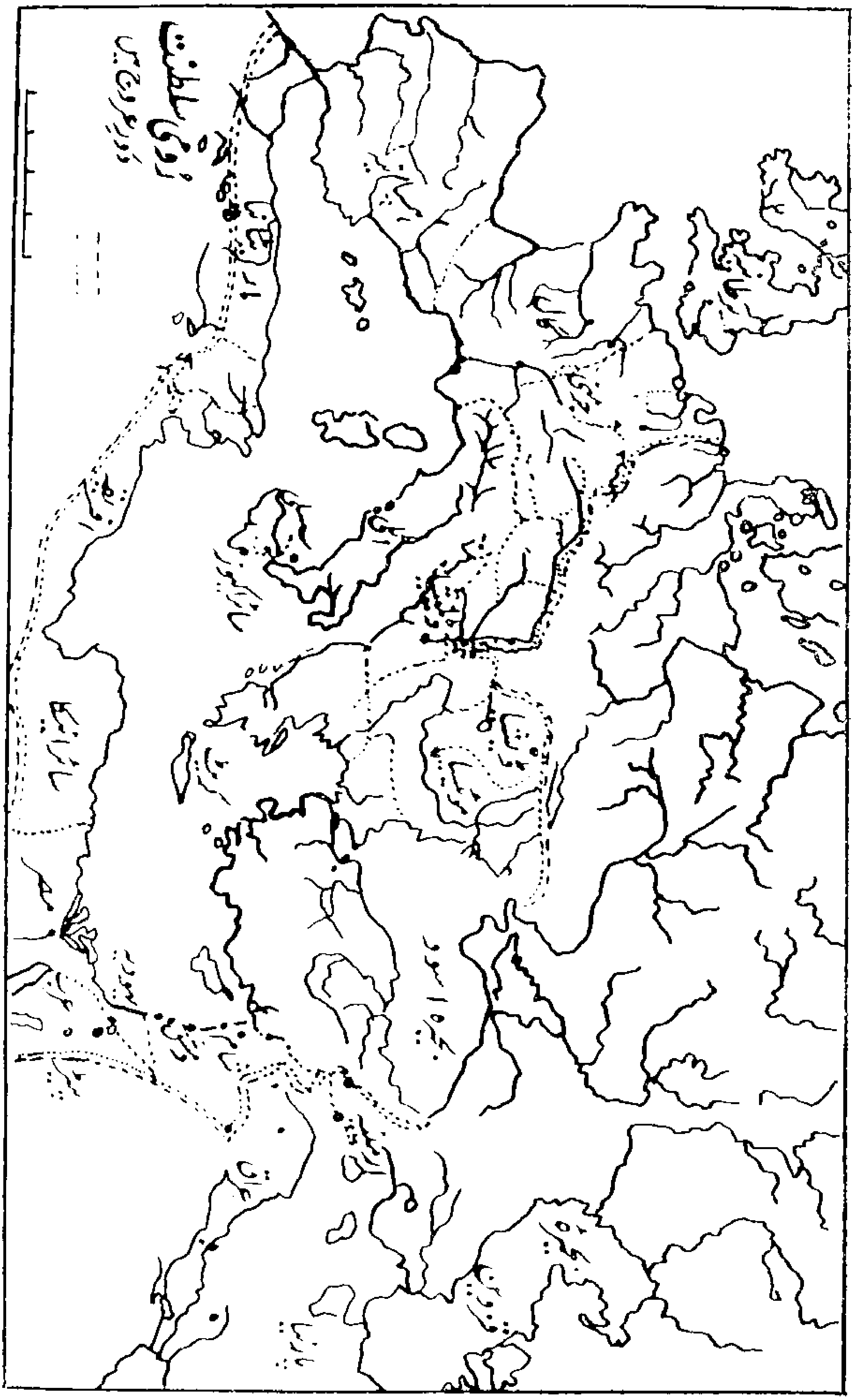

وہ بوردو اور دریائے رون کے ساتھ ساتھ لیون پہنچ گئے۔ گال ان کے لیے یہ طور خاص پُر جاذب تھا۔ دریائے موذیل پر لکسم برگ کے نزدیک ایک مقام ٹریوز ہے، وہاں ان کا بہت بڑا جمگھٹا تھا۔ گال کے رومن گورنر کے ایک فرمان (مرقومہ ۱۷۲ء) کی ایک نقل آرلیس (ارسائی کے شمال میں) کے ملاحوں کو بھیجی گئی تھی۔ اس میں گندم بھیجنے کے قواعد بتائے گئے تھے۔ یہ فرمان، جو ایک پتھر کی تختی پر ثبت تھا، لبنان کے کوہستانی حصّے سے بمقام دیر القمر ملا۔[1] ایسے گلدان نے، جن پر صیدا کے ایک شخص انین کے دستخط تھے۔[2] پہلی صدی عیسوی میں یہ لبنان کا مشہور ترین آبگینہ ساز تھا۔ ایسے گلدان مصر، قبرص، شمالی اٹلی اور جنوبی روس میں پائے گئے۔[3] اغلب ہے اس کے کارخانے کا ایک دفتر روم میں بھی ہو۔ ایک اور آبگینہ ساز نے کولون میں دفتر قائم کر رکھا تھا، جو دریائے رھائن پر واقع ہے۔ صور کے ایک کارخانہ آبگینہ سازی کی مصنوعات وینس میں ملیں۔ ایسے تاجر آبگینے اور معدنیات کی جو چیزیں لے جاتے تھے، وہ نمونوں کا کام دیتی تھیں۔ پھر مقامی صناع اور کاریگر ایسی ہی چیزیں بنا لیتے تھے۔ بعض لوگ چیزیں درآمد بھی کرتے تھے اور برآمد کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ برآمد کی تجارت میں اٹلی اور یونان کے ظروف گلی، ہسپانیہ کی خشک مچھلی، شمالی و مغربی یورپ کے اونی پارچے شامل تھے۔ پانچویں صدی اور بعد کی صدیوں میں ٹیوٹانیوں کے حملے شروع ہو گئے، تاہم یہ حملے شامی و لبنانی تاجروں کی تجارتی سرگرمی اور ہمت و جوش پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔

اموردیانز (فرانس) میں ان کی نو آبادی اس درجہ مطمئن تھی کہ ۵۸۵ء میں شاہ گونتر اندس شہر میں داخل ہوا تو شامی اور لبنانی تاجروں نے شامیوں، لاطینیوں اور یہودیوں کی زبان میں اس کی مدح کے گیت گائے۔[4] پیرس میں میروونجی بادشاہوں کے ماتحت شامی و لبنانی نو آبادی اس درجہ ذی اثر تھی کہ ۵۹۱ء میں انھوں نے اپنے ایک تاجر ممبرکو، جس کا نام یوسیبیس تھا، شہر کا بشپ منتخب کر لیا۔ نئے بشپ نے پیشرو کے تمام افراد برطرف کر کے اپنے آدمی رکھ لیے۔[5] شامی و لبنانی تاجر، سپاہی، غلام اور آباد کار چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں مسیحی مذہب کی تبلیغ کا بھی ویسا ہی جوش اور شوق رکھتے تھے، جیسا قبل ازیں انھیں پیشتر کے بت پرستانہ مراسم کی تبلیغ کا شوق تھا۔ مغرب نے مسیحیت کے نشوو ارتقاء پر جو اثر ڈالا، وہ درویشی، رہبانیت اور جذباتی

---

[1] دالڈزنگ کی کتاب جلد سوم صفحہ ۵۲۶، ۵۲۷، لاطینی سکے جلد سوم ضمیمہ ۱۴۱۶۵ + [2] Ennion +
[3] ہیشل ہیم صفحہ ۱۸۹، دوسرے آبگینہ سازوں کے نام کے لیے دوسا کی کتاب شام جلد اول (صفحہ ۲۳۰-۲۳۴) ملاحظہ فرمائیے + [4] گریگوری ساکن توراز کی تصنیف کتاب ۸، باب ۱ + [5] ایضاً کتاب ۱۰، باب ۲۶

Marfat.com

نمونے کی پرستاری اختیار کر لینے سے ظاہر ہے۔ اُنھوں نے چھٹی عہدِ عیسوی تک جو عناصر اِس مذہب میں داخل کیے، ان میں سے ایک عنصر یہ بھی تھا کہ صلیب کے لیے دلوں میں خاص عقیدت پیدا کی اور اسے مذہبی نشان بنا لیا۔ ساتویں اور آٹھویں عہدِ عیسوی میں روم کے اندر انھیں خاصا اثر حاصل تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے کئی پوپ مہیا کیے، جن میں سے دو کو باقاعدہ ولایت کا درجہ دیا گیا[1]۔ مریم عذرا کے اعزاز میں روزِ شن کینھوا کے جو جشن مناتے ہیں، وہ انھیں شامی پوپوں کی وجہ سے جاری ہوئے۔

---

[1] لوئی بریہیر کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۳۹-۴۳، صفحہ ۵۴-۵۵، صفحہ ۵۹، ۶۲، حتی کی تاریخ شام صفحہ ۴۸۵۔

# چودھواں باب

## ذہنی رجحانات

**فلسفی اور عالم**

رومیوں کے ابتدائی دور میں فونیقی شہروں کے اندر جس علمی اور ادبی سرگرمی کا مظاہرہ ہوا، وہ پیشتر کی ایسی تمام سرگرمیوں سے غالباً بڑھ گئی تھی۔ سٹرابو[1] (وفات ۲۴ء) صیدانیوں کے متعلق کہتا ہے کہ "وہ ہیئت اور حساب کے علوم میں فلسفی ہیں"۔ ساتھ ہی بتاتا ہے کہ میرے زمانے میں علم کا سب سے بڑا ذخیرہ فونیقی شہروں کے اندر پایا جاتا تھا۔ اس نے بوئیتھس کا ذکر بہ طور خاص کیا ہے، جس کے ساتھ مل کر اس نے فلسفۂ ارسطو کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ بوئیتھس کے بھائی ڈیوڈوٹس کو بھی مشہور فلسفی قرار دیتا ہے، لیکن اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ دوسرے کلاسیکی مصنفوں نے مشہور فونیقی شاعروں کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے نام بھی محفوظ نہیں رہے۔ صیدا کے علاوہ متعدد شہروں — ببلوس، صور اور بیروت — نے اس عہد کی ذہنی پیداوار میں اضافہ کیا۔

ببلوس کے فلو (۶۴ء-۱۶۱ء) نے یونانی زبان میں ایک نہایت اہم کتاب تصنیف کی، جس کی عام حیثیت افسانوی بھی تھی اور تخلیق و آفرینش پر بھی اس میں بحث کی گئی تھی۔ اس کتاب میں وہ فونیقیوں کے مذہب پر بھی بحث کرتا ہے اور اس سلسلے میں اس نے مصر و بابل کے ماخذ سے استفادہ کیا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ میں نے ابتدائی دور کے ایک فونیقی مصنف کی سند پر یہ سب کچھ لکھی، جس کا نام سینچونیا تھن[2] بتایا گیا ہے۔ وہ چھٹی صدی عیسوی میں بیروت کا ایک پُراسرار باشندہ تھا۔ یوسیبیس[3] کی کتاب میں اس کتاب کا ایک حصہ محفوظ ہے، لیکن یہ فونیقی ماخذ مدت تک محلِ نزاع رہا۔ اغاریت کی کھدائی میں مٹی کی تختیاں برآمد ہوئیں تو سینچونیا تھن کی تاریخی حیثیت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ جو معلومات اس سے منسوب کی گئی ہیں، ان کی کئی شہادتیں مل گئیں اور تازہ افسانوی دستاویزیں بہ طور خاص قابل توجہ ہیں۔ حقیقت

---

[1] کتاب ۱۶، باب ۲۔ [2] Sanchuniathen، فونیقی سکون یاتون یعنی سکون خدا نے دیا ہے۔ [3] کارل میولر یونانی تاریخی اجزاء جلد سوم صفحہ ۵۶۳۔ فلو کے متعلق جو کچھ تھا، وہ جرمن میں سینچونیا تھن کے نام سے ترجمہ ہوا۔

Marfat.com

یہ ہے کہ تحقیقوں کی روشنی میں فلو کے بیانات کا جائزہ لیا جائے تو وہ حد درجہ مستند اور درست ثابت ہوتے ہیں۔ سینچونیاتھن کے بیانات میں ایک لبلل کا افسانہ مذکور ہے، جو عمور کا بانی تھا اور اپنے بھائی اسوس[1] سے لڑا، جسے شکاری قرار دیا گیا ہے اور وہ جانوروں کی کھالیں پہنتا تھا۔ یہ افسانہ حضرت یعقوبؑ اور عیسو کے درمیان منازعت کا نقشی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے زراعت پیشہ حضریوں اور خانہ بدوش شکاریوں کے درمیان ہمیشہ نمایاں ہونے والی رقابت کا ایک مرقع سامنے آتا ہے، جو سرحدوں پر رہتے تھے، یعنی جہاں مزروعہ زمینیں صحرائی علاقے سے متصل تھیں۔

دوسری صدی عیسوی کے نصف اول میں میرنیوس[2] نام ایک شخص عمور کا باشندہ تھا۔ اس نے زمانۂ قدیم کے ریاضیاتی جغرافیہ کی بنیاد رکھی۔ وہی شخص بطلیموس کا قریب ترین پیشرو تھا۔ بطلیموس اکثر اس کا ذکر کرتا ہے، بلکہ کہتا ہے کہ میری کتاب میرینوس کی کتاب پر مبنی ہے[3]۔ میرینوس نے نقشے تیار کیے، جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں مختلف بلاد و دیہات کے مقامات طول بلد اور عرض بلد کی بنا پر متعین کیے گئے تھے اور اس طرح مقامیت کے متعلق بے یقینی ختم کر دی گئی تھی۔

## خطابت

اس عہد کی ذہنی زندگی میں درجۂ اول حاصل کرنے کے لیے عمور اور صیدا کے درمیان مسابقت جاری تھی۔ عمور کا ایک عالم میکسیمس[4] (تقریباً ۱۲۵ء تا ۱۸۵ء) تھا سوفسطائی[5] تھا۔ وہ کموڈس (۱۸۰ء تا ۱۹۲ء) کے عہد حکومت میں روما اور ایتھنز کے اندر گھوم پھر کر تقریریں کرتا اور وعظ کہتا۔ اس میں چنداں جدّت فکر نہ تھی، البتہ خطابت خوب جانتا تھا۔ نظری اعتبار سے خطیب اس شخص کو کہتے تھے، جو عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرتا اور لوگوں کو پیروی کرنے کی تعلیم دیتا[6]۔ عملی اعتبار سے خطیب اس شخص کو کہتے تھے، جو جگہ جگہ گھومتا پھرتا اور خطابت کے جوہر دکھاتا۔ خطابت اس زمانے میں ادبی کمالات کی نمائش کا ایک مقبول ذریعہ تھی۔ نامی خطیبوں میں سے ایک شخص لبانیوس بھی تھا (۳۱۴ء تا ۳۹۲ء)۔ یہ انطاکیہ کا باشندہ تھا اور نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے لبنان سے کچھ تعلق ضرور تھا۔ اس کے خطبوں کا خاصا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا تھا۔

---

[1] Usoos ۔ [2] Marinus ۔ [3] جغرافیہ کتاب اول: باب ۶ - ۷ ۔

[4] Maximus ۔ [5] یونان قدیم میں سوفسطائی ان لوگوں کو کہتے تھے، جو علم حاصل کرتے اور تعلیم دیتے۔ پھر یہ لفظ اجرت پر تعلیم دینے والوں کے لیے استعمال ہوا۔ یہاں اس سے یہی مراد ہے۔

[6] میکسمس کے انتقادی مطالعے کے لیے دیکھیے کارل میزر کی جرمن کتاب۔

Marfat.com

لبانیوس پر یونانیت کا اتنا گہرا اثر تھا کہ جب انطاکیہ میں اس کے تلمیذ ارشد نے جو آگے چل کر کریسوسٹم[1] کے لقب سے مشہور ہوا، یونانی دیوتاؤں کو ترک کر کے مسیحیت قبول کر لی تو اسے یعنی لبانیوس کو سخت مایوسی ہوئی بلکہ دکھ پہنچا۔ صور کا ایک اور سوفسطائی خطیب ایڈربانوس (۳۱۳ء تا ۳۹۳ء) تھا، جو دنیا کے دو ذہنی مرکزوں یعنی ایتھنز اور روم میں خطابت کی تعلیم دیتا رہا۔

## فلاطونیت جدیدہ

ان توفیقی فلسفیوں سے زیادہ اہم پورفری[2]، جس کا اصل نام ملک تھا (بادشاہ کے لیے سامی لفظ) پورفری صور میں پیدا ہوا (بعض کہتے ہیں، بطانیہ میں، جو حوران کے جنوب میں ہے)، پیدا ہوا (۲۳۳ء) ۔ شہر میں تعلیم پائی، پھر مصری عالم پلوٹینس کی شہرت نے اسے روم کھینچ لیا۔ یہی پلوٹینس جس نے یونانی اور مشرقی افکار کے امتزاج و ترکیب سے وہ چیز پیدا کی، جو فلاطونیت جدیدہ کے نام سے مشہور ہے۔ روم میں پورفری اپنی وفات (۳۰۴ء) تک تعلیم دیتا رہا۔ اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اپنے استاد کے فلسفیانہ مقالات فراہم کیے اور انھیں نو نو کے چھ مجموعوں میں مرتب کر کے شائع کیا۔ اگر پورفری یہ کام انجام نہ دیتا تو پلوٹینس کے متعلق نام کے سوا کچھ معلوم نہ ہو سکتا۔ پورفری کثیر التصانیف شخص تھا۔ اس کی ستتر تصانیف بیان کی گئی ہیں[3]۔ جن میں فلسفہ، صرف و نحو، خطابت، حساب، جغرافیہ اور موسیقی کی کتابیں شامل ہیں۔ اس نے ایک رسالہ مسیحیوں کے خلاف لکھا۔ تھیوڈوسیس ثانی (۴۴۸ء) کے زمانے میں یہ رسالہ برسرِ عام نذرِ آتش کیا گیا[4]۔ مسیحیت مشرق کا مذہب تھی۔ اس نے مغرب کے اوضاع زندگی بدل دیے۔ فلاطونیت جدیدہ بھی جسم و روح کے اعتبار سے مشرقی ہی تھی۔ اس نے مغرب کے فلسفے کی ہیئت میں تغیر پیدا کر دیا۔

یمبلیقوس[5] (۲۵۰ء تا ۲۲۵ء) بھی پورفری کا ایک شاگرد تھا۔ یہ چالسس (شمالی شام میں عنجر) میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کے عام طریقے کی پیروی نہ کی اور وطن ہی میں عمر گزار دی اور وہاں اپنا دبستان قائم کیا، جو غالباً افامیہ (دریائے عاصی کے کنارے) میں تھا۔ اس کی

---

[1] Chrysostom ، اس کے لفظی معنی ہیں زرّیں دہن یا زرّیں گلو۔ اس شخص کا نام جان یعنی یوحنا تھا اور وعظ و تقریر کی بے مثال خوبیوں کے باعث اسے یہ لقب مل گیا تھا۔
[2] Porphyry ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ملبس بہ لباس ارغوانی شاہی۔ عربی میں غالباً اسے فرفریوس کہتے ہیں۔
[3] دیکھیے بدیز کی فرانسیسی کتاب ضمیمہ ۷۔
[4] ایضاً صفحہ ۶۵-۷۹۔
[5] Jamblichus ۔

Marfat.com

تحریر کے ایک دلچسپ ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے تاریخی انتقاد سے کام لے کر، جو دورِ حاضر کا ایک طریقِ بحث ہے، صحیفۂ دانیال کی تصنیف کی تاریخ متعین کی۔ اس کی ایک تصنیف قرونِ وسطیٰ میں نصابِ منطق کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ الٰہیات کے مباحث میں اس نے اعداد کے مباحث بھی شامل کر لیے اور فیثاغورسیوں کے نئے طریقے کے مطابق وہ انھیں ریاضیات پر ترجیح دیتا ہے[1]۔ پورفری کی رائے کے خلاف وہ حیوانات کو عقل سے خالی مانتا ہے۔ اس کے شاگردوں اور آگے چل کر نوفلاطونیوں نے بھی یمبلیقوس کو پیشوا مان لیا، لیکن دورِ حاضر کے علماء کا بیان ہے کہ یمبلیقوس نے جادو اور عجائب کاریوں کے ذریعے شہرت حاصل کی۔

## لاطینی ادبیات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یونانی زبان رومیوں کے ابتدائی دور میں مشرقِ قریب کی عام زبان تھی۔ یہ لوگوں کی ادبی زندگی میں گہری جڑ پکڑ چکی تھی اور محض حکومت کے بدلنے سے اسے اکھاڑا نہیں جا سکتا تھا۔ علاوہ بریں اہلِ روم خود اس زبان کو پسند کرتے اور سیکھتے تھے۔ بیروت مشرقی یونانیت کے سمندر میں ایک[52] لاطینی "جزیرہ" تھا۔ وہاں ایک مشہور لاطینی مصنف پیدا ہوا جس کا نام مارکس ویلیریس پروبس[53] تھا۔ غالباً دوسرے لوگ تاریخ کے حافظے سے محو ہو گئے۔ پروبس پہلی صدی عیسوی کے نصفِ ثانی میں گزرا ہے۔ اس نے سپاہی کی حیثیت میں زندگی شروع کی، لیکن روم میں مقیم ہو کر اپنی تمام تر توجہات کلاسیکی ادب کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیں۔ وہاں اس نے ورجل، ہوریس اور دوسرے بڑے شعراء کے انتقادی ایڈیشن مرتب کیے اور اس طرح آئندہ کے شہنشاہی دور کے کلاسیکی ادب کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ وہ لاطینی لسانیات، صرف و نحو اور ادبی نقد و نظر کے ممتاز ماہروں میں شمار کیا جانے لگا۔

## سریانی

ارامی زبان ملک کی خاص بولی تھی۔ اس میں تصانیف کا سلسلہ لاطینی سے بھی کم ہے۔ مسیح کے وعظ ارامی میں ہوتے تھے۔ ان کے جو سوانح حیات اس زبان میں مرتب ہوئے، وہ ناپید ہو گئے۔ رومی شہنشاہی کے ابتدائی دور میں ان سوانح کا ترجمہ اجنبی یونانی زبان میں ہوا۔ انھوں نے لاطینی و یونانی زبان کے پورے ذخیرے سے بھی کہیں زیادہ نشو و ارتقاء انسانیت پر

---

[1] ایڈورڈ زیلر کی جرمن کتاب جلد سوم حصہ دوم صفحہ ۷۰۰۔ [52] مومسن کی کتاب "صوبے" جلد دوم صفحہ ۱۳۰۔ [53] Marcus Valerius Probus۔

پائدار و خوشگوار اثر ڈالا۔ اس علاقے نے مسیحیت اختیار کر لی تو سریانی زبان، جو ارامی ہی کی ایک شاخ تھی، مقامی ترمیمات کے ساتھ شام، لبنان اور دوآبہ دجلہ و فرات کے کلیساؤں کی زبان بن گئی۔ تیسری صدی سے ادبی مقاصد کے لیے یہ زبان خوب پھیل گئی۔ اس کی اصل وجہ قومی احساس کی تازگی سے کہیں بڑھ کر مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت تھی۔ سریانی ادب کی ابتدا اناجیل کے ترجمے سے ہوئی، جس کا مرکز ایڈیسا (الرّہا، عرفہ) تھا۔ ارامی مسیحیوں نے الرّہا کی بولی اختیار کر لی اور اسے کلیسا، ادبیات اور مہذب معاشرے کی زبان بنا لیا۔ وہ لوگ "سریان" مشہور ہوئے۔ ان کا ابتدائی نام ایک وقت دلوں کے اندر بت پرستی سے منسوب رہا تھا۔ اس لیے وہ ناخوشگوار معلوم ہونے لگا۔ اس وجہ سے ابتدائی سامی نام یعنی ارامی بالعموم ترک کر دیا گیا۔ اس کی جگہ یونانی نام یعنی سریانی باشندوں کے لیے اور سریانی زبان کے لیے استعمال ہونے لگا۔ سریانی کو لبنانی ادب میں مارونیوں کے ظہور کے بعد مرکزی حیثیت حاصل ہوئی +

Marfat.com

# پندرھواں باب

## لبنان میں مسیحیت

**مسیح** سن عیسوی کے آغاز سے چھ سال پیشتر یا اس کے آس پاس بیت اللحم کے چھوٹے سے قصبے میں وہ شخصیت پیدا ہوئی، جس نے نہ صرف تاریخ کو دو دوروں میں تقسیم کیا بلکہ حقیقتاً اس کی پوری روش بدل ڈالی۔ اس زمانے میں فلسطین و لبنان دونوں صوبۂ شام کے اجزا تھے۔ رومی حاکم[1] انطاکیہ میں رہتا تھا۔ اس وقت تہذیب و روشنی کا مرکز رومہ تھا، جسے ملکۂ عالم سمجھا جاتا تھا اور وہاں جلیل المنزلت سیزر نے کچھ ہی دیر پیشتر اپنا تختِ شکوہ بچھایا تھا۔ کسی معاصر مورخ کو اس امر سے کیا خاص دلچسپی ہو سکتی تھی کہ ایک نجار کا بیٹا، جو ایک صوبے کے دور افتادہ گوشے میں پیدا ہوا تھا، تعلیم دے گا، وعظ کہے گا، امراض کا علاج فرمائے گا اور اپنے عقیدے کے لیے صلیب کی سزا قبول کرے گا[2]۔ آئندہ حالات کا بہتر سے بہتر اندازہ کرنے والا بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند ہی سال میں حواری اور پیرو اس شخصیت کا پیغام مہذب دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں گے۔ یہ بات بھی کسی کے خیال میں نہیں آ سکتی تھی کہ یہ پیغام خود بخود دوامی شکل اختیار کر لے گا اور ہمیشہ پائدار رہے گا۔ تاہم حقیقت ہے کہ یہ سادہ سا پیغام ہر نظامِ فلسفہ اور رومہ و یونان کے ہر عقیدے پر فوقیت لے گیا۔ چند عام یہودیوں اور ارامیوں کا مذہب سلطنت کے ختم ہو جانے سے بعد بھی خاصی دیر تک قائم رہا۔ بظاہر وہ پائدار اور دائمی نظر آتا تھا، لیکن زوال میں آ گیا اور تاریخ کے حافظے میں باقی رہ گیا۔

---

[1] اس کا نام کورنیس تھا۔ لوقا کی انجیل باب ۲، آیت ۲، یوزیفس اینٹی کوٹیز کتاب ۱۷ باب ۵، کتاب ۱۸ باب ۱؛ ٹیسیٹس کتاب ۵ باب ۹۔ لکھا ہے کہ کورنیس ۶ سنہ میں شام کا گورنر مقرر ہوا۔ ہیرودیس، جس کے آخری عہد میں حضرت مسیح پیدا ہوئے، ۴ سنہ ق م میں مرا۔

[2] یہ سب کچھ مسیحی مصنف نے مسیحی معتقدات کے مطابق لکھا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ ہمارے علم کے مطابق اکثر مسیحیوں کو بھی اس سے پورا اتفاق نہ ہوگا۔

Marfat.com

نئے پیغام کا کلیدی نکتہ محبت کے سوا کچھ نہ تھا ــــ خدا کی محبت اور انسان کی محبت ــــ خود خدا سراپا محبت بن گیا۔ محبت کی بدولت حضرت مسیح کے پیروؤں نے پورے عالم انسانیت کو ایک کنبہ بنا دیا، جس کا ایک مربّی تھا یعنی خدا۔ یوں دنیا میں ایک عالمی نصب العین کی مؤثر ابتدا ہوئی، جہاں پہلے صرف مختلف خطّوں کے الگ الگ نصب العین بروئے کار آتے رہے تھے۔ اب اس امر پر زور دیا گیا کہ انسان کو بے غرضانہ خدا کی عبادت اور انسان کی خدمت انجام دینا چاہیے رسموں اور ریتوں کے مقابلے میں باطنیت اور روحانیت کو مرکزی اہمیت بنایا گیا۔ عقیدے سے کہیں بڑھ کر عمل و کردار پر زور دیا گیا۔

یونانیت میں بے شمار عقیدے تھے، مگر کسی کا بنیادی فلسفہ اس نوعیت کا نہ تھا۔ صرف رواقیت اس کے لگ بھگ پہنچی تھی۔ کسی نے مسکینوں، غم زدہ اور بے یار و مددگار لوگوں کو ایسا اہم پیغام نہیں دیا تھا۔ کسی نے حیات بعد الموت پر اتنی توجہ نہیں کی تھی۔ عبرانیوں نے قوم کے لیے غیر فانی ہونا تسلیم کیا تھا نہ کہ افراد کے لیے۔ یونانیوں اور رومیوں نے یہ منصب صرف منتخب لوگوں کے لیے تجویز کیا تھا یعنی اُن لوگوں کے لیے جو عوام کے محسن اور بہی خواہ ہوں اور جو کسی پُراسرار مذہب میں داخل ہو جائیں۔ نیا مذہب اپنے تصوّرات، اخلاق، معاد اور اعتقادی کیفیات کے اعتبار سے ان روحانی، ذہنی اور مجلسی تقاضوں کو پورا کرتا تھا، جو ہر جگہ کے روشن خیال لوگ اپنے روایاتی مذہب پر مسلسل چسپاں کرنے کی ناکام کوششیں کرتے رہے تھے۔

مسیحیت ایک سامی مذہب تھی۔ اسے حد درجہ تصنّع پرست یونانی و رومی دنیا میں رفتہ رفتہ ہی قدم بڑھانے کا موقع مل سکا۔ خوشگوار بنانے کے لیے اسے ایک حد تک یونانیت کا رنگ دیا گیا۔ اس عمل کا آغاز پولوس رسول سے ہوا جو سلیشیا کا ایک یہودی تھا اور اپنے آپ کو رومی شہری کہتا تھا۔ وہ یونانی زبان اور یونانی فلسفہ بھی جانتا تھا۔ لبنان اس وقت تک سامی ملک تھا، اگرچہ اس پر یونانیت کی ہلکی سی تہ چڑھ چکی تھی۔ وہاں نئے مذہب سے گہرے تعلقات کا آغاز ہوا اور مزاحمت بہ حیثیت مجموعی خوفناک نہ تھی۔ یہاں اس مذہب کو ابتدائی دو صدیوں میں زبردست حریفوں سے سابقہ پڑا۔ اوّل بعل (بعل)، جس نے جوپیٹر (زیوس) کا روپ دھار لیا تھا اور اس کا مرکز ہیلیوپولس (بعلبک) تھا۔ دوسرا اشترتموز کا مجموعہ، جس کا مرکز بیلوس تھا۔

**پہلا مسیحی مرکز**

جلیل کے نبی کی شہرت ابتدائی دور ہی میں صور و صیدا[1] پہنچ گئی اور جن لوگوں کو

[1] صور و صیدا کا یکجا ذکر "عہد نامہ جدید" میں دس مرتبہ آیا ہے مثلاً متی باب ۱۱ آیت ۲۱، ۲۲، باب ۱۵ آیت ۲۱، مرقس باب ۳ آیت ۸، باب ۷ آیت ۲۴، ۳۱، لوقا باب ۶ آیت ۱۷، باب ۱۰ آیت ۱۳-۱۴، اعمال باب ۱۲ آیت ۲۰۔

Marfat.com

اس کی تعلیمات اور بیماروں کی تندرستی سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان میں سے ایک گروہ ملاقات کے لیے اس کے پاس پہنچا[1]۔ خود حضرت مسیح نے ان دو شہروں کی سرحدوں تک سفر اختیار کیا[2]۔ جب آپ صور و صیدا کے درمیان تھے تو وہاں ایک شامی فونیقی عورت کی بیٹی کو بھلا چنگا کر دیا۔ اس سفر کے سلسلے میں اہم ترین منقولہ واقعہ یہی تھا۔ عام روایت کے مطابق جہاں یہ واقعہ پیش آیا، وہاں ایک گرجا بنا دیا گیا، جو چودھویں صدی کے وسط تک باقی تھا[3]۔ صیدا سے جنوب مشرق میں دو میل کے فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ ہے، جہاں کسی زمانے میں غالباً اشتارت کا معبد تھا اور اب یونانی کیتھولکوں نے حضرت مریم (سیدۃ المنطرہ) کے لیے گرجا بنا رکھا ہے۔ روایت یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت مریم اپنے فرزند کے صیدا آنے کا انتظار فرماتی رہیں۔ سٹیفن پہلا مسیحی شہید تھا۔ اس کی وفات پر جو لوگ پراگندہ ہوئے وہ انجیل کی اشاعت کے لیے فونیقیہ گئے[4]۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے ابتدائی دور ہی میں مسیحیت جنوبی لبنان کے اندر قدم جما چکی ہوگی ✦

صور مسیحی جماعت کا پہلا مرکز بنا۔ پولوس رسول یونان سے واپس ہوئے (تقریباً ۵۷ء) تو اس شہر میں ایک گرجے کی بنیاد رکھی، جس میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل تھے۔ ان کے پاس وہ سات روز ٹھہرے رہے۔ پھر یروشلم گئے اور یروشلم میں یہ ان کا آخری سفر تھا۔ صور کے مسیحیوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمت ور داعی کو تکلیف پیش آئے گی۔ چنانچہ انھوں نے یروشلم جانے سے روکا۔ رخصت کے لیے وہ بندرگاہ تک ساتھ گئے اور گھٹنے ٹیک کر دعا کی[5]۔ جنوبی جانب جاتے ہوئے رسول مذکور عکہ ٹھہرے۔ وہاں پہلے سے ایک مسیحی جماعت موجود تھی، جس نے آپ کا استقبال کیا[6]۔ اس وقت تک یعنی پہلی صدی کے وسط میں صیدا کے اندر بھی ایک مسیحی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جہاں پولوس رسول روم جاتے ہوئے ٹھہرے تاکہ خاطرداری سے مستفید ہوں[7]۔ صور جہاں پہلا لبنانی گرجا قائم ہوا، دوسری صدی کے اختتام تک ایک مسیحی اسقف کا مرکز بن چکا تھا۔ آگے چل کر اس اسقف کے ماتحت چودہ متعلقہ علاقے تھے۔ اس گرجے کے ہال میں ایک عالم مسیحی پادری اوریجن[8] کی ہڈیاں دفن کی گئیں (۲۵۴ء) جو سکندریہ کی درس گاہ سوال و جواب کا رئیس تھا، پھر قیصاریہ چلا گیا۔ یہ گرجا ڈایوکلیشن کی جاری کردہ سخت گیریوں کے دوران میں (۳۰۳ء) تباہ ہوا۔ ۳۱۴ء کے آس پاس قسطنطین اعظم کے عہد میں اسقف

---

[1] مرقس باب ۳، آیت ۸، لوقا باب ۶، آیت ۱۷ + [2] متی باب ۱۵، آیت ۲۱-۲۸ مرقس باب ۷، آیت ۲۴-۳۱ +
[3] بزاعف فان سوشم کی کتاب "بیان ارض مقدس" مترجمہ آبرے سٹیورٹ صفحہ ۵۰ + [4] اعمال باب ۱۱، آیت ۱۹ +
[5] ایضاً باب ۲۱، آیت ۴، ۶ + [6] ایضاً ایضاً آیت ۷ + [7] ایضاً باب ۲۷ آیت ۳ + [8] روایات میں اس کی قبر وہ بتائی جاتی ہے، جو مشہور ساحر ادیانوس کی ہے +

Marfat.com

پالینوس نے زیادہ وسیع اور شاندار ہال تعمیر کرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ فونیقیہ میں یہ سب سے زیادہ شاندار گرجا تھا۔ جب اس گرجے کا افتتاح ہوا تو یوسیبس بابائے تاریخ کلیسا اور اسقف قیساریہ نے جو خطبہ دیا، وہ اس کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ خطبہ اس آدمی نے دیا تھا جس کی علاحیتیں معمولی ہیں[۱]۔ صور ہی میں کلیسا کی ایک کونسل منعقد ہوئی، جس میں اتھاناسیوس اسقف اسکندریہ کو مردود قرار دیا گیا (۳۳۵ء)۔

کہا جاتا ہے کہ اتھناسیوس ہی کا ایک پیرو، جس کا نام فرومینٹس تھا اور وہ صور کا باشندہ تھا، حبشہ میں مسیحیت کی اشاعت کی۔ یہ ۳۳۰ء کا واقعہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس جہاز پر مسیحیت کا یہ مبلغ روانہ ہوا تھا، وہ بحیرۂ قلزم میں تباہ ہوگیا۔ وہ سلامت خشکی پر اتر گیا، مگر اسے حبشہ میں غلام بنا لیا گیا۔ اس کے نیک اوضاع، ہوشمندی اور عمدہ کردار نے بادشاہ کو اتنا متاثر کیا کہ اسے آزاد کر دیا گیا۔ آخر اتھناسیوس نے فرومنٹیس ہی کو حبشہ کا اسقف بنا دیا۔ اس وقت حبشہ اور مصر کے کلیساؤں میں بڑا گہرا تعلق قائم رہا ہے۔

چوتھی صدی عیسوی تک صور کے شمالی ہمسایے عبیدا میں بھی ایک اسقفی مرکز بن چکا تھا۔ جن اسقفوں نے نونیقیہ کی عالمی مذہبی مجلس میں شرکت کی تھی (۳۲۵ء) اور جس نے اریا یوسیت کے خلاف وہ مجموعۂ عقائد تیار کیا تھا جو عقائد نیقیہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس پر مہر تصدیق ثبت کی تھی، ان کی فہرست میں عبیدا کے اسقف تھیوڈورس کا نام بھی ہے۔

## شمالی جانب پیشقدمی

شاہنشاہی قرائن کے باوجود شمال کی طرف سے مسیحیت کی تبلیغ جاری رہی۔ چوتھی صدی میں بیروت بھی ایک اسقف کا مقام بن گیا۔ مسیح کے حواری انطاکیہ اور یروشلم سے آتے جاتے، غالباً بیروت بھی ٹھہرتے رہے ہوں گے۔ جو بت پرست طلبہ تیسری صدی کے اواخر میں بیروت کے تعلیمی اداروں خصوصاً اس کی قانونی درسگاہ میں تعلیم پاتے رہے انہیں مسیحی بنا لیا گیا تھا۔ ڈائیوکلیشن اور میکسیمین نے ۳۰۳ء میں مذہبی جبر و تشدد شروع کیا تو ان طلبہ نے شہادت پائی۔ یوسیبس نے لمفیلوس کی بہت ستائش کی ہے، اسے بڑا ہی عمدہ حقیقی معنی میں بابرکت اور خدا کا بہت پیارا قرار دیا ہے۔ اس نے کلیسائی مورخ کو بائبل کے ستر علماء والے ترجمے کے مسودے کی نقل و تصحیح میں مدد دی تھی۔ خصوصاً اس نسخے کو جو اریجن نے چھ متوازی خانوں میں مرتب کیا تھا۔ لمفیلوس بیروت میں یا اس کے قریب پیدا ہوا تھا۔ اسی سے یوسیبس نے تعلیم پائی اور یوسیبس

---

[۱] تاریخ کلیسا کتاب ۱۰، باب ۴، نیز تاریخ کلیسا و شہدائے فلسطین جلد اول صفحہ ۳۰۱۔

نے احترام میں اپنے نام کے ساتھ اس کا نام بھی شامل کر لیا۔ پھر وہ قیساریہ میں منتظم پادری مقرر ہوا۔ وہ اور ایک پادری افیانوس (جسے یوسیبیس براہ راست جانتا تھا اور اس کا بڑا احترام کرتا تھا) بڑے دولتمند بت پرست خاندانوں میں سے تھے، جنھیں امرا کا درجہ حاصل تھا۔ افیانوس بھی بیروت میں تعلیم پاتے ہوئے مسیحی بنا تھا ان دونوں کو (لمفیلوس اور افیانوس کو) پہلے سخت اذیتیں دی گئیں، پھر قید میں ڈال دیا گیا[1]۔

مذہبی جبر و تشدد کا ایک اور شکار، جو زیادہ مشہور تھا، سینٹ جارج تھا۔ مقامی روایت — اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا اور بعض دوسرے مقامات بھی اس اعزاز کے مدعی ہیں — یہ ہے کہ بیروت ہی میں اس نے دیو کو قتل کر کے شہزادی کو چھڑایا تھا۔ اس کہانی کا ڈھانچا مسیحیت سے بیشتر کا ہے اور اس کے ماخذ یونانی، مصری اور بابلی ہیں۔ بیروت جس کھاڑی پر واقع ہے وہ سینٹ جارج ہی کے نام سے موسوم ہے یعنی "خلیج مارجرجوس"۔ حاکم نے دریائے بیروت کے دہانے پر ایک نہایت عمدہ گرجا تعمیر کرا کے اس متقدس شخصیت سے منسوب کر دیا۔ یہ گرجا سینٹ سرجیس (سرگیس) کے گرجے سے مقابلہ کرنے لگا اور شام و لبنان میں درجۂ اولیٰ کا مدعی بن گیا۔ سینٹ جارج صلیبیوں کے ذریعے سے یورپ کے ساتھ متعارف ہوا۔ چودھویں صدی میں انگلستان نے اسے اپنا مربی بنا لیا اور اس وقت سے انگلستان کے سنہری سکوں پر یہ نمودار ہوا۔ ۱۳۴۰ء میں ایک جرمن زائر ارض متقدس گیا تھا، اس کا بیان ہے کہ سینٹ جارج نے محض بیروت کو بلکہ پورے ملک کو مسیحیت کا پیرو بنایا تھا[2]۔

ڈائیو کلیشین اور اس کے رفیق و شریک کار میکسمین نے مذہبی جبر کا جو دور ۳۰۳ء میں شروع کیا تھا، اس کی آگ دس سال تک مصر، فلسطین، شام اور لبنان میں بھڑکتی رہی۔ ڈائیو کلیشین نے فرامین جاری کیے تھے کہ گرجے ڈھا دیے جائیں، مسیحی مذہب کی کتابیں جلا دی جائیں اور جتنے مسیحی فوجی و انتظامی اداروں میں ملازم ہیں، ان سب کو برطرف کر دیا جائے۔ میکسمین اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ اس نے حکم دے دیا کہ ہر مسیحی کے سامنے دو راستے پیش کر دیے جائیں — سلطنت کے دیوتاؤں کے لیے قربانیاں یا موت۔ علاقے کے جن مظلوموں کے اعضا کاٹے گئے، یا انھیں سولی دیا گیا، یا ڈبو کر مارا گیا، یا آگ میں جلایا گیا یا درندوں کے سامنے ڈالا گیا، ان کی صحیح تعداد معلوم کرنا مشکل ہے اس سے بیشتر بھی مسیحیوں پر مذہبی جبر ہو چکا تھا۔ مثلاً ٹراجن نے ۱۱۱ء میں حکم دے دیا تھا کہ جو مسیحی

---

[1] ملاحظہ ہو یوسیبیس ترجمہ جلد اول صفحہ ۳۴۴ سے آگے اور ۳۸۰ سے آگے، جلد دوم صفحہ ۱۳۱، ۳۳ ۔

[2] فان سوشم Suchem ترجمہ صفحہ ۴۸، ۴۹، ۱۳۵ ۔

Marfat.com

سلطنت کے دیوتاؤں اور شہنشاہ کے روبرو جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں، انھیں غدّار مان کر سزا دی جائے۔ ڈیسیئس نے ۲۵۰-۵۱ء میں ان تمام لوگوں کو سزا کا مستوجب قرار دیا تھا، جنھیں سلطنت کے دیوتاؤں کی پرستش سے انکار تھا۔ ویلیرین نے ۲۵۷-۲۵۸ء میں مسیحیوں کے لیے لازم قرار دیا کہ وہ نہ محض علی الاعلان دیوتاؤں کے لیے قربانیوں میں شریک ہوں بلکہ ان کے اجتماعات بھی حکماً ممنوع قرار دیے۔ تاہم یہ جبر مقابلتہً نرم تھا۔ شامی و لبنانی خاندان کے بادشاہوں میں اور کتنی ہی کوتاہیاں ہوں، لیکن وہ خاصے روادار تھے۔ ان میں سے آخری بادشاہ الیگزانڈر سیویرس[1] (۲۲۲ء تا ۲۳۵ء) کی ماں جولیا ماما ئیا[2] عرقہ کی فونیقی تھی۔ اس نے آریجن کے خطبے سنے۔ وہ خود مسیحیت کی معترف نہ ہوئی تاہم اسے مسیحیوں سے ہمدردی ضرور تھی۔ اس کا بیٹا جو شاہنشاہ بنا عرقہ کے اس معبد میں پیدا ہوا تھا، جو سکندر نے بنوایا تھا۔ اس نے اپنی پوجا بند کرادی اور اپنی عبادت گاہ خاص میں زرتشت، ابراہیمؑ اور مسیحؑ کے مجسمے نصب کرائے۔

چوتھی صدی کے آغاز میں پرانے اصنامی مذاہب کے معتقدوں، مستفیدوں اور ان کے ساتھ انتفاع کا علاقہ رکھنے والوں پر آشکارا ہو گیا تھا کہ مسیحیت روحانی دائرے میں برتری کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ سرکاری عاملوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ سلطنت زوال کی طرف جا رہی ہے، مگر مسیحیت کا رخ عروج و ترقی کی جانب ہے۔

**مسیحیت سرکاری مذہب بن گئی**

جس مذہبی تشدد کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے خوفناک تجربے کے بعد شاہنشاہی قوت مسیحیت کی تباہی کے لیے نہیں بلکہ اس کی اعانت کی طرف راجع ہو گئی۔ عمل معکوس کی ابتدا قسطنطین اعظم نے شروع کی۔ (۳۰۶ء) وہ دوسرے شہنشاہ کا رفیق و شریک تھا۔ ۳۲۴ء سے ۳۳۷ء تک وہ تنہا شاہنشاہ رہا۔ اس نے ۳۳۰ء میں قدیم بیزنطینی کی جگہ نیا دارالحکومت بنایا، جو اب تک اسی کے نام سے موسوم ہے[3]۔ دارالحکومت منتقل کرنے کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ سلطنت کے نصف مشرقی حصے کی اہمیت بڑھ گئی۔ روما کو جس بڑی سلطنت سے اب مقابلہ درپیش تھا، وہ ایرانی سلطنت تھی، جس کا احیا ہو چکا تھا اور وہ مشرق میں واقع تھی۔ گویا معاملات عالم میں مرکز ثقل پھر مشرق کی طرف لوٹ آیا تھا۔ نئے دارالحکومت کی تعمیر سے پیشتر قسطنطین، مسیحیت کو نیا سرکاری مذہب مان چکا تھا

---

[1] Alexander Severus

[2] Juliamanca

[3] یعنی قسطنطنیہ، جس کا موجودہ نام استنبول ہے۔

Marfat.com

اس نے ۳۱۲ء اور ۳۱۳ء میں شاہی سکّوں کے ذریعے سے اپنے دائرۂ اثر میں مسیحیوں کے ساتھ رواداری کے برتاؤ کی تلقین کی، بلکہ حمایت شروع کر دی۔[1] روایت یہ ہے کہ ۳۱۲ء میں اس نے مدِمقابل کے خلاف، جو روم میں تھا، پیش قدمی شروع کی تھی تو اس وقت مسیحیت اختیار کر چکا تھا۔ کیونکہ اس نے افق پر ایک درخشاں صلیب کا نشان دیکھا تھا، جس پر یونانی زبان میں یہ الفاظ منقوش تھے: "اس نشان کے ذریعے سے فتح حاصل کرو"۔ چنانچہ فاتح شاہنشاہ نے اسی کو شاہی پرچم کا نشان بنا لیا۔ اس کی والدہ ہیلینا بڑی خوش عقیدہ مسیحیہ تھی۔ وہ ارضِ مقدس کی زیارت کے لیے نکلی۔ اس سفر میں وہ صلیب دریافت کی جس پر (مسیحیوں کے عقیدے کے مطابق) حضرت مسیح کو موت کی سزا دی گئی تھی اور یہ صلیب اس مقام پر ملی تھی، جہاں آج کل کنیسۃ القیامۃ ہے۔ اس طرح مقدس مقامات کی زیارتیں شاہنشاہ اور اس کی والدہ نے شروع کیں۔ بتدریج سلطنت میں قبولِ مسیحیت کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس پہلے مسیحی بادشاہ نے یکے بعد دیگرے فرمان جاری کیے کہ جہاں کہیں اصنامی معبد اور مورتیاں موجود ہوں، برباد کر دی جائیں اور ان کے لیے قربانیاں اور نذریں ممنوع ہیں۔[2] نئی سلطنت کا مذہب مسیحیت تھا۔ زبان یونانی تھی اور اپنی نئی پالیسی کے مطابق وہ مشرقی بن چکی تھی۔ اس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ گوناگوں انقلابات کے باوجود یہ ۱۴۵۳ء تک قائم رہی۔ پھر عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا اور صلیب کی جگہ ہلال نے لے لی۔

مشرقی رومی یا بیزنطینی سلطنت اور مغربی رومی سلطنت کے درمیان آخری تقسیم ۳۹۵ء میں جاری ہوئی۔ جب تھیوڈوسیس اعظم (۳۷۹ء-۳۹۵ء) فوت ہوا اور اس کے دو بیٹوں میں سے ایک نے مغربی اور دوسرے نے مشرقی سلطنت سنبھال لی۔ تھیوڈوسیس بھی مسیحیت کی حمایت میں قسطنطین کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔ اس کے عہدِ حکومت میں بھی مسیحیت کی فاتحانہ رفتار جاری رہی۔ معبد بعلبک کے صحن میں جو گرجا ہے، کہا جاتا ہے اس کی عمارت تھیوڈوسیس یا قسطنطین نے بنوائی تھی۔ باقی رہا یہ الزام کہ وہاں کے مسیحیوں پر قسطنطین سے پہلے یا بعد ظلم ہوا تو اسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یوسیبیس لکھتا ہے کہ قسطنطین نے شہر میں بھی ایک بڑا اور عالی شان گرجا تعمیر کرایا۔[3] اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ شاہنشاہ نے اس بڑے معبد کو گرجا میں تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔

---

۱؎ ان شقوں کے متن کے لیے ملاحظہ فرمائیے یوسیبیس کی کتاب ۱۰، باب ۵ (ترجمہ جلد اول ص ۳۱۵)

۲؎ یوسیبیس کی کتاب: "بابرکت بادشاہوں کے سوانح حیات" صفحہ ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۹۳، ۱۹۴

۳؎ یوسیبیس کی کتاب: "بابرکت بادشاہوں کے سوانح حیات" صفحہ ۱۶۴

Marfat.com

مورخ مذکور لکھتا ہے: کہ اس گرجے کے لیے ایک بشپ کے ساتھ منتظم پادری اور انجمن کا رکن مقرر کردیے گئے۔ پانچویں صدی عیسوی سے ہیلیوپولس (بعلبک) کے بشپوں کا ذکر کیسی سرگزشتوں میں شروع ہوگیا تھا۔ یوسیبئس[۱] یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم انترادوس نے باشندوں نے قسطنطنیہ کو ازسرِنو تعمیر کیا۔ اسے یہ نام دیا، اس کے بُت جلادیے اور نجات دہندہ مذہب اختیار کرلیا۔

افقہ میں اصنام پرستی کا جوڑا حصار تھا، چونکہ اس کے مراسم اخلاقی قیود سے آزاد تھے[۲]، اس لیے قسطنطین نے اسے منہدم کرادیا۔

> یہاں درختوں کا ایک جھنڈ اور ایک معبد تھا، جو نہ کسی شہر کے درمیان واقع تھا اور نہ منظرِ عام پر تھا۔۔۔۔ بلکہ عام راستے سے الگ افامیہ میں کوہستان لبنان کی ایک چوٹی پر تھا اور یہ اس شیطان دیوی سے منسوب تھا جس کا نام زہرہ ہے۔ یہ بد اخلاقی اور نفس پرستی کے مردود پجاریوں کے لیے شیطنت و شر کا ایک مرکز تھا۔ یہاں مرد، جنھیں انسانیت کے نام کا مستحق نہیں سمجھنا چاہیے، اپنی صنف کا وقار فراموش کردیتے تھے اور اپنے بوالہوسانہ جذبوں کے لیے شیطان کی پرستش کرتے تھے۔ یہاں عورتیں اپنے جسموں کی ناجائز تجارت کرتیں، فحش کاری میں مصروف رہتیں، نیز دوسری خوفناک اور ناقابلِ بیان حرکتوں کی مرتکب ہوتیں[۱]۔

جولین نے (۳۶۳ء - ۳۶۱ء) میں اس کا ایک حصہ ازسرِنو تعمیر کرایا۔ قسطنطین کے جانشینوں میں سے صرف وہ تھا جس نے مسیحیت قبول نہ کی۔ تھیوڈوسیئس کا دور آیا تو یہ معبد متروک ہوگیا۔

بیروت کے بڑے حصے نے چوتھی عیسوی کے وسط میں مسیحیت قبول کی۔ ۳۱۹ء میں وہاں ایک تباہ کن زلزلہ آیا، جسے خدا کے غیظ و غضب کا نشان قرار دیا گیا اور جو لوگ اس وقت تک اصنام پرست تھے، ان سے کہا گیا کہ نیا مذہب قبول کرلیں۔ تھیوڈوسیئس کے زمانے تک صنمیت کا نیا نیا قطعی و قطعی ہوچکی تھی۔ پانچویں صدی کے شروع میں وہ محض لبنان ہی نہیں بلکہ شام و فلسطین کا مسیحی سرزمینیں بن چکے ہوں گے۔ صور کا ملکرت، بعلبک کا بدو، بیلوس وافقہ کی اشتارت، یسوع ناصری کے روبرو یکے بعد دیگرے سرنگوں ہوتے گئے۔

---

[۱] یوسیبئس کی کتاب: بابرکت بادشاہ کے سوانح حیات صفحہ ۲۰۵۔ [۲] ایضاً صفحہ ۱۶۰۔

Marfat.com

# سولھواں باب

## ہیلیوپولس اور بیروت

### رومی نوآبادیاں

دو لبنانی شہر، جو پہلے پردے کا نہیں آسکے تھے، رومی دور میں ممتاز حیثیت حاصل کرکے سامنے آگئے۔ ایک ہیلیوپولس، دوسرا بیروت۔ دونوں آگسٹس سیزر کے زمانے میں رومی نوآبادیاں بن گئے[1]۔ دونوں نے رومی تہذیب و ثقافت کے بڑے مرکزوں کی حیثیت حاصل کرلی، جن کا اثر عالمگیر رہا۔ ان میں سے ایک مذہبی اور دوسرا تعلیمی مرکز تھا۔

ہیلیوپولس (شہر شمس) یونانی نام تھا، جو سلوکیوں کے زمانے میں ایک قدیم سامی شہر پر چسپاں کیا گیا۔ جب یہاں کے بعل کو قطعی طور پر سورج دیوتا قرار دے دیا گیا۔ قیاس یہ ہے کہ ابتدائی سامی نام "بعل بقاع" تھا، یعنی بقاع کا مالک۔ البقاع اس میدانی علاقے کو کہتے تھے، جو دونوں پہاڑوں (مغربی اور مشرقی) کے درمیان واقع تھا۔ جب عربوں کا ظہور ہوا تو پرانا سامی نام پھر زندہ ہوگیا اور اس نے بعلبک کی شکل اختیار کرلی۔ بول چال میں اسے بعلبک کہتے ہیں۔ ہیلیوپولس میں اسی فوج کے دستے آباد ہوئے، جسے آگسٹس نے بیروت کے سلسلے میں استعمال کیا تھا۔ اس شہنشاہ کے سکوں پر نوآبادی کا نام "کالونیا، جولیا، آگسٹا، ہیلیوپولس"[2] مرقوم ہوتا رہا۔ اصل شہر تو بتی مذہب کا قدیم مرکز تھا۔ اس پر رومی اثر اسی طرح کم رہا، جس طرح بیروت بمقابلہ انطاکیہ یونانیت سے کم متاثر ہوا۔ بہرحال یہ انطاکیہ اور بیروت دونوں کے مقابلے میں سامیت کا زیادہ نمائندہ تھا۔ ہیلیوپولس کے باشندوں نے فصاحت و خوش گفتاری میں بڑی شہرت حاصل کرلی۔ یہ خصوصیت انھیں اپنے پہاڑی طرز کی دیویوں کی بدولت میسر آئی۔

---

[1] دیکھیے آکسفورڈ کلاسیکل ڈکشنری میں ہیلیوپولس اور بیروت پر مقالہ۔ اس میں مرقوم ہے کہ ہیلیوپولس سپٹیمیس سیورس کے عہد تک علاقہ بیروت میں شامل رہا۔ سیورس نے اسے الگ آبادی بنا دیا۔

[2] Colonia, Julia, Augusta Helio Polis

Marfat.com

Marfat.com

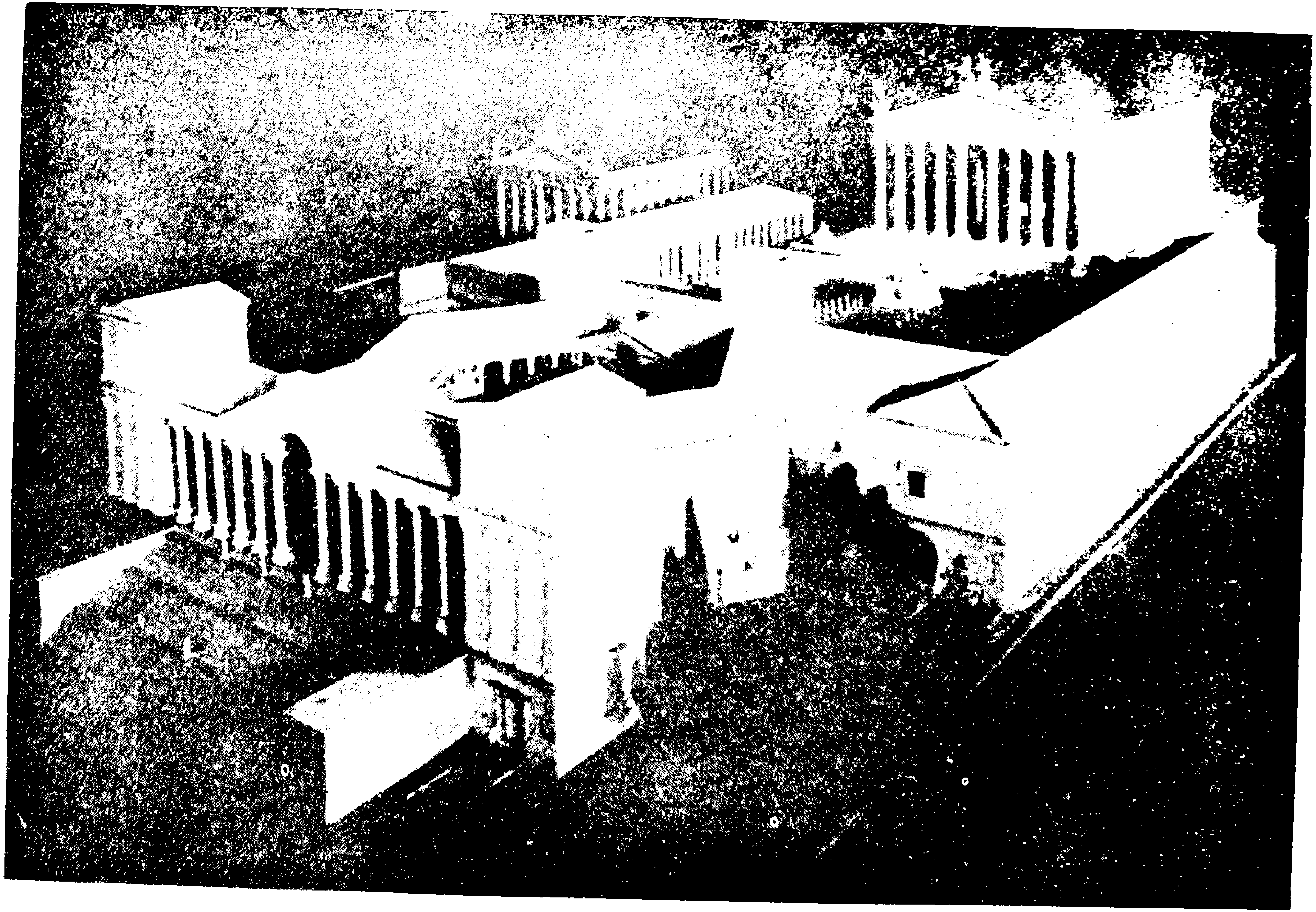

معبد بعلبک کا مثنیٰ

... کے اندر اس مندر کی توسیع کی اور اسے مکمل کیا

Marfat.com

یعنی یہاں کی عورتیں بڑی خوب صورت تھیں۔ یہ حسن شامی دیوی (آتار غاتس) کا عطیہ تھا، جو لبنانی پہاڑوں کی ہمسایہ ڈھلانوں میں اکثر پائی جاتی تھیں[۱]۔ علاوہ بریں یہاں کے مردوں اور عورتوں کے بعض طائفے بانسری بجانے میں سلطنت بھر کے اندر مشہور ہو گئے۔ انھیں محض جشنوں ہی کی تقریبوں میں نہیں بلکہ معبدوں میں مراسم عبادت ادا کرنے کے لیے بھی بلایا جاتا تھا، لیکن شہر کی عالمگیر شہرت کا مرکز اس کا معبد تھا، معبدوں کا وہ مجموعہ نہ تھا، جن کا ذکر بالاحصار کے طور پر کیا جاتا ہے۔

**معبدِ عظیم** ابتدا میں یہ معبد بڑے ارامی دیوتا ہدد کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، یعنی بجلی اور گرج کا دیوتا۔ وہ مہربان ہوتا تو مینہ برساتا، جس سے زمین میں زرخیزی پیدا ہوتی۔ نامہربانی پر آتا تو طوفان بھیجتا، جن سے فصلیں اور ریوڑ تباہ ہو جاتے۔ زراعت پیشہ لوگوں کے درمیان ایسا ہی دیوتا طبعاً مقبول ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شام و لبنان میں جا بجا اس دیوتا کے لیے معبد بن گئے۔ آگے چل کر ہدد دیوتا کے مذہب میں سورج دیوتا کی عقیدت کا امتزاج ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دیوتا کے سر کو کرنوں سے مزین کرنے لگے۔ ہیلیوپولس میں یہی کیفیت تھی۔ یونانیت کے دور میں اسے ہیلیوپولس کا جوپیٹر بنا لیا گیا۔ آگے چل کر یہ دمشق کے جوپیٹر کا مثنیٰ بن گیا۔

سلوکیوں کے زمانے سے پیشتر کے تونیقی معبد کا اب کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس معبد کی پیشگوئیاں رومی شہنشاہوں کے ہاتھوں بڑے پیمانے پر تعمیر نو سے قبل بہت مشہور تھیں۔ ٹراجن نے پارتھیا کے خلاف دوسری مہم پر روانہ ہونے سے پیشتر (۱۱۶ء) اس معبد کی پیشگوئیوں کا امتحان لیا، یعنی ایک سربمہر لفافے میں سادہ کاغذ رکھ دیا۔ جواب میں اسے ویسا ہی سادہ کاغذ واپس کر دیا گیا۔ اس طرح ٹراجن کی نظروں میں معبد کی پیش بینی نے بڑا احترام حاصل کر لیا۔ پھر اس نے عقیدت مندانہ استخارہ کیا۔ جواب میں بہ طورِ نشان لکڑیوں کا ایک مٹھا کپڑے میں لپٹا ہوا اس کے حوالے کر دیا گیا[۲]۔ آئندہ سال اس نے سلیشیا میں وفات پائی۔ معبد کی پیشگوئی کی یہ مکمل تعبیر تھی۔ اگرچہ اس کی حقیقت کا انکشاف دیر میں ہوا۔

اینٹونینس پائیس (۱۳۸ء۔ ۱۶۱ء) نے معبد کی توسیع میں بڑے اہتمام سے کام لیا۔ تعمیر کا سلسلہ اس کے دور کے جانشینوں میں بھی معمولی رفتار سے جاری رہا۔ ایک بالاحصار بن گیا،

---

[۱] کارل میولر کی فرانسیسی کتاب جلد ۲ صفحہ ۵۱۸۔

[۲] میکروبیس کی کتاب ۱، باب ۲۳۔

Marfat.com

جس میں ہدد کی اہلیہ اَنارغاتس (عشتارت، زہرہ) کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ کیراکلا (۲۱۱ء۔ ۲۱۷ء) اور اس کے پیشرو نے جو شامی و لبنانی خاندان سے تھا، معبد کی تعمیر اس پیمانے پر پہنچادی، جس کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس عمارت کی تصویر پہلے پہل کیراکلا کے باپ سپٹیمیس سیویرس (۱۹۳ء۔۲۱۱ء) کے سکوں کی پشت پر نمودار ہوئی۔ کیراکلا کی ماں — نہایت حسین و جمیل اور قابل خاتون جولیا ڈومنا — الہ الجبل حمص کے مذہبی پیشوا کی بیٹی تھی۔ اسے آگستا کا لقب دیا گیا اور وہ امورِ سلطنت میں اپنے شوہر کی شریک و رفیق رہی۔ اس کی چھوٹی بہن جولیا ماٹیسا اس سے بھی زیادہ قابل تھی۔ وہ بھی حمص ہی میں پیدا ہوئی۔ ایک رومی عامل سے شادی کرلی اور رومہ جا بسی۔ جب اس کا بھانجا کیراکلا قتل ہوگیا تو اس نے اپنے ایک نواسے ایلاگیبلوس[1] کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہی زمانہ ہے، جس میں رومہ اور اس کے علاقے کے دروازے شامی و لبنانی تارکین وطن کے لیے چوپٹ کھول دیے گئے۔ ایسے سپاہی بھی تھے جو رومی فوج میں دوسرے درجے کے بہترین عناصر مانے جاتے تھے[2]۔ انھوں نے بھی رومی سیاسیات پر خاصا اثر ڈالنا شروع کیا۔ کیراکلا اور اس کی ماں نے بھی ہیلیوپولس کی تصویر اپنے سکوں پر کندہ کرائی۔ معبد کے ستونوں کی کرسیوں پر اب تک ان دونوں کے اعزاز میں کتبے پڑھے جا سکتے ہیں۔ لاطینی کتبے میں بتایا گیا ہے کہ برنجی سکوں ان کے اعزاز میں رومی فوج کے ایک رکن نے پیش کیے اور ان کے بالائی حصوں پر ملمع کیا گیا تھا[3]۔ معبد کا نام فلپ عربی (۲۴۴ء۔۲۴۹ء) کے سکوں میں بھی مذکور ہے +

معبد کے درمیانی حصے میں دیوتا کا سنہری مجسمہ نصب تھا۔ مقامی لوگ اسے یوں پیش کرتے تھے کہ ایک بے ریش جوان نے جنگی رتھ چلانے والے کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں رعد کا کوڑا ہے، بائیں ہاتھ میں بجلی اور گندم کی بالیں[4]۔ اس طرح علت و معلول یک جا ہوگئے۔ خاص سالانہ جشنوں کی تقریب پر اس مجسمے کو ممتاز باشندے کندھوں پر اٹھا لیتے۔ یہ رسم بجا لانے سے پیشتر وہ سر منڈاتے، نیز پرہیزگاری و پاک دامنی کا حلف اٹھاتے۔ اس مقدس میں سیاہ پتھروں کا بھی بہت احترام کیا جاتا۔ ان میں سے ایک پتھر ایلاگیبلوس نے رومہ کے ایک مندر میں منتقل کردیا۔ بالاحصار نے ہیلیوپولس کو صدیوں تک خطۂ لبنان کا نہایت ممتاز شہر بنائے رکھا۔ صوبۂ شام میں انطاکیہ کے بعد اسی کا

---

ف۱ Elagabalus ۔ ف۲ راستوزلیف کی کتاب رومی سلطنت کی مجلسی و اقتصادی تاریخ صفحہ ۶۱۷ +

ف۳ "لاطینی سکے" جلد سوم، صفحہ ۱۳۸ +

ف۴ میکروبیس کتاب ۱، باب ۲۳ +

Marfat.com

درجہ تھا۔ مقدس کی حیثیت میں بالاحصار کے لیے تمام امتیازات مخصوص تھے، مثلاً اس کے دائرے میں جو شخص آجاتا، گرفت سے محفوظ ہو جاتا۔ اس کے نام زمین وقف کی جا سکتی۔ اسے تحصیلِ زر کا اختیار تھا اور اس میں رہنے والے لوگ سالانہ جشنوں کا انتظام کرتے۔ اس کا پورا نام جوپیٹر اوپٹیمس میکسیمس ہیلیو پولی ٹینس[1] تھا۔ تاجر اور سپاہی لبنان کے اس قدیم سامی دیوتا کو مغرب کی بہت سی سرزمینوں میں لے گئے۔

بالاحصار کے کھنڈر[2] اہلِ قلم اور سیاحوں کو صدیوں تک اس درجہ متعجب کرتے رہے کہ انھیں ہفت عجائباتِ عالم میں شمار کر لیا گیا۔ رومیوں کے دور کی کوئی عمارت ان کی ہم پلّہ نہیں اور مرکزی شہنشاہی شہر (روما) کی عمارتیں بھی مستثنیٰ نہیں۔ مسلمانوں نے تسخیرِ شام و لبنان کے بعد اسے قلعے کی شکل دے دی۔ اُنھوں نے اس تعمیر کو حضرت سلیمانؑ سے منسوب کر دیا[3]۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ایسی عمارت جنّوں کی خدمت حاصل کیے بغیر بن نہیں سکتی اور حضرت سلیمانؑ کے سوا کون جنّوں سے کام لے سکتا تھا۔ عام لوگ اسے اب تک قلعۂ بعلبک کہتے ہیں۔ مسجد، وضوگاہ اور محراب کے نشان بالکل واضح ہیں۔ اس قلعے کا ذکر سلجوقیوں کے سلسلے میں بھی آیا ہے۔ صلیبیوں اور مملوکوں کی جنگوں میں بھی۔ ۱۲۶۰ء میں عباسی بغداد کے فاتح ہلاکو کے ایک جرنیل نے اسے تباہ کر دیا۔ تاتاریوں اور زلزلوں کی تباہ کاریوں کے باوجود اس کا خاصا حصہ اب تک محفوظ ہے، جس سے دیکھنے والے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اسی حلقے میں جوپیٹر ہدد کے معبد کی جنوبی جانب آثارِ غاتس کے معبد کے کھنڈر ہیں، جو بڑے معبد سے چھوٹا تھا اور بہتر طریق پر محفوظ رہا۔ اسے عموماً باخوس[4] کا معبد کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پورے علاقے میں یہ سب سے زیادہ محفوظ اور سب سے بڑھ کر مزیّن معبدِ قدیم ہے۔ اس کا عظیم القدر اور عالی شان تراشا ہوا دروازہ پینتالیس فٹ اونچا اور پچیس فٹ چوڑا ہے اور اسے رومیوں کے تعمیری کارناموں میں سب سے اعلیٰ مانا جاتا ہے۔ جوپیٹر کی زیارت زرد پتھر کے بڑے بڑے ستونوں سے محصور ہے، جن کے بالائی حصّے کارنتھی وضع کے ہیں اور ان کے اوپر آرائشی پٹی لگی ہوئی ہے۔ ان ستونوں میں سے چھ آج تک بڑی شان سے قائم ہیں۔ ان کا رُخ کوہِ لبنان کی جانب ہے اور ان سے خاص عظمت و ہیبت ٹپکتی ہے۔ ایک انگریز سیاح نے لکھا ہے کہ ۱۷۵۱ء میں ان کی تعداد نو تھی۔ ایک فرانسیسی زائر کی روداد کے مطابق ۱۸۲۰ء میں یہ چھ ہی تھے۔

---

[1] Jupiter, Optimus, Maximus, Helio Polilanus، اس کا مطلب ہے ہیلیوپولس کا عظیم القدر جوپیٹر۔

[2] یہ مقام ایک جرمن مہم نے پش سٹائن (Ouchstein) کی سرکردگی میں ملبے سے صاف کیا۔ دیکھیے اس کی جرمن کتاب، نیز تھیوڈور ویگاں کی کتاب بعلبک جلد سوم۔ [3] دیکھیے ادریسی صفحہ ۱۵، نیز یاقوت کی معجم البلدان جلد اول صفحہ ۶۷۲، مقدسی صفحہ ۱۶۰-۱۸۶۔ [4] اس کے لیے ملاحظہ ہوں جرمن اور فرانسیسی کتابیں اور مقالے۔

Marfat.com

گویا تین ۱۷۵۹ء کے زلزلے میں گر گئے[1]۔ در اصل یہی ستون اب جوپیٹر ہدد کے پورے معبد کا بقایا ہیں۔ ہر ستون تین پتھروں سے بنا ہے اور بلندی باسٹھ فٹ سے کم نہیں۔ قطر ساڑھے سات فٹ ہوگا۔ دورِ حاضر کے ایک فرانسیسی مصنّف کا بیان ہے کہ اگر یہ ستون کسی وقت ناپید ہوگئے تو دنیا میں حسن کم ہو جائے گا اور لبنان کی فضا شعریت سے ایک حد تک محروم رہ جائے گی۔ سنگِ سماق کے جو ستون مصر سے تیار ہو کر آئے تھے، انھیں جسٹینین بعلبک سے قسطنطنیہ لے گیا اور سانتا صوفیا (ایا صوفیا) کا گرجا تعمیر کرنے میں استعمال کیے۔ ان میں سے ایک راستے میں ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ساتھ جو آرائشی پتیاں لگی ہوئی تھیں، انھیں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

معبد کا بڑا صحن جس میں قربان گاہ تھی، تقریباً تین سو چالیس مربع فٹ ہے۔ اس کے چار علی فِ[2] اڑتالیس ستون قائم تھے۔ اس کی مغربی جانب چھٹی صدی میں ایک گرجا تعمیر کیا گیا تھا، جس میں تین محرابیں تھیں، لیکن عموماً اسے قسطنطین یا تھیوڈوسیس سے منسوب کیا جاتا ہے، گویا یہ چوتھی صدی میں تعمیر ہوا[3]۔ معبد کی پوری عمارت بڑے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ یہ ایک بڑے پشتے پر قائم ہے، جو بڑی بڑی محرابوں کے سہارے بنایا گیا تھا۔ احاطے کی شمالی و مغربی دیواروں میں بڑے بڑے ترشے ہوئے پتھر لگائے گئے۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح زلزلوں کی صورت میں عمارت کو استوار رکھنا منظور تھا۔ ان میں سے تین پتھر، جو معبد جوپیٹر کے پشتے کی دیوار کو سہارا دے رہے ہیں، زمین سے بیس فٹ بلندی پر ہیں۔ ان میں سے ہر پتھر باسٹھ فٹ لمبا، چودہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ موٹا ہوگا اور ہر ایک کا وزن ساڑھے سات سو ٹن ہوگا۔ یہی ٹرلیتھان[4] کے مشہور تین پتھر ہیں۔ ان میں سے ہر پتھر اتنا بڑا ہے کہ اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر مربع مکان بنایا جا سکتا ہے، جس کی دیواریں کم از کم ایک فٹ موٹی ہوں گی، ہر ضلع کا طول ساٹھ فٹ ہوگا اور مکان کی اونچائی چالیس فٹ ہوگی۔ انھیں میں سے ایک پتھر، جو ان سے بھی بڑا ہے[5]، شہر کے حوالی میں اس مقام پر موجود ہے، جہاں سے پتھر کاٹ کر لائے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنگ تراش اتنے بھاری پتھر کو مقامِ تعمیر تک پہنچانے سے عاجز آگئے اور انھوں نے مایوس ہو کر اتنا مہتمم بالشّان منصوبہ ترک کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس پتھر سے ویسے چار سنگی ستون بن سکتے ہیں،

---

[1] دیکھیے رابرٹ وڈ کی کتاب بعلبک کے کھنڈر صفحہ ۲، ۲۲، ۲۴، والنے جلد دوم صفحہ ۲۱۸۔ دوسرے زلزلوں کا ذکر جن سے لبنان کو نقصان پہنچا، آگے آئے گا۔ [2] دیکھیے تھیرش کی کتاب، صفحہ ۲۰۔ [3] Trilithon، یعنی تین پتھر۔ [4] یہ حجر الحبلیٰ کہلاتا ہے، کیونکہ خوش عقیدہ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر بانجھ عورت اس پتھر پر ہو آئے تو اس کا بانجھ پن دور ہو جائے گا۔

جو کلوپیٹرا کی سُوئی[1] کہلاتا ہے اور اب نیویارک شہر سنٹرل پارک کی زینت بنا ہوا ہے +

ستونوں کے حجم کی زیادتی اور پتھروں کی بے پناہ جسامت کے علاوہ آرائش و شبیہ سازی کی فراوانی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہے، جو کچھی عمارتوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ آرائشی کاموں کے سلسلے میں گندم اور پوست کے پودے بنے ہوئے ہیں (موت اور حیات کے نشان) کردار جن پردہ اُٹھا رہے ہیں۔ عشق کا دیوتا کیوپڈ تیر کمان سنبھالے ہوئے ہے یا کسی اژدہے اور ڈالفن پر سوار ہے۔ ان کے علاوہ انگور کی بیلوں اور ہاروں سے دروازوں کے قدمچے آراستہ ہیں۔ بیلوں اور پتیوں کے درمیان کہیں کہیں ہندسی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ شہنشاہوں اور دیوتاؤں کے مجسمے ہیں۔ آتارغاتس کے معبد کے دروازوں پر جو بیل بوٹے ہیں، وہ نہایت دلکش ہیں +

بالا حصار سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مدوّر اور نہایت خوب صورت معبد ہے، جسے آثارِ قدیمہ کے جرمن ماہروں نے آس پاس کے باشندوں کے تصرّفات سے محفوظ کیا۔ اس کی طرزِ تعمیر شہنشاہی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ معبد زہرہ یا قسمت کی دیوی کے لیے مخصوص ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اسے گرجا بنا کر سینٹ باربرا سے منسوب کر دیا۔ اس طرح یہ محفوظ ہو گیا +

## بیروت

جو شہر سمندر کے کنارے واقع تھے، ان میں سے صرف بیروت نے تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ صیدا کو ایلاگیبلوس نے نو آبادی کے حقوق دے دیے تھے۔ صور کے لیے ہیڈرین نے مرکز کے اختیارات منظور کر لیے تھے۔ پھر سپٹیمیس سیورس نے اسے نو آبادی کا درجہ دے دیا، کیونکہ جب سیورس اور نائیجر کے درمیان شہنشاہی کے لیے کشمکش شروع ہوئی تو صور نے سیورس سے وفاداری قائم رکھی اور بیروت نے نائیجر کی حمایت کی۔ تاہم بیروت پورے علاقے میں سب سے پہلی رومی نو آبادی تھا اور یہاں ۱۴ ق م میں پانچویں یعنی مقدونوی اور تیسری یعنی فرانسیسی فوج کے بہادروں نے آگسٹس سیزر کے ایک نائب کے ماتحت توطن اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح یہ ابتدا ہی میں ایک چھاؤنی بن گیا اور جب کبھی حاکم صوبہ کو امدادی فوج کی ضرورت پڑتی تو بیروت سے اس کا انتظام ہو جاتا۔ آگسٹس کے ماتحت ویرس شام کا گورنر تھا تو اسے یہود کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ وہ بیروت میں سے گزرا تو اسے ڈیڑھ ہزار آدمی معاون فوج کے لیے ملے[2]۔ اس نو آبادی کا نام آگسٹس کی بیٹی کے اعزاز میں کالونیا جولیا آگسٹا فیلکس بریٹس[3] رکھا، یعنی جولیا آگسٹا کی نہایت مسرّت خیز نو آبادی بیروت۔ یہ مقام جنوبی و مشرقی

---

[1] (Cleopatra's Needle) یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ پتھر کی یہ خوبصورت سیاہ لاٹھ بظاہر سُوئی سے مشابہ ہے +

[2] جوزیفس اینٹی کوئیٹیز کتاب ۱۷، باب +

[3] Colonia, Julia, Augusta Felix Berytus +

بحیرۂ روم میں رومی بیڑے کے لیے ایک عمدہ مامن بنا رہا۔ نوآبادی کی حیثیت میں یہاں کے باشندوں کو داخلی خود مختاری کے حقوق حاصل تھے، نیز ان سے لگان اور سرشماری کے محاصل نہیں لیے جاتے تھے۔ کیراکلا (۲۱۱ء ۔ ۲۱۷ء) نے ایک فرمان کے ذریعے سے سلطنت کے تمام آزاد باشندوں کو شہریت کے حقوق دے دیے، اس وجہ سے بیروت کی خاص حیثیت ناپید ہوگئی۔ جو حلقہ یونانیت سے متاثر تھا، اس سے ہیلیوپولس کی طرح بیروت بھی رومیت کا ایک مرکز بن گیا۔

یہاں کی یہودی بادشاہی کی ابتدا ہیرودیس اعظم سے ہوئی (۳۷ ق م ۔ ۴ ق م)۔ یہ بادشاہ شہنشاہوں کے خراج گزار تھے۔ ان کی نظروں میں عزت و اعتبار حاصل کرنے کی غرض سے وہ تمام شہروں کے لیے عوامی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی عمارتیں بناتے رہتے تھے، جو ان شہنشاہوں کے نزدیک خاص توجہ کے مستحق تھے۔ انھیں امید تھی کہ اس طرح شہنشاہ خوش ہوں گے اور خراج گزاروں کے اعتبار میں اضافہ ہوجائے گا۔ ہیرودیس نے آگسٹس کی اجازت سے بیروت ہی میں اپنے دو بیٹوں پر مقدمہ چلایا تھا، جن کے خلاف غداری کا الزام تھا اور انھیں موت کی سزا دی تھی۔[1] مقدمے کے دوران میں انھیں ایک گاؤں میں رکھا گیا تھا، جس کا نام پلاٹانوس[2] تھا۔ اسے موجودہ دور کا ارمون سمجھنا چاہیے۔ ہیرودیس کے پوتے اگریپا اول (۴۱ء ۔ ۴۴ء) نے بیروت کو ایک تھیئٹر سے مزین کیا، جو نہایت نفیس بنا تھا اور اس میں بڑے تکلفات سے کام لیا گیا تھا۔ ایک ایمفی تھیئٹر بنوایا، نیز حمام اور محرابی دروازے تعمیر کرائے۔ ان میں بے دریغ روپیہ خرچ ہوا۔[3] ان عمارتوں کے افتتاح پر ایک جشن منایا گیا، جس میں موسیقی اور پہلوانی دنگلوں کے کمالات دکھائے گئے۔ اسی موقع پر مجرموں کے سات سو جوڑے اکھاڑے میں لائے گئے اور وہ لڑتے لڑتے کٹ کر مر گئے۔ ۶۹ء میں وسپیسین یہودیوں کے خلاف جنگ کر رہا تھا کہ قیساریہ میں اس کی شہنشاہی کا اعلان کردیا۔ وہ روما جاتے ہوئے بیروت میں بھی ٹھہرا۔ وہیں شام اور دوسرے صوبوں کے نمائندوں نے اس کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کی۔ بعض نمائندے تاج لے کر آئے۔ شام کے حاکم میوسیانوس[4] نے نئے شہنشاہ کو یقین دلایا کہ ہر شہر کے

---

۱؎ جوزیفس اینٹی کوئیٹیز کتاب ۱۶، باب ۱۱۔ ۲؎ Platanos، دیکھو پالی وسووا کا مقالہ ذیل انسائیکلوپیڈیا میں نیز دساؤ کی کتاب صفحہ ۴۶ ۔ ۴۷۔ ۳؎ جوزیفس اینٹی کوئیٹیز کتاب ۱۹: باب ۷۔

۴؎ Macianus۔

Marfat.com

باشندوں نے وفاداری کا حلف اُٹھا لیا۔[۱] وسپیسین نے اپنے بیٹے ٹائیٹس کو جنگی کاروبار سونپا اور وہ ۷۰ء میں یروشلم کو فتح کرنے کے بعد مدت تک بیروت میں ٹھہرا رہا۔ اپنی فتح اور اپنے باپ کی سالگرہ کے موقع پر ایسے جشن کا انتظام کیا، جیسا غالباً اس شہر میں کبھی نہ منایا گیا تھا۔ باقی تماشوں کے علاوہ ایگریپا کے ایمفی تھیٹر میں ایک تماشہ یہ بھی دکھایا گیا کہ جو یہودی جنگ میں قید ہوئے تھے، انھیں باہم لڑا کر یا ان پر درندے چھوڑ کر مروا دیا گیا اور لوگ چپ چاپ دیکھتے رہے۔[۲] ایگریپا ثانی (۱۰۰ء) نے بیروت میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور وہاں کثیر مصارف سے ایک تھیئٹر بنوایا، جس میں سالانہ ناٹک دکھائے جاتے تھے۔ نیز باشندوں میں تیل اور گیہوں تقسیم کیے جاتے تھے۔ مورخ کا بیان ہے کہ اس نے شہر کو اپنے بنائے ہوئے مجسموں اور اور قدیم زمانے کے مجسموں سے آراستہ و پیراستہ کر دیا۔[۳] بیروت میں چوتھی صدی عیسوی تک ناٹک اور سرکس کا عام رواج تھا۔ پتھر کے بڑے بڑے ستون یا ان کے ٹکڑے قدیم مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ستون مصر بالا سے آئے تھے۔ انھیں بعد میں لوگوں نے عمارتوں میں استعمال کیا یا انھیں بازاروں میں رولروں کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ ان کی تعداد اور عظمت و شان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن تعمیری یادگاروں سے یہ شہر مزین تھا۔ ان کی کیفیت کیا تھی۔[۴]

رومی عہد کا بیروت اپنے سرپرست دیوتا پوسیڈن (نیپچون، سمندر کا دیوتا) کے ظلِ حمایت میں خوشحالی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ یہاں کے سکوں پر بھی اسی دیوتا کی تصویر بنائی جاتی تھی جس کے ہاتھ میں ترسول ہوتا تھا یا دریائی گھوڑے اس کی گاڑی کھینچتے تھے۔ ہیلیوپولس سے بیروت کے گہرے تعلق کی شہادت یوں ملتی ہے کہ اول الذکر شہر کے جوپیٹر کی عبادت دیر القلعہ میں ہوتی تھی، ایک مارونی خانقاہ تھی، جو بیروت کے نزدیک ایک بلند پہاڑی پر بنائی گئی تھی۔ اسی مقام پر ایک گرجا قدیم معبد کے پتھروں سے تعمیر کیا گیا۔ لیکن یہاں کا سب سے بڑا دیوتا بعل مرقود تھا (رقص کا دیوتا) اہل بیروت اسی کے سامنے نذرانے پیش کرتے رہے۔ رقص بھی عبادت کا ایک جزو تھا۔ لاطینی کتبوں میں ایک عورت کا نام مذکور ہے (جو شیم اللہ سے منتسب تھی) موجودہ مسیحی خانقاہ ایک رومی معبد کے کھنڈروں پر قائم ہے۔ یہ معبد بھی ابتدائی دور کے ایک فونیقی معبد کی جگہ بنایا گیا تھا۔

---

[۱] جوزیفس، محاربات یہود کتاب ۳، باب ۱۰۔ [۲] جوزیفس، محاربات یہود، کتاب ۷ باب ۳۔ [۳] ایضاً ایمنٹی کوئیٹز کتاب ۲۰، باب ۹۔ [۴] دیکھیے ہاروے پورٹر کی تاریخ بیروت انگریزی صفحہ ۲۶، ۲۷۔

یہاں بہت سے ستون منتشر ہیں، جن کے قطر سات سات فٹ ہیں۔ یہ بعلبک جیسے ستون معلوم ہوتے ہیں۔ ترکوں نے پہلی جنگِ عظیم میں بندرگاہ کی حفاظت کے لیے جا بجا توپیں نصب کر دی تھیں۔ ان مقامات کے آثار بھی اب تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ بیروت کے قریب ہی ایک گاؤں کا موجودہ نام بیت میری ہے (میرے خداوندوں کا گھر) یہ نام نوشتی بعل کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک گاؤں کا نام برومانا ہے، معلوم ہوتا ہے، یہ غالباً بیت رمون تھا (رمون یعنی گرجنے والا ہدد کا لقب تھا)۔

## قانونی درس گاہ کا مقام

بیروت نے ذہنی سرگرمی کے ایک اور دائرے میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ یعنی وہ رومی قانون کی ایک شہرۂ آفاق صوبائی درس گاہ کا محل رہا۔ اس لحاظ سے پورے مشرق کے وہ لوگ یہاں آتے رہے جنھیں قانون سے دلچسپی تھی۔ اُس زمانے میں قانونی تعلیم و تربیت سرکاری ملازمت کی لازمی شرط تھی۔ بہت سے مجسٹریٹوں اور مشرقی صوبوں کے حاکموں نے اس درس گاہ میں تعلیم پائی تھی۔

یہ درس گاہ غالباً سپٹمیس سیورس (۱۹۳ء تا ۲۱۱ء) نے قائم کی تھی[1]۔ جس کی یاد میں یہاں ایک معبد بنایا گیا اور ایک مجسمہ قائم کیا گیا۔ یہ صوبوں میں اپنی نوعیت کی پہلی درس گاہ تھی۔ اس نے بڑی شہرت پائی اور سب سے زیادہ طویل مدت تک قائم رہی۔ ایتھنز، سکندریہ اور دوسرے صوبائی شہروں میں بھی ایسی درس گاہیں تھیں، مگر بیروت کی درسگاہ کو سب پر تقدم حاصل رہا۔ یہ درس گاہ تدریجاً ذہنی اداروں میں تخلیقی حیثیت کی حامل بن گئی اور اعلیٰ درجے کے منتخب طلبہ و اساتذہ اس کی طرف کھنچے آتے رہے۔ اُنھوں نے دنیا کی سب سے بڑی رومی میراث یعنی اصول و فلسفۂ قانون میں پائدار اضافہ کیا۔

رومی قانون دانوں میں سے دو نہایت ممتاز آدمیوں نے بیروت میں پروفیسر کی حیثیت سے زندگی شروع کی۔ اوّل پپنیاں[2]۔ دوم اُلپیاں[3]۔ ایمیلیس پپینیانس بظاہر حمص کا باشندہ تھا۔ ۲۰۳ء جولیا ڈومنا کے شوہر سپٹمیس سیورس نے اسے روم طلب کر کے مشیر بنا لیا۔ غالباً وہ سیورس کا رشتہ دار تھا۔ مشیر کی حیثیت میں وہ شہنشاہ کے ساتھ ایک جنگی مہم کے سرانجام کے لیے برطانیہ گیا۔ وہاں سپٹمیس نے اپنے دونوں بیٹوں کیر اکلا اور جیٹا کی اتالیقی پپنیاں کے حوالے کر دی۔

---

۱۔ پال کولینے کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۱۶، ۲۵، ہینری لامنس کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۲۱۔

۲۔ Papinian ۔ ۳۔ Ulpian ۔

Marfat.com

کیراکلا (۲۱۱ء۔۲۱۷ء) نے تخت نشینی سے کچھ مدت بعد پپینیاں کو مشیر کے عہدے سے برطرف کر دیا اور واضح ہے کہ ایسا غیر ذمہ دار استبداد پسند بادشاہ ایک سخت گیر نگران کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا تھا۔ شہنشاہ نے اپنے بھائی جیٹا کو قتل کرا دیا تھا پپینیاں نے اس فعل کو نامناسب قرار دیا۔ اس پر کیراکلا نے اسے قتل کرا دیا (۲۱۲ء)۔ قتل کے موقع پر کیراکلا کے ردّ عمل کا ایک واقعہ تاریخوں میں مذکور ہے، یعنی اس نے جلاد کو اس بنا پر بُرا بھلا کہا کہ قتل کے لیے تلوار کی جگہ کلہاڑی کیوں استعمال کی گئی۔[1] اگرچہ قتل کے وقت پپینیاں صرف سینتیس سال کا تھا تاہم اس نے اکثر بلند پایہ، رومی قانون دانوں سے کہیں زیادہ بیش قیمت قانونی میراث اپنے پیچھے چھوڑی۔ ۵۳۳ء میں جسٹینین اعظم نے تمام ضابطے مدوّن کیے تو اس مجموعے میں پپینیاں کی تحریرات سے کم و بیش پانسو پچانوے اقتباسات لیے گئے۔ یہ مجموعۂ قوانین دورِ حاضر کے اکثر یورپی قوانین کی بنیاد و اساس ہے۔ پپینیاں بہت بڑا عالم تھا، علاوہ بریں صاحبِ غور و فکر تھا۔ رائے بڑی پختہ اور صائب تھی۔ چلن بہت ہی پاکیزہ تھا۔ اس کی احترام کی یہ کیفیت تھی کہ ۴۲۶ء میں قانونِ نظائر منظور ہوا تو اس میں لکھ دیا گیا، اگر قانون دانوں کی اکثریت موافق یا مخالف ہو تو پپینیاں کی رائے کو فیصلہ کن سمجھا جائے۔

پپینیاں کو ہموطنوں میں سے ایک نہایت قابل جانشین ملا جس کا نام ڈومیٹین الپیانس (الپیاں) تھا۔ وہ صور میں ۱۷۰ء کے آس پاس پیدا ہوا۔ بیروت کی درس گاہ میں استاد رہا۔ پھر سپٹیمیس سیورس نے اسے پپینیاں کی امداد کے لیے رومہ بلا لیا۔ کیراکلا کے جانشین ایلاگیبلوس نے اسے برطرف کر دیا، لیکن جب الیگزانڈر سیورس تخت نشین ہوا تو اُلپیاں کو پھر شاہی مشیر بنا لیا گیا۔ دراصل وہی الیگزانڈر سیورس کا اتالیق و سرپرست تھا۔ یہ شہنشاہ، جو لبنان میں پیدا ہوا، اپنے قدیم پیشروؤں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی ذاتی زندگی نہایت سادہ اور پاکیزہ تھی۔ عوامی معاملات میں وہ انصاف، دانش اور رواداری کا پیکر تھا۔ اس کی سرپرستی میں اُلپیاں نے انتظامی خرابیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ عدالتی دائرے اور دوسرے دوائر میں اصلاحات کیں۔ شہنشاہ کی محافظ فوج اور اس کے سالاروں کے ضبط و نظم کا بہت عمدہ انتظام کر دیا۔ ۲۲۸ء میں محافظ فوج کا ایک سرکش گروہ رات کے وقت شاہی محل میں داخل ہو گیا، جہاں اُلپیاں پناہ گزین ہوا تھا۔ وہاں اسے شہنشاہ اور اس کی والدہ کے سامنے قتل کر دیا۔

اُلپیاں نے پپینیاں سے زیادہ عمر پائی اور اس کی قانونی خدمات کا دائرہ بھی زیادہ وسیع تھا۔

---

[1] ڈیوکیسیس کی لاطینی کتاب، "رومہ کی تاریخ" کتاب ۷۷، باب ۱۔

جسٹینین کے مجموعۂ قوانین میں اُلپیاں کی تحریرات سے اڑھائی ہزار اقتباسات لیے گئے۔ گویا اس مجموعے کا ایک تہائی حصّہ اُلپیاں ہی کی تحریرات پر مشتمل تھا۔ اس مجموعے کا دیباچہ بیروت کے ایک استاذ قانون نے لکھا تھا، جس کا نام اناٹولیس تھا۔ اس کی ستائش میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ قانون دانوں کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے قسطنطنیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ۵۵۷ء کے زلزلے میں مارا گیا۔[۱] مجموعہ مرتّب کرنے والوں میں سب سے اونچا درجہ بیروت کے ایک پروفیسر ڈروتھیس کا تھا، جسے جسٹینین نے قسطنطنیہ بلا لیا تھا۔ جسٹینین اس لبنانی شہر پر بڑا مہربان تھا اور اسے "تمام قوانین کی ماں اور دایہ" قرار دیتا تھا۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ جسٹینین کا مرتبہ مجموعہ رومی قوانین کا آخری اور مکمل ترین مجموعہ تھا۔ اس سے پیشتر ۴۳۸ء میں مشرقی رومی سلطنت کے لیے ایک مجموعہ مرتب کیا گیا تھا، جو تھیوڈوسیئن مجموعہ کہلاتا ہے۔ اس میں پپنیاں اور اُلپیاں کی تمام تحریرات ججوں کے لیے مستند قرار دی گئی تھیں +

غرض بیروت کی درس گاہِ قانون میں سلطنت کے کاروبار کے لیے موزوں آدمیوں کی تربیت ہوتی تھی۔ یہ درس گاہ کلیسا کے آدمیوں کے لیے بھی ایک نوع کا دارالعلوم بنی رہی۔ کلیسیائی تحریرات میں اس درس گاہ کی طرف سب سے پہلا اشارہ اس گریگوری کے ایک خطبے میں ملتا ہے، جسے خرقِ عادت کاموں کی بنا پر "تاماترگس"[۲] (عجائب کار) کا لقب دے دیا گیا تھا۔ یہ خطبہ ۲۴۰ء کا ہے۔ گریگوری کپاڈوشیا کا باشندہ تھا۔ نوجوانی ہی میں بیروت پہنچا اور آٹھ سال تعلیم پاتا رہا۔ اس وقت کی تعلیمی زبان لاطینی تھی، لیکن پانچویں صدی میں لاطینی کی جگہ یونانی نے لے لی، جو بیزنطینی سلطنت کی زبان تھی۔ گریگوری کے ساتھ اس کا ایک بھائی اتھینوڈورس[۳] بھی تھا، جو آگے چل کر گریگوری کی طرح پونٹس کا بشپ مقرر ہو گیا۔ بیروت سے گریگوری قیساریہ پہنچا۔ وہاں اس کے دل میں مسیحیت کی طرف میلان پیدا ہوا اور اس نے اپنے محترم استاد اوریجن کی رہنمائی میں مسیحیت قبول کر لی۔ پھر اسے وطن ہی میں بشپ بنا دیا گیا، جہاں اس وقت صرف سترہ مسیحی تھے۔ ۲۶۵ء میں گریگوری کی وفات پر شہر بھر میں صرف سترہ آدمی رہ گئے تھے، جنھوں نے مسیحیت قبول نہیں کی تھی۔ گویا مسیحیوں کے خلاف ظلم و ستم کے باوجود مذہب ترقی کرتا رہا۔ ظلم و جور کے دوران میں گریگوری بھاگ کر صحرا میں پناہ گزین ہوا۔ بظاہر فرار کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسے جان کا خوف دامنگیر تھا، بلکہ وہ اپنے آپ کو پیرووں کی خاطر محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ جب

---

[۱] اگاتھیاس کی کتاب ہسٹوریارم، کتاب ۵ +

[۲] Thaumaturgus +

[۳] Athenodorns +

ڈایو کلیشین اور میکسیمین کا جبر و تشدد شروع ہوا تو اس میں بیروت کے فارغ التحصیل طلبہ کی خاصی تعداد نے شہادت پائی[۵۱]۔ کلیسیا کا ایک اور ممتاز فرد بحیرۂ اسود کے حلقے میں سے تھا، جسے گریگوری ازیانزن[۵۲] کہتے تھے۔ یہ آگے چل کر قسطنطنیہ کا اسقف بن گیا اور اسے متقدس قرار دے دیا گیا۔ یہ ۳۵۶ء میں ایتھنز چھوڑ کر بیروت چلا آیا اور وہاں قانونی مطالعے میں مصروف رہا۔ اسے ۳۷۹ء میں اس غرض سے قسطنطنیہ بلایا گیا کہ آریوسیوں اور دوسرے ملحد گروہوں کے مقابلے میں آرتھوڈکس عقیدے کا دفاع کرے۔ اس نے تقریباً دس سال بعد وفات پائی۔ اس سے بھی زیادہ شہرت سیورس نے حاصل کی، جو ۵۱۲ء سے ۵۱۸ء تک انطاکیہ میں اسقف اعظم رہا۔ یہ شامی کلیسا کے مغربی حصے کا عالم تھا، جسے عموماً یعقوبی کہا جاتا ہے۔ غزہ کا ایک متکلم زکریاس تھا، جو بیروت میں سیورس کے ساتھ پڑھتا رہا۔ اس نے سیورس کے سوانح حیات لکھے تھے[۵۳] جن میں درس گاہ کی زندگی کے بڑے دلچسپ اور پر لطف پہلو پیش کیے ہیں۔ اور ان امور کا تعلق بیروت جیسے مقام کے عالمی تعلیمی مرکز سے تھا، جو شرق و غرب سرحد پر واقع تھا۔

## طلبہ کی زندگی

زکریاس سیورس سے ایک سال بعد ۴۸۷ء یا ۴۸۸ء میں داخل ہوا۔ وہ لیونٹیس جیسے ممتاز اُستاد سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے پہلے پہل جماعت میں گیا تو دوسرے نو واردوں کی طرح اس پر بھی گھبراہٹ طاری تھی۔ غالباً پرانے طلبہ نو واردوں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اگرچہ ان سے کوئی بُرا برتاؤ نہیں کرتے تھے[۵۴]۔ مقصود یہ ہوتا تھا کہ ان کے ضبط کا امتحان لیا جائے۔ امریکی طلبہ آج کل بھی ایسی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں اور ان سرگرمیوں کو "نو واردوں کا پلیتھن نکالنا" کہا جاتا ہے، لیکن سیورس اور دوسرے طالب علموں نے زکریاس کا خیر مقدم کیا۔ لیونٹیس بیروت کا باشندہ، اناطولیس کا باپ اور ایک ممتاز قانون دان کا بیٹا[۵۵] تھا۔ اُس زمانے میں قانون کے مطالعے سے پیشتر علوم صرف و نحو، خطابت، یونانی اور لاطینی کی تحصیل ضروری تھی۔ یونانی زبان میں قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم سے فراغت پاکر زکریاس عقیدت کیش مسیحی کی حیثیت سے کنیسۃ القیامہ کی زیارت کرتا، پھر وہ پھرتا پھراتا بندرگاہ میں پہنچا۔ وہاں ایک مرتبہ سیورس سے ملاقات ہوئی۔ زکریاس نے التجا کی کہ لکچروں کے خاتمے پر روزانہ گرجا جانا چاہیے۔ گھڑ دوڑوں، تھیٹروں اور تماشوں میں شریک نہ ہونا چاہیے، جہاں درندے انسانوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں، نیز قمار بازی اور طوائفوں کے ساتھ شراب نوشی

---

[۵۱] دوسرے ممتاز طلبہ کے لیے ملاحظہ ہو کالینے صفحہ ۸۴ - ۹۸ ۔ [۵۲] Gregory Nazianzen، نازیانزوس کپاڈوشیا میں ایک مقام تھا ۔ [۵۳] اس کتاب کا اصل یونانی نسخہ گم ہوگیا، سریانی نسخہ ایڈٹ کرکے مع ترجمہ چھاپا گیا ۔
[۵۴] زکریاس صفحہ ۴۷ ۔ [۵۵] کالینے صفحہ ۱۴۱، نیز ۱۸۸ ۔

سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ عیوب غالباً طلبہ میں عام تھے[1]۔ چونکہ سیویرس کا تعلق دولتمند خاندان سے تھا، اس لیے وہ درس گاہ میں آتا تو غلام ساتھ ہوتے۔ اس نے زکریاس پر یہ حقیقت واضح کی کہ میں نادانوں کا طالب علم ہوں، راہب نہیں۔ بہرحال وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ ممکن ہوگا، ضرور کروں گا۔

شنبہ کو بعد دوپہر اور یک شنبہ کو کاملاً تعلیم ملتوی رہتی۔ شام کو طلبہ دن بھر کا آموختہ یاد کرتے۔ ہمارے زمانے کی طرح اُس زمانے میں بھی طلبہ مختلف مجلسیں ترتیب دیتے۔ زکریاس نے مسیحیوں کی ایک انجمن بنائی تھی، جس کا اجلاس ہر شام کو کنیسۃ النفیامہ میں ہوتا اور وہاں باسل، کریسوستم اور دوسرے مسیحی پادریوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا جاتا۔ سمیساط کا ایک شخص ایواگریوس[2] اس مجلس کا عہدہ دار تھا۔ اس نے انطاکیہ میں تعلیم پائی تھی، جہاں ایک فساد میں زخمی ہوگیا۔ اس انجمن کے دوسرے رکن مختلف مقامات سے تعلق رکھتے تھے مثلاً لیبیا (جنوبی ایشیائے کوچک)، اڈیسا (الرّوعا)، بیروت، غزّہ، سکندریہ۔ یہ مختلف المقام افراد کا ایسا ہی مجموعہ تھا، جیسا آج کل بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں ملتا ہے۔ بیروت کا یہ تعلیمی ادارہ پانچویں صدی کے اواخر میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ادب، فلسفہ اور قانون کے دوسرے مدارس کا الحاق ہوگیا۔ ایواگریوس بڑا مذہبی آدمی تھا۔ وہ روزانہ روزے رکھتا اور بڑی پاکیزہ زندگی گزارتا۔ سال بھر میں صرف ایک مرتبہ عید فصح (ایسٹر) سے ایک روز پیشتر راحتِ غسل سے استفادہ کرتا[3]۔ زہد و تقشّف کے ان مظاہر سے سیویرس بھی متاثر ہوا اور اس نے گوشت کا استعمال ترک کرنا شروع کیا۔

طلبہ کی دوسری انجمنیں دوسرے مقاصد کے لیے وقف تھیں۔ ان میں سے ایک انجمن سحر و تسخیرات کے لیے وقف تھی۔ اس میں جن طلبہ کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ ان میں سے ایک آرمینیا کا تھا، ایک فلسطین کا، ایک لبنانی ہیلیوپولس اور ایک مصری تھیبز کا تھا۔ مصری کا نام جان تھا۔ وہ ایک عورت پر عاشق ہوگیا، لیکن عورت اس پر متوجہ نہ ہوئی۔ آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ جان کے حبشی غلام کو شیطانی قوتوں کے لیے قربان کر دیا جائے۔ اُمید یہ تھی کہ اس طرح مقصود حاصل ہو جائے گا[4]۔ رات کے وقت شہر کے سرکس میں یہ رسم ادا کی جا رہی تھی کہ اچانک

---

۱ زکریاس صفحہ ۵۱-۵۲ ۔ ۲ Eevagrius ۔ ۳ زکریاس صفحہ ۵۵-۵۷ ۔
۴ ایضاً صفحہ ۵۸ ۔

Marfat.com

پاس سے گزرنے والے ایک شخص نے مداخلت کی۔ جس غلام کو قربان کیا جا رہا تھا، وہ بھاگ نکلا اور اپنے مالک کو پوری کیفیت سُنادی۔ سحر و نیرنجات کی کتابیں خوب تلاش کی گئیں اور انھیں جان کی کرسی کے نیچے رکھ کر آگ لگا دی گئی۔ ان کتابوں میں شیاطین کی عجیب و غریب تصویریں تھیں۔ ان میں سے بعض منیخئو سے منسوب تھیں اور بعض زرتشت سے۔ مزید چھان بین کی گئی تو آشکارا ہوا کہ لیونٹیس بھی ایسی ہی ناجائز سرگرمیوں میں شریک ہے۔ چنانچہ شہر کے بشپ اور حکام بلدیہ کی ایک تحقیقاتی عدالت مقرر کی گئی۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ دوسرے افراد کے علاوہ پروفیسر بھی مجرم ہے۔ وہ نجوم بتاتا ہے، پیشگوئیاں کرتا ہے۔ اس طرح بت پرستی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ جو ملزم شہر چھوڑ کر فرار نہیں ہوئے تھے انھوں نے عوام کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی۔ جب ارباب مخالف نے آس پاس کے دیہاتیوں کو مسیح کردینے کی دھمکی دی تو سب نے ہتھیار ڈال دیے[۵۱]۔

سحر و نیرنجات کا فتنہ اس واقعے پر ختم نہ ہوا۔ سیلانی ساحروں کا ایک طائفہ آگیا اور یقین دلایا کہ ایرانی شہنشاہ دارا نے یہاں جو خزانہ دفن کر رکھا تھا، اسے نکالا جا سکتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے چند طالب علم اس طائفے کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دو مقامی پادریوں نے چشم پوشی سے کام لیا اور رات کے وقت گرجے کے مقبروں میں کھدائی شروع ہو گئی۔ چونکہ شیاطین کا تعلق ساحل بحر سے تھا، انھیں امداد کی غرض سے بلانے کے لیے کلیسا کے بخوردان اور دوسری نقرئی چیزیں ضروری تھیں۔ عین اس اثنا میں زلزلہ آیا اور یہ رسم ادھوری رہ گئی۔ سیلانی ساحر قیمتی چیزیں لے کر بچ نکلے۔ پادریوں کو سزا دی گئی۔ اُن میں سے ایک کو خانقاہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ بیروت میں اس سے پہلے بھی زلزلے آچکے تھے، بعد میں بھی آئے۔ جو زلزلہ ۳۴۹ء میں آیا اس نے شہر کا ایک حصّہ تباہ کر دیا، لیکن یونیورسٹی کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ۴۹۴ء اور ۵۰۲ء میں زلزلے آئے۔ ان سے بیروت کو معمولی نقصان پہنچا، لیکن صور و صیدا پر سخت تباہی آئی، مگر ۵۵۱ء اور ۵۵۵ء کے درمیان پے در پے زلزلے آئے، جنھوں نے ساحلِ لبنان کے شہروں کو بُری طرح پیس ڈالا۔ بیروت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ زلزلے کے بعد سمندر کی لہریں شہر میں در آئیں (۵۵۱ء)۔ غالباً یہ زلزلے سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی ہوں گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سمندر پہلے ایک میل پیچھے ہٹ گیا، پھر ویسی ہی تیزی و تُندی سے لوٹا کہ سب کچھ غرقاب

---

[۵۱] زکریاس صفحہ ۵۸، ۶۲ ۔ [۵۲] ایضاً صفحہ ۶۶، ۶۸ ۔ [۵۳] ایضاً صفحہ ۷۰، ۷۳ ۔

Marfat.com

ہوگیا۔ مکان ڈھے گئے، جہاز ڈوب گئے یا کنارے کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔ درخت ڈوب گئے۔ غالباً اسی زمانے میں درس گاہ کی عمارتیں برباد ہوئیں۔ شہر قدیم سے جو ستون کھود کھود کر نکالے گئے، وہ شاید انھیں عمارتوں کے تھے۔ یہ ستون آج کل قومی عجائب خانے کے صحن میں کھڑے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اہل بیروت میں سے تقریباً تیس ہزار نذر اجل ہوئے۔ جو زندہ بچے، وہ خوف و یاس کے عالم میں شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ یونیورسٹی کے بعض طلبہ اور شہر کے کچھ تاجر صیدا جا بیٹھے۔ وہاں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ انتظار یہ تھا کہ یونیورسٹی از سر نو تعمیر ہو گی۔ تعمیر جدید کا کام آہستہ آہستہ جاری تھا کہ ۵۶۰ء میں آگ لگ گئی، اس میں زیادہ نئی عمارتیں بُری طرح تباہ ہو گئیں۔ یہ شہر اور مشہور تعلیمی ادارے پر آخری کاری ضرب تھی۔ ایک معاصر یونانی قانون دان اور ایشیائے کوچک کا مؤرخ[1] اس نقصان کا ماتم کرتا ہوا لکھتا ہے :

> "بیروت، جو سب سے زیادہ خوب صورت شہر تھا اور جسے فونیقیہ کا زیور سمجھا جاتا تھا، شان و شکوہ سے بالکل محروم ہو گیا۔ اس کی تعمیرات کے مشہور شہکار زمیں بوس ہو گئے اور کوئی بھی اصلی حالت پر باقی نہ رہا۔ صرف بنیادیں رہ گئیں۔"

اس سانحۂ عظیم کی گونج ہسپانیہ جیسے دور افتادہ ملک میں بھی پہنچ گئی۔ اُس زمانے میں وہاں ایک شاعر[2] تھا، جو یونانی زبان میں شعر لکھا کرتا تھا۔ اس نے مصیبت زدہ مقام کی زبان سے مندرجۂ ذیل الفاظ کہلوائے :

> "یہ میں بدنصیب شہر ہوں، جو کھنڈروں میں گم ہے۔ میرے شہری موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ آہ! سب سے بڑی بدقسمتی یہ پیش آئی کہ زمین کو تہ و بالا کر دینے والے دیوتا کے بعد اگنی دیوتا نے مجھے تباہ کر دیا۔ میرا ماتم کرو، میں ایسے حسن و جمال کے بعد راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ او میرے پاس سے گزرنے والے! میری بدنصیبی پر آہ و بکا کر اور بیروت کے لیے آنسو بہا: جو کل تک موجود تھا، اب ناپید ہے......
>
> "اے ملّاح! میرے لیے جہاز نہ روک۔ اپنے بادبان نہ لپیٹ۔ تو بندرگاہ کی تلاش میں ہے، میں قبر کی نذر ہو چکا ہوں۔ تو چپّو مارتا ہوا

---

[1] اگاتھیاس کتاب ۲۔ [2] باربوکالوس Barbucallus۔

اپنی کشتی کو کسی دوسرے مقام پر لے جا؛ جو رنج و غم سے آزاد ہو۔ پوسیڈن اور دوسرے مہربان دیوتاؤں کی رضا یہی تھی۔ الوداع اے سمندر میں کشتیاں کھینے والو! الوداع خشکی پر سفر کرنے والو!"

آخری بڑا تباہ کن زلزلہ مارچ ۱۹۵۶ء میں آیا تھا۔ اس میں بیروت تو بچ گیا، لیکن ان کوہستانی دیہات میں بڑی تباہی پھیلی، جو جنوب مشرق میں واقع ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

# چوتھا حصّہ

# عربوں کا دور

Marfat.com

## سترھواں باب

# لبنان آغوشِ اسلام میں

**ظہورِ اسلام**

۵۵۱ء اور ۵۵۵ء کے درمیان ساحلِ لبنان پر جو خوفناک زلزلے آئے، ان سے کچھ مدت بعد جزیرہ نمائے عرب میں ایسے واقعات رونما ہوئے، جن سے دنیا بھر میں زلزلہ آگیا۔ ان واقعات کی ابتدا اس شخصیت سے ہوئی، جو ۵۷۱ء یا اس کے آس پاس مکہ معظمہ (الحجاز) میں پیدا ہوئی[1]۔ آپ قبیلہ قریش سے تھے، جنھوں نے آپ کے لیے الامین کا لقب تجویز کیا۔ یقیناً یہ بڑا تعظیمی لقب تھا۔ قرآن مجید میں آپ کو ایک مقام پر احمدؐ (سورۂ صف آیت ۶) اور دوسرے مقامات پر محمدؐ (آلِ عمران، آیت ۱۳۸، احزاب، آیت ۴۰، محمدؐ، آیت ۲، فتح آیت ۲۹) کہا گیا ہے۔ آخری نام کا مطلب ہے وہ، جس کی بہت تعریف کی گئی ہو۔ یہی شخصیت تھی، جس نے مشرقِ قریب میں تاریخ کا دھارا بدل دیا اور قریب تھا کہ دنیا بھر کی تاریخ کا دھارا بدل جاتا +

حیاتِ مستعار کے مختصر سے دور میں رسول عربی (صلعم، وفات ۶۳۲ء) نے ہیچ میرزا اجزاء سے ایک ایسی قوم کی تعمیر فرمائی، جس کے مختلف حصے پہلے کبھی متحد نہیں ہوئے تھے اور یہ سب کچھ ایسی سرزمین میں پیش آیا، جس کی حیثیت ایک رسمی جغرافیائی نام سے زیادہ نہ تھی۔ سب سے آخر میں یہ کہ ایک ایسے دین کی بنیاد استوار کی، جس نے متصلہ وسیع علاقوں میں مسیحیت و یہودیت پر نمایاں فوقیت حاصل کرلی اور آج بھی کم و بیش پینتیس کروڑ افراد اس کے حلقہ بگوش ہیں یعنی پورے عالم انسانیت کا ۱/۸ حصہ[2]۔ ساتھ ہی ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی، جس نے بہت جلد

---

[1] رسول اللہ صلعم کی صحیح تاریخ ولادت ۲۱ اپریل ۵۷۱ء ہے + [2] مصنف نے مسلمانوں کی جو تعداد پیش کی، وہ مسلمہ اندازوں سے بہت کم ہے۔ زیادہ صحیح اندازہ یہ ہے کہ مسلمان چالیس اور ساٹھ کروڑ کے درمیان ہیں۔ زیادہ قرین صواب تعداد آخری ہے +

Marfat.com

ذفت کی مہذّب دنیا کے بعض بہترین علاقوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ یقیناً ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں کوئی شخص اس پیشگوئی کی جسارت نہیں کر سکتا تھا کہ چند سال کے اندر عرب کی سرزمین میں، جو اس وقت تک بہت کم معروف اور جاہلیت زدہ چلی آتی تھی، بعض غیر متوقع اور نامعلوم قوتیں بروئے کار آجائیں گی، جو دو معاصر عالمی قوتوں ـــ ایران اور بیزنطین ـــ کو دعوتِ مقابلہ دے دیں گی، ان میں سے ایک کو تباہ کر ڈالیں گی اور دوسری کو زرخیز ترین صوبوں سے محروم کر دیں گی۔ اگر جسارت کرتا تو اسے پاگل خانے میں جانے کا امیدوار سمجھا جاتا، لیکن انھیں واقعات نے حقائقِ ثابتہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اعتراف کرنا چاہیے کہ محمدؐ (صلعم) کی برکت سے آناً فاناً شورہ زارِ عرب ان بہادروں، مجاہدوں اور عظیم القدر انسانوں کی تربیت گاہ بن گیا، جن کی مثال کمیت وکیفیت میں کہیں نہیں ملتی +

محمدؐ (صلعم) نے اپنی زندگی میں جزیرۃ العرب سے باہر صرف ایک مہم کا انتظام فرمایا اور وہ بھی کوئی بڑی مہم نہ تھی، یعنی موتہ کے خلاف ایک لشکر بھیجا، جو بحیرۂ لوط کے جنوبی گوشے سے مشرقی جانب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے سرعسکر زیدؓ بن حارثہ تھے، جو رسول اللہ صلعم کے منہ بولے فرزند تھے۔ ان کی ماتحتی میں تین ہزار جانباز تھے۔ زید اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ شکست خوردہ فوج کا باقی حصّہ ایک جوان قریشی کی سرکردگی میں مدینہ پہنچا[1]۔ جو تازہ تازہ حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا یعنی خالدؓ بن ولید، جنھوں نے آگے چل کر "سیف اللہ" کا لقب پایا۔ سرحد کے قریب رہنے والے حضری باشندوں کے نزدیک یہ واقعہ ان چھاپوں میں سے ایک تھا، جن کے تواتر کے وہ ماضی بعید سے عادی چلے آتے تھے۔ حقیقتِ حال کے اعتبار سے یہ اس کشمکش میں پہلا وار تھا، جو اسلام کے آخری بڑے مجاہدوں کے سامنے مسیحیت کے پُرفخر دارالحکومت بیزنطین کی سرنگونی تک جاری رہی (۱۴۵۳ء) +

آئندہ سال محمدؐ (صلعم) بہ نفسِ نفیس ایک مہم لے کر تبوک پہنچے[2]، جو شمالی حجاز میں ہے۔ وہاں کوئی

[1] جنگِ موتہ کے متعلق مصنّف کا بیان صحیح نہیں۔ بیزنطینی فوج نے تین روز کی لڑائی کے بعد میدان چھوڑ دیا۔ اس کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ انھوں نے دشمن کا تعاقب نہ کیا اور واپس چلے آئے۔ اس جنگ میں تین مسلم سالار شہید ہوئے، یعنی زیدؓ بن حارثہ، جعفرؓ بن ابی طالب اور عبداللہ ابن رواحہ۔ چوتھے سالار خالدؓ بن ولید تھے۔ فتح مسلمانوں کی ہوئی، البتہ وہ دشمن کا تعاقب نہ کر سکے، لہٰذا اسے زیادہ سے زیادہ غیر فیصلہ کن فتح کہا جا سکتا ہے۔ شکست کہنا بالکل خلافِ واقعہ ہے +

[2] بلاذری فتوح البلدان شائع کردہ گوئیج (Goeje) صفحہ ۵۹، انگریزی ترجمہ فلپ حِتّی صفحہ ۹۲، حِتّی تاریخ عرب صفحہ ۱۱۹ و ۱۴۷ + ("آئندہ سال" سے مراد ہے جنگِ موتہ کے بعد کا سال۔ جنگِ موتہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی تھی (ستمبر ۶۲۹ء) اور غزوہ تبوک رجب ۹ھ میں پیش آیا (اکتوبر و نومبر ۶۳۰ء) +

لڑائی پیش نہ آئی۔ ایک لشکر متعین کر دیا گیا۔ نیز ہمسایہ نخلستانوں کے یہودی قبائل اور ایلہ (العقبہ جنوبی فلسطین) کے مسیحی سردار سے صلح و امن کے معاہدے کیے۔ ان معاہدوں کی شرطیں یہ تھیں کہ مقامی مسیحیوں اور یہودیوں کو امان مل گئی۔ املاک انھیں کے پاس رہے۔ مذہبی حقوق بھی محفوظ کر دیے گئے۔ البتہ یہ ضروری تھا کہ وہ سالانہ خراج ادا کرتے رہیں۔ ان شرطوں نے ایک ایسا نمونہ قائم کر دیا جس کے اثرات بہت دُور رس تھے۔ جیسے جیسے عرب سالاروں کے ہاتھوں نئی سرزمینوں کے دروازے اسلام کے لیے کھلے، انھوں نے ہر مقام پر وہی اصول استعمال کیے، جو رسول اللہ صلعم کے ابتدائی معاہدوں کی بنیاد تھے۔

محمد (صلعم) کی وفات سے ایک سال بعد ۶۳۳ء میں ملحقہ سرزمینوں پر زبردست حملے کے لیے سٹیج آراستہ ہو چکی تھی۔ ردّت کی لڑائیوں کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ غیر مسلم عربوں کو اسلام کے دائرے میں لایا جائے، نہ یہ کہ جو ارتداد اختیار کر چکے تھے، انھیں پھر حلقہ بگوش اسلام بنایا جائے۔[۱]
یہ لڑائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ عرب متحد ہو چکا تھا اور کم از کم رسمی حیثیت میں خلیفۂ اوّل ابوبکرؓ (۶۳۲ء – ۶۳۴ء) کے زیر سرکردگی اسلام قبول کر چکا تھا۔ ان داخلی لڑائیوں میں جو ولولہ و جوش پیدا ہو چکا تھا، اس کے لیے نئے مظاہر تلاش کرنے ضروری تھے۔ خصوصاً اس بنا پر کہ نئے مذہب نے تمام حلقہ بگوشوں کو نظری اعتبار سے اخوت کے رشتے میں جکڑ دیا تھا اور جو چھاپے عرب معاشرے میں مزمن بیماری بن چکے تھے، انھیں برادری کے اندر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شمالی جانب دو بڑی طاقتیں یعنی بزنطینی اور ایرانی مغربی ایشیا میں سیادت کے لیے صدیوں تک لڑتی ہوئی دم نہیں توڑ رہی تھیں تو کم از کم نحیف و کمزور ضرور ہو چکی تھیں۔ ۶۰۸ء میں خسرو (کسریٰ) نے شام کو اور آئندہ سال لبنان کو پامال کیا۔ اس کے جانشین نے ۶۱۵ء میں یروشلم کو غارت گری کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ ساحلی علاقہ چھوڑ کر پورا خطہ ۶۱۱ء سے ۶۲۲ء تک ایران کا صوبہ بنا رہا بلکہ ایشیائے کوچک، آبنائے باسفورس تک ایرانیوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ ۶۲۲ء سے ۶۲۹ء تک پے درپے چھ مہموں میں رومیوں کے ایشیائی علاقے، جن میں شام و لبنان بھی شامل تھے، شہنشاہ ہرقل نے بزنطینی سلطنت میں واپس لے لیے۔ اس مدت میں عرب کی سرحد کے ساتھ ساتھ بزنطینیوں نے جو حفاظتی

---

۱ (مترجم) خدا جانے مصنف کو اس قسم کی موشگافیوں کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اسلام نہ کسی کو جبراً مسلمان بنانے کا روادار ہے، نہ مذہب میں جبر جائز ہے۔ ان لڑائیوں کے حقیقی اسباب تفصیل کے محتاج ہیں۔ جو لوگ اسلام کے حلقے میں آئے، خوشی سے آئے۔ مسلمانوں کو لڑائیاں خاص اسباب کی بنا پر پیش آئیں، جن کے ذمہ دار وہ خود نہ تھے۔

Marfat.com

قلعے تیار کیے گئے، ان پر پوری توجہ نہ ہو سکی یا بعض سے فوجیں ہٹا لی گئیں۔ دونوں سلطنتوں کو جنگی مساعی کے سلسلے میں رعایا اور شہریوں پر بھاری ٹیکس لگانے پڑے۔ اس وجہ سے لوگوں میں عام بے چینی پیدا ہوگئی، جو مذہبی گروہ عام مسلک سے الگ ہو چکے تھے، مثلاً شام و مصر کے قائلین وحدتِ فطرت (مسیح) اور عراق و شام کے نسطوری، انھیں مقامی آرتھوڈکس کلیسا سے سخت اختلاف تھا۔ جس کی نمائندگی بزنطینی کر رہا تھا۔ "ہلالِ زرخیز" میں جو سامی النسل تھے، انھوں نے حملہ آور عربوں کو اپنے خویش و اقارب سمجھا ہوگا۔ ہندی یورپی حاکموں سے انھیں نفرت تھی۔ پھر عرب قبائل میں سے شام کی سرحدوں پر غسانی اور العراق کی سرحدوں پر لخمی آباد تھے۔ ان کی وجہ سے مسلم حملہ آوروں کی پیش قدمی میں بڑی سہولت پیدا ہوئی ہوگی۔ ان تمام حقائق پر یہ حقیقت مستزاد ہے کہ عرب صحرائی علاقے سے ازدحام باہر نکلے تھے۔ ان میں بڑا جوش و خروش اور بڑی قوت تھی۔ اقتصادی ضرورت ان کی محرک تھی۔ نئی جمعیت کی حرارت سے ان کے سینے معمور تھے۔ فتح و تسخیر کا عزم ان کے رگ و پے میں ساری تھا۔ نئے دین نے انھیں موت سے بالکل بے پروا کر دیا تھا۔ بلاشبہ اسلام نے ان کے لیے ایک نعرۂ جنگ مہیا کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا نکتہ تھا، جس پر سب بہ آسانی متحد ہو سکتے تھے اور جماعت اس سے ہر جگہ کام لے سکتی تھی، لیکن ایک بڑی قوتِ جاذبہ یہ خواہش بھی ہوگی کہ روئے زمین پر امیرانہ زندگی بسر کریں، اس کی راحتوں اور آسائشوں سے فائدہ اٹھائیں۔ بلاذری اسلامی فتوحات کے سب سے پہلے وقائع نگاروں میں سے تھا اور نہایت محتاط وقائع نگار تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ابوبکرؓ نے حجاز، نجد اور یمن کے مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دی تو بزنطینیوں سے مالِ غنیمت حاصل کرنے کی بھی ترغیب دی۔[1]

## جنگی اقدامات

رسول اللہ صلعم کی وفات سے دوسرے سال مدینہ سے تین لشکر شمال کی جانب روانہ ہوئے۔ ان میں سے ایک کے امیر عمروؓ ابن العاص تھے اور دوسرے کے یزیدؓ بن ابی سفیان۔[2] دونوں امیر نسباً قریشی تھے۔ یزیدؓ نے اپنے بھائی معاویہؓ کو علمداری کا منصب سونپا تھا، جو آگے چل کر دمشق میں امیہ خاندان کی حکومت کے بانی ہوئے۔ عمروؓ بن العاص نے ساحل کے ساتھ ساتھ ایلہ کا راستہ اختیار کیا۔ دوسرے دو امیر تبوک و معان کی جانب بڑھے۔[3] یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ

---

[1] بلاذری صفحہ ۱۰۷، انگریزی ترجمہ حتی صفحہ ۱۶۵ (مترجم) اس وقت تک باقاعدہ اسلامی فوج مرتب نہیں ہوئی تھی۔ تمام اصحاب رضاکارانہ شریک جہاد ہوتے تھے اور مالِ غنیمت کا مقررہ حصہ انھیں ملتا تھا۔ دعوت جہاد کے لیے تھی، البتہ جہاد میں شریک ہونے والوں پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری تھا کہ مالِ غنیمت میں سے انھیں حصہ ملے گا، کیونکہ جنگ کا سامان وہ خود مہیا کرتے تھے۔

[2] گوئیجے کی فرانسیسی کتاب "فتح شام" صفحہ ۲۱، ۲۲۔

[3] بحیرۂ مردار کے جنوب مشرق میں اس سرزمین کو زمانۂ قدیم میں ادوم کہتے تھے۔

تینوں لشکر متحدہ صورت میں جنگی اقدامات کریں تو عمرو؄ ابن العاص سپہ سالاری کے منصب پر فائز ہوں۔ انھیں نے آگے چل کر مصر فتح کیا۔ پھر ایک امدادی لشکر ابو عبیدہ؄ بن الجراح کی سالاری میں مدینہ سے روانہ ہوا، جو رسول اللہ صلعم کے ایک صحابی تھے اور آگے چل کر شام میں سپہ سالار اعظم مقرر ہوئے۔ ان چاروں لشکروں کے افراد غالباً تیئیس ہزار ہوں گے[1]۔

وادی العربہ ـــ یہ بحیرۂ لوط کے جنوب میں ایک طویل نشیبی مقام ہے ـــ یہاں پہنچنے تک کہیں مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا۔ اس وادی میں بزنطینی حاکم سرجیئس کو یزید نے شکست فاش دی۔ اس کی پسپا ہوتی ہوئی فوج غزہ کے نزدیک داثن میں قریباً پوری کی پوری فنا کر دی گئی (۴ فروری ۶۳۴ء)۔ اب عرب فوج پورے جنوبی فلسطین پر جہاں چاہتی چھاپے مار سکتی تھی۔ شہنشاہ ہرقل نے ماضی قریب ہی میں دنیائے مسیحیت کو مصائب سے نجات دلائی تھی اور مشرقی رومی سلطنت کا اتحاد بحال کر دیا تھا۔ وہ حمص میں تھا۔ اس نے جلدی سے تازہ دم لشکر اپنے بھائی تھیوڈورس کی سرکردگی میں روانہ کر دیا۔ اس سے حالت میں کسی قدر تبدیلی ہوئی، لیکن اس اثنا میں خالد؄ بن ولید کو خلیفہ نے محاذ شام پر جانے اور بھائیوں کی مدد کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ خالد؄ ایک لشکر کے ساتھ وسط عرب سے عراق گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے آٹھ سو جانبازوں کی سرکردگی میں بادیۂ شام کو اٹھارہ روز کے خطرناک سفر کے بعد طے کیا اور شام پہنچ گئے۔ راستے میں کہیں آدمیوں کے پینے کا پانی گھوڑوں کو پلانا پڑا اور آدمیوں کو اونٹوں کے معدے کا پانی پلاتے رہے۔ غرض صحرا کے جلیل القدر کارناموں میں سے یہ بہت بڑا کارنامہ ہے[2]۔ خالد؄ بن ولید کے شام پہنچ جانے پر عرب لشکر کی حفاظت یقینی ہو گئی۔

دمشق صوبہ شام کا دار الحکومت تھا۔ اس کا محاصرہ چھ مہینے تک جاری رہا۔ ستمبر ۶۳۵ء میں ممتاز مسیحی عالموں نے غداری کی اور شہر عربوں کے حوالے کر دیا۔ اختتام سال سے پیشتر ابو عبیدہ؄ نے شام کا ایک اور ممتاز شہر لے لیا یعنی حمص۔ دمشق سے حمص جاتے ہوئے ابو عبیدہ؄ لبنان کے پہلے بڑے مرکز بعلبک پر قابض ہوئے اور اس کے لیے مندرجہ ذیل میثاق جاری کیا جو دوسرے شہروں سے سلوک کا آئینہ ہے:

---

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کی تاریخوں میں فوج کی تعداد محض تخمینوں پر مبنی ہے اور تمام وقائع بہت بعد مرتب ہوئے۔ [2] اس کے لیے ملحقہ نقشہ ملاحظہ ہو۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے حِتّی کی تاریخ شام صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴۔

Marfat.com

"اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ یہ امان نامہ ہے فلاں فلاں اور تمام اہل بعلبک کے نام، خواہ وہ بیزنطینی ہوں یا ایرانی یا عرب، ان کی جانوں، جائدادوں، کلیساؤں اور گھروں کے لیے، خواہ وہ شہر کے اندر ہوں یا باہر، نیز ان کے کارخانوں کے لیے۔ بیزنطینیوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ پندرہ میل کے علاقے میں جانور چرائیں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ پہلے سے مقبوضہ اراضی میں تعرّض نہ کریں۔ ربیع الاوّل، ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ کے مہینے گزر جائیں تو وہ جہاں چاہیں گے، جا سکیں گے۔ ان میں سے جو لوگ اسلام کے حلقہ بگوش بنیں گے، ان کے حقوق وہی ہوں گے جو ہمارے ہیں اور وہی واجبات ان پر عائد ہوں گے۔ ان کے تاجران تمام علاقوں میں جانے کے مجاز ہوں گے، جو ہمارے قبضے میں آئے ہیں جو لوگ اسلام قبول نہ کریں، وہ جزیہ اور خراج ادا کریں گے۔[۱] اللہ تعالیٰ اس عہد کا گواہ ہے اور اس کی گواہی کفایت کرتی ہے۔"

مسیحی اور یہودی معاونین کی سعی سے حلب ۶۳۷ء میں اور انطاکیہ ۶۳۸ء میں فتح ہو گئے۔ حما اور شمالی وسطی شام کے دوسرے شہروں نے تازہ واردوں کے لیے دروازے کھول دیے۔ بعض نے انھیں نجات دہندہ قرار دے کر خیر مقدم کیا۔ جنگ یرموک نے، جو ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو لڑی گئی، پورے خطّے کی تقدیر کا آخری فیصلہ کر دیا۔ یرموک دریائے اردن کی ایک معاون ندی ہے۔ جنگ اسی کے کنارے ہوئی تھی اور خالدؓ نے بدرجہا زیادہ کثیر التعداد فوج کو، جن میں سے اکثریت تنخواہ داروں کی تھی۔ جنگی سرزمینوں سے کام لے کر بالکل تباہ کر دیا۔ یہودیوں کی غدّاری کے باعث ۶۳۸ء میں یروشلم مسخّر ہو گیا۔[۲] لبنان و فلسطین کے صرف ساحلی قصبے عربوں نے چھوڑ دیے، کیونکہ انھیں بیزنطینی بیڑے کی طرف سے امداد مل رہی تھی اور اس وقت

---

[۱] بلاذری صفحہ ۱۳۰، انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹۔ [۲] (مترجم) مصنّف نے تقریباً ہر مقام کی تسخیر کے سلسلے میں یہودیوں یا مسیحیوں کی غدّاری کا ذکر ضرور کیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا ہو، ظاہر ہے کہ نہ اس کے ذمہ دار مسلمان عرب تھے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ رومی مسیحی حکمرانی پر مطمئن تھے۔ عربوں میں یقیناً خلق خدا کی خدمت کے یگانہ جوہر موجود تھے، جن کی بدولت ہر گروہ ان کی طرف بے اختیار کھنچا جا رہا تھا۔

Marfat.com

Marfat.com

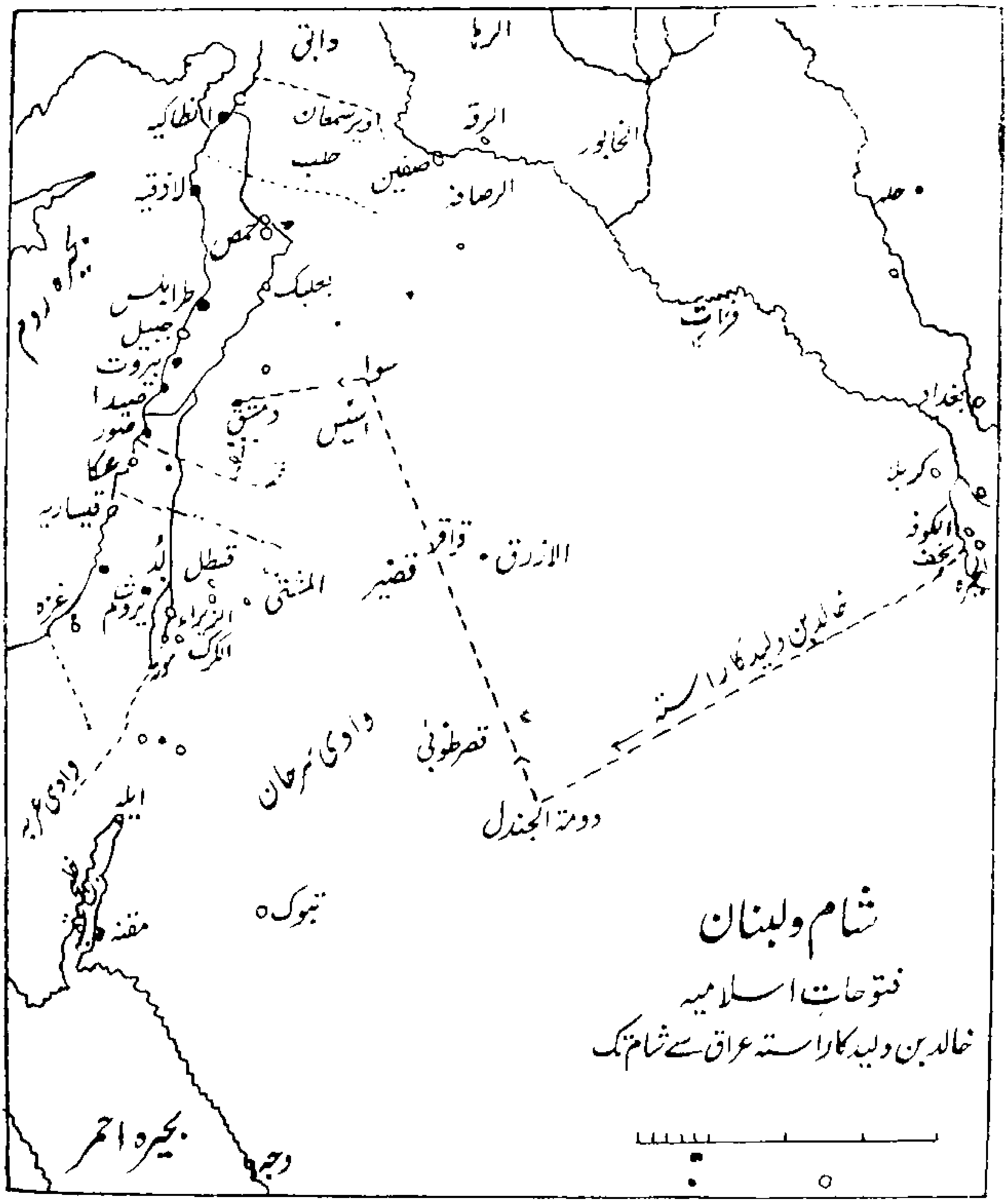

شام ولبنان
فتوحات اسلامیہ
خالد بن ولید کا راستہ عراق سے شام تک
دابق
الرہا
الرقہ
الخابور
دیر سمعان
حلب
صفین
الرصافہ
انطاکیہ
لاذقیہ
حمص
بعلبک
طرابلس
جبیل
بیروت
صیدا
صور
عکا
قیساریہ
بحیرہ روم
دمشق
سوا
فرات
حلہ
بغداد
کربلا
الکوفہ
النجف
قراقر
الازرق
قسطل
لد
الزرقاء
الکرک
غزہ
خالد بن ولید کا راستہ
وادی سرحان
قصر طوبی
دومۃ الجندل
ایلہ
تبوک
بحیرہ احمر


Marfat.com

تک بحری اقتدار اسی بیڑے کے پاس تھا، مگر یہ بھی صرف عارضی طور پر محفوظ رہے۔ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ سب کسی مزاحمت کے بغیر یزید اور معاویہؓ کے حوالے ہو گئے۔ بیروت ۶۳۵ء میں، صور و صیدا ۶۳۶ء میں، جبیل و عرقہ بھی قریباً اسی سال[۱]۔ طرابلس کی فصیل بہت بلند تھی، ۶۳۵ء میں اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اسی طرح ۶۴۰ء میں ارواد کا محاصرہ ہوا۔ بعض ساحلی شہر بزنطینی بیڑے نے عربوں سے واپس لے لیے تھے، لیکن معاویہؓ نے دوبارہ ان پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سات سال کی قلیل مدت میں طارس سے سینا تک کا پورا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ غالباً ایک بھی شہر مسلح قوت سے مسخر نہ کیا گیا۔

فتح شام مقامی اور عارضی مطلبوں سے بہت آگے نکل گئی۔ اس نے ایک ایسا مرکز بہم پہنچا دیا، جہاں سے شمالی و مشرقی جانب دوآبہ دجلہ و فرات، ایران اور اگلی سرزمینوں میں جنوبی و مغربی جانب مصر و شمالی افریقہ میں اقدامات کیے جا سکتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلام کو دنیا کی نظروں میں عزت و وقار کا خاص درجہ حاصل ہو گیا اور اس کے پیرووں کا اعتمادِ نفس کمال پر پہنچ گیا۔

## جابیہ میں مشورہ

یروشلم کی عوالگی (۶۳۸ء) سے تھوڑی مدت پہلے ابوبکرؓ کے جانشین عمرؓ ابن الخطاب (۶۳۴ء۔ ۶۴۴ء) نے نومفتوح علاقوں کی جانب[۱] اونٹ پر سفر کیا اور الجابیہ میں سالاروں کے ساتھ ایک مجلس شوریٰ منعقد کی، جو تین ہفتے جاری رہی[۲]۔ الجابیہ دمشق کے جنوب میں ایک دن کی مسافت پر ہے۔ اس وقت تک یہی مقام غسانی حکومت کا مرکز تھا۔ اس واقعے کو "یوم جابیہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واضح نہ ہو سکا کہ وہاں خاص فیصلے کیا ہوئے۔ ابو عبیدہؓ خلیفہ کے گہرے دوست تھے۔ خالدؓ بن ولید کی جگہ انھیں سپہ سالارِ اعظم اور حاکمِ اعلیٰ مقرر کر دیا گیا[۳]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفتوحہ علاقوں کے متعلق پالیسی کے عام خط و خال ضرور زیرِ بحث آئے ہوں گے، لیکن وقائع نگاروں نے جو تفصیلات بیان کیں، وہ بعد کے لوگوں کی تیار کردہ ہیں۔ جو نئی صورتِ حالات سامنے آ گئی تھی، اس کے باب میں کوئی قانون وضع نہیں ہوا تھا۔ ہم سمجھ سکتے ہیں ذہن میں یہ طے ہوا ہو گا کہ عرب مسلمانوں کو مفتوحہ علاقوں میں مخصوص مذہبی و فوجی جماعت کی حیثیت حاصل ہوئی، گروہ جاگیریں نہ لے

---

۱۔ بلاذری صفحہ ۱۲۶، انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۹۴ + ۲۔ بلاذری صفحہ ۱۳۹، ۱۵۱، انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۱۴۔ ۲۳۳ +
۳۔ کتاب الخراج امام ابو یوسف صفحہ ۱۷۶۔ ۱۷۷ +

Marfat.com

سکیں گے۔ مفتوحہ گروہوں، خصوصاً اہل کتاب (یہودی، عیسائی اور صابی) کو ایک نیا درجہ دیا گیا یعنی وہ ذمّی قرار پائے، جس کا مطلب ہے کہ ان کے ساتھ معاہدہ ہو گیا۔ ذمّیوں کی حیثیت میں ان سے دو رقمیں وصول کی جاتی تھیں، اوّل زمین کا مالیہ، جسے آگے چل کر خراج قرار دیا گیا، دوم جزیہ۔ مسلمانوں نے ان کی حفاظت کا ذمّہ اٹھا لیا اور وہ فوجی خدمات سے مستثنیٰ کر دیے گئے۔ یوں فاتحین و مفتوحین کے درمیان عدم مساوات کا اصول پالیسی کی مستقل بنیاد و اساس بن گیا اور یہ عدم مساوات اُس وقت تک قائم رہا، جب تک مفتوح غیر مسلم رہے۔

**انتظامی تقسیم** جابیہ کی مجلس شوریٰ میں شام کو انتظامی مقاصد کے لیے چار فوجی اضلاع (جُند) میں تقسیم کر دیا گیا۔ گویا بزنطینی حکومت نے پہلے سے جو انتظامی تقسیم کر رکھی تھی، وہی نئی تقسیم کی بنیاد قرار پائی۔ چار فوجی اضلاع یہ تھے: دمشق، حمص، الاردن اور فلسطین۔ معاویہؓ کے بیٹے اور جانشین یزید (۶۸۰ء تا ۶۸۳ء) نے ان میں پانچویں ضلع کا اضافہ کر دیا یعنی قنسرین۔ اس میں حمص کے کچھ علاقوں کے علاوہ پورا شمالی دجلہ و فرات شامل تھا[۵۴]۔ لبنان کو ضلع دمشق کا جزو بنا دیا گیا تھا۔ الجابیہ کے بعد دمشق ہی پورے شام کا دارالحکومت بن گیا۔ یہ شہر اموی خلافت (۶۶۱ء تا ۷۵۰ء) کا مرکز تھا جس کے بانی معاویہؓ (۶۶۱ء تا ۶۸۰ء) تھے۔ معاویہؓ نے حاکم صوبہ ہونے ہی کی حیثیت میں معاملاتِ شام کا انتظام ایسے طریقے پر کیا کہ مرکز مدینہ کی جانب سے اس میں زیادہ مداخلت نہ ہوئی۔ جب انتظامات کی باگ ڈور تیسرے خلیفۂ راشد عثمانؓ (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) کے ہاتھ میں آئی تو مداخلت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ عثمانؓ معاویہؓ کے عزیز تھے۔ دونوں کا تعلق قریش کی اموی شاخ سے تھا۔ یہ شاخ ابتدائی دور ہی سے رسول اللہ صلعم کی شدید مخالف رہی اور اس نے بالکل آخری دور میں اسلام قبول کیا[۵۶]۔ معاویہؓ نے خلافت کا نظم و نسق سنبھالتے ہی

---

[۵۴] کتاب الخراج امام ابو یوسف صفحہ ۴۲ + [۵۵] خلفائے راشدین یہ تھے: حضرت ابوبکرؓ (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) حضرت عمرؓ ابن الخطاب (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء)، حضرت عثمانؓ (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء)، حضرت علیؓ (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء)۔ انھیں راشدین اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے فرمائے ہوئے سیدھے راستے پر قائم رہے۔ ان کے زمانے میں مدینہ منورہ مرکزِ خلافت تھا۔ [۵۶] (مترجم) اس عبارت سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ تمام امویوں نے آخری دور میں اسلام قبول کیا۔ حضرت عثمانؓ بالکل ابتدا میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے۔ بنو امیہ میں سے اور لوگ بھی مسلمان ہوئے۔ خود ابو سفیانؓ اور امیر معاویہؓ نیز ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کر چکے تھے اور یہ واقعہ ۸ھ کا ہے۔ امیر معاویہؓ کی ہمشیرہ اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ بہت پہلے مسلمان ہو چکی تھیں۔ انھوں نے حبشہ ہجرت کی اور وہیں رسول اللہ صلعم نے وکیل کے ذریعے سے انھیں حبالۂ عقد میں لے لیا۔ یہ عقد خود شاہ حبشہ نے کرایا تھا۔

ساحل کی حفاظت کے لیے ایک بیڑے کی ضرورت بخوبی محسوس کر لی۔ کیونکہ بزنطینی بیڑا بار بار ساحل پر چھاپے مارتا رہتا تھا۔ بزنطینیوں نے جگہ جگہ جہاز سازی کے مرکز[1] قائم کر رکھے تھے۔ ان میں سے مرکزِ عکّہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ معاویہؓ نے فوراً ان کی مرمّت کرائی۔ زمانۂ قدیم کی طرح لبنان کے جنگل جہازوں کے لیے ضرورت کے مطابق لکڑی مہیا کرتے تھے۔ لبنانی ملّاح ملازم رکھے جاتے تھے، جو ابتدا سے بحر نوردی کی روایات کے حامل چلے آتے تھے۔ انھیں جنگلوں سے اسلامی بیڑے کی مصری شاخ کے لیے لکڑی بھیجی جاتی تھی۔ پہلا اسلامی بیڑا تیار ہو گیا تو اسے ۲۹ھ میں قبرص کے خلاف بھیجا گیا۔ جہاں اس نے حملہ آوری میں کامیابی حاصل کی۔ روڈس، کریٹ اور سسلی جیسے جزیروں پر چھاپے مار کر لوٹا گیا۔ اسی اثنا میں معاویہؓ نے ساحلی علاقے سے بزنطینی باشندوں اور ان کے حامیوں کو خارج کر دیا۔ آگے چل کر بعلبک، حمص اور انطاکیہ سے وفادار تاجروں کو ان کی جگہ آباد کیا گیا۔ جن مقامات کو جنگی اہمیت حاصل تھی، وہاں فوج بٹھا دی گئی۔[2] معاویہؓ کے ایک جانشین ہشام (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ)

---

[1] جہاز سازی کے مرکز کو عربی میں دارالصناعہ کہتے ہیں۔ اسی سے انگریزی کا لفظ آرسنل (Arsenal) نکلا۔ بلاذری صفحہ ۱۱۷، انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۸۰۔

[2] امویوں کی سفیانی شاخ کا شجرہ یہ ہے:

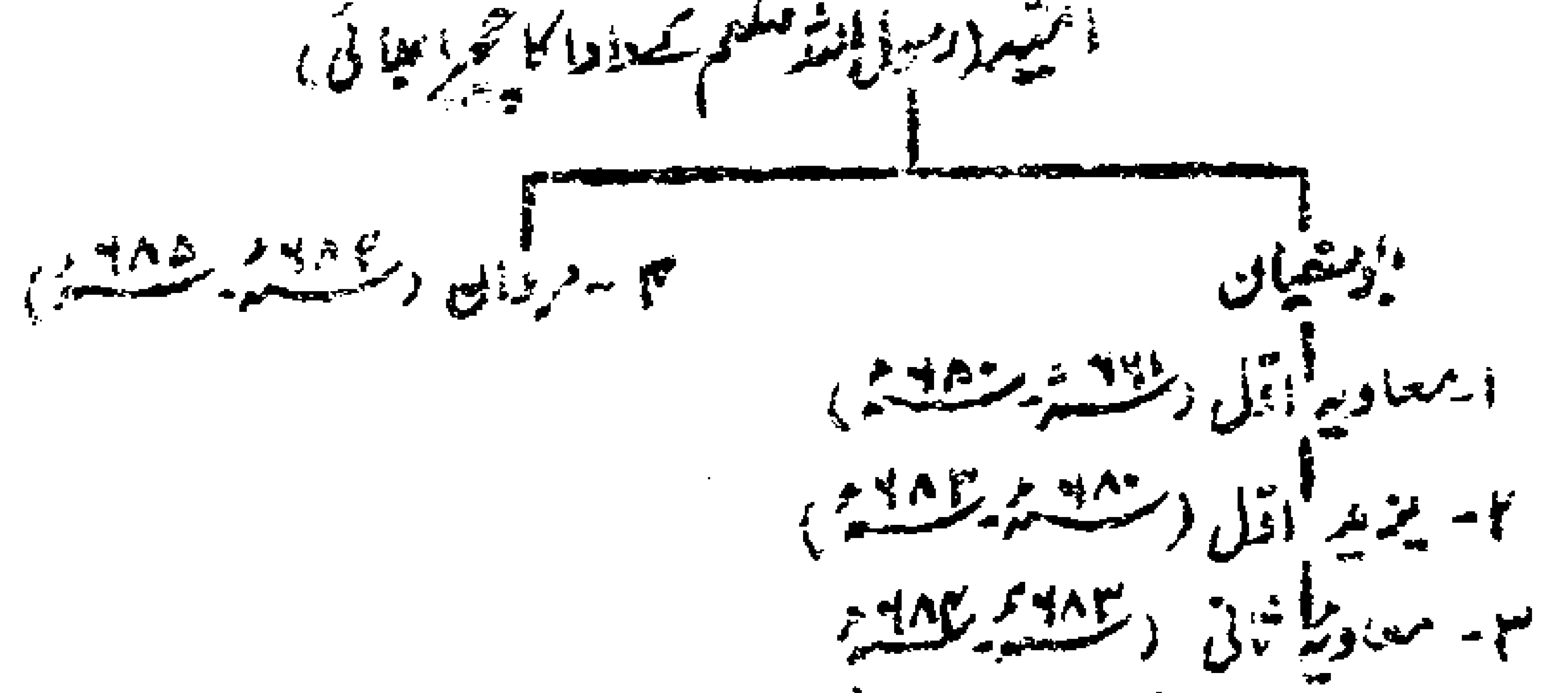


مروانی خاندان کا شجرۂ نسب

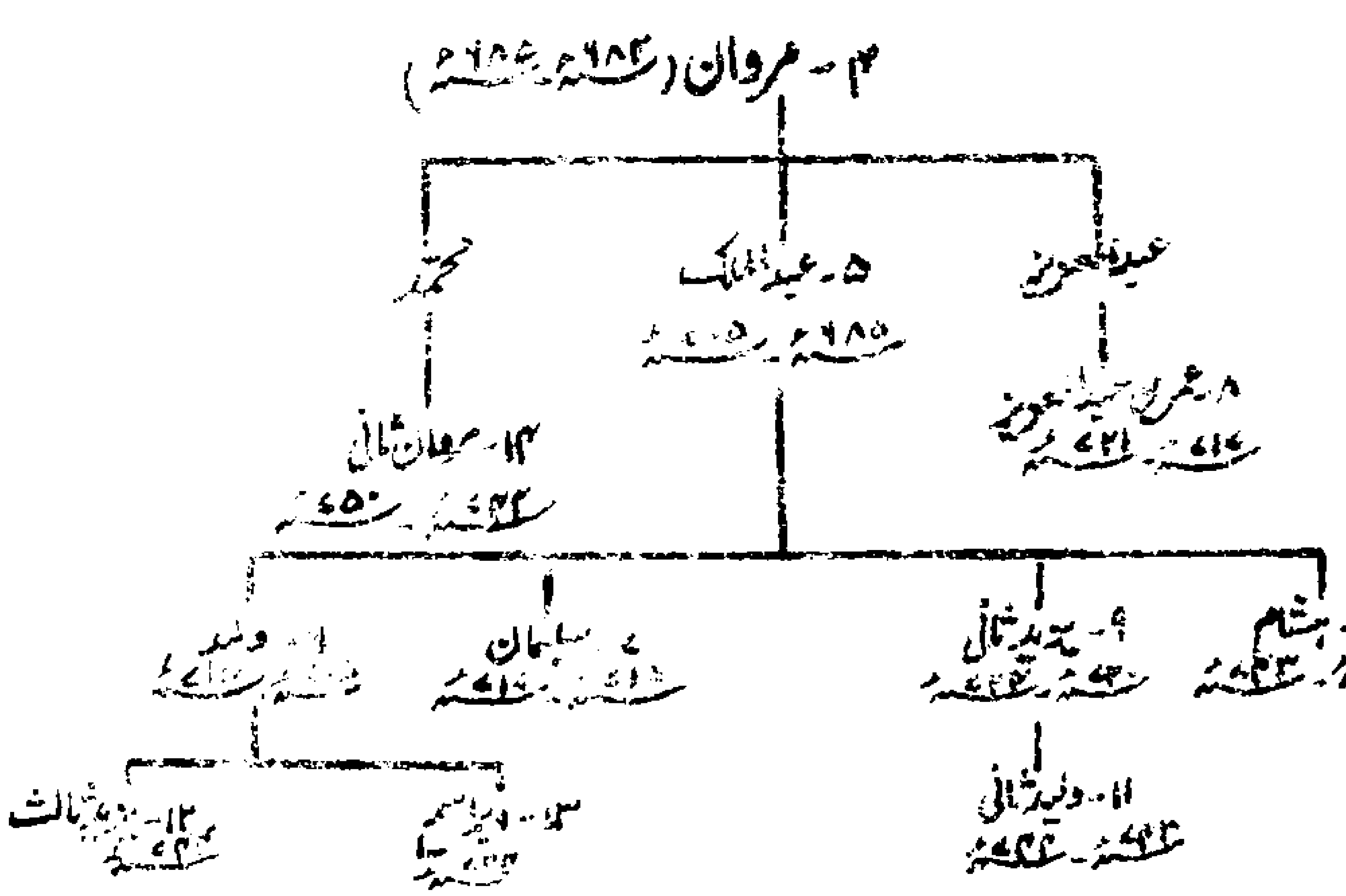

نے صور میں بحری مرکز بنایا[1]۔ اسلامی حکومت کے ماتحت بیروت کے مقابلے میں صور و عکّہ نے پہلے اہمیت حاصل کر لی۔ بیروت کا ذکر پہلے پہل اموی خلیفہ ولید ثانی (۷۴۳ء ۔ ۷۴۴ء) نے ایک نظم میں کیا۔[2] ۶۵۵ء میں اسلامی بیڑے کا مقابلہ بمقام فونکس[3] (موجودہ فینیکی) بیزنطینی بیڑے سے ہوا۔ یہ مقام لیسیا کے ساحل پر ہے۔ اس لڑائی میں بیزنطینی بیڑا بڑی حد تک تباہ ہو گیا۔ مشرقی بحیرہ روم کی کمان عربوں کے ہاتھ آ گئی۔ لبنانی ساحل کم از کم عارضی طور پر نسبتاً محفوظ ہو گیا۔

---

[1] کتاب البلدان الیعقوبی صفحہ ۳۲۷۔ [2] صالح بن یحییٰ صفحہ ۱۶، یاقوت، معجم البلدان جلد اول صفحہ ۷۸۵۔
[3] Phoenix۔

## اٹھارھواں باب

# دروزی اور دوسرے فرقے

**حجابِ تاریکی** مسلمانوں کے ماتحت ابتدائی ساڑھے چار سو سال تک سرزمینِ لبنان پر تاریخی لحاظ سے تاریکی کا پردہ پڑا رہا۔ عربوں کی فتوحات اور صلیبی جنگوں کی درمیانی مدت میں صرف موٹے موٹے خط و خال معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ بیزنطینی سرچشمہ ہائے معلومات خشک ہو گئے۔ عربی سرچشموں میں ابھی بہاؤ شروع نہیں ہوا تھا۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ "ہلال و رخیز" میں عربوں کا جو سیل امنڈ آیا تھا، اس میں سے صرف چھوٹی سی ندی اُس لبنانی علاقے میں پہنچی ہوگی، جو ساحلِ بحر پر واقع تھا۔ وہاں ان عربوں نے بیزنطینیوں اور ان کے حامیوں کی متروکہ آبادیوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ لوگ یا تو خود بخود چلے گئے تھے یا فتوحات کے سلسلے میں انھیں خارج کر دیا گیا تھا۔ ۶۶۳ء کے آس پاس معاویہؓ نے ایرانیوں کو عیدا، بیروت، جبیل، طرابلس، ارقہ اور دوسرے شہروں میں اس غرض سے آباد کیا کہ بیزنطینیوں کے بحری حملوں سے بچاؤ کا یہ بھی ایک ذریعہ[1] تھا، لیکن جبلِ لبنان میں عرب کے سرکاری عاملوں، جنگجوؤں، بدویوں یا نیم بدویوں کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ یہ لوگ زراعت کو اپنے مرتبے سے فروتر سمجھتے تھے۔ برفستان میں رہنا انھیں قطعاً پسند نہ تھا اور کوہستانی جنگ بھی عربوں کو کبھی خوشگوار معلوم نہ ہوئی +

**ارامی آثار** اس مفتوحہ علاقے میں جنگلی اور گھریلو درختوں اور پودوں کی بہت بڑی تعداد ہے، جن کے عربوں سے پیشتر کے سامی نام اب تک باقی ہیں۔ کھیتی باڑی اور باغبانی کی فنی اصطلاحات زیادہ سریانی اور ارامی ہیں۔ یہی کیفیت دینیات اور مراسم عبادت کی ہے۔ مثلاً عماد معنی بپتسمہ، کنز معنی تبلیغ، قسس بمعنی راہب، مزمور معنی سرود[2]۔ لبنان کے دیہات کی

---

[1] یعقوبی صفحہ ۳۲۷ +

[2] حضرت داؤدؑ کے ترانہ ہائے حمد و ثنا کو زبور بھی کہتے ہیں اور مزامیر بھی +

Marfat.com

خاصی بڑی تعداد کے نام عربی نہیں: ارامی یا فونیقی ہیں۔ رسالۃ المشرق[1] میں پانسو تیس دیہات کی فہرست دی گئی ہے اور ان سب کے نام سریانی بتائے گئے ہیں۔ لبنان میں کل ڈیڑھ ہزار قصبات و دیہات ہیں۔ ان میں سے دیکھی ہیں، جن کے آغاز میں لفظ "بیت" یا "با" آیا ہے، مثلاً بیت الدین، بطرام، بصالیم۔ یہ وہ آبادیاں تھیں جو کسی قدیم سامی معبد کے اردگرد آباد ہو گئیں۔ بعض مقامات کے نام "عین" یا "بای" سے مرکب ہیں مثلاً عین طیرہ، رشمایا، یہ آبادیاں چشموں سے موسوم ہوئیں۔ بعض دیہات قلعوں کے اردگرد آباد ہوئے مثلاً مجدلیہ، مجدلون۔ ایسے مقامات بھی ہیں، جن کے نام کفر (گاؤں) سے مرکب ہیں اور یہ سریانی لفظ ہے، مثلاً کفر فاقود، کفر ہاری، کفرشیما۔ ساحلی قصبوں کے ناموں میں عربی تسمیے کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

خلفاء مدینہ (منورہ) میں رہتے تھے، جو لبنان سے بہت دور تھا۔ انھیں کوہستان کی جنگی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ انھوں نے اسے علیٰ حالہ چھوڑے رکھا۔ یہاں کی ارامی النسل مسیحی آبادی کو براہ راست زیر اثر لانے کی پہلی کوشش معاویہ نے کی، جو قریب ہی دمشق میں مقیم تھے، مگر چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد جو کوششیں اسی خلیفہ یا اس کے جانشینوں نے کیں، وہ بھی برابر ناکام رہیں۔ اس وقت تک علاقہ خارج سے جنگجو گروہ کوہستانی علاقے میں پہنچ کر مقامی باشندوں کے لیے وجہ تکلیف بن چکے تھے۔ ان جنگجو گروہوں کو جراجمہ کہتے ہیں۔

**مردائی**

جراجمہ نیم آزاد اور غیر معروف لوگ تھے، جنھیں اپنے علاقے کے بڑے شہر جرجومہ کی وجہ سے یہ نام ملا۔ جرجومہ جبل لکام میں واقع ہے۔ بزنطینی حکومت ان سے فوج کے لیے قاعدہ دستے بھرتی کر لیتی تھی اور یہ شام کے مختلف حصوں پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ اس طرح عرب فاتحوں کے پہلو میں کانٹا بن گئے تھے۔ اس سے قبل مسلمانوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا (۶۳۸ء) تو جراجمہ میں سے ایک گروہ مسلمانوں کے لیے طلیعہ کی خدمت انجام دینے پر آمادہ ہو گیا۔ نیز ذمہ اٹھا لیا کہ بزنطینیوں اور عربوں کی سرحد پر جو درے ہیں، ان کی حفاظت کی جائے گی[2]۔ وہ لوگ شروع سے سرکش چلے آتے تھے اور ہر وقت مالی فائدے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جو حکومت انھیں زیادہ پیسے دینے پر راضی ہوتی، اسی کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ سب مسیحی تھے، البتہ یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ وہ فطرت مسیح یا وحدت ارادۂ مسیح کے قائل تھے۔

---

[1] جلد ۲۲ (۱۹۲۴ء) صفحہ ۳۷۲-۴۱۲، نیز جلد ۹ (۱۹۰۶ء) صفحہ ۷۰، ۱۵، صفحہ ۸۱-۸۷، صفحہ ۱۵۲-۱۵۷۔

[2] یاقوت معجم البلدان جلد دوم صفحہ ۵۵، بلاذری صفحہ ۱۵۹۔

وہ جبل لکام اور جبل طارق کی خلوت گاہوں میں رہتے تھے۔ جو شام و اناطولیہ کے درمیان ایک قدرتی سرحد تھے اور جس کی جنوبی ڈھلانوں سے اسلامی فتوحات کی لہریں ٹکرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ اب یہ کرخت مزاج جراجمہ رفتہ رفتہ شام میں داخل ہونے لگے۔ ۶۶۶ء کے آس پاس ان کے چھاپوں نے ایک حملے کی شکل اختیار کر لی۔ بیزنطینی رسالہ اور بیزنطینی فوجیں ان کے ساتھ تھیں۔ اور بیزنطین کا بحری بیڑا انھیں امداد دے رہا تھا۔ وہ لبنان کے قلب میں داخل ہو گئے اور جنوبی جانب فلسطین تک اہم جنگی مقامات ان کے قبضے میں تھے۔ اموی خاندان کا بانی زیادہ اہم ملکی معاملات میں الجھ گیا تھا۔ اس نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بیزنطینی امداد ختم کرنے کا مناسب طریقہ یہ سمجھا کہ خراج دینا منظور کرے تاکہ یہ نیا داخلی دشمن دستکش ہو جائے۔ خلیفہ نے اس گروہ کو بھی رقم دینا منظور کر لیا۔ چنانچہ جراجمہ کے زیادہ تر دستے پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن ۶۸۹ء میں بعہد عبدالملک (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) ایک اور بڑا حملہ جراجمہ ہی نے کیا اور اس کی وضع [illegible] کی سی ہی تھی۔ چنانچہ شمالی لبنان کی بلندیاں ان کے قبضے میں آ گئیں۔ خلیفہ نے شہنشاہ جسٹینین ثانی کو خراج دینا منظور کر لیا اور ایک ہزار دینار فی ہفتہ وہ جراجمہ کو دیتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اس نمونے پر عمل پیرا تھا جو معاویہ کے پیش نظر رہا تھا[1]۔ کوہستانی بلندیوں پہ یہ نو وارد پہنچے تو وہاں آبادی زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ وہ آرامی زبان بولنے والے مقامی عیسائیوں میں گھل مل گئے اور ایسا مرکز قائم کر دیا جہاں داخلی شام نیز ساحلی میدان سے مظلوم اور غیر مطمئن لوگ پناہ لے سکتے تھے۔ غالباً اسی زمانے میں یہ لوگ مردائٹ یعنی باغی کہلانے لگے[2]۔ اب لبنان نے اپنی قدیم روایات کے مطابق سفر شروع کر دیا یعنی یہ علاقہ اقلیتوں اور اختلاف رکھنے والوں کے لیے حصار بن گیا اور جو تحریکیں ناکام ہو گئی تھیں ان کے بچے کھچے افراد کے لیے ایک جائے پناہ بن گیا۔ اسی موقع پر امتزاج سے وہ گروہ معرض وجود میں آیا جسے مارونی (موارنہ) کہتے ہیں جسے اب تک شمالی لبنان میں استقرار حاصل ہے اور سب سے زیادہ مسیحی گروہ یہی ہے۔ اسی وقت سے کوہستانی علاقہ تاریخی وقائع کے دھارے میں موثر حیثیت اختیار کرنے لگا۔

عبدالملک کے بیٹے ولید (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) نے شمالی خطرے سے [illegible] ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۷۰۸ء میں اس نے اپنے بھائی مسلمہ کو ایک فوج دے کر بھیجا کہ جرجومہ کو تباہ کرے۔ اسی مسلمہ ہی نے آگے چل کر بیزنطین کے خلاف [illegible]

---

[1] بلاذری صفحہ ۱۶۰، انساب الاشراف جلد پنجم صفحہ ۲۹۹-۳۰۰۔
[2] جراجمہ کے متعلق مزید معلومات کے لیے لامنز کی فرانسیسی کتاب ملاحظہ فرمائیے۔ جلد اول صفحہ ۱۴-۲۲، نیز تصریح جلد دوم صفحہ ۲۷-۲۸۔

Marfat.com

مقرر ہوا۔ اس کے حملہ آور ہوتے ہی باشندگانِ جرجومہ میں سے کچھ لوگ بھاگ کر اناطولیہ چلے گئے۔ ایک گروہ کو شام و لبنان میں آباد ہو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ مسیحیت کے پابند رہیں اور جزیہ نہ دیں۔[1] عبدالملک اور اس کے فرزندوں کے ماتحت عربی خلافت عظمت و شوکت کے نصف النہار پر پہنچ گئی۔ اس کے حدود اٹلانٹک کے کناروں سے ہسپانیہ، فرانس، شمالی افریقہ، مغربی ایشیا میں سے دریائے سندھ اور سرحدِ چین تک جا پہنچے تھے۔ رومی سلطنت بھی اپنے انتہائی دورِ عروج میں اتنی وسعت نہیں اختیار کر سکی +

**سینٹ مارون**

مختلف گروہوں کا وہ مجموعہ، جو مارونی کہلایا، اپنے کلیسیا کے مربّی بزرگ مارون سے منسوب ہوا۔[2] یہ ایک متقشف راہب تھا، جو چوتھی صدی کے آخری حصے میں مشہور ہوا۔ ۴۱۰ء میں اس صحرائی علاقے کے اندر وفات پائی، جو انطاکیہ اور قورش کے درمیان ہے۔ اس مذہبی پیشوا کی زندگی کے مستند حالات چند فقروں میں لکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا قدیم ترین ماخذ اس کا معاصر تھیوڈ وایٹ اسقف قورش ہے، جو لکھتا ہے کہ مارون نے راہبانہ زندگی کا باغ لگایا،[3] جو اس زمانے میں خوب فروغ پر تھا۔ انطاکیہ کے ایک اور شخص مارون کا زیادہ مشہور معاصر تھا، یعنی جان کرسوستم (یوحنّا زرّیں گلو)۔ یہ ۴۰۴ء میں جلاوطن ہوا تو اس نے اپنے عزیز دوست مارون راہب کے نام ایک خط بھیجا، جس میں اس سے دعا کی درخواست کی، نیز حال پوچھا،[4] لیکن یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی مارون تھا۔ اس امر کی بھی کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی کہ سینٹ مارون یونانی جانتا تھا یا اس نے انطاکیہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ شامی کلیسیا کا ممبر تھا، جس کی دعا اور نماز میں سریانی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ غالباً یونانی کلیسیا کے ساتھ غیر معلوم اسباب کی بنا پر جھگڑا شروع ہو گیا تھا، جو انطاکیہ اور بیزنطیم میں بڑے زوروں پر جاری تھا۔ مارون کی وفات کے تھوڑی دیر بعد اس کے مرید افامیہ میں یا اس کے نزدیک منتقل ہو گئے۔ یہ دریائے عاصی پر واقع ہے اور آج کل اسے قلعۃ المازق کہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے اپنے پیشوا کی یادگار میں ایک خانقاہ تعمیر کر لی۔ روایت یہ ہے کہ وہ اپنے پیشوا کے باقیات بھی ساتھ لے آئے، جو بعد ازاں وہاں سے انھیں لبنان میں منتقل کر لیا۔ افامیہ کے اردگرد

---

[1] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۶۱ + [2] مارون اور مار سریانی میں چھوٹے آقا کو کہتے ہیں +
[3] دیکھیے مگنے جلد ۸۲ صفحہ ۱۴۱۸، ۱۴۱۹ + [4] ایضاً جلد ۵۲ صفحہ ۳۶۰۔ عربی ترجمے کے لیے ملاحظہ ہو اسطفان الدویہی، تاریخ الطائفۃ المارونیہ صفحہ ۱۹، ۲۰ +

مارونی عقیدے کے آدمیوں کی تعداد بڑھی تو یعقوبیوں[1] کی طرف سے رقابت و عداوت میں اضافہ ہوگیا۔ وہ بھی مارونیوں کی طرح نماز و دعا میں سریانی زبان ہی استعمال کرتے تھے۔ شہنشاہ مارسیانوس نے مارونی خانقاہ میں توسیع کردی (۴۵۲ء)[2]۔ ۵۱۷ء میں اس خانقاہ کے تقریباً ساڑھے تین سو راہب نئے دشمنوں یعنی یعقوبیوں کے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبی دریائے عاصی کی وادی میں بخوبی قدم جما چکے تھے۔ جسٹینین اعظم (۵۲۷ء۔ ۵۶۵ء) نے تباہ شدہ خانقاہ از سر نو تعمیر کرائی۔ شہنشاہوں میں سے ہرقل بھی اس خانقاہ کا مربی تھا۔ ایرانیوں پر فتح حاصل کر چکنے کے بعد وہ ۶۲۸ء میں یہاں آیا تھا[3]۔ یہی شہنشاہ تھا جس نے وحدتِ ارادۂ مسیح کے عقیدے کی حمایت کی۔ پیشتر اسے خلافِ مذہب سمجھا جاتا تھا۔ ایک گمنام سریانی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۵۹ء میں مارونی اور یعقوبی اپنا مذہبی جھگڑا معاویہؓ کے حضور لے گئے اور اپنا اپنا نقطۂ نگاہ تفصیل سے پیش کیا[4]۔ ساتویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں یعقوبیوں سے جھگڑے تازہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مارونی گروہ وہاں سے شمالی لبنان میں منتقل ہوگئے اور یہی مقام آگے چل کر مارونیت کا مستقل وطن بننے والا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مسیحی پہلے سے موجود تھے کیونکہ دو قدیم کلیساؤں کے طرزِ تعمیر اور صنعت کاری میں بزنطینی نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا۔ ان میں سے ایک کلیسا اِحدان کا ہے، جس کے کتبے یونانی میں ہیں؛ دوسرا کفر شلیمان کا[5]۔ سریانی زبان کا ایک مسیحی مخطوطہ برٹش میوزیم میں ہے۔ یونانیوں کی تقویم کے مطابق یہ ۸۲۰ء کا ہے، جو عام عیسوی تقویم کے مطابق اسے ۵۰۹ء کا سمجھنا چاہیے۔ اس میں کوہ لبنان کے ایک گاؤں حدا ثۃ الجبہ کا ذکر ہے[6]۔ معاد اور حدتوں کے کلیساؤں میں پیشتر کے اعتامی باقیات محفوظ ہیں[7]۔

**یوحنا مارون**

مارونی فرقے کا پیشوا تھا۔ یوحنا مارون[8] (وفات ۷۰۷ء) اس نئی قوم کا بانی اور سرگرم پیشوا تھا، جس نے تادیشا کے کنارے دیودار وں کے سایے میں پرورش پائی۔ یہی پہلا بطریق اعظم تھا، جس کی قیادت میں اس جماعت کے قومی

---

[1] یعقوبی وحدت فطرت مسیح کے پیروؤں کی ایک شاخ تھے۔ [2] دیکھیے ابوالفدا التواریخ القدیمہ من المختصر فی اخبار البشر صفحہ ۱۱۲، لامنز تصریح جلد دوم صفحہ ۹۰۔ [3] سعید ابن البطریق التاریخ المجموع علی التحقیق والتصدیق جلد دوم صفحہ ۵۔ [4] نولدیکے کا مضمون جرمن رسالے میں جلد ۲۹ (۱۸۷۵ء) صفحہ ۸۲-۹۶۔ [5] لامنز تصریح جلد اول صفحہ ۸۵-۸۶-۱۱۹۔ [6] رائٹ (WRIGHT) فہرست مخطوطات سریانیہ در برٹش میوزیم حصہ دوم صفحہ ۲۱۰۔ [7] لامنز تصریح جلد اول صفحہ ۸۵-۸۷۔ [8] جان (JOHN)۔

خصائص اُبھرے۔ یوحنا سوم (نزدِ انطاکیہ) میں پیدا ہوا۔ انطاکیہ میں سریانی اور یونانی زبان کی تعلیم پائی۔ پھر دریائے عاصی کے کنارے خانقاہ سے وابستہ ہوگیا۔ اس نے قسطنطنیہ میں بھی مذہبی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ پھر اسے البطرون کا اسقف بنا دیا گیا (تقریباً ۶۷۶ء) یہ مقام شمالی لبنان کے ساحل پر واقع ہے۔ یوحنا کا پہلا مرکز سمار جبیل تھا۔ وہاں سے وہ کفر حی میں منتقل ہوگیا، جو البطرون سے تقریباً دس میل مشرق میں ہے۔ جو جگہ اس نے خانقاہ اور قبرستان کے لیے چُنی، وہاں آج کل ایک درس گاہ ہے، جو اسی کے نام سے منسوب ہے اس کی قیادت میں مارونی جمعیت ایک خود مختار قوم بن گئی۔ وہ ایک طرف اسلامی خلیفہ اور دوسری طرف بیزنطینی شہنشاہ کو مداخلت کا موقع نہیں دیتے تھے ۶۹۴ء میں جسٹینین ثانی نے دریائے عاصی کی خانقاہ تباہ کر ڈالی اور لبنان میں مارونیوں کے خلاف پیش قدمی شروع کردی۔ یوحنا نے بمقام اموین جسٹینین کی فوج کو شکست دی[1] اس وقت سے مارونی الگ تھلگ بیٹھ گئے اور انھوں نے کوہستانی باشندوں کے مخصوص اوصاف پیدا کر لیے۔ گبن[2] لکھتا ہے کہ یہ مختصر سی قوم سلطنتِ قسطنطنیہ کے بعد بھی زندہ رہی۔ سلطنت مذکورہ ان لوگوں کو سر مشق تعذیب بناتی تھی۔ چودھویں صدی سے قنوبین مارونی بطریقِ اعظم کا مرکز بن گیا۔ یہ مقام وادیِ قادیشا کی چٹانیں کاٹ کاٹ کر بنایا گیا تھا[3]۔ آج کل بطریقِ اعظم موسم بہار بکرکی میں گزارتا ہے۔

یہ اپنے آپ کو اب تک انطاکیہ اور پورے مشرق کا بطریقِ اعظم قرار دیتا ہے ؛

## مارونیت کی اشاعت

صدر مقام لبنان میں منتقل ہونے کے بعد بھی مارونی جماعت وادیِ عاصی میں باقی رہی اور خطّہ قورس میں بھی یہی کیفیت تھی۔ خلیفہ مہدی عبّاسی (۷۷۵ء۔۷۸۵ء) کے دربار کا منجّم اعظم اور سریانی میں ہومر کا مترجم طوفیل (تھیوفلس ابن توما) مارونی تھا اور غالباً اس کا تعلق شمالی شام سے تھا[5]۔ عرب مورّخ المسعودی[4]، جس نے بغداد کی سیاحت بھی کی تھی، ۹۵۰ء کے قریب لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ ان فرقوں کی اکثریت لبنان نیز حمص، حما اور معرّۃ النعمان میں رہتی ہے۔ نیز کہتا ہے کہ یہ لوگ وحدتِ ارادہ مسیح کے قائل تھے۔ وحدتِ ارادہ کا نظریہ ہرقل کے بطریقِ اعظم نے ۶۳۸ء میں

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ببلیوتھیکا اورینٹلس جلد اوّل صفحہ ۴۹۶ - ۵۲۰ + [2] تاریخ انحطاط سقوطِ سلطنت روما جلد پنجم صفحہ ۱۵۶ - ۱۵۷ + [3] ابن العبری تاریخ مختصر الدول صفحہ ۲۱۹ - ۲۲۰ +

[4] التنبیہ والاشراف صفحہ ۱۵۳ - ۱۵۴ +

Marfat.com

تجویز کیا تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ بیزنطینی عقیدے اور وحدتِ فطرتِ مسیح میں مفاہمت پیدا ہو جائے۔ شامی رعایا کی اکثریت وحدتِ فطرتِ مسیح کی قائل تھی۔ شامی کلیسا اور بیزنطینی کلیسا کے درمیان اختلاف واضح تھا۔ شہنشاہ نے عین آخری وقت میں کوشش کی تھی کہ اس اختلاف کو ختم کر دے لیکن دوسری مفاہمتوں کی طرح یہ کوشش بھی کسی فریق کے لیے تسکین کا سامان نہ بن سکی۔ مسعودی کا ایک معاصر سعید بن لبطریق[1] (بطریق سکندریہ) یہی الزام مارونیوں پر لگاتا ہے بلکہ وہ ہرقل کو بھی مارونی قرار دیتا ہے[2]۔ ولیم صوری صلیبی[3] جنگوں کا مورخ ہے۔ وہ بھی ابن لبطریق ہی کا ہمنوا ہے۔ کہتا ہے:

> "مارون اور اس کے پیرووں کا الحاد ہے کہ ہمارے خداوند یسوع
> مسیح میں ابتدا سے ایک ہی ارادہ اور ایک ہی قوت تھی"

ولیم کے نزدیک مارونیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ۱۱۸۲ء میں یہ لوگ الحاد سے دست بردار ہو کر کیتھولک عقیدے کے پابند ہو گئے۔ مارونی مصنف الدویحی[4] (وفات ۱۷۰۴ء) اور ابن نمرون[5] (وفات ۱۷۱۱ء) سے آخر تک اس الزام کی تردید کرتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے کلیسا کی مخلصانہ پیروی سے کبھی انحراف نہیں کیا[6]۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ قسطنطنیہ میں تیسری (مذہبی) مجلس جو ۶۸۰ء۔۶۸۱ء میں منعقد ہوئی تھی، اس میں وحدتِ ارادہ کے عقیدے کی مذمت کی گئی اور مارونیوں کا ذکر قطعاً نہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اور مارون تھا جو وحدتِ ارادہ کے عقیدے کا پابند تھا۔ وہ الروحا میں رہتا تھا۔ ۴۵۰ء کے قریب وفات پائی۔ ولیم صوری اور دوسرے مصنف اسی کے مریدوں کو لبنانی مارونی سمجھتے رہے۔ یہ دعویٰ بے بنیاد معلوم نہیں ہوتا[7]۔ اگر انھیں یونانی[8] سمجھا جائے تو مارونی سب سے مختلف ہیں۔ وہ بہ حیثیت جماعت پوپ کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں اور اس قسم کے دوسرے گروہ مختلف [illegible] تاہم [illegible] انھوں نے اپنے مرکز سے علیحدگی اختیار کر لی۔

---

[1] Entychius ۔ [2] جلد دوم صفحہ ۱۲ و ۳۰-۳۱ ۔ [3] A History of Deeds Done Beyond the Sea جلد دوم صفحہ ۴۵۹ ۔ [4] صفحہ ۴۹۲ بیعد ۔ [5] فاستونیردنی ۔ [6] اس سلسلے میں جن لوگوں نے اپنا نقطہ نگاہ حال میں پیش کیا۔ اس کے لیے دیکھیے افرام الدیرانی کی کتاب المحاماۃ عن الموارنہ والقدیسیھم، یوسف الدبس کی کتاب تاریخ صوریہ جلد پنجم، نیز فرانسیسی کتاب جلد اوّل صفحہ ۶۳، ۱۴۴ ۔ [7] برنارڈ الغزیری کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۳۱-۳۳، صفحہ ۴۳، ۴۵، رابرٹ کرا فورڈ رسالہ ٹریکولم میں جلد ۳۰ صفحہ ۲۲۲، ۲۲۸ ۔ [8] (MNIATS) مشرقی مسیحی، جو پوپ کو پیشوا مانتے ہیں مگر ان کا طریق عبادت الگ ہے۔

Marfat.com

سیاحوں کے بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے اندر مارونیوں کی ایک جماعت تکریت اور دوآبۂ دجلہ و فرات کے دوسرے مقامات میں بھی موجود تھی۔ ایک مارونی نوآبادی قبرص میں تھی (فماگسٹا اور اس کے حوالی میں) یہ بارھویں صدی کے اوائل کا حال ہے۔ سنہ ١١٢٠ء میں انھوں نے ایک گرجا قائم کر رکھا تھا اور تیس دیہات پر ان کا اقتدار پھیلا ہوا تھا۔[1] اغلب ہے، یہ لوگ ابتدا میں عباسیوں خصوصاً متوکل (٨٤٧ء-٨٦١ء) کی سخت گیریوں کے باعث نکل گئے اور جزیرہ قبرص میں پناہ گزین ہوئے۔[2] صلیبی جنگوں کے زمانے میں مزید تارکین وطن وہاں پہنچ گئے۔ اس طرح اس قدیم ترین مارونی نوآبادی کے باشندے چار ہزار نفوس تک پہنچ گئے۔ انھوں نے کرمکیتی میں گرجا تعمیر کر لیا تھا اور سریانی و عربی زبان بولتے تھے، جو لبنان میں بیسویں صدی تک بولی جاتی رہی۔ اس میں شبہ نہیں کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں روما کی توجہ مارونیوں کی طرف منعطف ہوئی اور وہ بھی روما کی طرف مائل ہوئے، لیکن اٹھارھویں صدی تک ان میں اتحاد نہ ہو سکا۔ ان کا کلیسا، جسے لبنان کا قومی کلیسا سمجھنا چاہیے، اب تک نماز و دعا میں سریانی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ چرچ سینٹ جیمز سے منسوب ہے، نیز اس کے پادری شادیاں کرتے ہیں۔ جمہوریہ لبنان کا صدر بھی اسی طبقے سے ہے۔ لبنان کی پوری آبادی ١٩٥٢ء میں تیرہ لاکھ تین ہزار نو سو اکتالیس تھی۔ ان میں سے مارونی تین لاکھ ستتر ہزار پانچ سو چوالیس تھے۔ حال میں جن مارونیوں نے نقل وطن کیا، وہ اپنے مراسم عبادت فرانس، اٹلی، شمالی و جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے حصوں میں لے گئے۔

## مشرقی شامی کلیسا

مارونی فرقہ سریانی کلیسا کی محض ایک شاخ تھا۔ اس کی دو شاخیں اور بھی ہیں یعنی مشرقی شامی اور مغربی شامی جماعتیں۔ سریانی کلیسا اور اس کی شاخوں کی دعا و عبادت یونانی و لاطینی دعا و عبادت پر باعتبار زمانہ مقدم ہے۔ روایات کے لحاظ سے یہ سلسلہ سینٹ جیمز کے ساتھ ملایا جاتا ہے، جو حضرت مسیح کے حقیقی یا چچیرے بھائی تھے اور کلیسائے یروشلم کے رئیس وہی تھے۔ یقیناً تاریخ مسیحیت کا یہ بالکل ابتدائی کلیسا ہے اور اس کا سلسلہ "عشائے ربانی" اور "بالاخانے" (رسولوں کے اعمال، باب ١، آیت ١٣) تک جاتا ہے۔ یونانیوں میں بھی اس کی سریانی حیثیت قائم رہی ہے۔

---

١ لامنز: تاریخ جلد دوم صفحہ ٥٥-٥٦، ہٹی: عرب صفحہ ١٤٥، ١٤٦۔

٢ دیکھیے ہٹی کی تاریخ عرب صفحہ ٣٥٢۔

مشرقی شامی شاخ، جو اپنے آپ کو کلیسائے مشرق کے پر فخر نام سے موسوم کرتی ہے، دوسری صدی کے اواخر میں قائم ہوئی تھی، لیکن اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی تعلیمات، عبادات اور تقدیس و روایت ابجر شاہ رو حا کے زمانے سے بلا انقطاع چلی آ رہی ہیں۔ شاہ موصوف حضرت مسیحؑ کا معاصر تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خط و کتابت کے ذریعے سے ایک ناقابلِ علاج بیماری کے سلسلے میں حضرت مسیحؑ سے استمداد کی تھی اور حضرت نے رفع بیماری کے بعد اپنے ایک حواری کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہی وہ شرکتِ عشائے ربانی ہے جسے عموماً نسطوری قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نام سلیشیا کے نسطوریس کے نام پر رکھا گیا، جو ۴۲۸ء سے ۴۳۱ء تک قسطنطنیہ کا بطریق اعظم رہا۔ افسوس کی مذہبی مجلس نے اس کی مذمت کرتے ہوئے اس بنا پر مذہبی منصب سے معزول کر دیا تھا کہ وہ کہتا تھا، حضرت مسیحؑ میں آسمانی اور انسانی شخصیتیں عملاً پوری طرح ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ یہ نہیں کہ دونوں شخصیتوں کے امتزاج سے ایک شخصیت وجود پذیر ہوئی تھی۔ آرتھوڈکس عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ میں دونوں فطرتیں موجود تھیں، لیکن ان دونوں نے ایک شخصیت کا وجود اختیار کر لیا۔ کلیسائے شرق نسطوریس کو شامی نہیں یونانی مذہبی پیشوا سمجھتا ہے۔ نئے عقیدے کو شامیوں میں بہت سے حامی مل گئے اور یہ مشرقی جانب دوآبہ دجلہ و فرات میں پہنچ گیا۔ چونکہ اس کلیسا نے نسطوریس کی مذمت سے انکار کر دیا تھا[1]۔ اس لیے ابتدا ہی سے اسے نسطوری کہا جانے لگا، لیکن یہ نام اس کے پیروؤں کے لیے مذموم بن گیا۔ جب چھٹی صدی کے وسط میں اس کی ایک شاخ پوپ سے مل گئی اور اس کا نام کلدانی شاخ بن گیا[2]، پھر روس میں کیتھولک اس اصطلاح کو الحاد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ ۱۹۵۲ء کی مردم شماری میں لبنان کے کلدانیوں کی تعداد کل ایک ہزار تین سو نوّے تھی۔ انیسویں صدی میں انگلیکن مشن نے اپنے لیے آشوری کلیسا کا نام اختیار کر لیا۔ کیونکہ اس کا تعلق مشرقی شامیوں سے تھا۔ اس طرح پراگندگی اور افراتفری میں اضافہ ہو گیا۔

الرّوحا سے مشرقی کلیسا ایران تک پہنچ گیا۔ ظہور اسلام کے وقت بھی اس میں اتنی [illegible] عمل موجود تھی کہ اس نے اپنے مشنری چین بھیجے۔ اس سے پیشتر ہندوستان میں مشن [illegible] کیے جا چکے تھے۔ اسی کلیسا کے پیرو تھے، خصوصاً حنین ابن اسحٰق[4] (۸۰۹ء تا ۸۷۳ء) جنھوں نے یونانی زبان کی

---

[1] یحییٰ بن سعید الانطاکی ابن بطریق میں جلد دوم صفحہ ۲۶۳-۲۶۴۔ [2] جارج بیجر کی انگریزی کتاب "نسطوری اور ان کی عبادت" جلد دوم صفحہ ۴۹-۵۱، صفحہ ۱۲۸-۱۲۹۔ [3] واضح رہے کہ یہ ایک مذہبی گروہ کا نام ہے، اسے قومی گروہ سے الگ سمجھنا چاہیے۔ [4] Johannitius۔

بڑی بڑی فلسفیانہ اور طبی تصانیف کا ترجمہ سریانی کی وساطت سے عربی میں کیا۔ اس طرح عربی و یونانی افکار میں ایک دوسرے سے ربط و تعلق کا انتظام ہوا۔

**مغربی شامی کلیسا**

شامی کلیسا کی مغربی شاخ نے الٰہیات میں وحدتِ فطرت کا عقیدہ اختیار کیا۔ اس طرح حضرت مسیح کی شخصیت میں دونوں فطرتوں کا اتحاد تسلیم کر لیا، لیکن انسانی فطرت غائب ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ فطرت کے قائل حضرت مسیح کی شخصیت میں دو فطرتوں (الوہی اور انسانی) کے منکر تھے، یعنی اس عقیدے کے مخالف تھے، جو کالسیڈن کی مذہبی مجلس میں مرتب ہوا تھا (۴۵۱ء)۔ چھٹی صدی کے اوائل تک وحدتِ فطرت کے قائل شمالی شام کے بڑے حصے کو ہمنوا بنا چکے تھے۔ یہ کام سیورس کی شخصیت اور سرگرمیوں کی بدولت انجام پاتا تھا، جس نے بیروت کے دار العلوم سے اعلیٰ تعلیم کی سند حاصل کی تھی اور ۵۱۲ء سے ۵۱۸ء تک انطاکیہ کا بطریق اعظم رہا تھا۔ اس کی شامی تنظیم کے لیے جیکب براڈلیس اسقف الرّوحا (۵۴۳ء۔۵۷۸ء) بڑی حد تک ذمہ دار تھا۔ اسی کی وجہ سے شامی کلیسا یعقوبی[1] کہلایا، اگرچہ اس کے پیرو آرتھوڈکس یا قدیم شامی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ شام سے وحدتِ فطرت کا عقیدہ آرمینیا پہنچا اور وہاں گریگوری کے کلیسا نے اسے اختیار کر لیا۔ مصر میں قبطی کلیسا اسی کا پابند ہو گیا۔ مغربی شامی (سریان آرتھوڈکس) مسیحیوں کی تعداد لبنان میں چار ہزار پانچ سو باسٹھ اور کیتھولک شامی (سریان کاسولیک) مسیحیوں کی تعداد پانچ ہزار نو سو گیارہ ہے۔ آخر الذکر گروہ روما سے ملحق ہے اور ان کے بطریقوں کا ایک مرکز بیروت ہے، دوسرا دیر الشرفہ۔

**ملکی**

مشرقی شامی اور مغربی شامی کلیساؤں کی متعدد شاخیں ہیں، لیکن اور بھی چھوٹے گروہ ہیں، جن پر یونانی الٰہیات کا زبردست اثر پڑا، جو انطاکیہ اور قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے کالسیڈن کی مذہبی مجلس (۴۵۱ء) کے فیصلے قبول کر لیے۔ اس بنا پر یہ مسیحی گروہ راسخ العقیدہ مانے گئے۔ انھیں دائرۂ مذہب سے خارج نہ کیا گیا بلکہ کلیسائے سلطنت اور پوپوں کی حفاظت حاصل رہی۔ شامی مسیحی ان کے حریف تھے۔ انھوں نے آگے چل کر ان گروہوں کے لیے استہزاءً ملکیوں کا نام تجویز کر لیا۔ یہ نام جسٹینین ثانی (۶۸۵ء۔۶۹۵ء) کے عہد حکومت میں بہت رائج ہوا۔ ان گروہوں میں یا تو شہری لوگ شامل تھے یا یونانی آباد کاروں کے اخلاف۔

---

۱۔ Jacobite، یہ لفظ جیکب (یعقوب) سے بنایا گیا ہے، جو اسقف الرّوحا کے نام کا پہلا جزو تھا۔

Marfat.com

پہلے یہ اپنی عبادت اور دعاؤں میں سریانی زبان استعمال کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ یونانی زبان اختیار کرلی اور سریانی دعاؤں اور عبادتوں کی جگہ بیزنطینی دعائیں اور عبادتیں جاری ہوگئیں۔ اگرچہ ان لوگوں کو شہنشاہ کی حمایت حاصل تھی، مگر یہ نسبتہً کمزور رہے اور یونانی آرتھوڈکس (روم آرتھوڈکس) مشہور ہوگئے۔ آج کل یہ مالکورہ اور المتن میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی دعائیں اور عبادتیں وہ ہیں، جو بیسیلیس سے منسوب ہیں۔ یہ شخص اپنے وطن قیساریہ (کپاڈوسیا) کا اسقف تھا اور ۳۷۹ء میں فوت ہوا۔ دعاؤں اور عبادتوں پر نظر ثانی یوحنا کریسوسٹم نے کی تھی، جو ۳۹۸ء سے ۴۰۴ء تک قسطنطنیہ میں بطریق اعظم رہا۔ حال میں ملکیوں (روم ملکی) کا نام ان لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا، جو کیتھولک مشنریوں کی سرگرمیوں کے باعث آرتھوڈکس کلیسا سے نکلے اور روم سے وابستہ ہوگئے (۱۷۲۴ء)۔ انھیں یونانی کیتھولک (روم کاسولیک) کہا جاتا ہے۔ ان کی عبادتوں میں اب تک یونانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ یہی زبان یونانی آرتھوڈکس استعمال کرتے ہیں۔ البتہ وہ پوپ کا نام نہیں لیتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں ابتدا سے پوپ کے ساتھ تعلق چلا آتا ہے اور وہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ان کے بطریق اعظم کے دو مرکز مصر میں ہیں اور دو لبنان میں۔ زحلہ جس کی آبادی اکتیس ہزار ہے، ان کا خاص مرکز ہے۔ ۱۹۵۲ء کی مردم شماری کے مطابق لبنان یونانی آرتھوڈکس کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار آٹھ سو اٹھاون اور یونانی کیتھولکوں کی تعداد اکاسی ہزار سات سو چونسٹھ تھی +

## اسلامی سمندر میں مسیحی جزیرہ

عربی فتوحات کا سیل اندرون شام اور ساحلی میدان میں پھر نکلا تو رفتہ رفتہ پیروان مسیح حلقہ بگوش اسلام بنتے گئے، البتہ لبنان اسلامی سمندر میں ایک مسیحی جزیرہ رہ گیا۔ مختلف مسیحی خاندان ہمسایہ حلقوں سے نکل کر لبنان کے شمالی حصے میں جمع ہوگئے۔ بعض کی خواہش یہ تھی کہ جزیہ ادا کرکے دوسرے درجے کی شہریت حاصل نہ کریں۔ بعض چاہتے تھے کہ ان پابندیوں سے بچے رہیں، جو اموی خاندان کے متقی خلیفہ عمرؓ بن العزیز (۷۱۷ء۔۷۲۰ء) نے عائد کی تھیں۔ عمرؓ بن عبدالعزیز ہی نے سب سے پہلے ذمیوں کے خلاف امتیازی ضوابط جاری کیے تھے۔ ان کا مفاد یہ تھا کہ مسیحی لوگ سرکاری عہدوں پر مامور نہ ہوں۔ پگڑیاں نہ باندھیں۔ خاص لباس پہنیں، جن میں چمڑے کی ایک پیٹی بھی تھی۔ زین کے بغیر گھوڑے پر چڑھیں۔ عبادت گاہیں نہ بنوائیں۔ عبادت کے وقت آواز دھیمی رکھیں۔ یہ نووارد عموماً مارونی جماعت میں مدغم ہوگئے۔ ممتاز لبنانی خاندانوں میں سے، جن کا آبائی وطن ازروئے روایات حوران تھا، مندرجۂ

ذیل کا ذکر مناسب ہے: خازنی، جو غسّانی ہونے کے دعویدار ہیں۔ یہ دراصل یمنی ہیں۔ ملحمہ یہ بھی یمانی الاصل ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے اجداد دمشق کے راستے العاقورہ آئے۔ عہدا[۱] واب تک یعقوبی مسیحیوں کا گاؤں ہے۔ یہاں سے بعض ممتاز ترین مارونی خاندان آئے مثلاً السمعانی، عوّاد، مسعد، الشدیاق، ثابت، دِلس۔ عددد کے جنوب مشرق میں ایک مقام القریتین ہے۔ تیان اور سرکیس خاندان اپنی اصل یہیں سے بتلائے گا[۲]۔

مشرقی بحیرۂ روم میں مسلمانوں نے تقریباً دس برس میں غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ حقیقت میں عرب قومیت اور اسلامی حکومت کی فتح تھی۔ اسے عام فتوحات کا پہلا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلی جنگ ختم ہو گئی، دوسری جنگیں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ البتہ فتوحات کے دوسرے دور کے لیے راستہ ہموار ہو گیا تھا، یعنی مذہب اسلام کی کامیابی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس کی رفتار بہت دھیمی تھی اور اس کے لیے کوئی منظم منصوبہ بروئے کار نہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں دہاکے نہیں، سینکڑوں سال صرف ہو گئے۔ اموی خلفاء بہ استثنائے عمرؓ ثانی اقتصادی وجوہ کی بنا پر قبولِ اسلام کو پسند نہیں کرتے تھے، خصوصاً ان لوگوں کے قبولِ اسلام کو، جو قابلِ زراعت زمینوں کے مالک تھے۔ معہذا اموی حکومت بہ حیثیتِ عمومی غیر معمولی رواداری پر عمل پیرا تھی۔ اس کی کشادہ دلی اور مسالمت سیاسی دائرے سے گزر کر مذہبی اور ذہنی دائرے تک پہنچ گئی تھی۔ بانیٔ خاندان معاویہؓ نے اپنی روش سے جانشینوں کے لیے ایک نمونہ قائم کر دیا تھا۔ عراق کے علوی اور حجاز کے راسخ العقیدہ لوگ معاویہؓ کے سخت مخالف تھے اور اپنے تحت حکومت کی حفاظت کے لیے مسیحی رعایا پر بھروسا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس نے ایک یعقوبی مسیحی خاتون میسون سے عقد کیا[۳]۔ وہی یزید کی والدہ تھی۔ معاویہؓ کا درباری شاعر الاخطل اور طبیبِ خاص دونوں مسیحی تھے۔ مالیات کے انتظام کے لیے اس نے منصور ابن سرجون کی خدمات سے فائدہ اٹھایا، جو دمشق کے سینٹ جان (یوحنّا) کا دادا تھا۔ عباسیوں کی پالیسی نہ اتنی روشن خیالی کا مظہر تھی، نہ اتنی روادارانہ تھی۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عباسیوں ہی کے زمانے میں مسیحی لوگ زیادہ تر لبنان میں پہنچے[۴]،

---

۱؎ دیکھیے توریت کی کتاب گنتی باب ۳۴، آیت ۸۔ یہ مقام حمص سے پینتیس میل جنوب مشرق میں ہے۔ ۲؎ دیکھیے فیلیپ دی طرازی کی کتاب اصدق ما کان من تاریخ لبنان جلد دوم صفحہ ۲۴-۲۵، صفحہ ۵۱ و مابعد، صفحہ ۶۷۔

۳؎ (مترجم) امیر معاویہؓ کی کئی بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک میسون بھی تھی۔ اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ وہ معاویہؓ سے عقد کے بعد وہ سابقہ مذہب پر قائم رہی۔ ۴؎ (مترجم) ابتدا میں غیر ممکن تھا کہ کسی مسیحی یا یہودی کو ذمہ دارانہ عہدہ دے دیا جاتا، کیونکہ اس سلسلے میں اعتماد پیدا ہونا ضروری تھا۔ جب اعتماد پیدا ہو گیا تو بے تکلفی سے ہر قابل شخص کو عہدے ملنے لگے۔ یہ ہر اسلامی حکومت کی خصوصیت رہی۔

Marfat.com

خصوصاً ہارون الرشید (۷۸۶ء۔ ۸۰۹ء) اور اس کے پوتے المتوکل (۸۴۷ء۔ ۸۶۱ء) کے عہد میں، جس نے امتیازی قوانین از سرِ نو جاری کر دیے تھے بلکہ ان کے دائرے میں بہت توسیع کر دی۔[۵۱] متوکل نے حکم دے دیا کہ یہودی اور مسیحی اپنے گھروں کے سامنے لکڑی کے بت بنا رکھیں۔ قبریں زمین کے برابر کر دیں۔ صرف خچروں اور گدھوں پر سوار ہوں اور آستینوں پر ایک رنگین پٹی باندھیں۔ دسویں صدی کے اختتام تک شام، مصر اور عراق اسلامی سرزمینوں کے خط و خال پیدا کر چکے تھے۔ مصر میں فاطمی خلیفہ الحاکم (۹۹۶ء۔ ۱۰۲۱ء) کے قوانین کی بدولت عملِ اسلامیت تکمیل پر پہنچ گیا۔

فتوحات کے تیسرے اور آخری دور کا تعلق زبان سے ہے۔ اس سلسلے میں رفتار اور بھی سست تھی۔ لسانی جدوجہد کے دائرے میں رعایا نے کم از کم عارضی طور پر مزاحمت کا زیادہ کامیاب طریقہ اختیار کیا۔ عربی کی بول چال کی زبان بننے سے بہت پہلے قرآن مجید نے کامیابی حاصل کی۔ عربی ایک سادہ اور غیر علمی معاشرے کی زبان تھی۔ اسے قدم جمانے سے پیشتر اپنے لیے علمی حیثیت پیدا کرنا لازم تھا۔ یہ تغیر ہارون اور المامون (۸۱۳ء۔ ۸۳۳ء) کے ماتحت بغداد میں یونانی تراجم کے ذریعے سے عمل میں آیا۔ یہ ترجمے سریانی کی وساطت سے کیے گئے تھے۔ خلفاء کی سرپرستی میں معتقدوں اور عالموں نے قرآن مجید کی زبان میں وہ تصانیف مرتب کیں، جو دہقانوں اور مزدوروں کے عربی زبان اختیار کرنے سے صدیوں پہلے رائج ہو چکی تھیں۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں عباسیوں کا دور ختم ہو رہا تھا، جب عربی زبان کی کامیابی اتمام کو پہنچی۔

لبنان نمایاں طور پر اس دائرے سے باہر رہا۔ یہاں کا مذہب مسیحیت رہا اور پورے علاقے کے اسلامیت و عربیت اختیار کر لینے کے بعد بھی لبنان کی زبان صدیوں تک سریانی ہی رہی۔ ابن العبری[۵۲] (وفات ۱۲۸۶ء) موصل کا یعقوبی اسقفِ اعظم تھا۔ وہ سریانی ہی کو لبنان کی زبان قرار دیتا ہے۔

---

۵۱ معصیت یہ ہے کہ جب کبھی غیر مسلموں سے رواداری کا برتاؤ کیا گیا، انھوں نے خود تو شرع کر دیے۔ دشمنوں کا ساتھ دیا، خود غداریاں کیں۔ مختلف اوقات میں مختلف حکمرانوں کو وقتی حالات کے مطابق احکام جاری کرنے پڑے۔ لیکن یہ وقتی تقاضے تھے۔ مسلمانوں کی عام پالیسی رواداری ہی کی تھی اور ایسی رواداری کہ جس کی مثال دوسری حکومتیں پیش نہیں کر سکتیں۔

۵۲ مرتبہ صالحانی صفحہ ۱۸۔

**دروز** شمالی لبنان میں مارونیوں کی آبادکاری سے کچھ مدت بعد مختلف اسلامی اور نسلی گروہ جنوبی لبنان میں داخل ہونے لگے، مثلاً شیعہ، اسمٰعیلی، ایرانی، عربی۔ ان سب کے رل مل جانے سے گیارھویں صدی کے وسط میں دروزی جماعت وجود پذیر ہوئی۔ مارونیوں کی طرح یہ لوگ بھی قدیم ارامی آبادی سے وابستہ ہو گئے۔ بشریات کی چھان بین کے مطابق لبنانیوں ـــــ دروزی اور مارونی ـــــ میں اب تک غالب نمونہ چھوٹے سر والوں کا ہے[1]۔ اس کے برعکس صحرائے شام اور شمالی عرب کے بدویوں کے سر لمبوترے ہیں۔ یوٹنگ نے لبنان میں پیدا ہونے والے مارونیوں اور امریکہ میں پیدا ہونے والے مارونیوں کے سروں کی پیمائش کر کے اس نظریے کو تقویت پہنچائی کہ بچوں کو خاص طریق پر گہوارے میں لٹائے رکھنے سے سر کا پچھلا حصہ چپٹا ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے سر چھوٹا رہتا ہے۔ دروزیوں کے ظہور کے بعد کوہستانِ لبنان کی تاریخ ان پر نیز مارونیوں اور ان کے باہمی تعلقات پر گھومنے لگی۔

الدّروز نام ایک داعی سے ماخوذ ہے، جو ایرانی الاصل تھا۔ محمّد بن اسمٰعیل اس کا نام تھا اور درزی کا پیشہ اس نے اختیار کر رکھا تھا۔ قاہرہ پہنچ کر وہ چھٹے فاطمی خلیفہ الحاکم کا معتمد علیہ بن گیا۔ دروزی اسے ماننے میں متامّل ہیں۔ کیونکہ آگے چل کر وہ اپنی آزاد مشرب تعلیمات کے باعث احترام زائل کر بیٹھا تھا۔ دروزیوں کے نزدیک محبوب ترین نام الموحّدین ہے یعنی ایک خدا پر ایمان رکھنے والے۔ الدّرزی پہلا شخص تھا، جس نے خلیفہ الحاکم کے لیے عبادت گزارانہ احترام کی دعوت جاری کی۔ غالی شیعیوں کے نزدیک پہلے سے یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ خدا انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ اور ان کے اخلاف کے خاص حامی تھے۔ دراصل یہ محدود و مقید انسان اور قادر مطلق کے درمیانی اختلاف کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی تاکہ دونوں کے درمیان براہِ راست ربط ضبط پیدا ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ خدا کے واحد نے نو یا دس مرتبہ انسانیت کا روپ دھارا۔ آخری مرتبہ وہ الحاکم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دروزیوں کا یہ بنیادی عقیدہ اسمٰعیلی تعلیمات کے سلسلے کی ایک کڑی تھا، جو امام اسمٰعیل (وفات ۷۶۰ء) کے

---

[1] کارلٹن سیلز کی انگریزی کتاب "شامیوں اور ارامیوں کے نسلی خصائص" صفحہ ۱ بعد؛ نیز "مشرقِ قریب کے نسلی پہلو" صفحہ ۲۰-۲۱ و صفحہ ۳۷-۵۰، نجلہ عزّالدّین اور نیفکلن کا مضمون امریکی جرنل میں، جلد ۲۲ (۱۹۳۷ء) صفحہ ۳۵۰ بعد، نیز کیپرس اور یوٹنگ کی کتابیں۔

Marfat.com

پیرو تھے۔ امام اسمٰعیل کو حضرت علیؓ کا ساتواں جانشین مانا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان کا نام سبعیہ یعنی ہفت امامی پڑ گیا۔[1]

مورخین نے الحاکم کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے ـــــ یاد رہنا چاہیے کہ ان میں سے اکثر کو الحاکم کے مقاصد سے کوئی ہمدردی نہ تھی ـــــ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پُراسرار اور ناقابلِ تصور شخص تھا۔ بہ ایں ہمہ اسے مجلسی امور سے دلبستگی تھی۔ ایک طرف بتایا جاتا ہے کہ وہ علوم کا سرپرست تھا۔ اس نے تراجم و تحقیق کے لیے ایک دارالحکومت قائم کیا تھا۔ مسجدیں تعمیر کیں۔ ان کے لیے اوقاف کا انتظام کیا۔ علماء اور غرباء کے لیے خاص مرکز تعمیر کرائے۔ ساتھ ہی کہا جاتا ہے کہ اس نے یروشلم میں کنیسۃ القیامہ (مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کے جی اُٹھنے کا مقام) کو منہدم کرا دیا (۱۰۰۹ء)۔ تمام گویّوں اور تفریحات کا سامان مہیّا کرنے والوں کو باہر نکال دیا۔ ملوخیہ کھانے کی ممانعت کر دی۔ عورتوں کو حکم دے دیا کہ نہ وہ آرائش کا کوئی سامان کریں اور نہ حماموں میں جائیں۔ یہودیوں اور مسیحیوں کے لیے سخت قوانین جاری کر دیے۔ مثلاً سیاہ لباس پہنیں۔ سیاہ پگڑیاں باندھیں۔ گھوڑوں پر نہیں، صرف گدھوں پر سوار ہوں اور انھیں کوئی سرکاری عہدہ نہ دیا جائے۔[2] اس خلیفہ کا دورِ حکومت اس وقت شروع ہوا تھا، جب اس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ ۱۳ فروری ۱۰۲۱ء کو وہ ایک سازش کا شکار ہوا، جو اس کی بہن ستّ الملوک نے تیار کی تھی، کیونکہ خلیفہ کے دل میں بہن کی عصمت کے متعلق شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے پیرو کہتے ہیں کہ خلیفہ مرا نہیں بلکہ عارضی طور پر غیبت میں چلا گیا۔ جب مناسب وقت آئے گا وہ پوری شان سے ظاہر ہو جائے گا۔[3]

مصر میں اس عقیدے کے لیے پیرو نہ مل سکے۔ الدّرزی نے حاکم کے خدا ہونے کا اعلان کیا تو عام لوگ اس درجہ جوش میں آ گئے کہ داعی بہ عد مشکل جان بچا کر بھاگا۔ وہ کوہ حرمون (جبل الشیخ) کے دامن میں وادی تیم کے اندر پہنچا تو اس کی دعوت مقبول ہوئی۔ تقریباً دو سال کی محنت و مشقّت کے بعد وہ ایک لڑائی میں مارا گیا۔[4] (۱۰۱۹ء)۔ ایک ایرانی الاصل داعی

---

[1] دیکھیے حتّی کی تاریخ عرب صفحہ ۴۴۲ - ۴۴۳، نیز صدوزی اور ان کا مذہب (انگریزی) صفحہ ۲۷ - ۲۸۔

[2] یحییٰ ابن سعید ابن البطریق میں، جلد دوم صفحہ ۱۹۵ بعد، ابن العبری صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳، ابن خلکان وفیات الاعیان جلد سوم صفحہ ۴، ۷، ابن القلانیسی ذیل تاریخ دمشق صفحہ ۶۴، ۶۹، صفحہ ۵۵، ۵۶۔

[3] ابن تغری بردی النجوم الزاہرہ فی ملوک المصر والقاہرہ جلد دوم صفحہ ۷۰ بعد، حتّی تاریخ دروز صفحہ ۳۱۔

[4] یحییٰ ابن سعید البطریق میں جلد دوم صفحہ ۲۲۳ - بتایا گیا ہے کہ اسے ترک غلاموں نے قتل کر دیا تھا۔

Marfat.com

حمزہ اللّٰہ باد (سمور فروش) الزوزنی[1] نے الدرزی کی دعوت کی مذمت کی۔ حمزہ ہی دراصل اس تحریک کا دل و دماغ تھا۔ اس نے دروزیت کے بنیادی عقائد تیار کیے۔ اس کے الٰہیات میں باطنیت کا رنگ غالب تھا۔ یعنی وہ تمام صحائف کے ظاہری الفاظ سے خاص باطنی معنی نکالتا تھا۔ بنیادی باطنی تصور کے مطابق حقیقت خفیہ معانی کے انکشاف سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ ظاہری الفاظ محض ایک پردہ ہیں، جو حقیقت کو ناشناساؤں کی آنکھوں سے چھپانے کے لیے تان دیا گیا ہے۔ حمزہ حاکم وفات سے کچھ مدت پیشتر قاہرہ میں جوشِ غیظ سے بھرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

نئے مذہب کی اشاعت کے لیے حمزہ کے ایک شاگرد نے اس کی مسند سنبھال لی۔ یہ شخص اصل کے اعتبار سے شاید سریانی مسیحی تھا اور اس کا نام المقتنی بہاءالدین تھا (وفات ۱۰۴۲ء کے بعد) کچھ مدت تک بہاءالدین روپوش رہا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے یہ وقت مصر میں گزارا یا شام میں۔ اس نے تمام پیرووں یا متوقع پیرووں کے نام خطوط بھیجے، جن کا دائرہ بیزنطین سے ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ دروزی اب بھی ان خطوں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان خطوں میں سے ایک کا نام القسطنطینیہ تھا، جو شہنشاہ کالسٹنطائن ثامن (۱۰۲۵ء۔ ۱۰۲۸ء) کے نام بھیجا گیا تھا۔ ایک کا نام المسیحیہ تھا۔ اس میں مسیحیوں سے خطاب تھا۔ دروزیوں کی چار مقدس کتابیں اس سے منسوب ہیں اور دینی مصنفوں میں وہ سب سے بڑا مانا جاتا ہے۔ اس کے آخری شارحین میں عبداللہ التنوخی[2] تھا (وفات ۱۴۸۰ء)۔ یہ السید کہلاتا ہے اور اس کی قبر عابیہ (لبنان) میں ہے۔ وہاں ہر سال ہزاروں دروزی تحفے اور نذریں لے کر جاتے ہیں۔ تنوخ ایک مسیحی عربی قبیلہ تھا۔

بہاءالدین نے زندگی کے آخری دور میں نئی پالیسی جاری کی۔ اس نے کہا کہ الحاکم کی غیبت میں اس کے مذہب کی کوئی چیز نہ ظاہر کی جائے اور نہ اس پر عمل ہو۔ یہ پالیسی بلاشبہ حفاظت کا نتیجہ تھی اور جو چھوٹا سا جدا گانہ طبقہ سنیوں، شیعوں اور نصیریوں جیسی حریف جماعتوں میں رہتا تھا۔ اس لیے حفاظت کا کوئی اور ذریعہ بھی نہ تھا۔ بہاءالدین کا عقیدہ یہ تھا کہ نئے مذہب کے پیرووں کے لیے جو اعلی العانات ہیں، دنیا ان کی اہل ثابت نہیں ہوئی، لہٰذا دروازہ بند کر دیا گیا اور کسی کو داخل ہونے یا باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ مقدس کتابیں مخطوطوں کی شکل میں موجود تھیں۔ عام دروزیوں کو بھی انھیں پڑھنے کی اجازت نہ تھی، صرف چند عقال (دانشمند، ذی عقل) ان کتابوں کو دیکھ سکتے تھے۔

---

[1] ابن حجر العسقلانی رفع الاصر عن قضاۃ مصر، جو کندی کی کتاب الولاۃ و کتاب القضاۃ کا تتمہ ہے صفحہ ۶۱۲۔
[2] اس کے خطبات و داعیہ کے اقتباسات کے لیے دیکھیے حتی کی تاریخ دروز صفحہ ۱۷-۴۷۔

روشنی عقال میں سے بھی صرف ان بلند مرتبہ لوگوں کو مل سکتی تھی، جو از روئے کردار قابلِ اعتماد تھے اور معلومات کے انتہائی اخفا کے اہل تھے۔ جو شخص اس دائرے میں داخل ہونا چاہتے اس سے کڑے امتحان لیے جاتے ہیں اور مدت تک امیدواری کرنی پڑتی ہے۔ پھر مذہب میں داخلے کی رسم ادا ہوتی ہے۔ اس کے بعد لازم ہے کہ وہ شخص سخت اخلاقی ضوابط کا پابند ہو جائے۔ اس کی ہر حرکت میں عزّ و وقار نمایاں ہو۔ ہر قسم کے ناجائز فوائد سے احتراز کرے۔ اپنی زبان گالی سے آلودہ نہ ہونے دے۔ شراب اور تمباکو نہ پیئے۔ ان میں اعلیٰ درجے کے متقی آدمیوں کو اجاوید کہا جاتا ہے۔ وہ کسی سرکاری افسر کے ہاں بھی کھانے پینے میں شریک نہیں ہوتے۔ اس خیال سے کہ مبادا اس کا مال ناجائز ذرائع (حرام) سے حاصل ہُوا ہو۔ جو عورتیں استحقاق پیدا کر لیتی ہیں، انھیں مذہبی مجالس میں شامل کیا جاتا ہے۔ دروزی ایک ہی بیوی رکھتے ہیں۔ مذہبی مجالس جمعرات کی شام کو الگ تھلگ عمارتوں (خلوت) میں غیر نمایاں طریق پر منعقد کی جاتی ہیں۔ اس غرض سے عموماً پہاڑوں کی بلند چوٹیاں چُنی جاتی ہیں، جو دیہات سے قریب ہوں۔ خلوت گاہوں میں سے قدیم ترین اور محترم ترین البیاعنہ ہے، جو حاصبیّہ کے قریب ہے۔ جنوب مشرق میں شیعہ تھے۔ یہاں جتنے مخطوطات تھے، وہ ۱۸۳۸ء میں مصری فوج کے ہاتھ لگے، جو ابراہیم پاشا کی ماتحتی میں پہنچی تھی۔ ان مخطوطات سے پہلی مرتبہ علمی دنیا کو دروزی تعلیمات کی جھلک نظر آئی۔ دروزیوں کے متعلق چھان بین کا کام سب سے پہلے ایک فرانسیسی دی ساسی نے انجام دیا، جو اصل ماخذ پر مبنی تھا[1]۔ یورپی ادبیات میں دروزیوں کا ذکر سب سے پہلے ایک ہسپانوی یہودی نے کیا ہے، جس کا نام بنیمین تھا اور وہ تطیلہ کا رہنے والا تھا (تقریباً ۱۱۶۹ء)[2]۔

## دروزیت کی اشاعت

دروزیت کا گہوارہ لبنان کا جنوبی گوشہ تھا۔ وہاں سے براہ جبال شمالی جانب بڑھی۔ ساحلی علاقے اور اندرونی میدان کو بالکل چھوڑ دیا گیا۔ یہاں اس مذہب کے پیروؤں نے وہ قومی خصائص پیدا کر لیے، جن کی نمائش برابر ہوتی رہی۔ یعنی انتہائی جماعتی وفا شعاری، اتحاد و یک جہتی کا اعلیٰ احساس، خود مختاری کا زبردست جذبہ اور مشکلات و مصائب میں ثبات و استقامت۔ وہ جیسے جیسے ترقی کرتے رہے، مختلف عرب یا عربی قبیلے ان میں شامل ہوتے رہے، مثلاً تنوخ، معن، ارسلان، جمبلاط۔ انھیں قبیلوں سے مقامی

---

[1] سلوستری دی ساسی (Silvestre-de-Sacy) کی فرانسیسی کتاب دو جلد۔

[2] Benjamin of Fudela۔

سردار اور جاگیردار پیدا ہوتے گئے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں دروزی ضلع شوف کے مختار بن گئے تھے جو بیروت کے جنوب مشرق میں ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد مارونیوں نے صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ ضلع کسروان میں مملوکوں کے ماتحت مسلمانوں سے لٹ جانے والے گروہوں کی تعداد گھٹ گئی تھی۔ مارونیوں نے یہ دیکھ کر جنوبی جانب پیشقدمی شروع کر دی۔ سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک وہ دروزی علاقے میں دور دور تک پہنچ گئے تھے۔ ایک دوسرے کے بالمقابل آجانے سے انیسویں صدی میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ دروزیوں کی طاقت فخرالدین ثانی المعنی کے عہد میں نصف النہار پر پہنچ گئی۔ یہ شخص ۱۵۹۰ء سے ۱۶۳۵ء تک لبنان کا امیر رہا۔ شام میں انطاکیہ اور فلسطین میں عسقلان بھی اس کے زیر اقتدار تھے۔ اسی زمانے میں دروزیوں نے کوہ کارمل (جبل مار الیاس) اور علاقہ جلیل میں نوآبادیاں قائم کیں، جہاں ۱۹۴۷ء میں ان کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔ شوف سے نکل کر دروزی حوران (شام) پہنچے کیونکہ اٹھارھویں صدی میں ان کے درمیان داخلی جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ یہ جھگڑے ابتدائی عہد کے دو عرب فریقوں کی باہمی کش مکش کے باقیات تھے۔ ایک فریق قیسی، جو شمالی عرب سے نکل کر شام میں پہنچا تھا اور دوسرا یمنی، جو جنوبی عرب سے آیا تھا۔ انیسویں صدی میں حوران کی طرف جانے کا سلسلہ بڑھ گیا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے، جو لبنان کے حالات پر غیر مطمئن تھے اور وہ لوگ بھی شامل تھے، جو ۱۸۶۰ء کے ہنگامہ قتل کے باعث پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ حوران کے جس پہاڑی علاقے میں یہ لوگ مقیم ہوئے، اس کا نام جبل الدروز پڑ گیا، وہاں ان کی آبادی نواسی ہزار ہے اور لبنان میں پچاسی ہزار، جہاں ان کی آبادی زیادہ تر شوف اور المتن میں ہے۔ لبنان و شام دونوں کے قومی معاملات میں ان کا اثر تعداد سے بہت زیادہ ہے۔

## نُصیری

نُصیری وہ لوگ ہیں جن سے جنوبی لبنان میں دروزیوں کو پہلے پہل سابقہ پڑا۔ آج کل یہ لوگ شام کے اس پہاڑی خطے میں رہتے ہیں، جو لبنان کے شمال میں واقع ہے۔ دروزیوں کی طرح وہ اسمٰعیلیوں کی ایک شاخ ہیں۔ ان کا نام غالباً گیارھویں علوی امام الحسن العسکری (وفات ۸۷۴ء) کے ایک حامی سے ماخوذ ہے، جس کا نام محمد ابن نُصیر تھا۔ یہ نویں صدی کے اواخر میں بمقام کوفہ رہتا تھا۔ نُصیریوں کا نمایاں ذکر پہلے پہل حمزہ اور دوسرے دروز مناظرین کی تحریرات میں ملتا ہے۔ یہ اپنے عقائد چھپاتے ہیں۔ ان کی تنظیم کی حیثیت مذہبی ہے۔ عقائد کے اعتبار سے وہ باطنی ہیں۔ یہ مذہب اب تک ایک معمّا سمجھا جاتا ہے[1]۔

---

[1] دیکھیے حتّی کی تاریخ شام صفحہ ۵۸۶ - ۵۸۷ ۔

Marfat.com

**متاولہ** یہ شام و لبنان کے شیعوں کا خاص نام ہے، اس کا واحد متوالی ہے، جس کے معنی ہیں پیرو، مراد ہے حضرت علیؓ کا پیرو۔ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے تھے۔ ایک سنّی، دوسرا شیعہ۔ ان میں اختلاف خلافت جیسے اہم مسئلے پر ہوا۔ خلافت سے مقصود رسول اللہ صلعم کی جانشینی ہے، جس سے منصبِ نبوّت خارج ہے۔ کیونکہ خاتم ہونے کی حیثیت میں کوئی ان کا جانشین نہیں بن سکتا تھا۔ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ علیؓ، جو رسول اللہ صلعم کے داماد تھے اور ان کے اخلاف صحیح خلیفہ تھے، جن کے لیے انھوں نے ائمہ کی اصطلاح وضع کر لی ہے۔ دوسرے خلیفہ ان کے نزدیک ٹھیک نہ تھے۔ سنّیوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ خلیفہ ملّتِ اسلامیہ کے سیکولر امور و معاملات کا رئیس ہوتا ہے۔ شیعوں کے نزدیک امام روحانی اور مذہبی رہنما بھی ہوتا ہے اور اسے اختیارات عوام کی رائے اور اتفاق کی بنا پر نہیں بلکہ اصل منصب کی بنا پر خدا کی طرف سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے اخلاف ایک خاص حیثیت کے مالک بن گئے جو نسلاً بعد نسلٍ انھیں حاصل رہی۔ غالی شیعہ اور بھی آگے نکل گئے۔ اختلافِ عقائد کے سلسلے میں سیاسی مفاعد اور اقتصادی مصالح نے خاصی اُلجھنیں پیدا کر دیں، جیسا کہ قرامطہ کے معاملے سے ظاہر ہے۔ وہ اسمٰعیلیوں کے چچیرے بھائی تھے۔

سولھویں صدی کے آغاز میں ایران شیعیّت کا مرکز بن گیا اور اس کی مختلف شاخیں بھی، جن میں اسمٰعیلی، دروزی اور نُصیری شامل ہیں۔ اب تک اقلیتوں کی حیثیت میں وہاں رہتی ہیں۔ لبنان میں ان کی کثرت جبلِ عامل میں ہے، جو صیدا کے مشرق میں واقع ہے، نیز بقاع میں خصوصاً بعلبک کے آس پاس۔ ان کی کل تعداد دو لاکھ بیس ہزار ہے۔

# انیسواں باب

## عبّاسی خلافت اور جانشین سلطنتیں

### امویوں کی جگہ عبّاسی

اموی خلافت ۷۵۰ء میں تباہ ہوئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ داخلی حیثیت سے یہ کمزور ہو چکی تھی اور آخری خلیفہ نااہل تھے۔ نیز ان کا کردار اچھا نہ تھا۔ بیرونی سبب یہ ہوا کہ علویوں، عبّاسیوں، عراقیوں، ایرانیوں اور دوسرے غیر مطمئن گروہوں نے اس کے خلاف اتحاد کر لیا۔ عوامل انتشار بے روک ٹوک کارفرما رہے۔ عبّاسی رسول اللہ صلعم کے چچا عباسؓ کی اولاد تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں بنی امیہ پر ان کا حق فائق ہے۔ حضرت علیؓ کے حامیوں کے نزدیک خلفائے دمشق خلافت کے غاصب تھے، جنھوں نے اہل بیت کے خلاف ناقابلِ عفو اور ناقابلِ فراموش جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان مخالفوں کا زور عراق میں سب سے زیادہ تھا۔ جہاں حضرت علیؓ نے کوفہ کو وقتی طور پر مرکزِ حکومت بنایا۔ مزید براں عراقیوں کو شامی ہمسایوں کے خلاف یہ شکایت بھی تھی کہ عراق مرکزِ خلافت سے محروم ہو گیا۔ غیر عرب مسلمانوں کو عموماً اور ایرانیوں کو خصوصاً ــــ جو مدت سے آزادی اور قومی زندگی کی روایات کے حامل چلے آتے تھے ــــ اس بات پر غصہ تھا کہ عرب مسلمانوں نے خلافتِ دمشق کی سرکردگی میں ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر ایسے علما اور نقّاد بھی تھے، جنھیں یہ یاد تھا کہ بنی امیہ بہت بعد ایمان لائے۔ امیر معاویہؓ اور ان کے جانشینوں کی حکومت سیکولر وضع کی تھی۔ ان مخالف عناصر کو ایک اچھے قائد کی تلاش تھی۔ ابوالعباس عبداللہ نے قیادت کی ضرورت پوری کر دی۔ یہ صاحب رسول اللہ صلعم کے عمِ مکرّم کے پڑپوتے تھے۔

### جنگ زاب

جنوری ۷۵۰ء میں دونوں فریقوں کی فوجوں کا مقابلہ بالائی زاب ــــ دجلہ کا ایک معاون ــــ کے بائیں کنارے ہوا۔ مروان ثانی (۷۴۴ء تا ۷۵۰ء) شامی فوج کا سالار تھا۔ ابوالعباس کا چچا عبداللہ بن علی متحدہ فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔

Marfat.com

نو دن جنگ جاری رہی۔ شامیوں نے شکست فاش کھائی۔ دمشق معمولی مقابلے کے بعد فتح ہو گیا (۲۶ اپریل ۷۵۰ء)۔ پھر شامی شہر یکے بعد دیگرے پُرامن طریق پر عبداللہ اور اُس کی عراقی و ایرانی فوجوں کے حوالے ہوتے گئے۔ لبنانی شہروں نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ کامگار فوج جنوبی جانب پیشقدمی کرتی ہوئی فلسطین پہنچ گئی۔ بھاگتے ہوئے خلیفہ کا تعاقب کیا گیا۔ بالائی مصر میں عباسیوں نے اسے جا لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس کا سر مع نشانہائے خلافت ـــ رسول اللہ صلعم کے تبرکات ـــ ابوالعباس کے پاس بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی فیصلہ ہوا کہ اُمیہ خاندان کا نشان اور اس کی یاد صفحۂ ہستی سے محو کر دی جائے۔ چنانچہ عبداللہ کے حکم سے خلفاء کی نعشیں اکھاڑی گئیں۔ پھر یافہ میں ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام ہوا، جس میں خاندان اُمیہ کے اسّی امیر مدعو کیے گئے۔ وہ دعوت میں شرکت کے لیے آئے اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا[1]۔ بنی امیہ کے زوال کے ساتھ ہی دنیائے اسلام میں شام کی سیادت ختم ہو گئی اور اس کی شان و شوکت افسانۂ ماضی بن گئی۔ اب اسلامی معاملات کا مرکز ثقل مشرقی جانب عراق میں منتقل ہو گیا۔ نئی خلافت کا رُخ ایران کی طرف تھا۔ اسے اپنی تدبیروں اور منصوبوں کے نفاذ کی غرض سے پیشروؤں کے مقابلے میں فوج پر زیادہ تر بھروسا کرنا پڑا۔

بانیِ خاندانِ عباسیہ ابوالعباس (۷۵۰ء۔۷۵۴ء) نے السفّاح (خونریز) لقب اختیار کیا۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بھائی ابوجعفر المنصور جانشین بنا۔ اس نے ۷۶۲ء میں نئے دارالحکومت بغداد کی بنیاد رکھی۔ عباسی خاندان کے پینتیس خلفاء اسی کی اولاد تھے۔ یہ خلافت سب سے زیادہ طویل مدّت تک قائم رہی اور اس نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ اس کی قوّت و طاقت اور عظمت و شوکت پانچویں خلیفہ ہارون الرشید (۷۸۶ء۔۸۰۹ء) اور اس کے فرزند المامون (۸۱۳ء۔۸۳۳ء) کے عہد میں نصف النہار پر پہنچی۔ ہارون الرشید کا نام الف لیلہ ولیلہ میں بقائے دوام کا لباس پہن چکا ہے اور المامون یونانی فلسفہ، طب، ہیئت اور ریاضیات کی کلاسیکی تصانیف کو عربی میں منتقل کرانے کا ذمہ دار اور سرپرست تھا[2]۔ یہ خلافت ہلاکو تاتاری نے ۱۲۵۸ء میں برباد کی۔

**لبنان میں بغاوت** | عباسی خلفاء اہل شام کی اطاعت و فرمانبرداری حاصل نہ کر سکے۔

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے حتّی کی تاریخ شام صفحہ ۵۲۷-۵۳۳۔

[2] شجرہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں!

Marfat.com

سالہا سال تک اس پورے علاقے میں بہ شمول فلسطین شدید پروپیگنڈے کے نہیں تو کم از کم بے چینی کی آگ سلگتی رہی۔ صحیح صورتِ حال کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ المنصور نے ایک شامی سے کہا: تمھاری بڑی خوش نصیبی ہے کہ میرے عہدِ حکومت میں طاعون سے محفوظ رہے۔ اس نے بے تامل جواب دیا: خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمیں بیک وقت تمھاری حکومت اور طاعون کی مصیبتوں میں مبتلا کرے گا۔[1] اس جواب کے لیے شامی کو جان دینی پڑی۔ جس حد تک مسیحیوں کا تعلق ہے، ان کے حالات اس وجہ سے تشویشناک ہو گئے کہ جبری تحصیلات اور ناواجب محاصل کا انھیں ہدف بننا پڑا۔

لبنان کو ۷۵۹ء۔ ۷۶۰ء) میں پہلی مرتبہ بغاوت کا تجربہ ہوا۔ جس کا آغاز ایک بلند پہاڑی موضع المنیطرہ (نزد افقہ) سے ہوا۔ عباسی محصلوں کی جبری وصولیوں سے پریشان ہو کر مسیحیوں نے بغاوت کی، البقاع کے متعدد دیہات پر قبضہ کر لیا اور بعلبک پر پیش قدمی شروع کر دی جو محصل کا مرکز تھا۔ ایک نوجوان کوہستانی اس بغاوت کا قائد تھا۔ وہ خاصے تن و توش کا آدمی تھا اور اپنے آپ کو بادشاہ کہتا تھا۔ یہ لوگ بعلبک پر بڑھ رہے تھے۔ اچانک عباسی رسالے نے

---

(شجرہ متعلقہ صفحہ گزشتہ)

عباس (عم رسول اللہ صلعم)

۱۔ السفاح ۷۵۰ء۔ ۷۵۴ء

۲۔ المنصور ۷۵۴ء۔ ۷۷۵ء

۳۔ المہدی ۷۷۵ء۔ ۷۸۵ء

۴۔ الہادی ۷۸۵ء۔ ۷۸۶ء

۵۔ ہارون الرشید ۷۸۶ء۔ ۸۰۹ء

۶۔ الامین ۸۰۹ء۔ ۸۱۳ء

۷۔ المامون ۸۱۳ء۔ ۸۳۳ء

۸۔ المعتصم ۸۳۳ء۔ ۸۴۲ء

۹۔ الواثق ۸۴۲ء۔ ۸۴۷ء

۱۰۔ المتوکل ۸۴۷ء۔ ۸۶۱ء

[1] ابن عساکر: التاریخ الکبیر جلد سوم صفحہ ۳۹۲۔

Marfat.com

ان پر حملہ کر دیا اور انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ عباسی گورنر صالح بن علی (برادر عبداللہ سپہ سالار افواج عباسیہ) نے باغیوں کو سزا دینے کے لیے ان کے دیہات پر حملہ کر دیا اور انھیں پورے علاقے میں بکھر کر آباد ہونے کی اجازت دی، لیکن ان کے مذہب سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اسلام کے نہایت شریف النفس فقیہ امام اوزاعی نے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے فرمایا:

"کوہستان لبنان کے جو ذمّی بغاوت میں شریک نہ تھے، ان کا اخراج یقیناً آپ کے علم میں آیا ہوگا۔ بغاوت کے ذمہ داروں کو آپ نے قتل کرا دیا یا گھروں میں واپس بھیج دیا۔ سوال یہ ہے کہ چند آدمیوں کے جرم کی بنا پر اکثر کو کیوں کر سزا دی جا سکتی ہے؟ اور انھیں گھروں اور زمینوں سے کیوں کر نکالا جا سکتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا[1] یقیناً اللہ تعالیٰ کے فرمان سے بڑھ کر کوئی فرمان ہمارے قبول اور مستقل اتباع کا حق دار نہیں ہو سکتا اور رسول اللہ صلعم کے ارشاد سے بڑھ کر کوئی ارشاد توجہ اور عمل کا مستحق نہیں۔ حضورؐ کا ارشاد یہ ہے: جو شخص معاہدے کے ذریعے سے ہمارے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے، اس پر جو بھی سختی کرے گا یا اس کی استطاعت سے بڑھ کر رقم مانگے گا تو میں دلائل سے اسے قائل کر دوں گا[2]۔"

## امام اوزاعی

عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی بعلبک میں پیدا ہوئے (۸۸ھ)۔ ان کا تعلق جنوبی عرب کے قبائل سے تھا[3]۔ لڑکپن ہی میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ بیروت منتقل ہو گئے۔ جہاں علم فقہ، دل و دماغ اور زہد و تقویٰ میں ان کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی۔ لوگ انھیں امام اہل شام کہتے تھے اور ان کا اثر و اقتدار خلیفہ سے بھی بڑھا ہوا تھا[4]۔ المنصور بیروت سے گزرا تو اس نے امام اوزاعی کو خطبہ دیتے ہوئے سُنا اور ان کی بےحد تعریف کی۔ بعدازاں ان سے مشورے بھی لیتا رہا۔ جب امام موصوف نے سُنا کہ بزنطینیوں کے پاس جو مسلمان قید تھے، ان کے فدیے کی رقم ادا کرنے میں خلیفہ متامل ہے تو ایک ... درخواست

---

[1] وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا) سورہ انعام آیت ۱۶۴+
[2] بلاذری صفحہ ۱۶۲، انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۵۱+ [3] یاقوت، معجم البلدان جلد اول صفحہ ۴۰۳-۴۰۴ طبری جلد سوم صفحہ ۲۵۱۴، زین الدین خطیب محاسن المساعی فی مناقب امام الاوزاعی صفحہ ۴۷-۴۸+
[4] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۹۲، ابوالفدا تاریخ جلد دوم صفحہ ۷، صالح بن یحییٰ صفحہ ۱۵+

Marfat.com

ان کے لیے بھیج دی۔ خلیفہ نے فی الفور اس کے مطابق عمل کیا[1]۔ امام اوزاعی کے دل میں علم کے لیے جو قدر و منزلت تھی، وہ اس بیان سے واضح ہو سکتی ہے، جو اُن کے پوتے کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچا۔ امام نے فرمایا کہ علم کی کسی شاخ میں کمال حاصل کرنا صائم الدہر اور قائم اللیل رہنے سے بدرجہا بہتر ہے[2]۔

امام اوزاعی لبنان کی روحِ آفاقیت کے عمدہ ترین اور بہترین پیکر تھے۔ غیر مسلم رعایا سے ربط و تعلق میں وہ انصاف اور انسانیت کے اصول پر زور دیتے تھے۔ اپنے عہد اور اپنے وطن کے لیے وہ عزت و احترام کا باعث تھے۔ انسانی اخوت کے تقاضوں کا ایسا احساس کسی دوسرے مسلم فقیہ سے ظاہر نہ ہوا۔ امام ابو حنیفہؒ ان کے عراقی معاصر تھے (وفات ۷۶۷ء)۔ وہ سب سے بڑھ کر روادار دبستانِ فقہ کے بانی تھے۔ انھوں نے مشرکوں سے جنگ کے وقت کھجور اور دوسرے درختوں کا کاٹنا جائز قرار دیا تھا، لیکن امام اوزاعی اس کے لیے تیار نہ ہوئے[3]۔ امام ابو حنیفہؒ مرتد کا ذبیحہ کھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اگرچہ وہ ذمی ہوتا۔ امام اوزاعیؒ جواز کے قائل تھے۔ امام ابو حنیفہؒ دار الحرب میں ایک مسلمان کی مملوکہ زمین کو بھی مالِ غنیمت میں شامل سمجھتے تھے۔ امام اوزاعیؒ کی رائے یہ نہ تھی، خصوصاً اُن لوگوں کے تعلق میں جو مرتد ہو کر مسیحی یا یہودی بنے۔ امام اوزاعیؒ فرماتے تھے کہ جو ذمی اسلامی فوج میں شامل ہو کر شریکِ جہاد ہو، اسے مسلمان مجاہد کے برابر حصّہ ملنا چاہیے[4]۔ امام موصوف یرغمال کی جان لینے کے بھی قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک بدعہدی کا بدلہ بدعہدی سے دینے کے بجائے کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کا مسلک اختیار کرنا مستحقِ ترجیح ہے[5]۔ امام اوزاعیؒ کا فقہی نظام شام و لبنان کے علاوہ شمالی افریقہ اور اندلس میں بھی جاری ہو گیا تھا۔ شام و لبنان میں دو سو سال بعد اس فقہی نظام کی جگہ حنفیت اور شافعیت نے لے لی[6]۔ شمالی افریقہ اور اندلس میں چالیس سال بعد اوزاعی فقہ کی جگہ مالکی فقہ نافذ ہو گئی۔ امام موصوف کے نظام کے کشادہ دلانہ اور روادارانہ پہلوؤں کے باعث مسیحی ہسپانیہ میں اشاعتِ اسلام کو تقویت پہنچی۔ ۷۷۴ء کے موسمِ سرما میں ایک روز

---

[1] زین الدین الخطیب صفحہ ۱۱۴-۱۱۵، صفحہ ۱۲۰-۱۲۳ ۔ [2] ابن عساکر جلد ہفتم صفحہ ۳۹۸ ۔
[3] الطبری اختلاف الفقہا صفحہ ۱۰۳ ببعد ۔ [4] ابو یوسف الرد علی سیر الاوزاعی صفحہ ۸۵، صفحہ ۱۱۵-۱۱۶ صفحہ ۱۲۶-۱۲۷، نیز الشافی کتاب الام جلد ہفتم صفحہ ۳۲۴ صفحہ ۳۳۱، صفحہ ۱۲۶-۱۲۷ ۔
[5] بلاذری صفحہ ۱۵۹، انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۴۵ ۔ [6] دیکھیے حتی کی تاریخ عرب صفحہ ۳۹۷-۴۰۰ ۔

Marfat.com

امام اوزاعی حمّام میں گئے۔ جہاں اُن کی اہلیہ دہکتے ہوئے انگاروں کی انگیٹھی رکھ آئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھولا تو امام موصوف فرش پہ گرے ہوئے تھے اور روح بدن سے مفارقت کر چکی تھی۔ بظاہر گیس سے دم گھٹ کر انتقال ہوا، لیکن ان کا رُخ کعبہ معظّمہ کی طرف تھا[1]۔ اُس وقت ان کے پاس کل سات دینار تھے۔ بیروت کے باہر ساحلی ریت کے ٹیلوں پہ انھیں دفن کیا گیا۔ ان کا مقبرہ اس وقت تک باقی ہے۔ حالانکہ بہت سے ممتاز مسلمان اور صحابہؓ بھی عام روایت کے مطابق دفن ہوئے اور ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ان کے مقبرے کا مینار شہر کے وسیع اور پُر رونق ہوائی اڈّے کے پاس ہے +

## قسطا ابن لوقا

بعلبک کے ایک اور عالم نے جو مذہباً مسیحی تھا، اپنے عہد اور وطن کے لیے شان و شکوہ کا سر سامان مہیا کیا۔ یہ قسطا ابن لوقا تھا (وفات تقریباً ۹۱۲ء) قسطا یونانی، سریانی اور عربی تینوں زبانیں جانتا تھا۔ وہ مخطوطات کی تلاش میں بیزنطینی سرزمینوں تک بھی پہنچا۔ پھر بغداد میں مقیم ہو گیا، جو اس زمانے میں تراجم اور ذہنی بیداری کا بہت بڑا مرکز تھا۔ قسطا طبیب بھی تھا، فلسفی بھی۔ ہیئت دان بھی تھا اور ریاضی دان بھی۔ اس نے مترجم کی حیثیت میں امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ یہ تراجم زیادہ تر فلسفے اور ریاضی کی کتابوں کے تھے۔ کم از کم سترہ ترجمے اس سے منسوب ہیں۔ اُنہتر مستقل کتابیں اس نے لکھیں[3]۔ جن میں سے اقلیدس کی شرح اور اصطرلاب مدوّر پر رسالہ بہ طور خاص قابل ذکر ہیں[4]۔ اصطرلاب والا رسالہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قسطا نے ۹۱۲ء میں آرمینیا کے اندر وفات پائی۔ جہاں کے بادشاہ نے اسے بہ طور خاص بلایا تھا اور وہاں اس کی قبر پر قابلِ یادگار مقبرہ تعمیر کرایا +

## عباسی خلافت کا انحلال

اُس وقت تک عباسی خلافت کا سفرِ زوال شروع ہو چکا تھا۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر اس کی قوت برابر گھٹتی گئی اور اس کے اندر چھوٹی چھوٹی ریاستیں — ترکی، ایرانی اور عرب — مشرق و مغرب دونوں جگہ کھمبیوں کی طرح نمودار ہوتی رہیں +

المتوکل (۸۴۷ء۔۸۶۱ء) کے جانشینوں[5] اور تین پیشروؤں نے سامرہ کو مرکزِ حکومت بنائے

---

۱؎ زین الدین الخطیب صفحہ ۹۸، صفحہ ۱۵۹-۱۶۱ + ۲؎ سارٹن صفحہ ۱۶ + ۳؎ پوری فہرست الندیم کی کتاب الفہرست میں ہے صفحہ ۲۹۵، القفطی تاریخ الحکماء صفحہ ۲۶۲-۲۶۳ + ۴؎ جارج سارٹن انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس جلد اول صفحہ ۶۰۲ + ۵؎ المستنصر (۸۶۱ء۔۸۶۲ء)، المستعین (۸۶۲ء۔۸۶۶ء) المعتز (۸۶۶ء۔۸۶۹ء) المہتدی (۸۶۹ء۔۸۷۰ء)، المعتمد (۸۷۰ء۔۸۹۲ء) +

رکھا، جو بغداد سے ساٹھ میل شمال میں دجلہ کے کنارے واقع ہے۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ خلیفہ کی محافظ فوج کے سرکش اور ضبط نا آشنا آدمی بغاوت نہ کر دیں۔ یہ فوج زیادہ تر ترک غلاموں پر مشتمل تھی۔ مرکزِ حکومت پھر بغداد میں منتقل ہوا، تو تقریباً نصف صدی تک دارالخلافہ یہ دردناک منظر پیش کرتا رہا کہ خلیفہ کے رہے سہے اختیارات فوج کے سالارِ اعظم کے قبضے میں چلے گئے۔ اسے امیر الامراء کا پرشکوہ خطاب حاصل تھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہتا، خلیفہ بنا لیتا اور جسے چاہتا معزول کر دیتا۔ پھر تقریباً ایک صدی (۹۴۵ء تا ۱۰۵۵ء) تک ایک ایرانی خاندان برسرِ اقتدار رہا۔ جس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کا سلسلہ نسب اسلام سے پیشتر کے شاہی خاندان سے ملتا ہے۔ بغداد اور اس کی سلطنت کے بڑے حصے میں انھیں کی حکمرانی تھی۔[2] ایرانی آل بویہ کی جگہ سلجوقی ترکوں نے لے لی[3] (۱۰۵۵ء - ۱۱۹۴ء)۔ ان کے

---

ے ۱

۱۶- المعتضد (بن المتوکل) ۸۹۲ء - ۹۰۲ء

- ۱۷- المکتفی ۹۰۲ء - ۹۰۸ء
  - ۲۱- المستکفی ۹۴۰ء - ۹۴۶ء
- ۱۸- المقتدر ۹۰۸ء - ۹۳۲ء
- ۱۹- القاہر ۹۳۲ء - ۹۳۴ء
  - ۲۰- الراضی ۹۳۴ء - ۹۴۰ء
  - ۲۲- المتقی ۹۴۴ء - ۹۶۷ء

ے ۲ آل بویہ کے زمانے کے عباسی خلیفہ یہ تھے: المطیع (۹۴۶ء - ۹۷۴ء) الطائع (۹۷۴ء - ۹۹۱ء) القادر (۹۹۱ء - ۱۰۳۱ء) القائم (۱۰۳۱ء - ۱۰۷۵ء)۔

ے ۳

۲۶- القائم (۱۰۳۱ء - ۱۰۷۵ء)

۲۷- المقتدی (۱۰۷۵ء - ۱۰۹۴ء)

۲۸- المستظہر (۱۰۹۴ء - ۱۱۱۸ء)

- ۲۹- المسترشد ۱۱۱۸ء - ۱۱۳۵ء
  - ۳۰- الراشد ۱۱۳۵ء - ۱۱۳۶ء
- ۳۱- المقتفی ۱۱۳۶ء - ۱۱۶۰ء
  - ۳۲- المستنجد ۱۱۶۰ء - ۱۱۷۰ء
  - ۳۳- المستضیء (۱۱۷۰ء - ۱۱۸۰ء)
  - ۳۴- الناصر (۱۱۸۰ء - ۱۲۲۵ء)

زمانے میں خلیفہ موجود تھے، مگر انھیں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہ تھا۔ آخری تین خلفاء[1] کی زندگیاں متواتر تشویش و اضطراب میں گزریں، کیونکہ ہر لحظہ تاتاریوں کے حملے کا خطرہ لاحق تھا۔

## طولونی خاندان

مصر کا ترک حاکم احمد بن طولون (۸۶۸ء-۸۸۴ء) ایک غلام کا بیٹا تھا جسے بخارا سے بہ طور تحفہ المامون کے پاس بھیجا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ مرکزی سلطنت کمزور ہے اور مصر خاصا دُور افتادہ ہے تو اس نے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ صوبہ شام کے گورنر کا انتقال ہوا تو احمد بن طولون نے خاص مزاحمت کے بغیر فلسطین اور اندرونِ شام پر قبضہ جما لیا[2]۔ لبنان بغداد سے منقطع ہو چکا تھا، اس لیے وہ بھی پہلے کی طرح مصر کے تابع ہو گیا۔ بیروت پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ عکہ میں پہلے جو بحری مرکز تھا، اسے پھر سے بحال کر دیا گیا[3]۔ احمد بن طولون کے پاس ایک مستحکم بیڑا اور تربیت یافتہ فوج تھی جس میں چوبیس ہزار ترک اور چالیس ہزار حبشی غلام تھے، لہٰذا اسے مرکزی حکومت کے احکام پس پشت ڈالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور وہ پورے علاقے پر اطمینان سے قابض رہا۔ اس کے بیٹے اور جانشین خمارویہ (۸۸۴ء-۸۹۵ء) نے تیس سال کے لیے خلیفہ سے معاہدہ کر لیا، جس کے مطابق طے ہو گیا کہ مصر و شام طولونیوں کے قبضے میں رہیں گے اور ان کی طرف سے تین لاکھ دینار سالانہ خراج ادا ہو گا۔ یہ شخص چلن کا اچھا نہ تھا اور اس کے اسراف بلکہ تبذیر نے خزانہ خالی کر دیا[4]۔ اس کی وفات پر دو بیٹوں اور ایک بھائی کے درمیان کش مکش جاری رہی۔ بھائی پر، جس کا نام شیبان تھا (۹۰۴ء-۹۰۵ء) یہ خاندان ختم ہو گیا اور خلیفہ کی فوج نے مصر و شام کو پھر سنبھال لیا۔

اس زمانہ شور و فساد کے اختتام پر قرامطہ اُٹھے، جنھوں نے خلیج فارس کے مغربی ساحل پر ایک خود مختار ریاست قائم کر لی اور ۹۰۱ء میں اُنھوں نے شام پر فوج کشی کی۔ دوسرے شہروں کے علاوہ حمص لے لیا اور بعلبک کی آبادی تقریباً تباہ کر ڈالی۔ یہ فرقہ ایک عراقی دہقان حمدان قرمط[5] سے چلا۔ ابتدا میں یہ تحریک اسمٰعیلی تحریک سے قریب تر تھی۔ اس کی تنظیم بھی خفیہ خفیہ ہوتی تھی۔ اور اس کے عقائد بھی اشتمالیت اور غالی شیعوں کے عقائد کا مجموعہ تھے۔ بعض دوسرے اسلامی

---

[1] الظاہر (۱۲۲۵ء-۱۲۲۶ء)، المستنصر (۱۲۲۶ء-۱۲۴۳ء)، المستعصم (۱۲۴۲ء-۱۲۵۸ء)۔

[2] طبری جلد سوم ص ۱۶۷۰، ص ۱۹۲۹، ص ۱۹۳۲، ابن خلدون جلد سوم ص ۲۹۵، جلد چہارم ۲۹۰ھ-۲۹۹ھ۔

[3] یاقوت، معجم البلدان جلد سوم ص ۸۰۰، ص ۸۰۷۔ [4] ابن تغری بردی النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ جلد دوم صفحہ ۵۷-۵۹، المقریزی، المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار جلد اوّل صفحہ ۳۱۶-۳۱۷۔

[5] قرمط آرامی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں استادِ سرّی۔

فرقوں کی طرح یہ فرقہ بھی آبادی کے ایک حصے میں اقتصادی اور سیاسی بے چینی کے باعث پیدا ہوا۔

**اخشیدی خاندان** جس سالار نے طولونیوں کی طرف سے دمشق کی حفاظت کی اور واسطہ کی پیشقدمی کا مقابلہ کیا، وہ فرغانہ کا ایک ترک تھا، جس کا نام طغج تھا۔ اسی طغج کے بیٹے محمدؐ نے طولونیوں کی میراث سنبھال لی۔ ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں محمد نے مصر میں امن و نظم قائم کر دیا اور وہ الفسطاط میں رہنے لگا۔ مصر کے علاوہ ۳۳۰ھ/۹۴۱ء میں شام اور حرمین شریفین بھی انتظامی لحاظ سے اس کے حوالے کر دیئے۔ خلیفہ نے اسے الاخشید کا ایرانی خطاب دیا اور طولونیوں کی طرح اس سے بھی تیس سال کے لیے معاہدہ کر لیا گیا اور مذکورہ بالا علاقے اسے اور اس کے جانشینوں کو دے دیئے گئے۔ ۳۳۴ھ/۹۴۶ء میں الاخشید نے وفات پائی۔ پھر عنانِ حکومت ایک حبشی خواجہ سرا کے ہاتھ آئی، جس کا نام ابوالمسک کافور تھا۔ پہلے وہ الاخشید کے دو نابالغ بیٹوں کا سرپرست بنا پھر آزاد و خود مختار ہو گیا۔ کافور کا نام بھی اس کے شمالی شام والے حریف سیف الدولہ حمدانی کی طرح اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر المتنبی (۹۱۵ء - ۹۶۵ء) کے دیوان میں اچھی یا بُری شہرت کے ساتھ آ چکا ہے۔[1] المتنبی کے قصائد کا آغاز کافور کی مدح سے ہوا۔ جب اسے توقع کے مطابق صلہ نہ ملا تو ہجو شروع کر دی۔ حمدانی عربی الاصل تھے (۹۲۴ء - ۱۰۰۳ء)۔ وہ شمالی شام میں اخشیدیوں سے برسرپیکار رہے اور حلب کے اردگرد ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ سیف الدولہ (۹۴۴ء - ۹۶۷ء)۔ اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور حکمران تھا۔ اس کے پرشکوہ دربار اور کشادہ دلانہ داد و دہش نے المتنبی جیسے شاعر، الفارابی جیسے فلسفی اور بہت سے دوسرے علماء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ سرحدی ریاست تھی اور حمدانی بیزنطینیوں سے بار بار لڑتے رہے جو اسلامی سلطنت کے دشمن تھے۔ اس رزم و پیکار کو صلیبی جنگوں کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔

**فاطمی** عباسی خلافت کے پارہ پارہ ہو جانے پر جو حکومتیں پیدا ہوئیں، ان سب سے زیادہ طاقتور اور پائدار فاطمی حکومت تھی، جس کا مرکز مصر تھا (۹۰۹ء - ۱۱۷۱ء)۔ یہ محض ایک سلطنت نہ تھی، بلکہ ایک جداگانہ خلافت تھی، جس نے خلافتِ بغداد کی حیثیت ہی کو معرضِ بحث میں ڈال دیا۔ ایک وقت تو ایسا آ گیا تھا کہ یہ خلافت بغداد کو تباہ کر کے اس کی جگہ لینے والی تھی۔ اس کا بانی عبیداللہ تھا، جو اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے ہونے کا مدعی تھا۔ چنانچہ

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ہشتم صفحہ ۱۰-۲۰، ابوالفدا جلد دوم صفحہ ۶۷-۶۸، ابن خلدون جلد چہارم صفحہ ۳۱۱، مقریزی خطط جلد اول صفحہ ۳۲۸، ۳۲۹، ابن خلکان جلد اول صفحہ ۸۷-۸۸، ابن تغری بردی جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۱۱۲، السیوطی تاریخ الخلفا صفحہ ۲۱۴۔

[2] ان دونوں کے متعلق جو شعر کہے وہ اب تک حفظ کیے جاتے ہیں۔ اور دنیائے عرب کی تمام درسگاہوں کے بچے انہیں دہراتے ہیں۔ المتنبی

Marfat.com

اس نے المہدی ہونے کا اعلان کر دیا یعنی خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ قائد، جس کا انتظار شیعہ فرقہ بڑے شوق سے کر رہا تھا۔ عبیداللہ سلمیہ (نزد حمص) میں پیدا ہوا، تونیسیا میں اس نے المہدیہ کے نام سے نیا دارالحکومت بنایا، جہاں ۹۰۹ء سے ۹۳۴ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے تیسرے جانشین المعز (۹۵۲ء-۹۷۴ء) نے مرکز حکومت مصر میں منتقل کر دیا (۹۷۳ء) وہاں اس کے ظفر مند سالار جوہر نے، جو ابتدا میں سسلی کا ایک غلام تھا اور مذہباً مسیحی تھا، نئے دارالحکومت القاہرہ کی بنیاد رکھی۔ جوہر ہی نے شہرۂ آفاق یونیورسٹی اور مسجد تعمیر کرائی، جسے دنیا الازہر کہتی ہے۔ آج بھی وہ دنیا کے بہت بڑے اور راسخ العقیدہ تعلیمی اداروں میں سے ہے۔

اسی سالار یعنی جوہر نے فاطمی سلطنت کی حد لبنانی ساحل تک پہنچادی (۹۶۹ء) اور اخشیدیوں کو مصر و شام سے نکال دیا۔ العزیز (۹۷۵ء-۹۹۶ء) کے ماتحت فاطمی سلطنت انتہائی وسعت پر پہنچ گئی۔ اس کی حکمرانی اٹلانٹک سے بحیرۂ قلزم تک مسلّط تھی۔ حجاز، یمن اور موصل بھی اس میں شامل تھے۔ اسی العزیز کا بیٹا اور جانشین الحاکم (۹۹۶ء-۱۰۲۱ء) تھا، جس سے دروزیوں کی تحریک چلی +

الحاکم کی حکومت کے دوسرے سال صور کے ایک ملّاح نے، جس کا نام علاقہ تھا، جرأت سے کام لے کر اپنے شہر کی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کے سکّے جاری کیے، جن میں منقوش تھا: "افا اس کے بعد امیر علاقہ کے لیے عظمت و برتری ہو"۔ وہ کچھ مدت تک فاطمی فوج کا مقابلہ کرتا رہا۔ بیزنطینی بیڑے نے فاطمی بیڑے کے مقابلے میں مدد دی، لیکن آخر اسے شہر حوالے کرنا پڑا۔ اس کی کھال اُتار کر اس میں بھُس بھرا گیا اور منظرِ عام پر رکھ دیا۔[۱] ۱۰۱۵ء میں الحاکم نے بیروت، صور اور صیدا اپنے ایک گورنر الفتح کو تین لاکھ دینار کے بدلے میں تا حیات بہ طورِ جاگیر دے دیے +

**بیزنطینی حملے**

جب سے مشرقی بحیرۂ روم کا ساحل بیزنطینیوں کے ہاتھ سے چھنا تھا، وہ ہر مخالفانہ تحریک کو مدد دینے پر تُلے رہے اور اپنے اس علاقے پر حریصانہ نگاہوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ کیا۔ دسویں صدی کے آخری اکتیس سال میں چار مرتبہ ان کی فوجیں شام پہنچیں اور خود شہنشاہ ان کی کمان کر رہے تھے۔ پہلا حملہ نسی فورس فوکس نے ۹۶۹ء میں کیا اور انطاکیہ و حلب فتح کر لیے۔ پھر جان زمیسز کی فوج نے (۹۷۲ء-۹۷۶ء) حمص پر قبضہ کیا۔ البقاع کو روندا اور فلسطین کا ایک حصّہ واپس لے لیا۔ صیدا نے خراج کی پیشکش کی۔ بیروت نے

---

[۱] ابن القلانسی صفحہ ۵۰۔۵۱، یحییٰ بن سعید جلد دوم صفحہ ۱۸۱ +

Marfat.com

مقابلہ کیا۔ اسے لوٹا گیا اور اس کی آبادی میں اسیروں کے باعث کمی واقع ہوگئی۔ جبیل بھی ایسے ہی سلوک کا ہدف بنا۔ ۴۹۵ھ اور ۴۹۶ھ میں یاسل ثانی نے دو مرتبہ طرابلس پر یورش کی۔ اُس زمانے میں اس کی حفاظت کے بہترین انتظامات تھے۔ اس کی فصیلیں مضبوط تھیں اور اندر بھاری فوج رہتی تھی[1] فرنگیوں کو ساحل پر ایک مستحکم قدم گاہ حاصل کرنے کے لیے مزید ایک صدی کا انتظار کرنا تھا۔

## سلجوقی ترک

فاطمی جنوبی شام اور ساحلی علاقے پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے کوشاں تھے، جب سلجوقی ترکوں نے شمالی شام میں قدم جما لیے۔ طغرل بغداد میں سلطان بن چکا تھا، اس کے بھتیجے الپ ارسلان نے ۱۰۷۰ء میں حلب لے لیا۔ اس کا ایک سالار فلسطین میں داخل ہو گیا۔ ۱۰۷۶ء میں دمشق پر قبضہ کر لیا گیا۔ لبنانی شہر، جو طرابلس کے جنوب میں تھے مقامی حکمرانوں کے زیر اثر رہے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ مصر پر زیادہ سے زیادہ بھروسا رکھیں ساتھ ہی نئے حکمرانوں کو راضی کر لیں۔ گویا لبنان پھر ایک مرتبہ دو زبردست طاقتوں ــــ شمالی و جنوبی ــــ کے درمیان بازیچہ تذبذب بن گیا۔

## راہبوں اور پھلوں کی سرزمین

اگرچہ سیاسی حالات غیر مستقل تھے اور فوجی حکومتیں بار بار بدلیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ لبنان کو اقتصادی لحاظ سے زیادہ نقصان نہ پہنچا۔ دسویں صدی کے عرب جغرافیہ نویس کے نزدیک کوہستانِ لبنان راہبوں اور پھلوں کا علاقہ تھا۔ ابن الفقیہ[2] ۹۰۳ء کے آس پاس لکھتا ہے:

> "کوہستانِ لبنان میں راہب اور درویش رہتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کے پھل اور ہر طرح کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آب تازہ کے بے شمار چشمے یہاں سے نکلتے ہیں"۔

پھر وہ لبنان کے ایک خاص سیب کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ جب اسے توڑا جائے تو نہ اس میں ذائقہ ہوتا ہے، نہ خوشبو، لیکن جب اسے دریائے بلیخ (فرات کا ایک معاون) کے پار لے جائیں تو اس میں نہایت عمدہ ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے[3]۔ ابن حوقل[4] دسویں صدی کے وسط میں تھا۔ اس نے طرابلس کی زرخیزی کی بڑی تعریف کی ہے، جو دریائے ابوعلی کی وجہ سے تھی۔ ساتھ ہی،

---

[1] ابن القلانسی صفحہ ۱۳، ۱۴، صفحہ ۴۴، نیز دیکھیے مقدسی ۱۶۰۔ [2] صفحہ ۱۱۲۔ [3] ابن الفقیہ صفحہ ۱۱۷۔ [4] کتاب المسالک والممالک صفحہ ۱۱۶۔

Marfat.com

کہتا ہے کہ چیزوں کی قیمتیں بہت معمولی ہیں۔ فلسطین کا جغرافیہ نویس المقدسی[1] ۹۹۵ء میں لبنان سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ بعلبک میں دودھ مکھن بہت ہے اور وہاں عجیب و غریب انگور ہوتے ہیں جبل عامل میں اعلیٰ درجے کا شہد پیدا ہوتا ہے۔ وہاں بھی انگور، زیتون، دوسرے پھلوں اور چشموں کی کثرت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے چشموں کے کنارے لوگوں نے سرکنڈوں کی جھونپڑیاں بنا رکھی ہیں اور دعا و عبادت میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ وہ پھل کھاتے ہیں اور بلکیں، مہندی اور بعض دوسری جڑی بوٹیاں آس پاس کے شہروں میں بیچ کر کچھ پیسے پیدا کر لیتے ہیں[2]۔ مقدسی نے عکّہ کے زیتونوں کا بھی ذکر کیا ہے[3]۔ اس زمانے میں صور چینی، مالا اور بلوری برتن کی برآمد کے لیے مشہور تھا[4]۔

تمام جغرافیہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ ساحلی شہر جنگی اعتبار سے بڑے مستحکم تھے۔ ان کے گرد فصیلیں تھیں۔ ان میں بُرج بنے ہوئے تھے اور ہر شہر میں قلعے تھے۔ اس زمانے میں دو دشمنوں کا بڑا خطرہ تھا، اوّل بحری بیڑے، دوم بزنطینی۔ عکّہ بحری مرکز تھا، اس لیے ابن طولون نے اس کے استحکامات پر خاص توجہ مبذول کی۔ اس کے بُرج اتنے مضبوط تھے کہ دو سال تک صلیبی جنگوں کے قائدوں میں سے دو بادشاہوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ صدیوں بعد نپولین نے اس پر حملہ کیا، مگر اس کا میدانی توپ خانہ استحکامات کے مقابلے میں بالکل کارگر نہ ہو سکا۔ مقدسی لکھتا ہے[5] ابن طولون نے میرے دادا کو فلسطین سے بلایا تھا کہ شہر کے لیے ایک بندرگاہ بنانے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دے۔ چنانچہ لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر پہلو بہ پہلو رکھ لیے گئے اور ان پر پتھر ڈال ڈال کر بندرگاہ بنائی گئی۔ مغربی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا گیا۔ اس کے ساتھ مضبوط زنجیر کا انتظام کر دیا گیا تاکہ جب کوئی اجنبی جہاز اندر آنا چاہے تو دروازہ بند کر دیا جائے۔ رات کے وقت اسے عموماً بند رکھا جاتا تھا۔ محض عکّہ ہی نہیں بلکہ صور اور بیروت کی بندرگاہوں میں بھی ایسی زنجیروں کا انتظام تھا[6]۔

گیارھویں صدی کے متعلق ایک ایرانی ناصر خسرو کے قلم سے مفصل بیانات ملتے ہیں۔ یہ ایک اسمٰعیلی داعی تھا، جو سفر حج کے سلسلے میں لبنان بھی گیا اور اسے دوسری اسلامی سرزمینوں پر ترجیح دی۔ وہ ۱۰۴۷ء کے اواخر سرما میں طرابلس پہنچا تھا، جب یہاں کے باغات اور کھیت بہترین

---

[1] صفحہ ۱۶۰، ۱۸۱، ۱۸۴ + [2] صفحہ ۱۸۸، ؛ [3] صفحہ ۱۶۲ + [4] صفحہ ۱۸۰ +
[5] صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳، نیز یاقوت، البلدان جلد سوم صفحہ ۷۰۷، ۷۰۸ + [6] مقدسی صفحہ ۱۶۳، ۱۶۴، ابن جبیر ص ۳۰۲ +

Marfat.com

تازگی و شادابی کا مرقّع ہوتے ہیں۔ ناصر خسرو گنّے، میٹھے اور کھٹے سنگتروں، کیلے اور کھجوروں کی بہار سے بہت متاثر ہوا۔ اُس وقت شہر کی آبادی بیس ہزار تھی۔ سرائیں چار چار چھ چھ منزلیں تھیں۔ ہر قسم کا گوشت، پھل اور کھانے پینے کی چیزیں ایران کی طرح ملتی تھیں، البتہ ان کی کثرت سو گُنا تھی۔ وہ لکھتا ہے: مکان اتنے صاف ہیں کہ انھیں شاہی محل سمجھنا چاہیے۔ بازار میں ایک جگہ پانی کا انتظام ہے جہاں پانچ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ درویشوں اور عبادت گزاروں کے لیے خاص رباطیں ہیں۔ فاطمی فوج شہر کی حفاظت کر رہی ہے اور فصیلوں پر منجنیقیں نصب ہیں۔ یہاں کی بندرگاہ میں یونان، فرنگ، ہسپانیہ اور المغرب کے جہاز آتے ہیں اور فاطمی جہاز یہاں سے چل کر یونان، سسلی اور المغرب پہنچتے ہیں[۱]۔ یہاں کاغذسازی کا جو کارخانہ ہے، اس کے کاغذ کو سمرقند کے کاغذ پر فوقیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے ۷۵۱ء میں بمقام سمرقند چینی قیدیوں سے کاغذ بنانا سیکھا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد کے اندر کاغذسازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔ طرابلس کے لیے ترقی و خوش حالی کا بہترین دور خاندانِ بنی عمّار کے بانی کے ماتحت آنے والا تھا۔

جبیل بھی فصیل سے محصور تھا اور یہ فصیل بڑی مستحکم تھی۔ یہاں کھجور اور دوسرے پھلوں کی کثرت دیکھی۔ یہاں ناصر خسرو کو ایک لڑکا ملا جس کے ہاتھ میں گلاب کے دو پھول تھے۔ ایک سرخ دوسرا سفید۔ حالانکہ مارچ کی پانچویں تاریخ تھی[۲]۔

ناصر خسرو بیروت میں داخل ہوا تو اس نے ایک شاندار محراب دیکھی، جو اسّی یا نوّے فٹ بلند تھی۔ اس کے اطراف کی دیواروں میں سفید پتھر استعمال کیے گئے تھے، جن میں سے ہر ایک وزن میں ڈیڑھ ٹن سے کم نہ ہوگا۔ ان کے اوپر سنگِ مرمر کے ستون تھے، جو چودہ چودہ پندرہ پندرہ فٹ اونچے تھے اور اتنے بھاری تھے کہ دو آدمی بالمقابل کھڑے ہو کر بازوؤں سے انھیں گھیرتے تو ان کے بازو بمشکل مل سکتے۔ ان کے اوپر محراب تھی، جس کا وسطی حصّہ پچھتّر یا اسّی فٹ اونچا تھا۔ یہ محراب نہایت خوبصورت منقّش پتھروں سے بنی تھی۔ جن میں سے ہر ایک کا وزن دس ٹن تھا۔ اردگرد کا میدان بھی ستونوں سے بھرا ہوا تھا جن کے بالائی حصّے سنگِ مرمر اور سنگِ خارا کے تھے[۳]۔ یقیناً یہ رومی عہد کے باقیات تھے۔ محراب غالباً ان تعمیرات میں سے تھی، جن سے ہیروڈ اگریپا نے شہر کی رونق بڑھائی تھی۔

---

[۱] ناصر خسرو سفر نامہ صفحہ ۱۱۲، انگریزی ترجمہ صفحہ ۴۰-۴۲۔ [۲] صفحہ ۱۳، ترجمہ صفحہ ۴۳-۴۴۔
[۳] صفحہ ۱۳، ۱۴، ترجمہ صفحہ ۴۴-۴۵۔

Marfat.com

ناصر خسرو لکھتا ہے: عیدا کی مضبوط فصیل میں چار دروازے ہیں۔ بازار اس شان سے سجائے گئے ہیں کہ اجنبی کو گمان ہو، سلطان وقت یہاں آنے والا ہے۔ باغات اتنے خوبصورت ہیں گویا ان میں سے ہر ایک بادشاہ نے تفریح کے لیے بنوایا۔ دولتمند اور بارونق صور کے بازار بھی بہت صاف ہیں۔ یہاں کی سرائیں بھی پانچ پانچ چھ چھ منزلیں اونچی ہیں۔ طرابلس کی طرح اس شہر کی آبادی بھی زیادہ تر شیعوں پر مشتمل ہے۔ پانی کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ یہ ایک خاص گزرگاہ بنا کر پہاڑوں سے لایا گیا ہے۔ عکّہ کی جامع مسجد شہر کے وسط میں واقع ہے اور ارد گرد کی عمارتوں سے زیادہ اونچی ہے اس کے ستون سنگِ مرمر کے ہیں۔ سمندر کی طرف کوئی دیوار نہیں، البتہ دیوار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک زنجیریں لگی ہوئی ہیں۔ جب کوئی جہاز آتا ہے تو زنجیریں اتنی ڈھیلی کر دی جاتی ہیں کہ وہ پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کوئی اجنبی جہاز آنا چاہے تو زنجیریں تب کس دی جاتی ہیں۔[۱]

جن جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے لبنان کے ساحلی شہروں کے مضبوط استحکامات اور نئے نئے حفاظتی انتظامات کا ذکر کیا۔ ان میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہ تھا کہ قوت کی آخری آزمائش کا وقت اُس وقت آئے، جب مشرقی یورپیوں کی طرف سے بلکہ مغربی یورپیوں کی طرف سے حملہ ہوگا، جنھیں عرفِ عام میں صلیبی جنگجو کہتے ہیں۔ طولونیوں اور فاطمی حاکموں کو بھی ایسا کوئی احساس تھا، جنھوں نے یہ استحکامات تعمیر کیے۔

---

[۱] ناصر خسرو سفرنامہ صفحہ ۱۴-۱۵، انگریزی ترجمہ صفحہ ۴۸-۵۰۔

Marfat.com

# بیسواں باب

# صلیبی جنگوں کا دور

**اسلامی وحدت**

مسلمانوں کی وحدت بہ حیثیتِ مسلمان اور سیاسی وحدت بہ حیثیت حکومت دسویں صدی کے آغاز میں قائم نہ رہ سکی۔ گیارھویں صدی کے اختتام پہ باقاعدہ صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔ اس وقت سلجوقی ترک اور ترکمان، جن کا تعلق مذہباً سنیوں سے تھا، ایشیائے کوچک اور شمالی شام میں برسرِ اقتدار تھے۔ فاطمی شیعہ مصر، فلسطین اور لبنان پر حکمران تھے۔ چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار مقامی حکومتیں، بعض سُنّی اور بعض دوسرے عقائد کی، بعض عرب اور بعض غیر عرب — پورے علاقے میں موجود تھیں — مقامی کشمکشوں، خاندانی رقابتوں، چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور جانشینی کی نزاعوں نے سیاسی بے حفاظتی اور نااستواری کی ایک مزمن کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ کوہستانی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے اسلامی اور مسیحی فرقوں نے جابجا پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً نصیری لاذقیہ کے قریب تھے۔ پھر ان کے مشرق میں حشیشی اسمٰعیلی جم گئے۔ مارونی شمالی لبنان میں تھے۔ دروزی جنوبی لبنان میں اور متاولہ (شیعہ) ان دونوں کے درمیان تھے۔ اس صورتِ حال میں بدیں وجہ مزید اُلجھنیں پیدا ہو گئیں کہ صحرائی علاقے سے عرب، شمالی و مشرقی پہاڑوں سے کُرد متواتر مزروعہ علاقوں یا ان کی فوجی چوکیوں میں پہنچ رہے تھے۔ سب سے آخر میں ترکمان تھے۔ مقامی سرداروں میں سے جو شخص ان کے لیے بہتر منفعتوں کا انتظام کر دیتا، وہ اپنی فوجی خدمات اسی کے حوالے کر دینے پر آمادہ رہتے۔

سلجوقی سالارِ اعظم الپ ارسلان نے ملاذ کرد کی جنگ میں بیزنطینیوں پر فیصلہ کُن کامرانی حاصل کی (۱۰۷۱ء) اور خود بیزنطینی شہنشاہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد پورے ایشیائے کوچک اور پورے شام کے دروازے ترکوں اور ترکمانوں کے لیے کھل گئے۔ وسط ایشیا کے اُن لوگوں کو پہلی مرتبہ علاقے میں مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع ملا۔ ایشیائے کوچک سے خود قسطنطنیہ شدید خطرے

میں پڑ گیا۔ اگرچہ متعدد شامی قصبوں کے گورنر سلجوق اعظم کے ماتحت تھے، جس کا مرکز بغداد میں تھا، لیکن وہ سلجوقیانِ روم (ایشیائے کوچک) کے بھی رشتہ دار تھے۔

## پوپ کی سرگرمیاں

بیزنطینی شہنشاہ الیکسیس کومنینس[1] کی سلطنت کے ایشیائی علاقے بُری طرح پامال ہو چکے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ امداد کے لیے پوپ سے اپیل کی۔ آخر اس اپیل پر ہمدردانہ توجہ ہوئی۔ ۲۶ نومبر ۱۰۹۵ء کو پوپ اربن ثانی نے جنوبی فرانس کے ایک مقام کلرمونٹ[2] میں ایک آتش بار خطبہ دیا۔ جنوبی فرانس ہی تھا جس پر مسلمانانِ ہسپانیہ بارہا چھاپے مار چکے اور حملے کر چکے تھے۔ خطبے کا موضوع یہ تھا کہ مقدس کلیسا کو "کافروں" کے قبضے سے آزاد کرایا جائے۔ ۱۰۹۷ء کے موسم بہار تک ڈیڑھ لاکھ کے قریب مسیحیوں نے اس خطبے کی تعمیل میں قدم اُٹھایا۔ ان لوگوں میں سے اکثریت فرنگیوں اور نارمنوں پر مشتمل تھی۔ وہ قسطنطنیہ میں جمع ہوئے۔ نارمن جنوبی اٹلی اور سسلی میں آئے تھے۔ اُنھوں نے صلیب کو جنگی نشان کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس لیے وہ صلیبی جنگجو مشہور ہوئے۔ ان میں سے بعض یقیناً مذہبی محرکات کی بنا پر نکلے تھے، لیکن اکثریت کے پیش نظر صرف دنیوی مقاصد تھے۔ ایسے لیڈر بھی تھے، جو چاہتے تھے کہ اپنے لیے حکمرانی کے نئے علاقے پیدا کر لیں۔ تاجر، جن میں سے اکثریت کا تعلق جینوآ، وینس اور پیسا سے تھا، صرف نفع خیز تجارت کے آرزومند تھے۔ مجرم اور گنہگار چاہتے تھے کہ اس ارضِ مقدس کی زیارت کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ دے دیں، جس نے حضرت مسیح کے قدموں سے شرفِ تقدیس حاصل کیا تھا۔ ایسے نوجوان بھی تھے، جو گرد و پیش کے حالات سے حد درجہ غیر مطمئن تھے۔ اُنھوں نے صلیب کو اس لیے اپنا نشان بنا لیا کہ بے اطمینانی سے نجات ملے۔ یہ ان کی قربانی نہ تھی۔ طالع آزماؤں کا گروہ ہر اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے مضطرب تھا، جس میں ہنگامے کے ممکنات نظر آتے ہوں۔ وسیع نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ صلیبی جنگیں مشرق و مغرب کے درمیان عمل اور ردِ عمل کے طویل سلسلے کا ایک واقعہ تھیں، جس کا آغاز دارا اشتاسپ اور یونانیوں سے ہوا۔ پھر یہ سلسلہ بیزنطینیوں اور مسلمانوں کے درمیان جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔

---

[1] Alexius Comnenus

[2] Clermont

Marfat.com

## ابتدائی کامیابی

پہلی صلیبی جنگ کا راستہ ایشیائے کوچک میں سے تھا، جس پر سلجوقی
قابض تھے۔ انھوں نے قسطنطنیہ سے آبنائے کو عبور کیا اور نیقیہ[1]
پر قبضہ کر لیا (جون ۱۰۹۷ء) جو ایک اہم فوجی چوکی تھا۔ اس کے بعد ڈوری لائم (موجودہ اسکی
شہر) فتح ہو گیا[2]۔ اس فاتحانہ اقدام سے ایشیائے کوچک کے وسیع جزیرہ نما میں بزنطینی شہنشاہ
کے بہت سے چھنے ہوئے علاقے واپس مل گئے۔ جب صلیبی جنگجو کوہستانِ طارس سے گزر آئے
توان کے درمیان کشمکشیں شروع ہو گئیں۔ ہر لیڈر اپنے لیے فتوحات کے منصوبے اور نقشے تیار
کرتا تھا۔ لوتھارنجیا (لورین) کے بالڈون نے مشرقی جانب مرکز الرّحا کا قصد کر لیا، جو اس وقت
ارمنی مسیحیوں کے زیر حکومت تھا۔ ۱۰۹۸ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ یوں پہلی لاطینی سلطنت کی بنیاد
رکھی گئی۔ یہ بالڈون آگے چل کر بہ لقب بالڈون اوّل یروشلم کا دوسرا بادشاہ بنا۔ ٹینکرڈ ایک نارمن
لیڈر تھا۔ وہ مغربی جانب مرکز سلیشیا میں داخل ہو گیا۔ جس کی آبادی میں یونانیوں اور ارمنوں کا
اختلاف تھا اور وہ لوگ مسیحی تھے۔ ٹینکرڈ نے طرسوس اور آس پاس کے علاقے کے لیے صلیبی
فوج کے بڑے حصے نے جنوبی جانب پیش قدمی جاری رکھی اور یروشلم اس کی منزل مقصود تھا۔
انطاکیہ راستے میں پڑتا تھا، جہاں سب سے پہلے حضرت مسیح کے پیرووں کا نام مسیحی رکھا گیا (اعمال
باب ۱۱، آیت ۲۶)۔ یہ شہر ایک سلجوقی امیر کے حوالے تھا، جو بغداد کے سلجوق اعظم کی طرف سے متعیّن
تھا۔ اس کا محاصرہ بڑا ہی سخت تھا اور دیر تک جاری رہا (۲۱ اکتوبر ۱۰۹۷ء۔ ۳ جون ۱۰۹۸ء)۔
اس اثناء میں حلب اور دمشق کی طرف سے دو سلجوق بھائیوں نے کمک پہنچانے کی کوششیں کیں،
مگر ناکام رہیں۔ محاصرے کا سالار بوہمیند تھا[3]۔ وہ بھی ایک نارمن لیڈر تھا۔ اطالوی جہاز اسے مدد
پہنچا رہے تھے۔ ایک غیر مطمئن ارمن کماندار کی غداری کے باعث شہر کی تقدیر پر آخر مہر لگ گئی[4]۔
یہ معرّۃ النعمان، جو مشہور نابینا شاعر المعرّی (وفات ۱۰۵۷ء) سے منسوب ہے، نذرِ آتش ہوا
اور اس کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا گیا[5]۔

## یروشلم کے راستے پر

فوج کے دو حصّے مشہور شاہراہوں سے جنوب کی طرف بڑھے۔ کاؤنٹ ریمان

---

[1] Nicaea ؛ [2] Dorylaeum ، اس سلسلے میں جرمن، انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے
علاوہ ملاحظہ فرمائیے ابن القلانسی صفحہ ۱۳۴ ؛ [3] Bohemond ؛ [4] کمال الدین:
تاریخ حلب جلد سوم صفحہ ۵۸۰، ابن القلانسی صفحہ ۱۳۵ ؛ [5] ابن الاثیر جلد دہم صفحہ ۱۹۰، الیافعی
جلد دوم صفحہ ۲۲۱، کمال الدین جلد سوم صفحہ ۵۸۶، ۵۸۷، ولیم صوری جلد اول صفحہ ۳۱۰، ۳۱۲۔

Marfat.com

(سینٹ جلز یا ابی صنجیل یا ابن صنجیل) ان صلیبی جنگجوؤں کا دولت مند اور ممتاز لیڈر تھا جس کا تعلق پرووینس (صوبۂ فرانس) سے تھا۔ اسے دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ انطاکیہ کی ریاست اسے نہیں دی گئی۔ چنانچہ وہ کچھ مدت تک وادی عاصی کے راستے بڑھتا رہا اور اس نے حصن الاکراد پر قبضہ کر لیا، جسے اس درے میں اہم جنگی حیثیت حاصل تھی، جو ساحلی میدان اور دریائے عاصی کے درمیان واقع ہے۔ یہ قلعہ آج کل قلعۃ الحصن کہلاتا ہے۔ اسے حمص کے ایک امیر نے بنوایا تھا اور وہاں کُردوں کی فوج متعین کی تھی۔ اسی مقام پر آگے چل کر صلیبیوں نے ایک آبادی قائم کی، جس کا نام کریک داشولیرز[۱] رکھا۔ ارقہ شامی و لبنانی شہنشاہان روما میں سے ایک کی ولادت گاہ تھا۔ اس کے استحکامات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ یہ فروری سے وسط مئی ۱۰۹۹ء تک بہ حالتِ محصوری مدافعت کرتا رہا۔ لبنان کا یہ پہلا شہر تھا، جس پر صلیبی حملہ آور ہوئے۔ مارچ میں بوئیلان[۲] (زیریں لورین کا مرکزِ حکومت) کا گاڈفرے، جو بالڈون کا بھائی تھا، ساحلی راستے سے ریماں کے ساتھ جا ملا۔ اس نے پہلے لاذقیہ کو لینے کی معمولی کوشش کی، پھر جبلہ[۳] کا ناکام محاصرہ کیا، پھر انطرطوس[۴] پر قبضہ کر لیا، جو خالی پڑا تھا۔ اس زمانے میں جبلہ اور انطرطوس دونوں طرابلس کے ضلع میں شامل تھے۔ انطرطوس میں آگے چل کر ایک زبردست قلعہ تعمیر ہوا، جو صلیبی تعمیرات میں اب تک سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ ترکوں کے پاس کوئی بحری قوت نہ تھی۔ لہٰذا وہ نہ کسی ساحلی شہر کو واپس لے سکے، نہ ان پر قبضہ رکھ سکے۔ ان میں سے زیادہ شہر فاطمیوں نے ۱۰۸۹ء میں لے لیے تھے۔[۵] ریماں پر خود اس کے آدمیوں نے زور ڈالا اور وہ محاصرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ وہ لوگ جلد سے جلد یروشلم پہنچنا چاہتے تھے، جو ان کی منزلِ مقصود تھا۔ علاوہ بریں فخر الملک ابن عمار امیر طرابلس نے بھی گراں بہا تحفے بھیج کر اسے ترکِ محاصرہ پر آمادہ کر لیا تھا۔ ارقہ فخر الملک ہی کی ملکیت تھا۔ تحفوں میں پندرہ ہزار اشرفیاں، گھوڑے، خچر، ریشم اور قیمتی مرتبان تھے۔ ابن عمار نے حملہ آور فوج کے لیے خوراک کا بندوبست بھی کر دیا تاکہ وہ لوگ آس پاس کے کھیت نہ لوٹیں اور کاشتکاروں کو نہ ستائیں[۶]۔

---

[۱] Crac-des-Chevaliers، کریک عربی کے کرک کا بگاڑ ہے۔ یہ ارامی لفظ کرخا سے ہے، جس کے معنی شہر ہیں۔ [۲] Bouillon۔ [۳] Gabulum، حسب بیان لاطینی وقائع۔ [۴] لاطینی میں اسے طارٹوسا (Tortusa) کہتے ہیں، موجودہ نام طرطوس ہے۔ [۵] ابن الاثیر جلد دہم صفحہ ۱۱۶-۱۱۷، ابوالمحاسن: اخبار مصر صفحہ ۲۸۔

[۶] ولیم صوری جلد اوّل صفحہ ۳۲۱-۳۳۰۔

Marfat.com

اس کے بعد ساحلی راستہ اختیار کر لیا گیا۔ یہ وہی راستہ تھا، جو زمانۂ ماضی میں آشوری و بابلی اور یونانی و رومی حملہ آور اختیار کر چکے تھے۔ البترون[1] اور جبیل[2] طرابلس کی عمارت میں شامل تھے۔ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ البترون ہی میں عیلیبیوں نے پہلے پہل مارونیوں سے ربط و تعلق پیدا کیا، جنھیں وہ بہادر لوگ اور شجاع جنگجو قرار دیتے ہیں۔ عیلیبیوں کی رہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔ مارونیوں نے اس کا عمدہ انتظام کر دیا[3]۔ عیلیبیوں نے ایک رات بیروت میں بسر کی۔ ابنِ عمار کی پیروی کرتے ہوئے بیروت کے فاطمی گورنر نے بھی عیلیبیوں کے لیے روپے اور رسد کا فراخ دلانہ انتظام کر دیا تاکہ وہ فصلوں اور درختوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ وہ لوگ راستے میں زیادہ وقت صرف کرنے کے روادار نہ تھے۔ نہ مقامی لوگوں نے انھیں ستایا، نہ انھوں نے مقامی لوگوں پر کوئی آفت برپا کی۔ اگلے دن وہ صیدا[4] پہنچ گئے، جہاں کی ٹھنڈی فضا اور سایہ دار باغوں نے ان کے لیے خوشگوار راحت و آسائش بہم پہنچائی۔ وہاں انھوں نے خیمے نصب کیے اور چھوٹے چھوٹے دستے اِدھر اُدھر بھیج دیے کہ غذائی جنسیں اور ریوڑ لوٹ لائیں۔ فاطمی سالار نے انھیں روکنے کی معمولی کوشش کی۔ یہاں انھیں زہریلے سانپوں سے سابقہ پڑا۔ مقامی لوگوں نے انھیں بتا دیا کہ سانپ کے کاٹے کا علاج کیونکر کرنا چاہیے ۔

**صور** طرابلس کے بعد لبنانی شہروں میں صور زیادہ بارونق و خوش حال تھا۔ قدیم صنعتوں میں وہاں قند سازی کی صنعت کا اضافہ ہو گیا تھا، جس کی بہت مانگ تھی، خوراک کے لیے بھی اور دواؤں کے لیے بھی۔ شہر کا جو حصہ جزیرے میں واقع تھا، اس کے لیے پانی کا بڑا اچھا انتظام تھا کیونکہ رومیوں نے رأس العین سے شہر تک ایک عمدہ گزرگاہِ آب بنا لی تھی، جس کے بعض حصے اب تک کام دے رہے ہیں۔ یہ نہایت اہم بحری مرکز تھا، جہاں سے اسلامی جہاز بیزنطینیوں اور بحری قزاقوں سے لڑنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ خشکی کی جانب شہر کی حفاظت کے لیے تہری فصیل تھی اور سمندر کی جانب دُہری فصیل، لیکن یہاں کے تاجروں کو بین الاقوامی تجارت میں پہلے کی طرح اجارہ داری حاصل نہ تھی۔ اب جینوآ، وینس اور پیسا ہی نہیں بلکہ املفی[5] اور مارسائی کے تاجر بھی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود تھے۔ عیلیبیوں کی آمد سے ایک سال پیشتر اہلِ صور نے مصریوں کے خلاف بغاوت کی تھی اور ان کی خاصی تعداد موت کے گھاٹ اُتار

---

[1] Batrys ۔ [2] Giblet، قدیم ببلوس ۔ [3] ولیم صوری جلد اول صفحہ ۳۳۰، جلد دوم صفحہ ۱۹
[4] لاطینی وقائع میں اسے سجیٹا (Sagitta) لکھا ہے ۔ [5] (Amalfi) اٹلی کی بندرگاہ ۔

Marfat.com

دی گئی تھی۔ عیلبیوں نے اس مقام کے قریب خیمے نصب کیے، جسے زندہ پانیوں کا سرچشمہ اور عجوبۂ عالم قرار دیا گیا ہے[۱]۔ اس کے پانی پہاڑی چشموں سے نہیں آتے بلکہ ایک غار کی تہ میں سے اُچھلتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ یہ انھیں سرچشموں میں سے ایک ہے، جن کے گیت حضرت سلیمانؑ نے گائے[۲]۔

## لاطینی بادشاہی کا پایۂ تخت یروشلم

دوسرے روز عیلبیوں نے پھر رختِ سفر باندھ لیا اور روانہ ہو پڑے۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ عکّہ اور ارسوف ہوتے ہوئے قیساریہ پہنچے۔ پھر اندرونِ ملک کی طرف مُڑ گئے اور الرّملہ ہوتے ہوئے ۷۔ جون ۱۰۹۹ء کو اپنے اصل مقصود یروشلم پہنچ گئے۔ گاڈ فرے، ریمان اور ٹینکرڈ نے ایک مہینا محاصرہ جاری رکھا۔ پھر مقدّس پر قبضہ ہو گیا اور اس کی آبادی عنفّ وعمر سے قطع نظر بے امتیاز موت کے گھاٹ اُتار دی گئی۔ یروشلم کو مستقر بنا کر بیڑے کی مدد سے فلسطین کا بڑا حصّہ فتح کر لیا گیا۔ پہلے گاڈ فرے بادشاہ بنا۔ ایک سال کی حکومت کے بعد وہ فوت ہُوا تو اس کے بھائی بالڈون امیر الرّوحا کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یہ رسم ۱۱۰۰ء میں بڑے دن پر ادا ہوئی۔

## لبنانی بندرگاہیں

لاطینی بادشاہی کا پہلا اہم کام یہ تھا کہ ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ یورپ سے تعلقات قائم رکھے جا سکیں۔ جہازوں کے تعاون سے یہ اور بعض دوسرے ضروری کام انجام دیے جا سکے۔ یہ جہاز اٹلی کی جمہوری ریاستوں نے مہیّا کیے تھے۔ انھیں کی وجہ سے تمام مستحکم شہروں میں غذائی جنسیں، منجنیقیں اور تازہ دم فوجیں بھیجی جا سکیں۔ فاطمی بیڑے میں اس وقت صرف تیس یا چالیس جہاز تھے۔ وہ مؤثر مزاحمت نہ کر سکا۔ یورپی ملّاحوں کو بھی مالِ غنیمت میں سے حصّہ دیا گیا۔ جن شہروں پر قبضہ ہوا، وہاں ان کے لیے قیام گاہیں مہیّا کی گئیں۔ یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ وہ اپنی اپنی جمہوریتوں کے ماتحت رہیں گے اور انھیں محاصل ادا کیے بغیر باہر سے مال لانے اور فروخت کرنے کا حق حاصل ہو گا[۳]۔ اس طرح ان کی خدمت کا معاوضہ ادا کیا گیا۔ پھر انھوں نے مزید مراعات و حقوق کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور یہی حقوق آگے چل کر ان کے مستقل حقوق بن گئے۔ ارسوف اور قیساریہ پر ۱۱۰۱ء میں قبضہ کر لیا گیا۔ عکّہ کے استحکامات بڑے زبردست تھے۔ شاہ یروشلم نے خشکی کی جانب سے اور جینوا کے بیڑے نے سمندر کی جانب سے اس کی

---

۱ ولیم صوری جلد اوّل صفحہ ۳۳۱ ۔ ۲ ایضاً جلد دوم صفحہ ۶ ۔
۳ ایضاً ایضاً جلد اوّل صفحہ ۴۳۲، ۴۵۵ ۔

Marfat.com

ناکابندی کر لی۔ تین سال کے بعد عکہ حوالگی پر آمادہ ہوا۔ ۱۱۱۰ء میں بیروت کا محاصرہ گیارہ روز جاری رہا۔ ۱۲۔ مئی کو حملہ کر کے شہر فتح کر لیا گیا۔ اس کے پاس دیوداروں کے جو جھنڈ تھے، وہ اس وقت بھی خاصی رونق پر تھے۔ ان کی لکڑی سے محصور قصبوں پر حملے کے لیے برج اور فصیلوں پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئیں۔ مصری بیڑہ اٹھارہ جہازوں کے ساتھ شہر کی حفاظت کے لیے پہنچا، لیکن چالیس یورپی جہازوں کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں بعض جہاز یروشلم کی بادشاہی کے تھے اور بعض جینوا کے۔ بیروت کو لوٹا گیا۔ اس کے والی اور بہت سے باشندوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض بچ کر قبرص پہنچ گئے۔ بعض کو جنگی قیدی بنا لیا گیا[1]۔ بیروت کچھ مدت کے لیے بہ طور جاگیر خاندانِ ابالن[2] کے حوالے کر دیا گیا۔

اگست میں بالڈوِن البقاع ایک مہم لے گیا۔ وہ بعلبک پہنچا، جس کا حاکم ایک ترک اتابک[3] بنام طغتگین ساکنِ دمشق تھا۔ وہ اس بات کے لیے تیار ہو گیا کہ اپنے علاقے کی ایک تہائی پیداوار فرنگیوں کو دیتا رہے گا۔ اسی سال ۴۔ دسمبر کو صیدا پر قبضہ ہوا۔ اس سلسلے میں ناروے اور وینس کے ساتھ جہازوں نے بڑی مدد دی۔ فرنگیوں نے ایک عجیب و غریب برج بنایا۔ اس پر چٹائیاں اور چمڑا چڑھا دیا۔ جا بجا شاخیں لگا دیں تاکہ اسے آتشباری سے محفوظ رکھا جائے۔ اسے پہیوں کے ذریعے سے آگے پیچھے لے جاتے تھے۔ آگ بجھانے کے لیے اس میں پانی اور سرکہ رکھ دیا گیا تھا۔ سینتالیس روز کے محاصرے کے بعد شہر اس شرط پر حوالے ہوا کہ بیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا۔ اس طرح وہ اپنے ہمسایے کی مصیبتوں سے دوچار نہ ہوا۔ ناروے سے جو جہاز آئے تھے وہ زائروں اور جنگجوؤں کے علاوہ اسلحہ اور رسد بھی لائے تھے۔ بادشاہ بالڈون نے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا[4]۔ ۱۱۱۸ء میں بالڈون اوّل فوت ہوا۔ اس وقت لاطینی بادشاہی بھی کمال وسعت تک پہنچ چکی تھی۔ یعنی العقبہ سے بیروت تک اس کے حدود تھے۔ بالڈون کے بعد اس کا بھتیجا مسند نشین ہوا اور وہ ۱۱۱۸ء سے ۱۱۳۱ء تک بالڈون ثانی کے لقب سے حکومت کرتا رہا۔

غرض صور اپنے استحکامات کے ساتھ مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ ۱۱۱۲ء میں اسے فتح کر لینے کے لیے قدم اٹھایا گیا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اوّل طغتگین نے کمک کا انتظام کر دیا۔ دوم حملہ آوروں نے

---

۱ ابن القلانسی صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸، صالح بن یحییٰ صفحہ ۱۷، ۱۹، ولیم صوری جلد اوّل صفحہ ۴۸۴، ۴۸۵، نیز فرانسیسی اور انگریزی کتابیں۔

۲ Ibelin ، بیروت کے امرا کی فہرست کے لیے دیکھیے ریئی گروسیت کی فرانسیسی کتاب۔

۳ اتابک کا لفظی ترجمہ ہے شہزادے کا باپ۔ اس سے مقصود اتالیق ہے۔ سلجوقی شہزادوں کے تمام اتالیق اتابک کہلاتے تھے۔

۴ ابن القلانسی صفحہ ۱۷۱، ابن الاثیر جلد دہم صفحہ ۳۳۶، ۳۳۷، صیدا کے امرا کے لیے دیکھیے گروست کی فرانسیسی کتاب۔

Marfat.com

جو بُرج تیار کیا تھا، اسے نفط اور تارکول سے جلا دیا گیا۔ صلیبی ۱۱۲۴ء تک شہر کے اندر قدم نہ رکھ سکے[51]۔

## بنی عمّار کا طرابلس

انطاکیہ اور الرّوحا کی فرنگی ریاستیں شمال میں تھیں اور فلسطین کی بادشاہی جنوب میں۔ ان دونوں کے درمیان کا پورا اسلامی علاقہ فتح کر لینا ضروری تھا۔ اس کے بغیر سرزمینِ مشرق میں اہلِ مغرب کی قائم کردہ حکومتیں باقی نہیں رہ سکتی تھیں یہی طرابلس اور اس کے ملحقات کا علاقہ تھا۔ ریمان نے جب سے یہ علاقہ دیکھا تھا، دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے ضرور فتح کرے گا۔ چنانچہ یروشلم کی تسخیر کے بعد وہ اپنے ارادے کو لباسِ عمل پہنانے کا فیصلہ کر کے لوٹا۔ اس اثناء میں اس کا وقار بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریمان نے شہنشاہ الیکسیس کومنینس سے وفاداری کا حلف اُٹھا رکھا تھا۔ اگرچہ یہ حلف عام حلف سے کسی قدر مختلف تھا۔ شہنشاہ کو اُمید تھی کہ صلیبی جنگجو اسی کے لیے لڑائیاں کریں گے اور جو علاقے ان کے قبضے میں آئیں گے، وہ شہنشاہ کے حوالے ہوتے جائیں گے۔ ریمان نے تین سو آدمیوں کے ساتھ اس مرکزی حصار کا محاصرہ کر لیا، جس کی ابتدائی فوج بیس ہزار تھی (۱۰۹۹ء) یہ صریح احمقانہ اقدام تھا۔ ۱۱۰۳ء میں اس نے متصلہ پہاڑی پر ایک قلعہ تعمیر کیا، جس کا نام شاطو پیلرین[52] رکھا۔ خود پہاڑی کو جبلِ زائرین[53] کا نام دے دیا۔ صلیبی قلعوں کے طویل سلسلے میں سے یہ پہلا قلعہ تھا اور ایسے قلعے ساحل کے ساتھ ساتھ دُور تک چلے گئے تھے۔ یہ قلعہ اب تک موجود ہے اور اسے قلعۂ طرابلس کہتے ہیں۔ ترکوں نے اس کی مرمت کرا کے قید خانے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں ایک برطانوی دستہ یہاں ٹھہرایا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ دشمن کے ہوائی جہازوں کو مار گرائے۔ اس کا مشرقی رُوکار، جو دریائے ابوعلی کی جانب ہے، بارھویں صدی کا تعمیر شدہ ہے۔ پھر اس کے اردگرد لاطینیوں کی ایک آبادی قائم ہو گئی۔ یہیں سے طرابلس جدید کی آبادی شروع ہوئی، جسے بندرگاہ (المینا) سے وہ باغات الگ کرتے ہیں، جو دریائے ابوعلی سے سیراب ہوتے ہیں۔

شہر کا دفاع ابوعلی فخر الملک ابن عمّار کے متعلّق میں تھا، جو ۱۰۹۹ء میں مسندِ امارت پر بیٹھا۔ اس امارت کی بنیاد فخر الملک کے چچا ابوطالب امین الدّولہ ابن عمّار نے رکھی تھی، جو طرابلس کا ایک شیعہ قاضی تھا اور ۱۰۶۹ء میں فاطمی گورنر کی وفات پر اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ابوطالب

---

[51] ابن تغری بردی جلد دوم حصّہ دوم صفحہ ۳۳۶، ۳۳۸، سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزّمان۔

[52] Chateau Pelerin ۔ [53] Mons Pelcgninus ۔

علوم کا سرپرست تھا اور اس نے ایک دار العلم[1] کے علاوہ ایک کتب خانہ تعمیر کرایا جس میں عام روایت کے مطابق ایک لاکھ کتابیں تھیں۔ اس طرح اہل علم طرابلس کی طرف کھچے آنے لگے۔ ابوطالب نے چھوٹے پیمانے پر طرابلس کے لیے وہی کارنامے انجام دیے، جو سیف الدولہ نے زیادہ بڑے پیمانے پر حلب کے لیے انجام دیے تھے[2]۔ اس کتب خانے میں جن ممتاز لوگوں نے فائدہ اٹھایا، ان میں سے ایک المعرّی بھی تھا۔ بنی عمّار کے ماتحت طرابلس ذہنی ترقیات اور مادّی خوش حالی کے سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گیا[3]، لیکن اس ترقی کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ محاصرہ جاری رہا اور ریمان کو آس پاس کے کوہستانی مسیحیوں سے تازہ دم رنگروٹ ملتے گئے[4]۔ جینوآ کے جہازوں نے اسے پوری مدد دی اور شہر کو منقطع کر دینے کے لیے اس نے آس پاس کے علاقے فتح کر لیے۔ طرابلس کو حمص اور دمشق سے بھی کسی قدر مدد ملی، لیکن اس کی حیثیت عارضی تھی۔ آخر شہر پر قحط کا خطرہ منڈلانے لگا۔ لفغت سیر کھجور کی قیمت ایک اشرفی تک پہنچ گئی۔ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ سنہ ۵۰۱ھ میں فخر الملک نے امارت کے معاملات اپنے چچیرے بھائی ابوالمناقب ابن عمّار کے حوالے کیے اور خود بغداد چلا گیا تاکہ خلیفہ اور وقت کے سب سے بڑے حکمران سلجوقی سلطان سے کہہ کر کمک کا انتظام کرے۔ وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ چار مہینے تک بڑی پُرتکلّف دعوتیں ہوتی رہیں۔ برادرانہ محبّت کے پھول اس پر برسائے گئے اور دین کے دفاع کے لیے اس نے جو کچھ کیا تھا، اس کی بڑی ستائش ہوئی، لیکن کوئی عملی قدم اٹھایا نہ گیا۔ ابوالمناقب شہر کو فاطمی خلیفہ کے حوالے کر دیا، جس نے فخر الملک کے کنبے اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ بدنصیب امیر پھر وطن واپس نہ آسکا۔ جینوآ اور پرووینس کے بیڑوں نے سمندر کی طرف سے امداد کا ہر راستہ بند کر دیا۔ دوسرے فرنگی لیڈر بھی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ ریمان کی وفات سے چار سال بعد ۲۶ - جون ۱۱۰۹ء کو طرابلس فتح ہو گیا۔ اس کا دار العلم اور کتب خانہ صفحۂ ہستی سے محو کر ڈالے گئے[5]۔ وہاں ایک نئی لاطینی امارت قائم ہو گئی یعنی امارتِ طرابلس، جس کی سرحدیں المرکب سے جبیل تک تھیں۔ برٹرانی کو اس کا رئیس بنا دیا گیا[6]۔

---

[1] اسامہ صفحہ ۲۰۱، ترجمہ صفحہ ۲۳۷ ÷ [2] دیکھیے حتّی کی تاریخ شام، انگریزی صفحہ ۵۶۶-۵۷۰ ÷ [3] ابن القلانسی صفحہ ۹۶، ۹۷ - صفحہ ۱۱۴، ابن تغری بردی جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۲۶۷ ÷ [4] ابن خلدون جلد پنجم صفحہ ۱۸۶ ÷ [5] ابن تغری بردی جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۳۳۴-۳۳۶، ابن القلانسی صفحہ ۱۶۰-۱۶۱، صفحہ ۱۶۳، ابن الاثیر جلد دہم صفحہ ۳۱۵-۳۱۷، صفحہ ۳۳۳-۳۳۴، سبط ابن الجوزی، ابن میسّر صفحہ ۴۳ - ولیم صوری جلد اول صفحہ ۴۷۸ ÷ [6] Bertrand، طرابلس کے امرا کے لیے دیکھیے گرومست ÷

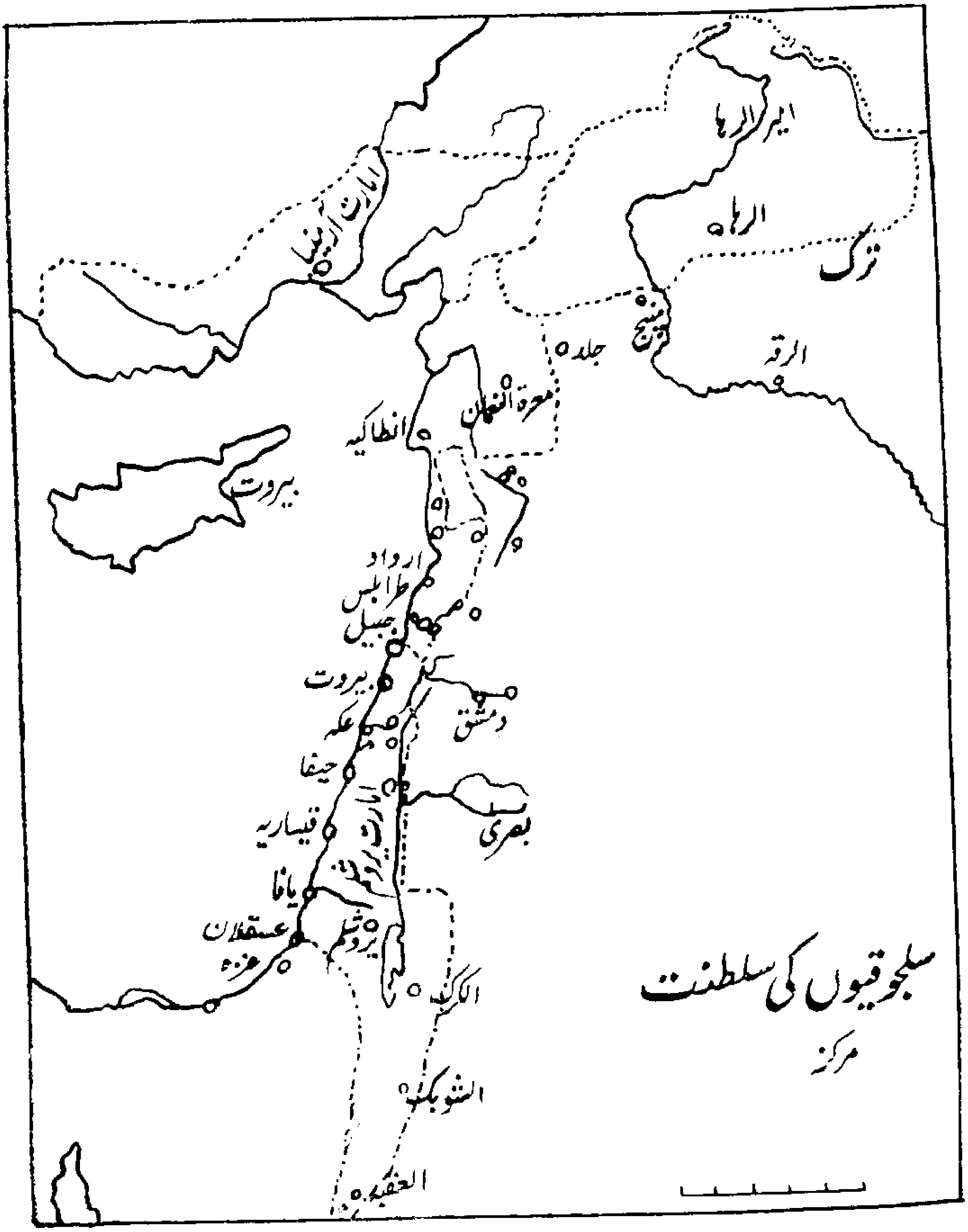
امارت آرمینیا
امیر الرہا
الرہا
ترک
منبج
جلد
الرقہ
معرۃ النعمان
انطاکیہ
بیروت
ارواد
طرابلس
جبیل
بیروت
دمشق
عکہ
حیفا
بصریٰ
قیساریہ
یافا
عسقلان
یروشلم
غزہ
الکرک
الشوبک
العقبہ
سلجوقیوں کی سلطنت
مرکز

Marfat.com

جو ریماں کا ایک ناجائز بیٹا تھا۔ شمال میں لاذقیہ پر مسیحیوں کا قبضہ تھا۔ اسے ٹینکرڈ نے ۱۱۰۳ء میں فتح کرکے انطاکیہ کی امارت میں شامل کر لیا تھا۔ الرّوھا، انطاکیہ اور طرابلس کی لاطینی امارتیں رسماً شاہ یروشلم کی وفادار تھیں۔ فرنگیوں کی کامیابی کا یہ سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔

**استحکامات**

صلیبیوں نے ابتدا میں جو کامیابی حاصل کر لی تھی — اور یہی ان کی کامیابی کی حد تھی — اس سے مستقبل کے متعلق نہ کوئی خوشگوار اُمید قائم کرنے کی گنجائش تھی اور نہ یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ کامیابی زیادہ دیر تک قائم رہے گی۔ صرف شمالی اور جنوبی گوشوں کو چھوڑ کر حاصل شدہ علاقہ سراسر ساحلی تھا۔ اس میں بڑے بڑے شہر تھے جن میں سے ہر ایک دشمن کے علاقے سے صرف ایک دن کی مسافت پر تھا۔ اندرونہ ملک غیر مسخر رہا یہ سچ ہے کہ حلب، حما، دمشق اور بعلبک جیسے شہر بعض اوقات خراج ادا کرتے رہے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی مسخر نہ کیا جا سکا۔ اپنے مراکز حکومت — الرّوھا، انطاکیہ، طرابلس اور یروشلم — میں بھی فرنگیوں کی اقلیت تھی۔ ایک اجنبی اقلیت نہ خود کسی میں جذب ہو سکتی تھی، نہ کسی کو اپنے اندر جذب کر سکتی تھی۔ ان میں سے کسی جگہ بھی فرنگی چند سو سے زیادہ نہ تھے ان امارتوں کی حیثیت چھوٹے چھوٹے حلقوں کی سی تھی، جو اکثر آپس میں کٹے پھٹے رہتے۔ باہر سے گئی ہوئی مسیحیت اس سرزمین میں جا بیٹھی تھی، جس کا پس منظر اسلام تھا اور اس کی وسعت بہت زیادہ تھی۔

ساحلی علاقے پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ سمندر پر قبضہ بحال رہتا اور وطن کے لوگوں سے ربط ضبط نہ ٹوٹتا۔ صلیبی جنگجو اسی وقت تک محفوظ رہ سکتے تھے، جب تک وطن سے تازہ دم رنگروٹ برابر پہنچتے رہتے اور مخالف قوتیں کسی زبردست قائد کے ماتحت متحد نہ ہو جاتیں۔ اسی غرض سے عکّہ، صور، صیدا، جُبیل اور دوسرے شہروں کی بندرگاہوں کے مدخلوں پر بُرج تعمیر کر دیئے گئے، یا آس پاس کے جزیروں کو مستحکم کر دیا گیا۔ چوکیوں کا ایک زنجیرہ قائم کر دیا گیا جن کے ذریعے سے لبنان کی تمام بندرگاہیں ایک سلسلے میں منضبط ہو گئیں۔ ایسے تو بُرج اب تک پہچانے جا سکتے ہیں اور جو بُرج جُبیل کے جنوب مشرق میں ہے، وہ زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ اس بُرج کی طرح اور بھی بہت سے بُرج تعمیر کیے گئے، جن میں پرانے مسلکے سے مدد لی گئی۔ فوجی دفاع کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ تمام بندرگاہوں میں خشکی کی جانب قلعے بنائے گئے۔ طرابلس، صور، اور عسقلان میں قلعوں کی تعمیر کا کام بہت پہلے شروع کر دیا گیا تھا اور ان کی وجہ سے ان

Marfat.com

شہروں کی تسخیر میں بھی مدد ملی، جو دیر تک مدافعت کرتے رہے۔ جبیل میں صلیبیوں کے قلعے کے کھنڈر سب سے پہلے سیاح کی نگاہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایسی بعض عمارتیں بارھویں صدی میں بنی تھیں اور بعض تیرھویں میں۔ صیدا میں جو قلعہ بنا تھا، اس کا نام شاطو دُلامر[1] (قلعۃ البحر) رکھا گیا تھا۔ یہ ۱۲۲۷ء اور ۱۲۲۸ء میں ایک چھوٹے سے جزیرے پر بنایا گیا تھا، پھر پچاس گز لمبے پل کے ذریعے سے اسے کنارے کے ساتھ ملا دیا گیا۔ ان استحکامات کی مرمت لوئی نہم نے کرائی اور انھیں مضبوط تر کر دیا۔ ان میں جو مسالا استعمال ہوا، وہ رومیوں اور فونیقیوں کے زمانے کا تھا، مثلاً سرخ اور سرمئی سنگ خارا کے ستون، جو مصر میں بنے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ لبنان میں صلیبیوں کے تمام قلعے بیزنطینیوں، رومیوں یا فونیقیوں کے زمانے کے پرانے استحکامات کی تجدید تھے۔ مملوکوں نے اپنے زمانے میں انھیں از سر نو درست کر لیا۔ ان کے مقامات کی اہمیت ان لوگوں کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتی تھیں، جو صلیبیوں سے پیشتر اس سرزمین پر حکمران تھے۔ مراکش کا جغرافیہ نویس الادریسی[2] (وفات ۱۱۶۶ء) کچھ ہی مدت پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے صیدا اور بیروت کے درمیان تین قلعوں کا، بیروت و لاذقیہ کے درمیان سولہ قلعوں کا ذکر کیا ہے +

## قلعۃ الشقیف

ساحل کے ساتھ ساتھ برجوں اور قلعوں کا جو سلسلہ قائم کیا گیا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ فرنگیوں کے مقبوضہ ساحلی علاقے اور اندرونِ ملک کے اسلامی علاقے کے درمیان جن دروں کو جنگی اہمیت حاصل ہے، ان کی پوری پوری حفاظت ہو سکے۔ اسی غرض سے پہاڑوں کی ڈھلانوں یا مغربی جانب کسی قدر آگے بڑھے ہوئے ٹیلوں کی چوٹیوں پر بھی قلعوں کی ایک قطار کھڑی کر دی گئی۔ ان میں سب سے زیادہ زبردست قلعہ وہ تھا، جسے شاطو دی بیوفورٹ (بیلفورٹ) کہتے تھے۔ عرب وقائع نگاروں نے ایک ہمسایہ گاؤں کے نام پر اس کا نام شقیف عرنون رکھا اور آج کل اسے قلعۃ الشقیف کہتے ہیں[3]۔ یہ قلعہ ایک عمودی چٹان کی چوٹی پر عقاب کے گھونسلے کی طرح کھڑا ہے اور دریائے لیطانی سے ڈیڑھ ہزار فٹ بلند ہے۔ سطح بحر سے ۲۱۹۹ فٹ اونچا ہے۔ یہ قلعہ اس جنوبی درے کی چوکیداری کرتا تھا، جو صور و صیدا کے ساحلی علاقے کو البقاع اور دمشق سے ملاتا تھا۔ بالکل اسی طرح حصن الاکراد اس شمالی درے کا پاسبان تھا جو طرابلس و طرطوس اور حمص و حماۃ کے میدانوں کے درمیان تھا۔ یہ قلعہ یروشلم کے بادشاہ فلک[4] نے

---

ف۱ Chateaude-la-Mar + ف۲ صفحہ ۱۸،۱۹۔ صفحہ ۲۰۔ صفحہ ۲۲ + ف۳ شقیف سریانی میں بڑی چٹان کو کہتے ہیں۔ عرنون سریانی میں تیز رفتار ندی کے لیے استعمال ہوتا ہے + ف۴ Fulk ، یہ بالڈون ثانی کا داماد اور جانشین تھا۔ عہدِ حکومت ۱۱۳۱ء۔ ۱۱۴۲ء +

۱۱۳۹ء میں اس جگہ تعمیر کرایا تھا، جہاں پہلے رومیوں کا ایک قلعہ تھا۔ بیو فورٹ کی مرمت لبنان کے دروزی امیر فخر الدین نے اُس وقت کرائی، جب اسے ترکوں سے جنگ کرنی پڑی۔ یہ عمارت ایک سو تیس گز لمبی اور پینتیس گز چوڑی ہے۔ اس کی دیواریں اٹھاون فٹ سے اٹھتر فٹ تک بلند ہیں۔ باہر کی طرف جنوبی و مغربی جانب ایک خندق ہے، جو ٹھوس چٹان کاٹ کر بنائی گئی اور اڑتالیس فٹ سے ایک سو پندرہ فٹ تک گہری ہے۔ اس خندق میں چٹان کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے حجرے بنائے گئے تھے، نیز چشمے نکالے گئے تھے۔ یہ قلعہ اپنے زمانے میں بالکل ناقابلِ تسخیر مانا جاتا ہوگا۔[1] اگرچہ اس کی تعمیر پہ صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن اب بھی یہ اپنی نوعیت کے شمالی قلعوں ـــ حصن الاکراد اور المرکب ـــ کی طرح اردگرد کے علاقے کی نگہبانی بلندی سے کر رہا ہے اور اس کے وقار و جلال کی شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لبنانی اور شامی حکومتیں اپنے سالانہ میزانیوں میں قرونِ وسطیٰ کی ان یادگاروں کی مرمت کے لیے رقمیں منظور کرتی ہیں کیونکہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے سیاحوں کے لیے یہ یادگاریں خاص کشش کا باعث ہیں۔ جس طرح الشقیف درے کے مغربی حصے کا محافظ ہے، اسی طرح مشرقی حصے کی حفاظت قلعۃ الصبیبہ کر رہا ہے۔ یہ کوہِ حرمون (جبل الشیخ) کے ایک کم بلند ٹیلے پہ واقع ہے، جو آج کل حدودِ شام میں شامل ہے۔ یہی قلعہ بانیاس ہے، جسے بول چال میں قلعۃ النمرود کہتے ہیں۔ یہ قلعہ صلیبی جنگوں سے پیشتر بنا تھا اور ۱۱۲۶ء میں طغتگین نے اسے حشیشی اسمٰعیلیوں کے حوالے کیا تھا۔ چار سال بعد فرنگیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور شاہ فلک نے اس کی مرمت کرا دی۔ اس کے جو آثار اب پائے جاتے ہیں، ان میں بعد کی متعدد صدیوں کے نشان بالکل واضح ہیں۔ اس کی مغربی سمت سے الحولہ اور دریائے اُردن کے پار کی پہاڑیوں کا منظر بہت شاندار نظر آتا ہے۔

الشقیف کے جنوب میں صور کی مشرقی جانب قلعہ تبنین کے کھنڈر واقع ہیں۔ یہ قلعہ طبریہ کے امیر نے ۱۱۰۵ء میں اس غرض سے بنایا تھا کہ صور اردگرد کے علاقے سے منقطع ہو جائے۔[2] اس کا نام لاتورون[3] رکھا گیا۔ اٹھارھویں صدی میں ایک بدوی باغی ظاہر العمر نے از سرِ نو تعمیر کر کے اس سے کام لیا۔ الشقیف سے چند میل شمالی جانب وہ قلعہ واقع ہے، جسے عرب مصنفین شقیف تیرون[4] کہتے ہیں

---

[1] اس قلعے کا ذکر آگے آئے گا۔ اس کے متعلق اپنے مزید معلومات کے لیے مصنف نے مختلف فرانسیسی کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔

[2] ولیم صوری جلد اوّل صفحہ ۴۶۹۔ [3] Leteron، پرانی فرانسیسی زبان میں اس کے معنی ہیں 'الگ تھلگ پہاڑی'۔ تبنین ارامی زبان کے لفظ تفنیس سے نکلا ہے، جو ایک قدیم نوآبادی کا نام تھا۔ ایبل جلد اوّل صفحہ ۳۰۹۔

[4] ولیم صوری جلد دوم صفحہ ۳۱۲، وہاں اسے غارِ صور قرار دیا گیا ہے۔ اسی سے کلاسیکی عربی نام نکلا۔

Marfat.com

اور اس کا موجودہ نام قلعہ نیحا ہے۔ ۱۲۵۷ء میں صیدا اور بیوفورٹ کے امیر نے قلعہ نیحا نیز بعض دوسرے پہاڑی قلعے ٹیوٹانی جنگجوؤں کو دے دیئے[1]۔ یہاں ٹھوس چٹان کاٹ کر تین کمرے بنائے گئے تھے ستر ھویں صدی میں فخر الدین ثانی نے یہاں پناہ لی اور حوالگی سے پیشتر ترک فوج نے دو مہینے تک اس کا محاصرہ جاری رکھا۔ صلیبی دور کے قلعوں میں سب سے بلند المنیطرہ[2] ہے، جو افقہ کے نزدیک ہے۔ یہ قلعہ بعلبک و جُبیل کے درے کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ عربوں نے بنایا تھا۔ طغتگین نے اسے ۱۱۰۹ء میں فرنگیوں کے حوالے کر دیا[3]۔

البترون اور طرابلس کے درمیان ایک بلند ٹیلا سمندر میں بڑھا ہوا ہے۔ اس پر قلعہ مسیلحہ کے کھنڈر واقع ہیں، لیکن اس کی اصل اب تک گمنامی کے پردے میں مستور ہے۔ نام عربی ہے یعنی مسلحہ (جائے اسلحہ) کی تصغیر اور طرزِ تعمیر بھی عربی ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دریائے عاصی پر شیزر اور جبل نُصیریہ میں مصیاف[4] سے ملتا جلتا ہے، مگر عربی یا لاطینی وقائع میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور اس پر کوئی کتبہ بھی نہیں، جو اس کی سرگزشت کی کلید بن سکے۔ اگرچہ وہاں عام لوگ بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں تاہم لبنانی قلعوں میں یہ سب سے زیادہ غیر معروف ہے۔ اس کی بیرونی دیواریں بھر بھرے پتھر کی ہیں اور پوری طرح محفوظ ہیں۔ دلاروک[5] نے اٹھارھویں صدی کے اوائل میں یہ مقام دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اسے فخر الدین نے تعمیر کرایا، لیکن غالباً یہ پیشتر کا ہے۔ برک ہارٹ[6] ایک صدی بعد یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مقام ایک مرتبہ متاولہ کے قبضے میں آ گیا تھا۔

## مُسلمانوں کا ردِّ عمل۔ زنگی

صلیبی جنگجو استحکامات کے ذریعے سے اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے اور میجینو لائن والی ذہنیت دفاع کو نشوونما دے رہے تھے۔ اُدھر مسلمانوں میں جذبۂ عمل جوش زن ہو رہا تھا۔ صلیبیوں کے خلاف ردّ عمل ایک کرنجی آنکھوں والے ترک سے ہُوا، جو موصل کا اتابک تھا یعنی عماد الدّین زنگی۔ یہ سلجوقیوں کے ایک ملازم غلام کا بیٹا تھا۔ پہلے موصل کا حاکم بنا۔ وہاں قدم جما لیے تو شام کے خلاف پیشقدمی شروع کی۔ ۱۱۲۸ء میں وہ حلب پر قابض ہو گیا۔ آئندہ سال حماۃ، حمص اور بعلبک اس کے دائرہ اختیار میں آ گئے۔ بعلبک کی فوج نے قدیم قلعے میں بیٹھ کر سخت مقابلہ کیا۔ اگرچہ وہ عفو کے وعدے پر حوالگی کے لیے آمادہ

---

[1] مرے کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۲۸۰، نیز دوسری فرانسیسی کتاب صفحہ ۵۱۳۔ [2] Lemonestre

[3] سبط ابن الجوزی۔ [4] اس کے آثار کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے برشم اور فنا ٹیو صفحہ ۱۱۳-۱۱۹۔

[5] De-La-Roque، صفحہ ۱۶۷۔

[6] Burckhardt صفحہ ۱۶۸۔

Marfat.com

ہوئی تھی[1]۔ لیکن عماد الدین نے حوالگی کے بعد اس فوج کو اذیتیں دے دے کر اور سُولی چڑھا چڑھا کر ختم کر دیا۔ یہ واقعہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بن گیا اور معلوم ہو گیا کہ مقابلہ کرنے والے مسیحی ہوں یا مسلمان، انھیں رحم کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔ اب اسلامی قوت میں اتحاد و یک جہتی کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں۔ دوآبہ دجلہ و فرات کا شمالی حصہ اور شمالی شام ایک حکومت کے ماتحت آ گئے۔ الرّوحا بیچ میں حائل تھا۔ ۱۱۴۴ء میں یہاں کی لاطینی ریاست پر حملہ کیا گیا اور چار ہفتے کے محاصرے کے بعد الرّوحا جوسلن ثانی سے بزور چھین لیا گیا۔ یہاں سب سے پہلے فرنگی ریاست قائم ہوئی تھی اور اسی کو سب سے پہلے سقوط کی منزل پیش آئی۔ الرّوحا کا سقوط لاطینیوں کے انجام کا آغاز تھا، لیکن انجام ابھی خاصا دور تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ منظم یورشیں جاری ہو چکی تھیں اور زنگی ان یورشوں کا پہلا علمدار تھا۔ اسی نے لاطینیوں پر سب سے پہلے کاری ضربیں لگائیں۔ ان ضربوں کا سلسلہ اس کے فرزند نور الدین کے عہد میں جاری رہا۔ پھر صلاح الدین، بیبرس اور اس کے مملوک جانشینوں کے ماتحت ضربوں کی مؤثریت بہت بڑھ گئی، یہاں تک کہ فرنگیوں کو بوریا بستر باندھ کر اس سرزمین سے نکل جانا پڑا۔

۱۱۴۶ء میں اسلامی مقاصد کی علمداری کا منصب زنگی کے خلف الرشید اور جانشین نور الدین محمود کے حوالے ہوا۔ نور الدین کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ اس نے دمشق کو فتح کر لیا، جو طغتگین کے ایک جانشین کے قبضے میں تھا اور وہ عماد الدین زنگی کے محاصرے کا مقابلہ کامیابی سے کر چکا تھا[2]۔ یوں نور الدین کی سلطنت اور لاطینی علاقے کے درمیان سے آخری روک دور ہو گئی اور اسلامی سلطنت دجلہ کے بالائی کناروں سے دریائے اُردن کے سرچشمے تک پہنچ گئی۔ سالہاسال تک دمشق نے یروشلم سے بڑے خوشگوار تعلقات قائم رکھے، بلکہ مختلف اوقات میں مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کی امداد کرتا رہا[3]۔ محض دمشق ہی نہیں بلکہ حوران و فلسطین کے دوسرے شہر بھی، مثلاً عجلون، بُصریٰ، بانیاس اسمٰعیلیوں کے ماتحت لاطینیوں سے امداد لیتے رہتے تھے[5]۔ بادیۂ شام کے بدوی مثلاً قبیلۂ طے کی شاخ بنی فضل بعض مواقع پر فرنگیوں کے ساتھ اور بعض مواقع پر لاطینیوں

---

[1] جمال الدین ابن واصل کی کتاب مفرّج القلوب فی اخبار بنی ایوب صفحہ ۸۶، ابن قلانسی صفحہ ۲۷۹ - ۲۸۰ ✦ [2] Jos(s)elin II ✦ [3] ابن الاثیر جلد یازدہم صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱ ✦ [4] ابن القلانسی (جو اس وقت حکومتِ دمشق کا ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا) صفحہ ۳۰۸، ۳۰۹، ولیم صوری جلد دوم صفحہ ۷۶ - ۷۷، صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸، صفحہ ۲۲۴، ابو شامہ کتاب الرّوضتین فی اخبار الدّولتین جلد اوّل صفحہ ۷۷ ✦ [5] ابن القلانسی صفحہ ۲۸۹، ۲۹۰، صفحہ ۳۱۲، صفحہ ۳۱۶، ابو الفدا جلد سوم صفحہ ۲ - ۳، ابن خلدون جلد ششم صفحہ ۹ بیعد ✦

Marfat.com

کے ساتھ ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑ چکے تھے۔ یروشلم کی لاطینی فوج میں ایک تیز رفتار رسالہ تھا، جس کا نام ترک پولی (ترکوں کے فرزند) تھا۔ یہ زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ پیادہ فوج میں ایک لشکر رومنیوں کا تھا اور ایک جمعیت مارونی تیر اندازوں کی تھی[1]۔

## صلاح الدین کا ورود

صلیبی جنگجوؤں کے خلاف تیسرے مجاہد نے، جس کا درجہ سب سے اونچا تھا، نورالدین زنگی کے ملازم کی حیثیت میں زندگی شروع کی تھی، لیکن جلد اس نے نورالدین کی جگہ لے لی۔ الملک الناصر السلطان صلاح الدین یوسف بن ایوب تکریت میں پیدا ہوا (۱۱۳۸ء) جو دجلہ زیریں کے کنارے واقع ہے۔ اس کے والدین کُرد تھے۔ وہ ایک سال کا تھا، جب اہل خاندان کے ساتھ بعلبک میں منتقل ہو گیا۔ عمادالدین زنگی نے صلاح الدین کے والد ایوب کو بعلبک کا کماندار بنا دیا تھا۔ ابتدائی دور میں یوسف کو دینیات سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے چچا اسدالدین شیرکوہ کو ۱۱۶۴ء میں فاطمیان مصر کے خلاف فوج دے کر بھیجا، تو یوسف بادل ناخواستہ چچا کے ساتھ گیا۔ جب چچا نے اسے ساتھ جانے کی دعوت دی تو صلاح الدین نے کہا: ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل میں خنجر بھونک دیا گیا ہے[2]۔ نورالدین زنگی کو فاطمیان مصر کی حالت زار کا پورا اندازہ تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ان کے زیر اقتدار مصر کے دروازے لاطینیوں کے لیے کھلے پڑے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ مصر پر قابض ہو کر لاطینیوں کو چکی کے دو پاٹوں میں پیس کر رکھ دے۔ مصر جاتے ہی سے صلاح الدین کے لیے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس کے پیش نظر تین مقصد تھے۔ اول یہ کہ مصر میں شیعی حکومت کی جگہ سُنی حکومت کی داغ بیل ڈالے۔ دوم مصر و شام کو ایک حکومت کے ماتحت متحد کر دے۔ سوم فرنگیوں کے خلاف جہاد کو آخری منزل پر پہنچائے۔ پہلا مقصد انتہائی آسانی سے حاصل ہو گیا۔ اس نے مصر پہنچ کر وزارت پر قبضہ کر لیا، جو فاطمی خلافت کا سب سے بڑا منصب تھا۔ پھر دوسرے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انتظار میں بیٹھ گیا۔ ۱۱۷۱ء میں ۲۱ سالہ فاطمی خلیفہ عاضد پر نزع کی حالت طاری ہوئی تو صلاح الدین نے حکم دے دیا کہ نماز جمعہ میں فاطمی خلیفہ کے نام کی جگہ عباسی خلیفہ المستضی کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ یہ معاملہ پُرامن طریق پر سادگی سے انجام پایا تو کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ اس طرح سالار فوج نے جو مخلص سُنی تھا، حسن تدبیر سے نہ محض ایک حکمران خاندان کو ختم کر دیا،

[1] دِ ب صفحہ ۹۴، جیکوبے دا وتری کی تاریخ یروشلم مترجمہ سٹیورٹ صفحہ ۶۷۔ [2] ابوشامہ جلد اول صفحہ ۱۵۵، ابن الاثیر جلد یازدہم صفحہ ۲۲۳، صفحہ ۲۲۶، ابوالفداء جلد سوم ۴۷۔

بلکہ ملتِ اسلامیہ میں ایک بہت بڑے تفرقے کا امکان بھی مٹا دیا۔ ساتھ ہی اسلام کے فاتحانہ اقدامات جاری ہو گئے۔

تین سال بعد نور الدین محمود خناق میں مبتلا ہوا اور صرف چھپن سال کی عمر پا کر دمشق میں فوت ہو گیا۔ صلاح الدین نے اس کے یازدہ سالہ بیٹے اسمٰعیل سے شام کا تخت چھین لیا۔ خلیفۂ بغداد نے بے توقف حکومتِ مصر و شام کی مسند صلاح الدین کے حوالے کر دی۔ اس حکومت میں مصر و شام کے علاوہ سارا نیوبیا، لوبیا، حجاز، یمن اور دوابۂ دجلہ و فرات کا بالائی حصہ شامل تھے۔ یوں نور الدین محمود اور فاطمیوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر ایوبی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ نور الدین محمود کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے فرنگیوں کو نرغے میں لے لے۔ پھر ان پر آخری مہلک ضرب لگائے۔ اس منصوبے کو اس کے زیادہ نامور جانشین نے آہستہ آہستہ لباسِ عمل پہنایا۔ پہلے دو مقصد حاصل ہو چکے تھے اور صلاح الدین تیسرے کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔

لاطینی بادشاہی کے لیے خطرے کا گھڑیال اس وقت بجا، جب ۳۔ جولائی ۱۱۸۷ء کو قرونِ حطین میں صلاح الدین سے جنگ ہوئی۔ حطین ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ تھا، جس کی آتش باری بہت پہلے سرد ہو چکی تھی۔ یہ دہانہ بحیرۂ طبریہ سے ایک ہزار سات سو چھ فٹ بلند تھا۔ اس مقام کے قریب ہی حضرت مسیح نے وہ وعظ فرمایا تھا، جو پہاڑی کا وعظ کہلاتا ہے۔ فرنگی فوج نے بھاری ہتھیار پہن رکھے تھے۔ گرما کی شدت نے اسے سخت پریشان کر دیا تھا اور طویل سفر نے اسے تھکا بھی دیا تھا اور پیاس سے بھی دم نکلا جا رہا تھا۔ مسلمان افواج نے بہت ہلکے ہتھیار پہن رکھے تھے۔ انھوں نے فرنگی فوج کو نرغے میں لے کر تیروں کی بارش اور سنگباری و آتشباری سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بیس ہزار سوار دلی اور پیادوں میں سے صرف چند جان بچا کر نکل سکے۔ اسیرانِ جنگ کی لمبی قطار کا سرخیل گائی دلوسینا[1] شاہِ یروشلم تھا۔ بلند حوصلہ سلطان نے اس سے بڑا شریفانہ برتاؤ کیا، لیکن اس کا ساتھی ریجینالڈ ساکن شاطی لون[2] امیر الکرک بالکل جداگانہ سلوک کا مستحق تھا کیونکہ اس نے معاہدے کر کر کے بار بار توڑے اور مسلم زائرین و حجاج پر چھاپے مارتا رہا۔ جو تجارتی قافلے اس کے قلعے کے پاس سے گزرتے رہے، انھیں بھی لوٹتا رہا بلکہ ایک مرتبہ حرمین شریفین پر بھی یورش کا منصوبہ

---

[1] Guy-de-Lusignan

[2] Chatillon

Marfat.com

باندھنے میں اسے تامّل نہ ہوا تھا۔ صلاح الدّین اس دشمنِ اسلام کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کا حلف اُٹھا چکا تھا۔ یہ حلف پورا کردینے کا موقع سامنے آگیا تھا۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی کو پینے کے لیے ٹھنڈا پانی دے دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں کے آدابِ مہمانداری کے مطابق اس وجہ سے سزائے قتل نہیں دی جاسکتی تھی، لیکن یہ صحیح نہیں۔ پانی خود بخود نہیں دیا گیا تھا بلکہ ریجینالڈ نے اس کے لیے گزارش کی تھی اور وہ بے تکلّف عربی بولتا تھا[1]۔

حطّین کے میدانِ جنگ میں صرف یروشلم ہی نہیں بلکہ ملحقہ ریاستوں کی فوج بھی تباہ ہوگئی۔ طبریّہ نے حوالگی قبول کرلی۔ ریمان ثالث، امیرِ طرابلس اور امیرِ جلیل کی بیوی نے شوہر کی طرف سے طبریّہ کی مدافعت کی۔ سلطان صلاح الدّین نے اس سے بڑا اچھا برتاؤ کیا، جس کی وہ مستحق تھی اور اسے گھربار کے ساتھ طرابلس چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اب اسلامی فوج کا بڑا حصہ عکہ پر بڑھا، جہاں تجارتی مال کے وسیع انبار موجود تھے، مثلاً ریشم، معدنیات، جواہرات اور اسلحہ۔ یہ انبار مسیحی تاجر چھوڑ گئے تھے۔ انھیں مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کردیا گیا اور شہر کے حفاظتی انتظامات نئے سرے سے درست کردیے گئے۔ مختلف جیش نابلس، تبنین اور شمالی شام کے دوسرے مقامات کی طرف بھیجے گئے، کہیں بھی مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا۔ یافہ پر حملہ کرکے اسے مسخّر کرلیا گیا اور اس کے لاطینی باشندے —— مرد، عورتیں اور بچّے —— بردہ فروشی کی منڈی میں فروخت کردیے گئے۔ مشہور مؤرخ ابن الاثیر[2] نے بھی حلب میں ایک کنیز خریدی تھی۔ یہ ایک جوان عورت تھی، جس کی گود میں ایک سال کا بچّہ تھا۔ اس کا شوہر، چھ بھائی اور دو بہنیں قتل ہوچکی تھیں۔ ابن الاثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک اور کنیز اپنے حلبی آقا کے ساتھ اس کے ایک دوست کے گھر گئی تو اُس گھر میں اپنی بہن کو دیکھ کر سراپا حیرت بن گئی، دونوں بہنیں گلے ملیں اور اتنا روئیں کہ ہوش وحواس کھو بیٹھیں۔ دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ خاندان کے دوسرے لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ جنگِ مقدّس کی روح بظاہر مسیحیوں کے کیمپ کو چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

اب لبنان کے ساحلی شہروں پر اقدام کا راستہ کھلا تھا۔ حطّین کے میدان سے جو لوگ

---

[1] ابو شامہ، جلد دوم صفحہ ۷۵ بعد؛ ابن الاثیر جلد یازدہم صفحہ ۳۵۲ - ۳۵۵، بہاء الدّین ابن شدّاد، النوادر السلطانیہ والمحاسن الیوسفیہ: ترجمہ صلاح الدّین یا سلطان یوسف کو کیا پیش آیا صفحہ ۴۲، ۴۳، صفحہ ۱۱۰، ۱۱۷، عماد الدّین الاصفہانی، الفتح القسّی والفتح القدسی صفحہ ۲۲ - ۲۸۔

[2] جلد یازدہم، صفحہ ۳۵۷۔

بچ کر نکلے تھے، وہ صور پہنچ گئے تھے۔ خشکی کی جانب اس شہر کی حفاظتی دیواریں بڑی مستحکم تھیں صلاح الدّین اس کے پاس سے گزر گیا۔ صیدا نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور اسے منہدم کر دیا گیا۔ اس کے حاکم ریجینالڈ نے بیوفورٹ میں پناہ لی۔ بیروت ۶۔ اگست کو حوالے ہوا۔ جبیل کے حاکم نے اس شرط پر شہر حوالے کیا کہ خود اسے رہا کر دیا جائے، چنانچہ اسے رہا کر دیا گیا اُس وقت تک پورے علاقے میں صرف طرابلس اور صور مسیحیوں کے پاس رہ گئے۔

یروشلم پر اسی سال ۲۔ اکتوبر کو قبضہ کر لیا گیا۔ یہاں کی آبادی سے جو سلوک ہوا، وہ اس سے بدرجہا بہتر تھا، جو اٹھاسی سال پیشتر فرنگیوں نے کیا تھا۔ ۱۱۸۹ء کے آخر تک طرطوس، جبلہ، لاذقیہ، عسقلان اور غزّہ بھی مسیحیوں سے واپس لے لیے گئے۔ انطاکیہ کو بالکل نہ چھیڑا گیا[1]۔ اسی سال بیوفورٹ کا محاصرہ ہوا تو ریجینالڈ حاکم صیدا خود صلاح الدّین کے خیمے میں پہنچ گیا۔ وہ عربی جانتا تھا اور ادبیات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو سے صلاح الدّین کو مسحور کر لیا، ساتھ ہی کہا: تین مہینے میں قلعہ آپ کے حوالے کر دوں گا اور خود مسلمان ہو جاؤں گا، لیکن مدّتِ متارکہ کو استحکامات کی تقویت میں صرف کرتا رہا۔ جب اسے ایک دستے کی نگرانی میں قلعے کے دروازے پر لے گئے تو اس نے عربی میں حکم دیا کہ قلعہ حوالے کر دیا جائے اور فرانسیسی میں کہہ دیا کہ خوب مقابلہ کرو، مگر مسلمانوں کو بھی چکما دینا آسان نہ تھا۔ بیوفورٹ کی ناکابندی کر لی گئی اور ریجینالڈ کو قید کر کے دمشق بھیج دیا گیا۔ ۱۱۹۰ء[2] میں اہلِ قلعہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں وہ جنگجو مقیم تھے، جو ٹیمپلر[3] کہلاتے تھے۔ یہ نام ہیکل سلیمانی سے لیا گیا تھا، جس کے قریب یروشلم میں ان لوگوں کی قیام گاہ تھی۔ یہ نظام ۱۱۱۹ء میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ ارضِ مقدّس کے مسیحی زائروں کی حفاظت کی جائے۔

**عکّہ کے لیے جنگ**

قدس شریف (یروشلم) کے چھن جانے سے یورپ میں بیداری کی نئی لہر دوڑی اور تازہ صلیبی مہم کا انتظام کیا گیا، جس میں یورپ کے تین نہایت زبردست بادشاہوں نے حصّہ لیا۔ اوّل فریڈرک باربروسا (سرخ ریش) شاہ جرمنی دوم

[1] المقریزی کتاب السّلوک فی معرفتہ الملوک جلد اوّل حصّہ اوّل صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱، عمادالدّین صفحہ ۱۳۶ ببعد۔
[2] بہاء الدین، ابوشامہ صفحہ ۱۳۹۔۱۴۰۔
[3] Templars۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، یہ جنگجوؤں کا ایک گروہ تھا، جو مسیحی زائروں کی حفاظت کے لیے منظم ہوا تھا۔ ہیکل سلیمانی کو ٹمپل کہتے تھے۔ یہ لوگ اس کے قریب رہتے تھے، لہٰذا ٹیمپلر مشہور ہوئے۔ دوسرا گروہ ہاسپٹیلر کا تھا۔ یہ لوگ زائروں کے لیے قیام و طعام کے انتظام کی غرض سے منظم ہوئے تھے، پھر جنگوں میں حصہ لینے لگے۔

Marfat.com

فلپ آگسٹس شاہِ فرانس، سوم رچرڈ اوّل شیر دل شاہِ انگلستان۔ اس مہم سے مشرق و مغرب کے شاندار ڈرامے کا نیا ایکٹ شروع ہوتا ہے جس میں صلاح الدین اور رچرڈ نے ہیرو کا کردار ادا کیا۔ فرنگیوں کا فیصلہ یہ ہوا کہ چھنے ہوئے علاقوں کی بازیافت کے لیے عکّہ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے چنانچہ جو فوج مہیا تھی، اُسے ساتھ لے کر عکّہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یورپ سے نئے جنگجو پہنچے تو وہ بھی اس محاصرے میں شامل ہو گئے۔ فریڈرک باربروسا ایشیائے کوچک کے ایک دریا میں ڈوب گیا اور اس کی فوج بکھر گئی۔ سابقہ مواقع کی طرح فرنگیوں کو دو سہولتیں حاصل تھیں۔ اوّل بحری بیڑے کا تعاون، دوم محاصرے کے لیے اعلیٰ توپ خانے کا وجود۔ زیرِ غور موقع پر پیسا کے بیڑے نے فرنگیوں کو مدد دی۔ ۲۷۔ اگست ۱۱۸۹ء سے ۱۲۔ جولائی ۱۱۹۱ء تک کشمکش جاری رہی۔ اسے قرونِ وسطیٰ کے فوجی وقائع میں بڑا اہم واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ صلاح الدین بڑی تیزی سے محصور فوج کی امداد کے لیے پہنچا اور محاصرین کے عقب میں خیمہ زن ہو گیا۔ اس نے تیراکوں اور نامہ بر کبوتروں کے ذریعے سے محصورین کے ساتھ روابط قائم رکھے۔ بیروت سے ایک جہاز گندم، گوشت، پنیر اور پیاز کا بھر کر بھیجا۔ اس کے عرشے پر نمائش کے لیے سؤر کھڑے کر دیے۔ اگرچہ جہاز کے تمام ملاح مسلمان تھے، مگر انھیں فرنگیوں کا سا لباس پہنا دیا گیا۔ داڑھی مونچھیں مُنڈی ہوئی تھیں اور گلے میں صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ اس طرح اہلِ شہر تک خوراک بہم پہنچائی، جس کی سخت ضرورت تھی۔ صلاح الدین نے النّاصر خلیفۂ بغداد سے بھی امداد کی درخواست کی، مگر اس درخواست کا نتیجہ ویسا ہی نکلا، جیسا النّاصر کے باپ کے زمانے میں ابنِ عمّار کی درخواست پر نکلا تھا۔[۱] آخر شہر کو حوالگی قبول کرنی پڑی۔ صلاح الدین دفاعی جنگ پر مجبور ہو گیا۔ فرنگیوں نے عسقلان بھی لے لیا۔ یافا کو مستحکم کر لیا اور الرّملہ پر بھی وہ قابض ہو گئے۔ ساتھ ہی یروشلم پر حملے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲۔ نومبر ۱۱۹۲ء کو صلح ہو گئی، جس کے مطابق قرار پایا کہ صور سے جنوب میں ساحل پر لاطینیوں کا قبضہ ہو اور اندرونی علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت رہے، البتّہ مسیحیوں کے لیے زیارت کا حق تسلیم کر لیا گیا۔[۲] فلسطین اس طرح تقسیم ہو گیا جس طرح ۱۹۴۸ء میں تقسیم ہوا۔ رچرڈ دوبرہ سے لوٹ گیا۔ صلاح الدین نے آئندہ سال مارچ میں بہ عارضہ بخار وفات پائی۔ صرف پچپن سال کی عمر تھی۔ اُس وقت سے وہ تاریخ اور افسانے میں عربی شجاعت و جوانمردی کا ایک بہترین نمونہ چلا آتا ہے۔ اس کا مزار جامع اموّیہ کے قریب دمشق کی نہایت محترم زیارت گاہوں میں سے ہے۔

---

[۱] بہاءالدین جلد سوم صفحہ ۱۷۸، ابوشامہ جلد دوم صفحہ ۱۶۰۔ ۱۹۱ [۲] بہاءالدین جلد سوم صفحہ ۳۲۰۔ ۳۲۲۔ (مترجم) زیارت کا حق کبھی زائل نہ ہوا۔ صلیبیوں کے خوفناک تعصب اور ظلم و جور نے سب کو ان کا دشمن بنا دیا۔

Marfat.com

## صلاح الدّین کے جانشین

صلاح الدّین نے جو وسیع سلطنت فراہم کر لی تھی، وہ اس کی وفات سے کچھ مدّت بعد اس کے بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک بیٹے کے حصّے میں حلب آیا، دوسرے کے حصّے میں دمشق اور تیسرے کے حصّے میں قاہرہ۔ اِس ہنگامے میں صلاح الدّین کا چھوٹا بھائی الملک العادل سیف الدّین (۱۱۹۹ء-۱۲۱۸ء) سب سے زیادہ مستفید ہوا۔ اس کی حکومت مصر کے علاوہ شام کے بڑے حصّے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہی شخص ہے، جسے لاطینی وقائع نگار سفادِن[1] لکھتے ہیں۔ رچرڈ نے اسی سے اپنی بہن کی شادی کر دینے کی پیشکش کی تھی۔ شرط یہ تھی کہ عکّہ اور یروشلم بہ طور تحفۂ تزویج ان کے حوالے ہو جائے۔ اس طرح مسلمانوں اور مسیحیوں کا جھگڑا اختتام کو پہنچے۔ العادل نے مصالحت کی پالیسی پر عمل کیا یعنی فرنگیوں سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں اور ان کے وطنوں سے تجارتی روابط قائم رہیں۔ العادل سے ایوبیوں کی کئی شاخیں چلیں، جو مصر، دمشق اور دوآبہ دجلہ و فرات پر حکمران رہیں۔ دوسری شاخیں حما[2]، حمص اور یمن میں تھیں۔ پھر خاندان کی مختلف شاخوں میں کشمکش شروع ہو گئی اور صلاح الدّین نے جو کچھ فرنگیوں سے چھینا تھا، وہ آہستہ آہستہ پھر اُن کے پاس چلا گیا۔ بیروت دس سال تک مسلمانوں کے قبضے میں رہنے کے بعد ۱۱۹۷ء میں گیا[3]، جبیل ۱۱۹۸ء میں، تبنین اور یروشلم ۱۲۲۹ء میں۔ یافا اور ناصرہ ۱۲۰۴ء میں، الشّقیف، عیدا اور صفد ۱۲۴۰ء میں اور طبریّہ ۱۲۴۴ء میں۔ الشّقیف، عیدا اور صفد الصّالح اسمٰعیل ایوّبی سلطانِ دمشق نے اس غرض سے لاطینیوں کو دیے تھے کہ الصّالح ایوّبی سلطانِ مصر کے مقابلے میں مدد دی جائے، جس سے اسمٰعیل نے دمشق کا تخت چھینا تھا۔ بظاہر مسلمان اُس وقت تک نہ صرف سیاسی وحدت بلکہ حسِ اتّحاد اور روحِ جہاد بھی کھو چکے تھے۔

فرنگیوں کی حالت بھی قطعاً بہتر نہ تھی۔ جینوآ اور وینس والوں کے درمیان جھگڑے تھے۔ جنگجوؤں میں سے ٹیمپلر اور ہاسپیٹلر ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ لیڈروں کے درمیان کشمکش تھی۔ ایسے ماحول میں صورتِ حال سے پورا فائدہ اُٹھانے کا کون سا امکان تھا؟ ہاسپیٹلر، جنھیں سینٹ جان ساکن یروشلم کے بہادر کہا جاتا تھا، ایک ابتدائی تنظیم سے پیدا ہوئے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ زائروں کے لیے ہسپتال نہیں بلکہ ہوسٹل مہیّا کیے جائیں۔ پھر یہ لوگ جنگی مقاصد کے لیے وقف ہو گئے۔ ٹیمپلر اور ہاسپیٹلر دونوں

---

[1] Saphadin، سیف الدّین کی تخریب ہے۔ [2] مشہور جغرافیہ نویس اور مورّخ ابوالفدا (۱۲۷۳ء-۱۳۳۲ء) جس کے حوالے بار بار آئے ہیں، اسی خاندان سے تھا۔ [3] صالح بن یحییٰ صفحہ ۲۳، ۲۵ لکھتا ہے کہ اسامہ بن منقذ قلعۂ شیزر کا حاکم تھا اور صلاح الدّین کا دوست تھا۔ اس نے کتاب الاعتبار میں بیان کیا کہ بزدل گورنر نے لڑائی کے بغیر بیروت حوالے کر دیا، لیکن اسامہ اس واقعے سے نو سال پیشتر مر چکا تھا۔

Marfat.com

راہبیت کے حلف اٹھاتے تھے۔ جب ان میں جھگڑے شروع ہوئے تو ایک دوسرے کے خلاف مسلمانوں کی امداد حاصل کرنا ان کے لیے قطعاً کوئی غیر معمولی معاملہ نہ تھا، جس طرح اُس زمانے کے مسلمان مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کی امداد حاصل کرنا غیر معمولی نہیں سمجھتے تھے۔ صلیبی جنگوں کی روح حد درجہ کمزور ہو رہی تھی کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لوئی نہم شاہِ فرانس نے صلیب کا نشان بند کر دیا۔ اس سے پھر تحریک میں تازگی پیدا ہو گئی۔ لوئی نہم خیالی منصوبوں میں گم رہنے والا آدمی تھا۔ اس نے خود اپنے وطن میں نظام حکومت کی اصلاح کو قربان کر دیا اور ملک سے باہر بڑے بڑے منصوبوں پر عمل پیرا ہو گیا۔ مصر اس وقت اسلامی اقتدار کا مرکز تھا۔ لوئی نے اندازہ کر لیا کہ اس ملک کو اصل مسئلے کے حل میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس پر حملے کا فیصلہ کر لیا۔ شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ رہائی کے بعد فروری ۱۲۵۰ء میں ارضِ مقدس پہنچا اور آئندہ چار سال کی زیادہ تر مدت عکہ میں بسر کی۔ شہر کی پہلی حیثیت بحال کر دی اور اسے بخوبی مستحکم بنا دیا۔ شہر کے جنوبی حصے میں پہلے صلیبیوں نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اسی میں رہنے لگا اور اس کا نام شاطو دسینت لوئی پڑ گیا۔ آج کل اسے قلعۃ المرّہ کہتے ہیں۔ لوئی نے قیساریہ اور یافہ کے استحکامات بھی بحال کر دیئے[1]۔ باقی اُس کا زیادہ تر وقت گفت و شنید میں صرف ہوا۔ اس کے پاس لڑنے والے آدمی صرف چودہ سو تھے۔ لوئی عکہ میں تھا جب حشیشیوں کے پیشوا (مقیم مصیاف) کی طرف سے ایک وفد آیا، جس کے پاس تحائف تھے، مثلاً زیورات، بلور کا ایک ہاتھی اور ایک زرافہ، عنبر، چوسر اور شطرنج، ایک انگشتری اور ایک قمیص۔ انگشتری سے مراد یہ تھی کہ آئندہ کے لیے حشیشی اور مسیح ایک سمجھے جائیں۔ قمیص کا مطلب یہ تھا کہ شاہِ فرانس حشیشی پیشوا کے لیے اتنا قریب ہے گویا دو قالب یک جان۔ لوئی نے بھی جواہرات، گلناری پارچات، زرّیں پیالے، روپہلی لگام وغیرہ چیزیں بھیجیں[2]۔ لوئی اُس زمانے کی شجاعت کا پیکر تھا۔ میدانِ جنگ میں بہادرانہ لڑتا۔ پریشانیوں کا دور آتا تو استقامت کو ہاتھ سے نہ دیتا۔ وہ بڑا پرہیزگار مسیحی تھا۔ اکثر روزے اور نماز میں مشغول رہتا۔ سفر میں بھی پادری گھوڑوں پر سوار اس کے ساتھ رہتے، جو مذہبی ترانے گاتے۔ تمام صلیبی رؤسا میں بہترین اور پاکیزہ ترین کردار اُسی کا تھا۔ ۱۲۹۷ء میں اسے بزرگ تسلیم کیا گیا۔ یورپی تاریخ میں اسے قرونِ وسطیٰ کا ایک مثالی بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔

**ایوبیوں کی جگہ مملوک**

تیرھویں صدی کے وسط میں دو ایسے واقعات پیش آئے، جن کی اہمیت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اوّل جس سلطنت کی بنیاد

---

[1] جائن ول، Joinville ‎ [2] ایضاً۔

صلاح الدّین نے رکھی تھی۔ اس کی جگہ مملوک امرا نے لے لی۔ دوسرا واقعہ یہ تھا کہ پورے مغربی ایشیا کو ایک نئے دشمن نے تباہی خیز حملوں کا ہدف بنا لیا۔ یہ تاتاری تھے۔ مملوک یا غلام خاندان ترکی، تاتاری اور چرکسی فوجی افسروں پر مشتمل تھا، جو ۱۲۵۰ء سے عثمانی ترکوں کی آمد (۱۵۱۷ء) تک حکمران رہے۔ وہ لوگ روس کی اسلامی سرزمینوں یا قفقاز کی منڈیوں میں خریدے گئے تھے اور الملک الصّالح (۱۲۴۰ء اور دوبارہ ۱۲۴۵ء۔ ۱۲۴۹ء) نے انھیں ذاتی محافظ فوج میں بھرتی کیا تھا۔ مملوکوں سے حکمرانوں کا سلسلہ چلا، جو دو حصّوں میں منقسم ہے۔ اوّل بحری مملوک (۱۲۵۰ء۔ ۱۳۹۰ء) یہ نام انھیں دریائے نیل[۵] سے ملا، جس کے ایک جزیرے میں ان کی بارکیں تھیں، دوم بُرجی مملوک (۱۳۸۲ء۔ ۱۵۱۷ء)۔ یہ صلاح الدّین کے تعمیر کردہ قلعۂ قاہرہ میں رہتے تھے۔ پہلا مملوک حکمران عزّ الدّین ایبک نام ایک ترک تھا (۱۲۵۰ء۔ ۱۲۵۷ء) جس نے الملک الصّالح کی بیوہ شجر الدُّر سے نکاح کر لیا۔

## تاتاری یورش

تاتاریوں نے وسط ایشیا کی سطوح مرتفع سے باربار جو حملے کیے، ان کی وجہ سے اسلامی حکومت پر تباہی و بربادی کا ایسا دور آیا، جس سے وہ ابھی تک پوری طرح بحال نہیں ہو سکی۔ ان حملوں کا آغاز چنگیز خاں سے ہوا تھا، جو عالمی سلطنت کے معماروں میں سے ایک تھا۔ اس فاتح اعظم نے ۱۲۲۷ء میں وفات پائی۔ اس سے پیشتر اس کی سلطنت مشرقی چین سے ایران کی سرحدوں اور وادیٔ سندھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے پوتے ہلاکو نے وہاں سے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، جہاں دادا نے چھوڑا تھا۔ وہ حشیشیوں کے قلعے الموت اور بغداد میں خلافت عبّاسی کو تباہ کر چکا تھا (۱۲۵۸ء)۔ پھر یہ خطرہ حلب کی دیواروں کے سامنے نمودار ہوا اور اس شہر کے پچاس ہزار باشندے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ پھر حما کی باری آئی۔ بعلبک برباد کر دیا گیا۔ صیدا خاکستر کا انبار بنا دیا گیا۔ اس نے اپنے ایک سالار کو دمشق پر حملے کے لیے بھیج دیا اور خود تیزی سے ایران پہنچا کیونکہ اس کے بھائی کی وفات ہو چکی تھی۔ انطاکیہ لاطینیوں کے قبضے میں تھا۔ یہ عملاً تاتاریوں کا تتمّہ بن گیا۔ پوپ اور لُوئی نہم کی رائے یہ تھی کہ لاطینیوں اور تاتاریوں کے درمیان معاہدہ ہو جانا چاہیے اس طرح مشترک دشمن یعنی مسلمانوں سے رزم و پیکار میں فائدہ رہے گا۔ ایک اور تاتاری سالار مذہباً مسیحی تھا اور کتبغا اس کا نام تھا، جنوبی جانب پیش قدمی کرتا ہوا فلسطین پہنچ گیا۔ نسطوری مشنریوں نے صدیوں پہلے چین میں مسیحیت کی تبلیغ کی تھی۔ مصر کا مملوک حکمران قطز (۱۲۵۹ء۔ ۱۲۶۰ء) تاتاریوں کے خطرے کی روک تھام کے لیے حرکت میں آیا۔ اس کی ہراول فوج کا

---

[۵] بول چال میں اس دریا کو بحر کہتے ہیں۔

کمانڈر بیبرس تھا، وہ بھی الملک الصّالح کا خرید کردہ ایک تاتاری غلام تھا۔ اس نے "زردفام" حملہ آور کو بمقام عین جالوت (نزد ناصرہ) تباہ کن شکست دی۔ تاتاریوں کی بقیۃ السیف فوج کا تعاقب کر کے اسے شام سے باہر نکال دیا گیا۔ مصری فوج فاتحانہ واپس ہوئی تو بیبرس نے راستے میں قطز کو فریب سے قتل کر دیا اور تخت غصب کر کے حکمران بن گیا۔ صلیبیو کے خلاف نئی یورش کا ہیرو بیبرس (۱۲۶۰ء تا ۱۲۷۷ء) بحری مملوکوں میں چوتھا حکمران تھا۔ دراصل وہی مملوک سلطنت کا حقیقی بانی تھا۔ وہ دشت قپچاق (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ لڑکا ہی تھا، جب آٹھ سو درہم کے عوض دمشق کی منڈی میں فروخت ہوا، لیکن خریدار نے یہ کہہ کر سودا فسخ کر دیا کہ لڑکے کی کرنجی آنکھوں میں سقم ہے۔ الملک الصّالح نے حماۃ کے ایک شخص سے اسے خرید لیا۔ تاتاری پیشقدمی کو روک کر وہ شام پر قبضہ کر چکا تھا۔ اسے مصر میں شامل کر لینے کے بعد صلیبیوں کے خلاف جارحانہ اقدامات کا اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس نے محاصروں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا اور لاطینیوں کے مستحکم مقامات یکے بعد دیگرے بالاہتمام تباہ کر دیا گیا۔ فرنگی بیبرس کے خلاف کہیں بھی بڑی فوج فراہم نہ کر سکے۔ ٹیمپلر اور ہاسپیٹلر اس نئے صلاح الدین کی کاری ضربوں کی تاب نہ لا سکے، حالانکہ وہ قلعوں میں بیٹھے تھے اور دفاع کے منصوبے میں انھیں ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیّت حاصل تھی۔ ایک ایک مستحکم مقام مسخّر ہو گیا۔ الکرک ۱۲۶۳ء میں تباہ ہوا۔ قیساریہ اور ارسوف ۱۲۶۵ء میں، صفد ۱۲۶۶ء میں۔ یافا اور شقیف عرنون ۱۲۶۸ء میں، ارسوف ہاسپیٹلروں کا مرکز تھا اور شقیف ٹیمپلروں کا۔ صرف یہ دو مقام پانچ پانچ ہفتے مقابلہ کر سکے۔ بیبرس نے الشّقیف کے خلاف چھبّیس منجنیقیں نصب کر دی تھیں۔[۱] ۱۲۶۸ء میں انطاکیہ بھی فتح ہو گیا۔ لاطینیوں کی یہ دوسری قدیم ترین سلطنت تھی۔ اس کے باشندوں اور لشکر میں سے سولہ ہزار تہ تیغ ہوئے اور علم روایت کے مطابق ایک لاکھ اسیرانِ جنگ قرار پائے۔ انھیں فروخت کیا گیا تو لڑکے کی قیمت بارہ درہم فی کس اور لڑکی کی قیمت پانچ درہم فی کس ملی۔ مالِ غنیمت کی کیفیّت یہ تھی کہ روپیہ پیمانے بھر بھر کر سپاہیوں میں بانٹا گیا۔ شہر میں پرانے قلعے تھے اور اس کے گرجے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ ان سب کو آگ لگا دی گئی۔ یہ ضرب ایسی کاری تھی کہ الشّقیف اس سے آج تک نہ سنبھل سکا۔[۲] ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد بھی فتح ہو گیا۔ یہ بہت

---

[۱] مقریزی: سلوک جلد اوّل حصّہ دوم صفحہ ۵۶۵، ۵۶۶ + ۵۴۲ ابوالفدا جلد چہارم صفحہ ۴-۵۔ مقریزی سلوک جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۵۶۷-۵۶۸، کواترمیئر کی فرانسیسی کتاب تاریخ سلاطین مملوک جلد اوّل حصہ دوم صفحہ ۵۲-۵۴۔ ابن العبری تمہ

زبردست اور مستحکم مقام تھا اور ہاسپیٹلر اس کے محافظ تھے۔ یہ صرف پندرہ دن مقابلہ کر سکا۔ حصن الاکراد امیر طرابلس کی ملکیت تھا اور اس میں بیک وقت دو ہزار فوج ٹھہر سکتی تھی حیثیتی ہاسپیٹلروں کے ساتھی تھے، اُن کے قلعے بھی مسخر ہو گئے۔ مثلاً مصیاف طرطوس ٹمپلروں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور المرکب[1] میں ہاسپیٹلر مقیم تھے۔ انھوں نے دس سال اور دس مہینے کے لیے صلح کر لینے میں ایک لمحے کا بھی توقف نہ کیا۔

## قلاوون۔ ایک قابل جانشین

بیبرس نے جو کام شروع کیا تھا، وہ اس کے ویسے ہی قابل اور پرجوش جانشین قلاوون (۱۲۷۹ء۔ ۱۲۹۰ء) نے بھی جاری رکھا۔ بیبرس کی طرح قلاوون کا مولد بھی دشت قپچاق ہی تھا اور اس نے بھی الملک الصالح کے غلام کی حیثیت میں زندگی شروع کی تھی۔ اس کا عرف الفی مشہور ہوا کیونکہ اسے ایک ہزار دینار میں خریدا گیا تھا۔ بیبرس کا ہفت سالہ بیٹا حکمران بنایا گیا تھا اور قلاوون اس کا اتالیق مقرر ہوا تھا، لیکن قلاوون نے لڑکے کو معزول کر کے خود تخت سنبھال لیا۔ ۱۲۸۲ء میں اس نے طرطوس سے دس سال دس مہینے کے لیے مصالحت کی تجدید کی۔ تین سال بعد اس قسم کی مصالحت امیر صور سے ہو گئی، جو بیروت[2] کا بھی مالک تھا۔ شرطیں وہی تھیں، جو دوسروں نے منظور کر لی تھیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ استحکامات میں اضافہ نہ کیا جائے گا۔ اسی سال (۱۲۸۵ء) المرکب کا محاصرہ کر لیا، جو اڑتیس روز جاری رہا کیونکہ اس نے تاتاریوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا تھا۔ قلعہ فتح ہوا تو اُس کے جنگجوؤں کو طرابلس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ کہہ دیا گیا کہ منقولہ جائداد میں سے جتنی خود اُٹھا سکیں، ساتھ لے جائیں۔ ہتھیار ہرگز نہ لے جائیں[3]۔ تیروں کے پیکان اور کلدار کمانوں کے قبضے اب تک ان سیاہ پتھروں میں پیوست نظر آتے ہیں، جن سے المرکب کی دیواریں اور بُرج بنے۔ ہمارا مؤرخ ابوالفدا[4] اس وقت بارہ سال کا تھا اور اسے پہلی مرتبہ جنگ کا تجربہ المرکب ہی میں ہوا تھا۔ ۱۲۸۹ء میں طرابلس پر حملہ ہوا اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اسے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ پندرہ سو سفرمینا کے علاوہ اُنیس بڑی منجنیقوں سے اس سلسلے میں کام لیا گیا۔ قلعے سے باہر تیا گیروں کا

---

[1] اس کے لفظی معنی ہیں دیدبانی کا بُرج، مقریزی سلوک جلد اوّل حصّہ دوم صفحہ ۵۹۱ - ۵۵۲۔

[2] معاہدوں کے ترجمے کے لیے دیکھیے مقریزی مرتبہ کواتر میر جلد دوم حصّہ سوم صفحہ ۱۷۲، ۱۷۶، صفحہ ۱۷۷، ۱۷۹، ترجمہ صفحہ ۲۱۲، ۲۲۳۔ [3] ابن الفرات کی تاریخ مرتبہ زریق نجلہ عزّالدین جلد سوم صفحہ ۱۸۰،۱۷۔

[4] جلد چہارم صفحہ ۲۲۔

ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ جب سمندر میں جزر کا وقت آیا، تو ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ لاشوں کی بدبو اس درجہ خوفناک تھی کہ ابوالفدا وہاں ٹھہر نہ سکا[۱]۔ مملوکوں کی بحری قوت چنداں اہم نہ تھی۔ اس لیے کچھ لوگ سمندر کے راستے بچ کر نکل گئے۔ طرابلس کے بعد البترون بہ آسانی فتح ہو گیا۔

**عکہ پر قبضہ**

طرابلس کے بعد صرف عکہ فرنگیوں کے قبضے میں رہ گیا تھا، جسے جنگی اعتبار سے اہمیت حاصل تھی۔ قلاوون کے بیٹے اور جانشین الاشرف (۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۳ء) نے ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اسے بھی لے لیا۔ اس نے قلعوں اور فصیلوں کے خلاف بانوے منجنیقیں نصب کرائیں۔ منجنیقوں کی اتنی بڑی تعداد پہلے کسی نے استعمال نہیں کی تھی۔ ۱۸۔ مئی ۱۲۹۱ء کو شہر پر حملہ ہوا اور پوری ایک صدی کے بعد یہ فرنگیوں کے قبضے سے نکل گیا۔ تقریباً نوسو ٹمپلار اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان سے صحیح سالم نکل جانے کا وعدہ کر لیا گیا تھا، مگر سب کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے علاوہ پندرہ ہزار کے قریب پیادہ فوج تھی۔ ابوالفدا چشم دید حالات بیان کرتا ہوا بتاتا ہے کہ شہر صفحۂ ہستی سے محو کر دیا گیا[۲]۔ ظاہر العمر نے اٹھارھویں صدی میں اسے از سر نو تعمیر کیا۔ سقوطِ عکہ نے باقی ساحلی شہروں کی تقدیر پر بھی مہر لگا دی۔ صور کو اس کے محافظوں نے اسی روز خالی کر دیا۔ ۱۴۔ جولائی کو صیدا خالی ہو گیا۔ سات روز بعد بیروت نے اور ۳۔ اگست کو طرطوس نے ہتھیار ڈال دیے۔ عثلیث[۳] کو ٹمپلر خالی چھوڑ گئے اور وسط اگست میں اسے منہدم کر دیا گیا۔ یوں خشکی پر آخری فرنگی قدمگاہ بھی ختم ہو گئی۔ ابوالفدا اسلامی جذبات کا نقشہ پیش کرتا ہوا لکھتا ہے: یوں شام اور اس کا ساحل فرنگیوں سے پاک ہو گئے ..... حمد و ستائش ذاتِ باری کے لیے زیبا ہے[۴]۔ صرف جزیرہ ارواد[۵] مزید گیارہ سال تک مقابلہ کرتا رہا۔ یہ ٹمپلروں کے ماتحت تھا۔ اس کے برباد شدہ قلعے کے دروازے پر لوسینان کا خاندانی نشان بنا ہوا ہے۔ یہ لاطینیوں سے ربط و تعلق کا مظہر ہے۔ یوں مسیحیت اور اسلام کے درمیان کشمکش کی سرگزشت کے ایک نہایت شاندار ڈرامے کا آخری پردہ گر گیا۔

---

[۱] جلد چہارم صفحہ ۲۴، ابن الفرات جلد ہشتم صفحہ ۸۰ - ۸۱، ادریسی صفحہ ۱۸، بندرگاہ میں چار جزیروں کا ذکر کرتا ہے، لیکن آج جو نظر آتے ہیں، وہ اتنے نہیں۔ [۲] ابوالفدا جلد چہارم صفحہ ۲۵ - ۲۶، مقریزی سلوک جلد اوّل حصہ سوم صفحہ ۱۰۰۲ - ۱۰۰۵، نیز جرمن کتاب۔ [۳] Athlites، اس کا نام شاطو پیلرن بھی ہے۔ [۴] صالح صفحہ ۴۲، ابوالفدا جلد چہارم صفحہ ۲۶، سنوڈو جلد دوم صفحہ ۲۳۱ ببعد۔ [۵] ابوالفدا جلد چہارم صفحہ ۲۷۔ [۶] فرانس نے عملداری کے دور میں اسے سیاسی قیدیوں کے لیے استعمال کیا گیا۔

# اکیسواں باب

## لاطینیوں اور لبنانیوں کے باہمی تعلقات

### صلیبی جنگوں کا سرمایۂ ثقافت

صلیبی جنگوں میں ڈرامائی اور قابلِ نظارہ واقعات کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن ثقافتی کارناموں اور نتائج کے اعتبار سے یہ جنگیں بہت فرومایہ ثابت ہوئیں۔ ان سے اصل مقصد بھی حاصل نہ ہوا اور پائدار خیر و بہبودی کی بھی کوئی چیز ان سے برآمد نہ ہوئی۔ بہ حیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ مغرب پر ان کا اثر زیادہ خوشگوار تھا، مثلاً نئے راستے کھل گئے، پرانے اُفق وسیع تر ہوگئے۔ یہ دعویٰ تجارت اور صنعت و حرفت میں بہ طور خاص قابلِ توجہ ہے۔ جس حد تک مشرق کا تعلق ہے، ان جنگوں نے ساحل کے ساتھ ساتھ تباہی اور بربادی کے مناظر پیدا کیے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بغض و عداوت کی میراث چھوڑ گئیں۔

### فرنگیوں نے کیا سیکھا؟

فرنگیوں نے محاربات میں نئے اسلحہ اختیار کیے اور نئے فنون کو فروغ دیا۔ جو نئی چیزیں مشرق سے سیکھیں، ان میں سے مندرجۂ ذیل بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں: صلیبی کمان کا استعمال، آتشباری کے لیے مختلف قسم کے مسالوں کی آمیزش۔ متحرک دروازے[1] تیار کرنے کا طریقہ۔ جنگی باجے میں طنبور و نقارہ کا استعمال۔ جنگی مقاصد کے لیے نامہ بر کبوتروں کی تربیت اور رات کی تاریکی میں آگ کے ذریعے سے اشارے کرنے کے قاعدے۔ سفر میں کے کام میں بھی انھیں نئے اوضاع کا علم ہوا اور محاصرے کے لیے منجنیقوں سے کام لینے کے گُر بھی سیکھے۔ دشمن کے بہادروں سے میل جول کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ زرہ بکتر کا استعمال عام ہوگیا اور لوگ نہ صرف بھاری بلکہ زیادہ قیمتی اسلحہ پہننے لگے[2]۔

---

[1] اطالوی میں انھیں سیراسنسکا Saracinesca کہتے ہیں۔ ان دروازوں کا مقصد یہ تھا کہ قلعے والے جب چاہیں دروازے سے نیچے اتار کر خندق پر پل کی طرح رکھ دیں، جب چاہیں اوپر اٹھا کر آمدورفت کا ذریعہ ختم کر دیں، لیکن یورپیوں کو اس تدبیر کا پیشتر علم تھا۔ [2] دوناسی منرو کی کتاب صلیبی جنگوں کے زمانے کی بادشاہی صفحہ ۱۸۴۔

Marfat.com

یاد رہنا چاہیئے کہ فرنگیوں اور مقامی باشندوں کے درمیان صلح کی مدت گرم یا سرد جنگ کے مقابلے میں زیادہ لمبی تھی۔ متارکے اور مصالحت کے زمانے میں مجلسی و اجتماعی روابط کے مواقع مہیا ہو جاتے تھے۔ اس وجہ سے صلیبی تحریک نے حمل و نقل کے وسائل کو ترقی دی اور صنعت و حرفت کی بعض چیزیں یورپ میں عام ہو گئیں، جو مشرقی الاصل تھیں۔ تجارت اور سفر زیارت کو بڑی تقویت پہنچی۔ یہ دونوں چیزیں پہلے سے رائج چلی آتی تھیں۔ مشرق میں فرنگیوں کے رہنے سہنے کے نئے طریقوں سے شناسائی ہوئی۔ وہ مقامی ملازموں، نرسوں اور سائیسوں سے کام لیتے رہے۔ رفتہ رفتہ انھیں مندرجۂ ذیل چیزوں کے متعلق بہتر معلومات حاصل ہوئیں۔ تل، خروبہ (خرّوب)، چاول (ارز)، نیبو (لیموں)، خوبانی (برقوق، لاطینی الاصل)، شیلٹ[۱]، سکیلین (عسقلان)۔ ان میں مسالوں، خوشبوؤں، عطر اور نیم گرم ملکوں کی دوسری چیزوں کا ذوق پیدا ہوا۔ ان میں سب سے بڑھ کر اہم چیز چینی (سُکر) تھی اور گنّے سے وہ پوری طرح لبنانی ساحل پر آشنا ہوئے۔ صور ہمارے ممتاز مورخ ولیم (وفات تقریباً ۱۱۹۰ء) کا وطن تھا[۲]۔ اس کے حوالی میں گنّے کی فصل بہت زیادہ ہوتی تھی[۳]۔ دِوِتری لکھتا ہے کہ ان علاقوں میں گنّے کی کثرت ہے۔ گنّا ایک سرکنڈا ہے، جس میں شہد بھرا ہوتا ہے۔ بچّے آج کل بھی ساحلی علاقے میں گنّے چُوستے نظر آتے ہیں۔ گنّا وادیٔ گنگا سے ایران پہنچا اور سترھویں صدی کے اوائل تک یہ بہت کمیاب تھا۔ عربوں کی فتوحات کے ساتھ یہ مشرق قریب میں تیزی سے پھیل گیا۔ آٹھویں صدی کا ایک بلوری برتن مصر میں ملا، جو چینی کے پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس پر لفظ سُکّر منقوش تھا۔ اس سے پہلے عربی ادب میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی[۴]۔ چینی ابتدا میں دوا کے طور پر مستعمل تھی۔

فرنگیوں میں مقامی کھانوں کا ذوق پیدا ہوا تو ساتھ ہی مقامی لباس بھی پسند کرنے لگے، چنانچہ مرد ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے، جو گرم آب و ہوا کے لیے زیادہ موزوں تھے اور سر پر کونیہ رکھتے۔ ساتھ ہی وہ ڈاڑھیاں بڑھانے لگے۔ عورتیں چادریں اپنے گرد لپیٹ لیتیں اور باہر نکلتیں تو نقاب پہنتیں[۵]۔ بہت سے لوگ اپنے ساتھ مشرقی، شطرنجیاں اور منسوجے لے گئے یا یہ چیزیں اُنھوں نے یورپ بھجوا دیں۔ سُوتی کپڑوں کا رواج ہو گیا، مثلاً شمر (جو دمشق میں بنتا تھا اور اس کا نام بھی دمسک تھا)، اطلس اور

---

[۱] Shallots & Scallions، یہ ایک قسم کے پیاز تھے، آخری نام عسقلان سے ماخوذ ہے۔ [۲] جلد دوم صفحہ ۶۔ [۳] یروشلم صفحہ ۲۸۔

[۴] جارج سی مائلز کی کتاب "عربوں کے ابتدائی بلّوری پیمانے اور اسٹامپ" صفحہ ۳۵، ۴۴۔

[۵] ابن جبیر صفحہ ۳۳۳۔

ساٹن[1]- یورپ والوں نے بھی نقالی شروع کر دی۔ یہی کیفیت ظروفِ گلی اور بلوری چیزوں میں پیش آئی، جن کے لیے ساحل لبنان کے شہر مدت سے مشہور چلے آتے تھے۔ ریشم کے کیڑے کی پرورش بیروت و طرابلس کے علاقے میں ہوتی تھی اور یہ سلسلہ بزنطینی حکومت کے آخری دور (چھٹی صدی عیسوی کا آخری حصہ) سے جاری تھا۔ صور اپنے مہین ریشمی کپڑے کے لیے خاص شہرت کا مالک تھا۔ اسے سندل (حریر) کہتے تھے۔ عکہ، بیروت اور لاذقیہ میں موٹا ریشمی کپڑا (کشتشاہ) بنتا تھا۔ اس کے ساتھ سونے اور چاندی کی تاریں بھی بُن دیتے تھے اور یہ کپڑا پُر تکلف گدیوں یا پادریوں کے لباس کے لیے مستعمل تھا۔ پارچہ بافی کے ساتھ سوزن کاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ اندھے شیشوں کا رواج مشرق ہی میں ہوا۔ صلیبی جنگوں میں شامل ہونے والے لوگ مقامی اشیا کے علاوہ ان گوناگوں تجارتی جنسوں سے بھی آگاہ ہوئے، جو ملک سے گزرتی تھیں۔ بین الاقوامی تجارت کو فروغ حاصل ہوا تو نقد روپے کی مانگ بڑھ گئی۔ اس وجہ سے روپیہ اقتصادی بنیاد قرار پایا اور سکوں کی زیادہ تعداد رائج کرنی پڑی۔ ٹیمپلر بعض اوقات بینک کاری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ساحلی شہروں میں قنصل خانے بھی بن گئے۔ سب سے پہلا قنصل خانہ جلینوا کا تھا، جو ۱۱۸۰ء میں بمقام عکہ متعین ہوا۔

مادی چیزوں میں مبادلہ جس تیزی اور آزادی سے بڑھا، اس کی مثال ذہنی سطح پر نظر نہیں آتی۔ بلاشبہ اہل مشرق کا درجۂ ثقافت بلند تھا، لیکن عداوت کا عام احساس، مذہبی تعصبات اور لسانی حد بندیاں اس سلسلے میں حائل تھیں۔ صرف ایک عربی کتاب کا ترجمہ صلیبیوں نے لاطینی میں کیا۔ وہ علی ابن العباس المجوسی (وفات ۹۹۴ء) کی کتاب کامل الصناعۃ الطبیہ ہے۔ ابن العباس کو لاطینی میں مولی عباس بنا لیا گیا۔ اس کا ترجمہ ۱۱۲۷ء میں بمقام انطاکیہ ہوا تھا اور مترجم کا نام سٹیفن کا تھا۔ جو لیسا کا باشندہ تھا۔

## مشرقی تعمیرات پر عام اثر

ہمارے مقاصد کے لحاظ سے زیادہ اہم امر یہ ہے کہ اس سرزمین پر صلیبی جنگوں کے اثر کا جائزہ لیں، جہاں یہ لڑی گئیں۔ محسوس نتائج میں سے زیادہ نمایاں ان برجوں کے آثار ہیں، جو ساحل کے ساتھ ساتھ بنائے گئے تھے یا ان وسیع قلعوں کے کھنڈر ہیں، جو پہاڑوں کی چوٹیوں یا ڈھلانوں پر تعمیر ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار گرجے ہیں، جن میں سے زیادہ تر کو مسجدیں بنا لیا گیا۔ استحکامات کے طرزِ تعمیر کے سلسلے میں بزنطینی

---

[1] عربی میں اسے زیتونی کہتے ہیں۔ یہ ایک چینی شہر کا نام تھا، جو ریشمی کپڑوں کے لیے مشہور تھا۔

Marfat.com

نمونہ پیش نظر رکھا گیا، جو پہلے سے اس سرزمین میں رائج تھا۔ گرجوں کے باب میں رومیوں اور گاتھوں کے طرز تعمیر کی پیروی کی گئی، البتہ آرائش میں بیزنطینی طریقہ اختیار کیا گیا۔ طرطوس کے گرجے کی محرابیں نوکدار ہیں۔ یہ ۱۱۰۲ء میں بنا تھا۔ مغرب میں ہ پیشتر کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرنگیوں نے مشرقی نمونہ اختیار کیا۔ صور کا گرجا نوتردام ۱۱۲۶ء میں شروع ہوا تھا۔ یہ اسی مقام پر بنا تھا، جہاں چوتھی صدی میں ایک گرجا موجود تھا اور غالباً یوسیبیس[۱] سے منسوب تھا۔ یہی گرجا ہے جس میں ولیم صوری ۱۱۷۵ء سے ۱۱۸۵ء تک اسقف اعظم رہا[۲]۔ صور کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں بیروت، صیدا، عکہ اور جنوبی جانب پیڑا تک کے نائب اسقف رہتے تھے۔ اس مقام میں ایک اور گرجا سینٹ مارک سے منسوب تھا۔ یہ اہل وینس نے بنوایا تھا۔ اس کے ستون گلابی پتھر کے تھے، جن کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ یقیناً یہ کسی ابتدائی عمارت سے لیے گئے ہوں گے۔ ایک سو اٹھ سال تک قابض رہنے کے بعد یہ گرجے ترک کر دیے گئے اور الاشرف نے شہر کے ساتھ انھیں بھی تباہ کر دیا۔ صور اور صیدا کے درمیان صرفند[۳] کے کھنڈر ہیں، جہاں صلیبیوں نے ایک اسقفی مرکز قائم کیا تھا۔ ایک گرجا اس مقام پر تعمیر ہوا تھا، جہاں عام روایت کے مطابق حضرت الیاس[۴] رہتے تھے۔ مسلمانوں نے اسے الولی الخضر کی زیارت گاہ بنا لیا۔ صیدا میں ہاسپیٹلروں کا گرجا مستطیل شکل کا تھا اور یہ سینٹ جان سے منسوب تھا۔ اسے الجامع الکبیر میں شامل کر لیا گیا، جو شہر کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ گرجا تیرھویں صدی میں بنا تھا۔

قرون وسطیٰ کے دوسرے شہروں کی طرح بیروت میں بھی ایک قلعہ تھا، جو ۱۸۵۶ء تک قائم تھا۔ اس کا برج اسی فٹ بلند تھا[۵] اور یہ اس جگہ تھا جہاں آج کل بڑا چوک ہے۔ اسی لیے اسے البرج کہتے ہیں۔ شہر کے جس حصے کا نام القنطرۃ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کسی زمانے میں شہر کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ صلیبی دور کے باقیات میں سے اہم ترین وہ گرجا ہے، جو یوحنا بپتسمہ دینے والے سے منسوب ہے۔ بالڈون نے ۱۱۱۰ء میں شہر لینے کے تھوڑی مدت بعد یہ گرجا تعمیر کرایا تھا۔ اسے الجامع العمری میں تبدیل کر دیا گیا، جو لبنانی دار الحکومت کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اصل عمارت بناوٹ میں رومی طرز کی تھی اور سادہ تھی۔ اس کے ستونوں اور بالائی حصوں میں بیزنطینی مسالا استعمال کیا گیا تھا۔ اسی سے دوبارہ

---

۱۔ انسائیکلوپیڈیا؟ ایلاورت جلد دوم صفحہ ۳۵۳ + ۲۔ جلد دوم صفحہ ۴۱۱ + ۳۔ سلاطین اول باب ۱۷، آیت ۹ میں اسے صارپت لکھا گیا ہے اور لوقا کی انجیل باب ۴ آیت ۲۶ میں بھی یہی صارپت ہے + ۴۔ ۵۔ جیسپ (Geasup) جلد اول صفحہ ۲۰ کے سامنے اس کی تصویر دی گئی ہے +

Marfat.com

کام لیا گیا۔ پتھر تراش کر جو بُت بنائے گئے تھے، ان پر گچ پلستر کر دیا گیا۔ بیزنطینی ساخت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً اس جگہ پہلے کوئی فونیقی معبد تھا۔ ۱۲۹۱ء میں مسلمانوں نے بیروت دوبارہ فتح کیا تو اس وقت سے یہ عمارت اسلامی عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہونے لگی[1]۔ ہمارا وقائع نگار صالح بن یحییٰ[2] بیروت میں ایک فرانسسکی خانقاہ اور گرجے کا ذکر کرتا ہے، جسے اس کے اجداد نے اصطبل بنا لیا تھا۔ صالح بنی تنوخ میں سے تھا، جو بیروت کے مشرق میں لبنان کے اندر پہنچے تھے۔ یہ نویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ ۱۱۴۰ء میں اس کے خاندان کو، جو بنی بحتر کے نام سے مشہور تھا، ضلع کا جاگیردار (امراء الغرب) بنا دیا گیا۔ شملان (بہ زبانِ سریانی بمعنی کامل)، عبیاب، عتیاب، سرحمول جیسے چھوٹے چھوٹے دیہات کا ذکر تاریخ میں جاگیرداروں کے طور پر آتا ہے، جو بیبرس نے ۱۲۹۲ء میں بحتریوں کو دی تھیں[3]۔ بیروت پر بار بار بحری حملے ہوتے تھے۔ ۱۲۹۴ء میں شہر کی حفاظت اس خاندان کے حوالے کر دی گئی۔

جبیل میں صلیبیوں کا جو گرجا تھا، یہ ۱۱۱۵ء میں بنا تھا۔ اب یہ مار یوحنا کا مارونی گرجا ہے[4]۔ اس کے شمال میں البترون ہے، جہاں دورِ حاضر میں مار یعقوب کا گرجا بنا۔ اس کی ایک دیوار صلیبیوں کے زمانے کی ہے۔ امیون یونانی آرتھوڈکسوں کا گاؤں ہے۔ یہاں ایک گرجے کے کھنڈر ہیں، جو مار فوکس سے منسوب ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اسے از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ یہ بھی اگر پہلے دور کا نہیں تو کم از کم ۱۱۱۵ء کا ضرور معلوم ہوتا ہے[5]۔ طرابلس کے جنوب میں ایک راس ہے، جس پر دیر البلمند قائم ہے۔ یہ صلیبیوں کی اُن چند تعمیری یادگاروں میں سے ہے، جن کے لاطینی نام محفوظ رہے۔ یہ ۱۱۵۷ء میں سسٹرشی راہبوں کے لیے بنا تھا۔ اس کا نام ایبٹیا بیلیمونٹس تھا[6] (خوب صورت پہاڑی کی خانقاہ)۔ تیرھویں صدی میں یعقوبیوں کے حوالے ہوا اور تقریباً ایک صدی بعد یونانی آرتھوڈکسوں کو مل گیا۔ قلاوون[7] نے طرابلس پر قبضے کے بعد (۱۲۸۹ء) یا تو آخری لاطینی راہبوں کو قتل کرا دیا یا وہ بھاگ گئے[8]۔

---

[1] (مترجم) جب اسلامی فتوحات کے بعد مسیحی موجود ہی نہ رہے یا ان کی آبادی ہی برائے نام رہ گئی تو لامحالہ بہت سے گرجے مسجدوں کی شکل میں تبدیل ہو گئے، جس طرح ابتدائی دور کے فونیقی معبد مسیحیوں نے گرجوں کی شکل میں تبدیل کر دیے تھے۔ [2] صفحہ ۱۱۰-۱۱۱۔ [3] صالح صفحہ ۲۵۔ [4] دان برچم الدلائد منڈفایتو صفحہ ۱۱۰-۱۱۳۔ [5] اینلارت جلد دوم صفحہ ۳۵، ۳۷، ۲۱۔ [6] Abbatia Belimontois اسے Abbye-de-Belmont بھی کہتے تھے۔ پہلا لاطینی نام تھا، دوسرا فرانسیسی۔ [8] دیکھیے لامنزہ تفریح جلد اول صفحہ ۱۵۴-۱۵۶۔ حسنِ تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیے کمیل اینلارت کی کتاب شام جلد چہارم صفحہ ۱-۲۲۔

Marfat.com

طرابلس کی الجامع الکبیر اسی جگہ بنی، جہاں صلیبیوں کے زمانے کا گرجا سینٹ ماری موجود تھا یہ بارھویں صدی کی ابتدا میں بنا تھا۔ ۱۱۷۰ء میں زلزلے سے تباہ ہو گیا۔ تیرھویں صدی میں اس کی مرمت ہوئی۔ مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کیا تو یہ پھر تباہ ہو گیا اور اس کی جگہ اسلامی عبادت گاہ وجود میں آ گئی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ ساتھ پہلی تعمیر کے آثار ماخوذ ہیں۔ بہت سی دوسری مذہبی تعمیرات کا ملاً ناپید ہو گئیں۔

**اقتصادیات** صلیبی جنگوں کی بدولت تجارت و زیارت کو جو تحریک ملی، وہ بارھویں صدی کے سیاحوں کی تحریرات میں منعکس ہے۔ اس دور میں سب سے بڑھ کر فائدہ صور کو پہنچا۔ عکہ کے بعد جس شہر نے فرنگیوں کے ماتحت سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا، وہ صور ہی تھا۔ ۱۱۵۴ء میں مغربی جغرافیہ نویس الادریسی لکھتا ہے:

"صور میں بہترین بلور و آبگینہ اور بہترین ظروف گلی بنتے ہیں۔ یہاں ایک سفید پارچہ بنا جاتا ہے، جو بہت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے اور اس میں بڑی ہنرمندی دکھائی جاتی ہے۔ یہ پارچہ جہازوں کے ذریعے سے دنیا کے ہر حصے میں بھیجا جاتا ہے۔ آس پاس کے علاقوں کا کوئی پارچہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا"[1]۔

یہ توثیقی دور کی صدائے بازگشت ہے۔ الادریسی[2] صیدا کے متعلق لکھتا ہے: "یہ بڑا آباد شہر ہے اس کے بازار سامان سے بھرے ہوئے ہیں اور قیمتیں بہت معمولی ہیں۔ شہر کے حوالی باغوں اور درختوں سے پٹے ہوئے ہیں اور پانی یہاں بہ افراط ملتا ہے"۔ صیدا کے متعلق یہ آخری رشح افروز بیان ہے۔ ہسپانوی ربی بنیمین ساکن تطیلہ[3] پندرہ سال بعد ادھر سے گزرا تھا۔ وہ بھی صور کے شہرۂ آفاق آبگینہ و بلور اور ارغوانی رنگ کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی بہت مانگ ہے اور دنیا کے ہر حصے سے تاجر اسے خریدنے کے لیے آ پہنچتے ہیں۔ بنیمین نے زلزلے سے طرابلس کی تباہی کا ذکر بھی کیا ہے۔ بارھویں صدی میں یہاں متعدد زلزلے آئے تھے۔ ۱۱۵۷ء کا زلزلہ بہت تباہی خیز تھا۔ پانسو آدمی حلب میں، ہزاروں آدمی حما میں مرے۔ شیزر کی کل آبادی میں سے صرف ایک عورت اور ایک خواجہ سرا بچے۔ حمص، الاکراد اور ارقہ کاملاً برباد ہو گئے۔ طرابلس کے

---

[1] ادریسی صفحہ ۱۲۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۵۔

[3] جلد اول صفحہ ۶۳۔

Marfat.com

بڑے حصّے کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔[1] تھیوڈورخ نام ایک جرمن زائر (۱۱۷۲ء) کہتا ہے کہ صور فونیقیہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ فصیل اور برجوں کے استحکام میں اس نے تمام شہروں پر فوقیت حاصل کرلی۔ وہ لکھتا ہے کہ بیروت بھی بڑا دولت مند، مستحکم، وسیع اور آباد شہر ہے۔ اندلسی سیاح ابن جبیر ۱۱۸۴ء یا ۱۱۸۵ء میں صور پہنچا تھا۔ اس کا بیان بھی یہی ہے کہ یہ شہر استحکام میں ضرب المثل تھا۔ اس کے کوچہ و بازار عکّہ سے زیادہ صاف تھے اور یہاں کے کافر مسلمانوں سے نسبتہً رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ ابن جبیر[3] نے ایک فرنگی شادی کی بڑی واضح تصویر پیش کی ہے، جسے اس نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ولیم صوری حوالیِ صور میں پانی کی فراوانی کا ذکر کرتا ہے، جس سے باغ، پھل والے درخت اور گنّے کے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔ گنّے سے چینی[4] بنتی ہے، جو بڑی قیمتی شے ہے۔ انسانی صحت کے لیے اس کا استعمال حد درجہ ضروری ہے اور تاجر اسے دنیا کے نہایت دُور افتادہ ملکوں میں لے جاتے ہیں۔ کریٹ کا ایک راہب جہینس پھوکس (۱۱۸۵ء) بھی صور سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شہر خوبصورتی میں فونیقیہ کے تمام بلاد سے بڑھا ہوا ہے۔ طرابلس کی طرح یہ بھی ویسے ہی جزیرہ نما پر تعمیر ہوا ہے، لیکن یہ بہت زیادہ وسیع ہے اور اس کی عمارتیں زیادہ پُرشکوہ و خوب صورت ہیں۔[5] وہ کہتا ہے کہ بیروت بھی بڑا اور آباد شہر ہے۔[6]

## ثقافتی اور مجلسی اثرات

خالص ثقافتی دائرے میں مغرب کا اثر زیادہ واضح نہ تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اثر کی حقیقت سے انکار کیا جائے۔ مجلسی اور مذہبی تعلقات میں اس کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔ دیہاتی آبادی پر پورے زمانے میں قطعاً گہرا اثر نہ پڑا، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ان چند متفرق مقامات کو چھوڑ کر، جہاں قلعے بنے ہوئے تھے، کوئی بیرونی اثر انھیں چھو بھی نہ گیا۔ جس حد تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ تمام فرنگیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور نہیں سمجھتے تھے کہ ان سے بھی کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

مغربی ثقافت کے متعلق مسلمانوں کی عام روش کا واضح اور روشن اندازہ اسامہ بن منقذ

---

[1] برجرالیس کی کتاب کا انگریزی ترجمہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۴ - ۲۸۵۔
[2] Description of the Holy Places، ترجمہ سٹیوارٹ صفحہ ۱۷، ۲۱، ۲۷۔ [3] صفحہ ۳۰۴، ۳۰۷۔ [4] ولیم صوری جلد دوم صفحہ ۱۷، لاطینی میں شوگر (Sugar) کو زچرا (Zachara) لکھا ہے۔
[5] PHOCAS، The Pilgrimage of Joannes، ترجمہ سٹیوارٹ صفحہ ۱۰۔
[6] ایضاً صفحہ ۹۔

Marfat.com

(۱۰۹۵ء تا ۱۱۸۸ء) سالکِ شیزر کی نہایت دلچسپ یادداشتوں سے ہو سکتا ہے، جن کا مقابلہ زندہ دلی اور دلآویزی میں بمشکل کیا جا سکتا ہے۔ اسامہ بڑا اچھا ماہر حربیات، مشّاق شکاری، خوش الحوا اللسان اور اچھا شاعر تھا۔ وہ جنگ کے زمانے میں صلیبیوں کے خلاف لڑتا رہا۔ امن کے زمانے میں ان سے برادرانہ تعلقات قائم رکھے۔ وہ لکھتا ہے کہ جنسی معاملات میں فرنگی لوگ رقابت سے بالکل خالی تھے۔ ان میں صرف دو خوبیاں تھیں۔ ایک حوصلہ اور دوسری رزم آرائی۔[۱] وہ ایک مرتبہ صور کے حمام میں گیا اور ایک فرنگی عورت کو وہاں دیکھا تو اوّل نظر میں سمجھا کہ آنکھوں نے دھوکا دیا ہے۔ پھر اپنے ملازم کو بھیج کر حقیقت دریافت کی تو یقین آیا۔[۲] وہ اس بات کا مذاق اُڑاتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ سچ کی تمیز کے لیے قدیم عہد کے طریقوں سے کام لیتے ہیں اور جرم و بے جرمی کے فیصلے کے لیے دست بدست لڑتے ہیں۔ جو فرنگی یورپ سے تازہ دم آتے ہیں وہ یہاں توطن اختیار کیے ہوئے فرنگیوں کے مقابلے میں زیادہ وحشی اور گنوار ہوتے تھے۔[۳] ایک امیر نے جو اسامہ کو بھائی کہہ کر پکارتا تھا، یہ پیشکش کی کہ میں آپ کے کم عمر بیٹے کو یورپ لے جانا چاہتا ہوں۔ اسامہ نے حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ کر ٹالا کہ بچّے کی دادی کو اس سے غیر معمولی محبت ہے۔ ساتھ ہی اسامہ اس بات پہ بڑا حیران ہوا کہ کوئی شخص یہ سلامت ہوش و حواس مسلمان کے سامنے ایسی تجویز کیوں کر پیش کر سکتا ہے۔[۴] ذیل کی مثال سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ فرنگیوں اور مقامی لوگوں کے طبّی نظام کس درجہ مختلف تھے۔ یہ واقعہ کوہستان لبنان کے ایک چھوٹے سے گاؤں منیطرہ میں پیش آیا۔ اور اس کا راوی ایک مقامی مسیحی طبیب ہے، جس کا نام ثابت تھا:

"وہ میرے پاس ایک بڑے جنگجو کو لائے، جس کی ٹانگ میں پھوڑا نکل آیا تھا اور ایک عورت آئی، جو ضعفِ عقل کی مریض تھی۔ میں نے جنگجو کے لیے تھوڑی سی پلٹس کا انتظام کر دیا، جس سے پھوڑا پھوٹا اور اچھا ہو گیا۔ عورت کے لیے ایسی غذا کا انتظام کر دیا، جس سے اس کی طبیعت سُدھر گئی۔ پھر ایک فرنگی طبیب آیا اور بولا کہ اس شخص کو علاج معالجہ بالکل نہیں آتا۔ پھر اس نے جنگجو سے پوچھا: تم ایک ٹانگ کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو یا دو ٹانگوں کے ساتھ مر جانا چاہتے ہو؟ مریض نے ایک ٹانگ کے ساتھ زندہ رہنے کو ترجیح دی۔ فرنگی طبیب نے کہا:

---

۱؎ اسامہ الاعتبار صفحہ ۱۳۲، ۱۳۵، انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۶۱ + ۲؎ اسامہ صفحہ ۱۳۷، ترجمہ صفحہ ۱۱۶ + ۳؎ ایضاً ۱۳۴، ۱۳۵، صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱، ترجمہ صفحہ ۱۶۳، ۱۶۴، صفحہ ۱۶۹، ۱۷۰ + ۴؎ اسامہ صفحہ ۱۳۲، ترجمہ صفحہ ۱۶۱ +

کہ پھر کسی مضبوط و توانا جنگجو کو میرے پاس لے آؤ۔ ساتھ ہی ایک تیز کلھاڑی لاؤ۔ چنانچہ ایک جنگجو کلھاڑی کے ساتھ آیا۔ میں پاس کھڑا تھا۔ فرنگی طبیب نے مریض کی ٹانگ لکڑی کے ایک کُندے پر رکھی اور جنگجو سے کہا کلھاڑی اس زور سے مارو کہ ایک ہی ضرب سے ٹانگ کٹ جائے۔ اس نے یہی کیا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ ضرب لگی لیکن ٹانگ الگ نہ ہوئی۔ پھر اس نے دوسری ضرب لگائی، جس سے ٹانگ کی ہڈی کا مغز نکل آیا اور مریض وہیں مرگیا۔

"پھر اس فرنگی طبیب نے عورت کا معائنہ کیا اور کہا کہ شیطان اس کے دماغ میں گھس کر مسلط ہوگیا ہے۔ اس کے سر کے بال مونڈ دینے چاہئیں۔ چنانچہ بال مونڈ دیے گئے اور اسے فرنگیوں کی عام خوراک دینے لگے، جس میں پیاز اور رائی ضرور ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کی دیوانگی زیادہ بڑھ گئی۔ یہ کیفیت دیکھ کر فرنگی طبیب نے کہا کہ اب شیطان اس کے سر میں بُری طرح داخل ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس نے استرہ لیا۔ سر پر ایک صلیب نما زخم لگایا اور اوپر سے کھال اُتار دی، یہاں تک کہ کھوپڑی کی ہڈی نمایاں ہوگئی اور اس پر نمک مل دیا۔ وہ عورت بھی آناً فاناً مرگئی۔ پھر میں نے گھروالوں سے پوچھا: آیا اب بھی میری خدمات کی ضرورت ہے؟ جواب نفی میں ملا تو میں واپس چلا آیا اور فرنگیوں کے علاج معالجے کے متعلق وہ باتیں سیکھیں، جو مجھے پہلے معلوم نہ تھیں[1]۔"

وہاں کی عجیب وغریب بیماریوں کے علاج میں مقامی طبیبوں کی اعلیٰ ہنرمندی اور بہتر ساز و سامان کی تعریف کرتے تھے۔ ولیم صوری نے بھی بادلِ نخواستہ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے[2]۔ وہ لکھتا ہے: "ہمارے مشرقی امیر اپنی عورتوں کے زیرِ اثر لاطینی طبیبوں کی دواؤں اور طریق علاج کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور صرف یہودی، سامری، شامی اور عرب طبیبوں پر انھیں اعتقاد ہے۔ جب بالڈون ثالث نے تینتیس سال کی عمر میں برقعے ایک طبیب کی گولیاں کھائیں، جو امیرِ طرابلس کا طبیب خاص تھا اور اچھی صحت کے باوجود وہ ۱۱۶۲ء میں بمقام بیروت مرگیا تو افواہ پھیلی کہ اسے زہر دیا گیا ہے[3]۔"

---

[1] اسامہ صفحہ ۱۳۲، ۱۳۳، ترجمہ صفحہ ۱۶۲۔ [2] جلد دوم صفحہ ۲۹۲۔ [3] ولیم صوری جلد دوم صفحہ ۲۹۲، ۲۹۳۔

Marfat.com

بارہ سال بعد شاہ املرک یروشلم میں پیچش سے بیمار رہا۔ شامی طبیبوں نے اس کی فصد لینے یا اسے جلاب دینے سے انکار کر دیا، لیکن اس کے لاطینی طبیبوں نے انھیں معالجات سے کام لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ املرک فی الفور مر گیا۔[ف۱] آپس میں شادیاں مجلسی ربط و ضبط کا ایک اہم ذریعہ تھیں، لیکن ان کا دائرہ محدود تھا۔ مسلمانوں نے فرنگی بیویوں سے شاذ ہی عقد کیے، البتّہ جو عورتیں جنگ میں اسیر ہوئیں یا کنیزوں کے طور پر خریدی گئیں، انھیں وہ خواصوں کی حیثیت میں رکھتے تھے۔ صلیبیوں کی قوت تباہ ہو گئی تو چند خاندان وہیں رہ گئے۔ وہ بالآخر مقامی باشندوں میں جذب ہو گئے۔ ۱۲۵۶ء میں ایک مارونی بطریق سمعان الحدثی نے پوپ الیگزانڈر چہارم کو ایک خط لکھا تھا۔ جس میں ان صلیبیوں کی سفارش کی تھی، جو پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین تھے۔[ف۲] لبنان میں متعدّد خاندان ہیں، جنھوں نے پرانی روایت قائم رکھی یا ان کے نام ایسے ہیں، جن سے ان کے یورپی الاصل ہونے کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً صلیبی،[ف۳] بردویل (بالڈون)، فرنجیہ (فرینک) دویحی (DE-DOUHAI)، دُریان (کاؤنٹ داوریاں)، طربیہ (ٹاربی)۔[ف۴] یہ زیادہ تر مارونی خاندان ہیں۔ جن شہروں میں لاطینی آبادیاں تھیں، وہاں ایک مخلوط النسل مقامی ماؤں سے پیدا ہو گئی۔ انھیں پولینس[ف۵] (نوجوان) کہتے تھے۔ پولینس اکثر باپوں کے نہیں، ماؤں کے مذہب کی پیروی کرتے تھے۔ وہ عربی بولتے، اپنے حرموں کو بالاہتمام پردے میں رکھتے تھے اور گرجوں میں نہیں جاتے تھے۔[ف۶]

## زبان اور مذہب

زبان اور مذہب آزادانہ مجلسی ربط و ضبط اور ثقافتی مبادلے میں دوزبردست رکاوٹیں بنے رہے۔ ایسے صلیبیوں کے ریکارڈ محفوظ ہیں، جنھوں نے عربی پر عبور حاصل کر لیا تھا، لیکن کوئی قابلِ ذکر مسلمان پیش نہیں کیا جا سکتا، جس نے لاطینی یا پرانی فرانسیسی زبان میں ایک حد تک مہارت حاصل کی ہو۔ چونکہ مسلمان قرآن اور فرشتوں کی زبان بولتے تھے، وہ کافروں کی بولی استعمال کرنے کو حقیر سمجھتے تھے۔ ولیم صوری اور ولیم طرابلسی (وفات ۱۲۷۳ء) نیز دوسرے لوگوں نے صرف عربی بولی ہی نہ سیکھی تھی بلکہ وہ کلاسیکی ادبیاتِ عرب سے بھی آگاہ تھے۔ جن امراء کو جاگیریں ملی تھیں، انھوں نے، نیز تاجروں اور راہبوں نے اپنے فائدے کے لیے مقامی بولی سیکھ لی۔ التقیف اور الکرک کے امراء کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ریمان ثالث طرابلسی نے

---

ف۱ ولیم صوری جلد دوم صفحہ ۳۹۵ ۔ ف۲ پال ابراہم کی کتاب لبنان کے مارونی صفحہ ۱۸۶، نیز لاطینی کتاب صفحہ ۱۳۱۹ ۔ ف۳ دیکھیے نجیب القلیبی تاریخ العشیرہ صلیبیہ صفحہ ۸ بعد ۔ ف۴ دیکھیے اینی رسل اُ کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۶۲۔۶۳ ۔ ف۵ Poulanis ۔
ف۶ ذوتری یروشلم صفحہ ۶۵ ۔

Marfat.com

زمانۂ اسیری میں جو بمقام حلب ۱۱۶۵ء سے شروع ہوا، عربی سیکھ لی تھی اور مسلمانوں کے اوضاع و اطوار سے خوب واقف ہوگیا تھا۔ لوئی نہم کا سوانح نگار متعدد فرنگیوں کا حوالہ دیتا ہے، جنھوں نے عربی بولی سیکھ لی تھی[۵۱] حشیشیوں کے پیشوا نے جو سفیر لوئی کے پاس بھیجے تھے، انھوں نے اپنا مقصد ترجمانوں کے ذریعے سے بیان کیا تھا، لیکن اس سے پہلے ان کے ایک پیشوا رشید الدین سنان نے عکہ کے محاصرے کے وقت صلاح الدین کے پاس جو سفیر بھیجے تھے، انھوں نے فرنگی لباس پہن رکھے تھے اور وہ فرنگی زبان بولتے تھے[۵۲]۔ انھوں نے یہ بھیس اس لیے بدلا تھا کہ فرنگی بادشاہ کو قتل کر دیں ۔

مسلمان آخری الہام کے پیرو تھے، جس میں یہودیوں اور مسیحیوں کے الہامات بھی شامل تھے۔ لہٰذا وہ اپنی چیز کو ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے تھے، لیکن تبدیلِ مذہب کی متفرق مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں، جو تنخواہ داروں اور غلاموں، اسیرانِ جنگ کے علاوہ ہیں۔ ژاک دوتری اسقفِ عکہ (۱۲۱۷ء) اور بطریقِ یروشلم (وفات ۱۲۴۱ء) کہتے ہیں کہ بہت کم مسلمانوں نے یسوع مسیح کے بپتسمے میں پناہ لی[۵۳]۔

## مارونی، فرانس اور یورپ

لاطینیوں نے مشرقِ قریب کے باشندوں سے جو تعلقات پیدا کیے، ان میں سے مارنیوں کے ساتھ تعلقات زیادہ نتیجہ خیز اور پائدار ثابت ہوئے۔ مسیحی اقلیتوں پر جو پابندیاں عائد تھیں ——— خصوصاً جو عمر اموی، متوکل عباسی اور حاکم فاطمی نے عائد کی تھیں ——— ان کی وجہ سے وہ اقلیتیں زیادہ سے زیادہ دوسرے درجے کی شہری رہ گئی تھیں۔ ان کی حالت ایسی تھی کہ خارجی اثر زیادہ پڑتا اور وہ مغربیوں کی طرف سے دوستانہ میل جول کے لیے بہ طورِ خاص تیار رہتے تھے۔ ارمنوں سے ربط و ضبط ابتدا ہی میں بمقام الرّہا و انطاکیہ شروع ہوگیا تھا۔ جس میں ارمنوں کی مذہبی مجلس نے رومیوں کی برتری تسلیم کر لی تو یہ ربط و ضبط کمال پر پہنچ گیا، تاہم یہ عارضی ثابت ہوا۔ اس سے منیتر مغربی شامیوں (یعقوبیوں) کے بطریقِ انطاکیہ اگناٹیس ثانی نے ۱۲۳۷ء میں دومنیکی مذہبی پیشوا کی موجودگی میں رومہ کی برتری تسلیم کر لی، لیکن یہ اتحاد عوام کو پسند نہ آیا اور فسخ کر دیا گیا۔ رومہ کو مشرقی کلیساؤں میں سے کسی ایک شاخ کے الحاق کے لیے عمدیوں انتظار کرنا پڑا، لیکن مارونیوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔

---

۵۱ ولیم صوری جلد دوم صفحہ ۳۰۸، صفحہ ۳۹۰، صفحہ ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۴ ۔ ۵۲ جائن ول ۔ ۵۳ سٹینس لاس گویارڈ ایشیائی جرنل میں جلد نہم صفحہ ۴۱۰، ۴۶۵ ۔ ۵۴ حروبِ صلیبیہ بزبانِ فرانسیسی گیزو کی ایڈٹ کی ہوئی صفحہ ۳۱ ۔

مارونیوں نے صلیبیوں کی پہلی فوج کے لیے رہبر مہیا کیے اور یروشلم میں بادشاہی قائم ہو گئی تو تیر اندازوں کا ایک حیش اس کی ملازمت میں داخل کر دیا۔ یقیناً وہ لبنان میں مسیحیوں کی سب سے بڑی اور سب سے متحد جماعت تھی اور لاطینیوں سے ان کے دوستانہ تعلقات کا آغاز ابتدا ہی میں ہو گیا۔ روایت یہ ہے کہ لوئی نہم ان کا سب سے پہلا بادشاہ اور سب سے بڑا فرانسیسی دوست تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عکہ میں لنگر انداز ہوا تو پچیس ہزار مارونیوں کا ایک گروہ رسد و تحائف کے ساتھ اس کے سامنے پیش ہوا۔ ۲۱۔ مئی ۱۲۵۰ء کو اس کی طرف سے ایک خط لکھا گیا، جس کے مطابق ان کے لیے فرانسیسی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔ فرنگی سلطنت میں لاطینیوں کے بعد مارونیوں کو پہلا درجہ حاصل تھا۔ دوسرے مسیحی گروہ ان کے بعد آتے ہیں۔ مارونیوں کو عدالتی حقوق بھی دے دیے گئے تھے اور انھیں اسی درجے پر رکھا گیا تھا، جو لاطینی ارباب ثروت کو حاصل تھا، یہاں تک کہ وہ یروشلم کی بادشاہی میں زمین بھی خرید سکتے تھے[1] وہاں ان کے آباد کاروں کی تعداد یقیناً بہت بڑھ گئی ہو گی۔ ان کے لیے پادریوں کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ لاطینی گرجوں میں نماز پڑھائیں۔ جب سلطان صلاح الدین نے یروشلم کو مسیحی قبضے سے آزاد کرا لیا اور گائی ڈلوسینیان (شاہ یروشلم) قبرص چلا گیا تو بہت سے مارونی بھی اس کے ساتھ گئے اور اس پہاڑی پر آباد ہوئے جو نکوسیا کے شمال میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی ان کے دل میں لبنان کی یاد تازہ کرتی تھی۔ ان میں سے بعض غالباً ہاسپٹیلروں کے ساتھ روڈس چلے گئے ہوں گے۔ پھر سولھویں صدی میں روڈس کے جنگجوؤں کے ساتھ مالٹا پہنچ گئے ہوں گے۔ دوستانہ روابط کی یہ روایت بعد کی صدیوں میں بھی قائم رہی ۱۸۶۰ء میں نپولین ثالث نے کوہستان لبنان کے علاقے میں امن قائم کرنے کے لیے فوج بھیج دی تھی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد شام و لبنان کی حکمداری فرانس کو ملی تھی +

مارونی مذہبی رسوم مسیحیت میں سب سے پرانے تھے۔ انھیں لاطینی بنانے کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا۔ ۱۲۱۳ء میں مارونی بطریق ارمیا العمشیتی رومہ گیا اور واپس آکر اس نے دعاؤں اور پادریوں کے تقرر کے متعلق اصلاحات شروع کیں۔ وہ پہلا بطریق تھا جس نے پاپائے رومہ کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم کیے۔ لاطینیت کا باقاعدہ آغاز پوپ انوسنٹ ثالث نے اپنے نمائندے کے ذریعے سے کیا تھا (۱۲۰۳ء)، جب بپتسمے کے لیے تین غوطے مقرر کر دیے

[1] گروسے، تاریخ حروب صلیبیہ جلد دوم صفحہ ۵۸، رشل ہویہ صفحہ ۵۰، ۵۱ +

Marfat.com

لیکن تثلیث کا ذکر صرف ایک مرتبہ کر دینا کافی سمجھا۔ اسقفوں کے لیے نوشتوں کا انتظام کر دیا۔ مارونی پادری انگشتریوں اور اسقفی کلاہوں کے استعمال میں لاطینیوں کے پیرو تھے۔ انہیں کی طرح ہاتھوں میں عصا اٹھائے ہوئے چلتے تھے۔ مارونی گرجوں میں دوسرے مشرقی گرجوں کی طرح مسیحیوں کو نماز کے لیے بلاتے وقت لکڑی کے گھنٹے بجائے جاتے تھے۔ ۱۱۱۲ء سے برنجی گھنٹوں کا استعمال شروع ہوا[1]۔ اس سلسلے میں انھوں نے لاطینی طرز عمل اختیار کیا۔ ایک دومنیکی راہب ۱۲۴۸ء میں ارض مقدس پہنچا تھا۔ ۱۲۸۳ء میں دوبارہ آیا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ تمام مشرقی مسیحیوں میں سے صرف مارونی برنجی گھنٹے بجاتے تھے۔ باقی تمام لوگ ایک چوبی تختہ بجا کر لوگوں کو گرجے بلاتے ہیں[2]۔ لبنان میں برنجی گھنٹوں کی صنعت نقاع خاندان کی خاص صنعت بن گئی، جو بیت الشباب (المتن) میں رہتا تھا۔ ذو تری لکھتا ہے کہ مارونی اتباع روما کے سلسلے میں لاطینی مراسم کی پیروی کرتے ہیں[3]۔ نان سوشم[4] ۱۳۳۶ء سے ۱۳۴۱ء تک ارض مقدس میں رہا۔ اس نے مارونی اسقفوں کو دیکھا، جن کی تقدیس کی رسم لاطینی اسقف اعظم ادا کر رہے تھے، لیکن کامل اتحاد ۱۷۳۶ء سے پیشتر نہ ہو سکا۔ بہرحال پوپ مارونی کلیسا سے اچھا برتاؤ کرتے رہے۔ انھوں نے مارونی بطریقوں کو کئی خط لکھے، جن میں ان کی مذہبی استقامت کی تعریف کی اور مثال دی کہ کانٹوں کی جھاڑیوں میں ان کی حیثیت گلاب کی سی ہے۔ پہلا محفوظ خط انوسنٹ ثالث کا ہے جو ۱۲۱۳ء میں لکھا گیا تھا۔

## مشنری سرگرمیاں

صلیبی جنگوں کا ایک ضمنی نتیجہ، جسے پائدار قدر و قیمت حاصل ہوئی، یہ تھا کہ مسلمانوں کو رضا و رغبت سے ہمنوا بنایا جائے اور جبر و تسخیر کے تبلیغ کے ذریعے سے اپنایا جائے۔ فوجی مہمیں اصل مقصد کے حصول میں ناکام رہیں۔ صلیبی روح مردہ ہو گئی۔ اس وقت یہ نئی تدبیر ذہن میں آئی یعنی پرامن ذرائع سے مسلمانوں کو مسخر کیا جائے۔ یہی امر مسیحی مشنری تصور کی بنیاد ہے۔ ارض مقدس کے خطے پر ایک صلیبی نے ۱۱۵۴ء میں ایک نظام قائم کیا، جسے کارمل (مار الیاس) پہاڑ کے نام پر کارملی کہتے ہیں۔ کارملی نظام کے افراد رفتہ رفتہ شام و لبنان میں پھیل گئے اور انھوں نے طرابلس میں ایک مرکز قائم کر لیا۔ مسیحی درویشوں کے دو اور نظام بھی تیرھویں صدی کے اوائل میں قائم ہوئے۔ ایک فرانسسکی، دوسرا دومنیکی ۱۲۱۹ء میں

[1] ذو تری یروشلم صفحہ ۸۰، دوہی صفحہ ۱۰۳۔ [2] فیلکس فیبری، کتاب سیر گردش ترجمہ سٹیوارٹ جلد دوم صفحہ ۳۸۹۔ [3] یروشلم صفحہ ۸۰، ۸۱۔ [4] صفحہ ۱۳۵۔

Marfat.com

سینٹ فرانسس ساکن اسیسی بانی نظام فرانسسکی عکہ میں اترا۔ دو سال بعد اس نے کچھ شاگرد مہیّا کر لیے اور ارض مقدس میں پہلی فرانسسکی نو آبادی بنائی۔ ان لوگوں کے مذہبی پیشوا کی پہلی قیام گاہ عکہ میں تھی۔ پھر اس کی ایک شاخ طرابلس میں اور ایک خانقاہ بیروت میں قائم ہوئی۔ سنہ ۱۲۲۳ء میں دومنیکی مشن دمشق پہنچا۔ پھر طرابلس، عکہ اور دوسرے مقامات پر گیا، جہاں خانقاہیں قائم کیں۔ ولیم طرابلسی ایک دومنیکی استقف تھا، جس نے سنہ ۱۲۷۰ء میں اسلام کے متعلق قرون وسطیٰ کا سب سے زیادہ عالمانہ رسالہ مرتب کیا۔ اس میں ولیم نے نئے نظریے کی حمایت کی۔ وہ کہتا ہے کہ ارض مقدس کی بازیافت کے لیے سپاہیوں کی نہیں، مشنریوں کی ضرورت ہے۔ یورپ میں اس فکر کا زبردست حامی کیٹالن کا ریمان لل تھا (وفات ۱۳۱۵ء) اس نے عربی پڑھی، پھر اسے پڑھاتا رہا۔ ساتھ ہی مختلف اداروں کو رائے دی کہ اسلامی سرزمینوں میں مشنری زندگی بسر کرنے کے لیے عربی کی تعلیم ضروری ہے۔ اس کا انتظام کیا جائے۔ لاطینی پادری اب تک ارض مقدس میں مختلف مسیحی فرقوں کے اتحاد میں معروف رہے تھے۔ اب انھوں نے غیر مسیحیوں تک انجیل کا پیغام پہنچانے کی تیاری کی۔ فرانسسکیوں اور یسوعیوں نے بھی اس کام سے تعاون کیا۔ سترھویں صدی میں، نیز بعد کے زمانے میں ان دو نظاموں (فرانسسکی اور یسوعی) نے لبنان میں ذہنی بیداری پیدا کرنے اور باقی عرب دنیا کو جگانے کے لیے بے پناہ کام کیا +

## مملوکوں کی جوابی کاروائی

جو مستحکم شہر مسیحیوں سے مسلمانوں نے واپس لیے، ان کے استحکامات کو منہدم کر دینے کی پالیسی سلطان صلاح الدین نے شروع کی تھی، خصوصاً بندرگاہوں کے سلسلے میں، مملوکوں نے یہ پالیسی جاری رکھی بلکہ ہر شے کو جھلس کر رکھ دینے کی پالیسی اختیار کی۔ بندرگاہوں کو اس طرح خراب کر دیا گیا کہ دشمن واپس بھی آئے تو ان سے کام لینے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ نہ ایوبیوں کے پاس کوئی قابل ذکر بحری قوت تھی اور نہ مملوکوں کے پاس کہ اگر فرنگی کسی بندرگاہ کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے آئیں، تو ان کی مدافعت کر سکے۔ فرعونوں کے زمانے کی طرح ایوبیوں اور مملوکوں کی بحری قوت کا انحصار جہاز سازی پر تھا، جو لبنان سے لکڑی مہیّا ہونے پر موقوف تھی اور لبنان کی زیادہ تر بندرگاہیں فرنگیوں کے قبضے میں تھیں ان فرنگیوں کی مراجعت کا زیادہ اندیشہ تھا جو شام و لبنان سے نکل کر قبرص جا ٹھہرے تھے۔ ادھر یہ حالت تھی، اُدھر ایک طرف تاتاری حملوں کی تباہ کاری جاری تھی۔ دوسری طرف زلزلے بربادی کا

Marfat.com

مقدّمہ حصّہ پورا کر رہے تھے۔ ۱۲۶۰ء سے ۱۳۰۳ء تک تاتاریوں نے چار مرتبہ شام پر حملہ کیا، جو مملوکوں کے ماتحت تھا اور پیچھے خون کی ایک سرخ ندّی چھوڑ گئے۔ عسقلان اور طرابلس کے درمیان تمام شہر یا تو کاملاً مسمار ہو گئے یا کم دبیش نصف کو عمداً برباد کردیا گیا۔[۱] ابن جُبیر نے ۱۱۸۵ء میں صور کو دیکھا تو کہا تھا کہ استحکامات میں کوئی شہر اس پر فائق نہیں۔ ایک صدی بعد ابوالفدا نے اسے تباہ حال دیکھا[۲]۔ صیدا کی کہانی سن لیجیے: ۱۱۰۷ء میں صلیبیوں کو رقم دے کر محاصرے سے نجات حاصل کی گئی۔ ۱۱۱۱ء میں بالڈون اوّل نے اسے فتح کرلیا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدّین نے اس کے استحکامات توڑ ڈالے۔ ۱۱۹۷ء میں صلیبی دوبارہ اس پر قابض ہو گئے۔ اُسی سال مسلمان پھر اس کے مالک بن گئے اور اسے تباہ کیا۔ ۱۲۲۸ء میں فرنگیوں نے یہاں ازسرِنو تعمیرات کیں۔ ۱۲۴۹ء میں پھر مسلمان اس پر قابض ہو گئے اور یہ تباہ ہوا۔ ۱۲۵۳ء میں لوئی نہم نے پھر اسے مستحکم کردیا۔ ۱۲۶۰ء میں تاتاریوں نے اسے بُری طرح پامال کیا۔ ۱۲۹۱ء میں الاشرف کے ماتحت یہ مستقلاً مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اُنھوں نے اسے منہدم کرادیا۔ پھر کیا امر باعثِ حیرت سمجھا جاسکتا ہے کہ دورِ حاضر میں یہ شہر اپنی سابقہ عظمت کا ایک عبرت انگیز مرقّع رہ گیا تھا۔[۳] مراکشی سیاح ابن بطوطہ ۱۳۲۶ء میں اس علاقے سے گزرا تھا۔ اس کے سفرنامے سے مندرجہ ذیل ملاحظہ فرمائیے:

"میں نے قلعہ عسقلان کا سفر کیا، جو کھنڈروں کا ڈھیر ہے۔ پھر میں عکّہ پہنچا، جو شام میں فرنگیوں کا دارالحکومت تھا، لیکن اب کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں ...... پھر میں صور پہنچا، وہ بھی برباد ہو چکا تھا، البتّہ اس سے باہر ایک گاؤں خاصا آباد ہے۔ پھر میں طبریہ گیا، جو کسی زمانے میں بہت بڑا اور شاندار شہر تھا، لیکن اب وہاں کوئی ایسی چیز نہیں، جو اس کی سابقہ وسعت اور شان و شکوہ کی شہادت بن سکے۔"[۴]

پندرھویں صدی کے زائرین اور سیّاح صورتِ حال میں بہتری کی کوئی دستاویز پیش نہیں کرتے۔ دلابراک کوایر برگنڈی کا ایک امیر اور زائر تھا۔ اس نے ۱۴۳۲ء اور ۱۴۳۳ء میں ارضِ مقدّس کی

---

[۱] دیکھیے ابوالفدا تقویم صفحہ ۲۳۹، لامنس شام جلد اوّل صفحہ ۲۶۵، جلد دوم صفحہ ۲-۳ + [۲] تقویم صفحہ ۲۴۳ +
[۳] تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار جلد اوّل صفحہ ۱۲۶، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۲ +
[۴] Bertrandon de la Brocquière فلسطین میں ابتدائی سفر مرتبہ ٹامس رائٹ صفحہ ۲۸۶ - ۲۹۲ + دوہی صفحہ ۱۱۵، دوہی کی تاریخ ازمنہ المشرق جلد ۴ صفحہ ۱۴۵ - ۱۴۶ +

زیارت کی تھی وہ لکھتا ہے: یافہ میں خیموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جن پر سرکنڈے پڑے ہوئے ہیں۔ عکّہ میں تین سو سے زیادہ گھر نہ ہوں گے اور بیروت موجودہ حالت سے بیشتر زیادہ شاندار تھا ٭

مملوک سلاطین نے ان فرامین کو از سر نو تازہ کر لیا، جو ذمیوں کے خلاف تھے۔ مسیحیوں اور یہودیوں کے لیے لازم ہو گیا کہ امتیازی لباس پہنیں اور گھوڑے یا خچر پر سوار نہ ہوں۔ صلیبی جنگوں کی وجہ سے عیسائیوں کے خلاف جو جذبہ پیدا ہوا تھا، اس کا ہدف اب مقامی مسیحی بن گئے۔ ۱۲۸۳ء میں قلاوون کی فوج ایک دور افتادہ مارونی قلعوں میں گھس گئی، یعنی بشرّی، احدان، حدیث الجبہ اور انھیں تباہ کر دیا[1]۔ مزید ہزاروں قبرص بھاگ گئے، جہاں آگے چل کر ان کی تمام نو آبادیوں کے نفوس کی تعداد اسّی ہزار ہو گئی۔ ۱۳۴۰ء میں وہاں ایک مارونی اسقف کا تقرر ہوا[2]۔ آج کل بھی قبرص میں مارونی مذہبی پیشواؤں میں ایک مستقل اسقف موجود ہے۔ مملوکوں کا نیا پروگرام یہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو یکسانی پر آمادہ کیا جائے۔ ان میں سے بعض گروہ ایسے تھے، جو دشمن کے وفادار رہے اور اسے امداد و راحت پہنچاتے رہے ٭

سُنّیوں اور درُوزیوں کا اختلاف زیادہ تر دینیات کی بنا پر تھا اور دروزیوں کو تخریب کا سرچشمہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ تعداد میں کم تھے۔ جغرافیائی لحاظ سے اکٹھے رہتے تھے، سیاسی اعتبار سے وہ کسی فوری کارروائی کے خواہاں نہ تھے، لہٰذا قائم شدہ حکومت کے لیے وہ کوئی فوری مسئلہ نہ بنتے۔ الاشرف نے جبراً انھیں ہمنوا بنایا، لیکن یہ ہمنوائی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ۱۳۰۰ء میں النّاصر کی فوج تاتاریوں کے مقابلے میں پسپا ہوئی تو دروزیوں کے تیر اندازوں نے بھی اسے ہراساں کیا۔ یہی زمانہ ہے، جب تاتاری حمص و دمشق پر قابض ہو چکے تھے اور پورے شام کے لیے خطرہ درپیش تھا ٭

لبنانیوں کے خلاف تمام مہموں میں سے النّاصر کی وہ مہمیں زیادہ تباہی خیز تھیں، جو پہلے ۱۳۰۲ء پھر ۱۳۰۶ء اور ۱۳۰۷ء میں کسروان[3] کے خلاف بھیجی گئیں۔ اس وقت کسروان کے حدود دریائے بیروت، جبل صنّین اور جبل الکلیسا تک پہنچے ہوئے تھے۔ موجودہ زمانے کا المتن بھی اسی میں شامل تھا اور وہاں مسیحی (مارونی اور یعقوبی) دروزی، شیعہ اور نُصیری رہتے تھے۔ صفد، طرابلس اور دمشق کی فوجوں نے ان مہموں میں حصہ لیا اور دمشق کا نائب جمال الدین آقوش ان کا کماندار تھا۔ وقت کے ممتاز عالم دینیات

---

[1] دویہی صفحہ ۱۱۵، دویہی کی تاریخ ازمنۃ المشرق جلد ۱۲ صفحہ ۱۴۵، ۱۴۶ +
[2] دیب صفحہ ۲۶۳ +
[3] ابتدائی روایت یہ ہے کہ بارھویں صدی میں ضلع کے ایک مارونی امیر کا نام کسریٰ تھا جس سے یہ نیا نام پڑا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت مسیحی اس پر قابض تھے۔ دیکھیے لامنس شام جلد دوم صفحہ ۱۹ +

ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ دروزی اور نصیری مومن نہیں، ان کا درجہ مسیحیوں سے بھی نیچے ہے اور ان کا استیصال کر دینا چاہیے[۱]۔ خود ابن تیمیہ نے بھی ان مہموں میں حصہ لیا۔ دروزیوں کے مقدم ابو اللمس کا صدر مستقر قصر سلوان میں تھا دوسرے حماملک کے مطہر حسن کا بلند آہنگ خطاب اب تک قائم ہے) عین صوفر کے قریب فیصلہ کن جنگ ہوئی (۱۳۰۵ء) پچاس ہزار کی فوج نے کسروانیوں کو تقریباً تباہ کر دیا، جن کی تعداد دس ہزار تھی۔ ان میں زیادہ تر دروزی تھے اور ضلع برباد ہو گیا۔ درخت کاٹ دیے گئے، مرد، عورتیں اور بچے قتل کر دیے گئے۔ بیروت کے شمال سے طرابلس کے جنوب تک پورا علاقہ جاگیروں میں تقسیم کر کے تین سو ترکمان خاندانوں کے حوالے کر دیا گیا[۲]۔ مارونی اور دروزی اس زمانے میں پہلو بہ پہلو امن کی زندگی بسر کرتے رہے۔ سنہ ۱۴۴۱ء میں دروزیوں اور مسیحیوں کے نمائندے پوپ کے نائب کے ساتھ دوستانہ مقاصد کی غرض سے روم پہنچے[۳]۔

اگرچہ مملوکوں کی پالیسی مختلف فرقوں کو ختم کرنے یا مسلمانوں کے اندر جذب کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، تاہم وہ خاصے کمزور ہو گئے۔ شام، لبنان اور فلسطین مدت تک فرنگیوں (زیادہ تر فرانسیسیوں) کے زیر اثر رہے تھے۔ اب وہاں بہ حیثیت عمومی نئی پالیسی چلانے میں کامیابی ہوئی۔ مزید برآں مشرق و مغرب کے درمیان آہنی پردہ ذرا نیچا ہو گیا، جس نے مملوکوں کے جانشین یعنی عثمانی ترکوں کے دور میں بڑی شدت اختیار کر لی۔

---

[۱] صلاح الدین المنجد ولاتِ دمشق فی عہد العثمانی صفحہ ۶، ۷۔ [۲] دیہی صفحہ ۱۲۳، ۱۲۵، المشرق جلد ۲۴ صفحہ ۱۶۰، ۱۶۴، صالح صفحہ ۳۲، ۳۳، صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱، ابراہیم عواد لبنان فی عہد الممالیک، المشرق جلد ۲۴ صفحہ ۱۶، ۲۱۔ [۳] عواد، المشرق جلد ۲۴ صفحہ ۲۸، دیب صفحہ ۲۲۲۔

## بائیسواں باب

# چودھویں اور پندرھویں صدی

**مملوکوں کا دور**

چودھویں صدی کے آغاز میں مملوکوں کی قوت اوج کمال پر پہنچی ہوئی تھی مشرق و مغرب کا کوئی حکمران ان کی برابری کا دم نہیں بھر سکتا تھا اور غالباً کوئی دوسرا مسلمان حکمران ان پر سبقت نہ لے جا سکا۔ انھوں نے آخری صلیبیوں کو شام سے نکال دیا تھا۔ تاتاریوں کا سیل روک دیا تھا۔ شام و لبنان کے مخالف فرقوں کو کچل ڈالا تھا اور سنّیوں کی برتری قائم کر دی تھی۔ ان کی مملکت بہت وسیع اور محفوظ تھی، جس میں مصر، شام، لبنان، فلسطین اور حجاز شامل تھے۔ اب وہ اپنی مرضی کے مطابق جو طریقہ چاہتے، اختیار کرتے اور بدلے ہوئے حالات میں جس مسلک پر چاہتے گامزن ہوتے۔

**لبنان کی تقسیم**

شام کے علاقے کو انتظامی اعتبار سے انھوں نے چھ صوبوں میں تقسیم کر لیا۔ (ہر صوبے کو نیابہ یا مملکت کہتے تھے) اور لبنان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تین صوبوں میں ضم کر دیا۔[1] اس تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ آزادی حاصل کرنے کیلئے کوئی کوشش نہ کی جا سکے۔ شمالی لبنان اور ساحلی علاقہ لاذقیہ سے جبیل تک صوبۂ طرابلس میں شامل تھے۔ جنوبی لبنان اور صور صوبۂ صفد کا حصّہ تھے۔ باقی لبنان صوبۂ دمشق کا جزو تھا، یعنی اسی صوبے میں صیدا، بیروت، بعلبک اور البقاع شامل تھے۔ پھر البقاع کو دو انتظامی ضلعوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک شمالی ضلع یعنی ضلع بعلبک اور دوسرا جنوبی یعنی عزیزی۔ گورنر یا نائب ابتدا میں سلاطین کے غلام تھے۔ ان میں سے ارباب سیف کو صوبوں کی حکومت سونپی جاتی تھی، نہ کہ ارباب قلم کو۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ تمام گورنر یا نائب ایک دوسرے سے الگ الگ مسلک پر قائم رہتے۔ ہر ایک کا الگ دربار ہوتا، جس کا پیمانہ قاہرہ کے سلطانی دربار سے قدرے کم ہوتا۔ انھیں تھوڑی دیر کے لیے مقرر کیا جاتا۔ پھر ان میں

---

[1] القلقشندی صبح الاعشیٰ جلد چہارم صفحہ ۱۶۳ ببعد۔

Marfat.com

رقابتیں موجود ہوتیں، جن کی وجہ سے وہ ذاتی اقتدار کی افزائش کے لیے کچھ نہ کر سکتے اور مرکزی اقتدار کے خلاف باہم اتحاد کے امکانات بھی نہ تھے۔ اونچے درجے کا کوئی بھی افسر تین سال سے زیادہ کسی عہدے پر نہ رہا اور بہت سے قاضیوں نے اپنی زندگی میں دس دس مرتبہ بحالی و برطرفی کے احکام وصول کیے۔ برقوق (۱۳۸۳ء۔۱۳۹۸ء) کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق کے ایک گورنر کو موقوف کیا اور فی الفور اس کی جگہ دوسرا مقرر کر دیا۔[1] گورنر بڑے مسرف تھے۔ وہ رعایا سے جبری تحصیلات کرتے۔ ان میں باہم جھگڑے پیدا ہو جاتے اور زیادہ تر لوگ نااہل تھے۔ اس وجہ سے پوری سلطنت کچھ مدت کے لیے بدنظمی کا مورد بن گئی۔ قحطوں، خشک سالیوں، زلزلوں اور طاعونوں نے بھی تباہی پھیلائی۔ المقریزی[2] بعلبکی الاصل تھا اور اپنے عہد کا ممتاز مؤرخ مانا جاتا تھا۔ اس نے ایک پوری جلد ان قحطوں کی نذر کی ہے، جن سے مصر اور آس پاس کے علاقے ۱۴۰۵ء تک متاثر ہوئے اور اسی سال اس نے کتاب لکھی تھی۔ اس کے ہمسر مؤرخ ابن تغری بردی[3] کا بیان ہے کہ چودھویں صدی میں طاعون کے چار حملے نہایت شدید ہوئے۔ پندرھویں صدی میں کم از کم چودہ وباؤں کا تذکرہ مختلف وقائع نگاروں نے کیا ہے، گویا بالاوسط ہر سات سال کے بعد وبا نمودار ہوتی رہی۔ ۱۳۰۲ء کے زلزلے میں مصر و شام کے اندر بے شمار لوگ ملبے کے نیچے دفن ہو گئے۔ دمشق میں جامع اموی کی دیواریں پھٹ گئیں۔ صفد کے قلعے کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ عکہ کے قریب سمندر پہلے سے دو فرسنگ پیچھے ہٹ گیا۔ پھر انتہائی شدت سے خشکی پر چڑھ گیا۔[4] ۱۳۴۸ء میں طاعون اعظم نمودار ہوا۔ اس کے آخری دنوں میں دمشق کے اندر روزانہ دو ہزار آدمی مرتے تھے۔ ابن بطوطہ[5] اس وقت مرکز شام میں تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا جلوس دیکھا، جس میں بوڑھے، جوان، مرد، عورت، مسلمان، مسیحی، یہودی شامل تھے۔ اُنھوں نے اپنی مقدس کتابیں اُٹھا رکھی تھیں اور رو رو اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے رحم کی التجائیں کر رہے تھے۔ اس جلوس سے تین روز پہلے اُنھوں نے گورنر کے حکم کے مطابق روزے رکھے تھے۔ ابن تغری بردی[6] کہتا ہے کہ اس وبا میں حلب کے اندر روزانہ پانسو اور دمشق کے اندر روزانہ بارہ سو آدمی مرتے تھے۔ صفد، یروشلم، نابلس، الکرک، غزہ اور دوسرے ساحلی شہروں کے باشندے تباہ ہو گئے۔ انسانوں کی لائی ہوئی مصیبتوں کے ساتھ قدرت کی ان آفتوں اور بلاؤں نے مل کر مملوکوں کے

---

۱؎ صالح صفحہ ۱۹۸، نظم دمشق کے لیے مزید دیکھیے: کولا اے زیادہ مملوکوں کے ماتحت شہری زندگی صفحہ ۱۱، ۱۲ + ۲؎ اغاثۃ الامۃ فی کشف الغمۃ + ۳؎ جلد پنجم صفحہ ۷۰، ۷۶، ۱۵۴، ۱۸۵، ۲۰۸، ۵۰۷ + ۴؎ مقریزی، سلوک جلد اوّل حصہ سوم صفحہ ۹۲۴، ۹۲۵ + ۵؎ جلد اوّل صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹ + ۶؎ جلد پنجم صفحہ ۶۴، ۶۸ +

Marfat.com

دور میں آبادی اتنا گھٹا دی کہ زمانۂ سابق سے صرف ایک تہائی باقی رہ گئی۔ اس وجہ سے مقبوضات جن میں کوہستانِ لبنان بھی شامل تھا، سب سے کم متاثر ہوئے +

کسروان میں مارونیوں اور دروزیوں کی تباہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اوّل کی مردانی روح اور دوم کا فوجی جوش وخروش کچلا گیا۔ بیروت وطرابلس کے سوا تمام ساحلی شہروں میں نمایاں تنزل پیدا ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ لاطینیوں کے ساتھ تجارت کا سلسلہ باقی نہ رہا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مملوکوں کی طرف سے نظم وضبط کا شدید انتظام تھا۔ ان دو بندرگاہوں (بیروت وطرابلس) کو اس وجہ سے مستثنیٰ رکھا گیا کہ تجارتی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایسا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ مارونی بطریق اعظم اپنا مرکز بدلتا رہا۔ کبھی ایک گاؤں میں ہوتا، کبھی دوسرے گاؤں میں۔ رومہ کے ساتھ خط وکتابت پوپ یوجینئیس رابع[1] (۱۴۳۱ء تا ۱۴۴۷ء) کے زمانے تک معطّل رہی۔ یونانی ملکی بطریق اعظم کو منصب عطا کرتے وقت ہدایت کی گئی کہ نہ کسی اجنبی سے ملاقات کی جائے نہ اسے مہمان رکھا جائے، نہ کسی اجنبی حکمران سے خط وکتابت کی جائے۔ یعقوبی بطریق اعظم[2] کو بھی یہی انتباہ کیا گیا۔ بہ ایں ہمہ شمال کے مارونی اپنے امیروں کے ماتحت مقامی خود مختاری سے مستفید رہے۔ ان امیروں کو مقدم کہتے تھے، جو محاصل جمع کرتے، مقامی جھگڑوں کا فیصلہ سناتے۔ البتہ وہ صرف ان مقدموں کی سماعت کر سکتے تھے، جو شخصی نوعیت کے ہوتے، باقی مقدمات پادریوں کے حوالے ہو جاتے۔ دویہی[3] نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ایک روز سلطان الظاہر برقوق بھیس بدل کر بشری پہنچا۔ ایک چھوٹے مسیحی عہدہ دار نے، جس کا نام یعقوب ابن ایّوب تھا، اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ برقوق نے اس کے بدلے میں تانبے کی تختی پر ایک فرمان لکھ دیا، جس کے مطابق اس مسیحی عہدہ دار کو ضلع کا مقدم بنا دیا گیا۔ مشہور ذیر قنوبین میں بھی برقوق کا بڑا اچھا استقبال ہوا تھا۔ چنانچہ اس خانقاہ کو عام محاصل سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یہ ۱۳۸۹ء یا ۱۳۹۰ء کا واقعہ ہوگا، جب برقوق کی جگہ حاجی نے عنانِ حکومت سنبھال لی تھی +

سیاسی اعتبار سے جنوبی لبنان کی حالت بہتر رہی۔ حاصبیہ اور وادی التیم دروزیّت کے گہوارے تھے، جہاں بنی شہاب اور بعقلین کے ماتحت تھے۔ ان کے آس پاس شوف بنی معن کے تابع تھے۔ بھور اور جبل عامل کے متاولہ بنی عاملہ کے زیرِ نگرانی تھے۔ بنی معن اور بنی شہاب کو آگے چل کر

---

[1] دب صفحہ ۱۵۶، ۲۱۹ + [2] العمری التعریف بالمصطلح شریف صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶ + [3] طنوس الشریاقی اخبار الاعیان فی جبل لبنان نے ایک باب اس پر لکھا ہے صفحہ ۲۰۱، ۲۲۳ + [4] صفحہ ۱۳۱، تسدیاق صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴ +

ممتاز کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ خود اس زمانے میں تنوخ قبیلے کی شاخ بنی بحتر کو امتیاز حاصل تھا۔

**غرب کے بحتری**

بحتری بیروت اور الغرب کے امرا[1] تھے۔ الغرب سے مراد وہ متصلہ پہاڑی ڈھلانیں ہیں، جو جنوب میں الدامور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے ابتدائی مقام سلحموں اور عرمون تھے۔ یہ ۱۱۳۵ء سے پہلے آباد ہوئے تھے اور ان کے پاس جاگیریں تھیں۔ انھوں نے بیروت و صیدا کے صلیبیوں کے پاس اپنی فوجی خدمات پیش کر دیں۔ جب تاتاریوں اور مملوکوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں تو بحتری نمائندے بعض اوقات دونوں کے پاس موجود ہوتے تاکہ جو بھی فریق کامیاب ہو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے[2]۔ احتیاط سے مناسب حالات کا انتظار کرنا اور دورخی پر عمل پیرا رہنا کوئی نیا واقعہ نہ تھا۔ اس سرزمین میں یہ طرز عمل مسیح سے چودہ صدیاں پیشتر بھی جاری تھی۔ بعد ازاں فخر الدین اوّل (۱۵۱۶ء) اور اس کے جانشین کے زمانے تک یہی ہوتا رہا۔ مملوکوں نے بحتریوں کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ اگر فرنگیوں کا حملہ ساحل پر ہو تو خصوصاً قبرص سے اس کی مدافعت کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے پندرھویں صدی تک اپنا قبضہ قائم رکھا۔ ان کا نظم و نسق بہت اچھا تھا اور غلعلوں کو ان کے ماتحت نیم خود مختاری اور ایک حد تک خوش حالی حاصل رہی۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو سُنّی مسلمان کہتے تھے، لیکن غالباً اپنی دروزی رعایا کے طریقے پر چلتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے بیروت کو بیرونی تجارت کا مرکز بنا لیا اور اسے دمشق کی بندرگاہ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ قبرص اور بیروت کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت باقاعدہ شروع ہو گئی۔ یروشلم کے زائرین یہیں اُترتے اور یہیں سے آگے جاتے۔ یورپی تاجروں کو کارواں سرائیں (خان)، حمّام اور گرجے تک قائم کرنے کی اجازت دے دی[3]۔ شہر کی آبادی دس ہزار تک ضرور پہنچ گئی ہوگی۔ چونکہ بیروت نے اطالوی جمہوریتوں اور یورپی مملکتوں سے تعلقات از سر نو پیدا کر لیے تھے، اس لیے یہ پورے اندرونی علاقے کی بندرگاہ بن گیا۔ بیروت سے دمشق تک ڈاک (برید) کا سلسلہ جاری تھا اور بیبرس سے قاہرہ، قاہرہ سے دمشق تک یہ سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ خطرے کا دور آجاتا تو نامہ بر کبوتروں سے کام لیا جاتا یا آگ جلا کر اشارے کیے جاتے۔ آگ جلا کر اشارے کرنے کا سلسلہ رات کے وقت اس بُرج سے شروع ہوتا، جو راس بیروت پر بنایا گیا تھا۔ وہاں سے یہ اشارے پہلے

---

[1] امیر کا واحد، امیر عربوں میں سالار کو کہتے تھے اور مقدّم اس آدمی کو، جو شمالی لبنان میں کسی آبادی میں ممتاز ترین ہوتا۔ اس لفظ کا پس منظر سریانی ہے۔ [2] صالح صفحات ۵۱، ۵۷، ۶۵، ۸۰، ۱۹۶۔
[3] ایضاً صفحہ ۳۹، ۴۰، فان سوتم صفحہ ۴۹۔

Marfat.com

مغربی لبنان کی چوٹی بوارش تک جاتے، پھر مشرقی کوہستان کی چوٹی یبوس تک یا آلاخر جبل محالصحیہ تک پہنچ جاتے، جو دمشق کے پاس ہے[1]۔

دمشق اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ ۱۳۱۲ء سے ۱۳۴۱ء تک وہاں ایک ایسا شخص رہا، جس کا وجود مملوکی شام کی تاریک سرگزشت میں ایک نادر روشنی کا نقطہ تھا۔ یہ شخص تنکز تھا۔ ابتدا میں یہ سلطان الاشرف کا غلام تھا۔ اس نے الدامور (بیروت و صیدا کے درمیان) کا پل تعمیر کرایا، جو بار بار طغیانی کے باعث ٹوٹ جاتا تھا۔ بیروت کے بعض دمدمے درست کرائے۔ وہاں نئی سرائیں اور حمام بنوائے۔ بحتریوں کے مقامی نظم کا وہ حامی تھا۔ اس نے رفاہ عامہ کے جو کام کیے، ان سے دوسرے شہروں کے علاوہ یروشلم بھی مستفید ہوا، جس کے لیے اس نے پانی کا انتظام کیا۔ پھر اس پر سرکاری سرمایے میں تغلّب کا الزام لگا اور اسے سکندریہ میں قید کر دیا گیا، جہاں وفات پائی[2]۔ اس کے ایک جانشین کو ۱۳۶۵ء میں حکم ملا کہ فی الفور ایک بیڑا تیار کرے تاکہ لوسینیان سے انتقام لیا جائے، جو قبرص میں بیٹھا تھا اور اس کے جہاز مسلسل لبنان و مصر کے ساحلی شہروں میں ہراس پیدا کرتے رہتے تھے۔ ۱۳۰۳ء میں فرنگیوں نے ایک بحتری امیر کو گرفتار کر لیا، جب وہ الدامور کے نزدیک تیتر کا شکار کھیل رہا تھا اور تین ہزار دینار فدیہ لے کر اسے رہا کیا[3]۔ ۱۳۶۵ء میں فرنگیوں نے سکندریہ پر حملہ کیا، لہٰذا بیروت کے نزدیک ایک بڑے سے بیڑے کی تیاری شروع ہو گئی، لیکن دو جہازوں پر بے اندازہ رقمیں صرف ہو چکیں تو یہ منصوبہ یکایک ترک کر دیا گیا۔ جو جہاز تیار ہو چکے تھے، نیز جو زیر تعمیر تھے، وہ وہیں گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیے گئے اور ان کے لیے جو لوہا فراہم کیا گیا تھا، وہ اہل بیروت چراتے رہے۔ جہاز سازی کے لیے یہ مقام اس لیے تجویز ہوا تھا کہ دیودار کے جنگل قریب تھے۔ اس زمانے میں یہ جنگل بہت وسیع تھے۔ پاس ہی خام لوہے کی کانیں تھیں اور خام لوہا بیروت سے مصر بھی بھیجا جاتا تھا[4]۔ ۱۳۸۱ء میں جینوا کے ایک بیڑے نے صیدا کو لوٹا اور بیروت پر حملہ کیا۔ دشمن کے پہنچنے کی اطلاع آپ کے ذریعے سے دمشق پہنچ گئی تھی۔ اگلے روز شام کو ایک رسالہ آیا، مگر دفاع میں حصہ لینے کا وقت گزر چکا تھا[5]۔

---

[1] فان سوشم صفحہ ۸۰، شویاق صفحہ ۲۱۲، ۲۱۳۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۷، ۱۱۷، ابن بطوطہ جلد اوّل صفحہ ۱۲۱، ابن الیاس، بدائع الظہور فی وقائع الدہور جلد اول صفحہ ۱۷۲۔ [3] صالح صفحہ ۱۴۹، ۱۵۰۔
[4] ایضاً صفحہ ۳۴، ۳۵، ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۱۳۳۔ [5] ایضاً صفحہ ۳۵-۳۶۔

صالح کے باپ نے اس سلسلے میں مدافعت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۴۰۴ء میں پھر ایک بیڑا بیروت کے سامنے نمودار ہوا۔ شہر کو لوٹا، منڈی کو جلایا، جو بندرگاہ کے قریب تھی اور باشندوں کو پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ غالباً فرنگیوں کو یقین ہو گیا ہوگا کہ تجارتی تعلقات قائم رکھنا بہ حیثیت مجموعی زیادہ مفید ہے۔

## لبنان میں جاگیرداری

مصری سلاطین نے جاگیروں (اقطاع) میں ردو بدل کی پالیسی اختیار کی تھی اور انھیں غیر موروثی بنا دیا تھا۔[1] لیکن لبنان کے تعلق میں اس پر عمل نہ ہوا۔ مملوکوں کی پالیسی یہ تھی کہ جاگیردار بہر حال قاہرہ کے دست نگر رہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور کی طرح جاگیر کسی خدمت کے معاوضے میں دی جاتی تھی۔ عموماً جنگی خدمت کے عوض میں اور اس کا قبضہ خلیفہ یا سلطان کی رضا تک باقی رہتا تھا۔ جاگیردار کے لیے ضروری تھا کہ سالانہ خراج کے علاوہ مقامی فوج کا ایک جیش بھی تیار رکھے۔ بحتریوں کی جاگیریں مملوکوں کی حکومت کے آخری دور تک جاری رہیں۔ ۱۳۷۵ء میں العفورہ کا مارونی مقدم فوت ہوا تو اس کی بیٹی جاگیر کی وارث بنی[2] اور اس نے ایک وحداح سے شادی کر لی۔ اس طرح خاندانِ وحداح جاگیرداروں میں شامل ہوا کہ اب تک باقی ہے۔ ۱۳۲۲ء میں حاصبیہ کے حسین الشہابی کو سلطان کی طرف سے حکم ملا کہ حاکم کرک کے خلاف جنگ کے لیے فوج مہیا کی جائے۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ البقاع کے مقدموں کو اس کے خلاف جنگ پر ابھار گیا تو اس نے مقدموں کے پانسو آدمی قتل کر دیے۔[3] بحتریوں نے بھی فوج مہیا نہ کی۔ ان کے ذمے صرف یہ کام تھا کہ بیروت و صیدا کے درمیان ساحلی علاقے کی حفاظت کریں اور اس میں دونوں شہر بھی شامل تھے۔ اس غرض سے انھوں نے نوے سوار بھرتی کر رکھے تھے، جن میں سے تیس مہینا بھر خدمت انجام دیتے۔

مصر و شام کے مزارعین کے برعکس لبنانی مزارعین غلام نہ تھے۔ انھوں نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ جب چاہتے، ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاتے اور جس مالک سے چاہتے کھیتی باڑی کے لیے زمین لے لیتے۔ لاطینیوں نے جو نظام جاری کیا تھا، اس میں بھی مزارعین کو آزادی حاصل نہ تھی۔ لبنان کی جاگیریں عموماً چھوٹی تھیں۔ کم سے کم ایک گاؤں کی اور زیادہ سے زیادہ دس گاؤں کی۔ یہ امراء کے خاندانوں میں بٹ گئی تھیں۔ مزارعین کو پیداوار میں سے مقررہ حصہ

---

[1] قلقشندی جلد چہارم صفحہ ۵۰-۵۱ ؛ [2] شدیاق صفحہ ۱۰۹ ؛
[3] ایضاً صفحہ ۴۸-۴۹ ؛

Marfat.com

ملتا (مقاسمہ)۔ یہ حصّہ تین چوتھائی اور دو تہائی کے درمیان ہوتا۔ جن زمینوں کے لیے آبیاری کا انتظام تھا، ان میں کاشتکاروں کا حصّہ بالاوسط نصف ہوتا۔ بحتری جاگیردار کے محاصل میں زیتون، صابون اور ریشم بھی شامل تھے[1]۔

**صوبے کا دارالحکومت طرابلس** تمام لبنانی شہروں میں سے طرابلس نائب یا گورنر کا مرکز قرار پایا، جو حما اور صفد کے گورنروں سے بہ اعتبار درجہ بلند تر تھا۔ البتہ دمشق و حلب کے گورنروں کو اس پر فوقیت حاصل تھی[2]۔ صیدا بھی دمشق کی برآمد کا ایک مرکز بن گیا اور بیروت سے مقابلہ کرتا رہا، لیکن صور بدستور تباہ حال رہا۔ ایک سیاح لکھتا ہے: یہاں کسی زمانے میں مسیحیوں کا ایک بڑا اور عمدہ شہر تھا، مگر خرم قیتین (مسلمان) نے اس کا بڑا حصّہ تباہ کر ڈالا اور مسیحیوں کے خوف سے وہ اس کی حفاظت کر رہے ہیں[3]۔ فان سوشم[4] کی آمد پر یہ بالکل بے آباد تھا۔

صوبائی گورنر کے ابتدائی فرائض میں قیام امن، انسداد فساد اور اعلیٰ افسروں کا تقرر بھی شامل تھا۔ یعنی وہ افسر جنھیں سلطان مقرر نہیں کرتا تھا۔ مملوکوں کے نظم و نسق میں مرکزیت کو اہمیت حاصل تھی۔ ۱۳۱۷ء میں طرابلس کے گورنر نے حکم دیا کہ شہر کی خلال بار (شراب فروشی کا مقام) بند کر دی جائے کیونکہ وہاں شراب نوشی کے علاوہ اور بھی برے کام ہوتے ہیں۔ نیز نصیریوں کے دیہات میں ایک ایک مسجد بنائی جائے۔ دوسرے درجے کا افسر قاضی تھا، جو شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتا۔ مرکز حکومت میں قاضی القضاۃ کی عدالت تھی۔ طرابلس کا ایک مشہور قاضی ابن منظور (۱۲۳۲ تا ۱۳۱۱ء) تھا، جو مصر میں پیدا ہوا اور اس کی کتاب لسان العرب[5] جوہری (۱۰۰۳ء) کی صحاح کی طرح اور خیر حروف کے پیش نظر ابجدی ترتیب کے مطابق مرتب ہوئی تھی۔ یہ عربی دنیا میں بہت رائج رہی اور اب تک رائج ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے مقامی غازی تھے۔ عدالت کے پاس ہی پولیس کا مرکز رئیس الشرطہ تھا، جو گورنر کے احکام اور قاضیوں کے فیصلے نافذ کرتا۔ منڈیوں کی نگرانی کے لیے محتسب مقرر تھے، جو دوسرے فرائض کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں کا بھی

---

[1] صالح صفحہ ۱۸۱، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے عواد کے مقالے 'المشرق' جلد ۴ صفحہ ۲۶، ۲۸، نیز پولیاک کی کتاب 'مصر، شام، فلسطین اور لبنان میں جاگیرداری' صفحہ ۴۶ ببعد۔ [2] ابن الشحنۃ، 'الدر المنتخب فی تاریخ مملکۃ الحلب' صفحہ ۲۵۷، ۲۵۸۔ [3] سرجان مانڈے ول کی کتاب، دیکھیے ٹامس رائٹ کے ابتدائی سفر صفحہ ۱۴۱۔ [4] ص ۵۰۔ [5] یہ کتاب بولاق میں شائع ہوئی، بیس جلدیں ہیں۔

Marfat.com

معائنہ کرتے۔ اجناس فروخت پر نظر رکھتے۔ ذرائع باٹوں کی نگرانی کرتے۔ ساتھ ساتھ عوام کے اخلاق کی درستی پر بھی متوجہ رہتے۔ دراصل یہی لوگ نافذین قانون تھے اور اس حیثیت سے انھیں عوام کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ مملوکوں کے زمانے سے ان افسروں کے فرائض کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں محتسبوں کا فرض یہ بھی بتایا گیا کہ فصّادوں (رگ زنوں)، گگرڈوں، طبیبوں، جرّاحوں، امراض چشم کے ماہروں، ہڈّی بٹھانے والوں، معلّموں، واعظوں، نجومیوں اور کاتبوں کی نگرانی کریں۔[۱] وہ بعض پیشہ وروں کی بھی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ابن خلدون[۲] مملوکوں کے ماتحت قاہرہ میں مالکی قاضی القضات تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ حسبہ (احتساب) بھی حکومت کے مذہبی فرائض میں داخل ہے۔[۳]

ذمّی مسلمانوں کے قائم کردہ معمول کے مطابق اپنے پادریوں کے دائرہ اختیار میں ہے، جن کا سرخیل بطریق اعظم تھا۔ وہی ذمّیوں اور حکومت کے درمیان واسطے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ بہت سے مارونی صوبۂ طرابلس میں آباد ہو گئے، لیکن ان کے بطریق اعظم کی سرکاری دستاویزوں میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں، البتہ یونانیوں، ملکیوں اور یعقوبیوں کے بطریقوں کا ذکر موجود ہے۔[۴] مارونی زیادہ تر پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے۔ انھیں نسلی اعتبار سے ایک اقلیت سمجھا جاتا تھا، نہ کہ ایک جداگانہ نام کی قوم کے اعتبار سے۔ قلقشندی[۵] نے انھیں جبلیوں (کوہستانیوں) میں شمار کر لیا ہوگا، یعنی وہ بھی ترکمانوں اور کُردوں میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ جن کے اپنے مقدم تھے۔ بطریق اعظم اپنی جماعت کے اچھّے چال چلن کا ذمّہ دار تھا۔ نکاح، طلاق اور وراثت کے قوانین اسی کے ہاتھ میں تھے اور کلیساؤں کے فیصلوں کے مطابق وہ فیصلے صادر کرتا تھا۔ خیراتی ادارے بھی اسی کی زیر نگرانی تھے۔ ان میں زمینیں بھی شامل تھیں اور عورتیں بھی۔ محاصل جاگیردار امراء وصول کرتے تھے۔ مسیحیوں اور یہودیوں کے لیے امتیازی لباس کے ضوابط نافذ کر دیے گئے۔ پوری سلطنت میں ذمّیوں کے خلاف جو رنجش تھی، وہ شام کے مشہور سلفی عالم ابن تیمیہ (۱۲۶۳ء-۱۳۲۸ء) کی تصانیف میں نمایاں ہوئی جس نے یہودیوں اور مسیحیوں کے خلاف لکھا اور اس امر پر اعتراض کیا کہ انھیں گرجے اور ہیکل باقی رکھنے یا تعمیر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ابن تیمیہ ابن حنبل کا پیرو اور ابن عبدالوہاب کا پیشرو تھا۔[۶] ڈلا ہما کوائیہ[۷] ۱۴۳۲ء میں دمشق گیا تھا۔ شہر میں داخل ہونے سے پیشتر اسے سواری سے اترنا پڑا۔

---

[۱] ابن الاخوہ معالم القربۃ فی احکام الحسبہ صفحہ ۱۶۵، ۱۸۲۔ [۲] مقدمہ صفحہ ۱۸۸۔ [۳] دیکھیے زیادہ صفحہ ۱۰۵، ۱۲۷۔ [۴] کاڈی فرائے ڈیمومینس صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۸۔ [۵] جلد نہم صفحہ ۲۵۴، اعمری تعریف صفحہ ۱۱۳، ۱۱۴۔ [۶] شیخ الاسلام ابن تیمیہ امام احمد بن حنبل کے پیرو نہ تھے، اگرچہ انھیں حنبلی مشہور کر دیا گیا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اس لیے انھیں زیادہ پسند کیا کہ ان کی تحریرات کتاب و سنّت سے زیادہ سے زیادہ مطابق تھیں۔ [۷] دیکھیے فائٹ کے ابتدائی سفر صفحہ ۲۹۳۔

**زراعت** مصنف اور سیاح سرزمین کی زرعی پیداوار کی مقدار و کیفیت دونوں کی مدح و ستائش کرتے رہے۔ لبنان اور ساحلی میدان میں پھل اعلیٰ درجے کے پیدا ہوتے تھے۔ البقاع خطے کی پیداوار میں بڑھا ہوا تھا۔ شامی جغرافیہ نویس[1] (الدمشقی وفات ۱۳۲۷ء) کا بیان ہے کہ طرابلس کے باغ دریائے ابو علی سے سیراب ہوتے ہیں۔ ان باغوں میں پھل والے درخت اتنے ہیں کہ ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس نے گنّے، انجیر، لیموں اور قلقاس[2] کا ذکر بہ طور خاص کیا ہے۔ پہاڑی علاقے میں ان جڑی بوٹیوں کی افراط ہے، جو دواؤں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک پودا چٹانوں کے شگافوں میں پیدا ہوتا ہے اور رسّوں کے ذریعے سے ان شگافوں تک پہنچتے ہیں۔ اس سے تریاق پیدا ہوتا ہے[3]۔ ایک درخت ایسا ہے جس کی لکڑی سے چمچے اور دوسرے برتن بنتے ہیں۔ سونے اور چاندی کے پترے چڑھا کر انھیں باہر کے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ الدمشقی کا معاصر ابوالفدا[4] (وفات ۱۳۳۱ء) بیروت کے باغوں اور زمین کی زرخیزی کا ذکر کرتا ہے۔ نیز بتاتا ہے کہ اس کے لیے زمین دوز نالیوں کے ذریعے سے پانی لایا جاتا ہے اور یہاں دو برج ہیں۔ نیا طرابلس خشکی پر آباد ہوا تھا۔ ابن بطوطہ ۱۳۵۵ء میں یہاں پہنچا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں جا بجا پانی کی گذرگاہیں ہیں۔ شہر باغات سے گھرا ہوا ہے۔ اس کی زمین بھی زرخیز ہے اور سمندر سے بھی بے شمار چیزیں ملتی ہیں۔ بعلبک دریاؤں اور باغوں کے ساتھ دمشق کا نمونہ تھا ٭

یورپی سیاح بھی اس سرزمین سے یکساں متاثر ہوئے۔ جرمن پادری فان سوشم[5] ۱۳۳۶ء سے ۱۳۴۱ء تک ارض مقدس میں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ شمالی لبنان کے پہاڑی علاقے ان خوشگوار درختوں، پھلوں اور سبزیوں سے معمور ہیں، جو انسانی دماغ کے تصوّر میں آ سکتے ہیں۔ یہاں بے شمار شہر اور دیہات ہیں اور ان سب میں مسیحی رہتے ہیں۔ ایک اور جرمن راہب[6] برچرڈ ۱۲۳۲ء میں مشرق گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ طرابلس کے اردگرد کی زمین بہشت کا نمونہ ہے۔ یہاں بے شمار خوبصورت نکستان، زیتون و انجیر کے باغ اور گنّے کے کھیت ہیں۔ میں نے ان جیسی چیزیں دنیا کے کسی حصے میں نہیں دیکھیں ٭

**صنعت و تجارت** ان بیانات سے اقتصادیات کا جو نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے، حقیقی تصویر ویسی گلرنگ نہ تھی۔ مرکزی حکومت کے محاسن اور نامحکم مالی نظام کو

---

[1] صفحہ ۲۰۷ ٭ [2] ایک بوٹی ہوتی ہے، جو صحت کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے ٭ [3] دمشقی صفحہ ۱۹۹، ۲۰۰ ٭ [4] تقویم صفحہ ۲۴۷ ٭ [5] جلد اول صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸ صفحہ ۱۸۵ ٭ صفحہ ۴۸ ٭
[6] دیکھیے ارض مقدس کے متعلق ایک بیان مترجمہ سٹیوارٹ صفحہ ۱۶ ٭

Marfat.com

غارت گرانہ نہ سمجھئے۔ پھر بھی اس سے صورت حال کی نزاکت میں اضافہ ہوا۔ گھوڑوں اور کشتیوں ہی پر نہیں بلکہ زندگی کی نہایت ضروری چیزوں پر بھی بھاری ٹیکس عائد تھے، مثلاً نمک اور چینی بعض جنسوں کی اجارہ داری سلاطین کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اپنے فائدے کے لیے قیمتوں میں ہیر پھیر کرتے رہتے بعض اوقات حاکموں کے فائدے کے لیے سکّوں کی قیمت گھٹا دی جاتی۔ اس طرح افراطِ زر میں اضافہ ہوتا۔ مملوک نسل، زبان اور ثقافت کے لحاظ سے اہلِ ملک کے لیے اجنبی تھے۔ انھوں نے اپنے متعلق اچھّی رائے پیدا کرنے کی غرض سے رفاہی کاموں پر خاصی رقمیں صرف کیں۔ مثلاً عالیشان درس گاہیں، مسجدیں اور مقبرے، جن کی وجہ سے بعض اوقات خزانہ خالی ہو جاتا تھا اور اسے ازسرِنو بھرنے کے لیے ناجائز اور جابرانہ وسائل استعمال کیے جاتے تھے۔ چودھویں صدی کے نصف آخر میں سلاطین نے اہلِ وینس سے جو معاہدے کیے، نیز یورپی تاجروں کو جو رعایتیں دیں، ان کی وجہ سے جنسوں کا مبادلہ شروع ہو گیا اور عوام کے نقصانات کی کم از کم جزوی تلافی کا موقع نکل آیا۔ اس اثنا میں یورپیوں نے مسیحیوں کو ارضِ مقدس کی زیارت کی اجازت ازسرِنو دے دی۔

سُوتی اور ریشمی کپڑے، چینی، بلوری برتن اور ظروف گلی ساحلی علاقے کے ممتاز مصنوعات رہے۔ طرابلس میں صلیبی دور کے اختتام پر چار ہزار کھڈیاں تھیں[1] ۱۴۲۲ء میں وہاں ایک پولستانی یا جرمن سیاح پہنچا تھا[2]۔ وہ لکھتا ہے کہ طرابلس میں بارہ سو جُلاہے صرف ریشم اور خمل[3] بنتے تھے۔ اس سیّاح نے بیروت کی بندرگاہ کو مکروہ اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے[4]۔ اندرونِ ملک میں بعلبک مصنوعات کا ایک ممتاز مرکز تھا۔ یہاں اُون اور سُوت کا ایک پارچہ بنتا تھا، جسے بعلبکی کہتے تھے۔ شاہی خاندان کے لوگوں کو بھی اسی کی طلب رہتی تھی۔ شام کے گورنر سلاطین کے لیے جو تحفے بھیجتے تھے، ان میں یہ پارچہ بھی شامل ہوتا تھا۔ ایک سلطان کا ذکر ہے کہ وہ بعلبکی پارچے کے لباس پر مطمئن نہ ہوتا تھا جس کی قیمت تیس دینار سے کم ہوتی تھی[5]۔ یہاں کے بُنے ہوئے کمبل مراکش اور ہسپانیہ تک جاتے تھے۔ چوبی برتن اور چمچے بعلبک کی خاص صنعت تھے اور ان جیسی کوئی چیز کہیں نہیں ملتی تھی[6]۔ یہ چمچے حددرجہ

---

[1] مقریزی، سلوک جلد اوّل حصّہ سوم صفحہ ۲۸۰۔ [2] یمان پولو ترارضِ مقدس کا بیان مترجمہ سٹیورٹ صفحہ ۳۳۔ [3] ایک کپڑا ہوتا ہے، جو اونٹ کے بالوں اور ریشم سے بنتا ہے۔ [4] پولونر صفحہ ۳۲۔
[5] ابن طغری بردی جلد دوم صفحہ ۷۶۰۔ [6] ابن بطوطہ جلد اوّل صفحہ ۱۸۶، ۱۸۷۔

Marfat.com

سیاک بنتے تھے اور ان کے سائز مختلف ہوتے تھے، یہاں تک کہ بڑے چمچے میں درجہ بدرجہ تو چھوٹے چمچے رکھ دیے جاتے تو ایک ہی چمچہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص صنعت یہ تھی کہ انگور کے بیثرے کو گاڑھا کرکے خشک کر لیا جاتا۔ اس میں مغز بادام اور دوسرے مغز ملا دیے جاتے۔ اس کی وجہ سے بھی بعلبک کو خاص شہرت حاصل تھی۔ تیمور کی فوج ۱۴۰۰ء میں دمشق جاتی ہوئی بعلبک سے گزری تھی، بیان کیا گیا ہے، وہاں پھلوں، دالوں اور دوسرے سامان کی اتنی افراط تھی کہ سپاہی مدت دراز کے لیے ہر قسم کی ضروریات سے بے نیاز ہو گئے[1]۔

قیاس یہ ہے کہ اس زمانے میں چینی کی صنعت بہت بڑھ گئی ہو گی۔ کیونکہ یورپ میں اس کی بڑی مانگ تھی۔ اہل لبنان محض گنا کاشت ہی نہ کرتے تھے بلکہ چینی بھی بناتے تھے اور انھیں کے ذریعے سے چینی یورپ پہنچی۔ طرابلس، بیروت، صیدا اور عکہ چینی بنانے کے بڑے مرکز تھے۔ قبرص کو چینی کی تجارت ختم شدہ صلیبی ریاستوں سے میراث میں ملی۔ قرونِ وسطیٰ کے اواخر تک طرابلس اور دمشق سے چینی مختلف شکلوں میں یورپ پہنچتی رہی، یعنی ڈلیاں بھی، قلمیں بھی اور عام چینی بھی[2]۔ صیدا میں بلوری ظروف اور نگین ظروف بنتے تھے، لیکن اس صنعت میں اس کی شہرت سابقہ شہرت کا محض ایک پرتو تھی۔

برآمد کا نقشہ پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیروت اور صیدا سے پھل، بیروت اور طرابلس سے روغن زیتون اور صابون مصر بھیجا جاتا تھا۔ شام کے میدانوں کی روئی مہیا نیہ تک جاتی تھی۔ بیروت اور طرابلس میں جہازوں کی آمد و رفت معمولاً جاری رہتی تھی۔ جون کے مہینے میں خاص بیڑا بھیجا جاتا، جو روئی کی فصل لے جاتا[3]۔ درآمد میں مغرب سے اونی اور سوتی کپڑے، مشرق سے موتی، جواہرات اور مسالے آتے تھے۔ مسالوں میں سیاہ مرچ کو سب پر تقدم حاصل تھا اور وینس کے تجارتی مال میں اس کا درجہ سب پر فائق تھا۔ ریشم، موتی، جواہرات اور ہاتھی دانت سیاہ مرچ کے بعد آتے تھے۔ بیروت میں اہل وینس کی ایک نو آبادی تھی اور ایسی ہی نو آبادیاں دمشق و حلب میں تھیں۔ ان شہروں کے بازاروں میں یورپی تاجروں اور عراق، ایران، ہندوستان کے تاجروں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دلا برا کوایر[4] (۱۴۳۲ء) نے دمشق میں صرف وینس نہیں بلکہ جینوآ، فلارنس، کیٹلیریا اور فرانس کے تاجر بھی

---

[1] شرف الدین علی الیزدی: تاریخ تیمور بیگ۔ [2] ڈبلیو ہیڈ کی فرانسیسی کتاب، مترجمہ رینا و جلد دوم صفحہ ۶۸۶۔
[3] ہیڈ جلد دوم صفحہ ۶۰، ۶۱، ۶۲۔ [4] صفحہ ۳۲۔

دیکھے۔ وہ لکھتا ہے:

"دمشق میں مسیحیوں کو نفرت و حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ شام کے وقت یہ تاجر ان لوگوں کے اندیشے سے گھروں میں بند کر دیے جاتے ہیں، جو اسی کام پر متعین ہیں اور صبح کو جس وقت ان کا جی چاہے آکر دروازے کھولتے ہیں[1]"

دلا بر اکویر نے شہر میں داخلے کے وقت ایک چوڑی سنجابی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کسی شخص نے چھڑی سے ٹھوکا دے کر اسے اتار پھینکا۔ وہ لکھتا ہے کہ شہر کی آبادی ایک لاکھ بتائی جاتی ہے بیروت میں یہ شخص وینس کے ایک آدمی کے ہاں ٹھہرا۔ وہاں اس نے ایک اسلامی جشن دیکھا، جس میں آتشبازی کا بھی مظاہرہ کیا گیا۔ ہوائیاں چھوڑی گئیں تو بہت بلندی پر پہنچ گئیں اور بڑے فاصلے پر جا گریں۔ یہ ہوائیاں لالٹینوں سے بڑی تھیں[2]۔ یہاں اس کے لیے شرقیین جیسا لباس تیار کر دیا گیا۔ پھر اس نے جنوب کی جانب سفر اختیار کیا۔ حما میں اس نے سفید بانات کا لباس خریدا جس میں سے مینہ کا پانی گزر نہیں سکتا تھا۔ ایک جرمن سیاح لکھتا ہے کہ ارضِ مقدس میں زائر جہاں جاتے، دل اور رات کا بڑا حصہ جواہرات، دمشقی پارچے اور خمل کی خرید میں صرف کرتے۔ منڈیوں میں خوب شور و غل اور ہنگامہ بپا رہتا۔ چودھویں صدی میں وینس نے دمشق، حلب، بیروت اور طرابلس میں قنصل خانے قائم کر لیے تھے[3]۔ پندرھویں صدی کے آغاز تک بھی صنعت و تجارت کو فروغ حاصل رہا، جس کا اختتام تیمور کے تباہ کن حملے سے ہوا تھا۔

## آخری تاتاری یورش

چنگیز خاں کی نسل سے ہونے کا یہ مدعی وسط ایشیا کے تاتاری گروہوں کے ساتھ ایک خوفناک طوفان کی طرح مغربی ایشیا میں سے گزر گیا اور اپنے پیچھے تباہی و بربادی چھوڑ گیا۔ اکتوبر ۱۴۰۰ء میں یہ شمالی شام پہنچا۔ شام پر تاتاریوں کا یہ چوتھا یا پانچواں حملہ تھا اور یہی آخری حملہ تھا۔ تین روز تک حلب میں غارتگری جاری رہی۔ یہاں کے باشندوں میں سے کوئی بیس ہزار تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان کے سر کاٹ کر ایک چبوترا بنایا گیا، جو دس ہاتھ اونچا تھا اور اس کا گھیر بیس ہاتھ ہوگا[5]۔ حما اور حمص

---

[1] ہیڈ جلد دوم صفحہ ۲۹۵۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۹۶۔ [3] فیلکس فیبری جلد دوم صفحہ ۸۴، ۸۵۔
[4] ہیڈ جلد دوم صفحہ ۴۶۵، ۴۶۶۔ [5] ابن تغری بردی جلد ششم حصہ دوم صفحہ ۵۲، ابن عرب شاہ عجائب المقدور فی اخبار تیمور صفحہ ۹۴، ۹۸، ابن ایاس جلد اول صفحہ ۳۲۶، ۳۲۷۔

Marfat.com

دونوں کو یقین ہوگیا کہ مزاحمت کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ تاتاری خاصی دیر تک بعلبک میں ٹھہرے رہے اور یہاں کے استحکامات کا معائنہ کیا۔ انھیں یقین تھا کہ یہ استحکامات حضرت سلیمانؑ کے حکم سے دیوؤں اور جنّوں کے ہاتھوں اہتمام کو پہنچے[1] لیکن یہ بے سود ثابت ہوئے۔ ساحلی علاقے میں غارت گری کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے بھیج دیے گئے، جو بیروت و صیدا سے مال غنیمت کے انبار لے کر واپس آئے۔ اس اثنا میں مصری فوج سلطان الناصر (۱۳۹۸ء-۱۴۰۵ء اور بار دوم ۱۴۰۶ء-۱۴۱۲ء) کی سرکردگی میں دمشق کی طرف بڑھ رہی تھی اور ۲۳- دسمبر کو وہاں پہنچی۔ مصری فوج کے ساتھ مشہور مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۶ء) بھی تھا، جو تونیسیہ میں پیدا ہوا اور اس وقت قاہرہ میں قاضی القضات تھا۔ ۲۵- دسمبر کو ہراول سے مقابلہ پیش آیا۔ چار روز بعد تیمور دمشق کے سامنے نمودار ہوا۔ بعد ازآں مملوکوں کی طرف سے ابن خلدون کو نمائندہ بنا کر تیمور کے پاس بھیجا گیا۔ اسے فصیل شہر سے رسّے کے ذریعے نیچے اتارا گیا تھا۔ ۱۰- جنوری ۱۴۰۱ء کو پہلی ملاقات ہوئی۔ پھر دنیا کے ایک بہت بڑے فاتح اور ایک بہت بڑے مورّخ کے درمیان جو ملاقاتیں ہوئیں، ان کی کیفیت مورّخ موصوف نے خود بیان کی ہے[2]۔ کہا جاتا ہے کہ اہل دمشق میں سے تیس ہزار کے قریب شعلوں یا تلواروں کی نذر ہوئے۔ جامع اموی کی صرف دیواریں باقی رہ گئیں۔ پورے ملک کی صنعت و حرفت پر کاری ضرب لگی دمشق کے زیادہ تر ہنرمندوں، کاریگروں، زرہ سازوں، صنعت گرانِ فولاد اور آبگینہ سازوں کو تیمور اپنے دارالحکومت سمرقند لے گیا۔ علمی زندگی کو بڑا نقصان پہنچا۔ بعض عالم مارے گئے اور بعض کو تیمور قید کرکے ساتھ لے گیا۔ اسیروں میں نوجوان دمشقی ابن عرب شاہ بھی تھا، جو وطن واپس آیا اور ۱۴۵۰ء میں فوت ہوا۔ اس نے تیمور کے سوانح حیات بھی لکھے، جن میں اسے عیاش اور ظالم بتایا۔ آئندہ سال اس وحشی فاتح نے انقرہ میں عثمانی فوج تباہ کی اور بایزید اول کو قید کر لیا۔

**علمی فضا** مملوکوں کے عہد سے مشرقی عربی دنیا پر تاریکی کا ایک دور شروع ہوگیا، جو انیسویں صدی تک قائم رہا اور عثمانیوں کے عہد میں تاریکی اور بھی گہری ہوگئی۔ شورشیں اور جنگیں، طاعون اور قحط، بدنظمی اور تشدد ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو معاون نہیں ہوتے،

---

[1] شرف الدین جلد دوم صفحہ ۱۸۰۔ [2] ابن خلدون التعریف بابن خلدون در حلبہ۔

Marfat.com

جس میں ادبی اور علمی چیزیں فروغ پاتی ہیں۔ جسمانی علاحدگی روحانی و ذہنی افادے و استفادے کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ سلطان ثقافتی لحاظ سے پست درجے کے تھے اور اسلام نے ثقافت کی پستی سے ایسے تجربے کبھی نہ کیے تھے۔ یہ لوگ غلام تھے اور ان کی خوبیوں کا کمال یہ تھا کہ وہ بیدرد اور اخلاقی اعتبار سے نامحکم تھے۔ ان کے کارنامے صرف جسمانی و فوجی تھے۔ برجی مملوکوں (۱۳۸۲ء تا ۱۵۱۷ء) میں سے صرف پہلے سلطان برکوک کا باپ مسلمان تھا۔ اس کے جانشینوں میں سے ایک برسبائے تھا (۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۸ء)۔ وہ عربی زبان سے بھی ناآشنا تھا۔ اسے ایک مہلک بیماری ہو گئی تھی۔ طبیبوں نے علاج کیا، ناکام رہے۔ ان میں سے دو کو برسبائے نے قتل کرا دیا۔ اینال (۱۴۵۳ء تا ۱۴۶۰ء) نوشت و خواند دونوں سے بے بہرہ تھا۔ ایک معاصر مورخ[1] کا بیان ہے کہ وہ فاتحہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حالانکہ قرآن مجید کی یہ پہلی سورت ہے۔ اس کی صرف سات آیتیں ہیں اور ہر مسلمان پانچوں نمازوں کی ہر رکعت میں اسے پڑھتا ہے۔ وہ سرکاری دستاویزوں پر دستخط یوں کرتا تھا کہ سکرٹری کے لکھے ہوئے کے اوپر قلم پھیر دیتا تھا۔ اس کا تیسرا جانشین بلبائے (۱۴۶۷ء) ان پڑھ بھی تھا اور دیوانہ بھی۔ صوبائی حاکم یا نائب بھی سلطانوں ہی کے نمونے کے تھے اور امید بھی کیا رکھی جا سکتی ہے؟ غالباً اس عہد کے کسی مفکر کو یہ بات نہ سوجھی کہ ہر نسل اپنے ماضی اور ثقافت کو اپنے ہی طریقے پر پیش کرتی ہے۔

**درسگاہیں** مصر میں ان سلاطین نے اپنی کوتاہیوں کی تلافی ایک حد تک یوں کر دی کہ مرکز حکومت میں نہایت عالیشان عمارتیں بنائیں، جو اب تک باقی ہیں اور اسلامی طرز تعمیر کے بہترین نیز موثر نمونے پیش کرتی ہیں، مثلاً برقوق کی مسجد اور مقبرہ، قائتبائے (۱۴۶۸ء تا ۱۴۹۵ء) کی مسجد۔ اس مسجد کے ساتھ ایک مقبرہ، ایک فوارہ اور ایک درسگاہ بھی ہے۔ سب سے آخر میں الغوری (۱۵۰۰ء تا ۱۵۱۶ء) کی مسجد۔ اس کے بعد صرف ایک مملوک سلطان اور ہوا۔ درسگاہوں میں ایوبیوں اور نوریوں کی روایات پر عمل کیا گیا، جنھیں مدرسے کہتے تھے یعنی مسجدوں کے ساتھ کالج۔ یہ مدرسے ان مدرسوں کی طرح علوم و فنون کے مرکز نہ تھے، جو المامون نے بغداد میں قائم کیے تھے (۸۳۰ء) بلکہ یہاں فقہ اور دینیات پر خطبے دیے جاتے تھے۔ فقہ، دینیات کا ضمیمہ تھی۔ سلطنت ان مدرسوں کے مصارف برداشت کرتی تھی۔ سمجھا یہ جاتا کہ اس طرح صحیح دین کو فروغ حاصل ہوتا ہے، بدعات رکتی ہیں اور سنی اسلام پھیلتا ہے۔ مملوکوں نے سلطنت بھر میں جو اعلیٰ ادارے

---

۱؎ ابن تغری بردی جلد ہفتم صفحہ ۵۵۹۔

بنائے، ان میں غیر معمولی دلچسپی کی اصل وجہ یہی تھی +

ان اداروں کے ساتھ اوقاف تھے، جن کی شکلیں دو تھیں۔ یا جاگیریں تھیں یا مستقل رقم کا انتظام تھا۔ اسی مد سے اساتذہ کے مشاہرے اور طلبہ کے مصارف پورے ہوتے تھے مملوکوں کے عہد میں اوقاف کی مقدار بہت بڑھ گئی۔ اساتذہ میں علما بھی تھے، فقہا بھی۔ نحوی بھی تھے اور محدّث بھی۔ نصاب میں بنیادی حیثیت علم الکلام کو حاصل تھی۔ باہر سے انکار کی کوئی لہر طلبہ کے مقام درس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جو لوگ ان درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوتے تھے، انھیں سرکاری ملازمتوں میں بہ طور عہدہ دار لے لیا جاتا تھا یا وہ قانون دان یا معلّم یا مبلّغ یا مصنّف بن جاتے تھے +

لبنان کے تمام شہروں میں سے طرابلس مملوکوں کے نظام تعلیم سے حد درجہ مستفید ہُوا۔ یہاں کم از کم چار بڑی درسگاہیں تھیں۔ یہ گورنروں نے وقف کی تھیں[۱] اور ان کے لیے ناظم مقرر تھے۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مشہور القرطعیہ تھی، جو قلاوون کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ ۱۳۲۶ء میں بنی تھی، جیسا کہ اس کے کتبے سے ظاہر ہے۔ اصل عبارت جامع کبیر سے متصل اب تک موجود ہے۔ ایک اور درسگاہ الخاتونیہ ۱۳۷۳ء میں بنی۔ یہ ایک گورنر کی خواص اور آزاد کردہ کنیز نے بنوائی تھی اور وہ گورنر خود کسی زمانے میں الاشرف کا غلام تھا +

دوسری مذہبی تعمیرات بھی تھیں، جو علوم عالیہ کے اداروں کا کام دیتی تھیں۔ یہ سلسلہ ہائے تصوّف کے صدر مقام تھے، جنھیں کبھی تکیے، کبھی زاویے، کبھی رباطیں، کبھی خانقاہیں کہا گیا۔ انھیں مسیحی نظام کے راہب خانوں سے مشابہ سمجھنا چاہیے اور ایک "طریقے" کے پیروؤں کے لیے یہ مقامات اجتماع کا کام دیتے تھے۔ تیرھویں صدی اور چودھویں صدی میں ممتاز صوفی سلسلے اور طریقے قائم ہو چکے تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ایرانیؒ (۱۰۷۷ء تا ۱۱۶۶ء) نے بغداد میں سب سے پہلا سلسلہ قائم کیا یعنی قادریہ سلسلہ۔ یہ سب سے زیادہ پھیلا۔ بعلبک کے دو خلیفوں اور مبلّغوں نے شام میں اس سلسلے کی اشاعت خوب کی۔ رفاعیہ سلسلہ عراق کے شیخ احمد الرفاعی (وفات ۱۱۸۵ء) نے قائم کیا تھا۔ اس سلسلے کے پیرو عجیب کارنامے دکھاتے تھے، مثلاً دہکتے ہوئے انگارے نگل لیتے تھے۔ یہ سلسلہ بھی مملوکی عہد کے شام و لبنان میں پھیلا اور وہاں اس کے مختلف مرکز قائم

---

[۱] محمد کرد علی خطط الشّام جلد چہارم صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹، خلیل توتا The Contribution of the Arabs to Education صفحہ ۲۳، اس کتاب میں طرابلس کے اندر تیرہ درسگاہوں کا ذکر ہے +

Marfat.com

ہوگئے۔ قلقشندی[1] لکھتا ہے کہ بعلبک میں مسجدوں، درسگاہوں، خانقاہوں اور بیمارستانوں کی کثرت تھی۔ یہاں کی درسگاہ النجمیہ صلاح الدین کے والد سے منسوب تھی۔ اس میں لوگ تصوف کی تعلیم پاتے تھے۔ طرابلس میں سلسلہ ہائے تصوف کی آٹھ خانقاہیں تھیں[2]۔ یہاں دو بیمارستان بھی تھے[3] جن میں سے ایک حلب کے گورنر نے بنوایا تھا (وفات ۱۳۴۱ء)۔ درسگاہوں کی طرح بیمارستانوں کے مصارف بھی اوقاف سے پورے ہوتے تھے اور ان میں لوگوں کو طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور وہ عملی تربیت بھی پاتے تھے۔ جو بیمارستان سلطان نورالدین زنگی نے دمشق میں قائم کیا تھا، وہ اپنی نوعیت کا سب سے پہلا اور ممتاز ترین بیمارستان تھا۔ جب بعلبک کے ایک قاضی کا فرزند بدرالدین اس کا سرطبیب بنا تو تیرھویں صدی کے وسط میں اس کی توسیع ہوئی اور اس کے لیے زیادہ سروسامان مہیا کیا گیا۔ اس میں عورتوں کے لیے ایک الگ حصہ مقرر تھا۔ ایک حصے میں دماغی فتور کا علاج ہوتا تھا۔ ایک حصہ جراحی کے لیے وقف تھا۔ بدرالدین طب کی تعلیم بھی دیتا تھا اور اس نے اس موضوع پر متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں[4]۔

اعلیٰ تعلیم کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔ عام تعلیم کے انتظام کے ذمہ دار مذہبی ادارے تھے۔ یہ تعلیم مسجدوں کے صحن میں ہوتی تھی۔ "مسجد کے خدام" یا ان کے معاون معلمی کرتے تھے۔ عموماً قرآن اور دو کتابیں پڑھائی جاتی ۔ ذیل میں ابن الاخوہ (وفات ۱۳۲۹ء) کے ایک باب سے اقتباس دیا جاتا ہے[5]۔ یہ ایک مصری یا شامی محتسب تھا۔ اقتباس سے ابتدائی تعلیم کے مقاصد اور طریقے کی سرسری کیفیت معلوم ہو سکتی ہے :

> "یقیناً تعلیم و تدریس شریف ترین پیشہ ہے۔ تقویٰ، عفت اور دیانت اچھے معلم کے خاص اوصاف ہیں۔ مزید برآں اسے قرآن حفظ ہونا چاہیے۔ خط کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسے حساب کا علم بھی ہونا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ بیاہا ہوا ہو۔ کسی کنوارے کو اسی وقت لڑکوں کی درسگاہ کھولنے کی اجازت ملنی چاہیے، جب وہ سن رسیدہ ہو، نیز خیر و تقویٰ میں اسے شہرت حاصل ہو۔ منتظم کی حیثیت میں اسے چاہیے کہ چھوٹے بچوں سے

---

[1] جلد چہارم صفحہ ۱۰۹ + [2] کرد علی جلد چہارم صفحہ ۱۵۷ + [3] ابن شحنہ صفحہ ۲۶۳ +
[4] ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطبا جلد دوم صفحہ ۲۵۹ +
[5] صفحہ ۱۷۰، ۱۷۲ +

لطف وشفقت کا برتاؤ کرے۔ جب وہ ابجد سیکھ جائیں تو قرآن مجید کی
چھوٹی سورتیں انھیں پڑھائے۔ پھر عقائد کی تعلیم دے۔ حساب کے مبادی
سکھائے۔ خط وکتابت سے مناسب طریقے سکھائے۔ بچہ سات سال کا
ہو جائے تو اسے نماز کے لیے جماعت میں شریک کرنا چاہیے۔ یہ تعلیم دینی
چاہیے کہ ماں باپ کی اطاعت کرے، اُن کے تمام احکام مانے۔ جب
ان سے ملے تو پہلے سلام کرے، پھر اُن کے ہاتھ چومے۔ اگر اس کے
اوضاع و اطوار خراب ہوں، بول چال میں گستاخی کرے، یا شریعت کے
احکام سے منحرف ہو، مثلاً پانسہ یا چوسر کھیلے، انڈے لڑائے یا جوئے
کے کسی اور طریقے پر عمل پیرا ہو تو اسے بید لگانے چاہئیں، لیکن بید نہ تو
اتنا موٹا ہو کہ ہڈی توڑ دے، نہ اتنا ہلکا ہو کہ اس کے لگنے سے تکلیف
کا احساس ہی نہ ہو۔ معلم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ سے کوئی ذاتی
کام نہ لے اور لڑکیوں کو لکھنا نہ سکھائے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے عورت کو
لکھنا سکھانا ایسا ہے جیسا سانپ میں زہر پیدا کر دیا جائے۔

**مسیحیوں کی تعلیم**

مسیحیوں کے لیے راہب خانے علم وثقافت کے مرکز تھے۔ راہب یا پادری تعلیم دیتے تھے۔ گرجوں کی عمارتیں یا متعلقہ مکانات درس گاہ کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ جن لوگوں کو کلیسائی نظام میں شامل ہونا ہوتا، صرف وہی اعلیٰ تعلیم پاتے۔ راہب مختلف مخطوطوں کی نقلیں کرتے۔ اس طرح وہ محفوظ ہو جاتے اور ان کے مطالب دوسرے لوگوں تک پہنچ جاتے۔ اسی طرح مسیحی روشنی کی مشعل ٹمٹماتی رہی۔ دوسری نسلوں میں یہ لوگ قومی روایات و وراثت کے خاص محافظ تھے۔ جو مارونی دور افتادہ مقامات پر رہتے تھے ان کی زبان بدستور سریانی تھی۔ جب وہ کلیسائی ادب کے سلسلے میں عربی سے کام لیتے تو اسے بھی سریانی حروف میں لکھتے (گرشونی) یہ طریقہ اب تک قائم ہے۔

تیرھویں صدی کے وسط میں مملوکی دور کا آغاز ہوا۔ اُس وقت تک عربی "ہلال زرخیز" پر فتح کامل حاصل کر چکی تھی، البتہ یعقوبیوں، نسطوریوں اور مارونیوں نے جابجا چھوٹے چھوٹے لسانی جزیرے قائم کر رکھے تھے۔ مارونیوں کے متعلق دوتری[1] (وفات ۱۲۴۰ء) لکھتا ہے کہ وہ عام

---

۱؎ تاریخ یروشلم صفحہ ۸۱۔

اسلامی بولی بولتے ہیں، لیکن اسے کلدانی حرفوں میں لکھتے ہیں۔ یہ بیان بہ ظاہر فلسطینیوں اور ساحلی علاقے کے مارونیوں کے متعلق تھا۔ جو سیاحت نامہ ۱۳۲۲ء - ۱۳۵۶ء ماندویل[1] سے منسوب ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ شام نظری روٹی سے عشائے ربّانی تیار کرتے ہیں اور اپنی زبان کے سلسلے میں اسلامی حروف سے کام لیتے ہیں۔ یہ شہری مسیحیوں کی کیفیت ہوگی۔ ۱۳۶۵ء میں اہلِ قبرص نے سکندریہ پر حملہ کیا۔ سلطان کو مناسب معلوم ہوا کہ لبنان کے مارونی اسقفوں کو گرفتار کرکے دمشق کے محبس میں ڈال دے۔ احدان کا اسقف بچ نکلا اور جہاں وہ روپوش تھا وہاں اس نے انجیلیں سریانی اور گرشونی میں لکھیں[2]۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک مارونی مسیحی دونوں زبانیں[3] استعمال کرتے تھے۔ ایک فرانسسکی راہب — گریفون — نے سریانی اور عربی[4] دونوں کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ یہ شخص ۱۴۵۰ء سے ۱۴۷۴ء تک لبنان میں رہا اور مارونی پادریوں میں اس درجہ گھل مل گیا تھا کہ عام روایت کے مطابق اسے بطریق اعظم نامزد کیا گیا۔ گریفون نے دو نہایت قابل نوجوان روما بھیجے، جن میں سے ایک جبرئیل القلاعی ساکن لحفد تھا (وفات ۱۵۱۶ء)۔ یہ واپس آکر اسقف بنا اور کئی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں سریانی محاورے بکثرت استعمال ہوئے +

## ذہنی تخلیقات

اس عہد کی ذہنی تخلیقات میں سے بہت کم اشاعت کی روشنی سے بہرہ یاب ہوئیں۔ حق یہ ہے کہ اشاعت کی مستحق بھی بہت کم تھیں۔ جو مخطوطات موجود ہیں یا جن کے حوالے ملتے ہیں، وہ زیادہ تر دینیات، قانون، صرف و نحو اور شعر سے متعلق تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں، جسے نادر یا جدید سمجھا جا سکے۔ القلاعی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے مارونیوں کی آرتھوڈکسی اور پوپ سے تعلقات کے باب میں متعدد رسالے لکھے۔ اس کی تاریخ لبنان اور لوک شاعری میں سے اقتباسات چھپ چکے ہیں[5]۔ طرابلسیوں میں سے علی ابن خلیل الطرابلسی (وفات ۱۴۴۰ء) کا ذکر ضروری ہے، جو یروشلم میں قاضی تھا اور اس نے حنفی فقہ پر ایک کتاب لکھی تھی، جو بولاق میں چھپی تھی (۱۳۰۰ء) پھر قاہرہ میں چھپی (۱۳۱۰ء)۔ وقائع نگاروں میں سے صالح بن یحییٰ (وفات ۱۴۳۶ء) حاکم

---

[1] دیکھیے رائٹ کی کتاب صفحہ ۱۸۹ + [2] دویہی صفحہ ۱۲۹ + [3] لامنس المشرق جلد اول صفحہ ۱۵، ۱۲۷، ۱۲۸، نیز فرانسیسی رسالہ + [4] المشرق جلد ۴۴ صفحہ ۵۴۱، ۵۵۲، دویہی صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴، صفحہ ۳۶۸، ۳۶۹، صفحہ ۳۷۲، ۳۷۹ + [5] دیس جلد ششم صفحہ ۵۱۸، یوسف سرکیس، معجم المطبوعات العربیہ والمعربیہ +

Marfat.com

احترام کا مستحق ہے۔ اس نے بیروت پر جو رسالہ لکھا تھا[۱]۔ اس سے زیرِ غور باب میں بہت فائدہ اٹھایا گیا۔ صالح نے امراء الغرب کے خاندانی کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ وہ خود انھیں کے اخلاف میں سے تھا۔ پھر ذاتی تفصیلات سے بیان کو گراں قدر بنا دیا اور جس عہد کی تاریخ لکھی، اسے پوری طرح روشنی میں لے آیا[۲]۔ اس کے وقائع کا رشتہ بیان حمزہ بن احمد بن ثابت ساکن علیہ (وفات سنہ ۱۵۲۰ء) نے سنبھالا۔ اسے مشہور دروزی شارح السیّد عبداللہ تنوخی نے اختیار کر لیا۔ الدّوہی وفات سنہ ۱۷۰۴ء، الشّریانی وفات سنہ ۱۸۵۹ء اور دوسرے لبنانی وقائع نگار بالواسطہ یا بلاواسطہ انھیں دو ماخذوں سے ضروری چیزیں لیتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ بیروت۔ [۲] اقتباسات کے لیے دیکھیے صالح، صفحہ ۲۳۰، ۲۳۸، حیدر شہابی، الغرر الحسان فی تواریخ الحوادث الازمان صفحہ ۵۶۴، ۵۸۹۔

Marfat.com

## تیئسواں باب

# عثمانی اقتدار کی صبحِ اوّل

### ہندوستان کا بحری راستہ

پندرھویں صدی ختم ہوئی تو بحیرۂ روم کی بین الاقوامی تجارت میں بھاری تغیّر پیدا ہو چکا تھا اور اس کے بڑے بحری راستے نئی شکل اختیار کر رہے تھے۔ سولھویں صدی کا آغاز ہوا تو سیاسی اقتدار میں بھی تغیّر آ گیا اور بڑی طاقتوں کی ترتیب از سرِ نو ہوئی۔ ان دونوں تبدیلیوں نے لبنان پر ناخوشگوار اثر ڈالا۔ ۱۴۸۸ء میں ایک پرتگیز بحر پیما بارتھولومیو دیاز نے بحری سفروں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے راس دریافت کر لی، جس کا نام اس نے طوفانی راس رکھا اور آگے چل کر وہ راس امید کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۴۹۰ء میں ایک اور پرتگیز ملاح جولائی میں لزبن سے چلا۔ تازہ دریافت شدہ راس کا چکر کاٹا اور کالی کٹ[1] میں لنگر انداز ہوا، جو مدراس سے مغرب میں ہے۔ یوں مغربی یورپ سے چل کر افریقہ کا چکر کاٹتے ہوئے اس کو ہندوستان تک بحری راستہ مل گیا، جس کے مسالوں کی دولت کو افسانوی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ مذکورہ بالا دو تاریخوں کے درمیان (۱۴۹۲ء) ایک زیادہ ہمتور بحر پیما کرسٹوفر کولمبس اطالوی نے وہ پردہ چاک کر دیا، جو نصف کرّے کو چھپائے ہوئے تھا۔ یہ زمانہ بھر میں سب سے بڑا جغرافیائی انکشاف تھا۔ ۱۵۲۰ء میں ایک اور پرتگیز نے جس کا نام فرڈیننڈ میجالن تھا، جنوبی امریکہ کے انتہائی جنوبی سرے کا چکر لگا کر پورے کرۂ ارض کا بحری سفر پایۂ تکمیل پر پہنچا دیا۔ ان انکشافات سے دنیا کی سرگرمی اور تہذیب کا مرکز مغرب کی جانب حرکت کرنے لگا۔ پرتگال، ہسپانیہ، پھر ہسپانیہ، پھر انگلستان و فرانس عالمی طاقتیں بن گئیں۔ اب ان کا تجارتی مال سمندر کے راستے مشرقی افریقہ، عرب، ہندوستان اور چین پہنچنے لگا۔ یہ راستہ یقیناً لمبا تھا، لیکن خرچ کم آتا تھا۔ نیز مصر، لبنان اور

---

[1] کالی کٹ، یہیں سے کیلیکو کپڑے کا نام رکھا گیا +

Marfat.com

شام کی بندرگاہوں کا واسطہ باقی نہیں رہا تھا مشرقی بحیرۂ روم پر جو سرزمینیں واقع تھیں، ان کی خوش حالی کی بنیاد یہی تجارت تھی، جو مشرق و مغرب کے درمیان ان سرزمینوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ نئے انکشاف سے یہ بنیاد دکھو کھلی ہوگئی۔ جب اس سے یا بردوسرا بحری راستہ مل گیا تو یہ "بحیرۂ متوسط" نہ رہا، جیسا کہ فونیقیوں کے زمانے سے برابر چلا آرہا تھا۔ ۱۸۶۹ء تک ان سرزمینوں کو انتظار کرنا پڑا۔ نہر سویز کا افتتاح ہوا تو ان کے نقصانات کی تلافی ایک حد تک ہوگئی۔ اس اثنا میں لبنانی تاجروں کا انحصار زیادہ تر برّی تجارت پر رہا۔ ساتھ ہی تحقیق و تفتیش کا نیا دور شروع ہوگیا، جس کی وجہ سے ہمارے علاقے کی علاحدگی اور تیرگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

اس کے سیاسی اثرات صرف مغرب تک محدود نہ رہے۔ خلیج فارس کے ذریعے سے ایران کے ساتھ تعلق نے تجارتی اور عام سرگرمیوں میں نئی حرکت پیدا کردی۔ ۱۵۰۱ء میں ایران نے شیعی صفویوں کے ماتحت ایک زبردست قوّت کی شکل میں ظہور کیا۔ اسی زمانے میں عثمانی ترکوں نے ــــ جو ایشیائے کوچک اور بلقان میں دو صدیوں سے فتوحات کو منظم کرتے چلے آئے تھے ــــ عربی سرزمینوں کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا، جو ان کے اور مملوکوں کے درمیان حائل تھیں۔ ترک سنّی تھے۔

**عثمانی ترکوں کا ظہور** مملوکوں کے مقبوضات کی اقتصادیات پر ضرب لگی تو خود مملوکوں کے وقار کو بھی نقصان پہنچا۔ وہ استقامت اور سرگرمی رخصت ہوچکی تھی، جو تاتاریوں اور صلیبیوں کی قوّت کے مقابلے میں ڈٹ گئی تھی۔ جس نئے دشمن کا ظہور شمالی افق سے ہوا تھا، وہ مملوکوں کا ہم مذہب تھا اور ان سب سے زیادہ خوفناک تھا۔ جن سے مملوکوں کو اس وقت تک سابقہ پڑچکا تھا۔ یہ عثمانی ترک تھے، جو اسلام کے آخری بڑے مجاہد تھے اور انھوں نے جو سلطنت قائم کی وہ عظیم ترین اسلامی سلطنتوں میں سے ایک تھی۔

وسط ایشیا میں ترکوں کے ابتدائی حالات پر اب تک تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کی مرکّب زبان کا تعلق منگولی زبان کی اس شاخ سے ہے، جو یورال الطائی شاخ کہلاتی ہے۔ ان کے اپنے ادب کا مکتوب ذخیرہ بہت معمولی تھا[۱] اور ترکوں نے مغربی ایشیا میں پہنچ کر عربی رسم الخط اختیار کرلیا، جو ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔ پھر مصطفٰی کمال نے حکماً لاطینی رسم الخط نافذ کردیا۔

---

[۱] وسط ایشیا میں سریانی رسم الخط کا استعمال بہت کم تھا۔

Marfat.com

رسم الخط کی عربیت اور لوگوں کی اسلامیت کی بدولت ہزاروں مذہبی، علمی، ادبی اور فنی اصطلاحات بے تکلف عربی سے لے لی گئیں۔ فارسی سے بھی ترکوں نے بے شمار الفاظ مستعار لیے، خصوصاً سلطانی ادب اور شعری ادب میں۔ ترکوں کا ابتدائی مذہب شمانی تھا، جو اصنام پرستی کا ایک قدیم نمونہ تھا۔ اس میں قدرتی مظاہر کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہ نمونہ اسکیمو اور امریکی ہندوستانیوں میں بھی ملتا ہے۔ وہ لوگ بھی اصلاً منگولی نسل ہی سے تھے۔ عربوں کو ترکوں سے ساتویں صدی میں تعلق پیدا ہوا، جب اسلامی فتوحات دریائے جیحوں کے پار پہنچیں تو ترکوں میں سے جو لوگ سب سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور برتری حاصل کی، وہ گیارھویں صدی کے وسط کے سلجوقی تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ غز قبائل کے ذریعے عثمانیوں سے متعلق تھے[۱]۔

وہ وسط ایشیا میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جن ترکوں نے آگے چل کر عثمانیوں کا نام پایا، وہ رفتہ رفتہ مغرب کی جانب بڑھے اور ایران سے گزرتے ہوئے ایشیائے کوچک پہنچ گئے (ترکی و عربی نام اناطول، اناطولیہ) جہاں مستقل طور پر جم گئے۔ سلجوقی سلطنت کے کھنڈروں پر نئی سلطنت کی بنیاد رکھی اور بیزنطینیوں کے علاقے فتح کر کر کے اس سلطنت کی توسیع کرتے رہے۔ ان کی قومی تاریخ میں عثمان کو قبیلے کا سردار بنایا گیا ہے، جس کے والد طغرل نے سلجوقی سلطان سے بروسہ کے قریب ایک جاگیر حاصل کی تھی، وہی عثمانی سلطنت کا بانی ہے۔ یہ جاگیر کمزور شدہ بیزنطینی سلطنت کی مشرقی سرحد پر واقع تھی اور زوال پذیر سلجوقی سلطنت کی یہ مغربی سرحد تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عثمان کا دادا اپنے قبیلے کو عراق سے اناطولیہ لایا تھا، جو سلجوقیوں کے ماتحت ترقی رنگ میں خاصا رنگا جا چکا تھا۔ عثمان نام تیسرے خلیفۂ راشد (حضرت عثمان رضؓ) کے اسم مبارک پر رکھا گیا تھا، اس لیے یہ شخص یقیناً مسلمان ہوگا۔ اس نے مغربی ہمسایے کے علاقے پر تصرفات کا آغاز کیا، یہاں تک کہ عثمانی سلطنت پھیلتے پھیلتے باسفورس اور بحیرۂ اسود تک جا پہنچی۔ عثمان کے بعد جن سلاطین کے ہاتھوں میں عنان رفتہ رفتہ آئی وہ بلا استثنا ممتاز صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آخری دور کے سلاطین کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ۱۳۲۶ء میں بروسہ پر قبضہ ہوا اور اسے نئی سلطنت کا دار الحکومت بنا لیا گیا۔ اسی سال عثمان نے وفات پائی۔ ۱۳۴۵ء میں درِ دانیال کو عبور کیا گیا اور گیلی پولی پر قبضہ ہوا۔ گویا یورپ میں ایک قدم گاہ مل گئی۔

---

[۱] ترکوں کی اصل کے متعلق دیکھیے پال وٹک کی انگریزی کتاب "عثمانی سلطنت کا ظہور" صفحہ ۶-۱۱، محمد فواد کوپرولو کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۸۲-۸۸، جوزف فان ہیمر کی جرمن کتاب جلد اول صفحہ ۴۰ ببعد۔

Marfat.com

عثمان ابتدا میں سلجوقیوں کے ماتحت متعدد حاکمانِ اضلاع میں سے ایک تھا۔ پھر اس نے ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو طویل مدت تک قائم رہنے والی سلطنتوں میں سے تھی اور اسلام کی نہایت طاقتور سلطنتوں میں شمار ہوتی ہے۔ یکے بعد دیگرے اس کے چھتیس سلطان تخت نشین ہوئے (۱۳۲۶ء - ۱۹۲۲ء)۔ بعد کی دو صدیوں میں چھوٹی سی عثمانی سلطنت مغربی ایشیا، جنوبی و مشرقی یورپ اور شمالی افریقہ کے معاملات میں مقتدر حیثیت کی مالک بن گئی۔ محمد ثانی (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۱ء) عثمان کے بعد چھٹا سلطان تھا۔ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا اور مرکز حکومت وہاں منتقل ہو گیا، جو اس زمانے کی دنیا میں نہایت مستحکم مقام تھا اور حربی نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم مقام پر واقع تھا۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ یونانی بولنے والے مسیحیوں، سلجوقیوں، دوسرے ترکوں اور ایشیائے کوچک کی متفرق قوموں کو اپنے اندر جذب کرتے گئے۔

**ایران سے قوت آزمائی**

جب تک مشرق میں کسی سرگرم قوت کا ظہور نہیں ہوا تھا ایشیا میں عثمانی سرحدیں بالکل محفوظ تھیں، لیکن جب ایران اسمٰعیل صفوی

اے

عثمان اوّل (تقریباً ۱۳۰۰ء)

اورخان (۱۳۲۶ء)

مراد اوّل (۱۳۵۹ء)

بایزید اوّل (۱۳۸۹ء - ۱۴۰۱ء)

سلیمان (مدعی سلطنت) (۱۴۰۳ء - ۱۴۱۰ء) | محمد اوّل ۱۴۰۳ء | موسیٰ (مدعی سلطنت) (۱۴۱۰ء - ۱۴۱۳ء)

مستقل سلطان (۱۴۱۳ء)

مراد ثانی (۱۴۲۱ء)

محمد ثانی (۱۴۵۱ء)

بایزید ثانی (۱۴۸۱ء)

(۱۵۰۱ء - ۱۵۲۴ء) کے ماتحت مضبوط و متحد ہو گیا تو صورتِ حال میں بنیادی تغیر رونما ہوا یعنی وہی کیفیت عود کر آئی، جو ایک طرف رومیوں اور بیزنطینیوں، دوسری طرف ساسانیوں کے درمیان تھی۔ شاہ اسمٰعیل نے جس صفوی خاندان کی داغ بیل ڈالی تھی، وہ اسلامی ایران کا نہایت پرشکوہ خاندان تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب بنا دیا اور اپنا سیاسی و مذہبی پروپیگنڈا ایران اور ایشیائے کوچک کے ترکوں میں شروع کر دیا۔ وہ شیعوں کا روحانی رئیس تھا اور اپنے ہم مذہبوں میں سے سب کی حمایت اسے حاصل تھی۔ اس نے ایک درویشی نظام بھی جاری کیا، جسے قزلباش[1] کہتے تھے۔ یہ ترکی میں اس مضبوطی سے جڑ پکڑ گیا کہ مصطفیٰ کمال نے ۱۹۲۵ء میں جو قانون منظور کیا تھا، وہ بھی اس کا استیصال نہ کر سکا۔

دو پُرجوش اور ترقی پذیر قوتوں کے درمیان مملوک بالکل بودے اور ناکارے نظر آتے تھے عثمانیوں اور مملوکوں کے درمیان تعلقات خوش قدم (مملوک سلطان ۱۴۶۱ء - ۱۴۶۷ء) اور محمد فاتح کے وقت سے کشیدہ چلے آتے تھے، لیکن ۱۴۸۶ء تک لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ پھر قایت بای (مملوک سلطان) اور عثمانی سلطان بایزید ثانی کے درمیان اذانہ، طرسوس اور دوسرے سرحدی شہروں کے سلسلے میں لڑائی شروع ہو گئی۔ جب قایت بائے نے دیکھا کہ فرڈیننڈ اور ازابلا حکمران ہسپانیہ وہاں کی آخری اسلامی سلطنت کو برباد کر رہے ہیں تو پوپ کو ایک سخت انتباہی پیغام بھیجا کہ (اگر یہ سلسلہ بند نہ ہوا تو) شام و لبنان کے مسیحیوں کے خلاف انتقامی قدم اُٹھایا جائے گا۔ اب مملوک صفویوں کے طرفدار بن گئے کیونکہ صفویوں سے انھیں اپنی سلطنت کے لیے بہت کم خطرہ تھا۔

اگست ۱۵۱۴ء میں عثمانی اور ایرانی فوجیں چالدیراں کے میدانِ جنگ میں رودررو ہوئیں، جو جھیل ارومیہ کے شمال میں ہے۔ نتیجہ زیادہ دیر تک مشتبہ نہ رہا۔ اسمٰعیل کا رسالہ سلطان سلیم کے ینی چریوں[2] کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ فاتح نے تبریز لے لیا جو اس زمانے میں صفویوں کا دارالحکومت تھا۔ ساتھ ہی آرمینیا اور عراق کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ ترک تھک چکے تھے اور آگے نہیں بڑھ سکتے تھے، یا جو کچھ لے چکے تھے اس پر تصرف کو مستحکم بنانا ہی مشکل نظر آتا تھا، لہٰذا وہ اس اُمید پر لوٹ گئے (۱۵۱۵ء) کہ دوبارہ آئیں گے۔

**مرج دابق**

آئندہ سال کے موسم بہار میں قانصوہ الغوری ایک بڑی مصری فوج لے کر بظاہر اس غرض سے شمالی شام پہنچا کہ دونوں محارب فریقوں کے درمیان ثالثی کی خدمات انجام دے

---

[1] قزلباش کے لفظی معنی ہیں سرخ سر والے۔ یہ لوگ سر پر سرخ رنگ کی کلاہ رکھتے تھے، اس لیے قزلباش مشہور ہوئے۔

[2] ینی چری کے لفظی معنی ہیں نئی فوج۔ ترکی کی یہ فوج فتوحات میں حد درجہ معاون رہی۔

Marfat.com

اپنے مقصد کو زیادہ پر امن بنانے کی غرض سے قانصوہ اپنے ساتھ بے اختیار خلیفہ المتوکل[۵۱] اور سلطنت کے بڑے قاضیوں کو بھی ساتھ لایا۔ دراصل وہ اپنے ایرانی حلیف کی امداد کا خواہاں تھا۔ سلطان سلیم کو جاسوسوں کے ذریعے سے صحیح خبریں مل چکی تھیں، جو سفیر قانصوہ کی طرف سے پیغام صلح لے کر سلیم کے پاس پہنچا، اس سے اچھا برتاؤ نہ کیا ہوتا، تمام ساتھی مروا دیے گئے۔ خود اس کی ڈاڑھی منڈوائی گئی، جو انتہائی بے عزتی کا باعث تھی۔ خچر پر سوار کر کے واپس بھیج دیا گیا، ساتھ ہی اعلان جنگ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ سلیم نے فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلے دائیں بازو کے خطرے سے عہدہ برآ ہو ۔

۲۴۔ اگست ۱۵۱۶ء کو دونوں فوجیں مرج دابق کے میدان میں ایک دوسری کے مقابل ہوئیں، جو حلب کے شمال میں ایک دن کی مسافت پر ہے۔ بوڑھے مملوکی سلطان کی عمر پچھتر سال ہو چکی تھی۔ وہ کسی زمانے میں قایت بائے کا غلام تھا اور خاصی جنگی صلاحیت سے بہرہ مند تھا، لیکن نہ اسے اپنے شامی گورنروں کی وفاداری پر بھروسا تھا اور نہ بعض مصری امیروں سے تعاون کی امید تھی۔ غداری کی ابتدا حلب کے گورنر خائر بیگ سے ہوئی جو پہلے ہی عثمانی حملے پر اپنی فوج لے کر الگ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلطان قانصوہ گھوڑے سے گر پڑا۔ بظاہر مرگ کا دورہ[۵۲] پڑا۔ عثمانی فوج اعلیٰ درجے کے توپ خانے، اعلیٰ درجے کی بندوقوں اور لمبی زد کے اسلحہ سے مزین تھی۔ اسے فتح کامل حاصل ہوئی۔ اسی فتح نے شام کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا۔ مملوک فوج میں بدوی اور شامی جیش بھی تھے۔ وہ آتش بار ہتھیاروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ترکی فوج بارود سے کام لے رہی تھی۔ شامی اور مصری کچھ دیر تک اسی دقیانوسی نظریے پر قائم رہے کہ لڑائی کا فیصلہ ذاتی جرأت و شجاعت پر موقوف ہے۔ عثمانی سلطان فاتحانہ حلب میں داخل ہو گیا۔ لوگوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور مملوکوں کے ظلم و جور سے نجات دہندہ قرار دیا۔ وہاں قلعے میں اسے کروڑوں دینار کے خزانے ملے جو مملوکوں اور ان کے افسروں نے چھپا رکھے تھے۔ سلطان سلیم وسط اکتوبر میں دمشق پہنچ گیا۔ وہاں بھی خوب اس کا استقبال ہوا۔ اس طرح شام و لبنان امن سے عثمانیوں کے قبضے میں چلے گئے، یہاں ان کے لیے چار صدیاں رہنا مقدر تھا ۔

---

[۵۱] یہ المستنصر کا جانشین تھا، جو عباسی خاندان میں سے تھا۔ بیبرس نے نئی حکومت کے استحکام کے لیے ۱۲۶۱ء میں اسے قاہرہ میں خلیفہ بنایا گیا تھا، القرمانی : اخبار الدول و آثار الاول صفحہ ۲۱۹، ۲۲۰ ۔

ابن ایاس جلد پنجم صفحہ ۶۷، ۶۹ ۔

Marfat.com

## مملوکوں کی حکومت کا خاتمہ

شام سے سلطان سلیم جنوب کی طرف پیشقدمی کرتا ہوا مصر پہنچا، جہاں قانصوہ کا ایک غلام طومان بائے سلطنت کا مالک بن گیا تھا۔ ۲۲۔جنوری ۱۵۱۷ء کو قاہرہ سے باہر جنگ ہوئی۔ طومان بڑی مردانگی سے لڑا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی فوج ہمت ہار چکی تھی۔ جرنیلوں کے درمیان رقابتیں زوروں پر تھیں۔ آتشیں اسلحہ ناکافی تھے اور جنگ بھی بڑی سخت تھی۔ شام کے میدان کی طرح اس میدان میں بھی مملوک فوجی قیادت اور فنون جنگ میں سلیم کا مقابلہ نہ کر سکے۔ آخر عثمانی فوج قاہرہ میں داخل ہوئی اور اسے لوٹا گیا۔ جو مملوک گرفتار ہوئے انھیں قتل کرا دیا گیا۔ طومان بھاگ کر بدویوں میں چلا گیا۔ آخر اسے گرفتار کرا دیا گیا اور ۱۴۔اپریل کو قاہرہ کے بڑے دروازے پر اسے پھانسی دے دی گئی[1]۔ ساتھ ہی مملوکوں کی سلطنت ختم ہو گئی۔ مصر اپنی برتری کھو بیٹھا۔ حجاز اور مقاماتِ مقدسہ بھی ترکوں کے حوالے ہوئے۔ شریف مکہ نے فوراً اطاعت کا اعلان کر دیا۔ مصری امام نے جمعہ کے خطبے میں عثمانی فاتح کے لیے ان الفاظ میں دعا کی:

> "اے اللہ! تو سلطان کا ناصر ہو، جو سلطان کا بیٹا ہے۔ برین و بحرین کا حکمران ہے جس نے دونوں جگہ پر فتح پائی، جو عراقین کا شہنشاہ اور حرمین شریفین کا خادم ہے سلطان فاتح سلیم شاہ اے اللہ! تو اپنی نصرت سے اسے مشرف رکھ۔ مزید فتوحات اسے ارزانی کر۔ تو ہی دنیا و عقبیٰ کا مالک اور تو ہی کائنات کا خداوند ہے[2]۔"

## خلافت کی داستان

سلطان سلیم قسطنطنیہ واپس ہوا تو خلیفہ بھی جلو میں تھا، جو شمالی شام میں گرفتار ہوا تھا۔ پہلے اس پر غصب مال کا الزام لگا اور وہ قید کر دیا گیا۔ پھر اسے قاہرہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہاں ۱۵۴۳ء میں اس نے وفات پائی۔ رہا یہ مسئلہ کہ اس نے منصبِ خلافت سلیم کے جانشین سلیمان کے حوالے کر دیا تھا، تو یہ مشتبہ ہے۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی اور عملی اعتبار سے اس کی کچھ حیثیت

---

[1] ابن ایاس جلد اوّل صفحہ ۱۳۸ ببعد، ۱۴۵ ببعد، القرامانی صفحہ ۲۲۰۔
[2] ایضاً جلد سوم صفحہ ۹۸۔

Marfat.com

نہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ عثمانی سلطنت دنیائے اسلام کا سب سے طاقت ور فرمانروا ہونے کی حیثیت میں طبعاً خلیفہ کے فرائض و وظائف انجام دینے کا اہل تھا۔ رفتہ رفتہ یہ فرائض اس نے سنبھال لیے اور انجام کار سب نے اسے تسلیم کر لیا۔ سلطان سلیمان نے اپنے والد سلیم کی وفات پر جو خط زین الدین ابن برکات شریف[1] مکہ کو بھیجا تھا، اس میں لکھا تھا کہ اب میں سلطنت کے تخت اور مستقر الخلافت کا مالک ہوں۔ شریف نے جواب میں سلطان کو بڑی سلطنت کی تخت نشینی اور خدائے قدیر و جلیل کے لطف و نوازش سے "خلافت عظمیٰ کے مقام پر فائز ہونے کی مبارک باد دی تھی"[2]۔ اس سے پیشتر زین کو اس کے باپ نے، جو شریف مکہ تھا، سلطان سلیم کے پاس حرمین شریفین کی کنجیاں اور خلافت کے بعض نشان دے کر بھیجا تھا۔ دوسرے نشان خلیفہ المتوکل نے عثمانی سلطان کے حوالے کر دیے تھے۔ ان میں رسول اللہ صلعم کی ردائے مبارک (بُردہ) بھی تھی، جو خاص موقعوں پر پہنی جاتی تھی، نیز بعض اور نشان تھے، جو ذخائر نبویہ کہلاتے تھے، مثلاً عصائے مبارک، خاتم مبارک، نعلین مبارک، دندان مبارک اور موئے مبارک۔ یہ تمام تبرکات قسطنطنیہ کے شاہی محل میں محفوظ رکھے گئے اور منصب عالیہ خلافت کے بیش بہا نشان ہونے کی وجہ سے ان کا خاص احترام کیا جاتا تھا۔ منصب خلافت کے لیے عثمانیوں کے دعوے کی زیادہ مستحکم بنیاد ان کی تلوار تھی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ۱۷۷۴ء تک کسی سلطان نے کسی سفارتی دستاویز میں خلیفہ کا نام استعمال نہ کیا۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں روسیوں اور ترکوں کے درمیان کوچک کینرجی کے معاہدے پر دستخط ہوئے +

---

[1] شریف، حضرت حسنؓ کی اولاد کے لیے امتیازی لقب ہے، حضرت حسینؓ کی اولاد کو سیّد کہتے ہیں۔ حجاز میں شریفیوں کی حکومت تقریباً ایک ہزار سال رہی اور شاہ حسین پر آ کر ختم ہوئی۔ حسین شاہ اردن بھی اسی نسل سے ہے۔ آج کل یہ لوگ سُنّی ہیں، جیسے کہ شریفانِ مراکش سُنّی ہیں +

[2] فریدون بے مجموعۂ منشآۃ السلاطین صفحہ ۵۰۰، ۵۰۲ +

Marfat.com

# پانچواں حصّہ

# عثمانی ترکوں کا دور

Marfat.com

Marfat.com

## چوبیسواں باب

# ہلال اور ستارے کا پرچم

**عام کیفیت** مرج دابق کی جنگ میں بنی بحتر الغربی مملوکوں کی طرفداری میں سرگرم حصہ لے رہے تھے لیکن بنی معن اور بنی شوف میں پرجا چکر لگاتے رہے۔ واضح طور پر کسی کی بھی حمایت نہ کی۔ بظاہر فخر الدین اوّل المعنی نے دو غدار گورنروں ——— خاعربے گورنر حلب اور الغزالی گورنر دمشق ——— سے خفیہ گفت و شنید شروع کر دی تھی اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دے دی تھی کہ انتظار کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ظفریاب کون ہوتا ہے۔ اسی سے مل جائیں گے[1] دمشق میں لبنانی امیروں کا ایک وفد سلطان سلیم کے دربار میں پیش ہوا۔ یہ فخر الدین جمال الدین التنوخی[2] الغربی اور مساف الترکمانی الکسروانی پر مشتمل تھا۔ فخر الدین سلطان کے رو برو زمین بوس ہوا۔ پھر فخیم انداز میں یہ دعا دی :

"اے باری تعالیٰ! اس حکمران کی زندگی کو دوام عطا کر، جسے تو نے اپنی سرزمین کے نظم و نسق کے لیے برگزیدگی بخشی۔ جسے اپنے میثاق کے مطابق خلیفہ مقرر کیا۔ اپنے بندوں پر اور اپنی زمین پر اقتدار دیا اور فرمانروائی و حکمداری سونپی۔ وہ ذاتِ بلند جو تیری روشن شریعت کی حامی ہے۔ جو تیری سچی اور ناسخ ملّت کا قائد ہے۔ ہمارا آقا ہمارا امیر المؤمنین ...... اے باری تعالیٰ! اس کے خاندان کے لیے دوام کی دعا قبول فرما۔ وہ راحت و شادمانی اور عظمت و جلال کی زندگی بسر کرے۔ آمین!"

---

[1] حیدر: غرا صفحہ ۵۵۹، ۵۶۰ + [2] اسے یمنی بدیں وجہ کہا گیا کہ دوسرے تنوخیوں سے ممتاز ہے، جن کا تعلق قیسی فریق سے تھا۔ یہ شخص مملوکوں کا وفادار رہا + [3] حیدر، غرر صفحہ ۵۶۱، دویہی صفحہ ۱۵۲، شدیاق صفحہ ۲۵۱ +

Marfat.com

سلیم فخر الدین کی پر عظمت شخصیت اور خلوص سے متاثر ہوا اور اسے سلطان الجبل کا خطاب دیا۔ اسے اور دوسرے امراء کو لبنان کی جاگیروں پر بحال کر دیا اور مملوکوں کے ماتحت انھیں داخلی خود مختاری کے جو حقوق حاصل تھے۔ قائم رکھے۔ نسلیتہً ہلکے خراج ان کے لیے تجویز کیے۔ خراج میں کسروان کا حصہ چار ہزار دو سو سنہری پیاسٹر تھا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ مشرق کی طرف سے حقیقی خطرہ ایران و مصر تک محدود تھا اور مغرب کی جانب سے بلقان تک۔ پھر عثمانی سلطان اپنے لبنانی ماتحتوں سے یا تو براہ راست معاملے طے کرتے رہے یا اس سلسلے میں ہمسایہ گورنروں کے واسطے سے کام لیتے رہے۔ ابتدا میں دمشق و طرابلس کے گورنر یہ کام انجام دیتے رہے بعد میں صیدا کے گورنر۔ لبنانی خراج گزار داخلی معاملات میں بالکل آزاد تھے۔ اپنے املاک اخلاف میں سے جنھیں چاہتے دیتے۔ سلطان کی طرف سے فوجی خدمت ان پر لازم نہ تھی۔ اپنی مرضی کے مطابق محاصل اور چونگی وصول کرتے تھے، بلکہ اپنی رعایا پر انھیں موت و حیات کا اختیار بھی حاصل تھا۔ ان امیروں میں سے کم از کم ایک نے ایک خارجی طاقت سے معاہدہ بھی کر لیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فتوحات کی جن لہروں نے شام و فلسطین کو پوری طرح اپنی آغوش میں لے لیا تھا، وہ پہاڑوں کی بلندی تک نہ اٹھ سکیں اور کوہستانی باشندے آبائی طریق حیات ہی کے مطابق مصروف عمل رہے۔ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے سب کچھ دیکھتے تھے، جو نیچے میدانی علاقوں میں ہو رہا تھا۔ اور اگر وہ تاریخ کی مزاحمت کے درپے نہ تھے تو کم از کم اس سے اعراض ضرور کیے بیٹھے تھے۔ مصریوں، آشوریوں اور بابلیوں نے اپنے ورود کی دستاویزیں چھینی کے ذریعے سے دامنِ کوہ کی چٹانوں پر کندہ کر دیں۔ رومیوں، بیزنطینیوں اور صلیبیوں نے اپنی آمد کی یادگار میں عالیشان عمارتیں بنائیں، جو اب کھنڈروں کی شکل میں موجود ہیں۔ ایرانیوں، سلجوقیوں اور تاتاریوں کا کوئی بھی نشان باقی نہیں۔ یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نو وارد لٹیرے (عثمانی ترک) کوئی مستقل اثر چھوڑیں گے، اگرچہ وہ چار سو سال مسلط رہے۔

ترکوں کے اقتدار اور فخر الدین کے ظہور سے قبیلہ معن کا ستارہ چمک اٹھا اور بحتریوں کی تقدیر کا ستارہ ڈوب گیا۔ تنوخی جن سے بحتریوں کی نسل چلی، لاریب عربی الاصل تھے، لیکن بنی معن کی اصل کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا، جنھوں نے درزیت اختیار کر لی تھی۔ تنوخیوں کا تعلق زیادہ تر قیسی طریق سے تھا۔ بالکل یہی کیفیت ان کے جانشین بنی معن کی تھی۔ قبیلہ قیس شمالی عرب کا

---

۵ے حیدر: غرا صفحہ ۵۶۱، ۵۶۲، عیسیٰ المعلوف تاریخ الامیر فخر الدین المعنی الثانی۔

Marfat.com

ایک قبیلہ تھا، جو نینیا سے فرات کے ساتھ ساتھ آباد ہو گیا تھا۔ پھر یہ لوگ یمنیوں کے مقابلے میں ایک سیاسی گروہ بن گئے۔ یمنیوں میں زیادہ تر جنوبی عرب کے تارکین وطن تھے۔ شمالی عربوں اور جنوبی عربوں کے درمیان منازعت نے قیسی و یمنی گروہوں کی شکل میں صورت دوام اختیار کر لی اور یہ منازعت خراسان سے اندلس تک پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ اس منازعت نے یمنی اور جنبلاتی کی شکل اختیار کر کے مشرقی بحیرۂ روم کے علاقے میں ظہور کیا اور ماضی قریب تک قائم رہی +

## عثمانی نظم و نسق

لبنان میں عثمانی حکومت بہ مقابلہ شام ایک مدت تک بالواسطہ تھی۔ مملوکوں نے لبنان کو جن انتظامی حلقوں میں تقسیم کر دیا تھا، وہ تخفیف سی ترمیم سے قائم رکھے گئے۔ سلطان سلیم نے ایک کمیشن مقرر کر دیا جس کا کام یہ تھا کہ زمین کی پیمائش کرے تاکہ اس کے مطابق محاصل عائد کر دیے جائیں۔ البقاع کے زرخیز میدان اور دریائے عاصی کی سرسبز وادی میں سے خاصا بڑا حصہ سلطانی املاک میں شامل کر لیا گیا۔ مملوکوں کے زمانے میں محاصل وصول کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص زیادہ رقم ادا کرنے کی بولی دیتا، اسے مجازِ تحصیل بنا دیا جاتا۔ یہ طریقہ قائم رکھا گیا۔ عثمانیوں کے ہاں حنفی فقہ کو ترجیح حاصل تھی۔ یہی فقہ سرکاری طور پر اپنا لی گئی +

گورنریوں کو پہلے "نیابہ" (حلقۂ نائب سلطان، صوبہ) کہا جاتا تھا۔ ترکوں کے ماتحت پہلے ان کا نام "ایالہ" (ترکی ایالت) پھر "ولایہ" (ترکی ولایت) رکھا گیا۔ ولایتوں کی تعداد انتظامی ضرورتوں اور جنگوں میں فتح و شکست کی بنا پر کم زیادہ ہوتی رہی۔ نائب کو "والی" کہنے لگے اور اس کے لیے "پاشا" کا اعزازی لقب تجویز کیا گیا۔ اس کا درجہ وزیر کے برابر تھا۔ والی اور ان کے ماتحت، نیز وزرائے سلطنت اور ان کے سکرٹری اور کلارک حکمران ادارے کے اجزا تھے۔ انھیں عموماً اصحاب السیف یا اہل السیف کہا جاتا تھا اور یہ سب صدرِ اعظم کے ماتحت تھے۔ علماء کا طبقہ اصحابِ قلم یا اہل القلم کہلاتا تھا۔[1] ہر ولایت دو ضلعوں میں منقسم تھی۔[2] حلب اناطولیہ کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں ایک ترک والی مقرر ہوا۔ دمشق کے ساتھ بیت المقدس، عقد اور غزہ ملا دیے گئے۔

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے گب اور ہیرلڈ بوون کی کتاب "اسلامی معاشرہ اور مغرب" صفحہ ۴۵ ببعد، سٹینلے لین پول کی انگریزی کتاب "ترکی کی کہانی" صفحہ ۳۲۲، ۳۳۹ + [2] ترکی لفظ سنجاق ہے، عربی سنجق۔ اس کا عربی ترجمہ لوا یعنی جھنڈا ہے۔ یہ تمام اصطلاحیں سلجوقی نظم و نسق سے لی گئیں +

Marfat.com

یہ جان بردی الغزالی کے حوالے کر دیا گیا ہے، جو مملوکوں کے عہد میں دمشق کا گورنر تھا اور اس نے نازک موقع پر غداری کر کے الغوری کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح الغزالی عملاً پورے شام کا والی بن گیا۔ آگے چل کر اس نے ترکوں سے علیحدگی کا اعلان کر دیا (۱۵۲۰ء)۔ اسے شکست دی گئی اور شام کو تین ولایتوں میں بانٹ دیا گیا۔ اوّل دمشق، جس میں صیدا و بیروت کے سنجاقوں کے علاوہ یروشلم، نابلس، غزّہ اور تدمر بھی شامل تھے۔ دوسری ولایت حلب جو شمالی شام پر مشتمل تھی۔ تیسری ولایت طرابلس، جس میں حمص اور حما شامل تھے۔ یوں لبنان کو طرابلس اور دمشق کے درمیان بانٹ دیا گیا۔ ۱۶۶۰ء میں صیدا کو ایک الگ ولایت بنا دیا گیا، تاکہ لبنان میں آزادی کا جو جذبہ اُبھر رہا تھا، اسے دبایا جا سکے[1]۔

الغزالی کسی زمانے میں نایت بائے کا غلام تھا۔ اس نے نئی حکومت سے وفاداری کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آخری بحتری امیر کو گرفتار کر کے دمشق کے قلعے میں قید کر لیا۔ غربی امراء میں سے ایک نے اس وقت سلطان سلیم کے حضور میں باریابی حاصل کی تھی جب سلطان دمشق میں تھا اور عربی گھوڑے بطور نذر پیش کیے تھے[2]۔ تمام بحتریوں پر شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ مملوکوں کے طرفدار ہیں۔ نیز انھوں نے ایک عرب رئیس ناصرالدین ابن حنشی کو چھپا رکھا ہے، جو صیدا اور البقاع کا رئیس تھا اور اس نے نئے نظام کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ الغزالی نے ابن حنش کے ٹکڑے کرا دیے۔ ایک اور باغی رئیس ابن حرفوش تھا۔ یہ اُس شیعہ خاندان کا سرخیل تھا، جو اب تک بعلبک میں موجود ہے ـــ اس سے بھی یہی سلوک ہوا۔ ان دونوں کے سر قسطنطنیہ بھیجے گئے، لیکن جو شخص پرانے آقا سے غداری کر چکا تھا، اس سے نئے آقا کا وفادار رہنے کی اُمید ہو سکتی تھی؟ سلطان سلیم کی وفات (۱۵۲۰ء) سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے الغزالی نے جامع اموی میں اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا اور اپنے لیے "الملک الاشرف" کا لقب تجویز کیا۔ سلیم کے جانشین سلطان سلیمان (۱۵۲۰ء-۱۵۶۶ء) نے ینی چریوں کی ایک فوج بھیج دی، جس نے ۲۷ جنوری ۱۵۲۱ء کو الغزالی کا خاتمہ کر دیا۔ شہر اور اس کے حوالی کا کم و بیش ایک تہائی حصہ برباد ہو گیا[3]۔ اس وقت سے ینی چریوں کا نام شامیوں کی یاد میں دہشت اور بربادی سے وابستہ ہو گیا۔

---

[1] احمد عبدالکریم: التقسیم الاداری لسوریہ فی عہد العثمانی صفحہ ۱۳۹ بعد۔ [2] ابن سباط حیدر کی کتاب غرائب صفحہ ۵۹۶۔ [3] ابن الیاس جلد پنجم صفحہ ۳۶۳، ۳۷۱، ۳۷۶، ۳۷۸، ۳۸۰-۴۱۸، ۴۱۹، قرامانی صفحہ ۳۱۶، ۳۱۷۔

## رعیّت اور ملّت

عثمانیوں کے سیاسی نظریے کے مطابق مفتوحہ قوموں، خصوصاً غیر مسلموں کو "رعیہ" بنا دیا گیا، اس سے مراد ہے ریوڑ، جس کی چوپانی فاتح کے فائدے کے لیے کی جائے۔[1] یہ لفظ بدویوں کے عربی ذخیرے سے لیا گیا تھا اور اس اصطلاح سے وہ روایتی تصوّر پیش کرنا منظور تھا، جو خانہ بدوش چوپان سلاطین یا کے اخلاف کے قلوب میں جاگزیں تھا۔ مفتوحہ لوگ انسانی ریوڑوں سے مشابہ تھے۔ ان سے دودھ دوہا جاتا تھا، اُون اتاری جاتی تھی اور ان کی حفاظت بھی کی جاتی تھی۔ جب تک وہ سلامت روی پر قائم رہتے تھے، انھیں اپنے طریقے پر زندگی بسر کرنے کی پوری اجازت تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر مزارعین، دستکار اور تاجر تھے اور بڑے فوجی یا انتظامی عہدوں کے طلبگار نہ ہو سکتے تھے۔ وہ عہدے صرف ترکوں کے لیے مخصوص تھے۔ لہٰذا ان میں دھیرے دھیرے غیر ترک لوگ شامل ہوتے گئے، جو اسیرانِ جنگ کی حیثیت میں آتے تھے یا غلاموں کی حیثیت میں خرید کیے جاتے تھے یا مسیحی بچے جو خراج میں وصول ہوتے تھے۔ ان سب کو خوب تعلیم دی جاتی تھی، مسلمان بنایا جاتا تھا، محض اسلام ہی نہیں بلکہ ترکیت بھی ان کی رگ رگ میں اُتاری جاتی تھی۔ ان کی تربیت کا نظام بڑا سخت تھا۔ پہلے بارکوں میں رکھا جاتا۔ پھر سالہا سال تک وہ قسطنطنیہ کے شاہی محل میں منتقل رہتے۔ اس تربیت میں انھیں بار بار پرکھا جاتا۔ جو کم درجے کے ثابت ہوتے، الگ کر دیے جاتے اور بہترین آدمی چن لیے جاتے، جو جسمانی اعتبار سے اعلیٰ ہوتے انھیں ینی چریوں کی پیادہ فوج میں بھرتی کیا جاتا۔ سواروں کا نام "سپاہی" تھا۔ جو لوگ دماغی اعتبار سے برتر ہوتے، انھیں اعلیٰ جنگی اور انتظامی سلسلوں میں منسلک کر لیا جاتا اور وہ وزیرِ اعظم، وزیر، گورنر، سپہ سالار اور امیر البحر ہو جاتے۔ اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جانے کے باوجود وہ سلطان کے غلام سمجھے جاتے تھے۔[2]

---

[1] (مترجم) حتّی نے اور اس کے ساتھ لیبر نے بھی عثمانی سلطانوں کے متعلق یہ عجیب و غریب طریق بیان وضع کیا۔ بلاشبہ وہ مطلق العنان تھے، جیسے کہ اکثر بادشاہ مطلق العنان تھے، لیکن انھوں نے رعایا کی بہبود اور اس کے مختلف طبقوں کے مذہبی و معاشرتی معمولات کے احترام کا وہ نمونہ پیش کیا جس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس کا اعتراف خود حتّی نے آگے چل کر کیا ہے۔ بایں ہمہ ترک سلطان کیسے "چوپان" ہی رہے۔ رعایا کے بہی خواہ اور حق شناس حکمران نہ بن سکے۔ ان میں غلط قسم کے آدمی بھی تھے، جن سے کوئی معاشرہ خالی نہیں، لیکن بیشتر سلطان اکثر یورپی بادشاہوں سے بدرجہا بہتر تھے۔ باقی رہا لفظ "رعایا" تو یہ لفظ دنیا بھر میں ان افراد کے لیے استعمال ہوتا رہا جو بادشاہوں کے ماتحت ہوتے تھے۔

[2] The Government of the Ottoman Empire Under Suleiman the Magnificent
نیز بارنٹ بلر The Palace School of Muhammad the Conquerrer

یہ نظام اٹھارھویں صدی تک قائم رہا پھر مسیحی والدین نے اپنے بچوں کو رقم فدیہ دے کر چھڑانے کی عادت نکال لی اور ترک والدین نے اپنے بچوں کو غلاموں کی حیثیت میں تربیت کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔ اصطلاح "کُول" (قول) یعنی غلام کا مطلب سلطانی رعایا سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی عثمانی خاندان سلطنت کے اندر حقیقتاً خاندان امراء سمجھا جاتا رہا۔ اسے سلطنت کے مرکزی نظم و نسق میں مطلق العنانی کا درجہ حاصل تھا۔ اگرچہ اکثر یہ اختیارات بڑے عہدہ داروں کی طرف منتقل کر دیے جاتے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر ترکی نظام بیشتر کے عرب نظاموں سے نمایاں طور پر مختلف تھا۔ دوسرے لفظوں میں ترکی حکومت غلاموں کی حکومت تھی۔ خواجہ سرا سلطان کے محافظ تھے۔ حرم کی حفاظت کے لیے کنیزیں موجود ہوتیں اور سلطانی اقتدار سلطنت کے بعید ترین گوشوں تک ان عہدہ داروں کے ذریعے سے پہنچ گیا تھا، جو سلطان کے غلام تھے اور سلطان جب چاہتا ان کی جائدادیں ضبط کرنے کے علاوہ انھیں موت کی سزا بھی دے سکتا تھا۔ یہ سلطان بھی خود بھی بسا اوقات کسی ایسی ماں کے بیٹے ہوتے، جو کنیز کی حیثیت میں محل کے اندر داخل ہو کر خواص بنی۔ اسلامی شریعت میں اعضائے جنسی کا انقطاع ممنوع تھا، لہٰذا خواجہ سرا عموماً قفقاز یا سوڈان سے آتے، جہاں انھیں بلوغ سے پیشتر ہی خواجہ سرا بنا دیا جاتا۔ سوڈانیوں کو مصر کے گور[illegible] کر لیتے اور قبطی انھیں خواجہ سرا بناتے۔

ایک اور لحاظ سے بھی ترکی نظم و نسق عربی نظام سے مختلف تھا۔ سلطان اپنے منصب عالیہ کے تنفیذی اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتا اور اسلامی شریعت سے متعلقہ معاملات ایک خاص طبقہ علماء کے حوالے کرتا، جن میں سے بعض کو اہل القلم کہا جاتا تھا اور سول قانون عام عدالتوں کے حوالے ہو گیا، جو آگے چل کر قائم ہوئیں۔ اس سلسلے میں ترکوں نے بیزنطینی نمونے کی پیروی کی۔ علماء کا منصب وہی تھا، جو بیزنطینیوں کے ہاں کلیسا سے تعلق رکھنے والے پادریوں کا تھا۔ اہل علم جن میں اساتذہ، قاضی، فقیہ، مفتی وغیرہ شامل تھے، سب شیخ الاسلام کے ماتحت تھے۔[۵] ابتدا میں قسطنطنیہ کے مفتی کو شیخ الاسلام کہا جاتا تھا۔ یہی شخص اسلامی شریعت کے متعلق فتویٰ دینے کا سب سے بڑا مجاز تھا۔ شریعت کی کسی تعبیر یا قرآنی احکام کے متعلق مجوزہ عمل کا فیصلہ اس کے فتوے پر موقوف تھا، لہٰذا اسے سلطنت میں شرعی معاملات کے باب میں سب سے بڑا اختیار حاصل تھا۔ اہل السیف اور اہل القلم کے علاوہ علماء بھی مسلّم اسلامی خاندانوں سے لیے جاتے تھے۔

درجہ بندی کی ایک بنیاد محکومی تھی۔ اس کے علاوہ مذہبی الحاق بھی پیش نظر رہتا تھا نہ ق

---

[۵] ہیبرس صفحہ ۱۹۹ بعد۔

Marfat.com

سے مشرقِ قریب کا معاشرہ نسل کے بجائے عقائد کی بنا پر مرتب تھا۔ اس طرح قومیت کے دو مساوی نمونے تسلیم کر لیے گئے۔ ایک مذہبی عقائد سے وفاداری یعنی یہودی یا ارمن یا آرتھوڈکس یونانی یا مارونی یا قبطی، دوم حکومت سے وفاداری۔ ہر مذہبی گروہ کو اصطلاح میں ملت[51] کہا جاتا تھا۔ مسلمان بھی ایک ملت تھے، جو تعداد اور اہمیت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد رومیوں[52] کا درجہ تھا۔ یہ اصطلاح یونانی آرتھوڈکسوں کی عثمانی رعایا کے لیے استعمال ہوتی تھی اور اس باب میں لسانی یا قومی اصل کا کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا۔ نظام ملت کے مطابق تمام غیر مسلم گروہ مستقل وحدتیں بن گئے۔ ہر وحدت اپنے مذہبی رئیس کے تابع تھی، جو طلاق، شادی، میراث تینیت وغیرہ معاملات کا فیصلہ کرتا تھا۔ مذہبی تعلیم اور مذہبی اوقاف کا نگران بھی وہی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وسیع حکومت کے اندر ایک چھوٹے درجے کی حکومت کا انتظام ہو جائے۔ اقلیتوں کے مسئلے حل کرنے کی کوشش میں مسلمانوں نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ صورتِ حال میں مزید پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہو گئی کہ لفظ "قوم" مذہبی نقطۂ نگاہ سے بین الاقوامی لفظ تھا۔ اس طرح مارونی اور دوسرے کیتھولک فرانس سے وابستہ ہو گئے، آرتھوڈکس یونانی روس سے اور آگے چل کر پروٹسٹنٹ لوگ برطانیہ سے۔

### امتیازی حقوق

نظام ملت کی توسیع میں وینس، جینوآ، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان کی وہ اقلیتیں آ گئیں، جو ترکی میں آباد تھیں۔ ان اجنبی شہریوں کے حقوق و واجبات تدریجاً تجارتی اور عدالتی معاہدوں کے ذریعے سے مرتب ہوئے۔ انھیں عربی میں امتیازاتِ اجنبیہ کہتے تھے۔ سب سے پہلے یہ درجہ اہل وینس کو ملا اور ان کے ساتھ معاہدے پر خود سلیمان اعظم نے دستخط کیے (۱۵۲۱ء)۔ اس معاہدے کے مطابق ان تمام حقوق کی توثیق و تصدیق کر دی گئی، جو انھیں بزنطینیوں کے ماتحت حاصل تھے۔ چودہ سال بعد اسی سلطان نے فرانسیسیوں کے لیے (بہ زمانۂ فرانسس اول) امتیازاتِ اجنبیہ منظور کیے، جو فرانسیسی تجارت کی بنیاد بنے۔ لیوانت[53] میں فرانسیسیوں کو انھیں امتیازات کی بدولت برتری حاصل ہوئی۔ ۱۸۵ء میں انگلستان نے ایسے ہی حقوق حاصل کیے۔ ان معاہدوں کے مطابق یورپی تاجر اور دوسرے قومی لوگ، جو ترکی میں رہتے تھے، خاص حقوق سے مستفیض تھے۔ وہ بہ حیثیت مجموعی اپنے ہی قوانین ملک کے تابع رہتے اور مقامی نظم و نسق سے وہ بالکل

---

۵۱ ملت بمعنی مذہبی فرقہ۔ ۵۲ یہ اصطلاح ابتدا میں یورپیوں کے لیے، خصوصاً بزنطینیوں کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ پھر ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں کو رومی کہتے رہے۔
۵۳ دیکھیے ڈیٹنا جلد اول صفحہ ۱۵ ببعد، نیم سوسا The Capitulary Regime of the Turks

Marfat.com

محفوظ تھے۔ ۱۵۶۹ء اور ۱۵۸۱ء میں فرانس نے مزید امتیازات حاصل کر لیے اور اسے دوسری حکومتوں کے جہازوں کے سلسلے میں مخصوص حفاظت کا حق حاصل ہو گیا۔ ۱۷۴۰ء میں سلطان محمود اول نے لوئی پانزدہم (شاہِ فرانس) سے معاہدہ کیا جس کی رُو سے نہ محض ارضِ مقدس کے فرانسیسی زائرین بلکہ سلطنتِ عثمانیہ میں آنے والے تمام مسیحیوں کو فرانسیسی پرچم کی حفاظت حاصل ہو گئی۔ یہی مراعات تھیں جن کی بنا پر فرانس نے شام کے تمام کیتھولک مسیحیوں کی حفاظت کا دعویٰ پیش کیا۔[1]

ان امتیازاتِ اجنبیہ کا نتیجہ آگے چل کر یہ نکلا کہ اجنبیوں کو مقامی معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا، مثلاً وہ ناجائز فائدے اُٹھانے والے ترک عہدہ داروں کو ـــــ اور بہت سے عہدہ داروں کی کیفیت یہی تھی ـــــ بھاری سُود پر قرض دیتے اور اس کے بدلے میں طبعی وسائل سے فائدہ اٹھاتے ریلوں، کانوں اور رفاہِ عامہ کے دوسرے کاموں میں اجارہ دار بن جاتے۔ غرض یہ حیثیتِ عمومی انھوں نے سلطنت کی اقتصادی زندگی کے گلے میں پھندا ڈال لیا۔ شروع میں رعایتوں کا مقصد یہ تھا کہ ایک طاقتور سلطنت اپنی دوست قوموں پر احسان کرتی ہے۔ آگے چل کر صورت یہ بن گئی کہ طاقتوروں نے ایک کمزور سلطنت سے من مانے فائدے اُٹھانے کا انتظام کر لیا۔ اس طرح یہ امتیازات قائم رہے یہاں تک کہ بابِ عالی[2] نے پہلی جنگِ عظیم میں وسطی یورپ کی طاقتوں کی حمایت میں شریک ہوتے ہی مراعات و امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔ ان کے کچھ اثرات باقی رہ گئے، جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد محو کر دیے گئے۔

## اسلامی سلطنت کا عہدِ نصف النہار

سلیمان اول (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) کا عہد سب سے زیادہ لمبا اور سب سے بڑھ کر شاندار تھا۔ اسی میں عثمانی سلطنت نصف النہار پر پہنچی۔ اس وقت یورپ میں اس سلطنت کی حد مغربی جانب وی آنا تک اور مشرقی جانب دریائے نیپر کے پار کریمیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایشیا میں یہ حد بحیرۂ مرمرا سے خلیج فارس تک جاتی تھی، پھر بحیرۂ قلزم تک پورا عرب اس میں شامل تھا۔ افریقہ میں یہ سلطنت مصر سے الجزائر تک چلی گئی تھی۔ مسلمانوں نے عہدِ حاضر میں اتنی بڑی سلطنت کی تعمیر کا کوئی دوسرا نمونہ پیش نہ کیا اور نہ اس عہد کی کوئی دوسری اسلامی سلطنت اتنی استوار و پائدار ثابت ہوئی۔ سلیمان کو

---

[1] ڈیٹسا جلد اول صفحہ ۱۸۶ ببعد، چارلس رُو کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۶۸ - ۷۷، رسل جوپر صفحہ ۹۳، ۱۰۵۔

[2] عثمانی دربار کا یہ نام اس لیے پڑا کہ ایک بڑے اونچے دروازے سے گزر کر دربار میں جاتے تھے (مترجم) آگے چل کر وزارتِ عظمیٰ، وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ کے دفتروں کی عمارت کو بابِ عالی کہنے لگے۔

Marfat.com

سلیمان کو اس کی رعایا القانونی کہتی تھی۔ اس کے قوانین ان تمام قوانین کا مجموعہ اور تکملہ تھے، جو فوجوں کی تنظیم، جاگیروں کی تقسیم اور رعایا کے فرائض کے متعلق پہلے جاری ہو چکے تھے۔ بڑی اصحاب سلیمان کو سلیمان عالی شان کہتے تھے۔ یقیناً وہ عالی شان تھا۔ اس کا دربار فنون، ادبیات اور رفاہ عامہ کا سرپرست ومربی تھا اور یورپی قلوب میں اس کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ فرانسس اوّل شاہ فرانس سے سلیمان نے ان الفاظ سے خطاب کیا:

"سلطانوں کا سلطان، خاقانوں کا خاقان، روئے زمین کے بادشاہوں کو تاج بخشنے والے اور زمین پر خدا کے سایہ کی جانب سے ..... فرانسس شاہ فرانس کے نام[۱]"

سلیمان کے ماتحت ترکی سلطنت پہلی مرتبہ اوّل درجے کی بحری قوت کی مالک بنی نتیجہ یہ نکلا کہ بحیرۂ روم کے تمام جزیروں پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ مزید براں مویا اور براہ راست حملوں یا بحری قزاقی کے ذریعے سے طرابلس، تونیسیہ اور الجزائر بھی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ سلیمان نے مرکز حکومت اور دوسرے شہروں کو مسجدوں، درسگاہوں، شفاخانوں، محلوں، مقبروں، آبی گزرگاہوں، پلوں، کاروان سراؤں اور حماموں سے مزیّن کر دیا۔ اس کی عالی شان مسجد جامع سلیمانیہ آج بھی اس شہر کے قابل دید مقامات میں سے ہے، جو پہلے مرکز حکومت تھا۔ (قسطنطنیہ) اس مسجد کا نقشہ عہد سلیمانی کے مشہور ترین فنکار سنان نے تیار کیا تھا اور مقصود یہ تھا کہ اس مسجد کے سامنے ایا صوفیہ ماند پڑ جائے۔

## ضعف کے مضمر اور اکتسابی عناصر

۱۶۸۳ء میں وی آنا کو مسخر کرنے کی دوسری اور آخری کوشش ناکام رہی یہیں سے عثمانی فتوحات کے اس سیل کا رخ پلٹا، جو تقریباً چار صدیوں سے بے پناہ چلا آتا تھا۔ یہیں سے زوال کا دور شروع ہوا اور چند وقفوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے پہلی جنگ عظیم تک جاری رہا۔ جس میں سلطنت پر خط نسخ کھنچ گیا۔ عثمانی سلطنت بھی رومیوں کی طرح ایک خاندان کی سلطنت تھی۔ اس کی تنظیم اساساً عسکری تھی اور رعایا کے مفاد کی بیشتر سے اسے کمتر تعلق تھا۔ سلطنت کا مفاد سلطان اور خلیفہ کے اردگرد گھومتا تھا یا اس کے سرکاری نمائندوں کے اردگرد۔ سلطان ہی کو ہر جگہ فوقیت حاصل تھی۔ گورنر عیش و راحت کی زندگیاں بسر کرتے تھے۔

---

[۱] راجر بی میریمین کی انگریزی کتاب سلیمان عالیشان صفحہ ۱۳۰۔

Marfat.com

وہ اپنے سے بڑے عہدہ داروں کو نذرانے دے کر عہدے لیتے تھے اور نذرانے یا موعودہ نذرانے جائز و ناجائز ذرائع سے وصول کر لیتے تھے۔ رعایا مختلف نسلی گروہوں کا مجموعہ تھی۔ مثلاً عرب، شامی، مصری، بربر، کُرد، ارمن، سلافی، یونانی، البانی۔ ان کے مذہب بھی مختلف تھے، زبانیں بھی مختلف تھیں، زندگی کے اوضاع و اطوار بھی مختلف تھے۔ یہ کسی غاصب نصب العین کے لیے کسی خصوصی رشتۂ وفا سے باہم وابستہ نہ تھے بلکہ عثمانی شمشیر نے انھیں یکجا کر رکھا تھا۔ حکمران عثمانی تو زیادہ تر دارالحکومت یا شہری نو آبادیوں سے بھرتی کیے جاتے تھے یا ان میں وہ لوگ شامل ہوتے تھے، جو صوبوں سے یا سلطنت کے باہر سے اسلام قبول کر کے آ جاتے۔ عام ترک دہقان بھی رعیت ہی سمجھے جاتے تھے۔ یہ سلطنت متفرق گروہوں کی بہبود کے لیے نہیں بلکہ اصلاً جنگی مقاصد کے لیے منظم ہوئی تھی۔ اس کا دُور افتادہ رقبہ ہلال کی طرح خمدار تھا، جسے سنبھالنا مشکل تھا۔ ہلال کی ایک نوک وسط یورپ میں تھی اور دوسری شمالی افریقہ میں۔ پھر آمد و رفت کے مسائل بہت معمولی تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سلطنت کے بنیادی نظام میں زوال و انحطاط کے جراثیم موجود تھے۔ اختیاراتِ اعلیٰ کی باگ ڈور ایک شخص کے ہاتھ میں تھی۔ یعنی سلطان خلیفہ۔ پھر جانشینی کے سلسلے میں جو معمولات رائج ہو گئے اور ایک فوجی قوت شدت سے قدامت پسندی کے ساتھ چمٹ گئی۔ یہ عوامل بہرحال انحلال ہی کو تقویت پہنچانے والے تھے۔ زوال کی داخلی قوتیں پورے زور سے کارفرما تھیں۔ پھر بیرونی عوامل نے بھی آہستہ آہستہ تقویت حاصل کر لی۔ اٹھارھویں صدی میں فرانس، انگلستان اور آسٹریا دائرہ ہائے اثر کی تلاش میں نکل پڑے۔ انیسویں صدی میں روس نے یورپ کے "مردِ بیمار" کے املاک کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

بدوی معاشرے میں شیخ کا جانشین لازماً اس کا بیٹا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ منصب قبیلے کے ممتاز فرد کو ملتا تھا۔ معاویہؓ نے جو اموی خلافت کے بانی تھے، جانشینی کے لیے میراث کا اصول جاری کیا[1]، جو ابتدائی دور کی روایات سے متصادم رہا۔ سلطان محمد فاتح (۱۴۵۱ء۔ ۱۴۸۱ء) کے زمانے سے یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ سابق سلطان کا جو بیٹا تخت نشین ہوتا، وہ اپنے تمام بھائیوں کو قتل کرا دیتا، جن میں سے اکثر اس کے سوتیلے بھائی ہوتے، یعنی خواصوں کے بیٹے، جن میں سے ہر ایک کی آرزو ہوتی کہ اپنی اولاد کو تخت پر بٹھائے۔ مراد ثالث (۱۵۷۴ء۔ ۱۵۹۵ء)

---

[1] دیکھیے حتی کی تاریخ شام صفحہ ۴۴۰۔

Marfat.com

سلطنت عثمانیه

Marfat.com

Marfat.com

نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے پانچ بھائی قتل کرا دیے۔ اس کے بیٹے اور جانشین محمد ثالث[۱]
(۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء) نے اپنے اُنیس بھائیوں کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا اور وہ کُل اتنے ہی
تھے۔ سلیمان اعظم اکلوتا بیٹا تھا، اس لیے اسے عام سازشوں یا تخت نشینی کی جنگوں سے
سابقہ نہ پڑا، تاہم اس نے بھی اپنے دو بیٹے مروا دیے۔ بڑا بیٹا صرف سلیمان کی کنیز بیوی روکسلینا
کی انگیخت پر قتل کا سزاوار ٹھہرا۔ روکسلینا روس کے ایک پادری کی بیٹی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ
اپنے بیٹوں کے لیے تخت کا راستہ صاف کر لے۔ صرف یہی ایک واقعہ نہیں، جس میں سلطانہ نے
تخت کے پس پردہ بیٹھ کر حکم چلایا ہو۔ سلطان کی والدہ دوسرے موقعوں پر بھی غیر مرئی انداز میں
کارفرما رہیں۔ بعض اوقات ینی چری بھی سلطانوں کے بنانے اور بگاڑنے میں حصہ لیتے رہے اور
وہ جسے چاہتے تھے، صدر اعظم بنا لیتے تھے، جسے چاہتے تھے، معزول کر دیتے تھے۔

احمد اول (۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء) سے ترکوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ حکمران کے خاندان سے اس
شخص کو وارث مانا جائے جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔ احمد نے ایک نیا سلسلہ جاری کر دیا یعنی

---

ط ۱

۹۔ سلیم اول (۱۵۱۲ء)

۱۰۔ سلیمان اول (۱۵۲۰ء)

۱۱۔ سلیم ثانی (۱۵۶۶ء)

۱۲۔ مراد ثالث (۱۵۷۴ء)

۱۳۔ محمد ثالث (۱۵۹۵ء)

۱۵۔ مصطفیٰ اول (۱۶۱۷ء، ۱۶۲۲ء) — ۱۴۔ احمد اول (۱۶۰۳ء)

۱۸۔ ابراہیم (۱۶۴۰ء) — ۱۷۔ مراد رابع (۱۶۲۳ء) — ۱۶۔ عثمان (۱۶۱۸ء)

۲۱۔ احمد ثانی (۱۶۹۱ء) — ۲۰۔ سلیمان ثانی (۱۶۸۷ء) — ۱۹۔ محمد رابع (۱۶۴۸ء)

۲۳۔ احمد ثالث (۱۷۰۳ء) — ۲۲۔ مصطفیٰ ثانی (۱۶۹۵ء)

Marfat.com

محصور باغ میں ایک کوشک تھا، جسے قفس کہتے تھے، اس نے اپنے بھائیوں کو قتل کرنے کے بجائے وہاں نظر بند کر دیا۔ نظر بند لوگ وہاں اپنے حرم، غلاموں اور خواجہ سراؤں کے ساتھ رہتے۔ ان کے بیٹے عموماً مارے جاتے۔ یہ طریقہ بلاشبہ رحم پر مبنی تھا، لیکن اس سے نتیجے بہت برے نکلے۔ جب کوئی نظر بند شخص کسی سلطان کا جانشین بنتا تو وہ عموماً ناتجربہ کار ہوتا بلکہ بعض حالتوں میں اس کے دماغی قویٰ طبعی نشوونما ہی سے محروم رہتے۔ عبدالحمید اوّل (۱۷۷۴ء - ۱۷۸۹ء) تینتالیس سال تک نظر بند رہا تھا اور دماغی اعتبار سے وہ بہت ضعیف تھا۔ یہی کیفیت محمد خامس کی تھی، جو نہایت نازک وقت میں (۱۹۰۹ء) اپنے بھائی عبدالحمید ثانی کا جانشین بنا۔

## ترکی ثقافت

مختلف الاصل عناصر کی ایک بڑی تعداد، جو منگولی، ایرانی، عربی اور بیزنطینی سرچشموں سے لی گئی تھی، حیرت انگیز طریقے پر آمیز کر دینے سے وہ چیز وجود میں آئی، جسے عثمانی ترکی ثقافت کہتے ہیں۔ وسط ایشیا کی خانہ بدوشی سے جو میراث ملی تھی، وہ تیز نقل و حرکت، جذبۂ توسیع اور عزم جنگ پر مشتمل تھی۔ ایران میں ترک مغربی جانب کوچ سے پیشتر ٹھہرے رہے۔ وہاں سے تعمیراتی و فنی آرائشیں، ادیبانہ طرز تحریر کے نمونے اور بادشاہ کی برتری کے متعلق نظریاتی تصور لیے۔ بیزنطیں نے بلاواسطہ یا سلجوقیوں کے واسطے سے متعدد فوجی و انتظامی ادارے لیے، لیکن ترکوں کے سب سے بڑے اور آخری معلّم عرب تھے۔ عربوں کے تعلق میں ترکوں کی حیثیت وہی تھی جو یونانیوں کے تعلق میں رومیوں کی تھی۔ ترکوں نے عرب سے مذہب لیا، ساتھ ہی مجلسی و اقتصادی اصول اور قوانین شریعت آئے۔ علوم اور حروف تہجی آئے، جو ۱۹۲۸ء تک ٹھکرائے نہ گئے۔ مذہب اور عربی رسم الخط قبول کر لینے سے بے شمار دینی، فلسفیانہ، قانونی، علمی اور ادبی اصطلاحات عربی سے مستعار لی گئیں، جو ایسی مضبوطی سے پیوست ہوئیں کہ کمالیوں نے زبان کو صاف کرنے کی جتنی کوششیں کیں، ان میں بھی زائل نہ ہو سکیں۔ تین بڑے دائروں میں ترکوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اوّل سیاسیات، دوم تعمیرات، سوم شعر۔

سیاسی تنزل کے ساتھ ہی ثقافتی تنزل آ گیا۔ یورپ قرون مظلمہ سے باہر نکلا تو تنوّر کے دور میں داخل ہو گیا۔ اس نے مادی فطرت پر مفید گرفت مضبوط کر لی۔ نئے علمی اور فنی طریقے نکالے اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ ترکی اپنے روایتی طریق زندگی پر چلتا رہا۔ اسے بیرونی دنیا

Marfat.com

ترقی کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس کے باشندے یورپ میں رہتے تھے، مگر یورپی نہ بن سکے۔ بہت تھوڑی تعداد میں مغربی درسگاہوں کی سرپرستی کی یا یورپی زبانوں کا مطالعہ کیا۔ ان زبانوں سے تراجم کا سلسلہ مسیحیوں اور یہودیوں کا اجارہ رہا۔ نئے حقائق کے متعلق خاصی آگاہی حاصل کرنے اور ان سے کام لینے میں سستی مہلک ثابت ہوئی۔[1] محکوم اقوام، جن میں سے مسیحی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں، مغربی محرکات سے فی الفور متاثر ہوئے اور تجدد و ترقی کی راہ پر لگ گئے۔ حاکم و محکوم میں تفرقے کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی +

---

[1] لیوس، امس اور رچرڈ فرائی کی کتاب The United States & Turkey & iran، صفحہ ۴۹ +

Marfat.com

# چوبیسواں باب

## امرائے جبل۔ خاندان معن

### معن کی اصل

عثمانی فتوحات کے ساتھ ہی وسطی اور جنوبی لبنان میں بحتریوں اور تنوخیوں کی جگہ معن نے لے لی۔ تنوخی عمارت کا سورج ڈوب گیا اور معن کی امارت کا سورج چمک اٹھا۔[1] اس خاندان کا بانی معن الایوبی تھا جس سے خاندان کا نام چلا۔ اس کا عربی نسب نامہ قطعاً یقینی نہیں۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۱۲۰ء میں آیا، جب دمشق کے سلجوقی گورنر طغتگین نے اسے حکم دیا تھا کہ اپنے قبیلے کے ساتھ جبل لبنان کی جنوبی و مغربی ڈھلانوں پر آباد ہو جائے اور ساحلی علاقے میں صلیبیوں کو ہراساں کرتا رہے۔ معن خاندان کے لوگوں نے الشوف میں خیمے لگا لیے، جو اس وقت بھی حد درجہ غیر آباد تھا اور بعقلین کو صدر مقام بنالیا، جو بے آبادی کے باعث صحرا سے مشابہ تھا۔[2] ضعف عدی بعد شہابیوں نے، جن کا تعلق قریش سے تھا، حوران میں اپنے گھر بار چھوڑے اور جنوبی لبنان کی وادی تیم میں پہنچ گئے۔ یہ دونوں خاندان معاہدوں اور شادیوں کے ذریعے سے متحد ہو گئے اور دونوں نے عہد جاگیرداری کے لبنان میں ممتاز کردار ادا کیا۔ معن نے جنوبی لبنان میں پہنچتے ہی دروزی مذہب اختیار کر لیا، جو وہاں کے باشندوں میں رائج تھا۔ شہابیوں نے مارونیت سے وابستگی پیدا کر لی۔ ان کی صرف ایک شاخ اسلام پر قائم رہی۔ بنی عسداق اور بنی سیفا معن کے اقتدار کی بنیاد فخر الدین اول نے رکھی تھی (وفات ۱۵۴۴ء)۔ یہ اقتدار اس کے پوتے فخر الدین ثانی (۱۵۹۰ء۔ ۱۶۳۵ء) کے عہد میں اوج کمال پر پہنچ گیا۔ پھر زوال شروع ہوا، یہاں تک کہ فخر الدین کے پوتے احمد کی وفات (۱۶۹۷ء) پر یہ شمع اقتدار گل ہو گئی۔ پھر معن کی جگہ شہابیوں نے لے لی اور وہ انیسویں صدی کے وسط تک لبنانی نظم ونسق کے ذمہ دار رہے۔ معن کے معاصر اور بعض اوقات

---

[1] شریاق صفحہ ۲۵۰، ۲۵۱

[2] محمد المحبی خلاصۃ العصر فی احیان القرن الحادی عشر، جلد سوم صفحہ ۲۶۶، شریاق صفحہ ۲۴۷

مدِمقابل کسروان کے بنی عسّاف تھے جو معن سے متصل شمالی جانب رہتے تھے۔ بنی عسّاف اصلاً
ترکمان تھے۔ ۱۳۰۶ء میں لبنان کے اندر مقیم ہوئے اور یہ لوگ ان وفود میں بھی شامل تھے، جو اظہارِ اطاعت
کے لیے سلطان سلیم کے پاس پہنچے تھے۔ اُس وقت سے جُبیل بھی بنی عسّاف کی امارت میں شامل ہوگیا۔
منصور کے زمانے میں (۱۵۲۲ء تا ۱۵۸۰ء) عسّافی امارت بیروت کے قریب سے ارقہ تک پہنچی ہوئی تھی،
جو طرابلس کے شمال میں ہے۔ غزیر اُن کے نظم و نسق کا مرکز تھا اور اس عہد میں کسروان خوشحالی کی اُس
منزل پر پہنچا، جو پہلے اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ بعلبک سے شیعہ وہاں چلے آئے۔ انھوں نے
غزیر اور ہراجل پر قبضہ کرلیا۔ البقاع سے سُنّی آ پہنچے اور اُنھوں نے ساحلِ علما اور فیترون میں
اقامت اختیار کرلی۔ المتن کے دروزیوں نے متعدد گاؤں بسا لیے۔ طرابلس کے خطّے سے مارونی عرمون[1]
اور کفور الفتوح[2] میں آباد ہوگئے۔ منصور کے جانشین محمّد کی وفات (۱۵۹۰ء) پر لبنان کا ایک اور جاگیردار
خاندان (بنی عسّاف) دو سو چوراسی سال کی حکمرانی کے بعد ختم ہوگیا۔

بنی عسّاف کی سیاسی میراث سیفا عکّاری کو مل گئی، جو عسّاریوں کے حریف تھے۔ ان کا تعلق
کُردوں سے تھا۔ طرابلس میں مقیم ہوئے اور غیر ملکی تجارت کے متعلق سخت ناروادارانہ پالیسی اختیار کی۔
قنصلوں کی روئدادوں سے واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی تجارت کا مرکز مجبوراً اسکندرونہ لے جانا پڑا[3]۔ اس
خاندان کی تاریخی حیثیت کا آغاز یوسف بن سیفا سے ہوتا ہے، جو ترک پاشا سے بھی زیادہ طاقتور بن
گیا تھا[4]۔ یوسف بڑی امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور داد و دہش میں بہت فراخ حوصلہ تھا۔ چنانچہ شعراء
اس کے دربار کی طرف کھنچے آنے لگے اور اس نے ایک حد تک ویسی ہی حیثیت اختیار کرلی، جیسی
ہارون الرشید کے زمانے میں برامکہ کو حاصل تھی[5]۔ اس کی ریاست کی حدیں انطاکیہ کے حوالی تک پہنچی ہوئی
تھیں۔ ۱۵۵۴ء میں ینی چریوں کا ایک گروہ مصر و فلسطین کے محاصل قسطنطنیہ لے جا رہا تھا۔ جون عکّاری
نے اس پر حملہ کیا اور لوٹ لیا۔ ۱۵۷۱ء میں اطالوی اور ہسپانوی بیڑوں نے ایک آسٹروی کماندار کے
ماتحت ترکوں پر بمقام لیپانٹو (یونان) فتح حاصل کی۔ بظاہر اس وجہ سے بحری راستہ عثمانیوں کے لیے
غیر محفوظ ہوگیا تھا۔ جون کے واقعے پر سلطان مراد ثالث کو سخت غصہ آیا اور مصر کے گورنر ابراہیم پاشا
کے ماتحت ایک تعزیری مہم بھیج دی، جس نے عکّار کے علاقے کو تباہ کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ امرائے
لبنان بعض اوقات باہمی رقابتوں کے علاوہ اقتدارِ اعلیٰ سے بھی لڑ پڑتے تھے۔ مقامی اور قومی سطح پر

---

۱ یہ عرمون المغرب سے الگ مقام ہے۔ ۲ دویہی صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳۔ ۳ جی برشے (Herchet) کی
فرانسیسی کتاب صفحہ ۹۱، ۴۴، ۶۰، ص ۸۵ - ۱۲۵۔ ۴ برشے صفحہ ۱۲۷۔ ۵ محبّی جلد چہارم صفحہ ۵۰۳۔

Marfat.com

جنگِ آزار کے لیے بھی ان کا خاصا وقت اور خاصی قوت صرف ہوتی رہی۔ ۱۵۹۰ء میں یوسف کے آدمیوں نے محمد العسّاف پر البترون اور المسیلحہ کے درمیان اچانک حملہ کرکے قتل کر ڈالا۔ فاتح نے وقت کے دستور کے مطابق مفتوح کی بیوی سے شادی کر لی۔ پورے خاندان کے املاک قبضے میں لے لیے اور غزیر میں بنی عسّاف کے مکان تباہ کر ڈالے جن کے کھنڈر اب تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ حبیش خاندان جو مارونی تھا اور بنی عسّاف کا تابع سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی اس اثنا میں برباد ہو گیا[1]۔

ان تمام جاگیردار خاندانوں کا دستور تھا کہ امیر اپنی جاگیر مختلف ماتحت مقدموں، شیخوں یا دوسرے امیروں میں تقسیم کر دیتا، جنھیں مقاطعجی کہتے تھے۔ مارونیوں کے اپنے مقدم تھے اور بنی سیفا کے زمانے میں یہ لوگ زیادہ تر مشتری ہوتے تھے[2]۔ ان مقدموں کے خاص فرائض یہ تھے کہ خراج جمع کریں اور اپنے رئیس یا سرمایہ پاشا کے ذریعے سے عثمانی حکومت تک پہنچا دیں۔ حکومت کو صرف خراج سے دلچسپی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جمبلاط الشوف پر قابض تھے۔ آج کل انھیں شیخ کا معزز موروثی لقب حاصل ہے۔ ابو لمعا ایک زمانے میں دروزی تھے۔ اب مارونی ہیں۔ یہ بھی امیر کہلاتے تھے اور المتن کو سنبھالے بیٹھے تھے۔ تلحوق فاطمیوں کے جلو میں لبنان پہنچے تھے۔ وہ بالائی غربی علاقے کے مالک بن گئے۔ ارسلانوں نے زیریں غربی علاقہ سنبھال لیا۔ خازن کسروان پر قابض ہو گئے[3]۔ تلحوق آج کل دروزی شیخ کہلاتے ہیں۔

## لبنان پر ترکوں کا حملہ

جون عکّار کے واقعے کی بنا پر عثمانیوں نے تعزیری مہم بھیجی تھی۔ مزید وجہ یہ بیان کی کہ بعض مجرم یا تو دروزی ہیں یا دروزیوں کے علاقے میں پناہ گزین ہیں۔ غرض یہ تعزیری مہم جنوب میں مصر کے مقام الشوف تک بھیجی۔ معلوم ہوتا ہے کہ باب عالی کے نزدیک اپنی گستاخ رعایا کو سبق سکھانے کا یہی مناسب موقع تھا۔ ابراہیم پاشا نے دروزی زعماء میں سے بمقام عین صوفر چھ سو آدمی مروا دیے۔ پوری آبادی سے ہتھیار لے لیے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ساٹھ ہزار کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی[4]۔ جبل دروز[5] (اس زمانے میں جنوبی لبنان کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا) کا امیر قرقماس تھا، جو ترکوں سے دائمی دشمنی کا

---

[1] دویہی صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲، حیدر غرر صفحہ ۶۲۰، شرباز صفحہ ۳۵۰۔ [2] شدیاق صفحہ ۲۱۸ بعد۔

[3] دیکھیے لویاق ص ۵۶، ۵۸۔ [4] دویہی صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹، حیدر غرر صفحہ ۶۱۸، ۶۱۹، خریاق صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲۔

[5] پھر یہ نام ضلع حوران کے لیے تجویز ہوا جب دروزیوں نے لبنان سے نکل کر یہاں پناہ لے لی۔

Marfat.com

حلف اُٹھا چکا تھا۔ کیونکہ پاشائے دمشق نے ۱۵۴۴ء میں قرقماس کے والد کو دھوکے سے قتل کرادیا تھا۔ قرقماس نے جزین کے نزدیک اس غار میں پناہ لی جسے قلعۃ النیحا (شقیف تیرون) کہتے ہیں اور اس مقام تک پہنچنا بہت دشوار تھا۔ وہیں ۱۵۸۵ء میں اس نے وفات پائی۔ وفات کا سبب یا تو یہ تھا کہ اسے زہر دیا گیا یا وہ امارت سے محرومی کے باعث دل شکستہ ہو کر مرا۔ قرقماس فخرالدین اول کا بیٹا تھا، جسے امتیازی حیثیت حاصل تھی اور ممتاز ترین بیٹے یعنی فخرالدین اول کا باپ تھا۔

## فخرالدین ثانی

قرقماس کے پیچھے بارہ سال کا ایک یتیم بچہ رہ گیا، جسے اس کی والدہ نے ایک بہی خواہ کے حوالے کر دیا۔ وہ شخص بچے کو خفیہ خفیہ کسروان کے ایک مقام بلونہ لے گیا، جہاں اس کی تربیت ایک مسیحی گھرانے میں ہوئی۔ یہ خازنوں کا ایک گھرانا تھا۔ ۱۵۹۰ء میں اس کے ماموں سیف الدین تنوخی ساکن عبیہ نے علاقہ الشوف اس کے سپرد کر دیا۔ اُس وقت سے نوجوان امیر اپنی دروزی میراث کا مالک بنا، جو باپ اور ماں کے اجداد کی طرف سے چل رہی تھی۔ ترکوں کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت موجزن تھی۔ مسیحیوں کے بارے میں اس کے رجحانات بڑے لطف آمیز تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں ایک سہ گانہ منصوبے نے تشکیل پائی یعنی یہ کہ اول لبنان کامل کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچائی جائے، دوم لبنان اور ترکی کے درمیان ہر تعلق منقطع کر دیا جائے، سوم اہل لبنان کو تجدد و ترقی کے راستے پر لگا دیا جائے۔ اس وقت سے یہی منصوبہ اس کی کام آرزوؤں اور کوششوں کا مرجع رہا۔ اس زمانے میں باہم شادیوں کے تعلقات، رشوتیں، سازشیں، حلیفانہ معاہدے، جنگیں حصول مقاصد کے عام ذریعے تھیں۔ فخرالدین نے بھی انھیں وسیلوں سے کام لیا اور وہ کامیابی کے قریب پہنچ گیا۔ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عثمانی لبنان کی تاریخ میں وہ سب سے قابل اور حد درجہ مسحور کن شخصیت تھا بلکہ پوری سلطنت میں اس سے زیادہ نادر صفات کا آدمی کوئی نہ تھا۔

اپنے وسیع منصوبوں پر عمل پیرا ہونے سے پیشتر احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ وہ وطن میں اپنے آپ کو مضبوط بنا لے تاکہ مستحکم مرکز سے کام شروع کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے وادی تیم کے سنی شہابیوں، بعلبک اور البقاع کے شیعہ حرفوشوں سے اتحاد کا انتظام کر لیا اور الغرب کے دروزی ارسلانوں سے شادی کا رشتہ جوڑ لیا[1]۔ کسروان کے مارونی خازن

---

[1] پولس قرعلی، فخرالدین المعنی الثانی صفحہ ۱۳، ۱۴؛ معلوف صفحہ ۶۰، ۶۲۔

Marfat.com

پہلے سے اس کے دوست ہی نہیں محسن تھے۔ المتن کے دروزی الو لمعہ اس کے ہمسایے تھے۔ وہ بھی بے تکلف اس حلقۂ اثر میں داخل ہو گئے، لیکن نہایت طاقتور ہمسایہ اور بالقوۃ دشمن یوسف بن سیفا تھا۔ فخر الدّین نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کی بیٹی سے شادی کر تے۔ یوسف نے باب عالی کو یقین دلا دیا تھا کہ فخر الدّین کا باپ جون عکّاری کے جرم میں شریک تھا اسی وجہ سے اس پر عتاب نازل ہوئی۔ سیفا قبیلے کے آدمی یمنی فریق کے رئیس تھے اور قیسی فریق کی ریاست معن قبیلے کو حاصل تھی۔ فخر الدّین نے سلطان احمد اوّل (۱۶۰۳ء۔ ۱۶۱۷ء) سے عیدا کی سنجاق (ولایت) حاصل کر لی، جو اس کے باپ کے قبضے میں تھی اور بیروت بھی لے لیا۔ اس طرح اسے سمندر کا راستہ مل گیا۔ احمد ایک کمزور اور مذبذب سلطان تھا۔ چودہ سال حکمران رہا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ عہد حکومت میں شاہ عبّاس اوّل نے شاہ ایران کے ہاتھوں شکست کھائی۔ آسٹرویوں اور منگریوں سے لڑائیاں کیں۔ اہل مالٹا سے بحری جنگوں کی نوبت آئی۔ ایشیائے کوچک اور شام میں سرکش پاشاؤں کے ساتھ کشمکشوں سے سابقہ پڑا۔ شام کے پاشاؤں میں ایک کرد رئیس علی جان پولاد تھا، جس نے ولایت حلب پر قبضہ جمالیا۔ فخر الدّین نے اس نا عاقبت اتحاد کر لیا تھا اور اس کے اہل قبیلہ لبنان میں منتقل ہو گئے، جہاں ان کے اخلاف اب تک جنبلاط مشہور ہیں اور دروزیوں میں رئیس مانے جاتے ہیں۔ فخر الدّین نے البقاع، حوران اور بالائی فلسطین کے بدوی شیخوں کو بھی نظر انداز نہ کیا۔ وہ ایک طرف تحفوں اور خطوں سے باب عالی کے شکوک و شبہات کی تسکین کا انتظام کرتا رہا، دوسری طرف اپنے ہمسایوں کے اضلاع پر قابض ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۱۶۱۱ء میں ایک انگریز سیاح لبنان پہنچا تو نہر الکلب سے کوہ کارمل (مار الیاس) تک پورا ساحلی علاقہ، نیز عمقد، بانیاس، طبریہ اور ناصرہ فخر الدّین کی توسیع پذیر امارت میں شامل تھے[1]۔ سینڈیز بیان کرتا ہے کہ فخر الدّین قامت کا پست ہے، مگر اس کا حوصلہ بلند اور کارنامے بڑے زبردست ہیں۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ لومڑی کی طرح عیار ہے اور اس کا رجحان استبداد کی طرف ہے۔ وہ اس وقت تک لڑائی شروع نہیں کرتا اور نہ کسی اہم کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے، جب تک اپنی والدہ الست النسبہ کی رضامندی حاصل نہ کر لے۔

---

[1] A Relation of a Journey، صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲، والئے جلد دوم صفحہ ۹۳ [2] صفحہ ۲۱۰۔

جنوبی جانب اقدامات میں قلعۃ الشّقیف جیسے اہم مقامات اس کے ہاتھ آ گئے، جو صلیبیوں کے زمانے سے اہم جنگی مقامات اور راستوں کی کلید سمجھے جاتے تھے۔ ان تمام مقامات کو اس نے از سرِ نو درست کر لیا اور ان میں فوجی دستے بٹھا دیے۔ البقاع کا زرخیز علاقہ مل جانے سے اس کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔ اب اس نے ایک تربیّت یافتہ قواعد دان فوج کی تنظیم شروع کر دی، جو پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس کی حیثیت ایک حد تک ینی چری فوج کی سی تھی۔ یوں دروزیوں اور مارونیوں کی قدیم بے قاعدہ فوج کے لیے تقویّت کا انتظام ہو گیا۔ تنہا بے قاعدہ فوج عثمانیوں کی باقاعدہ فوج کے مقابلے سے عہدہ برآنہ ہو سکتی تھی یہ باقاعدہ تنخواہ دار فوج سگبان[1] کہلاتی تھی اور اس کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ فخرالدّین کل ایک لاکھ آدمی میدانِ جنگ میں لا سکتا تھا۔[2] ینی چریوں میں بھی سگبان نام ایک جیش تھا۔ فخرالدّین نے الحاج کیوان[3] کو اپنا کارندہ اور معتمد علیہ بنا رکھا تھا۔ یہ شخص ابتدا میں غلام تھا۔ پھر شامی فوج میں ینی چریوں کا افسر بن گیا۔ سازش اور دو رُخا پن میں اسے مہارتِ تامّہ حاصل تھی۔

فخرالدّین کی داخلی پالیسی کے ستون تین تھے۔ اوّل تحفّظ، دوم خوش حالی، سوم غیر فرقہ داری یہ تینوں چیزیں باہم وابستہ تھیں۔ تحفّظ کے سلسلے میں اس نے جا بجا فوجی چوکیاں قائم کیں۔ پُرانے قلعے از سرِ نو بنوائے یا ان کی مرمت کرائی ـــــ مثلاً قلعہ بانیاس یا قلعۂ ندمر[4]۔ جا بجا بُرج بنوائے ـــــ جیسے بیروت میں الکشّاف[5] ـــــ مختلف سڑکوں پر گھومنے پھرنے والے سپاہی مقرر کیے۔ نامہ بر کبوتروں سے کام لیا۔ ان تمام انتظامات کے علاوہ ایک بڑی بھاری باقاعدہ فوج موجود تھی۔ پھر دربارِ قسطنطنیہ میں اپنی حمایت کے لیے ایک ادارہ رکھنا ضروری تھا۔ حریفوں کے مرکزوں میں جاسوس مقرر کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ تمام مصارف پورے کرنے کے لیے بھاری ٹیکس لگانے پڑے۔ ٹیکس اس وقت تک وصول نہیں ہو سکتے تھے، جب تک خوشحالی میں اضافہ نہ ہوتا۔ لہٰذا اسے زراعت اور باغات پر خاص توجہ کرنی پڑی، مثلاً زیتون، توت اور دوسرے

---

[1] اسے سقمان بھی کہتے ہیں، عام بول چال میں سیمان بولتے ہیں۔ فارسی میں اس لفظ کے معنی ہیں شکاری کتے کا نگہبان۔ محبّی جلد سوم صفحہ ۲۶۷، دی آر دیو جلد یکم ص ۴۳۸، مائیکل شبلی فخرالدّین ثانی محسن امیر ملی بیالی ص ۴۶، ۴۸، لامنس جلد دوم ص ۷۴، ۷۵ [2] محبّی ص ۲۶۷ [3] اس کے متعلق دیکھیے محبّی جلد سوم ص ۲۹۹، ۳۰۲، شدیاق ص ۲۵۲، معلوف ص ۳۹، اسے غلطی سے مارونی قرار دیا گیا ہے [4] یہاں کے قلعے کو آج کل قلعۃ ابن معن کہتے ہیں [5] بیروت کا سب سے وسیع چوک ابھی تک مساحۃ البرج کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام ساحۃ الشہداء رکھا گیا ہے۔

Marfat.com

درخت لگوائے۔ سن اور ریشم کی صنعت کو فروغ دیا اور غیر ملکی تجارت کے نئے وسائل پیدا کیے، خصوصاً فلارنس، وینس اور فرانس کے ساتھ۔ فلارنس سے کپڑا، سکّے اور فوجی سامان درآمد کیا جاتا تھا۔ تمام قوموں میں سے اہلِ فلارنس پر عنایات سب سے زیادہ تھیں۔ ١٦٠٨ء میں فخر الدّین نے فرڈیننڈ اوّل دمیدیچی گرانڈ ڈیوک ٹسکنی سے معاہدہ کیا، جس کا دارالحکومت فلارنس تھا۔ اس میں ایک خفیہ فوجی دفعہ بھی تھی، جو عثمانی سلطنت کے خلاف تھی۔[1] فلارنس کے جہاز اکثر لبنانی بندرگاہوں میں آتے اور ریشم، صابون، شراب، روغن زیتون، فول[2]، گیہوں اور دوسرے غلّے لے جاتے تھے۔ بیرونی منڈیوں میں یہ تجارت بہت نفع بخش تھی۔ فخر الدّین نے رفاہِ عامہ کے جو کارنامے انجام دیے، ان میں متعدد چیزیں شامل ہیں، مثلاً نہر الکلب، نہر بیروت، نہر العوالی اور نہر القاسمیّہ پر پل بنائے۔ غیر ملکی تاجروں کے لیے جگہ جگہ سرائیں (خان) بنائیں اور ان کے لیے ویسے ہی امتیازی حقوق کا انتظام کر دیا، جیسے سلیمان اعظم نے دے دیے تھے۔ صیدا میں فرانسیسیوں کے لیے جو سرائے بنوائی تھی (الخان الفرنساوی) وہ انیسویں صدی میں فرانسیسی قنصل اور فرانسسکی پادریوں کے لیے قیام گاہ رہی اور آج کل وہاں یتیم لڑکیاں رکھی جاتی ہیں۔ صیدا مدّت سے حادثوں کا شکار چلا آتا تھا۔ فخر الدّین کے ماتحت اس میں زندگی کی نئی روح پیدا ہوئی۔ اس نے بیروت سے پیشتر مغرب کے ساتھ تجارتی اور مالی تعلقات پیدا کر لیے، جو صلیبی جنگوں کے باعث بگڑے نہیں تھے تو کم از کم معطّل ضرور ہو گئے تھے۔ صیدا کی عظمت و شوکت کا یہ آخری دور تھا، جو تھوڑی مدّت قائم رہا۔ اس کی شمالی بندرگاہ کو ١٦٣٤ء میں اس لیے بھر دیا گیا کہ ترکی بیڑا اس میں نہ آسکے۔ ١٧٩١ء میں عکّہ کے الجزّار نے فرانسیسی تاجروں کو وہاں سے نکال دیا۔ اس طرح صیدا کی تجارت ختم ہو گئی۔ فخر الدّین نے بیروت کی بندرگاہ کو بھی برج کے ملبے سے بھروا دیا تھا۔[4] الجزّار کے زمانے میں وہاں کی ترقّی بھی رک گئی، لیکن آگے چل کر صیدا کی جگہ بیروت کوہستانی علاقے اور دمشق کی بندرگاہ بن گیا۔ فخر الدّین نے اپنے زمانے میں دیودار کے درخت اس مقام پر لگائے تھے، جہاں بیروت کے پرانے جھنڈ تھے۔ بعد کے زمانے میں مشہور ہو گیا کہ سب درخت اسی کے لگوائے ہوئے ہیں۔ دالنے[5] اور چرچل[6] کا خیال تھا کہ فخر الدّین نے سب سے پہلے یہ درخت

---

١؎ اس معاہدے اور ڈیوک کے ساتھ دوسرے معاہدوں کے متعلق دیکھیے پاؤلو کرالی (پولس قرعلی) کی اطالوی کتاب فخر الدّین ثانی جلد اوّل صفحہ ١٢٦ ببعد، جلد دوم صفحہ ١٥٩ ببعد۔ ٢؎ Beans کو کہتے ہیں یعنی لوبیا۔ ٣؎ کرالی جلد دوم صفحہ ٥٨، ٥٩، ٦٧۔ ٤؎ دا آردو جلد دوم صفحہ ٣٣٨، رسل ہیوبر صفحہ ١٢٩۔ ٥؎ جلد دوم صفحہ ١٧٢۔ ٦؎ کرنل چرچل کوہ لبنان میں دس سال قیام انگریزی جلد اوّل صفحہ ١٢١۔

Marfat.com

لگوائے۔ ماؤنٹی[1] اور الیرمین[2]، ان درختوں کو فخر الدین کا جنگل کہتے ہیں۔ درختوں کے اس جھنڈ کا ذکر چوتھی صدی مسیح میں ایک بزنطینی شاعر نے کیا ہے۔ الادریسی (وفات ۱۱۶۶ء) کے زمانے میں یہ درخت بارہ میل مربع رقبہ گھیرے ہوئے تھے[3]۔ صلیبیوں کو منجنیقیں بنانے کے لیے لکڑی یہاں سے مہیا ہوتی رہی اور ان کے مسلمان حریف یہی لکڑی جہاز بنانے کے لیے استعمال کرتے رہے۔

خوش حالی اور تحفظ کی وجہ سے ہمسایہ ریاستوں کے باشندے ترک وطن کر کے اس علاقے میں آنے لگے، مثلاً حلب کے جمبلاط۔ آزاد خیالی اور رواداری کی پالیسی نے شمالی لبنان کے مارونیوں کو جنوبی لبنان کی طرف کھینچ لیا۔ حالانکہ پہلے یہ خالصتہً دروزی علاقہ تھا۔ یوں پہلی مرتبہ ان دو ممتاز گروہوں کے درمیان تعلق پیدا ہوا اور وہ اطمینان سے پہلو بہ پہلو رہنے لگے۔ فخر الدین نے مارونیوں کے خازن خاندان سے ابو نادر[4] کو مشیر اعلیٰ بنا لیا۔ اس خاندان کے ایک فرد کو پیادہ فوج کا کمانڈر مقرر کیا۔ اس خاندان کے رئیس کو خط لکھتے وقت فخر الدین نے عزیز بھائی کہہ کر خطاب کیا۔ یوں اسے شیخ کے منصب اعلیٰ پر پہنچا دیا[5]۔ اس کے اخلاف اب تک شیخ ہی کہلاتے ہیں۔ ایک وقت میں فخر الدین کی فوج میں ہزار مارونیوں پہ مشتمل تھی۔ ۱۶۱۱ء میں اس نے اپنا سفیر کاسموثانی رئیس ٹسکنی و پوپ پال خامس کے پاس بھیجا تاکہ باب عالی کے خلاف اتحاد کی گفتگو پایۂ تکمیل تک پہنچائے[6]۔ وہ ایک مارونی اسقف بنام جرجوس ابن ماروان (ساکن اہدین) تھا۔

دمشق کے گورنر حافظ پاشا نے فخر الدین کے خلاف پے در پے تاکیدی شکایتیں باب عالی میں پہنچائیں۔ آخر وہ مؤثر ثابت ہوئیں اور پچاس سنجاقوں سے فراہم کر کے ایک زبردست فوج بھیج دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگی جہازوں کا بیڑا تھا۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ لبنان کے اس بیباک امیر کو تباہ کر دیا جائے اور اس نے توسیع و علیحدگی کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ درہم برہم کر دی جائے۔ یہ ۱۶۱۳ء کے موسم گرما کا واقعہ ہے۔ بیڑے نے ساحل کی ناکہ بندی کر لی۔ فوج نے پہاڑی علاقے کے خلاف پیش قدمی شروع کی۔ ادھر احتیاط کا تقاضا یہ ہوا کہ قطعاً مزاحمت نہ کی جائے۔ فرانس اور فلانڈرس کے تین جہاز اتفاق سے صیدا کی بندرگاہ میں موجود تھے۔ فخر الدین اور اس کی بڑی اہلیہ نیز ایک مشیر کیوان اور نوکر چاکر ان میں سوار ہو کر اٹلی

---

[1] صفحہ ۴۳۔ [2] فرانسیسی کتاب سفر مشرق جلد اول صفحہ ۴۳۰، ۴۵۲، ۴۔ [3] صفحہ ۱۷۔
[4] یہ کنیت اس کے بڑے بیٹے کے نام سے مشہور ہوئی۔ [5] معلوف صفحہ ۱۷۔
[6] کرالی صفحہ ۱۴، ۱۵، قرعلی جلد دوم صفحہ ۳۷، ۳۸۔

چلے گئے۔ یہ لوگ تریپن روز بعد لیگھارن (لوورنو) کی بندرگاہ میں اترے۔ فخر الدّین نے اپنے بھائی یونس کو فوج کا کمانڈار بنا دیا تھا اور امارت کا سارا کاروبار اپنے بیٹے علی کے حوالے کر دیا تھا۔ معن خاندان کا مرکز بعقلین دیر القمر کے نزدیک منتقل ہو گیا۔

**فخر الدّین اٹلی میں** فخر الدّین کے سوانح حیات صفد کے ایک قاضی نے لکھے ہیں۔ ممکن ہے، یہ کتاب فخر الدین کی تحریک پر لکھی گئی ہو۔ اس سوانح نگار نے اٹلی میں پنچسالہ قیام کی دلچسپ تفصیلات بتائی ہیں اور ان عجائبات کا ذکر بھی کیا ہے جو نصرانیوں کی سرزمین میں دیکھے گئے[1]۔ سوانح میں مختلف مقامات کا مختصر سا ذکر موجود ہے، مثلاً لیگھارن اور اس کی کشتیاں، فلارنس، اس کے محل، عام کھیل، جشن اور میلے، لیسا اور اس کا خمدار مینار، سسلی میں میسینا اور پلرمو۔ تفریحات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ رقص میں مرد و زن دونوں شریک ہوتے ہیں۔ بازاروں میں اونٹ کہیں نظر آتے۔ دُنبے ناپید ہیں۔ شفا خانے جا بجا موجود ہیں، جہاں علاج کے لیے مریضوں سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا۔ جن بچوں کے وارث موجود نہ ہوں، اُن کے لیے خاص گھر بنا دیے گئے ہیں۔ جنگلی سُوروں سے برسرِ عام مقابلے ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ عجائب خانے ہیں۔ ایسے بنک موجود ہیں جو حصّہ داروں کو سود دیتے ہیں۔ ایسے چھاپے خانے موجود ہیں، جہاں مقامی اور عربی زبان کی کتابیں چھپتی ہیں۔ پلرموں سے باہر انھیں ایک مسجد ملی، جو فاطمیوں کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ اس کے گنبد بالکل محفوظ تھے۔ نیپلز کے متعلق بتایا گیا ہے کہ مکان پانچ پانچ سات سات منزل کے ہیں۔ یہاں فخر الدّین نے ایک مسجد کا فوری انتظام کر لیا اور اس کے لیے ایک مؤذّن مقرّر کر دیا۔ مقامی پادریوں کو اس سے بڑی بے اطمینانی ہوئی۔

کاسموثانی نے اپنے لبنانی دوست کا استقبال باضابطہ کیا۔ سرکاری خرچ پر ایک بڑا محل قیام کے لیے تجویز کر دیا اور ایک فنّی کمیشن بھیج دیا تاکہ لبنان میں فوجی اور اقتصادی ضروریات کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے۔ مہمان کو اُمید تھی کہ ہسپانیہ، فرانس یا پوپ کے تعاون سے ایک زبردست مہم منظّم کی جائے گی، لیکن یہ اُمید پوری نہ ہوئی۔ فلارنس کے نوجوان انجینئروں نے ساحل کے ساتھ ساتھ اور پہاڑی علاقوں میں متعدّد قلعے دیکھے۔ فخر الدّین نے اپنے ہم قوموں کے نام ایک خط میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے عاقلانہ انداز میں کہا تھا:

---

[1] احمد الخالدی الصفدی: تاریخ الامیر فخر الدین صفحہ ۱۹۲۷ء۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۸-۲۴۱۔

Marfat.com

> "قوی فریق سے کمزور فریق کی بات چیت دراصل گداگری کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر تم آزادی حاصل کر کے قوموں کے درمیان درجۂ عزت پر فائز ہونا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ سب سے بڑھ کر اپنے قوتِ بازو پر بھروسا کرو۔"[1]

پھر فخرالدین کو اطلاع ملی کہ ترک افسروں نے اس کی والدہ کو گرفتار کر لیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> "ہم نے اپنے سامنے ایک نصب العین رکھ لیا ہے، جس کی طرف ثابت قدمی سے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ نصب العین یہ ہے کہ ہمارا ملک آزاد ہو جائے اور اس کی سیادت میں کوئی خلل باقی نہ رہے۔ ہم طے کر چکے ہیں کہ عیلے کی کوئی ترغیب اور تعزیر کی کوئی تہدید ہم پر اثر انداز نہ ہو گی۔"[2]

میسینا کے ڈیوک نے شاہ فرانس کی نمائندگی کرتے ہوئے فخرالدین کو اپنے پاس بلا لیا، چنانچہ ۱۶۱۵ء میں وہ سسلی پہنچ گیا۔ فخرالدین کا سوانح نگار ہمیں بتاتا ہے کہ شاہ ہسپانیہ نے اسے ایسی ہی مملکت پیش کر دی تھی، جیسی مسلمانوں کے سلطان کی طرف سے اسے حاصل تھی، لیکن شرط یہ لگائی تھی کہ مسیحیت قبول کر لی جائے۔ فخرالدین نے یہ کہتے ہوئے پیش کش بے تامل ٹھکرا دی: "ہم یہاں مذہب یا سلطنت کی تلاش کے لیے نہیں آئے۔ ہمارا ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ ہماری حفاظت کی جائے۔"[3] اسی سال کے موسم گرما میں ڈیوک کے مہیا کردہ جہاز میں خفیہ لبنان کا سفر اختیار کیا اور اطمینان کر لیا کہ صورتِ حال قابو میں ہے۔ مالٹا کے راستے وہ واپس گیا، جہاں کے جنگجوؤں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ یورپ میں کسی دروزی امیر کا پہنچنا اور مشترکہ دشمن کے خلاف تعاون کا آرزومند ہونا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس وجہ سے یہ افسانہ فروغ پا گیا کہ دروزی دراصل صلیبی جنگوں کے زمانے کی ایک نوآبادی کے باشندے ہیں، جس کی بنیاد کاؤنٹ ذی دریو نے رکھی تھی۔[4]

---

[1] انیس النقصولی رسائل الامیر فخرالدین صفحہ ۱۶ کے ان خطوں کے اصولِ تحریر کے متعلق شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نوادرِ حاضر کے ہیں۔ [2] ایضاً صفحہ ۹۔ [3] خالدی صفحہ ۲۳۶۔ [4] Dadreux ایبی میرتی کا سفرنامہ کبرص، شام و فلسطین میں (انگریزی) جلد دوم صفحہ ۲۱، ۲۸، ۔۔۔ جلد دوم صفحہ ۴۰، ۴۱، یرشے صفحہ ۹۰، ماندرل صفحہ ۳۹۔

اس اثنا میں قسطنطینیہ کا وزیر اعظم بھی بدل گیا اور دمشق کا گورنر بھی۔ اس سے فخرالدّین کے حالات بہتر ہو گئے، جس نے خود بخود جلا وطنی اختیار کر رکھی تھی۔ ڈیوک سے اس نے یہ معذرت کی: "میری بوڑھی والدہ نے فوری بلاوے کا خط بھیجا ہے اور ان چھاتیوں کا واسطہ دیا ہے، جن سے میں نے دودھ پیا کہ واپس آؤ اور میرے مرنے سے پہلے اپنی صورت دکھا جاؤ۔" چنانچہ وہ ۱۶۱۸ء میں لبنانی ساحل پر پہنچا۔ اس انتہائی جوش و شادمانی کا اظہار کیا گیا۔ دوست، دشمن سب پیشکش اور تحفے لے کر مراجعت کنندہ امیر کی پیشوائی کے لیے آ گئے۔ یوسف سیفا نے اپنے بیٹے حسن کو عربی النّسل گھوڑے دے کر بھیجا۔ حسن نے فخرالدّین کی ایک بیٹی سے شادی کر رکھی تھی، لیکن فخرالدّین نے اس تحفے کے قبول سے انکار کر دیا اور اک گونہ تہدیدی انداز میں کہا: "ہمیں ان مکانوں کی تعمیر کے لیے مسالا درکار ہے جو تم نے دیر القمر میں تباہ کیے تھے۔" جب فخرالدّین لبنان سے باہر چلا گیا تھا تو یوسف نے موقع سے فائدہ اٹھا کر معن خاندان کے مرکز کو جلانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔

کسی امدادی فوج کے ساتھ واپسی میں ناکامی فخرالدّین کے لیے یقیناً یاس انگیز تھی، لیکن اس نے ہمّت نہ ہاری۔ وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس نے نہ صرف چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے تدبیریں اختیار کیں بلکہ نئے علاقے حاصل کرنے لگا۔ توسیع اور آزادی کے پروگرام پر اس نے انتہائی فوجی ہنرمندی اور سفارتی احتیاط و دور اندیشی سے از سرِ نو کام شروع کیا کہ اس کی کامیابی کے مقابلے میں دورِ سابق کے نتیجے بھی حقیر معلوم ہونے لگے۔ اس کا قد پست تھا۔ حریف اور دشمن اس بنا پر اسے استہزا کے تیروں کا ہدف بناتے رہتے تھے۔ لوگ کہتے تھے۔ "اگر انڈا جیب سے زمین پر گر جائے تو وہ ٹوٹے گا نہیں"۔ یوسف بن سیفا نے ایک مرتبہ اپنی بہو (فخرالدّین کی بیٹی) سے کہا: "تمھارا باپ! میں چاہوں تو اپنی کنجیوں کی طرح اسے بھی جیب میں ڈال لوں۔" یہ سن کر لڑکی کو بڑا دکھ ہوا۔ یہ زبانی یورشیں شعروں میں بھی منتقل ہو گئیں۔ سیفا کے ایک شاعر نے کہا:

"جب کوئی طویل القامت آتا ہے تو ہم اپنی تلواروں کے ساتھ پُرغرور انداز میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی چمکیلی سنہری زنجیروں پر مستقیم رہتے ہیں اور ہماری استقامت محلِ کلام نہیں۔ جب پست قامت آتا ہے تو نہ ہمیں مشوروں کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ سحر و نیرنگ کی ایسا

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ مینڈک کنوؤں کے گوشوں میں ٹرّا رہے ہیں"

فخر الدین نے جواب دیا :

"ہمارا قد چھوٹا ہے، لیکن یاد رہے، دشمنوں کی نگاہوں میں ہم بہت بڑے نظر آئیں گے اور ان پر ہیبت طاری رہے گی۔ تم طویل القامت درخت ہو، ہم آرا ہیں جو لکڑی کو چیر کر رکھ دیتا ہے۔

طیبہ[1]، زمزم اور رسول اللہ صلعم کی قسم۔

عکّار کے پتھروں سے دیر (قمر) کے مکانات از سر نو تعمیر کیے جائیں گے۔"[2]

چنانچہ اپنے قول کو لباسِ عمل پہناتے ہوئے فخر الدین نے سیفا خاندان کے ساتھ تیزی سے اقدامات شروع کر دیے اور اس نے قلعۃ الحصن پر یورش کی۔ عکّار میں تمام محل برباد کر دیے۔ پھر طرابلس میں اس خاندان کے جتنے مکان تھے، سب منہدم کرا دیے اور ان کے پتھر اٹھوا کر اپنے دار الحکومت میں لے آیا۔ دیر القمر میں معن خاندان کی عمارتوں اور مسجدیں، جو اب تک قائم ہے زرد رنگ کے پتھر نمایاں ہیں۔ یہ بتا رہے ہیں کہ انھیں دور سے لایا گیا۔ اب شمالی شام کا راستہ کھلا پڑا تھا۔ فلسطین اور شرق اردن کا راستہ ۱۶۲۲ء میں کھلا، جب سلطان نے نابلس اور عجلون فخر الدین کے حوالے کر دیے۔ دمشق کے گورنر مصطفیٰ پاشا نے یہ دو سنجاق دینے سے انکار کر دیا اور بارہ ہزار فوج لے کر حملے کے لیے بڑھا۔ عنجر البقاع میں لڑائی ہوئی۔ چار ہزار لبنانیوں نے پاشا کی فوج کا صفایا کر دیا۔ خود مصطفیٰ اسیر ہو گیا، لیکن اسے فوراً رہا کر دیا گیا۔[3] ۱۶۲۳ء میں مراد رابع تخت نشین ہوا، جب اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اسی سال ایرانیوں نے بغداد و موصل پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۲۴ء میں مراد نے (بارہ سال کی عمر میں) دیکھا کہ ینی چری اور سوار مسلسل بغاوت اور فتنہ و فساد پر مائل ہیں، تو اس نے ایک طے شدہ امر کو رسماً تسلیم کر لیا، یعنی فخر الدین کو حلب سے مصر تک پورے علاقہ عربستان کا امیر مان لیا۔ اس اعزاز کے سامنے وہ اعزاز بھی ماند پڑ گیا، جو اس کے نانا کو حاصل ہوا تھا۔ خود فخر الدین نے اپنے لیے امیر لبنان و صیدا و طبریّہ کا لقب پسند کیا۔ اس کا سوانح نگار کہتا ہے کہ اب فخر الدین کے لیے اپنے آپ کو سلطان قرار دینے کے سوا کوئی کام نہ رہا۔[4]

---

[1] یہ زمزم کا ایک نام ہے۔ [2] معلوف صفحہ ۲۱۱، چرچل جلد دوم صفحہ ۳۰۷۔ [3] قرعلی صفحہ ۱۶، معلوف صفحہ ۲۳۲، ۲۳۳، دویہی صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹۔

[4] محبی جلد اول صفحہ ۳۸۶۔

Marfat.com

وہ پورے علاقے کا مالک بے غل و غش ہوگیا تو اپنی زندگی کے تیسرے منصوبے پر عمل شروع کیا یعنی لبنان میں دورِ جدید کے انتظامات کو فروغ دینا اور اسے ترقی کے راستے پر لگانا۔ ٹسکنی سے روابط پھر استوار کر لیے گئے۔ سب سے پہلے سفارتی کارکنوں کا مبادلہ ہوا، پھر ٹسکنی سے فنکار، آبکاری کے انجینئر اور زراعت کے ماہر بلا لیے گئے۔ ٹسکنی کے ماہروں نے لبنان کے کسانوں کو ہل چلانے کے اصلاح یافتہ طریقوں سے روشناس کیا۔ بہتر آلاتِ کشاورزی مہیا کیے۔ وہ اپنے ساتھ ایسے مویشی لائے، جس سے مقامی نسل کی اصلاح ہوئی۔ فخر الدین نے جو چیزیں منگوائیں، ان میں کتے بھی تھے، جنھیں عام مسلمان ناپاک سمجھتے تھے، فخر الدین انھیں شکار اور نگہبانی کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔[1] لبنان سے اس نے عربی النسل گھوڑے بھیجے۔ اطالوی ماہروں نے بیروت کی تزئین و استحکام میں امداد دی، جسے صیدا پر فوقیت حاصل ہو چکی تھی اور فخر الدین موسمِ سرما یہیں بسر کرتا تھا۔ بیروت میں اس نے ایک عالی شان محل بنایا، جس کے ساتھ ایک وسیع باغ تھا۔ مانڈرل[2] نے ۱۶۵۶ء میں یہ محل دیکھا تھا، جو شہر کے شمالی و مشرقی حصے میں واقع تھا اور اس کے خوبصورت فواروں، متعدد ایوانوں، اصطبلوں، گھوڑوں کے احاطوں، شیروں کے جنگلوں سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ چیزیں مسیحی دنیا کے ممتاز بادشاہوں کے لیے بھی نازیبا نہ تھیں۔ یہی کیفیت باغ اور اس کے ثمردار درختوں کی تھی۔ جگہ جگہ مجسمے نصب تھے۔ مانڈرل لکھتا ہے:

> "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر زادہ پُرجوش مسلمان نہ تھا۔ صیدا میں بھی اس نے ایک محل بنانا شروع کیا تھا، جو مکمل نہ ہو سکا۔ یہ اس سرائے کے سامنے تھا، جو فرانسیسی تاجروں کے لیے بنائی گئی تھی۔ بعد میں یہ سینٹ جوزف کی راہبات[3] نے لے لی تھی۔ قنصلوں کی رپوٹ سے واضح ہوتا ہے کہ فخر الدین یورپی تاجروں کو وہاں آباد ہونے کی ترغیب دیتا رہتا تھا۔ ان کے لیے امتیازی حقوق کا انتظام[4] کر دیا تھا اور بحری قزاقوں سے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتا تھا۔"

اس نے ایک اور کام بھی کیا، جس کا اثر زیادہ پائیدار تھا، یعنی کیتھولک مشن کو،

---

[1] کرالی جلد دوم صفحہ ۵۲، ۵۳۔ [2] صفحہ ۳۹، ۴۱۔ [3] احمد عارف الزین تاریخ صیدا صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵۔ [4] برشے صفحہ ۱۶۳۔

Marfat.com

خصوصاً کپوچیوں[1] کو صیدا میں قیام کی اجازت دے دی۔ پھر وہ بیروت، طرابلس اور دوسرے دُور افتادہ دیہات مثلاً احدین میں پہنچ گئے، جہاں فرانسسکی راہب رہتے تھے[2]۔ اٹلی میں کچھ مدّت کے لیے مشہور مارونی فاضل حاقلی کو کچھ مدّت کے لیے اپنا کارندہ بنایا اور اس کے ذریعے سے فلارنس کے بنک میں روپیہ جمع کرایا۔ نوّے سال بعد اس کے اخلاف نے روما کے ایک اور رومی سمعانی کے ذریعے سے واپس لینے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی[3]۔

مسیحیوں کے ساتھ فخرالدّین کی ہمدردانہ روش نے مسیحیت کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچایا[4]۔ سینڈیز کہتا ہے کہ ہم نے اسے کبھی نماز پڑھتے نہ سُنا، نہ وہ کبھی مسجد جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ ڈآروِیو[5] فرانسیسی قنصل تھا۔ لیوانت میں وہ متعدّد عہدوں پر رہا۔ وہ لکھتا ہے کہ فخرالدّین کا مذہب وہی تھا، جو اس کے لوگوں کا تھا اور ان کا مذہب کوئی نہ تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فخرالدّین اور خاندان کے دوسرے افراد عثمانی عہدہ داروں کے سامنے اسلام کا اقرار کر لیتے تھے اور اپنے لوگوں میں جاتے تھے تو دروزیّت پر عمل پیرا رہتے تھے۔ ایک دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ ۱۶۳۳ء میں ایک کپوچی طبیب[6] نے اسے بپتسمہ دیا تھا۔ جب اسے موت کی سزا دی گئی تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے پارچات میں ایک صلیب بھی ملی تھی[7]۔

اس کی امارت کا مالیہ خاصا بڑھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی مقدار نو لاکھ دینار تھی، جن میں سے تینتالیس ہزار سلطانی خزانے میں داخل کیے جاتے تھے۔ باقی رقم وہ اپنی زبردست جنگی مشینری کی نشوو ارتقا میں لگاتا رہا۔ اسلحہ کا پیمانہ بلند ہوتا گیا۔ یورپیوں سے گفت و شنید اور مسیحیوں کی طرف اس کا رجحان ترقی کرتا گیا۔ اس وجہ سے بالادست حکام کے دل میں پھر شبہات پیدا ہوئے۔ اس وقت تک سلطان مراد رابع قومی اور بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے بہت قوی ہو چکا تھا۔ احمد اوّل اور مصطفیٰ اوّل کبھی اتنے قوی نہ تھے۔ ۱۶۳۳ء میں شام و مصر کے پاشاؤں کو لبنانی باغی کے خلاف پیشقدمی کا حکم مل گیا۔ دمشق کا کوچک احمد پاشا اس فوج کا سالارِ اعظم تھا۔ ساتھ ہی جعفر پاشا نے

---

[1] Capuchin، یہ مسیحی فرانسسکی درویشوں کا ایک نظام تھا، جو زہد میں بڑے سخت تھے۔

[2] اینکائن ریبّہ کی فرانسیسی کتاب جلد دوم صفحہ ۴۶۴، ۴۶۸، ۴۷۳، دویہی صفحہ ۲۰۳۔ [3] کرالی جلد اول صفحہ ۴۰۲، ۴۰۳، جلد دوم صفحہ ۳۱۵، ۳۱۸، ص ۳۷۸، ۳۸۸۔ [4] صفحہ ۲۱۰۔ [5] جلد اوّل صفحہ ۳۶۷۔

[6] کرالی جلد دوم صفحہ ۳۴۰ ببعد۔

[7] معلوف صفحہ ۲۷۵، وسٹن فلڈ کی جرمن کتاب صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸۔

Marfat.com

بائیس جنگی جہازوں کے بیڑے کے ساتھ ساحلی بندرگاہوں اور استحکامات کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ فخر الدّین نے پچیس ہزار آدمی فراہم کر لیے، جن میں سے بارہ ہزار کی کمان اس کے بیٹے علی کے ہاتھ میں تھی، ان میں سے ایک ہزار مارونی اور دو ہزار دروزی بھی شامل تھے۔ یہ فوج تیزی سے عنداور بانیاس پہنچی، تاکہ حلب، دمشق، غزّہ اور قاہرہ کی فوجوں میں اتّصال نہ ہو سکے۔ جن کی تعداد اسّی ہزار تھی اور وہ کوہستانی علاقے پر بڑھی چلی آ رہی تھی[1] علی نے فتح حاصل کی، لیکن اس کے سات ہزار آدمی مارے گئے اور وہ مقابلے کے قابل نہ رہا۔ وادی التیم کی جنگ میں اس کا گھوڑا ہلاک طریق پر زخمی ہو گیا اور وہ خود تکان سے چُور ہو کر پکڑا گیا۔ وہیں اس کے ٹکڑے اُڑا دیے گئے۔ اس بہادر جنگجو کے سر کو خوشبو لگا کر قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی وہ انگلی ارسال کی گئی جس میں اس نے اپنی مُہر پہن رکھی تھی۔ فخر الدّین کے حلیفوں اور ماتحتوں ـــ سیفا، حرفوش اور یمنی ـــ نے یکے بعد دیگرے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے پاشا کی خدمت میں ایک لاکھ زیچن[2] کی رقم پیش کی، ساتھ ہی اپنے بیٹے منصور کو یرغمال میں دے دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ پیشکش قبول کر لی گئی، مگر جنگ بند کرنے کا حکم صادر نہ ہوا[3]۔ اطالوی دوستوں سے بار بار امداد کی درخواستیں کی گئیں۔ ان میں فخر الدّین کا نمائندہ خصوصی جرجوس ابن مارون واسطہ تھا، مگر کسی درخواست پر توجہ نہ کی گئی[4]۔ اپنے والد کی طرح محفوظ قلعے میں جا بیٹھنے کی ذہنیت پر عمل کرتے ہوئے فخر الدّین بھی مہینوں قلعہ نیحا میں پناہ گزین رہا، لیکن اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ جس پانی پر اس کا انحصار تھا، اسے ذبح شدہ جانوروں کے خون سے آلودہ کر کے پینے کے ناقابل بنا دیا گیا تھا۔ پھر وہ آبشار جزّین سے تھوڑے فاصلے پر ایک ایسے غار میں جا بیٹھا، جہاں تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ ۱۰ فروری ۱۶۳۵ء کے آس پاس اس کا سراغ مل گیا اور بیٹوں کے ساتھ گرفتار کر کے اسے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ سمرنا کے برطانوی قنصل[5] کا بیان ہے کہ سونے سے بھرے ہوئے صندوق دیکھ کر صدر اعظم بہت خوش ہوا۔ پوتے نے بھی اسی فصاحت سے کام لیا، جو فخر الدّین اوّل کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئی تھی۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی، مگر تھوڑی دیر کے لیے۔ اس نے اپنا معاملہ سلطان کی بارگاہ میں یوں پیش کیا:

"حقیقت یہ ہے کہ مجھے غلط سمجھا گیا۔ میں نے سفور کے شذیروں اور نمائندوں

---

[1] پال ریکا دی ہسٹری آف دی ٹرکش ایمپائر جلد اوّل صفحہ ۴۰ ۔ [2] ایک سکّہ جواب متروک ہو چکا ہے۔ اس کی قیمت نصف گنی کے برابر مانی گئی ہے (Zechin) ۔ [3] ریکا جلد اوّل صفحہ ۴۱ ۔ [4] کرالی جلد دوم صفحہ ۲۴۶ ببعد ۔

[5] ریکا جلد اوّل صفحہ ۴۲ ۔

کے حکم کے بغیر کبھی کوئی فوج جمع نہیں کی۔ میں نے جو قلعہ تعمیر کیا، اس میں سلطنت
کی حفاظت کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔ صرف اُن آدمیوں کو موت کی سزا دی
جو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے۔ میں نے باغیوں کے
قلعوں پر صرف اس لیے قبضہ کیا کہ انھیں حکومتِ عثمانیہ کے حوالے کر دوں۔
میں نے حاجیوں کے راستے بدویوں کے چھاپوں سے محفوظ کیے اور شریعت
شریفۂ اسلامیہ کے احکام و ضوابط پوری پابندی سے نافذ کیے[۱]۔

اس طرح سن رسیدہ باغی نے درجۂ اعتماد حاصل کر لیا اور اس کے خلاف رقابت کے جذبات
بھڑک اُٹھے۔ جن لوگوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان پر فوقیت لے جائے گا اور انھیں حلقۂ اعتماد
سے خارج کر دے گا، اُنھوں نے سازشیں شروع کر دیں۔ شیخ الاسلام کو راضی کر کے فخر الدین کے خلاف
ارتداد کا فتویٰ حاصل کیا گیا۔ ۱۳۔ اپریل ۱۶۳۵ء کو دو گونگوں نے مسجد کے چوک میں اس کا گلا گھونٹ دیا[۲]۔
تینوں بیٹوں کو موت کی سزا ملی۔ چوتھا بیٹا حسن اور اس کا بھائی یونس دوسروں کے ساتھ جنگ میں مارے
جا چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا حسین بچ رہا۔ اس پر عثمانیت کا رنگ چڑھ گیا۔ وہ بڑے عہدہ داروں
میں شامل ہو گیا۔ کچھ مدت تک حاجب بنا رہا، پھر اسے سفیر بنا کر ہندوستان بھیج دیا گیا۔

فخر الدین نے لبنانیوں کو ان کی تقدیر کا راستہ بتا دیا تھا۔ اس کی زندگی لبنانِ ماضی اور لبنانِ
حال کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[۱] معلوف صفحہ ۲۰۳، شدیاق صفحہ ۳۳۶۔
[۲] ریگا جلد اوّل صفحہ ۴۲۔ کرالی جلد دوم صفحہ ۳۵۵، ۳۵۶۔

Marfat.com

# چھبیسواں باب

## امرائے جبل — خاندان شہاب

### افراتفری کا دور

فخرالدین سیاسی منظر سے باہر نکلا تو بے عملی اور بے استواری کا دور شروع ہوگیا۔ سوئے ہوئے فتنے جاگ اُٹھے۔ ان میں سب سے زیادہ وسیع فتنہ قیسیوں اور یمنیوں کا تھا۔ جو جاگیردار خاندان معطّل ہوچکے تھے، مثلاً عکّار کے سیفا اور بعلبک کے حرفوش، وہ پھر کھڑے ہوگئے۔ کوچک احمد پاشا نے جنوبی لبنان کی امارت کے لیے علی عَلَم الدین کا انتخاب کیا۔ اس کا تعلّق تنوخیوں سے تھا[1] اور اپنے قیسی ہم قوموں نیز معن پیشروؤں کے خلاف وہ یمنی گروہ کا سردار تھا۔ اس نے حصولِ اقتدار کے لیے سازشیں کبھی نہ چھوڑیں[2]۔ علی نے معن خاندان کے املاک پر قبضہ کرلیا تھا اور ان کے ہمراہیوں اور ہمدردوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تباہ کیا اور وہ جبر و تشدّد کی پالیسی پر کاربند رہا۔ عباسیوں نے بنی اُمیّہ کی تباہی کا فیصلہ کیا تھا تو انھیں دعوت میں بلاکر قتل کردیا تھا۔ علی عَلَم الدین نے اس کے خلاف یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب تنوخیوں نے اسے اپنے محل عبیہ میں کھانے کی دعوت دی تو یہ اپنے آدمیوں کو لے کر میزبانوں پر حملہ آور ہوا اور انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ خاندان کے جو افراد بچ رہے تھے، اُن کا تعاقب کیا گیا، یہاں تک کہ پورے خاندان کا استیصال ہوگیا[3]۔ تاہم مخالفت یونس کے بیٹے ملحم[4] کی قیادت میں جاری رہی، جو فخرالدین کا بھتیجا تھا۔ برسوں تک ملحم جنوبی لبنان پر اقتدار کے لیے

---

۱ انتونیوس ابو خطّار (العینطورینی) کی کتاب مختصر تاریخ جبل لبنان شائع کردہ المشرق جلد ۴۶ صفحہ ۳۳۲
یہ کتاب شدیاق کا ایک ماخذ ہے اور لبنان کے امرا کی تاریخ کے متعلق ابو خطّار کی کتاب پہلی تصنیف ہے۔

۲ شدیاق صفحہ ۱۱۴۔ ۳ ایضاً صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵، حیدر غزر صفحہ ۱۹ء۔

۴ شجرہ، اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں!

Marfat.com

مقابلہ کرتا رہا اور آخر عثمانیوں کی لاپروا مشکوک نگرانی میں اسے نا استوار سا تصرف حاصل ہو گیا۔ بعض اوقات حلی مقررہ محاصل (میری[1]) کے ادا کرنے میں انکار کی بنا پر باب عالی کی سرگرم عداوت کا ہدف بھی بنتا رہا۔ مختلف فریقوں کی یہ کشمکش اس درجہ خونریز تھی کہ شدیاق[2] کہتا ہے: الشوف، الغرب، الجرد اور المتن بالکل بے آباد ہو گئے۔ ملحم کے بیٹے احمد کے ماتحت معن خاندان کی حکومت جاری رہی۔ اس نے ١٦٩٧ء میں لاولد وفات پائی۔ اس پر تنوخیوں سے دو نسل بعد معن خاندان کی نسلِ ذکور ناپید ہو گئی۔ حالات کی ابتری نے طرابلس کے پاشا کو موقع دے دیا اور اس نے ١٦٥٤ء میں بنی حمادہ کو، جو شیعہ تھے، جبیت لبشری بہ طور جاگیر دے دی۔ یہ جاگیر جبر و تشدد کی بنا پر انھوں نے قبضے میں رکھی، یہاں تک کہ ایک صدی بعد قومی مخالفت کے ہنگامے میں وہ نکالے گئے[3]۔

## خاندانِ شہاب

١٦٩٧ء میں بمقام سمقانیہ (نزد بعقلین) ایک قومی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، جس میں لبنان کے ممتاز اصحاب نے امیر بشیر الشہابی ساکن راشیہ کو اپنا حاکم مقرر کیا۔ بشیر معن خاندان کے آخری فرد احمد (بن ملحم بن یونس برادر فخر الدین ثانی) کی بہن کا بیٹا تھا۔ معن ختم ہو گئے، لیکن داخلی خود مختاری اور اصولِ میراث باقی رہے۔ یہ فیصلہ والی عیدا کے ذریعے سے باب عالی کو پہنچا دیا گیا اور یقین دلا دیا گیا کہ مقررہ خراج اور بقایا جلد خزانۂ عامرہ

---

(شجرہ متعلقہ صفحہ گذشتہ)

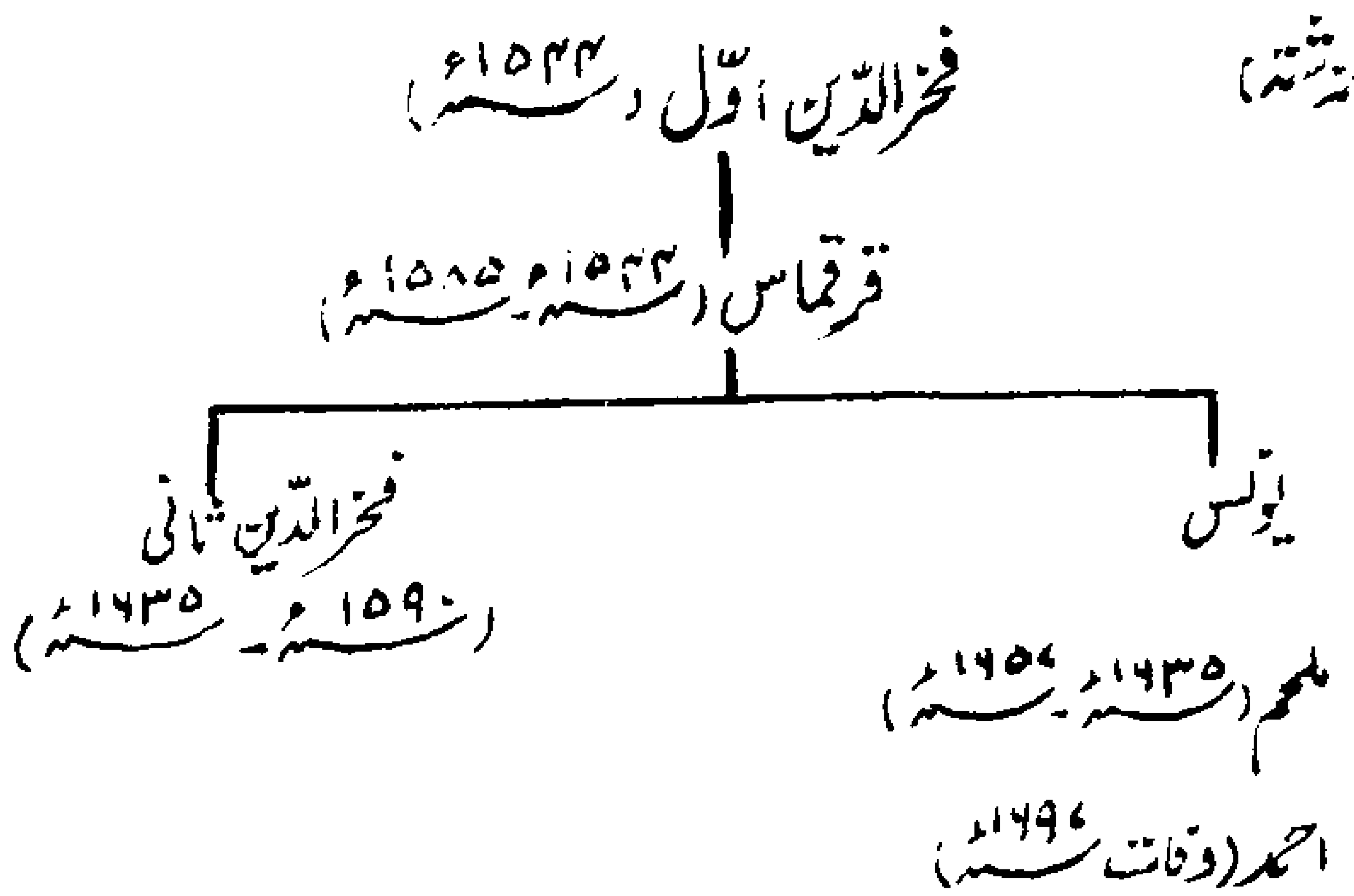


[1] اصل لفظ المال الامیری ہے، یعنی سرکاری مالیہ۔ لوک چال میں صرف میری رہ گیا۔
[2] صفحہ ١١٥۔
[3] ابو خطار

میں پہنچ جائے گا۔ عیدا کو ولایت کا درجہ دے دیا گیا تھا تاکہ لبنان کے جذباتِ آزادی کو روکا جاسکے اور وہاں کے گورنر کی روش پر نگرانی قائم رہے۔ بیروت بعض اوقات دمشق کے ماتحت رہا تھا۔ اب اسے عیدا[2] کے ماتحت رکھ دیا گیا اور عیدا میں ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان تک بھی پاشا گورنر مقرر ہوتا تھا۔ الجزار نے اپنا مرکز عکّہ میں منتقل کر لیا۔ فخرالدّین ثانی کے بیٹے حسین نے باب عالی سے پے درپے یہ درخواست کی کہ حیدر الشہابی ساکن حاعبیہ کا حق مقدم ہے، جو احمد کا نواسا تھا۔ حیدر کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ بشیر کو اس کا نائب مقرر کر دیا گیا۔ یہ منصب اسے ۱۷۰۷ء تک حاصل رہا، جو اس کی وفات کا سال ہے۔ شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ حیدر کے کارندوں نے اسے زہر دے دیا۔ دونوں امیر دیر القمر میں مقیم ہو گئے، جو معن خاندان کا مرکز تھا۔ اس مقام سے شہابی خاندان تقریباً ڈیڑھ سو سال (۱۶۹۷ء۔ ۱۸۴۱ء) حکمران رہا۔ اس زمانے میں کوہستانی علاقے پر ان کا قبضہ بحال رہا۔ اس کی وحدت قائم رکھی گئی۔ آس پاس کے میدانی علاقوں — ساحلی اور اندرونی — پر اقتدار دوبارہ نافذ کر دیا گیا یا حاصل کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں پالیسی یہ تھی کہ عیدا اور طرابلس کے والیوں کی حرص و رقابت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ نیز مرکزی حکومت قسطنطنیہ کی کمزوری کے مدِّنظر جو کچھ کیا جا سکتا ہے، کر لیا جائے۔ عام طریقہ یہ تھا کہ اپنے لوگوں میں سے ایک سردار یا ایک فریق کو دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے، نیز مارونیوں اور دروزیوں کے درمیانی توازن میں فرق نہ آنے دیا جائے۔ اس پالیسی کی کامیابی کا اندازہ لبنانِ کلاں کی خود مختاری سے کیا جا سکتا ہے۔ بشیر نے اپنے پیشرووں کے خلاف عیدا کے والیوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ نہ وہ کبھی علی الاعلان دروزیت کا مدّعی ہوا اور نہ اس کے جانشینوں میں سے کسی نے ایسا اقدام کیا، اگرچہ نجی طور پر انھیں اور اپنے ساتھیوں کو یقین دلا دیا ہو کہ اعترافِ اسلام میں وہ اصول تقیہ پر عمل کر رہے ہیں، جو شیعوں کے نزدیک ایک مسلّمہ اخلاقی اصول تھا۔

**نئے جاگیردار امراء** حیدر کے عہدِ امارت (۱۷۰۷ء۔ ۱۷۳۲ء) کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ یمنی فریق عین دارہ میں بالکل تباہ ہو گیا (۱۷۱۱ء) اس میدانِ جنگ

---

[1] حیدر الشہابی لبنان فی عہد الامراء الشہابیان صفحہ ۳، ۴، شدیاق صفحہ ۳۵۸، ۳۵۹، لامنس جلد دوم صفحہ ۹۳، ۹۴۔

[2] چارلس رو (Roux) کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۸۷۔

Marfat.com

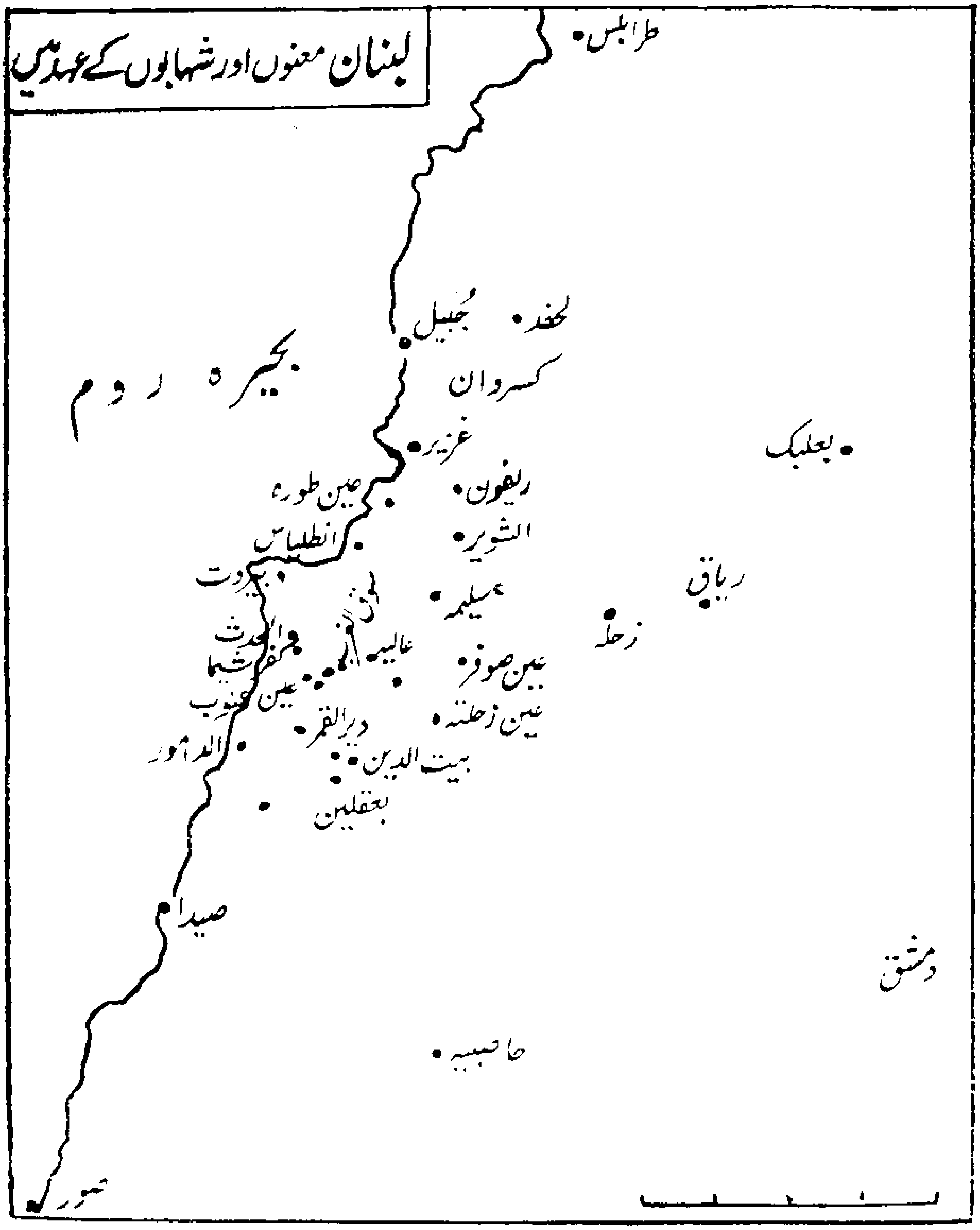
لبنان معنوں اور شہابوں کے عہد میں
طرابلس
لحفد
جبیل
کسروان
بحیرہ روم
غزیر
بعلبک
عین طورہ
ریفون
انطلیاس
الشویر
بیروت
رباق
زحلہ
عالیہ
عین صوفر
عین عنوب
عین زحلتہ
دیر القمر
بیت الدین
الدامور
بعقلین
صیدا
دمشق
حاصبیہ
صور

Marfat.com

میں عَلَم الدّین کا خاندان جو یمنی فریق کا علمدار تھا، اپنے خاص حامیوں کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا۔ شکست خوردہ گروہ کے جن ارکان نے حوران میں پناہ لی، اُنھوں نے وہاں ایک طاقتور دروزی جماعت کی بنیاد رکھ دی۔ اب لبنانی کے جاگیردارانہ املاک میں نئی صف بندی شروع ہوگئی۔ ابو لمعہ کا خاندان اب تک صرف مقدم کے درجے تک فائز تھا۔ عین دارہ کی فیصلہ کن جنگ میں انتہائی شجاعت کی بنا پر اسے امیر کا درجہ مل گیا اور شہابیوں سے شادیوں کا دروازہ کھل گیا۔[1] چنانچہ انھیں متن میں جاگیردار (مقاطعجی) بنادیا گیا۔ جمبلاط کو شیخ کا منصب دے کر الشوف میں بٹھادیا گیا۔ خازن کسروان میں رہتے تھے، انھیں وہاں کی سرداری حاصل رہی۔ ارسلان[2] خاندان یمنی فریق کا حامی تھا اور الشویفات میں زیتون کے سب سے زیادہ باغات انھیں کے قبضے میں تھے۔ ان سے الغرب کی جاگیر چھین لی گئی اور یہ جاگیر عنیاط کے تلحوقوں کو دے دی گئی۔ یوں تلحوق بھی ترقی پاکر شیخ کے درجے تک پہنچ گئے۔ ایک اور دروزی خاندان اسی زمانے میں پردے کار آیا یعنی عبدالملک۔ امیر حیدر نے انھیں شیخ بناکر الجرد[3] کا علاقہ دے دیا۔ ارسلان، جمبلاط، تلحوق اور عبدالملک کے خاندان آج بھی دروزی امرا میں ممتاز ہیں۔ جمبلاط نے ایک نئے فریق کی شکل اختیار کی۔ یزبکی ان کے مخالف تھے۔ یزبک بن عماد[4] کا رئیس تھا۔ وہ اصل میں عمادیہ کا رہنے والا تھا، جو موصل کے نزدیک ہے۔ لبنان میں اس خاندان نے دروزیت اختیار کر لی اور عین دارہ[5] کی جنگ میں وہ نمایاں ہوگیا۔ یزبکی عمادیوں کو تلحوقوں اور عبدالملکوں کی حمایت حاصل تھی۔ رفتہ رفتہ دو فریقوں کی سپرٹ دروزیوں کے دائرے سے باہر پہنچ گئی، یہاں تک کہ مسلمان اور مسیحی بھی باہم بٹ گئے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے تک یہ صورت حال کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی +

## لبنان کلاں کی بحالی

شہابی خاندان از سر نو ترتیب یافتہ جاگیرداری نظام کا رئیس و سرخیل رہا۔ ان کی وجہ سے اتحاد و اتصال قائم رہا۔ ان کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا اور ماتحت جاگیرداران کے لیے مسلح آدمی فراہم رکھتے تھے اور مقامی محاصل کے وصول میں مدد دیتے تھے۔ امیر، مقدم، شیخ اور دوسرے ممتاز اصحاب صلح و جنگ کے فیصلوں اور قومی مفاد کے دوسرے اہم مسئلوں کے فیصلوں میں شریک ہوتے تھے۔ پیشرو معنیوں کی طرح شہابیوں نے

---

[1] شدیاق صفحہ ۳۶۴، ۳۶۵ + [2] خاندانِ عَلَم الدّین کی طرح یہ بھی اصلاً تنوخی تھے + [3] شدیاق صفحہ ۳۶۵، ۳۶۶ + [4] یزبکیوں کی اصلیت کے متعلق مختلف تعبیر کے لیے دیکھیے شبلی صفحہ ۲۲، نیز معلوف صفحہ ۱۸، ۲۰ +
[5] دیکھیے شدیاق صفحہ ۶۲، ۶۴ +

بھی محاصل اپنے ماتحتوں میں تقسیم کر دیے تھے اور یہ محاصل شمالی لبنان کے سلسلے میں پاشائے طرابلس کے پاس، البقاع کے سلسلے میں پاشائے دمشق کے پاس، الشوف کے سلسلے میں پاشائے عیدا کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ اسی طرح نابلس، صفد وغیرہ فلسطینی مقامات کے محاصل ادا ہوتے تھے[1]

حیدر کے بیٹے ملحم (۱۷۳۲ء۔ ۱۷۵۴ء) نے البقاع کا علاقہ حاصل کر لیا اور جبل عامل کو اپنے املاک میں شامل کر کے توسیع کی پالیسی کا آغاز کیا۔ جبل عامل صور کے مشرق میں ہے۔ اس وقت تک وہاں متاولہ ہی رہتے تھے۔ اس کا موقع یوں پیدا ہوا کہ سعد الدین الاعظم والیِ عیدا نے ملحم سے کہا کہ عاملی علاقے میں محاصل ادا کرنے کے لیے امداد دی جائے۔ صور اور صفد جو جنوب میں تھے، لشیر حاصل کر چکا تھا۔ اس نے الظاہر کے باپ عمر الزیدانی کو، جو ایک بدوی رئیس تھا، اپنا کارندہ بنا لیا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں البقاع لے لیا گیا تو قومی محاصل میں بھی اضافہ ہو گیا اور کوہستانی علاقے کی حفاظت کے انتظامات بھی بہتر ہو گئے۔ اس کے بعد ملحم کو اسعد پاشا الاعظم برادر سعد الدین کی فوجوں پر براالیاس میں فتح حاصل ہوئی[2]۔ اسعد عثمانیوں کے ماتحت دمشق کا مشہور ترین حاکم تھا۔ اس کا عالی شان محل اب تک قائم ہے اور اٹھارھویں صدی کی عربی تعمیرات کی نہایت خوبصورت یادگار ہے۔ براالیاس کی جنگ میں بعلبک کے حرفوش امیر نے دمشق کی فوج کو مدد دی تھی، اس وجہ سے امیر لبنان کو اس کے خلاف اقدام کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ حرفوش امیر کو معزول کر کے اس کے بھائی کو یہ عہدہ دے دیا گیا۔ اس طرح اس کا علاقہ امیر لبنان کے دائرۂ اثر میں آ گیا۔ ۱۷۴۹ء میں بیروت پر قبضہ ہوا۔ اس کے لیے مختلف تدبیریں کام میں لائی گئیں۔ شاہین تلحوق نے ملحم کی انگیخت پر جو فتنہ و فساد پیدا کیا تھا، وہ فرو نہ ہو سکا تو بیروت کے ترک حاکم نے والیِ دمشق سے مدد مانگی۔ اس پر والی نے بیروت امیر لبنان کے حوالے کر دیا[3]۔ بیروت پر شہابی خاندان الجزار کے ظہور تک قابض رہا۔ لبنان کو ہمسایہ علاقوں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ اس کے تمام باشندے مستقل فوجی خدمت انجام دینے کے اہل بنا دیے گئے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ لبنان کوہستان کے تمام لوگ بڑے جفاکش، بلند حوصلہ اور شیدائے آزادی تھے۔ گویا لبنان کی بالقوۃ جنگ

---

[1] عبدالکریم صفحہ ۱۴۲، کرد علی جلد دوم صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵۔ [2] دمشق کے اس ممتاز خاندان کے افراد اب تک موجود ہیں۔ انھیں دمشق، صیدا اور حماۃ کی حکومت دی گئی تھی۔ کرد علی جلد دوم صفحہ ۲۸۹، ۲۹۱، شدیاق صفحہ ۶۹، ۳۷۰۔ [3] حیدر لبنان صفحہ ۳۷، ۴۰۔ [4] شدیاق صفحہ ۳۰۳۔

صلاحیت کا مقابلہ کوئی دوسرا علاقہ نہیں کرسکتا تھا۔ شہابی خاندان فرنگیوں کی حفاظت اور حوصلہ افزائی کے سلسلے میں معنی خاندان کی پالیسی پر کاربند تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بحری قزاقوں نے بیروت پر حملہ کیا تو دو مسلمان بیروتیوں نے لاطینی خانقاہ لُوٹ لی۔ ملحم نے دونوں مسلمانوں کو موت کی سزا دی[۱] ۔

۱۷۵۴ء میں ملحم امارت سے دست بردار ہوگیا اور باقی زندگی اسلامی کتابوں کے مطالعے اور مذہبی ذکر و فکر کے لیے وقف کردی۔ اس کے بیٹوں نے مسیحیت قبول کرلی۔ ساتھ ہی ان کے رشتہ دار ابو لمعہ بھی مسیحی بن گئے۔ ملحم کے دو بھائی تھے۔ ان میں سے منصور کا رجحان جمبلاط کی طرف تھا۔ احمد کا یزبکیوں کی طرف۔ ان دونوں میں امارت کے لیے کشمکش شروع ہوگئی۔ احمد مورخ حیدر کا باپ تھا، جس کی کتاب کے حوالے زیر نظر باب میں بار بار آئے ہیں ۔

حیدر بڑا مخلص مسیحی تھا، اس نے اور اس کی بیوی نے شملان کی پوری جاگیر مارونی خانقاہ کے لیے وقف کردی (قائم شدہ ۱۸۲۸ء[۲])۔ اس کے گرد موجودہ گاؤں آباد ہے۔ اس کا مکتب اب دیرالشیر کے پاس ہے۔ ایک اطالوی پادری منصور کی امارت کے زمانے میں لبنان گیا تھا۔ اس کا تاثر یہ تھا کہ دروزی قسطنطنیہ کے وزیر اعظم کی ماتحتی سے آزاد ہیں، لیکن وہ تھوڑا سا خراج ضرور دیتے ہیں۔ باب عالی کو ان لوگوں پر صرف اس قدر اقتدار حاصل ہے اور وہ اپنی آزادی کے لیے بڑے گرمجوش ہیں[۳]۔ موسم سرما میں دروزیوں کا مرکز حکومت بیروت تھا اور موسم گرما میں دیرالقمر۔ اگرچہ یہ شہر متعدد معن اور شہابی امیروں کے قبضے میں رہا، لیکن یہاں چونکہ بحری قزاقوں اور دشمنوں کے حملے ہوتے رہتے، لہٰذا اسے مستقل قیام گاہ بنانا درست نہ تھا۔

بدنظمی کا دور اس وقت تک قائم رہا، جب تک ملحم کے بیٹے یوسف نے بالغ ہوکر امارت نہ سنبھال لی[۴]۔ یوسف کا سرپرست رشمیا کا ایک مارونی تھا، جس کا نام سعد الخوری تھا۔ یہ وہی خوری خاندان ہے، جس سے جمہوریہ لبنان کے دو صدر صاحبان کا تعلق تھا۔ یوسف نے خوری خاندان[۵] کو ترقی کے درجے تک پہنچادیا۔ ۱۷۷۰ء میں مقام باروک ایک قومی مجلس منعقد ہوئی، جس میں منصور نے اعلان کردیا کہ میں اپنے بھتیجے یوسف کے حق میں دست بردار ہونے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔ وہیں

---

[۱] حیدر لبنان صفحہ ۴۷، ۴۸ ۔ [۲] اردنیموس خیراللہ تاریخ موجز لہ الرہبانیہ الانطونیہ المارونیہ صفحہ ۳۲۔
[۳] ہیرٹی جلد دوم صفحہ ۳۱ ۔ [۴] حیدر غزر صفحہ ۸۰۷، شدیاق صفحہ ۳۶۷، ۳۶۸ ۔ [۵] حیدر غزر صفحہ ۸۴۳، شدیاق صفحہ ۳۷۳، وولنے جلد دوم صفحہ ۴۶، ۴۷ ۔

Marfat.com

یوسف کی حاکمی کا اعلان کر دیا گیا۔[۵۱] والیِ دمشق کے ذریعے سے اس فیصلے کی اطلاع بابِ عالی کو پہنچا دی گئی۔ یوسف (۱۷۷۰ء-۱۷۸۸ء) کو پہلا مسیحی امیر سمجھنا چاہیے، جس نے طرابلس سے صیدا تک پورے علاقے پر بے خرخشہ اقتدار حاصل کیا۔[۵۲] سعد اس کا وزیر مالیات تھا۔ والنے[۵۳] جس نے آٹھ مہینے دروزیوں کے درمیان ایک عربی خانقاہ میں گزار کر (۱۷۸۴ء) عربی زبان سے شناسائی حاصل کر لی تھی، لبنانی آبادی کی کثرت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ علاقہ ہمارے بہترین صوبوں کے برابر آباد ہے۔ جو آدمی ہتھیار اُٹھا سکتے ہیں، ان کی تعداد چالیس ہزار ہے۔ وہ آزادی اور تحفّظ کے ایک اونچے درجے سے مستفید ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحی خاندان روزانہ ترکی صوبوں کو چھوڑ کر کوہستانی علاقے میں پہنچ رہے ہیں، جہاں آزادی کی کرنیں جھلملاتی ہیں اور جہاں مارونی اور دروزی گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے ہیں:[۵۴]

"ترکی کے دوسرے علاقوں کے برعکس یہاں ہر شخص کی زندگی اور ملکیّت کامل محفوظ ہے۔ مزارعین دوسرے ملکوں کے مزارعین سے زیادہ دولت مند نہیں مگر امن و اطمینان سے رہتے ہیں۔ انھیں یہ ڈر نہیں کہ فوجی افسر (آغا) یا ضلع کا حاکم (قائم مقام) یا پاشا سپاہی بھیج کر ان کے گھر لٹوا دے گا یا ان کے خاندان کو پکڑ لے جائے گا یا انھیں بید کی سزا دی جائے گی۔ کوہستانی علاقے میں اس قسم کا ظلم وجود بالکل ناپید ہے۔[۵۵]"

---

۵۱ حیدر غرر صفحہ ۸۰۷، شدیاق صفحہ ۳۸۶، ۳۸۷۔

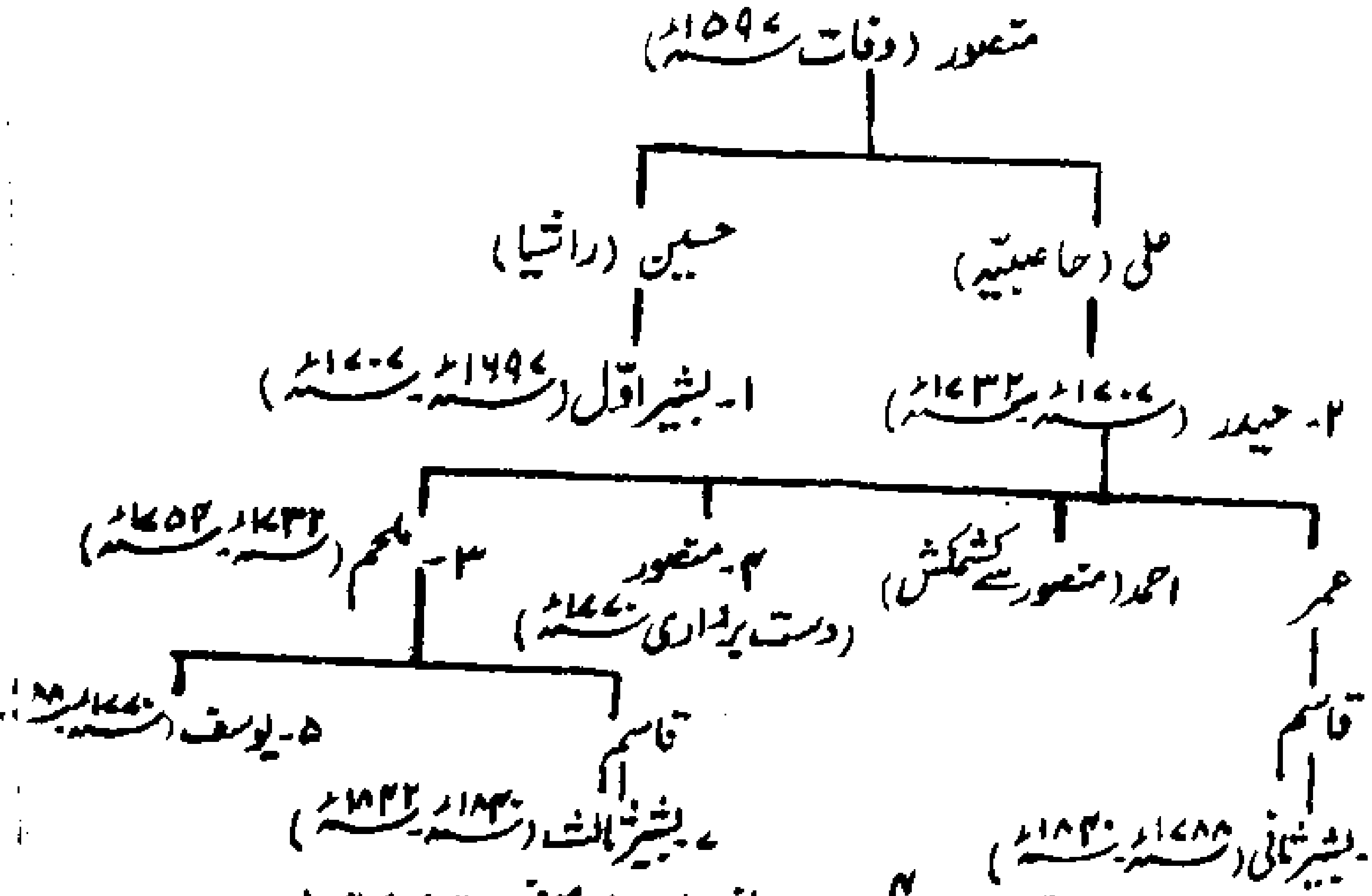


۵۲ چرچل جلد سوم صفحہ ۱۰۹۔ ۵۳ جلد اوّل صفحہ ۸۔ ۵۴ والنے جلد دوم صفحہ ۶۶، ۶۷۔

۵۵ والنے جلد دوم صفحہ ۶۷۔

Marfat.com

**ظاہر العمر** اب دو اور لیڈر منظرِ عام پر آ گئے اور انھیں بھی شہابی امیروں کے ساتھ درجۂ امتیاز حاصل ہو گیا۔ ایک صفد کا ظاہر العمر، دوسرا عکّہ کا احمد الجزّار۔ ان کے ظہور سے فلسطین تاریخی نمائش میں ممتاز جگہ حاصل کرنے کے لیے لبنان کے مقابلے پر آ گیا۔

ظاہر ایک بدوی شیخ کا بیٹا تھا۔ ۱۷۳۷ء میں سیاسی اکھاڑے کے اندر پہنچا اور رفتہ رفتہ اس نے طبریہ، بالائی جلیل، نابلس اور ناصرہ صفد کی جاگیر میں شامل کر لیے۔ ۱۷۵۰ء میں عکہ پر قبضہ ہوا تو وہ خطرناک حد تک لبنان کے قریب پہنچ گیا۔ عکّہ صلیبیوں کے زمانے سے ایک حد تک کھنڈر چلا آرہا تھا۔ غاصب ظاہر نے اس کے استحکامات درست کیے اور اسی کو جائے قیام قرار دے لیا۔ اس کی بندرگاہ کو فخر الدین ثانی نے پرانے مکانوں کا ملبہ ڈلوا کر بھروا دیا تھا۔[۱] ظاہر کے ماتحت پھر اس شہر کے لیے عظمت و خوشحالی کا مختصر سا دور شروع ہو گیا۔ ظاہر ڈکٹیٹر تو تھا، لیکن عوام کا بہی خواہ تھا۔ اس نے بے آئینی کو کچل کر رکھ دیا۔ کھیتی باڑی کی حوصلہ افزائی کی اور مسیحیوں سے رواداری کا برتاؤ شروع کیا۔ اس کے دربار میں زیادہ لوگ یونانی کیتھولک تھے۔[۲] اس کا ایک سوانح نگار فخریہ لکھتا ہے[۳] کہ ایک عورت بھی اس کے علاقے میں سے سونا اچھالتی ہوئی سفر کر سکتی تھی اور اسے قطعاً اندیشہ نہ تھا کہ کوئی شخص سونا چھین لے گا۔ جو عورت بدکاری کی مجرم قرار پاتی، اسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا اور بدکاری کے مجرم مرد کو بورے میں بند کر کے سمندر میں ڈال دیا جاتا۔ میریٹی لکھتا ہے کہ صور کے اردگرد پہاڑی علاقوں میں تمباکو کی کاشت خوب ہو رہی ہے۔ توت کے لیے شمار سے بے درخت لگائے گئے تھے، لیکن گھونگا مچھلی سے کوئی کام نہیں لیا جاتا، حالانکہ زمانہ سابق میں اسی سے ارغوانی رنگ بنتا تھا۔[۴] ظاہر عثمانی حکومت کے مالی واجبات بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا اور عثمانیوں کے لیے یہ امر مستحق توجہ نہ تھا کہ کارکردگی کا سلسلہ کسی ترک کے ہاتھ میں ہے یا عرب کے ہاتھ میں۔ خراج کی مقدار کس پانچ پر اسّی سالانہ تھی۔[۵] اس زمانے میں عثمانی سلطان روس کی ملکہ کیتھرائن ثانی سے جنگ میں بے طرح الجھا ہوا تھا۔ ترکی اقتدار کو بہت نقصان پہنچ چکا تھا۔ ۱۷۶۸ء میں سلطان نے ظاہر کی درخواست مانتے ہوئے اسے مستقل حاکم بنا دیا اور اسے اور اس کے جانشینوں کو شیخ عکّہ، امیر الامراء، والی ناصرہ و طبریہ و صفد اور امیر و والی جلیل کا منصب دے دیا۔[۶] مصر میں

---

[۱] حیدر عزّ صفحہ ۸۰ ببعد ÷ [۲] میریٹی جلد دوم صفحہ ۸۸ ÷ [۳] مخائیل الصبّاغ العکاوی تاریخ شیخ ظاہر العمر الزیدانی صفحہ ۵۰ ÷ [۴] میریٹی جلد دوم صفحہ ۱۰۳، ۲۱۱، ۲۱۲ ÷ [۵] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۲ ÷ [۶] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۰؛ چرچل جلد سوم صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰ ÷

Marfat.com

ایک مملوک علی بے اس کوشش میں تھا کہ عثمانیوں سے پیشتر کی حکومت کو از سر نو زندہ کرے۔ اس نے اپنے ایک غلام کارکن ابو الذہب[1] کو بھیجا کہ دمشق اور دوسرے شامی شہروں پر قبضہ کر لے (۱۷۷۱ء)۔ ظاہر کے لیے علی بے ایک نہایت موزوں حلیف تھا۔ ادھر روسی بیڑے نے ان لوگوں سے تعاون کرتے ہوئے صیدا پر گولہ باری کی تو ظاہر نے شیخ پر قبضہ کر لیا (۱۷۷۲ء)۔ اسی بیڑے نے بیروت پر بھی گولہ باری کی اور اسے لوٹا۔ یوسف الشہابی نے اس موقع پر والیِ دمشق سے تعاون کر کے نئے حریف کی مخالفت شروع کر دی۔ قسطنطنیہ سے کچھ جہاز فی الفور بھیجے گئے۔ بری اور بحری علاقوں میں جنگی اقدامات کر لیے گئے۔ ۱۷۷۵ء میں صیدا ظاہر سے چھین لیا گیا اور عکّہ میں اس کی ناکہ بندی کر لی گئی، جسے اس نے خوب مستحکم کر رکھا تھا۔ ترکی آتشباری عکّہ کی فصیل پر بے اثر رہی، لیکن ترکی سونا محصور فوج کے لیے موثر ثابت ہوا اور ظاہر کو قتل کر دیا گیا۔ اس کا سر کاٹ کر قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، تاکہ شاہی محل کے اردگرد کی دیوار میں اسے لگا دیا جائے۔ شام کی جو فوج ظاہر اور روسیوں کے خلاف بیروت و صیدا کی مدافعت کر رہی تھی، اس میں ایک شخص احمد الجزّار بھی شامل تھا۔ اس کی طالع آزمائیوں کے سامنے ظاہر کے کارنامے بھی ہیچ رہ جاتے ہیں۔

**احمد الجزّار** احمد الجزّار بوسنیا کے ایک مسیحی گھرانے میں پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے اپنی سالی کی آبرو ریزی کرنے کی کوشش کی اور بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچا۔ خود ہی ایک یہودی بردہ فروش کے ہاتھ بک گیا اور علی بے کی ملکیت بن کر قاہرہ پہنچا۔ اپنے آقا کے منصوبوں کی تعمیل میں اس نے وہ مستعدی اور بے رحمی دکھائی کہ اس کے لیے الجزّار (قصاب) کا لقب تجویز ہوا۔ اس لقب پر بعد میں وہ ہمیشہ فخر کرتا رہا اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے میں اپنی حد تک کبھی کوتاہی نہ کی۔ وہ قاہرہ سے دمشق گیا اور شامی فوج میں شامل ہو گیا۔ وہاں الظاہر کے خلاف فوجی خدمات کے صلے میں اسے صیدا کا حاکم بنا دیا گیا۔ وہ کچھ مدت تک بیروت پر قابض رہا اور یوسف کا اقتدار ماننے سے انکار کر دیا۔ اس وقت بیروت کی آبادی چھ ہزار کے قریب تھی۔[2]

---

[1] اس کی یہ کنیت اس لیے پڑی کہ وہ جب کبھی تحفے دیتا تھا تو سنہری دیناروں کی شکل میں دیتا تھا۔ جبرتی عجائب الآثار فی التراجم والاخبار جلد اول صفحہ ۴۱۷۔

[2] ل حیدر غرر صفحہ ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۲۷، والنے جلد دوم صفحہ ۱۷۰۔

لبنان کے بحری صوبے الگ کر لیے اور الجزّار نے ظاہر کی میراث لے لی۔ عکّہ کو اپنا مرکز بنایا اور بیگار سے کام لے کر اسے خوب مستحکم کر لیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا بیڑا بھی بنا لیا۔ ایک پیادہ لشکر بنایا، جس میں ایک ہزار مغربی شامل تھے۔ آٹھ سو سواروں کا رسالہ تھا۔ اس میں بوسنیا اور البانیہ کے باشندے شریک تھے۔ علاقے کی تجارت کا بڑا حصّہ خود سنبھال لیا تھا تاکہ فوجی مصارف ادا کر سکے اور عیش و راحت کی زندگی بسر کر سکے[1]۔ اس نے شہر میں ایک عالی شان مسجد بنائی تھی۔ اسی میں وہ دفن ہوا۔ یہ مسجد اب تک قائم ہے۔ اس کا اقتدار لبنان کے ساحلی علاقے اور فلسطین سے آگے پہنچا ہوا تھا۔ ۱۷۸۰ء میں سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے دمشق کی ولایت اس کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد یہ ظالم ربع صدی تک شام کے نائب السّلطنت اور لبنانی معاملات کا سرپنچ رہا۔ اس مدّت میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا، جو اس کی برتری پر اثر انداز ہوتا۔ ۱۸۰۴ء میں طبعی موت مرا۔ اُس زمانے کے وقائع میں یہ ایک یگانہ واقعہ ہے۔ اس غاصب ڈکٹیٹر کا نام لوک کہانیوں میں اب تک بیباکی، کجروی اور ظلم و جور کا مترادف چلا آتا ہے۔ ایک مقامی وقائع نگار[2] بیان کرتا ہے کہ اس کے حرم میں سینتیس عورتیں تھیں۔ کسی ایک کی عصمت کے متعلق شبہ پیدا ہوا۔ اُس نے آگ کی چتا تیار کی اور سینتیس کی سینتیس عورتوں کو خواجہ سراؤں کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے اس چتا میں ڈلوا دیا۔ لبنان میں اس نے ایک فریق کو دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا۔ جمبلاط کی سرپرستی اختیار کر لی۔ تبہ الیاس کی جنگ کے بعد (۱۷۸۵ء) جس میں یوسف نے شکست کھائی، الجزّار نے لوگوں سے درخواست کی کہ بشیر الشہّابی کو حاکم بنالیں۔ یوسف بوڑھا ہو چکا تھا اور حاکماً کمزور تھا۔ اس نے حوالگی کو مناسب جانا۔ ایک رومال گردن میں باندھا اور الجزّار کے رحم کا ملتجی ہُوا۔ الجزّار نے عکّہ کے قید خانے میں اسے پھانسی دلا دیا[3]۔

۱۷۹۹ء میں الجزّار اپنے اقتدار کی انتہا پر پہنچ گیا، جب اس نے نپولین بوناپارٹ کے فاتحانہ اقدامات روک دیے، جو ایک سال پہلے مصر سے شروع ہو چکے تھے۔ برطانوی بیڑا سر سڈنی سمتھ کی سرکردگی میں وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس کی امداد سے حاکم عکّہ نے ۲۱۔ مارچ سے

---

[1] منجد صفحہ ۸۵۔ [2] میخائیل مشاقہ مشہد الاعیان بحوادث السوریہ و اللبنان صفحہ ۴۔
[3] حیدر غرر صفحہ ۸۵۶ ببعد، مشاقہ صفحہ ۴۶، شدیاق صفحہ ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۷، چرچل جلد سوم صفحہ ۱۷۰ ببعد۔

۲۰ مئی تک شہر کی کامیاب مدافعت کی۔ فرانسیسی فوج طاعون اور ضروری سامان سے محرومی کے باعث پہلے ہی کم ہو چکی تھی۔ عکّہ سے بھی اسے ناکام لوٹنا پڑا اور یہ شہر محفوظ رہ گیا، جسے نپولین قسطنطنیہ اور ہندوستان کی کلید سمجھتا تھا۔ آگے چل کر ثابت ہوا کہ یہی شہر نپولین اور تسخیر عالم میں رکاوٹ بنا[1]۔

---

[1] ایڈورڈ لاک رائے کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۷، مونٹگمری گیز ملٹری کیریر آف نپولین دی گریٹ صفحہ ۱۲۸

# ستائیسواں باب

## داخلی اور خارجی تعلّقات

**تمہید** زمانۂ قدیم میں اہلِ لبنان صرف ان یورپیوں سے شناسا تھے، جو زائروں کی حیثیت میں آتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں انھیں صلیبیوں سے روشناسی کا موقع حاصل ہوا۔ دورِ حاضر میں وہ پہلے مشنریوں اور تاجروں سے آگاہ ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے سیاح پہنچنے لگے۔ ہمارے نقطۂ نگاہ سے سیاحوں کو اس بنا پر خاص اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے سیاحت نامے مرتب کیے، جو معلومات کے بیش بہا ذخیرے تھے۔ معنیوں اور شہابیوں کے عہدِ اقتدار میں کیوچی اور یسوعی لبنان میں جم کر بیٹھ گئے۔ ان دونوں گروہوں کے ساتھ جو لوگ آئے — مشنری اور تاجر — وہ عموماً فرانسیسیوں پر مشتمل تھے۔ اس طرح دانستہ یا نادانستہ اس خارجہ پالیسی نے لباسِ عمل پہننا شروع کیا، جو لوئی چہاردہم (۱۶۴۳ء – ۱۷۱۵ء) نے جاری کی تھی اور اس کے جانشین اس پالیسی پر کاربند رہے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ فرانسیسی تجارت کو ترقّی دی جائے اور کیتھولکوں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ فرانسیسیوں اور لبنانیوں کے ثقافتی و اقتصادی تعلّقات صلیبی جنگوں کے اثرات کے ماتحت مختل ہو گئے تھے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ ٹوٹے ہوئے رشتے بڑی تیزی سے جوڑ لیے گئے۔

**خارجی تجارت** فرانسیسی تجارت کو شروع ہی میں آگے بڑھنے اور نفع خیز صورت اختیار کر لینے کا موقع مل گیا۔ یہ سب کچھ ۱۵۳۵ء کے معاہدۂ امتیازات کی بنا پر ہوا جس کی تجدید ۱۵۶۹ء میں ہوئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے تجارتی قدم آگے بڑھایا، ان کا دائرہ محدود رہا۔ ایک خاص وقت تک فرانس اور وینس کے جہاز فرانسیسی پرچم کی حفاظت میں آتے جاتے رہے۔ ۱۶۹۰ء میں لوئی چہاردہم نے اپنے سفیر متعینۂ قسطنطنیہ اور اپنے شامی و لبنانی قنصلوں کو

ہدایت کی کہ وہ اپنا اثر و رسوخ مارونی قوم کے حق میں استعمال کریں، جن کی تعداد ستر ہزار تھی۔ اسی طرح سرزمین مشرق کے دوسرے کیتھولکوں کی خدمت انجام دیں اور یہ ہدایت نامہ مارونیوں کے مذہبی رئیس تک پہنچا دیا گیا[1]۔ یہ اس بیان کی توثیق تھی، جو پہلے شائع کیا گیا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ جو لبنانی طلبہ مسیحیوں کی سرزمین میں آنا چاہیں، ان کی مالی حیثیت کے مطابق بحری کرایے میں تخفیف کر دی جائے گی۔ چالیس سال بعد (۱۷۳۷ء) لوئی پانزدہم نے مارونیوں کی حفاظت کے لیے یہ بیان از سر نو جاری کیا اور قنصلوں کو تاکید کی کہ مارونی بطریق اعظم اور قوم کے تمام افراد کو اپنے اثر و رسوخ اور نگرانی سے مشرف رکھیں[2]۔

۱۶۱۶ء میں صیدا کے اندر پہلی مرتبہ فرانسیسی قنصل خانہ قائم ہوا اور اس کا دائرۂ اختیار بیروت، صور، عکہ، حیفا اور یافا پر مشتمل تھا۔ فخر الدین نے قنصل خانے نیز فرانسیسی تاجروں اور مشنریوں کو وہ سرائے (خان) رہنے کے لیے دے دی، جو اس نے تعمیر کرائی تھی[3]۔ صیدا لبنان کے لیے مال کا گودام اور دمشق کے لیے بندرگاہ تھا۔ وہاں ۱۶۸۵ء سے ۱۷۰۹ء تک ایک سو چھتر فرانسیسی یکے بعد دیگرے پہنچے۔ مارسائی سے تقریباً بیس جہاز سالانہ یہاں آتے تھے[4]۔ یوں صیدا حلب سے بھی سبقت لے جانے کے قریب پہنچ گیا، جسے شام کی تمام منڈیوں میں مستحکم حیثیت حاصل تھی۔ بیروت ۱۶۶۰ء میں صیدا سے دُگنا تھا، لیکن وہاں صرف چار پانچ فرانسیسی تاجر تھے[5]۔ ۱۵۹۶ء میں پوپ کا ایک اطالوی سفیر طرابلس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بندرگاہ کی حفاظت کے لیے ساحل کے ساتھ ساتھ پانچ بُرج بنے ہوئے ہیں اور وہاں صرف چند اطالوی تاجر مقیم تھے۔ آس پاس اس علاقے میں دیوداروں کی کثرت تھی۔ اسی طرح گندم، عمدہ شرابوں، رُوئی، ریشم، شہد، موم اور انگوروں کی بھی کمی نہ تھی اور انگور آلوچے کے برابر تھے[6]۔ ایک صدی بعد ماندرل[7] طرابلس پہنچا۔ اس زمانے میں ایک چٹان کے زیر آب آجانے کے باعث بندرگاہ کی کیفیت بدل چکی تھی اور وہاں صرف ایک برطانوی تاجر اور ایک برطانوی قنصل تھا۔ سترھویں صدی کے اواخر میں یہ شہر پھر لبنان کی ایک بارونق بندرگاہ بن رہا تھا۔ حلب کا نائب قنصل بھی یہیں مقیم تھا۔ یہاں سے مال حمص، حما اور شمالی لبنان آتا جاتا تھا۔ بحری قزاقی کو رومیوں سے پیشتر ہی کے زمانے سے ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ سترھویں صدی میں اس پیشے نے

---

[1] دیکھیے دلاراک جلد دوم صفحہ ۲۴۲، ۲۴۷، دلتستا جلد چہارم صفحہ ۱۴۱؛ [2] رسل ہیوپر صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸، دلتستا جلد سوم صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱، عربی ترجمہ صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱؛ [3] دلتستا جلد سوم صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲، رسل ہیوپر صفحہ ۲۵۵؛ [4] ایضاً صفحہ ۹۶، ۱۲۹؛ [5] دا آریو جلد دوم صفحہ ۳۳۸، ۳۴۴؛ [6] ڈینڈینی صفحہ ۲۵، ۴۲، ۴۳؛ [7] صفحہ ۲۵؛

فرنگیوں کے ہاں غیر معمولی وسعت اختیار کرلی۔ خاصی حیثیت والے تاجروں نے اسے ترقی دی۔ ان کے نزدیک سمندر میں لوٹ مار کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو بدوؤں کے نزدیک صحرائی علاقے میں چھاپوں کو حاصل تھی۔ اس زمانے میں لبنان کی بحری تجارت کو زیادہ تر نقصان مالٹا کے بحری قزاقوں نے پہنچایا۔

تجارت میں جن مصنوعات اور زراعی پیداوار کو اونچا درجہ حاصل تھا، ان میں سے قابلِ ذکر ریشم، زیتون کا تیل، صابون، کشمش نیز اونی اور سوتی پارچے ہیں۔ ہمسایہ خطوں کی دوسری جنسوں میں سے چاول اور قہوہ صیدا سے باہر بھیجے جاتے تھے۔ لبنانی ریشم بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ طرابلس میں سفید ریشم کے کپڑے بناتے تھے۔ ان کی بڑی مانگ تھی۔ کیونکہ ان پر حسب منشا سنہری اور روپہلی کشیدہ کاری ہو سکتی تھی۔ شوف کا ریشمی کپڑا قدرے موٹا ہوتا تھا، اسے مخمل کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ بیروت کے تافتے اور مشجر کی بڑی مانگ تھی۔ فرانسیسی تاجر ہر سال یہ لبنانی جنس چار لاکھ اکو (پانچ فرانک) کی خریدتے تھے۔ صیدا کی پوری تجارت دس لاکھ اور بیس لاکھ فرانک سالانہ کے درمیان[۵۱] تھی۔ فرانس سے اونی اور سوتی کپڑے، انگلستان سے کاغذ، لوہا، تانبا آتے تھے۔ اوزار اور سکے دونوں ملکوں سے درآمد کیے جاتے تھے۔ فرانس و انگلستان کے سنہری پونڈ ترکی کے بازاروں میں پہنچنے لگے اور پہلی جنگِ عظیم تک یہ رائج رہے۔ یہاں جو سنہری سکے مسلّم مانے جاتے تھے، وہ لیرا[۵۲] اور پونڈ تھے۔ چاندی کا سکہ[۵۳] ریال پندرھویں اور سولھویں صدی میں رائج رہا۔ چاندی کے چھوٹے سکے بھی تھے۔ مثلاً گُرش یا قرش، جس کا ترجمہ یورپی زبان میں پیاسٹر کیا گیا۔ یہ لفظ جرمنی کے گروشن سے لیا گیا تھا (لاطینی گروسس یعنی موٹا)۔ یہ سکہ جرمنی اور اس کے مشرق میں رائج تھا۔ یہ لفظ پہلے پہل چودھویں صدی کے آخری حصے کی ایک دستاویز میں مذکور ہوا۔ ترکی کی ٹکسالوں میں اس کی مقبولیت تین صدی بعد کا واقعہ ہے۔ گرش چالیس پارے[۵۵] کا ہوتا تھا۔ تیس پارے کا ایک سکہ زولو (زلط[۵۶]) کہلاتا تھا۔ یہ دراصل ولندیزی[۵۷] فلورن کا ایک نام تھا، جو سترھویں صدی میں ترکی پہنچا۔

---

[۵۱] دارویو جلد دوم صفحہ ۳۴۵، رسل ہیوبر صفحہ ۹۶۔ [۵۲] لیرا اطالوی لفظ ہے، جو لاطینی لیرا سے نکلا۔
[۵۳] یہ فرانسیسی لفظ (Royal) سے بنا، جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں رائج تھا۔ [۵۴] دیکھیے مقالۂ گروش انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ [۵۵] پارہ فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑا۔ [۵۶] یہ اطالوی اسولوتی (Isolotti) اور فرانسیسی اسولوت (Isolotte) سے ہے۔ غالباً یہ ایسل (Ijssel) سے ماخوذ ہے، جو ہالینڈ کا ایک دریا ہے۔ اسی پر سب سے پہلے ٹکسالیں بنی تھیں۔
[۵۷] فلورن بھی ایک سکہ تھا، جو ولیم سوم شاہ انگلستان کے عہد میں رائج ہوا۔ پہلے اس کی قیمت چھ شلنگ آٹھ پنس تھی، اب دو شلنگ ہے۔

Marfat.com

## ایک لبنانی خاندان

۱۶۵۵ء میں نادر الخازن، جس کی کنیت بڑے بیٹے کے نام پر ابو نوفل تھی، بیروت میں نائب فرانسیسی قنصل مقرر ہوا۔ اس وقت تک بیروت صیدا کے تابع تھا۔ اس وقت ابو نادر کا بیٹا ابو نوفل امیر ملحم المعنی کی جانب سے کسروان کا جاگیردار اور اس کے بیٹے احمد کا سرپرست تھا[1]۔ کسروان کے امیر اعلیٰ کی حیثیت میں اس نے فرانسیسی مشنوں کی حفاظت کی اور انھیں کی سفارش پر قنصل خانے میں عہدہ قبول کیا تھا۔ بلاشبہ ملحم نے اس کی تائید کی ہوگی۔ دو سال بعد لوئی چہاردہم نے اپنے اس لبنانی قنصل کو نہ صرف فرانسیسی شہریت کے حقوق دے دیے بلکہ اسے ایک فرانسیسی امیر کے حقوق سے بھی مشرف کر دیا۔ ۱۶۶۲ء میں اس شخص کو قنصل بنا دیا گیا۔ بیروت میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی ملازمت تھی۔ تیرہ سال بعد اس کے منصب میں وہیں کے نائب قنصل کا اضافہ ہو گیا۔ سرکاری دستاویزوں میں اسے لمبے خطابات سے مخاطب کیا جاتا تھا[2]۔ ابو نوفل کے بعد اس کا بیٹا ابو کا نصوہ (فیاض) قنصل بنا (۱۶۷۹ء) یوں اس عہدے کو خاندان میں موروثی حیثیت حاصل ہو گئی[3]۔ ابو کا نصوہ کی وفات سے چھ سال بعد (۱۶۹۱ء) اس کا بیٹا حصن قنصل مقرر ہوا۔ ۱۷۰۶ء میں اس کا انتقال ہوا تو یہ منصب اس کے بیس سالہ بیٹے نوفل کو ملا اور وہ ۱۷۱۷ء تک اس پر فائز رہا۔ آخری دور میں وہ صرف اعزازی طور پر یہ خدمت انجام دیتا رہا کیونکہ باب عالی نے اپنی رعایا کے کسی فرد کو کسی خارجی حکومت کا نمائندہ یا کارندہ بننے کی ممانعت کر دی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں خازن خاندان کے دو بھائیوں کو جمال پاشا نے اس بنا پر پھانسی دے دی تھی کہ انھوں نے عثمانی حکومت کے خلاف اجنبی لوگوں کی سازش میں شرکت کی تھی۔ ان میں سے ایک کا نام فیلیب تھا، جو فرانسیسی قنصل خانے میں ترجمان خصوصی تھا اور دوسرا فرید، جو اخبار نویس تھا۔

۱۷۸۶ء میں لوئی شانزدہم نے سعد الخوری کے بیٹے غندور کو بیروت میں قنصل مقرر کیا۔ غندور امیر یوسف شہاب کا سکریٹری تھا۔ خازنوں کی سرپرستی میں کپوچیوں نے ۱۶۲۶ء میں بیروت کے

---

[1] شدیاق صفحہ ۸۶، ۸۷۔

[2] Nader Kasen Prince des Maronites Chealier Romain Conte Palatin Conseiller de Roy Consul pour Sa Uajeste, Tres Chretienne en La Ville de Barut et ses dependances.

اس کے لیے دیکھیے دارولو جلد دوم صفحہ ۳۶۶۔ مزید دیکھیے دوہی صفحہ ۲۲ ببعد، صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴؛ رسل ہیور صفحہ ۱۳۲ ببعد، جالیس۔ و صفحہ ۹۲۔

[3] دوہی صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶۔

Marfat.com

اندر قدم جما لیے اور یسوعی ۱۶۵۲ء[51] سے وہاں چلے آتے تھے۔ انھوں نے بھی اپنا کام خوب پھیلا لیا۔ طرابلس میں فرانسسکی اور لبشری کارلی پہنچے۔ ان کیتھولک مشنریوں نے جو کام کیا، وہ بہ اعتبار نتائج ایک فسانہ بن گیا، جس نے روایتی قدامت پسندانہ افکار کا خول پھاڑ کر رکھ دیا۔

۱۶۵۶ء میں ایک یسوعی پادری کی کشتی جونیہ کے قریب تباہ ہو گئی۔ اسے بحری قزاق سمجھ کر ابو نوفل الخازن کے پاس پیش کیا گیا۔ ابو نوفل نے کسروان کے امیر اعلیٰ کی حیثیت میں اس یسوعی کو عین طورہ میں زمین کا ایک وسیع ٹکڑا دے دیا، جہاں ایک گھر اور ایک گرجا تعمیر کیا گیا۔[52] ۱۷۳۴ء میں ایک مارونی پادری نے، جو رومہ میں تعلیم پا چکا تھا، ایک ہائی سکول یسوعیوں کے حوالے کر دیا، جس کی بنیاد پہلے عین طورہ میں رکھی جا چکی تھی اور وہ خود بھی اسی گروہ میں شامل ہو گیا۔ اس کا نام پطروس مبارک تھا اور وہ غوسطا کا رہنے والا تھا۔ پھر یہ نظام ختم کر دیا گیا۔ اس سے دس سال بعد (۱۷۷۳ء) یہ درسگاہ خیراتی کام کرنے والوں کی نگرانی میں دے دی گئی۔ ابتدائی دور کے یسوعی مشنری مارونی پادریوں ہی کا لباس پہنتے تھے، لہٰذا انھیں ادھر ادھر آزادانہ پھرنے میں سہولت رہتی تھی اور دین کا کام بے تکلف انجام دیتے تھے۔ ۱۷۸۹ء میں عین ورقہ کی خانقاہ کے اندر ایک اور اعلیٰ درسگاہ نے نشو و نما پائی۔ اس کی بنیاد بھی رومہ ہی کے ایک فارغ التحصیل نے رکھی تھی۔ ان دو درسگاہوں کو دورِ حاضر کی یورپی وضع کے پہلے ادارے سمجھنا چاہیے۔ پھر انھیں کا نمونہ پیش نظر رکھتے ہوئے غزیر، زغرتا اور دوسرے مقامات پر درسگاہیں قائم ہوئیں۔ انیسویں صدی میں مارونی پادریوں اور عام آدمیوں میں جو اعلیٰ درجے کے فضلا ہوئے، ان میں سے بعض انھیں درسگاہوں کے تربیت یافتہ تھے۔

## مارونی طلبہ رومہ میں

مشرق قریب کی تمام آبادیوں میں سے مارونیوں نے دورِ حاضر میں سب سے پہلے مغرب کے ساتھ گہرے روابط قائم کیے۔ یہ روابط تجارتی یا سفارتی نہ تھے بلکہ ثقافتی تھے اور ان میں پائداری و استواری تھی۔ رومہ ان ثقافتی تعلقات کا مرکزی نقطہ تھا۔

لبنان میں مشنریوں کی درسگاہیں قائم ہو گئیں تو ہونہار طلبہ کو مزید تعلیم کے لیے رومہ کے مشرقی کالج میں بھیجنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۵۷۸ء میں پوپ کی طرف سے دو یسوعی سفیر طرابلس پہنچے اور دو مارونی لڑکوں کو اپنے ساتھ لے گئے، جن میں سے ایک قبرص کا باشندہ تھا۔ وہاں پہنچ کر

---

[51] رتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰ ببعد۔ [52] اسل ہویہ صفحہ ۸۴۔

سفارش کی کہ ایسے طلبہ کے لیے روم میں خاص مرکز قائم کیا جائے اور لبنان میں عربی و سریانی کا چھاپہ خانہ کھولا جائے۔ ان یسوعی سفیروں کی رپورٹ سے اصل تحریک میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ ۱۵۸۴ء میں گریگوری سیزدہم نے ایک مارونی کالج کے قیام کو برکت دی۔ یہ دراصل مبادلۂ افکار کا ایک مرکز تھا، جو بیس طلبہ پر مشتمل تھا۔[1] اسے تاریخی اہمیت کا واقعہ سمجھنا چاہیے۔ اسی درسگاہ سے بعض نہایت بالغ نظر اور فاضل مارونی پادری درجۂ فضیلت حاصل کرکے نکلے، جنھوں نے وطن واپس پہنچ کر اثر و اقتدار والے عہدے حاصل کیے۔ انجام کار انھیں کے ذریعے سے مارونی کلیسا اور روم کے درمیان اتحاد پیدا ہوا، جو طلبہ اٹلی میں رہے یا وہاں سے پیرس چلے گئے، انھوں نے مشرقی علوم کی تعلیم میں مدد دی۔ مشرقی کلیساؤں اور ثقافت کے متعلق صحیح حالات بہم پہنچائے۔ فرانس و لبنان کے درمیان خوشگوار تعلقات نہ صرف محفوظ رکھے بلکہ انھیں تقویت دی۔

روم سے واپس آئے ہوئے طلبہ میں سے جس شخص نے سب سے نمایاں حیثیت حاصل کی وہ اسطیفان الدویہی تھا[2] (۱۶۳۰ء۔ ۱۷۰۴ء) جو اپنی قوم میں بلند ترین عہدے پر پہنچ گیا اور متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ ان میں سے ایک وہ بھی ہے، جس کے حوالے زیر نظر کتاب میں بار بار آئے ہیں۔[3] اسطیفان اہدن میں پیدا ہوا، گیارہ سال کی عمر میں روم چلا گیا۔ چودہ سال وہاں رہا۔ ۱۶۷۰ء میں اسے بطریق اعظم بنایا گیا۔ اس پر ابو نوفل الخازن ناراض ہو گیا کیونکہ اس سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا، لیکن جب اسطیفان نے خود ملاقات کی تو امیر اعلیٰ اور قنصل اس انتخاب پر مطمئن ہو گیا۔ اسطیفان کی بطریقی میں کئی ناخوشگوار واقعات کے سایے ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

میں نے مصیبتوں اور اذیتوں کو صبر سے برداشت کر لیا۔ ان کی کیفیت حد بیان سے باہر ہے۔[4]

طرابلس کے پاشا کا جو جاگیردار بنی حمادہ کے خاندان سے تھا، اس نے اسطیفان سے اتنا خراج لینے کی کوشش کی، جسے وہ ادا نہیں کر سکتا تھا اور اسے بعض اوقات بھاگ کر غاروں میں پناہ لینی پڑی، حالانکہ دریائے نادیشہ کے کنارے اس کے صدر مقام قنوبین کی حیثیت ایسی تھی کہ اس عہد کے فرنگی سیاح وہاں آئے تو حیران رہ گئے کہ بال و پر کے بغیر یہاں پہنچنا کیونکر ممکن ہے؟[5] حلب میں انگریزی کارخانے کے پادری نے یہ خانقاہ دیکھی تو لکھا کہ یہاں راہبوں کو دعا و نماز کے

---

[1] ربّہ جلد اوّل صفحہ ۲۰۴-۲۰۷، جوزف نصراللہ کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۱۶، ۱۷۔ [2] یہ نام لاطینی میں Aldoensis بن گیا۔ [3] تاریخ الطائفۃ المارونیہ، ماخوذ از تاریخ الازمنۃ المشرق جلد ۴۴، نیز میخائیل الرّجی المشرق جلد ۴۸ صفحہ ۷۷ بعد۔ [4] دلیس جلد ہفتم صفحہ ۳۰۹۔ [5] دارد لو جلد دوم صفحہ ۱۳۰۔

Marfat.com

غرض سے بلانے کے لیے دو چھوٹے چھوٹے گھنٹے استعمال کیے جاتے ہیں اور بلاوے کا یہ ذریعہ ملک بھر میں کہیں رائج نہیں[1] اگر یہ مقام "ترکوں" کے دائرۂ سماعت میں ہوتا تو ان کا استعمال بھی گوارا نہ ہوتا۔ ماندرل[2] نے طرابلس کے قلعے میں ایک بوڑھے مارونی کو دیکھا تھا، جس نے بظاہر مجبوری کی حالت میں اسلام قبول کر لیا۔ آگے چل کر اسے ترک کر دیا تو اس کی کھال کھینچ لی گئی۔

الدویہی بطریق جرجوس امیر عامیرہ (وفات ۱۶۴۴ء) کی سفارش پر تعلیم کی غرض سے رومہ گیا تھا۔ عامیرہ ان طلبہ میں سے تھا، جنھوں نے پہلے پہل رومہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ بھی احدن ہی کا باشندہ تھا اور اس نے کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی ماں دویہی خاندان سے تھی۔ اسی نے گریگوری سیزدہم کی اصلاح کردہ تقویم مارونیوں میں نافذ کی تھی، اس طرح مارونی کلیسا کی مذہبی تقریبات لاطینی کلیسا کی مذہبی تقریبات کے مطابق ہو گئی تھیں۔ لبنان سے یہ تقویم دمشق و حلب کے مارونیوں میں رائج ہو گئی، البتہ مقامی حکام اس سلسلے میں خاصی مزاحمت کرتے رہے۔ ۱۵۹۶ء میں عامیرہ نے سریانی گرامر (بہ زبانِ لاطینی) شائع کی۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب تھی۔ چالیس سال بعد رومہ کی مارونی درسگاہ کے ایک اور فارغ التحصیل اسحٰق الشدراوی[3] نے سریانی زبان (لاطینی میں) کے متعلق ایک کتاب شائع کی۔ یہ شخص شدرا (عکار) میں ۱۵۹۰ء کے قریب پیدا ہوا۔ بارہ سال کی عمر میں رومہ گیا۔ پانچ سال بعد وطن واپس آیا۔ اس نے میلان (اٹلی) میں خاصی مدت گزاری، جہاں کی لائبریری کے عظیم القدر ذخیرۂ کتب کو ترتیب دیتا رہا۔ ۱۶۱۶ء میں جب وہ اسقف طرابلس تھا، اٹلی اور فرانس کا سفر اسی غرض سے اختیار کیا کہ ابونوفل کی امداد کرے۔ فرانسیسی قنصل نے ابونوفل کے خلاف شکایات کی تھیں۔ اسحٰق شدراوی کی کوشش یہ تھی کہ ابونوفل بیروت کا مستقل قنصل بن جائے[4]۔ اٹلی میں وہ ریونّا پہنچا تو کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تاکہ وہاں کی ایک مارونی درسگاہ کو دیکھ لے، جو العافورہ کے ایک شخص نے، جو رومہ میں طالب علم رہ چکا تھا، قائم کی تھی اور اس کے لیے وقف کا انتظام کر دیا تھا۔ شمالی اٹلی کی اس بندرگاہ میں لبنانیوں کی خاصی آبادی ہو گی۔

جو لوگ یورپ میں تعلیم، تصنیف، تحقیق اور ترتیب کتب کی غرض سے ٹھہر گئے، ان میں

---

[1] ماندرل صفحہ ۱۴۳۔ [2] صفحہ ۱۴۱۔ دویہی صفحہ ۱۵۱۔ لامارال جلد دوم صفحہ ۲۲۱، ۲۳۳، دلیس جلد ہفتم صفحہ ۲۸۷ - ۲۹۱۔ [3] لاطینی نام Scialrensis۔ [4] اس سفر کے سلسلے میں دیکھیے المشرق جلد دوم صفحہ ۹۳۹ - ۹۴۵۔

Marfat.com

ممتاز اصحاب یہ تھے : الصّہیونی، الحاقلی اور السّمعانی۔ دو یعنی، صہیونی اور سمعانی خاندان آج تک شمالی لبنان میں خوشحال ہیں۔ جبرئیل الصّہیونی[1] (۱۵۷۷ء۔ ۱۶۴۸ء) نے رومہ کے سپئنزا[2] کالج میں سریانی اور عربی کے پروفیسر کی حیثیت میں علمی زندگی شروع کی۔ وہاں سے لوئی سیزدہم کے بلاوے پر وہ پیرس چلا گیا، جہاں شاہی کالج[3] میں اسے سامی زبانوں کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی بادشاہ نے اسے اپنا ترجمان بنا لیا۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پیرس میں متعدد الالسنہ بائیبل مرتّب کی۔ یہ پہلا نسخہ تھا، جس میں عربی اور سریانی تراجم شامل ہوئے۔ لبنان میں جو متعدد الالسنہ بائیبل مرتّب ہوئی، اس میں بھی پیرس کی بائیبل سے استفادہ کیا گیا۔ پھر اس نے عربی کی ایک گرامر لکھی۔ یہ بھی اپنی نوعیت کی پہلی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ایک اور ہم وطن اور دوست حنّا الحصرونی[4] نے بھی رومہ ہی میں تعلیم پائی تھی۔ صہیونی نے اس کے اشتراک سے ادریسی کے جغرافیے کا خلاصہ لاطینی میں مرتّب کیا (پیرس ۱۶۱۹ء) البتہ اس کا نام صحیح نہ تھا۔ متعدد الالسنہ بائیبل کی ترتیب میں اس کا شریک کار اور جانشین ابراہیم الحاقلی[5] تھا۔ وہ فارغ التّحصیل ہونے کے بعد سپئنزا کی درسگاہ میں عربی و سریانی کا پروفیسر بن گیا۔ ۱۶۴۶ء میں اسے الصّہیونی کی جگہ شاہی کالج میں مقرّر کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو ہم دو زبانیں جاننے والے کہہ سکتے ہیں۔ ڈلاراک[6] ۱۶۸۸ء میں لبنان آیا تھا۔ اسے بشرّی اور بنی حماوہ کے علاقے میں بہت سے لوگ ملے، جو سریانی بولتے تھے۔ ایک اور فرانسیسی دکاس تیول ۱۶۳۲ء میں بیروت آیا تھا، وہ لکھتا ہے کہ حصرون و احدن کے لوگ سریانی بولتے تھے۔ وہ وادی قادیشہ کے ایک مارونی راہب خانے میں مقیم ہو گیا اور چودہ سال بعد وہیں فوت ہوا[7]۔ ۱۸۱۰ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک سیّاح برک ہارٹ نے حلب میں عربی کی تعلیم پائی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ بہت سے مارونی اب تک سریانی بولتے ہیں۔ قزحیا میں ریشمی کارخانوں کے مالکوں کے نام سریانی حروف میں ان بوریوں پر مختلف ہاتھوں سے لکھے ہوئے تھے، جو گرجے میں آویزاں تھیں[8]۔ الحاقلی نے قیام رومہ کے دوران میں پوپ اور

---

[1] لاطینی نام Sionita ÷ [2] Sapienza ÷ [3] اب اسے کالج دا فرانس کہتے ہیں ÷
[4] لاطینی نام Nesronita ہے، یہ حصرون سے ماخوذ ہے جو شمالی لبنان کا ایک گاؤں ہے ÷
[5] حاقل جبیل کے نزدیک ہے۔ اس کا لاطینی نام Ecchelensis ہے ÷ [6] جلد اول صفحہ ۱۷۵ ÷
[7] ایضاً جلد دوم صفحہ ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۵۸ ÷ [8] برک ہارٹ صفحہ ۲۲۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے فلیپ حتّی کی کتاب اللّغات السامیّۃ المحکیہ فی سوریا و اللّبنان صفحہ ۳۰، ۳۵ ÷

Marfat.com

فخر الدین کے درمیان ایک معاہدے کے لیے کوشش کی۔ مذہبی تصانیف کے علاوہ الحاقلی نے رومہ میں ایک سریانی گرامر شائع کی (۱۶۲۸ء)۔ تیرہ سال بعد رومہ میں اخلاق پر ایک رسالہ مرتّب کیا۔ جس میں مختلف ماخذ سے استفادہ کیا گیا تھا۔ ۱۶۵۱ء میں اس نے ایک قبطی راہب ابن الراہب المصری کے وقائع کا لاطینی میں ترجمہ کیا، جو پیرس میں شائع ہوا۔ اس نے معلمی پر زرموجی کے رسالے کا ترجمہ بھی کیا تھا، جو بعد میں شائع ہوا (یوٹریکٹ ۱۷۰۹ء)۔ الحاقلی کا نام القہیونی اور دوسرے پروفیسروں کے ناموں کے ساتھ اس کالج کے دروازے پر کندہ کیا گیا تھا، جہاں وہ تعلیم دیتا تھا۔

رومہ میں الحاقلی کی جگہ اس کا بھانجا مرہج ابن نمرون[1] (۱۶۳۰ء – ۱۷۱۱ء) مقرر ہوا اور وہی جماعت نشر و تبلیغ کا ترجمان تھا۔ مرہج وان میں پیدا ہوا جو قنوبین سے آگے ہے۔ اس کا ماموں الحاقلی اسے رومہ لے گیا، جہاں تعلیم مکمل ہوئی۔ اس نے عہد نامہ جدید کا ایک ایڈیشن سریانی اور عربی میں مرتّب کیا اور مارونیوں کی ایک تاریخ لکھی (رومہ ۱۶۷۹ء)۔ وان میں اس وقت تک سریانی بولتے تھے[2]۔

**السّمعانی**

رومہ کی مارونی درسگاہ کا ممتاز ترین طالب علم غالباً یوسف سمعان السّمعانی تھا[3] (۱۶۸۷ء – ۱۷۶۸ء)۔ یہ خاندان اصلاً حصرون کا تھا اور اس کے متعدد افراد نے رومہ میں تعلیم پائی۔ یوسف طرابلس میں پیدا ہوا اور آٹھ سال کی عمر میں رومہ چلا گیا۔ وہیں محنت و مشقت کرتا رہا اور وہیں وفات پائی۔ وہ ویٹیکال لائبریری (پوپوں کی لائبریری) کا ناظم اعلیٰ تھا۔ اسی کی بدولت یہ لائبریری دنیا کے بہترین اور عظیم ترین ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئی۔ مخطوطات کی تلاش میں سمعانی نے مشرق کے دو سفر کیے۔ ایک جہاز، جو مشرقی کتابوں کا ایک ذخیرہ اٹلی لے جارہا تھا، طوفان کے باعث راستے میں ڈوب گیا۔ خود سمعانی نے سریانی، عبرانی، عربی، فارسی، ترکی اور حبشی نسخوں کے متعلق چھان بین کی، جس کے نتائج ببلیوتھیکا اورینٹلس میں محفوظ ہیں[4]۔ نیز مشرق کے کلیساؤں اور تاریخ کے متعلق معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا۔ نیپلز اور سسلی کے بادشاہ نے اسے مورخ مقرر کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے سلطنت کے متعلق چار جلدوں میں ایک کتاب مرتّب کی۔ جس کی شہریت اعزازی اسے دے دی گئی تھی۔ ۱۷۳۶ء میں پوپ نے السّمعانی کو اپنا نمائندہ بنا کر اللّوازہ کی مذہبی مجلس میں لبنان بھیجا۔ اس مجلس میں اسقفِ طرابلس کا نمائندہ میخائیل الغزیری[5] تھا (۱۷۱۰ء – ۱۷۹۱ء)، جو طرابلس میں

---

ف۱ سریانی نام Faustus Naironius ہے۔ ف۲ دلا راک جلد دوم صفحہ ۲۰۹۔ ف۳ لاطینی نام Assemani ہے۔ ف۴ Bibliotheca Orientalis۔ یہ چار جلدوں میں مرتّب ہوئی۔ رومہ (۱۷۱۹ء – ۱۷۲۸ء)۔

ف۵ غزیر: جونیہ کے نزدیک ایک گاؤں ہے۔ اس کا لاطینی نام Casiri ہے۔

پیدا ہوا۔ روما میں تعلیم پا کر درجۂ فضیلت حاصل کیا۔ پھر ہسپانیہ کی اسکوریال لائبریری میں ہیڈ لائبریرین بن گیا۔ وہاں اس نے ایک ہزار آٹھ سو عربی مخطوطات کی مفصّل فہرست دو جلدوں میں مرتّب کی۔ (میڈرڈ ۱۷۶۰ء۔ ۱۷۷۰ء)[۵۱]

## اللوازہ کی مذہبی مجلس

لوازہ کی خوبصورت خانقاہ دریائے کلب کے دہانے پر اونچی جگہ واقع ہے یہاں وہ مذہبی مجلس منعقد ہوئی تھی۔ جس میں مارونی کلیسا اور روما کے درمیان اتحاد کی قطعی توثیق ہوئی۔ اس طرح وہ انتظام آخری منزل پر پہنچا، جس کے لیے چھ صدی قبل کوششیں شروع تھیں۔ یہ صرف مذہبی مجلس نہ تھی بلکہ قومی مجلس شوریٰ تھی، جس میں قبیلۂ خازن کے رئیس مذہبی سرگرمیوں سے غیر متعلق اور دوسرے مشرقی گروہوں کے نمائندے شریک تھے۔ اس میں تیرہ اسقفوں نے حصّہ لیا۔ بحث کی بنیاد پوپ کی وہ لاطینی دستاویز تھی، جسے السمعانی نے عربی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ اس مجلس نے سابقہ کلیسائی مجلسوں کو درست تسلیم کیا۔ فلیوق[۵۲] قبول کر لیا۔ روما کی طرف سے عقائد کے متعلق جو مجموعہ بہ طور سوال و جواب مرتّب ہوا تھا، اس کی منظوری دے دی۔ دعائے عام میں پوپ کا نام داخل کر لیا گیا۔ صرف چھوٹے درجے کے پادریوں کو شادی کی اجازت دے دی گئی۔ یہ فیصلہ ہو گیا کہ راہبین و راہبات ایک عمارت میں مقیم نہ رہیں اور ان میں سے کوئی کہیں جائے تو پادری اس کی مہمان داری کریں، لیکن پادریوں کے سوا کسی کو یہ حق نہ ہو کہ اس مجلس کے فیصلوں میں دراصل بیشتر کی مجلس تنوبین کے فیصلے نئے سانچے میں ڈھال لیے گئے تھے اور اسی میں مارونی کلیسا کی اس تنظیم کا فیصلہ ہوا جو آج کل قائم ہے[۵۳]۔ مجلس نے یہ بھی طے کر لیا کہ ان مذہبی قوانین کو از سرِ نو مرتّب کیا جائے اور ان پر نظرِ ثانی کر لی جائے، جن کا تعلق شخصی معاملات سے تھا۔ اس کے لیے بنیاد حلب کے مارونی راہب عبداللہ قرعلی کی تصانیف نے مہیا کی تھی، جو سابقہ صدی کے اواخر میں لبنان کے اندر متوطن ہو گیا تھا۔

تنوبین کی مجلس ۱۵۹۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں ایک اطالوی لیسوعی ڈینڈینی نے پوپ کی

---

[۵۱] اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے ڈلاراک جلد دوم صفحہ ۹۸ - ۱۱۰، دلبس جلد ہفتم صفحہ ۱۹۹ ببعد جلد ہشتم صفحہ ۵۴۷ ببعد۔ یہ تمام معلومات ایک خاص کتاب میں مدون ہو گئیں۔ الجامع المفصّل فی تاریخ الموارنۃ المؤصّل۔ خیر اللہ کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۳۲ - ۴۲، رسل ہیو بر صفحہ ۱۰۶ - ۱۱۴۔

[۵۲] کتاب العقائد میں اس سے وہ عقیدہ مراد ہے، جس کے مطابق روح القدس کا ظہور باپ اور بیٹے سے یکساں ہوتا ہے۔ Filioque

[۵۳] دیکھیے ابو خطّار المشرق میں جلد ۴ صفحہ ۵۳۶ ببعد، باخوس الفغالی مشرق میں جلد ۴۵ صفحہ ۲۴۴ - ۲۷۵۔ دلبس جامع صفحہ ۴۹۲ - ۴۹۶۔

نمائندگی کی تھی۔ اس کی مرتبہ روئداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس بعض اصولوں میں اتفاق رائے پر پہنچ چکی تھی، مثلاً یہ کہ مارونی دعاؤں میں سریانی زبان استعمال کرتے رہیں۔ ان کی مذہبی تقریبات اور بزرگوں کی تقریبات بدستور قائم رہیں۔ ان کے پادریوں کے لیے شادیوں کی ممانعت نہ ہو اور عشائے ربانی میں سب حصہ لے سکیں[1]۔

ڈینڈینی[2] نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہمیں مارونی کی اس مجلسی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے، جو سولھویں صدی کے اواخر میں وہ بسر کر رہے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ مارونی قوم فاحشہ عورتوں سے تقریباً پاک ہے۔ زنا یا جنسی جرائم کبھی سننے میں نہیں آتے۔ شادی بارہ سے چودہ سال کی عمر کے درمیان ہو جاتی ہے۔ عورتیں مہذب اور باحیا ہیں۔ ان کے لباس اطالویوں سے زیادہ مختلف نہیں۔ جب انھیں کسی ناواقف مرد سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ ایک طرف ہٹ جاتی ہیں یا چہروں پر نقاب ڈال لیتی ہیں۔ مرد چوڑی دھاری والی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ان کا رنگ سبز نہیں ہوتا، جو رسول اللہ صلعم کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔ جنسی اخلاق کی طرح دیانت میں بھی ان کا درجہ بڑا اونچا ہے۔ اچھی کتابیں کمیاب ہیں، لیکن بُری کتابوں کی کمی نہیں، خصوصاً نسطوریوں اور یعقوبیوں کی کتابیں۔ تنہا یعقوبیوں نے اپنی جو کتابیں یہاں پھیلائیں، وہ پچاس خچروں پر لد کر آئی تھیں۔

روم کے ساتھ آخری اتحاد سے پہلے اور بعد مارونی اپنے علاقے میں ان کلیساؤں کو ماننے والے پناہ گزینوں کا خیر مقدم کرتے رہے، جو یونانی، سریانی یا ارمنی زبان استعمال کر رہے تھے۔ ان کے پادری ان معتقدات کے طلبہ کو اپنی درسگاہوں میں شریک کرتے رہے۔ ان کے جاگیردار امرا خصوصاً خازن نوواردوں کو زمینیں اور روپیہ دیتے رہے تاکہ وہ نئے وطن میں اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ اس طرح مارونیوں نے ویٹیکن اور دوسرے کلیساؤں کے درمیان اختلافات مٹانے اور اتحاد پیدا کرنے کی خاص خدمت انجام دی[3]۔ ۱۶۹۲ء میں مارونیوں نے اپنے مذہبی سلسلے منظم کر لیے تھے۔ پھر شامی کیتھولکوں، ارمنوں اور یونانی گروہوں کو شمالی لبنان اور کسروان میں آباد کیا گیا، جہاں وہ بے تامل اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

---

[1] ڈینڈینی صفحہ ۹۲ بعید۔ [2] صفحہ ۲۷، ۳۰، ۴۷ بعید۔
[3] پیٹر فائل کی کتاب The Role of the Maronites in the Return of the Oriental Churches صفحہ ۳۲، ۳۳، ۳۷، ۳۸، ۴۱، ۴۲، ۸۸۔

Marfat.com

**جنوبی لبنان**

شمالی لبنان نے اٹلی اور فرانس سے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا، اس لیے وہ کسی حد تک روشنی میں آ چکا تھا، اگرچہ وہ روشنی مدھم تھی۔ اس کے برعکس جنوبی لبنان کے دروزی اور شیعہ مقابلتہً گمنامی میں پڑے رہے۔ یورپی سیاحوں میں سے کسی نے ان پر توجہ نہ کی۔ مقامی باشندوں میں سے کسی نے ان کی زندگی کا خاکہ مرتب نہ کیا، مگر ایک حقیقت واضح ہے کہ مسیحی، دروزی اور شیعہ سب امن و ہم آہنگی سے رہتے تھے +

والنے[1] فرانس کا ایک امیر اور ناعمل تھا۔ وہ دروزیوں اور مارونیوں کے طریق زندگی، نظام حکومت، زبان، مراسم اور اوضاع و اطوار کی یکسانی پر بے حد متعجب ہوا۔ وہ کہتا ہے: دونوں قوموں کے لوگ پہلو بہ پہلو مل جل کر رہتے ہیں۔ بعض اوقات دروزی مارونیوں کے کلیساؤں میں چلے جاتے ہیں، مقدس پانی استعمال کرتے ہیں۔ مشنری ان پر زور ڈالیں تو بپتسمہ بھی لے لیتے ہیں۔

میرٹی[2] ایک اطالوی پادری تھا، جو والنے سے کچھ مدت پیشتر ۱۷۶۰ء میں لبنان گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دروزی مسیحیوں کے بڑے دوست ہیں اور ان کے مذہب کا احترام کرتے ہیں۔ وہ بے تکلف مارونیوں کے گرجوں اور ترکی کی مسجدوں میں دونوں جگہ نماز ادا کرتے ہیں۔ اسلحہ میں سے پستولوں کی جوڑی اور خنجر ان کے لباس کا ینفک جزو ہے۔ دونوں چیزیں ایک پیٹی میں لگی رہتی ہیں۔ مسیحی ہمسایوں کی بعض تقریبات میں دروزی اب تک شریک ہوتے ہیں اور اسے کوئی خاص اہمیت نہ دینی چاہیے۔

بلس[3] لکھتا ہے کہ جبری فوجی خدمت سے بچنے کے لیے دروزیوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنے پراٹسٹنٹ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایک فرانسیسی کپتان کو حوران میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے امرا کے خاندانوں کا عام دستور ہے کہ جب ایک یا زیادہ بچوں کی موت ہو جائے تو نومولود بچے کو بپتسمہ دلا دیتے ہیں۔ سلطان الاطرش کے دوسرے بیٹے کو ۱۹۲۴ء میں ایسے ہی حالات کے اندر بپتسمہ دیا گیا تھا۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ اگر اس قسم کے معمولات تقیہ کا نتیجہ نہیں تو انھیں طلسمی اثر کے اعتقاد کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ اصولی اعتقاد میں تبدیلی آ گئی مزید برآں دروزی اور مسیحی بعض مقدس مقامات کا یکساں احترام کرتے رہے۔ جو دروزی خاندان کسی مسیحی گاؤں میں رہتا ہے، وہ بعض اوقات کلیسا کی امداد کے لیے چندہ بھی دے دیتا ہے بعض درختوں

---

[1] جلد دوم صفحہ ۳۱، ۵۷، ۶۸ + [2] جلد دوم صفحہ ۲۵ +

[3] فریڈرک بلس کی کتاب The Religions of Modern Syria & Palestine صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹، نیز آبزک رائیلے سیرین ہوم لائف Syrian Home-life، صفحہ ۱۸۱ +

[4] بوردن (Bourdon) کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۲۹۹، ۳۱۵ +

Marfat.com

مقدّس سمجھا جاتا ہے، مثلاً علیہ کا پرانا شاہ بلوط۔ یہ درخت چند سال پیشتر تک موجود تھا۔ دروزی اور مسیحی اپنے لباس کی چندیاں اس کی شاخوں سے باندھ دیتے تھے اور یہ سلسلہ اس وقت سے جاری تھا جب مسیحی اور دروزی وجود میں بھی نہیں آئے تھے۔

## دروزیوں کا مجلسی و مذہبی نظام

سیاحوں کی متفرق روئدادوں سے واضح ہوتا ہے کہ معنیوں اور شہابیوں کے ماتحت دروزیوں کا مجلسی و مذہبی نظام ایک خاص شکل اختیار کر چکا تھا اور وہ اب تک باقی تھا۔ دروزی نہ تو رمضان کے روزے رکھتے ہیں، نہ حج کے لیے مکّہ معظمہ جاتے ہیں اور نہ جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں صرف ایک شادی کا رواج ہے۔ طلاق دمتارکت کے سلسلے میں خاصی سہولت ہے۔ ہر فرد مسیحی ہموطن کی طرح وصیّت کے مطابق اپنی جاگیر جسے چاہے دے سکتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ کوئی مسلمان کسی مہلک بیماری میں وصیّت کرنا چاہے تو صرف جائداد کے ایک تہائی حصّے میں اس کا مجاز ہے۔ باقی دو تہائی جائداد قرآنی فیصلے کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ دروزیوں کی مذہبی تقسیم کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ عام لوگوں کا ہے، دوسرا "عُقّال" کا اور تیسرا "اجواد"[1] کا۔ عام لوگ ہلکی سفید پگڑی باندھتے ہیں۔ "عُقّال" وہ ہیں جنھیں اپنے فرقے کے اسرار سے زیادہ گہری واقفیت ہوتی ہے۔ وہ نوجوانوں کو تعلیم دے سکتے ہیں، شادی اور وفات پر تقریبات رائج ہیں، ان کی صدارت کر سکتے ہیں۔ جن مجلسوں میں عام لوگ جا سکتے ہیں، وہاں عُقّال اخلاق کے ان اصول کی تعلیم دیتے ہیں، جو دنیا بھر کے نزدیک مسلّم ہیں۔ چوری، زنا، شراب نوشی اور دروغ گوئی کی مخالفت پر زور دیتے ہیں۔ وہ حقّہ نہیں پیتے۔ کھانا زیادہ نہیں کھاتے، غیبت نہیں کرتے۔ ان میں سے کوئی شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے، مثلاً چوری یا زنا کا تو اسے مذہبی معاشرے سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ سب سے اونچا درجہ اجواد کا ہے۔ وہ اجتماعات یا سرکاری مواقع پر عبا کے نیچے سیاہی مائل لباس پہنتے ہیں، جس کی بنا پر دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ نیز وہ سفید اُون کی عبائیں پہنتے ہیں، جن پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔

ان کے مقاماتِ اجتماع بہت سادہ ہوتے ہیں۔ وہاں نہ تو کوئی بُت یا مورتی ہوتی ہے، نہ میز نہ کرسی۔ بیٹھنے کے لیے یا تو چٹائیاں بچھائی جاتی ہیں یا سفید و سیاہ دھاریوں والی شطرنجیاں۔ سب ان پر مشرقی انداز میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جب معمر ترین عُقّال تالی بجاتا ہے تو عام لوگ اُٹھ جاتے ہیں۔ خاص خفیہ مجلسیں جمعرات کی شام کو ایسے مقامات پر منعقد کی جاتی ہیں، جو بالکل الگ تھلگ ہوں۔

---

[1] اجواد کا واحد جوید ہے، جس کے معنی ہیں راست باز۔

انھیں خلوہ کہتے ہیں۔ یہ مقامات یا تو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ہوتے ہیں یا ان کے اطراف میں اور وہاں صرف خاص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ وہیں مذہبی کتابیں لائی جاتی ہیں۔ یہ سب قلمی ہوتی ہیں، جو مرورِ زمانہ سے خاصی بوسیدہ ہو گئی ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ ان کتابوں پر کسی غیر کی نظر نہیں پڑ سکتی اور ان کے مندرجات کوئی اجنبی کان نہیں سن سکتا۔ پھر "مولانا" کے پُر اسرار مذہب پر گفتگو شروع ہوتی ہے۔ مولانا سے مراد فاطمہ خلیفۃ الحاکم ہے۔ ان کتابوں میں جو ادبی ترکیبیں اور فنی اصطلاحات ہیں، وہ نیم خواندہ آدمیوں کے فہم کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں، لیکن نوشتہ مذہبی کتابوں کی مسحور کن تاثیر مشرق میں مسلّم ہے۔ مارونی اور آرتھوڈکس یونانی بھی اپنی سریانی اور یونانی دعاؤں سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ۱۵۲۴ء میں پاشائے دمشق نے لبنان کے دروزی علاقے پر حملہ کیا اور تینتالیس گاؤں جلا دیے۔ ان کی خلوت گاہوں کو لوٹا۔ مقدس مخطوطات کے نسخے لے آئے اور کٹے ہوئے سروں کے چار بار بھی ساتھ تھے تاکہ انھیں دارالحکومت کے قلعے کی دیواروں پر بہ طور نمائش لگا دیا جائے۔[1] دوسرا غارت گرانہ حملہ تین سو سال بعد مصر کے ابراہیم پاشا نے کیا اور وہ خمسہ (حاصبیہ کے جنوب مشرق میں) کی مقدس خلوت گاہ سے جو قدیم ترین خلوت گاہوں میں سے ایک تھی، بہت سے قلمی نسخے اٹھا لایا اور یہ مصر و یورپ کے کتب خانوں میں پہنچے۔ اس طرح اخفا کا وہ پردہ چاک ہوا، جو دروزیوں کے عقائد پر ابتدا سے پڑا ہوا تھا اور جن کی حفاظت اس اہتمام سے کی جاتی کہ کسی دوسرے مذہب کی تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔ جو عورتیں ضروری اوصاف سے متصف ہو جاتی ہیں، وہ بھی ان مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ ان کے لیے مردوں کے عقب میں بیٹھنے کے لیے ایک جگہ بنا دی جاتی ہے۔ چونکہ یہ مجلسیں پُر اسرار طریق پر تاریکی میں منعقد کی جاتی ہیں، اس لیے غیر مصدقہ الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا، مثلاً یہ کہ وہ لوگ بدمستی کی حرکتیں کرتے ہیں یا انسانوں کی قربانی کی جاتی ہے یا بچھڑے کی پوجا ہوتی ہے۔ اس قسم کے الزامات مارونیوں اور مسیحیوں پر بھی عائد کیے گئے تھے۔

ان خلوت گاہوں میں کچھ لوگ، جن کا تعلق اجواد سے ہوتا ہے، بعض ایسے معمولات پر عمل پیرا ہوتے ہیں، جو صوفیوں یا راہبوں سے مختص ہیں، اگرچہ انھیں یہ نام نہیں دیا جاتا۔ خلوت گاہوں کی زندگی میں جسموں کو زیادہ سے زیادہ گھُلایا جاتا ہے اور مراقبے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ آرتھوڈکس یونانیوں یا کیتھولک یونانیوں کی خانقاہوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ کوہ حرمون کے ایک جانب حاصبیہ کے نزدیک دروزیت کے گہوارے کے اوپر البیاضہ موجود ہے۔ یہ ایک نہایت قدیم اور مشہور خلوت گاہ ہے۔ یہاں ہر روز

---

[1] منجد صفحہ ۶۔

تقریباً بیس آدمی تعلیم، مراقبے اور نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ چار یا پانچ ممتاز ترین افراد معلّمی اور امامت کا فرض ادا کرتے ہیں۔ کوئی حلف نہیں اٹھوایا جاتا۔ شادی نہ کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ بیرونی دنیا سے کامل انقطاع کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا۔ عام طریقہ یہ ہے کہ خلوت گاہوں میں رہنے والے لوگ اس زمین کی پیداوار پر زندگی گزارتے ہیں، جو خلوت گاہ کے ساتھ وقف ہوتی ہے۔ وہ ہاتھ سے محنت مشقت کرتے ہیں۔ مقدس کتابوں کی نقلیں لیتے ہیں، جو نئے مومنوں کو بطور عطیہ دی جاتی ہیں، فروخت نہیں کی جاتیں۔ سفر پر جاتے ہیں تو پیدل چلتے ہیں یا حقیر درجے کی سواری سے کام لیتے ہیں، مثلاً گدھا۔ سرکاری ملازمت سے بطور خاص احتراز کیا جاتا ہے۔ جو لوگ مذہبی عقائد میں زیادہ پکے ہیں، وہ کسی سرکاری ملازم کے گھر میں کھانا نہیں کھاتے بلکہ اپنے نئے ہم مذہب کے گھر بھی کھانا کھانے میں تامّل کرتے ہیں[51]۔

**متاولہ**

لبنانی شیعوں کی زندگی پر بھی تاریکی کا گہرا پردہ پڑا رہا، لیکن ایک واقعہ ایسا روشنی میں آیا ہے، جسے قومی درجے سے زیادہ وسیع اہمیت حاصل ہے، یعنی اس جماعت نے اعلیٰ تعلیم کی روایت قائم رکھی۔ سولھویں صدی کے موڑ پر شاہ اسمٰعیل بانی خاندانِ صفویہ نے ایران میں شیعیت کو سرکاری مذہب کا درجہ دے دیا، تو اسے اس مذہب پر سختی سے عمل کرانے میں مشکلات پیش آئیں، کیونکہ علماء اور علمی کتابوں کا قحط تھا۔ اس وقت وہ تمام دوسرے مقامات کو چھوڑ کر لبنان پر متوجہ ہوا تاکہ کمی کی تلافی کر سکے۔ چنانچہ متعدد لبنانی فضلاء شاہ کی دعوت پر یا دعوت کے بغیر نقل وطن کر کے ایران چلے گئے۔ انہیں میں حسین العاملی بھی تھا، جو اس وقت ایران گیا، جب ترکوں نے اس کے آقا زین الدین کو موت کی سزا دے دی۔ زین الدین کو الشہید الثانی کا لقب ملا۔ شمس الدین العاملی شہید اوّل تھا، جسے سنہ ۱۳۸۴ء میں مالکیؒ اور شافعیؒ قاضیوں کے فتوے پر بمقام دمشق موت کی سزا دی گئی تھی۔ حسین کے ساتھ اس کا نوجوان بیٹا بہاء الدین العاملی بھی تھا (سنہ ۱۵۴۶ء-۱۶۲۲ء)۔ وہ بعلبک میں پیدا ہوا، جو آج کل بھی شیعی خطہ سمجھا جاتا ہے۔ بیٹا علم و شہرت میں باپ پر فوقیت لے گیا۔ وہ فقہ کا عالم تھا۔ ایک حد تک فلسفہ اور ریاضی بھی جانتا تھا۔ ایرانیوں میں وہ شیخ بہائی کے لقب سے مشہور ہے۔ اصفہان میں اسے شیخ الاسلام بنا دیا گیا تھا اور وہ شاہ عباس کے دربار کے لیے زیب و زینت کا باعث بنا رہا۔ حج کے بعد اس نے درویشوں کے لباس میں اپنے وطن کا سفر بھی کیا۔ فقہی فیصلوں کے علاوہ، جن پر اس کی شہرت کا انحصار ہے، بہاء الدین نے ایک کتاب "الکشکول" کے نام سے بھی مرتب کی تھی۔ جس میں بے شمار متفرق لطائف، اشعار اور مقالے ہیں۔ یہ دراصل ایک ادبی بیاض ہے، جو مصر (ٹائپ) اور ایران (سنگی) دونوں جگہ چھپی[52]۔

---

۵۱ دروزیوں کی موجودہ مذہبی زندگی کے متعلق نہایت مفصل بیان بورل میں ملے گا، صفحہ ۸۸ بعد۔

۵۲ ایڈورڈ جی براؤن (A Literary History of Persia) جلد چہارم صفحہ ۵۴، ۲۵۳، ۳۱۰، ۴۰۶، ۴۲۷۔

Marfat.com

# اٹھائیسواں باب

## انیسویں صدی

**نیا جانشین**

سنہ ۱۷۸۸ء میں عکہ کے حاکم کی تجویز کے مطابق لبنان کے اُمراء نے مقتول امیر لبنان کے ایک دور کے رشتہ دار کو جانشین منتخب کیا، جس کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ حاکم عکہ یا امرائے لبنان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ نیا جانشین بشیر ثانی کتنے اونچے مرتبے پر پہنچے گا۔ المختار پر دما ضم ہو گیا کہ نیا امیر ہر حکم کے روبرو سر بہ خم ہونے والی جنس نہیں۔ شیخوں اور جاگیرداروں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جہاں سے امیر اعظم کا اقتدار شروع ہوا، خود ان کا اقتدار ختم ہو گیا۔ بشیر ثانی دوسرا فخر الدین ثانی ثابت ہوا۔ اس کے سامنے بھی وہی مقاصد و عزائم تھے، جو اس کے عظیم القدر پیشرو کے سامنے تھے اور

**لبنانِ کلاں کا دوسرا معمار**

انھیں اس نے اپنی عمل بھی اسی طریق پر پہنچایا۔ ایک لحاظ سے دونوں میں اختلاف تھا۔ معنی کا قد پست تھا اور اسے دیکھ کر کسی پر رعب نہیں پڑتا تھا۔ اس کے برعکس بشیر شہابی کی وضع قطع پرانے زمانے کے شیخوں کی سی تھی۔ اس کے ابرو بھرے ہوئے تھے، جو تیز اور چمکیلی آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی لمبی تھی اور سینے پر لہریں لیتی تھی۔ دیکھنے والے کے دل میں رعب اور احترام پیدا ہوتا تھا۔ وہ آخری مرتبہ جلاوطن ہو کر قسطنطنیہ پہنچا اور دربارِ سلطانی میں حاضری کا وقت آیا تو مشہور ہے کہ سلطان نے تمام درباریوں کو تاکید کر دی تھی، اس بے وطن امیر کا استقبال کھڑے ہو کر نہ کریں لیکن جونہی بشیر دربار میں پہنچا، سب بے اختیار کھڑے ہو گئے۔[1] اس کا عہد حکومت خیر اور [illegible] نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے (سنہ ۱۷۸۸ء - سنہ ۱۸۴۰ء)۔ اس میں خود اختیاری جلاوطنی یا جبری جلاوطنی کے صرف چار وقفے پیش آئے۔ اس پوری مدت میں بشیر کی کوشش یہ رہی کہ قسطنطنیہ کی مزاحمت کرتے ہوئے وسیع تر اور آزاد لبنان کے لیے مسلسل کوشاں رہے اور اسے دورِ حاضر کی ترقیات

---

۱؎ بطرس معلا الامیر بشیر الشہابی صفحہ ۱۳ ۔

Marfat.com

بہرہ مند کر دے۔ وہ بڑی دانش مندی سے کام لے کر آس پاس کے شمالی والیوں کو جھکیے دیتا رہا۔ باب عالی میں شبہات کو روکنے کے لیے فراخ حوصلگی سے اس نے رقمیں صرف کیں۔ جو دروزی اور مسیحی جاگیردار اس کے اجداد نے بنائے تھے اور وہ بہت طاقتور ہو گئے تھے، انھیں مطیع و منقاد بنانے میں اس نے انتہائی سختی سے کام لیا۔

اس کے تدبر کی آزمائش کا پہلا نازک موقع وہ تھا، جب نپولین ۱۷۹۹ء میں عکہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ الجزار نے فوری اور موثر مدد کے لیے درخواست کی۔ بشیر نے یہ عذر پیش کیا کہ مجھے اپنے ہم قوموں پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود الجزار نے دروزی شیخوں کو بشیر کے خلاف انگیخت دی تھی بلکہ یوسف کے دو بیٹوں کو اس کی جگہ مقرر کر دیا تھا[1]۔ نپولین نے وعدہ کیا کہ میں دروزیوں کو آزادی دے دوں گا۔ ٹیکس گھٹا دوں گا۔ بیروت اور تمام دوسری بندرگاہوں کو آزاد چھوڑ دوں گا، جو حفاظت اور تجارت کے لیے ضروری تھیں۔ بشیر نے اس سلسلے میں انتظار کی پالیسی پر عمل کیا[2]۔ تاکہ نتیجہ واضح طور پر سامنے آ جائے۔ صرف چند غیر مطمئن لوگ، جن میں زیادہ تر شیعہ تھے، نپولین کی فوجوں میں شامل ہوئے۔ جب صدر اعظم قسطنطنیہ سے فوج لے کر فرانسیسی حملہ آور کی روک تھام کے لیے دوڑا ہوا آیا تو بشیر نے اس کے حما پہنچنے پر گھوڑے پیش کیے۔ دمشق پہنچنے پر گیہوں بہم پہنچایا اور کہہ دیا کہ بعلبک اور البقاع کے تاج گذار ترکی فوجوں کے لیے وقف ہیں۔ اس کا صلہ بہت جلد ملا اور بہت ہی خوش کن تھا یعنی صدر اعظم نے ایک فرمان کے ذریعے سے بشیر کو جبل دروز، وادی تیم، بعلبک، البقاع، جبل عامل اور خطہ جبیل کا حکمران بنا دیا اور یہ حق دے دیا کہ براہ راست باب عالی سے روابط قائم کر لے[3]۔ لیکن الجزار ایسا آدمی نہ تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا تو خاموش رہتا، خصوصاً اس حالت میں تو اس کا خاموش رہنا ممکن ہی نہ تھا، جب نپولین پر فتح پانے کا ہالہ اس کے سر کی زینت بنا ہوا تھا۔ بشیر برطانوی سمندر کے ایک جہاز میں سوار ہوا اور العریش پہنچ کر صدر اعظم سے ملاقات کی۔ وہاں سے قبرص چلا گیا اور چند مہینے کے بعد لوٹا[4]۔ ترکی جنگی جہازوں نے انگریزی جہازوں [illegible] کر کے فرانسیسیوں کو مشرقی بحیرہ روم سے باہر نکال دیا۔

۱۸۰۴ء میں الجزار کی موت نے وہ سب سے بڑی رکاوٹ دور کر دی، جو بشیر کی کامیابی کے

---

[1] باسیلیوس قطان: معاصر تاریخی حوادث لبنان و سوریہ صفحہ ۱۵۷، ۱۶۰۔ [2] نپولین کے خط کے لیے دیکھیے ڈیسٹا جلد اول صفحہ ۵۷۶، نیز دالاغرتین جلد اول صفحہ ۲۰۶-۲۰۷۔ [3] حیدر: لبنان صفحہ ۱۹۵، قطان صفحہ ۱۵۷۔ [4] حیدر: لبنان صفحہ ۲۰۱ بعد، چرچل: لبنان جلد سوم ۱۹۶، ۱۹۸۔

Marfat.com

راستے میں حائل تھی۔ اب بشیر نے داخلی دشمنوں کو کچلنے کے لیے سختی سے کام لیا۔ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اپنے علاقے کے متفرق اجزاء کو باہم پیوست کر دیا۔ یوسف کے دونوں بیٹے اس کے حریف تھے۔ انھیں پہلے بینائی سے محروم کیا، پھر قتل کرا دیا۔ بخشش عدل میں وہ بڑا سخت تھا۔ لبنانی لوگ کہانیوں میں بے شمار قصے مذکور ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ بشیر نے کس سرگرمی سے مجرموں کا تعاقب کیا۔ دریائے دامور کے دہانے کے نزدیک ایک جگہ ہے، جہاں ایک شخص مارا گیا تھا۔ بشیر نے خفیہ پولیس کے دو آدمی وہاں بٹھا دیے۔ آٹھ مہینے گزر گئے اور کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک رات وہ ایک درخت کے نیچے چھپے بیٹھے تھے کہ پاس سے دو آدمی خچروں پر سوار چلے جا رہے تھے اور اس جرم کے متعلق مخبری کی باتیں کر رہے تھے، جس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس طرح وہ گرفتار ہوئے۔ ایک شخص ارتکاب جرم کے بعد بھاگ کر قبرص چلا گیا۔ بشیر نے اپنا ایک کارندہ اس کے پیچھے بھیج دیا۔ وہ قبرص پہنچا، مفرور سے دوستی پیدا کی۔ کارندہ بھی اس کا ساتھی بن گیا۔ پھر دونوں سکندریہ جانے کے ارادے سے جہاز پر سوار ہوئے جسے بیروت سے ہو کر جانا تھا۔ بیروت پہنچے تو مجرم کو گرفتار کرا دیا گیا۔ دیر القمر بشیر کا مرکز تھا۔ وہ پاس کے ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت کو دیکھا، اپنے سر کے بال نوچ رہی ہے اور مقتول شوہر پہ آہ وزاری کر رہی ہے۔ بشیر نے گاؤں والوں کو متنبہ کر دیا کہ اگر دو دن کے اندر اندر مجرموں کو پیش نہیں کرو گے تو میں تم میں سے اتنے آدمیوں کے گلے میں پھندا ڈال کر اس شاہ بلوط پر لٹکا دوں گا، جتنے اس کے پتے ہیں۔ وہ واپس آیا تو قاتل وہاں حاضر تھے۔ ان میں سے ایک عورت تھی اور دو مرد اس کے ساتھ شریک تھے[1]۔ لبنان نے بشیر کے عہد میں جائے پناہ کی قدیم روایت بھی قائم رکھی۔ خطۂ حلب میں چار سو دروزی کنبے اپنی حالت پر غیر مطمئن تھے۔ بشیر نے انھیں لبنان بلا کر آباد کیا اور آبادی کے لیے مالی امداد دی۔ یہ کنبے حلبی کہلاتے ہیں۔ اس طرح ان کی اصل کی یاد اب تک قائم ہے۔ یونانی کیتھولکوں کی ایک جماعت حلب اور دمشق کے خطوں میں پریشاں حال تھی وہ دیر القمر، زوق، مکائل اور دوسرے مسیحی قصبوں میں منتقل ہو گئے۔ ۱۸۰۷ء میں حلب کے برطانی قنصل کو معلوم ہوا کہ اس کے ملک اور باب عالی کے درمیان تعلقات منقطع ہونے والے ہیں۔ وہ اپنی جان بیوی کو لے کر لبنان بھاگ آیا۔ بشیر نے اسے حریصا کی خانقاہ میں پناہ دے دی۔ بیروت اور طرابلس کے فرانسیسی قنصلوں نے اسے نکالنے کے لیے جتنی کوششیں کیں، بشیر نے ان سب کو ٹھکرا دیا[2]۔

---

[1] حیدر: لبنان صفحہ ۲۰۴، ۲۰۸، صغیر صفحہ ۷۶ ببعد۔ [2] جان یارکر: انگریزی
Egyat under the last five Sultans، جلد اول صفحہ ۹۹، ۱۰۸۔

Marfat.com

عثمانی ارباب بست وکشاد کے تعلق میں بشیر کی روش بظاہر بڑی دوستانہ تھی، لیکن وہ اپنے مقصد و نصب العین سے کبھی ادھر اُدھر نہ ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں نجد کے وہابی صحرائی حدود سے نکل کر بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ بے خبر ہمسایہ علاقوں پر حملہ آور ہوئے۔ بشیر پندرہ ہزار لبنانی فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے موجود تھا۔ اس نے حوران اور شرق اُردن کی عثمانی فوج کے ساتھ ہو کر وہابی لشکروں کی پسپائی میں حصہ لیا[۱]۔ کچھ عرصہ بعد بشیر نے نابلس کے نزدیک ایک مستحکم قلعے کو تباہ کرنے میں مدد دی جس کا نام سانور تھا اور جہاں شہر و حوالی کے باغی استحکامات کر کے بیٹھ گئے تھے۔ وہابیوں کے خلاف جنگ کے سال میں برک ہارٹ مقامی باشندوں کا لباس پہن کر لبنان سے شمالاً جنوباً گذرا۔ وہ بے تکلف عربی بولتا تھا، مقامی باشندوں نے اس کی خاطر داری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ اس سفر کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے:

"کوہستانی باشندے سفر پر نکلیں تو انھیں کھانے پینے اور رہنے پر کچھ بھی خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جس گاؤں میں شام ہو جاتی ہے، وہ اپنے کسی واقف کے گھر جا اُترتے ہیں اور ان کے واقف عموماً ہر جگہ ہوتے ہیں۔ جاتے ہی گھر کے مالک سے کہتے ہیں: ہم تمھارے مہمان ہیں۔۔۔۔۔ میزبان ہر مسافر کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہے، جس میں دودھ، روٹی اور برغول[۲] ہوتا ہے۔ اگر میزبان خوش حال اور کشادہ دل ہو تو مسافر کے خچر یا گھوڑے کے لیے بھی دانہ چارہ فراہم کر دیتا ہے۔ اگر کسی مسافر کو گاؤں کے کسی آدمی سے شناسائی نہ ہو تو جس گھر میں چاہتا ہے، اُتر جاتا ہے۔ اپنی سواری باندھ دیتا ہے اور پائپ پینے لگتا ہے، یہاں تک کہ گھر کا مالک اس کی خاطر تواضع کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے اہل عزت و حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر مسافر کا استقبال دوست کی حیثیت میں کریں اور اسے کھانا دیں۔ صبح کو مسافر اُٹھ کر "خدا حافظ" کہہ کر رخصت ہو جاتا ہے[۳]۔"

بشیر کو اپنی لڑائیوں اور ترقی کے منصوبوں کے لیے روپے کی ضرورت تھی لہٰذا اس نے بھاری ٹیکس عائد کیے۔ وہ اپنے پیشرو کے زمانے میں تحصیلداری کی خدمت انجام دے چکا تھا اور ایک ایک دمڑی وصول کرنے میں اس نے کبھی کوتاہی نہ کی۔ اپنی امارت کے ابتدائی زمانے میں اس نے دو سردل

---

[۱] حِتّی: لبنان صفحہ ۵۵۶-۵۵۷۔ [۲] گیہوں کا دلیا، جسے کوہستانی باشندے چاول کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔
[۳] برک ہارٹ صفحہ ۲۲۴۔

شہر والوں کو نہایت اچھا سبق دیا۔ مثلاً ایک مرتبہ زحلہ نے واجب الادا رقم ادا نہ کی تو بشیر نے تعزیراً اہل زحلہ پر دگنی رقم عائد کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض غریب نادار باشندے شہر چھوڑ کر چلے گئے[1]۔ محاصل کی زیادتی کے باعث بشیر اور اس کے ماتحتوں، خصوصاً محاصل جمع کرنے والے کارکنوں کے خلاف جو بے چینی کا طوفان اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ ۱۸۲۰ء میں یہ طوفان عام لوگوں (عامیہ) کی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا اور کچھ عرصہ تک بشیر نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس طوفان کے آگے جھک جائے۔ چنانچہ وہ عارضی طور پر حوران میں منتقل ہو گیا۔ اس کے اقتدار میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ تمام حالات کے مطالعے اور والی دمشق و طرابلس و صیدا کی کشمکشوں میں اپنا فرض ادا کرنے کے لیے واپس آ گیا۔ ۱۸۲۱ء میں جو حقیقت میں کشمکش تھی اس میں اس نے والی دمشق کے خلاف والی صیدا کی حمایت میں غلطی کی اور المزہ میں والی دمشق کو ذلت خیز شکست دی۔ اس پر باب عالی کی قوت اس کے خلاف حرکت میں آ گئی اور وہ باہر نکل جانے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ وہ مصر چلا گیا، جہاں محمد علی نے یہ کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا کہ میرے ہاں تم سے زیادہ عزیز مہمان کوئی نہیں آیا[2]۔ اس طرح کوہستان و وادی کے دو زبردست آدمیوں کے درمیان نتیجہ خیز دوستی کے رشتے پیدا ہو گئے۔ دونوں کا آقا ایک تھا جسے دونوں بالقوہ دشمن سمجھتے تھے۔ دونوں کا نصب العین یہ تھا کہ آقا کی سلطنت کے مختلف حصوں پر قبضہ کر کے اپنے دائرہ اقتدار میں توسیع کر لیں۔ والی مصر کی وساطت سے امیر لبنانی پھر سلطان کی بارگاہ میں مورد لطف و کرم ہو گیا اور اپنے علاقے میں واپس آیا تو پہلے سے زیادہ استوار اور زیادہ با اثر تھا۔

بشیر عقیدے کی وجہ سے مسیحی تھا۔ اس نے شادیاں مسلمانوں میں کیں۔ عقیدے کی بنا پر نہیں بلکہ سہولت و مصلحت کی بنا پر وہ دروزی تھا۔ وہ اپنے اور بیشتر گھرانے کی روایات سامنے رکھتے ہوئے رواداری اور مصالحانہ مذہبی پالیسی پر کاربند رہا۔ بیت الدین میں اس کے محل کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی اور ایک گرجا بھی[3]۔ اس کی امارت کے زمانے میں تعلیمی نظام اور ذہنی ابھاروں کا وہ بیج سرزمین لبنان میں بویا گیا، جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی شان سے بہرہ مند ہوا۔ اس کی امارت کا دوسرا سال تھا جب عین ورقہ کی مارونی درسگاہ کو تعلیم کا ایک عالی قدر ادارہ بنا دیا گیا، جس میں یورپی کالجوں کا نمونہ پیش نظر رکھا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے پیشرو کے سکرٹری غندور السعد اور فرانسیسی قنصل کی تحریک بھی شامل تھی۔ اسی درسگاہ میں بعض ایسے لوگوں نے تعلیم پائی، جو جدید تعلیم و تنور کے اولین مشعل بردار تھے، مثلاً یوسف الدبس (۱۸۳۳ء-

---

[1] کتمان صفحہ ۱۱۵۔ [2] حیدر: لبنان صفحہ ۲۷، شدیاق صفحہ ۵۳۶ [3] مالا ارتین جلد اول صفحہ ۱۹۸۔

اسقفِ بیروت، جس نے ارونی کالج کی بنیاد رکھی اور متعدد تاریخی کتابوں کا مصنف تھا۔[۵۱] رشید الدحداح (۱۸۱۳ء-۱۸۸۹ء)۔ جو امیر کا سکریٹری، اخبار نویس اور ادیب تھا اور بطرس البستانی ۔

جولائی ۱۸۲۳ء میں پہلا امریکی مشنری پلینی فسک[۵۲] بیروت پہنچا۔ اسے غیر ملکی مشنوں کے امریکی بورڈ آف کمشنرز نے بھیجا تھا۔ یہ شخص عرب مشرق میں پہلا امریکی معلّم تھا۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں ایک امارت اس کے نام کی یاد تازہ کر رہی ہے اور امریکی پریس نے قبرستان میں سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی لوح پہ یہ عبارت کندہ کرادی تھی: پلینی فسک، وفات ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۲۵ء، عمر اکتیس سال[۵۳]۔ یہ عربی پریس اولاً مالٹا میں قائم ہوا تھا (۱۸۲۲ء)، ۱۸۳۴ء میں بیروت منتقل ہوا ۔

بشیر نے لبنان سے طلبہ کی ایک جماعت اس طبی درسگاہ میں تعلیم کے لیے بھیجی، جو دورِ حاضر کے عرب مشرق میں اپنی نوعیت کی پہلی درسگاہ تھی۔ یہ محمد علی نے اہل مغرب کی تحریک پر قصر العینی میں قائم کی تھی۔ وہ تعلیم پاکر لبنان واپس آئے۔ یہ پہلا گروہ تھا، جس نے علاج معالجے کا کام شروع کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بشیر ہی پہلا شخص تھا، جس نے قرنطینہ کے ابتدائی قواعد و ضوابط بنائے اور انھیں بیروت کی بندرگاہ میں داخل ہونے والے غیر ملکی جہازوں پر عائد کیا۔ تجربے کے طور پر اس نے بعض لوگوں کو چیچک کے ٹیکے کرائے (۱۸۱۰ء) جن کے لیے وہ ویکسین استعمال کی گئی تھی، جو اسٹروی قنصل لایا تھا۔ پھر ان لوگوں کو دیہاتیوں کے ساتھ رہنے سہنے کے لیے بھیج دیا، جو صیدا کے شمال میں چیچک کے مریض تھے۔ جب جزّین کے نزدیک ایک گاؤں میں گلٹی والا طاعون نمودار ہوا تو بشیر نے اس گاؤں کے اردگرد پہرے داروں کا ایک گروہ بٹھادیا، جو کسی کو اندر سے باہر نکلنے یا باہر سے اندر آنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ صحت عامّہ کے مسائل سے ایسی متنوّرانہ دلچسپی کی مثال اردگرد کے علاقوں کی معاصر حکومتیں نہیں پیش کر سکتیں ۔

روپے کی کمی نہ تھی اور خواہش یہ تھی کہ ہر تعمیر میں زیادہ سے زیادہ شان و شکوہ اور عظمت نمایاں ہو، اس وجہ سے اس نے رفاہ عامّہ کے کام وسیع پیمانے پر جاری کیے اور ان میں بوقلمونی بھی تھی۔ پُرانی سڑکوں کی توسیع عمل میں آئی۔ نئی سڑکیں بنیں، نئے پل بنائے یا پُرانے پلوں کی مرمت کرائی، مثلاً

---

[۵۱] ان میں سے دو کے حوالے زیر نظر کتاب میں بار بار آچکے ہیں۔ اوّل تاریخ سوریہ آٹھ جلدوں میں، دوسری الجامع المفصّل فی تاریخ الموازنۃ الموصل ۔
[۵۲] Pliny Fisk ۔
[۵۳] Henry Jessup. Firly thee years in : yria صفحہ ۲۵، ص ۳۴، ۳۵
Rufus Aaderson History of the Missions of Americae Beerd of Commisons for Foreign Missions to the Oriental Churchs جلد اوّل صفحہ ۲۸، ۳۱ ۔
[۵۴] حیدر عزر صفحہ ۹۱۷ بعد، ص ۹۲۶ بعد ۔

دریائے کلب اور دریائے دامور کے پُل۔ دریائے کلب کے رومی پل پر جو کتبہ کندہ کرایا، اس کے ایک شعر میں بشیر کا نام مذکور ہے۔ حد درجہ عالیشان رفاہی کارنامہ یہ تھا کہ نو میل لمبی گزرگاہ عام تیار کر کے الصفا کا صاف پانی نئے دار الحکومت بیت الدین میں پہنچایا گیا۔ الصفا ایک چشمہ ہے، جس میں برف اور بارش کا پانی جمع ہو کر عین زحلتہ کی پہاڑیوں پر گرتا ہے، جو دیودار کے درختوں سے پٹی پڑی ہیں۔ یہ گزرگاہ آب اس نالی کے اوپر سے گزاری گئی، جو بشیر کی قدیم قیام گاہ دیر القمر کے پاس تھی۔ بشیر نے کوہستانی باشندوں سے کہہ دیا تھا کہ ان میں سے ہر شخص دو دن مفت کام کرے۔ اس طرح سب کام کے اسی ہزار دن ہو گئے اور یہ آبی منصوبہ جولائی ۱۸۱۲ء سے شروع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور امیر کے خزانے پر کوئی بوجھ نہ پڑا۔ انجینئروں کے اس کامیاب کارنامے پر جشن منایا گیا، جس میں توپیں چلیں، جا بجا الاؤ روشن کیے گئے، گیت گائے گئے۔ ملک الشعراء بطرس کرامہ نے اس موقع پر ایک ولولہ انگیز نظم لکھی، جو اب تک گائی جاتی ہے۔ یہ اس نمونے کی تھی، جسے فنِ موسیقی میں "موشح" کہتے ہیں۔ یہ پانی سب سے پہلے اس عالی شان محل میں پہنچا، جو امیر نے نہایت خوبصورت اور خوشنما بلندی پر بنوایا تھا۔ پہلے سے طے ہو چکا تھا کہ یہ محل تعمیری خوبیوں میں لبنان کی تمام سابقہ عمارتوں پر سبقت لے جائے۔ اس غرض سے لبنان کے بہترین معمار جمع کیے گئے اور فنکاروں کو بلایا گیا؛ جنھیں سنگِ مرمر کو جلا دینے میں کمال حاصل تھا۔ دمشق اور حلب سے وہ کاریگر آئے، جو پچی کاری میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس محل کے سامنے ایک میدان ہے، جو اتنا وسیع تھا کہ اس میں بیک وقت ایک سو شہسوار اپنے ملک کے قومی کھیل جرید کے کرشمے دکھا سکتے تھے۔ میدان کے ایک کنارے پر اصطبل تھے، جن میں پانسو گھوڑے رکھے جا سکتے تھے، پھر محرابوں کی ایک قطار چلی جاتی تھی، جو ڈھلان کے عین سر پر کھڑی تھی۔ اس محل کے کمروں کی حیثیت ایوانوں کی تھی اور وہ بڑے وسیع تھے اس کے برج مربع رکھے گئے تھے۔ اس کی تعمیر، توسیع اور تزئین میں چالیس سال صرف ہو گئے۔ بشیر کو اس کام سے اتنی دلچسپی تھی کہ جب امارت کے کام سے تھک جاتا تو تفریح کی غرض سے اس مقام پر پہنچ جاتا۔ شبق بردار یا پائپ پلانے والا اس کے ساتھ ہوتا، یا وہ قالین پر بیٹھ کر کاریگروں کو تعمیر کام کرتے ہوئے دیکھتا۔ یہ کام ایسا تھا جس میں حکم چلانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ فرانسیسی شاعر لامارتین[2] کے قلم سے اس محل کا ایک نہایت ابتدائی (۱۸۳۲ء) اور مفصل خاکہ ہمارے سامنے ہے۔ وہ لکھتا ہے:

---

ے ۱ حیدر رغر صفحہ ۹۲۹، ۹۳۵۔

ے ۲ جلد اوّل صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲۔

Marfat.com

"جو دروازہ محل کے حصۂ حرم کی جانب ہے، وہ مختلف رنگوں کی لکڑی سے بنایا گیا تھا، جو سنگِ مرمر میں نصب تھی اور اس پر عربی کتبے تھے۔ یہاں سیاہ فام غلاموں کی ایک قطار کھڑی تھی، جنھوں نے شاندار لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے پاس جو پستول تھے ان پر چاندی کے پتر ے چڑھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے دمشقی تلواریں لٹکا رکھی تھیں، جن میں سونا جھلک رہا تھا۔ محل کے سامنے جو وسیع ایوان تھے ان میں بھی ملازموں، درباریوں، پادریوں یا سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک نے قسم قسم کے خوش نما لباس زیبِ بدن کر رکھے تھے۔ ان میں لبنان کی مختلف آبادیوں کے نمائندے شریک تھے: مثلاً دروزی، مسیحی، ارمن، یونانی، مارونی اور متاولہ۔ پانچ یا چھ سو عربی گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ان پر زین کسے ہوئے تھے۔ انھیں لگامیں دے رکھی تھیں اور ان پر نہایت خوش رنگ جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔"

یہ ممتاز فرانسیسی سیّاح سن رسیدہ امیر کی عقل و دانش، روشن طبعی اور شاندار و پُر وقار اوضاع و اطوار سے مسحور ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ امیر نے اصرار کیا، میں خود مہمان کے ساتھ ہو کر محل کے حمّام دکھاؤں گا۔[1] عربی بولنے والا سیّاح ان اشعار سے بہ طورِ خاص متاثر ہوتا، جو خوبصورتی سے جگہ جگہ کندہ کیے گئے تھے۔ یہ اشعار بطرس کرامہ کے تھے، جن میں پُرانی مثلیں نظم کی گئی تھیں، مثلاً "عدل کی ایک ساعت ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔" "خدا اُس کو اجرِ خیر دیتا ہے، جو اس کے بندوں پر راست بازی سے حکومت کرتا ہے۔" اس عالی شان محل کا بانی، جو خود مختار فرمانروا کی حیثیت میں حکومت کر رہا تھا، اگرچہ برائے نام ترکی اقتدار کے ماتحت تھا۔[2] یقیناً اس کے دل میں موروثی حکومت قائم کر دینے کے عزائم پرورش پا رہے ہوں گے۔ بیروت میں سارڈینیا کے قنصل خانے کی طرف سے دالامرتین اور بشیر کے بیٹے کے لیے ضیافت کا اہتمام ہوا تھا۔ وہاں جامِ صحت بھی نوش کیا گیا۔ اس سے یہ آرزو بھی کی گئی تھی کہ ابراہیم پاشا کامیاب ہو، لبنان کو آزادی ملے، فرانسیسیوں اور عربوں کی دوستی استوار ہو۔[3] یہ فرانسیسی ادیب لبنان کے طبعی حسن سے اس درجہ مسحور ہوا کہ جس انداز میں اس نے مدح و ستائش کے گیت گائے، وہ کسی دوسرے یورپی کی زبان سے نہ سُنے گئے۔

---

[1] دالامارتین جلد اوّل صفحہ ۱۹۵۔ [2] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۹۷، چرچل، لبنان جلد سوم صفحہ ۲۱۲۔ [3] دالامارتین جلد اوّل صفحہ ۲۳۲۔

Marfat.com

اس کے نزدیک بیروت کی وہ پہاڑی، جس کا نام بار متری ہے، شام کی سب سے زیادہ دلآویز پہاڑی تھی، اور کارساز قدرت کی خلق کردہ چیزوں میں سے انسانی آنکھ حسن و جمال کے جن بہترین مناظر پر پڑی، ان میں سے ایک وادی حمّانا بھی ہے[51]

## ابراہیم پاشا شام میں

بشیر کی حکومت کے آخری دس سال میں لبنان بین الاقوامی منظر پر پہنچ گیا اور اس وقت سے لبنان کی پوزیشن میں کبھی فرق نہ آیا۔ یہ سیاستِ عالم کے چکر میں اُلجھ گیا اور صدی کے ایک تہائی حصّے تک خاص امتیاز و نمایاں رہا۔
یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب محمّد علی نے ۱۸۳۱ء میں فلسطین و شام کے راستے ترکی کے خلاف جنگی اقدام کیا۔ بشیر نے اپنی قسمت کا پانسا محمّد علی کے حق میں ڈال دیا۔ غالباً اس سلسلے میں پہلے سے کوئی مفاہمت ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ اس حالت میں ہوا کہ بہت سے دروزی شیخ سلطان کی طرفداری اختیار کر چکے تھے۔ والی مصر ان خدمات کے صلے میں شام کو اپنے صوبے میں شامل کرنا چاہتا تھا، جو اس نے یونان کے میدانِ جنگ میں سلطنتِ عثمانیہ کے لیے انجام دی تھیں (بہ سلسلہ جنگ آزادی یونان)۔ بالکل ایسی ہی خدمات عرب کے میدانِ جنگ میں وہابیوں کے خلاف انجام دی تھیں، جو نئے نئے اُبھر رہے تھے اور محمّد علی نے انھیں عارضی طور پر کچل دیا تھا۔

بشیر کے سرگرم تعاون کی بدولت ابراہیم کا کام بہت آسان ہو گیا۔ لبنانی فوجیں عکّہ، طرابلس، حمص اور دمشق کی دیواروں کے نیچے مصری فوجوں کے دوش بدوش لڑتی رہیں[52]۔ زحلہ کو مصری فوجوں کے لیے رسد و اسلحہ کا ذخیرہ بنا دیا گیا۔ ابراہیم نے نہایت تھوڑی مدّت میں دمشق پر قبضہ کیا۔ عثمانی فوج کو حمص میں شکست فاش دی اور کوہ طارس کو عبور کر کے وہ ترکی سرزمین کے قلب میں پہنچ گیا۔ قریب تھا کہ پوری سلطنتِ عثمانیہ پر کاری ضرب لگ جائے۔ تمام مفتوح شامی شہر بشیر کے بیٹوں کی فوجی حکومت کے حوالے کر دیے گئے۔ اس کا دوسرا بیٹا خلیل وا... کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ شام کی حکومت بشیر کو پیش[53] کی گئی تھی، مگر اس نے معذرت کی۔ اس ب... کارنامے میں فرانس ابراہیم (جو اپنے باپ کا فولادی بازو تھا) کی حوصلہ افزائی کرتا رہا، لیکن ۱۸۴۰ء میں انگلستان، آسٹریا اور روس نے اسے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلے میں

---

[51] دالامارتین جلد دوم صفحہ ۳۰، ۷۰۔ [52] مشاقہ صفحہ ۱۰۱ ببعد، حیدر، لبنان صفحہ ۸۲۳ ببعد، شدیاق صفحہ ۵۶۷، ۵۶۸۔ [53] اسد رستم، ذکری البطل الفاتح ابراہیم پاشا صفحہ ۱۱۳، ۱۱۹۔

Marfat.com

دست کشی کا سب سے بڑا حامی انگلستان تھا، جسے یہ خطرہ دامنگیر تھا کہ اگر ترکی درمیان سے نکل گیا تو ہندوستان تک انگلستان کا راستہ غیر محفوظ ہو جائے گا بلکہ ہندوستان پر قبضہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ محمد علی کا عزم یہ تھا کہ عربی سرزمینوں کی ایک سلطنت قائم کرے جس کا رئیس وہ خود ہو۔ یہ خواب پریشان ہو گیا۔ عوام نے اس کی حمایت نہ کی۔ دالامارتین کی رائے صائب تھی، یعنی یہ کہ مصر کی تقدیر دو سروں پر موقوف تھی۔ ایک محمد علی کا سر اور دوسرا اس کے بیٹے کا سر۔ وہ کہتا تھا کہ ان دو آدمیوں کو الگ کر دیا جائے تو مصر یا سلطنت عربیہ میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔[۵۱]

شام میں انتظامات کی عنان براہ راست مصریوں کے ہاتھ میں تھی۔ لبنان کا نظم و نسق بدستور بشیر کے حوالے رہا۔ شام میں ابراہیم پاشا نے بڑی شاندار اصلاحات کیں۔ اس نے مسیحیوں کو حکومت میں ذمہ داری کے عہدے حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ کہہ دیا کہ سفید پگڑیاں باندھو اور گھوڑے پر سوار ہو کر بے تکلف پھرو۔ پہلے یہ حق صرف مسلمانوں کو حاصل تھا۔ دمشق کے مسیحیوں نے مذہبی جلوس نکالنے شروع کیے۔ ۱۸۳۱ء سے پیشتر برطانوی قنصل دمشق میں سوار ہو کر نکلتا تو اس کے ساتھ فوج حفاظت کے لیے موجود ہوتی۔ اب وہ کسی محافظ فوج کے بغیر آزادانہ پھرنے لگا۔[۵۲] ابراہیم نے اپنے شامی معتمر مالیات حنا البحری کو "بے" کا منصب دے دیا۔ عثمانی سلطنت میں یہ پہلا مسیحی عرب تھا، جو اس منصب سے مشرف ہوا تا آنکہ مارونی اسلام چھوڑ بیٹھے تھے۔ ابراہیم نے اس واقعے سے چشم پوشی کی، لیکن دروزیوں کے قبول مسیحیت کو منظور نہ کیا۔ چار لبنانی دروزیوں کو "بے" کا منصب دیا گیا۔ ان میں سے ایک جمبلاط تھا، ایک ابونکد اور دو عماد۔[۵۳] ابراہیم کی پیروی کرتے ہوئے بشیر اور اس کے بیٹوں نے بھی پگڑیوں کی جگہ طربوش مغربی (ترکی ٹوپی) پہننی شروع کر دی، جس کا بھاری پھندنا ایک جانب لٹکتا رہتا تھا۔ بہت جلد یہی ٹوپی ملک میں رائج ہو گئی۔ مصریہ ایک چھوٹا سا مصری سکہ تھا، جو پارے کے برابر تھا اور چند سال پیشتر تک رائج رہا۔ یہ اس موقع پر رائج نہیں ہوا تھا جیسا کہ عموماً بیان کیا جاتا ہے بلکہ ابراہیم نے رائج کیا تھا۔[۵۴]

ابراہیم نے پہلے عوام کو ہمنوا بنانے کی کوشش کی، پھر اپنے والد کی ہدایات کے مطابق جس نے مصر کے تمام وسائل اپنے قبضے میں لے لیے تھے، محاصل تقریباً تگنے کر دیے۔ ساتھ ہی ریشم،

---

[۵۱] دالامارتین جلد اول صفحہ ۲۲۴۔ [۵۲] شام و فلسطین (ایک کتاب، جو وزارت خارجہ کے شعبۂ تاریخی کی طرف سے شائع ہوئی تھی) صفحہ ۷۲۔ [۵۳] رستم: ذکری صفحہ ۱۱۳، ۱۱۴۔ [۵۴] منجد صفحہ ۸۰۔

صابون اور دوسری ضروریاتِ زندگی کے متعلق حکومت کے اجارے قائم کر دیے۔ سب سے زیادہ مصیبت خیز فیصلہ یہ تھا کہ عوام کو غیر مسلح کرنے اور ان سے جبری فوجی خدمت لینے پر اصرار کیا۔ کوہستانیوں کے لیے آخری فیصلے سے بڑھ کر ذلت خیز چیز کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور اس سلسلے میں اس نے ابتدائی ضمانت کی بھی خلاف ورزی کی کہ ان کے حقوق کا احترام کیا جائے گا۔ بشیر نے نو ہزار جنگجوؤں سے اس کی امداد کی تھی اور ابراہیم مصر سے جو باقاعدہ فوج لے کر چلا تھا، یہ تعداد اس کا نصف تھی۔ بیگار سے کام لیتے ہوئے تزنائل کی کانوں سے کوئلہ نکالا گیا۔ اگرچہ یہ ذرا پست درجے کا تھا۔ لیکن اس حصے میں یہ بڑی قیمتی جنس تھی، جس طرح مرجبا میں خام لوہا بڑا قیمتی تھا۔ یہ دونوں مقام تین ہزار فٹ بلندی پر واقع ہیں اور وہاں کان کنی کے نشان اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان جنسوں کے علاوہ لکڑی مصریوں کے لیے یکساں گہری دلچسپی کی چیز تھی۔ فرعونوں کے زمانے کی طرح وہ اسے بھی حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے اور لکڑی کی انھیں بیڑا تعمیر کرنے کے لیے یا از سرِ نو تعمیر کرنے کے لیے ضرورت تھی، کیونکہ ان کا بیڑا یونانی جنگ میں تباہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ بیروت میں دیوداروں کا جو جنگل تھا، اس سے لکڑی کٹوائی گئی۔

ابراہیم نے جبری بھرتی پر اس لیے اصرار کیا کہ حالاتِ جنگ نے اسے مجبور کر دیا تھا اور اس کا عزم یہ تھا کہ قسطنطنیہ پہنچ جائے۔ یہ سلسلہ پہلے مسلمانوں سے شروع ہوا۔ بیروتی مسلمانوں نے یورپی قنصلوں یا غیر ملکی باشندوں کے ہاں پناہ لی یا وہ آس پاس کے ٹیلوں کے غاروں میں جا چھپے یا سمندر میں کود پڑے اور تیرتے ہوئے ان عمودی چٹانوں (الروشہ) پر پہنچ گئے جو سمندر سے دو سو فٹ بلند ہیں۔ مصری فوج نے تعاقب کیا تو وہ اُن چٹانوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے۔[لہ] دروزیوں نے بپتسمہ لے کر اس مصیبت سے محفوظ ہونے کی کوشش کی یا اعلان کر دیا کہ ہم پراٹسٹنٹ ہیں۔ مصری حکومت کے خلاف فلسطین میں جو بغاوت شروع ہوئی (۱۸۳۴ء) وہ نصیریوں کے علاقے، شمالی شام و حوران تک جا پہنچی۔ ۱۸۴۰ء میں لبنان بھی اس سے متاثر ہو گیا، جہاں پُشت ہا پُشت سے یہی دستور چلا آ رہا تھا کہ لوگ رضاکارانہ فوجی خدمات انجام دیتے تھے۔ جبری بھرتی ان کے نزدیک خلافِ دستور تھی۔ حوران کے دروزیوں کی سرکشی دبانے کے لیے (جس میں ابراہیم کو پندرہ ہزار مقتولین و مجروحین کا صدمہ اٹھانا پڑا) اس کے سات ہزار مسلح مارونی تھے، جن کی خدمات پر خوش ہو کر اس نے انھیں غیر معین مدت کے لیے پاس رکھنے کی اجازت دے دی تھی اور وعدہ

---

لہ ولیم ٹامسن لبنان، دمشق اور ماورائے اُردن (انگریزی) صفحہ ۱۱۰۔

کر لیا تھا کہ ان کے ملیے یا شخصی ٹیکس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔[1] ۱۸۴۰ء میں اس نے ان سے بھی ہتھیار لینے پر اصرار کیا اور دوسرے لوگوں کو بھی جن میں زیادہ تر اُن کے ہم مذہب تھے، مسلح کر دینا چاہا۔ حوران کے واقعے نے مارونیوں اور دروزیوں کے درمیان عداوت کا بیج بو یا تھا۔ لبنان میں بدامنی کی آگ کو انگریزوں[2] اور ترک کارندوں نے ہوا دے دے کر بھڑکا دیا۔ اس غرض سے روپیہ بھی استعمال کیا، ہتھیار بانٹے اور انعامات کے وعدے بھی کیے۔ ابراہیم نے ہر چند اپنے اور والد کے سر کی قسمیں کھا کھا کر اعلان کیے کہ ہتھیار لے لینے کا حکم ایک عارضی مصلحت پر مبنی ہے اور لوگوں سے جبراً فوجی خدمت لینا ہرگز منظور نہیں، لیکن یہ اعلان بالکل بے نتیجہ رہے۔[3] بشیر نے بھی انتباہ کیا کہ جو شخص اس برطانوی جہاز سے ہتھیار یا سامانِ رسد حکومت کی اجازت کے بغیر لے گا یا قبول کرے گا، جو بیروت میں لنگر انداز ہے تو اسے فی الفور موت کی سزا دی جائے گی۔ یہ انتباہ بھی غیر مؤثر رہا۔[4] ۸۔ جون ۱۸۴۰ء کو باغیوں ـــ دروزی، مسیحی، متاولہ اور مسلمان ـــ نے انطلیاس میں ایک مجلسِ شوریٰ منعقد کی۔ وہاں مار الیاس کے گرجے میں حلف اُٹھایا کہ کوئی بھی صورت پیش آ جائے، وہ ایک دوسرے سے وابستہ رہیں گے۔ ساتھ ہی ہم وطنوں کو دعوت دی گئی کہ وہ جابرانہ حکومت کے خلاف ہتھیار لے کر اُٹھ کھڑے ہوں اور عہد کر لیں کہ یا تو آزادی بحال کر کے رہیں گے یا جانیں دے دیں گے۔[5] یہ ایک اہم دستاویز ہے جو عوام (عامیہ) نے شائع کی۔ اس میں آزادی کی حمایت کرتے ہوئے ترغیب دی گئی کہ اس کے لیے فیصلہ کن جنگ کی جائے۔ اس جنگ میں فرانسیسی الخازن کو قائد چُنا گیا۔ یہ باغی گروہ متواتر مصری فوج میں ہراس پیدا کرتے رہے۔ جو رسد ان کے لیے بھیجی جاتی تھی، اسے لوٹ لیتے اور جہاں موقع پاتے ان کے خلاف لڑتے۔ تھوڑی مدت میں بغاوت نے خوفناک شکل اختیار کر لی۔ اس اثنا میں انگریزوں، آسٹریوں اور ترکوں کا ملا جلا بیڑا بیروت پر حملہ آور ہوا، جو مصریوں کی جنگی کارروائیوں کا مرکز تھا اور جونیہ میں فوج اتار دی۔ مجیدیہ مسجد کے در و دیوار میں بم باری کے نشانات اب تک موجود ہیں۔

برطانیہ کی وزارتِ خارجہ کے الفاظ میں: "(پانچ طاقتوں کا) مقصد یہ ہے کہ ترکی سلطنت کی سالمیت بحال رہے اور وہ نفس بہ حق اس بنا پر حاصل ہے کہ سالمیت یورپ میں توازنِ قوت قائم رکھنے کے لیے

---

[1] لیکینو ورینت کی فرانسیسی کتاب جلد اول صفحہ ۵۰۹، ابیرت: آرمیگناک کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۲۳۲، ۲۳۳، قسطنطین الباشا مذاکرات تاریخیہ صفحہ ۱۵۰۔ [2] سرکاری دستاویزوں کے لیے ملاحظہ فرمائیے معاملاتِ لیوانت کے متعلق خط و کتابت حصہ دوم صفحہ ۳۰۲، ۳۰۳۔ [3] ویتستا جلد سوم صفحہ ۳۷۔ [4] ایضاً ایضاً صفحہ ۸۳۔ [5] فلیپ اور فریدالی زن: مجموعۃ المحررات السیاسیہ والمفاوضات الدولیہ جلد اوّل صفحہ ۵۰۲، ویتستا جلد سوم صفحہ ۶۲-۶۷۔

Marfat.com

ضروری اور امنِ عالم کی حفاظت کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔[1] ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۰ء کو بشیر انگریزوں کے پاس پہنچ گیا اور اسے کہہ دیا گیا کہ شام و فرانس کے سوا جہاں چاہے، مقیم ہونے کا فیصلہ کرلے۔ چنانچہ ہفتاد سالہ امیر مالٹا کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کی ۲۳ سالہ بیوی، تین بیٹے، پوتے، اس کا معتمد اور درباری شاعر بطروس کرامہ اور ستر کے قریب ملازم ساتھ تھے۔ بیوی اصلاً چرکسی تھی اور قسطنطنیہ کے بازار بردہ فروشی میں خریدی گئی تھی۔ تھیلیوں میں بھرا ہوا سونا اور نقد و جواہر بھی ساتھ تھے۔ گیارہ مہینے مالٹا میں گزار کر وہ قسطنطنیہ چلا گیا۔ وہیں ۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔[2] ۱۹۴۷ء میں اس کی نعش قسطنطنیہ سے قصر بیت الدین کے باغ میں منتقل کی گئی، جس کے ساتھ اسے بہت محبت تھی۔ اس محل کا ایک حصہ آج کل عجائب خانہ ہے اور ایک حصہ صدر جمہوریہ لبنان کی گرمائی قیام گاہ ہے۔ بوڑھے اب تک لبنانی آتشدانوں کے سامنے بیٹھے ہوئے بشیر کبیر کے کردار اور کارناموں کی ستائشی کہانیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کو سناتے ہیں۔

بشیر کی حکومت ختم ہونے کے بعد کچھ مدت تک بدنظمی اور ہنگامہ جوئی قائم رہی۔ امیروں کا دور ختم ہوا۔ لبنان ایک داخلی خود مختار متصرفیہ بن گیا، جسے تمام حکومتوں نے قبول کرلیا۔

## بیروت کی سرکردگی

مصری تصرف کے عشرۂ مختصرہ نے شام کے دروازے یورپی مداخلت کے لیے کھول دیے۔ اب بیروت نے تمام بندرگاہوں میں سب سے نمایاں حیثیت حاصل کرلی، جسے اس نے اب تک قائم رکھا ہے۔ یہیں تمام ملکوں کے قنصل رہتے تھے۔ یہی مقام فرانسیسی، امریکی اور برطانوی مشنوں کا مرکز تھا۔ یہی تجارت و صنعت کا ترقی مرکز قرار پایا۔ یورپی، شامی اور کوہستانی سب یہاں کھچے چلے آنے لگے۔ بہت جلد اس کی آبادی آٹھ ہزار سے بڑھنے لگی، یہاں تک کہ قرونِ وسطیٰ کی خستہ و شکستہ فصیلوں سے بھی باہر نکل گئی۔ ۱۸۳۱ء سے پہلے کسی یورپی عورت کا سبز لباس پہن کر برسرِ عام آنا بڑے حوصلے کا کام سمجھا جاتا تھا اور کوئی شریف آدمی گھر کے دروازے سے باہر کسی عورت کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے متامل ہوتا تھا۔ سبز رنگ کو رسول اللہ صلعم کا خاص رنگ سمجھا جاتا تھا۔ پہلے صرف چند متفرق یورپی یا لیوانتی یورپی لباس میں نظر آتے تھے اور وہ بھی زیادہ تر اپنے کارخانوں یا دکانوں کے دروازوں پر دیکھے جاتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی فرنگی عورت، کسی قنصل یا تاجر کی بیوی ایک مکان سے دوسرے مکان تک ڈرتی اور سہمی ہوئی جاتی تھی۔ اب فرا

[1] معاملات لیوانت کے متعلق خط و کتابت حصہ اول صفحہ ۲۲۴۔

[2] حیدر غُرر صفحہ ۱۰۴۹، ۱۰۵۰۔

Marfat.com

مرد و زن بے تکلف پھرنے لگے۔ انیسویں صدی کے عشرۂ پنجم میں بیروت کے اندر رہنے والے فرنگی خاندانوں کی تعداد ایک سو پر پہنچ گئی [1] پہلے یورپ سے کوئی جہاز آتا تھا تو اس کا استقبال شادمانی و استعجاب سے یوں کیا جاتا تھا، جیسے کوئی خاص واقعہ پیش آگیا۔ اب ان جہازوں کی آمدورفت ایک عام واقعہ بن گئی۔ صرف برطانوی [2] پرچم اڑاتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو جہاز سالانہ یہاں پہنچنے لگے۔ شہر میں ایک بازار صرف فرنگیوں کے لیے مخصوص ہوگیا جس میں یونان، آئی اونیا، مالٹا اور اٹلی کے باشندوں نے دکانیں کھول لیں۔ عام حماموں میں فرنگیوں کے نہانے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ اطالویوں اور یونانیوں نے ہوٹل (عربی لوکندہ، جو اطالوی لفظ لوکندا [3] سے بنا) کھول لیے۔ اطالوی اس حلقے کی عام زبان ہوگئی، لیکن بہت جلد فرانسیسی نے اس کی جگہ لے لی۔ بعض عربی کنیوں کے ناموں پر غور کرو، مثلاً باسیلا، ایلا، پینی، بالی، کا تسغایس یہ آبادی کے اختلاط و امتزاج کی شہادت دے رہے ہیں۔ راتوں کے وقت کھیل ہونے لگے، داستان سراؤں نے عنتر، صلاح الدین اور بیبرس کے کارنامے ڈراموں کی شکل میں پیش کیے۔ علاوہ بریں تفریحات کے نئے نئے سامان جمع ہوگئے۔ مثلاً بعض لوگ مجیرے، کھڑتال اور طنبور بجاتے۔ مصر سے رقاصائیں آگئیں، جن کی نگاہیں شعلہ ریز تھیں۔ چہروں پر غازہ ملا ہوا اور آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ تفریح پسند لوگ ہوٹلوں میں بیٹھ کر قہوہ پیتے یا نارجیل (حقّہ) کے کش لگاتے اور مذکورہ بالا تفریحات سے حظ اٹھاتے۔ مشرق قریب میں قہوہ خانوں کی تفریح امریکہ کے طلبہ کے لیے مخصوص تھی۔

طرابلس کی آبادی سات ہزار تھی [4] اور وہاں فرانسیسی قنصل کے علاوہ صرف ایک فرانسیسی مقیم تھا۔ عیدا میں سابقہ شوکت و عظمت کا نشان تک موجود نہ تھا۔ صور ابھی قرون وسطیٰ کے خواب سے بیدار نہیں ہوا تھا، لہٰذا بیروت کے ساتھ مقابلے کا سوال ہی خارج از بحث نظر آتا تھا۔ ان تمام شہروں میں مسیحی عورتیں بھی مسلمان عورتوں کی طرح نقاب اوڑھتیں اور منظر عام سے مستور رہتیں لیکن بیروت میں نقاب تیزی سے غائب ہو رہا تھا [5] گھروں کے اندر عورتوں کی تفریح یہ تھی کہ رومی مصطگی چبائیں اور نارجیل پئیں۔ خیال یہ ہے کہ جب تک نئی دنیا (امریکہ) سے تمباکو

---

[1] ایف۔ اے نیل Memoirs of the Pa...y Stoll Hole: صفحہ ۲۴۷، ۲۴۸ [2] Fine Years in Syria Palestine and Asia Minor مصنف ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۰ء تک خدمات انجام دیتا رہا، جلد اول صفحہ ۲۴۷ [3] Locanda [4] نیل جلد اول صفحہ ۲۴۹

[5] ایضاً ایضاً صفحہ ۲۵۰

Marfat.com

نہیں پہنچا تھا تو کوئی مقامی جنس حقّے میں استعمال کی جاتی تھی۔

## ابتدائی دور کے انگریز باشندے

مغربی یورپ کی فرمیں بیروت میں قدم جمانے لگیں۔ ان میں سے ایک جیمز باربک کی فرم نے دیانت اور اعلیٰ کاروباری اصول کا ایسا بلند معیار قائم کر لیا کہ انگریزی قول (کلمہ انکلیزیہ) باعزت کاروبار[۱] کا مترادف بن گیا۔ ایک فرانسیسی خاتون پورتلس[۲] نے ۱۸۴۱ء میں مقام بناتر ریشم کا کارخانہ قائم کیا۔ پھر ایک سکاٹ نے شملان میں ایک اور کارخانہ بنا لیا۔ یہ اپنی نوعیت کی ابتدائی کارگاہیں تھیں۔ ریشم کے کیڑے پالنے کا پیشہ لبنانی کسانوں کے لیے پہلی جنگِ عظیم تک روزی پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ بناتر کے نیچے وادی میں اور شملان کے پیچھے ایک برطانوی کارندے نے اقامت اختیار کر لی، جو ابراہیم پاشا کو شام و لبنان سے نکالنے کی مہم کے ساتھ افسر بن کر آیا تھا۔ اس کا نام چارلس ہنری چرچل تھا، جسے عربوں نے شرشرلے بنا لیا۔ یہ شہرۂ آفاق انگریز سالار (ڈیوک آف مارلبرو) کے خاندان سے تھا۔ اس نے دیسی سرپند اور عبا اختیار کر لی۔ بحوارہ میں ایک سکول کھولا اور حلب کی ایک خاتون سے شادی کر لی، جو شہابی خاندان سے تھی اور ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ اس نے دروزیوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے اور بہت جلد پورے علاقے میں دروزیوں کا معتمد علیہ بن گیا۔ اس نے دو تصنیفیں چھوڑیں[۳]، جن سے ۱۸۴۰ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان لبنان کا معاشرہ اور تاریخ روشنی میں آئے۔

۱۸۱۰ء میں پہلے لارڈ چیتھم کی ۳۴ سالہ نواسی ولیم پٹ (وزیر مالیات انگلستان) کی بھانجی اور پرائیویٹ سکرٹری محبت میں ناکام رہ کر مشرق میں سیر و گردش کے لیے روانہ ہوئی۔ آخر اس نے جون کی خاموش فضا میں اقامت اختیار کر لی۔ یہ مقام صیدا کے شمال میں تقریباً آٹھ میل پر ہے۔ اس خاتون کا نام ہیسٹر سٹینہوپ[۴] تھا۔ جون میں اس نے ایک پہاڑی پر قلعہ نما بنگلا بنا لیا، جس کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ساتھ ایک عالیشان باغ تھا۔ اس نے دیسیوں کا سا لباس اختیار کر لیا۔ سر پر پگڑی باندھتی اور مڑی ہوئی نوک والے جوتے پہنتی۔ لمبا پائجامہ پہنتی۔ ہاتھ میں چابک یا خنجر رکھتی۔ البانویوں کا ایک محافظ دستہ اسے گھیرے رہتا۔ حبشی غلام

---

۱؎ دیکھیے جلیبپ صفحہ ۹۴، تیبل جلد اول صفحہ ۲۴۵۔ ۲؎ Fortune Fortolis۔ ۳؎ کرنل چرچ ماؤنٹ لبنان، تین جلد، A Ten Year's Residence، The Druzes & Maronites۔

۴؎ آئن بروس کی کتاب The Nun of Lebanon صفحہ ۲۹ بعد۔ ۵؎ Hesterstan hope

Marfat.com

بھی ایک عملہ ساتھ تھا، جو اس خاتون سے بادشاہوں کا سا برتاؤ کرتا۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے اسے بارہ سو پونڈ سالانہ پنشن ملتی تھی۔ اس نے عربی پڑھی۔ ہیئت و کیمیا کی کتابوں کا مطالعہ کیا، جن کے متعلق کہا کہ یورپ سے یہ دو علم گم ہو چکے ہیں اور قافلے ساتھ لے کر بعلبک، تدمر اور فلسطین بھی گئی۔ صحرائے شام کے عربوں نے اس خاتون کی عظمت، سخاوت اور بلند کرداری سے مسحور ہو کر اسے ملکۂ تدمر مان لیا۔ آس پاس کے دیہات پر جن میں زیادہ تر دروزیوں کی آبادی تھی، اسے پورا اختیار حاصل تھا۔ ابراہیم پاشا نے حملے کا منصوبہ تیار کیا تو لیڈی سٹینہوپ سے غیر جانبدارانہ رہنے کی درخواست کی۔ ابراہیم کے خلاف دروزیوں کو ابھارنے میں اس خاتون[۱] کا بھی ہاتھ تھا۔

اس کے جاسوس شام و لبنان کی حکومتوں کے مرکزوں میں متعین تھے۔ وہ پاشاؤں اور شیخوں سے ساز باز کرتی رہتی۔ بشیر اور دوسرے امیروں سے اس کی باقاعدہ خط و کتابت تھی، لیکن وہ اپنے ہم قوموں سے ملاقات پر راضی نہ تھی اور عورتوں کا آنا بھی اسے ناخوشگوار گزرتا تھا۔ بعض اوقات قنصلوں اور سالاروں سے بھی نفرت کا برتاؤ کرتی۔ افسروں کو زدوکوب کرنے میں بھی متامل نہ ہوتی۔ قرض خواہوں کو چکمے دیتی اور ان کے قابو میں نہ آتی[۲]۔ دالامارتین (۱۸۳۲ء) نے اس سے ملاقات کی تھی، جس میں بڑے عجیب انکشافات ہوئے۔ یہ عجیب خاتون تھی۔ اس کے پاس ایک عربی گھوڑی تھی، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ زین ساتھ لے کر پیدا ہوئی ہے، یعنی اس کے کندھوں کے درمیان تھوڑا سا جھکاؤ تھا اور دونوں جانب رکاب کی مانند گوشت بڑھا ہوا تھا۔ وہ کہتی تھی، یہ مسیح موعود کی سواری ہے۔ بہر حال ایک معاصر امریکی مشنری کے قول کے مطابق اس کے جنونی افکار کی کوئی حد و نہایت نہ تھی۔ اس گھوڑی کے پاس اصطبل میں چراغ برابر روشن رہتا۔ اسے شربت پلایا جاتا اور دوسری لذیذ چیزیں کھلائی جاتیں۔ لیڈی سٹینہوپ نے ۱۸۳۹ء میں وفات پائی۔ اس وقت کوئی یورپی اس کے پاس نہ تھا اور وہیں اسے دفن کر دیا گیا۔ بہت جلد اس کی قبر کی زیارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو فرنگی سیاح آتا، وہ اس کی قبر پر ضرور پہنچتا۔ ربع صدی پہلے برطانوی حکومت اس کے ساتھ لیوانتی قنصل مقیم قبرص کے ذریعے سے برائے نام تعلق رکھتی تھی[۳]۔

**اصلاحات کی کوشش**

شام و لبنان پر مصریوں کا قبضہ سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء۔ ۱۸۳۹ء) کے عہدِ حکومت کا واقعہ ہے۔ وہ ان تین بہادر

---

۱۔ Memoirs of Lady Stanhope، جلد سوم صفحہ ۶۳، ۷۶۔ ۲۔ جلد اول صفحہ ۱۶۴، ۱۸۷۔

۳۔ تاریخ لبنان (انگریزی) صفحہ ۱۷۔

Marfat.com

سلطانوں میں سب سے بیٹا تھا، جنھوں نے نظام اصلاحات (تنظیمات) کی سرپرستی کی۔ باقی دو سلطانوں میں سے ایک سلیم ثالث تھا اور دوسرا خود محمود کا بیٹا عبدالمجید اول[1]۔ محمود نے اس وقت بڑی نمایاں قومی خدمت انجام دی، جب جون ۱۸۲۹ء کی ایک قابل یادگار صبح کو حکم دے دیا کہ توپوں کا رُخ اُن بارکوں کی طرف پھیر دیا جائے، جہاں ینی چری جمع تھے اور انھیں کاملاً تباہ کر دیا جائے۔ یہ سرکش فوج ترقی کے راستے میں خوفناک رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ سلطان اور وزیر اس کی مرضی کے مطابق بنتے اور معزول ہوتے۔ سلیم ثالث اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ فوجی اصلاحات کے علاوہ محمود ثانی نے نظم ونسق کا ڈھانچا بھی از سرِ نو ترتیب دیا۔ طبی اور دوسرے سکول کھولے، جن میں یورپ کے ماہرین سے کام لیا اور اناطولیہ میں جاگیرداری کا نظام توڑ کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ یہی پہلا سلطان تھا، جس نے سرخ فیض[2] (طربوش[3]) پہنی۔ پھر یہ پوری رعایا میں پھیل گئی اور مراکش سے انڈونیشیا تک مسلمانوں کے قومی لباس کا جزو بن گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ رعایا نے محمود کو گبر کا لقب[4] دیا۔ مصطفیٰ کمال نے دوسری مجلسی اصلاحات کے ساتھ فیض کو بھی منسوخ کر دیا۔

---

۱ عثمانی سلاطین کا شجرہ

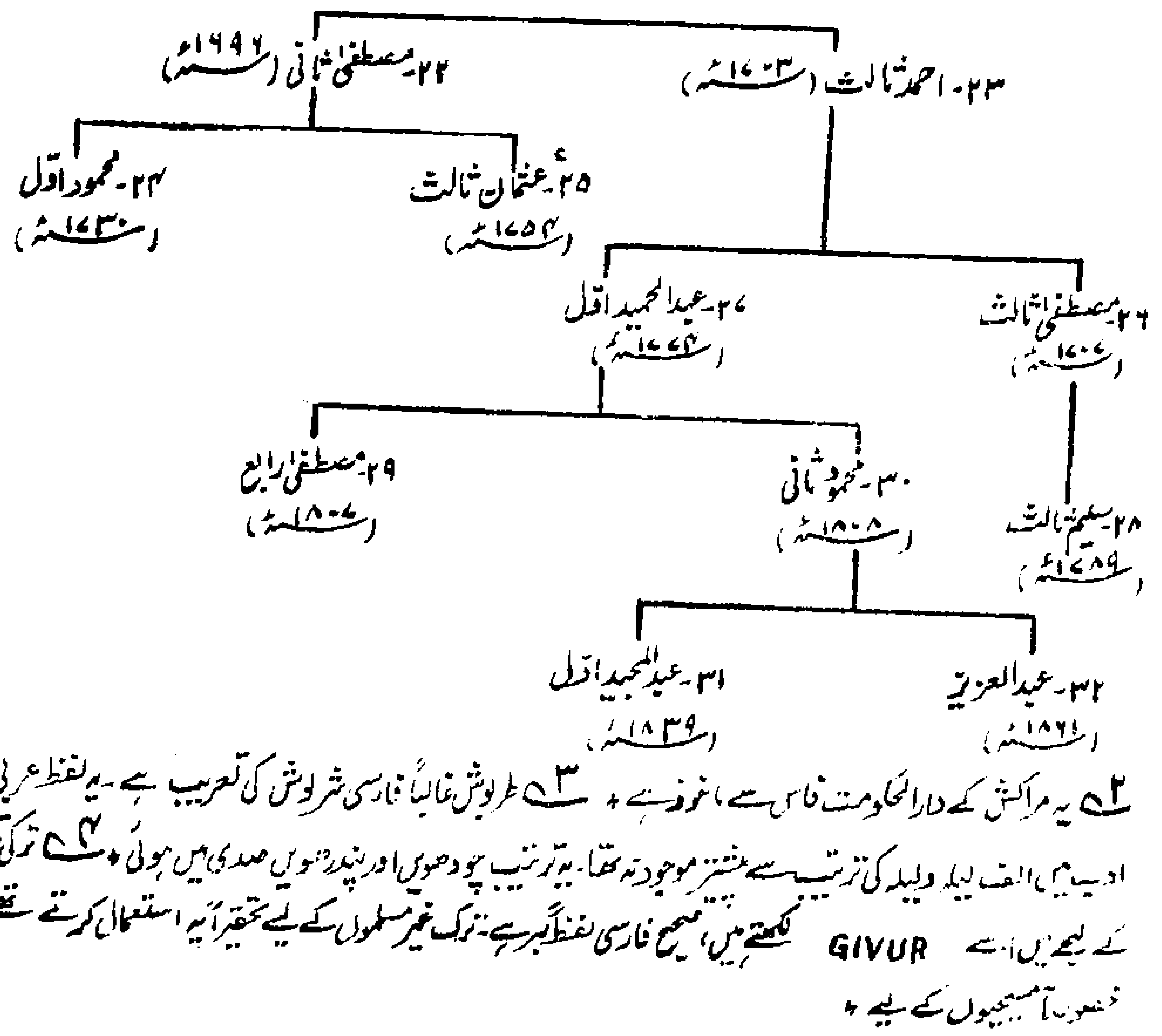


۲ یہ مراکش کے دارالحکومت فاس سے ماخوذ ہے۔ ۳ طربوش غالباً فارسی سرپوش کی تعریب ہے۔ یہ لفظ عربی ادب میں الف لیلہ ولیلہ کی ترتیب سے بیشتر موجود نہ تھا۔ یہ ترتیب چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہوئی۔ ۴ ترکی لفظ کے لیے یہ اسے GIVUR لکھتے ہیں، صحیح فارسی لفظ گبر ہے۔ ترک غیر مسلموں کے لیے تحقیراً یہ استعمال کرتے تھے خصوصاً مسیحیوں کے لیے۔

Marfat.com

سلطانوں میں سے سلیم ثالث (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء) پہلا شخص تھا جس نے اصلاحی تحریک جاری کی اور اٹھارھویں صدی کے سلطانوں میں سے وہی تھا، جسے تنظر بندی سے سابقہ نہ پڑا۔ وہ فرانسیسی ثقافت کا بڑا شیدائی تھا۔ نپولین نے اس کی سلطنت پر حملہ کیا تو یقیناً اسے سخت جھٹکا لگا ہوگا۔ سلیم کے "نظام جدید" میں مالی اور فوجی دونوں اصلاحیں شامل تھیں۔ یہی نظام آئندہ اصلاحات کے لیے نمونہ بنا۔ ینی چریوں، رشوت خور افسروں اور رجعت پسند گروہوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ عبد المجید اوّل (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء) نے "گلخانہ" کے "خطِ شریف" (۱۸۳۹ء) اور "خطِ ہمایوں"[1] (۱۸۵۶ء) میں سابقہ فرامین کی توثیق کی اور ان کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔ ان کا مدّعا یہ تھا کہ بلا لحاظ مذہب و نسل رعایا کے تمام افراد کی جان، مال اور آبرو کی یکساں حفاظت کی جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ہر شخص کو بلا مقدمہ سزا دینے کی ممانعت ہوگئی۔ جبری تبدیلی مذہب ممنوع قرار دیا گیا۔ سرکاری ملازمت کے دروازے سب پر کھل گئے۔ مسیحیوں کو فوج میں عہدے ملنے لگے۔ البتہ انھیں اجازت تھی کہ بھاری رقمیں بہ طورِ جرمانہ ادا کر کے خدمت سے مستثنیٰ ہو جائیں۔ رعایا صدیوں سے جن پابندیوں میں جکڑی چلی آتی تھی، وہ سب دُور کر دی گئیں۔ عشر اور محاصل کی اجارہ داری کے نظام کی بھی اصلاح ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلطانی فرمان نے کوئی ضروری چیز چھوڑی نہ تھی۔ البتہ اس پر عمل پیرائی باقی تھی۔ تمام تنظیمات کے سلسلے میں یہ مسئلہ غور طلب تھا۔ مجلسی نظام پر ان تنظیمات کا اثر بہت تھوڑا پڑا۔ ایک تو ان پر عمل پیرائی کے ضوابط متعیّن نہیں ہوئے تھے، دوسرے یہ سب چیزیں قبل از وقت تھیں۔ صدیوں کا جمود ان کے خلاف تھا۔ قدامت پسند علما ان کے مخالف تھے، جو اجنبی امتیازی حقوق سے مستفید تھے، وہ انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ یہودی اور مسیحی صرّاف ان کے بعض پہلوؤں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے تھے۔ کیتھولک اور آرتھوڈکس پادریوں کو یہ نظر آیا کہ ان تنظیمات پر عمل پیرائی سے ان کا اختیار گھٹ جائے گا اور ان کی آمدنی کم ہو جائے گی۔ مزید براں جو سلطان اور وزیر ان تنظیمات کے حامی تھے، ان کی غرض بھی ایک حد تک محض سیاسی تھی، یعنی وہ چاہتے تھے کہ اگر کوئی بین الاقوامی پیچیدگی پیدا ہو تو ان تنظیمات کو حربے کے طور پر استعمال کر سکیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس زمانے میں یہ تنظیمات مرتّب ہوئیں، سلطنت تیزی سے زوال کی طرف جا رہی تھی۔ اس میں محض داخلی کمزوری

---

[1] اس کے متن کے لیے دیکھیے احمد لطفی کی کتاب "تاریخ" جلد چہارم صفحہ ۶۱، ۴؛ نیز انور ضیا کی ترکی تاریخ صفحہ ۲۶۶، ۲۷۲، دیتستا جلد پنجم صفحہ ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۴۰، ۱۴۳، ایڈورڈ ہرٹسلیٹ The Map of Europe by Treaty جلد دوم صفحہ ۱۰۰۲، ۱۰۰۵، ۱۲۴۳، ۱۲۴۹+

ہی نہیں، خارجی دباؤ بھی کارفرما تھا اور یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ آیا یہ تنظیمات عثمانی معاملات میں یورپیوں کی مداخلت کو روکنے کے لیے تجویز ہوئی ہیں یا اصل مدعا یہ ہے کہ ایک زوال پذیر سلطنت کو حب وطن کے نئے تصور اور مساوی شہریت کے ساتھ مستحکم کر کے تجدید کے راستے پر لگا دیا جائے۔

زاروں کا روس اس زمانے میں سلطنت عثمانیہ کے یونانی آرتھوڈکسوں کا محافظ بنا بیٹھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر فرانس، جو کیتھولک کلیسا کی سب سے بڑی بیٹی ہونے کا مدعی تھا، باب عالی کی کیتھولک رعایا کا محافظ بن سکتا ہے تو روس، جو سب سے زبردست آرتھوڈکس قوت ہے، کیوں اپنے ہم مذہبوں کے سلسلے میں وہی خدمت انجام نہیں دے سکتا؟ فرانس اور روس کا اثر توڑنے کے لیے برطانیہ عظمیٰ کو ایک بہانے کی تلاش تھی اور وہ دروزیوں نے مہیا کر دیا۔ دروزیوں نے اپنی حفاظت کے لیے اسی طرح لندن کی طرف نگاہیں اٹھانا شروع کیں، جس طرح کیتھولک پیرس کو دیکھ رہے تھے۔ کوچاک کینرجی کے معاہدے میں (۱۷۷۴ء) ترکی نے جس حد درجہ ذلت خیز دفعہ پر دستخط کیے، وہی تھی، جس کے مطابق روس کو اس کا مطلوبہ حق دے دیا گیا۔ اس دفعہ پر روس نے نہ صرف سختی سے عمل شروع کیا بلکہ مطالبہ پیش کر دیا کہ اسے مسیحی مقامات مقدسہ کا محافظ تسلیم کر لیا جائے۔ اسی پر جنگ کریمیا شروع ہوئی (۱۸۵۳ء-۱۸۵۶ء)۔ اس میں ترکی کے ساتھ اس کے حلیف یعنی فرانس، برطانیہ اور سارڈینیا بھی شریک ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں زار نے انگلستان کے سامنے ترکی کی تقسیم کی تجویز پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ترکی یورپ کا مرد بیمار ہے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک زاروں کا روس اس مسلک پر کاربند رہا کہ ترکی کے متصلہ حصوں پر اسے اقتدار حاصل ہو جائے۔ بعض اوقات وہ مغربی طاقتوں سے "شریفانہ معاہدے" کے لیے بھی تیار ہو گیا، جس کے مطابق سلطنت کے جنوبی حصے ان کے حوالے کرنے پر آمادہ تھا، تاکہ ایک دوسرے کے دائرے میں مداخلت نہ کی جائے۔ ایک اور استعماری طاقت بھی ترکی کی ہمسایہ تھی یعنی آسٹریا اور ہنگری کی سلطنت۔ اسے بھی علاقوں کے الحاق سے دلچسپی تھی۔ دو باقی استعماری سلطنتیں نام نہاد مشرقی مسئلے سے خاص تعلق رکھتی تھیں، جو دراصل مغربی مسئلہ تھا اور اس کا مدعا یہ تھا کہ عثمانی سلطنت میں اثر و رسوخ بڑھایا جائے۔ یہ فرانس و برطانیہ تھے۔ دونوں اپنے مخصوص اقتصادی اور بحری مصالح کے محافظ تھے۔ ظاہر ہے کہ ترکی سلطنت کو خاص حربی اہمیت حاصل تھی۔ یہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان خشکی اور تری کے

Marfat.com

راستوں پر واقع تھی۔ اور یہی راستے تھے۔ جنھیں زندگی کے راستے سمجھا جاتا تھا۔ اور جو ان سلطنتوں کی منڈیوں نیز مشرقی افریقہ، ہندوستان اور مشرق بعید کے مقبوضات کو ملاتے تھے۔

تنظیمات بالعموم غیر مؤثر ثابت ہوئیں۔ اس اثناء میں چند تجارتی اور بحری ضوابط جاری کیے گئے۔ جو قابلِ قبول ثابت ہوئے وجہ یہ تھی کہ یہ ضوابط قانونِ شریعت کو تقویت پہنچاتے تھے۔ اس کے خلاف نہیں جاتے تھے۔ نیز وہ طاقت در مفاد پرستوں کے مقاصد سے مزاحم نہ تھے۔ اب تک قانونِ شریعت کم از کم نظری اعتبار سے برتر سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ احساس پیدا ہوا کہ جو ضوابط سا تویں صدی مسیحی میں تیار ہوئے تھے۔ ان میں دورِ حاضر کے کاروبار، صنعت و حرفت اور تجارت کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں عبدالمجید اول نے ایک ضابطہ تجارت جاری کیا۔ آٹھ سال بعد ایک ضابطۂ تعزیرات نافذ ہوا۔ یہ دونوں یورپی ضابطوں پر مبنی تھے۔ خصوصاً فرانسیسی نمونہ پیش نظر رکھا گیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں بحری تجارت کا ضابطہ جاری ہوا۔ یہ بھی فرانسیسی نظام پر مبنی تھا۔ اس کی تنفیذ کے سلسلے میں خاص عدالتیں قائم کر دی گئیں، جو قاضیوں کی مذہبی عدالتوں سے الگ تھیں۔ ۱۸۷۶ء میں ایک سول ضابطہ تیار ہوا، جسے "المجلہ"[1] کہتے تھے۔ یہ پورے کا پورا شرعی قانون کے اصول و ضوابط پر مبنی تھا۔ "مجلہ" شام و لبنان میں حکمرانیوں کا دور شروع ہونے تک جاری رہا۔

---

[1] متن اور شرح کے لیے دیکھیے شرح مجلۃ الاحکام العدلیۃ مرتبہ محمد السحاسلی تین جلدیں، ہو پر۔
جلد اول CIVIL LAW OF PALCSTINE AND TRANS JORDAN ؛

# اُنیسواں باب

# بد نظمی کے بیس سال

## نزاع و کشمکش کا دور

اُنیسویں صدی کے وسط میں لبنان فتنہ و فساد اور نزاع و کشمکش کی دلدل میں گردن تک غرق تھا۔ اس کی طویل اور بوقلموں سرگزشت میں یہ سب سے بڑھ کر ناخوشگوار دور تھا۔ فرقہ وار نزاع نے، جو تاراج کے قریب پہنچی ہوئی تھی، دروزیوں اور مسیحیوں کے درمیان تین لڑائیوں کی شکل میں ظہور کیا۔ پہلی ۱۸۴۱ء میں، دوسری ۱۸۴۵ء میں اور تیسری ۱۸۶۰ء میں۔ یہی زمانہ ہے، جس میں لبنان کے اندر مقامی امیروں کی حکومت کا اختتام اور متصرفیہ کا آغاز ہوا، یعنی عثمانی گورنر (متصرف) پانچ یورپی طاقتوں کے اتحاد و مشورہ سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا۔

اشتعال پذیر عناصر سالہا سال سے نشوونما پا رہے تھے۔ دروزیوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ بشیر نے مقامی جاگیرداروں کے اقتدار کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اس کے فرزند خلیل کے خلاف غیظ و غضب کا سبب یہ ہوا کہ جب ہم مذہب دروزیوں نے حوران میں بغاوت کی تو اسے کچلنے کے لیے بیرونی فوجوں نے بھی مدد دی۔ پھر دروزی علاقے میں مسیحیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اور ان کا وقار بھی بہت اونچا ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں برطانیہ کسی مناسب دائرۂ اثر کی تلاش میں تھا اور مغربی کارندے لبنان کی دو بڑی آبادیوں (مسیحیوں اور دروزیوں) میں فتنہ پیدا کر رہے تھے۔ محمود ثانی نے یہ نئی پالیسی اختیار کی تھی کہ براہِ راست حکومت کی جائے اور تمام اختیارات سلطان کے ہاتھ میں چلے جائیں۔ صورتِ حال کی خرابی سے فائدہ اٹھایا گیا اور ایک عنصر کو دوسرے کے خلاف انگیخت دے دی گئی۔ بڑی طاقتوں کی رقابتوں نے لبنان کے مختصر اور بے یار و مددگار خطے کو بین الاقوامی سیاسیات کے اکھاڑے میں پہنچا دیا اور یہاں کے سادہ مزاج عوام کو سلطانی فوجوں کے رحم پر چھوڑ دیا۔

اُنیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں کوہستانی علاقے کے اندر مختلف قسم کی داخلی لڑائی

تسلسل کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ دروزی دروزیوں سے لڑ رہے تھے اور مسیحی مسیحیوں سے وجہ نزاع یہ کہ فلاں قیسی ہے یا یمنی، یزبکی ہے یا جنبلاطی۔ اس سلسلے میں صف بندی کی بنیاد جاگیردارانہ اور فریق وارانہ تھی، مذہبی اور فرقہ وارانہ نہ تھی۔ جو سیاح اور شاہد اس زمانے میں پہنچے وہ بالاتفاق اس روح یگانگی کا ذکر کرتے رہے، جو دروزیوں اور مسیحیوں کے تعلقات کا نمایاں پہلو تھی۔[1] ۱۸۴۰ء میں دروزیوں اور مارونیوں نے ابراہیم پاشا کے خلاف متفقہ اعلان پر دستخط کیے تھے اور آٹھ سال بعد دالامارتین کو یہ لکھنے کا موقع مل گیا تھا کہ کوہستانِ لبنان کے دامن میں امن و قناعت سے اپنے کاموں میں مشغولیت کا جو نقشہ نظر آتا ہے، وہ سیاح کو سکاٹ لینڈ، سیوا اور سوئٹزرلینڈ میں نظر نہیں آ سکتا۔ حالانکہ لبنان میں ہمیں صرف بربریوں سے ملاقات کی توقع تھی[2]۔

## پہلی شورش

بشیر ثانی کی معزولی پر باب عالی نے بشیر ثالث (۱۸۴۰ء۔۱۸۴۲ء) کو نغر کر کے اپنا اقتدار براہِ راست قائم کر لیا۔ بشیر ثالث ایک شہابی مسیحی تھا اور اسے امیر جبل دروز قرار دیا گیا تھا۔[3] اس بشیر نے ابراہیم کے خلاف بغاوت میں شرکت کی تھی اور اس کے اخراج میں عثمانیوں اور انگریزوں کا ہاتھ بٹایا تھا۔ نام کے سوا اس میں اور اس کے زبردست پیشرو میں یکسانی کے پہلو سراسر اتفاقی تھے۔ اس کے امیر بننے کے تھوڑی دیر بعد وہ واقعہ پیش آیا، جس نے مسیحیوں اور دروزیوں کے درمیان پہلے اشتعال کا سامان پیدا کیا۔ عام بول چال میں اسے الحرکۃ الاولیٰ کہتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ دیر القمر کے ایک مسیحی نے ایک تیتر کا شکار کیا، جو خاندانِ ابونکد کے ایک دروزی کے املاک میں پھر رہا تھا۔ ابونکد پاس ہی بعقلین میں رہتے تھے۔[4] دونوں فریقوں نے اس پر ہتھیار اٹھا لیے۔ جنبلاط اور عماد اپنے آدمیوں کو لے کر نکد خاندان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دیر القمر کو آگ لگا دی گئی (۱۴۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء)۔ تھوڑی مدت میں الشوف اور الغرب کے دوسرے بلاد و دیہات اس نزاع میں شریک ہو گئے، مثلاً جزین، عبیہ، الشویفات، الحدث، بعبدا۔ پہلے دو مقاموں میں شہابی محل تھے، انھیں بہ طورِ خاص آگ کا ہدف بننا پڑا۔

---

[1] ایبی دا بنوس کی فرانسیسی کتاب جلد دوم صفحہ ۹۰، ۹۱۔ [2] جلد اوّل صفحہ ۲۷۰۔ [3] دینتما جلد سوم صفحہ ۳۔ [4] مشاقہ صفحہ ۱۲۵، ۱۴۶، شدیاق صفحہ ۶۲۱ ببعد، چرچل کی کتاب دروزی صفحہ ۴۴ ببعد، جیسپ صفحہ ۱۶۱ ببعد۔ چرچل متعدد واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔ اس کا گھر بحوارہ میں تھا اور گھر کی چھت پر سے جلتے ہوئے دیہات سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھتا رہا۔ جیسپ امریکی مشنری تھا، بعض واقعات اس نے بھی دیکھے اور مشنریوں سے براہِ راست اطلاعات حاصل کیں۔

جو ماروتی جانیں بچا کر بھاگے، انھیں بیروت کے باہر ترکی فوجوں کے کیمپ کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا۔ فوجیں بظاہر اس غرض سے بھیجی گئی تھیں کہ امن قائم کریں، مگر مفروروں پر حملے ہوئے۔ انھیں لوٹا گیا، حتیٰ کہ عورتوں تک کے کپڑے اتروا لیے گئے۔ اس وقت سے، نیز بعد کے تجربات سے یہ مثل مشہور ہو گئی کہ درزیوں کے ہاتھ سے لٹنا منظور ہے، ترکوں کی حفاظت منظور نہیں[۱]۔ درزیوں کی مجلسی روایات کا ایک طبعی عنصر یہ بھی ہے کہ مستورات کا خاص خیال رکھا جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔

فرانس، برطانیہ اور روس کی طرف سے جو قنصل بیروت میں موجود تھے، انھوں نے ایک مشترکہ نوٹ حاکم کو بھیجا، جس میں عام طور پر پھیلی ہوئی افواہوں کا بھی ذکر تھا۔ مثلاً یہ کہ درزی حکومت کے خفیہ احکام کی بنا پر ہتھیار اٹھا چکے ہیں۔ دیر القمر کے ترک افسروں پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انھوں نے عام آبادی سے ہتھیار لے لیے اور حوران کے درزی رئیس شبلی العریانی کو حکم دیا کہ وہ بے قاعدہ ترک سپاہیوں کے ساتھ زحلہ پہنچے اور عوام سے ہتھیار لے لے[۲]۔

اس پہلی کشمکش میں تین سو جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ لوگ زیادہ تر درزی تھے۔ پانچ لاکھ ڈالر کی مالیتی جائداد تباہ ہوئی۔ دونوں فریقوں کے درمیان شبہات اور رنجشیں بڑھ گئیں، کیونکہ ارباب اختیار نے لوٹی ہوئی رقموں کی واپسی، مجرموں کی تعزیر اور گھر بار چھوڑ کر نکل جانے والے لوگوں کی از سر نو آبادی کا کوئی بندوبست نہ کیا۔ یوں آئندہ شورشوں کے لیے ایک بنیاد قائم ہو گئی۔

جنوری ۱۸۴۲ء میں بشیر ثالث کو معزول کر دیا گیا اور وہ قسطنطنیہ پہنچا۔ یہ آخری شہابی امیر تھا۔ ہنگری کا ایک شخص، جو ابراہیم پاشا کے اخراج کے لیے عثمانی فوج کے ساتھ آیا تھا، باب عالی کی طرف سے یہ عمر پاشا النمساوی (آسٹروی) تھا جس نے عثمانیوں کی طرف سے لبنان میں پہلے پہل گورنری کا منصب سنبھالا[۳]۔ اس نے اپنے قیام کے لیے سیف الدین کے شہابی محل پر قبضہ کر لیا۔ یہ شخص صورت حال کی اصلیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ درزیوں اور مسیحیوں میں سے اسے کسی کی اعانت و وفاداری بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ لوگ مقامی امیروں کی اطاعت کے خوگر چلے آتے تھے۔ باب عالی نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا،

---

۱ چرچل کی کتاب درزی صفحہ ۵۲، جیسپ صفحہ ۱۶۲ + ۲ دیتیستا جلد سوم صفحہ ۱۰۲، ۱۰۵ +
۳ شدیاق صفحہ ۴۰۲ ببعد +

Marfat.com

یعنی کوہستانی علاقے کو دو ضلعوں میں تقسیم کر دیا۔ شمالی ضلع مسیحی قائم مقام (نائب حاکم) کے تابع رکھا گیا اور جنوبی ضلع کے لیے ایک دروزی قائم مقام مقرر کیا گیا۔ یہ دونوں قائم مقام الی عبیدا کے تابع تھے، جو بیروت میں رہتا تھا۔ بیروت سے جو سڑک دمشق کو جاتی ہے، اسی کو خطِ تقسیم قرار دیا گیا۔ فرانس نے پوری کوشش کی کہ علاقہ متحد رہے اور کسی شہابی کو کارفرما مقرر کیا جائے، لیکن یہ کوشش بے اثر رہی۔ حیدر ابو لمعہ مسیحی قائم مقام اور احمد ارسلان دروزی قائم مقام مقرر ہوئے[1]۔ حیدر نیا نیا مسیحی ہوا تھا۔ احمد نو عمر تھا اور وہ اپنے ہم قوم شیخوں پر اثر و رسوخ حاصل کرنے کا اہل نہ تھا۔ باب عالی کی خواہش یہ تھی، یورپی طاقتوں پر واضح ہو جائے کہ لبنان میں مقامی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کا اتنا اضطراب نہ تھا۔ سرکاری دستاویزوں[2] کے مطابق مسیحی ضلع میں چوہتر ہزار سات سو مارونی تھے اور ان کی آبادی زیادہ تر ضلع کے شمالی حصے میں جمع تھی۔ دروزی ضلع میں چھتیس ہزار چار سو پچاس دروزی تھے، سترہ ہزار تین سو پچاس مارونی، پانچ ہزار دو سو یونانی آرتھوڈکس اور پندرہ ہزار پانسو نوے یونانی کیتھولک تھے۔ دس ہزار ایک سو پچاس دروزی مسیحی علاقے اور دیر القمر میں مقیم تھے۔ گویا کل کوہستانی علاقے کی آبادی دو لاکھ تیرہ ہزار ستر تھی، جن کی کیفیت یہ تھی:

| | |
|---|---|
| مارونی | ۹۵۳۵۰ |
| یونانی کیتھولک | ۲۱۰۹۰ |
| یونانی آرتھوڈکس | ۲۸۵۰۰ |
| دروزی | ۳۵۶۰۰ |
| متاولہ | ۱۲۳۳۰ |
| یہودی | ۲۰۰ |

نئی سیاسی تقسیم نے مذہبی اختلافات کی خلیج وسیع کر دی اور صورتِ حال کی نزاکت میں تخفیف کے بجائے اضافہ ہو گیا۔ دونوں قائم مقامیوں میں دروزیوں اور مارونیوں کی آبادی مخلوط تھی، خصوصاً الشوف، العرب اور المتن میں۔ دیر القمر ایک زبردست مسیحی قلعہ تھا، جہاں آٹھ ہزار باشندے رہتے تھے۔ یہ دروزی ضلع کے قلب میں واقع تھا اور اسے نظم و نسق کا خاص درجہ دے دیا

---

[1] شدیاق صفحہ ۲۹۶

[2] ریچرڈ ایڈورڈز کی فرانسیسی کتاب "شام" (۱۸۴۰ء تا ۱۸۶۲ء) صفحہ ۱۷

گیا تھا۔ حالت ایسی ہوگئی کہ کوئی بھی شخص ہتھیار لیے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتا تھا اور ہتھیار زیب و زینت کے لیے نہیں بلکہ استعمال کے لیے اُٹھائے جاتے تھے۔

یہ گھٹائیں جمع ہوتے ہوتے اپریل ۱۸۴۲ء میں برس پڑیں۔ دروزیوں کے چودہ گاؤں جلانے کے بعد مسیحیوں نے المختارہ کا رخ کیا، جو جنبلاط کا وطن تھا۔ وہاں ایک ترک رجمنٹ موجود تھی، جس نے پوری ہوشیاری سے ان کا استقبال کیا۔ عبیہ میں بھی ترک دروزیوں کی امداد کے لیے موجود تھے۔ پھر یہ کشمکش جزین، دیر القمر اور دوسرے مقامات تک پہنچ گئی[۱]۔

باب عالی نے اپنے وزیر امور خارجہ شکیب آفندی کو موقع پر بھیجا۔ اس نے دو گونہ قائم مقامی کی توثیق کر دی، جو ۱۸۶۰ء تک قائم رہی۔ عثمانی حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی مقامی رئیسوں کا اقتدار اور گھٹا دیا۔ اس طرح تیسری اور نہایت خوفناک کشمکش کے اسباب فراہم ہوئے یہ ۱۸۶۰ء کی کشمکش تھی۔

اس پوری مدت میں دروزی محاذ ایک سالار کے ماتحت متحد رہا۔ اس کے برعکس مارونی ایک نئے مجلسی انقلاب سے گزر رہے تھے، جس میں وہ جاگیرداری کے پھندے کاٹ رہے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں مارونیوں کے درمیان ایک زرعی بغاوت پورے زور سے جاری تھی، جس کا سرخیل طانیوس شاہین تھا، جو رقیون کا ایک نعلبند تھا اور خیرانی خانقاہ کا ملازم تھا[۲]۔ دوسرے مارونی امراء کے ساتھ خازنوں کو بھی گھروں سے نکال دیا گیا۔ ان کے مکان جلا دیے گئے اور املاک کسانوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ آئندہ سال شاہین نے کسانوں کی ایک دولت مشترکہ کا اعلان کر دیا اور خود اس کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ مارونی لبطریق اعظم نے چشم پوشی سے کام لیا۔ اس کے ماتحت پادری زیادہ تر عوامی لوگ تھے۔ انھوں نے انقلابی مقاصد کی حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت تک مارونیوں کے جاگیردار امراء مذہبی اقتدار کو بہت محدود کر چکے تھے۔ ترک ارباب اختیار اس صورت حال پر خوش تھے کیونکہ سمجھتے تھے، نتیجہ بہر حال ان کے حق میں نکلے گا۔ اگرچہ انھوں نے اس خوشی پر باریک نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس اثناء میں ان مسیحیوں کی جانیں اور ملکیتیں روز بروز غیر محفوظ تر ہو رہی تھیں[۳] جو دروزی ضلع میں مقیم تھے اور وہاں دس سال

---

[۱] چرچل کی کتاب دروزی صفحہ ۹۱، ۹۲۔ مشاقہ صفحہ ۵۲، ۵۳۔ اسکندر ابکاریوس کی کتاب نوادر الزمان فی ملاحم لبنان، مخطوطہ صفحہ ۲۲، ۲۳۔ ترجمہ شلتا صفحہ ۶۲۔ ابکاریوس ایک ارمنی الاصل مسیحی تھا، بیروت میں تعلیم پائی۔ سفارتی اور سرکاری روئدادوں کے لیے دیکھیے وزارت خارجہ کی خط و کتابت حصہ اول صفحہ ۱۶۰ بعد، دیتینا جلد ۱ صفحہ ۱۷۴ بعد، خازن جلد اول صفحہ ۱۷۶ بعد، دلیں جلد دوم صفحہ ۱۶۴، ۱۶۶۔ [۲] کمتے دی پارس کی فرانسیسی صفحہ ۱۰۲۔ [۳] انطون العقیقی ثورۃ و فتنۃ فی لبنان صفحہ ۸۲، ۹۰۔ خازن جلد اول صفحہ ۳۶۴، ۳۶۶، ۳۷۲، ۳۸۵۔ [۴] چرچل کی کتاب دروزی صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲۔

Marfat.com

قتل کے سات سو واقعات پیش آچکے تھے اور کسی کی بھی تفتیش کے لیے کوئی کوشش نہ ہوئی ؎

## دردناک سانحات

۱۸۶۰ء کے قتل (مقامی اصطلاح کے مطابق "مذابح ستین") کے واقعات کی ابتدا اپریل میں ہوئی اور یہ جولائی کے مہینے میں بھی بدستور غیر معمولی تیزی و تندی سے جاری رہے۔ ان کے لیے فوری اشتعال کی کوئی وجہ نہ تھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے ان کا منصوبہ تیار کر دیا گیا تھا۔ اسباب کا سلسلہ سالِ سابق کے موسم گرما تک پہنچتا ہے۔ جب بیت میری کے دو لڑکوں کے درمیان جن میں سے ایک مارونی تھا اور دوسرا دروزی، ایک جھگڑا شروع ہوا، جس میں مسیحیوں سے دروزی مقتولوں کی تعداد زیادہ تھی۔ پھر مخلوط آبادیوں میں تشدّد کے متفرق واقعات پیش آتے رہے۔ اس سال موسم سرما بڑا شدید تھا اور سلسلہ رک گیا، لیکن اس اثناء میں ان اقدامات کی تیاری کر لی گئی، جو ناگزیر معلوم ہوتے تھے۔ دروزی شیخوں نے کھلم کھلا بیروت کے خورشید پاشا سے مشورہ کیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وساطت سے اسلحہ مہیّا کیے۔ جب اپریل ۱۸۶۰ء میں آگ بھڑک اٹھی تو دروزی علاقے کا ایک بھی مسیحی اپنی زندگی محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ چند ہفتوں میں المتن اور الشّوف کے ساٹھ سے زیادہ گاؤں جلا کر خاکستر بنا دیے گیے۔ باقاعدہ ترکی فوج نے اس لڑائی کو روکنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ بے قاعدہ ترکی سپاہیوں (باشی بوزق) نے ان پناہ گیروں سے بُرا برتاؤ کیا اور انھیں لوٹا، جو دمشق اور بیروت سے جان بچا کر بھاگے تھے ؎

کسروان اور شمالی لبنان مارونیوں کے مستحکم قلعے تھے۔ وہاں تک کوئی اثر نہ پہنچا۔ وہاں سے امداد کے دو پیغام آئے، ایک طانیوس شاہین کی طرف سے اور دوسرا یوسف کرم زاہدان کی طرف سے۔ آخرالذکر شخص ایک نوخیز قومی لیڈر تھا۔ عثمانی اربابِ اختیار نے ترغیب و تہدید سے ان دونوں لیڈروں کی نقل و حرکت روک دی۔ فرانسیسیوں نے اس روک تھام کے لیے مداخلت کی۔ مارونی پادری دشمن کے خلاف زبانی ہنگامہ آرائی میں معروف رہے اور اپنے ہم مذہبوں کو حوصلہ بھی دلاتے رہے، برانگیختہ بھی کرتے رہے اور امداد کا یقین بھی دلاتے رہے۔ دونوں صورتوں میں اس طرزِ عمل سے نفع کے بجائے نقصان پہنچا۔ اُدھر دروزیوں کی امداد کے لیے ان کے ہم مذہب حوران سے آپہنچے۔ ان کی تعداد تین ہزار یا اس سے کسی قدر زیادہ تھی۔ اسمٰعیل الاطرش ان کا قائد تھا۔ لبنان میں سعید جنبلاط نے عنانِ قیادت سنبھال لی۔ ختار العماد اور علی حمادہ اس کے خاص نائب تھے ؎

اس کے بعد بڑے شہروں کی باری آئی۔ زیادہ تر ایک ہی قسم کا طرزِ عمل روا رکھا گیا یعنی پہلے عثمانی فوج کا کمانڈر مسیحی آبادی سے پناہ کے وعدے پر ہتھیار حوالے کر دینے کا مطالبہ کرتا، پھر انھیں

Marfat.com

مقامی سرائے میں قتل کر دیا جاتا۔ دیر القمر میں یہی ہوا، جہاں دو ہزار چھ سو آدمی مارے گئے۔ جزّین اور اس کے حوالی میں مقتولین کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی۔ حاصبیہ کی چھ ہزار آبادی میں سے ایک ہزار یونانی آرتھوڈکس موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ راشیہ میں آٹھ سو تباہ ہوئے[۱] حاصبیہ کے متعلق حکم تھا کہ سات سال اور ستر سال کے درمیان عنفوانِ ذکور میں سے کسی کو چھوڑا نہ جائے۔ شاہی محل کے صحن میں بوڑھوں اور جوانوں کی لاشیں ملی جلی ہوئی پڑی تھیں۔ کینہ ور نگاہیں انھیں دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ زحلہ بڑے شہروں میں سے تھا۔ اس کی آبادی بارہ ہزار تھی، جن میں سے زیادہ تر یونانی کیتھولک تھے۔ اس نے کچھ دیر مقابلہ جاری رکھا۔ پھر حوران کے جنگجوؤں اور بدوؤں کا حملہ ہوا تو حوالگی پر مجبور ہو گیا۔ یہ شہر ایک گہری گھاٹی میں واقع تھا۔ جو بردونی نے پہاڑ کاٹ کر بنائی تھی۔ یہ نالا کوہ ستین سے آتا تھا، جو عقب میں واقع ہے۔ اس کا ایک بھی گھر شعلوں سے نہ بچا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ کرنل چرچل[۲] نے تیار کیا تھا اور اس میں انھیں چالوں سے کام لیا گیا تھا، جن سے یوشع نے عی اور بیت ایل کے خلاف کام لیا تھا[۳]۔ متصلہ ساحلی شہروں کی طرف جانے والی سڑکیں پناہ گیروں سے اٹی پڑی تھیں، ان میں سے بہتیروں کو لوٹا گیا یا بے قاعدہ رسالے نے قتل کر دیا۔ عیدا کے مسلمانوں نے کوئی تین سو پناہ گیروں کو مارا۔ تین مہینے کی مدت میں اور چند میل کے رقبے میں تخمینے کے مطابق بارہ ہزار آدمی مارے گئے۔ املاک کا نقصان چالیس لاکھ پونڈ تک پہنچ گیا۔ اس موسم میں ریشم کے کیڑوں کے کویے جمع کیے جاتے تھے۔ لبنان کے اقتصادیات میں اس جنس کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ گرجوں اور خانقاہوں کو بھی نقصان پہنچا[۴]۔

لبنان سے شعلے اُڑ کر دمشق پہنچ گئے اور مسلمانوں کے جذبات میں آگ لگا دی، جو ابراہیم پاشا کی کشادہ دلانہ پالیسی اور "خطِ ہمایوں" کی دفعاتِ مساوات سے پیدا ہوئے تھے۔ لبنانی مجرموں سے اعراض اور سرکاری افسروں کے اشتراک نے حوصلہ افزائی کی۔ مسیحی حصۂ شہر کو آگ لگا دی گئی اور دس ہزار آدمی مارے گئے۔ تین بھائی جو رومیوں کے مسالقی خاندان سے تھے، فرانسسکی کلیسا کے اندر قتل ہوئے جہاں وہ پناہ گزین تھے۔ بعد ازاں پوپ نے انھیں روحانی برکت دے دی (۱۹۲۶ء)۔ شام کے دار الحکومت میں کل گیارہ ہزار مارے گئے۔ عبد القادر المغربی الجزائر میں فرانسیسی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ہجرت کر آئے تھے اور دمشق میں رہتے تھے۔ انھوں نے مروت و شجاعت سے کام لے کر

---

[۱] شام میں فسادات کے متعلق کاغذات (انگریزی) صفحہ ۲۰، ۴۴ + [۲] جیسپ صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵ + [۳] یوشع باب ۷، آیت ۲-۶، باب ۸، آیت ۹ تا ۱۷ + [۴] سرکاری دستاویزوں کے لیے دیکھیے معاملات شام کے متعلق خط و کتابت جلد ششم صفحہ ۲۷، ۱۰۱، خازن جلد دوم صفحہ ۱ بعد، ابکاریوس صفحہ ۴۲ بعد، شلیتا صفحہ ۲۷ بعد، مشاقہ صفحہ ۵۸، ۱۲۸، ایدورد دریال کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۱۹۴، ۱۹۵، چرچل دروزی صفحہ ۳۲، رائیلے صفحہ ۲۵۰، چارلس رو فرانسز صفحہ ۱۸۳، ۱۸۶، ابو شکرا الحرکات فی لبنان صفحہ ۱۱۳، ۱۳۱۔

Marfat.com

ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں کی جانیں بچائیں۔ تاریک پس منظر میں ان کا یہ کارنامہ روشنی کا نشان ہے۔ لبنان میں کوئی عبدالقادر پیدا نہ ہُوا۔

**قیامِ امن** آخر بڑی حکومتیں حرکت میں آئیں۔ فرانس، برطانیہ، آسٹریا، پروشیا، روس اور ترکی کے درمیان فرانس کی تحریک پر مداخلت کا فیصلہ ہوا۔ قرار پایا کہ بارہ ہزار مشترکہ فوج بھیجی جائے۔ صرف فرانس میدانِ عمل میں آیا اور اس نے جنرل بیونورٹ دہاتپول کی سالاری میں سات ہزار فوج بھیج دی۔ یہ سالار شام میں اُس وقت لڑائی کا تجربہ کر چکا تھا جب کرنل سیو کے عملے سے وابستہ تھا۔ یہ کرنل اسلام کا مدعی تھا سلیمان پاشا اس کا نام رکھ لیا تھا اور مصری فوج کی جنگی کارروائیوں کا نگران تھا۔ بیونورٹ اگست ۱۸۶۰ء میں بیروت پہنچا۔ فواد پاشا عثمانی وزیر خارجہ تازہ افواج کے ساتھ پہنچ چکے تھے اور ان افسروں کے خلاف شدید کارروائی شروع کر چکے تھے، جو لبنان اور دمشق میں قتل کے واقعات کو چپ چاپ دیکھتے رہے یا اُنھوں نے اس میں حصّہ لیا۔ ایک سو گیارہ سپاہیوں کو گولی سے اُڑا دیا گیا اور انتظامی عملے کے چند آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ عبدالقادر الجزائری کے لیے نشانِ اعزاز تجویز ہوا۔ دمشقی مجرموں کے خلاف زیادہ سخت کارروائیاں عمل میں آئیں۔ فرانسیسیوں کے پہنچنے سے پیشتر ہی امن قائم ہو چکا تھا۔ فواد نے بہت جلد ایک بین الاقوامی کمیشن اس غرض سے مقرر کیا کہ ان فسادات کی ذمّہ داری کا فیصلہ کرے۔ چھان بین کرے کہ کون کون مجرم ہیں۔ نقصانات کا تخمینہ بھی اسی کے ذمّے ہوا اور کوہستانی علاقے کے آئندہ نظامِ حکومت میں اصلاحات تجویز کرے۔ وہ خود بڑا ہوشیار اور باتدبیر شخص تھا۔ خود اس کمیشن کا صدر رہا۔ اس نے تمام دوسرے آدمیوں کی چالیں مات کر دیں۔ مختلف ارکانِ کمیشن میں اختلاف تھا۔ فواد نے اس سے پورا فائدہ اُٹھایا اور کہا: میں آپ لوگوں کے اتفاقِ رائے کا انتظار کروں گا یا اصل معاملے کو اپنی حکومت کے روبرو پیش کر کے اس کی ہدایات کا منتظر رہوں گا۔[1] لارڈ ڈفرن (انگریزی رکن کمیشن) نے نپولین ثالث کے نمائندے کو بے حقیقت بنا دیا۔ فواد کی تائید کرتے ہوئے ترکی اقتدار کی حمایت کی۔ دروزیوں کے معاملے میں جو امور تخفیفِ جرائم کا باعث تھے، ان پر خاص زور دیا۔ آسٹریا اور پروشیا کے نمائندوں نے بھی اسی مسلک کی پیروی کی۔ فرانس نے مسیحیوں کے معاملے کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ روس نے نیم دلی سے اس کی تائید کی۔

---

[1] لبنان کی یادگاریں (فرانسیسی) صفحہ ۲۷۴، ۲۷۶۔

Marfat.com

کمیشن کے پاس چار ہزار چھ سو دروزی مجرموں کی فہرست پہنچی۔ ان میں سے اڑتالیس کو موت کی سزا دی گئی۔ گیارہ کو عمر قید، تیرہ کو چھ چھ سال کی قید، دو سو انچاس کو محض نظربندی یا عارضی جلاوطنی کی سزا ملی۔[1] لیکن جنھیں موت کی سزا ملی تھی، ان سب کو یہ سزا دی نہ گئی۔ سعید جنبلاط کی سزائے موت منسوخ ہو گئی۔ متعدد لوگ مختار العماد کی سرکردگی میں حوران بھاگ گئے۔ ایک سو بیس کو طرابلس الغرب (افریقہ) بھیج دیا گیا، خورشید پاشا موت سے بچ گیا، لیکن حاصبیہ کا کماندار اور دمشق کا پاشا نہ بچ سکے۔ خورشید (والیِ صیدا) بیروت کا فوجی کماندار اور دوسرے چھوٹے عہدہ دار قبرص، مالٹا یا قسطنطنیہ جلاوطن ہوئے۔ تین سو مشتبہ مسلمانوں کو عمر بھر کے لیے قید یا مشقّت کی سزا ملی۔ ان کے ہاتھ کندے سے بندھے ہوئے تھے اور انھیں پیدل بیروت لایا گیا۔ وہاں سے جہاز میں سوار کرا کے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ چھ مہینے کے بعد وہ سرکاری خرچ پر بیروت پہنچنے لگے اور اپنے گھروں میں جا بیٹھے۔[2]

نقصان کا اندازہ ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ کیا گیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ نقصان دروزی پورا کریں۔ فواد نے اعلان کر دیا کہ دولتِ عثمانیہ اس نقصان کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ خزانۂ عامرہ سے کچھ رقم دے دی گئی اور معاملہ ختم کر دیا گیا۔ بابِ عالی نے عفوِ عام کا اعلان کر دیا۔ صرف وہ لوگ مستثنیٰ رہے، جو حوران بھاگ گئے تھے۔[3] اس اثنا میں پناہ گیروں کی حالت غذائی جنسیں بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے بہت تکلیف دہ ہو گئی۔ ٹائیفس، ٹائیفائڈ، پیچش اور دوسری مہلک بیماریوں نے بڑی تباہی پھیلائی۔ عورتیں حرموں میں لے لی گئیں۔ ماؤں نے بچّے فروخت کے لیے پیش کر دیے۔[4]

**تنظیم جدید**

حکومت کی تنظیم جدید کے سلسلے میں فرانس کی تجویز یہ تھی کہ ملک کو متحد کر دیا جائے اور اسے داخلی خود مختاری دے دی جائے۔ ۱۸۴۰ء سے پیشتر کے دَور کے مطابق ایک مارونی کو گورنر بنایا جائے۔ جنرل بیو فورٹ کی طرف سے اس عہدے کا امیدوار مجید تھا، جو بشیرِ اعظم کا بیٹا تھا، لیکن بیو فورٹ کا نائب جنرل ڈکرو یوسف کرم کا حامی تھا، جسے فواد نے[5] مسیحی مجمع کا منصرم قائم مقام مقرّر کر دیا تھا۔ فرانسیسی مشنری بھی یوسف ہی کا حامی تھا۔ یوسف احدن کا موروثی شیخ تھا۔ اس نے عین تورہ میں یسوعیوں کے ہاں تعلیم پائی تھی۔ فرانسیسی بولتا تھا

---

[1] ناموں کے لیے دیکھیے ایڈورڈز صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴، چرچل دروزی صفحہ ۲۲۲، "معاملاتِ شام کے متعلّق خط و کتابت" صفحہ ۵۰۹، یادگاریں صفحہ ۲۳۸ ببعد، ۲۴۰ ببعد۔ [2] رائیلے صفحہ ۸۷، ۸۸۔ [3] ایوشکرا صفحہ ۱۳۳ کے مطابق تین ہزار لوٹ کا مال لے کر بھاگ گئے تھے۔ [4] دی ورلڈ نیویارک ۲۳- اپریل ۱۸۶۱ء۔
[5] فرانسیسی کتاب جلد دوم صفحہ ۱-۲۔

Marfat.com

اور فرانسیسیوں کی حمایت کے احساسات اس کے سینے میں پرورش پا رہے تھے۔ جو فرانسیسی سیّاح دیو داروں کے جھنڈ دیکھنے آتے، یوسف کا باپ ان کی مہمانداری کرتا تھا۔ وہ دیکھنے میں وجیہ تھا۔ طور طریقے بڑے اچھے تھے۔ شخصیت پُر وقار تھی اور عوام میں وہ بڑا ہر دلعزیز تھا۔ فرانسیسی تجویز کی ہلکی سی تائید روس کی طرف سے ہوئی، لیکن عثمانیوں نے شدّت سے اس کی مخالفت کی اور انگریزوں نے عثمانیوں کی تائید کی۔ ۹۔ جون ۱۸۶۱ء کو لبنان کے لیے نئے نظام پر قسطنطنیہ میں دستخط ہوئے۔ ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ تین سال بعد اس میں ترمیم ہوگی۔ یہ نظام پہلی جنگِ عظیم تک جاری رہا۔ فرانس، برطانیہ، آسٹریا، پروشیا، روس اور ترکی نے اس پر دستخط کیے۔ لبنان کو ایک ایسی متصرّفیہ بنا دیا گیا، جو داخلی طور پر خود مختار رکھی گئی۔ ایک گورنر جنرل (متصرّف) اس کے لیے تجویز ہوا۔ یہ طے کر لیا گیا کہ وہ مسیحی ہوگا۔ بابِ عالی کی طرف سے اسے نامزد کیا جائے گا اور دوسری طاقتیں اس کی منظوری دے دیں گی۔ یوں لبنان کی داخلی آزادی بین الاقوامی حیثیت سے تسلیم کر لی گئی۔ بڑی یورپی طاقتیں ضامن بن گئیں۔ اٹلی نے ۱۸۶۷ء میں اس نظام پر دستخط لیے، جو ۱۸۶۱ء میں جاری ہوا اور ۱۸۶۴ء میں اس میں ترمیم کی گئی تھی۔ اس کے بعد بڑی یورپی طاقتوں کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔

جنوری ۱۸۶۱ء میں برطانیہ نے فرانسیسی فوجوں کے تخلیے پر زور دینا شروع کیا اور ۵۔ جون تک ان کے تصرّف پر بادلِ ناخواستہ راضی ہو گیا۔ تخلیے سے پیشتر ان فوجوں نے امدادی کام میں ہاتھ بٹایا۔ زحلہ، دیر القمر، حمّانہ اور دوسرے شہروں کے منہدم مکانات ازسرِ نو تعمیر کیے گئے[۵۱]۔ نہر الکلب کی چٹان پر یہ فوجیں اپنا ایک کتبہ چھوڑ گئیں۔

نئے نظام نے خراج کا وہ دَور ختم کر دیا، جس کی تلخی اور شک کی میراث اب تک بھی پوری طرح محو نہیں ہوئی۔ اب نئے دَور کا آغاز ہوا، یعنی دَورِ متصرّفیہ جبل لبنان[۵۲]۔

---

۵۱ ارنیسٹ لوے کی فرانسیسی کتاب "مہم شام" صفحہ ۱۲۳، ۱۳۸، ۱۴۶۔

۵۲ ۱۸۶۰ء کے ہنگامے کے متعلق ہم نے کچھ نہیں لکھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہنگامہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے افسوسناک ہے، لیکن فاضل مصنف نے اوّل اس سلسلے میں صرف ایک فریق کی رودادوں پر بھروسا کیا، جو یقیناً مبالغے سے خالی نہ تھیں۔ دوسرے وہ اسباب پوری طرح پیشِ نظر نہ رکھے، جو مسلمانوں کے اشتعال کا باعث ہوئے۔ صلیبیوں سے بھی پیشتر کے زمانے سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا کہ مارونی، دوسرے مسیحی اور بعض مسلمان گروہ مسلمانوں کے خلاف اجنبیوں کی حمایت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ترکوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ جب یورپی طاقتیں خود باہم سمجھوتا کر کے ترکی اقتدار کو نقصان پہنچانے لگیں اور مسیحیوں نے اجنبی طاقتوں کی حمایت کی تو ظاہر ہے کہ حکومت یا عام مسلمان اس حرکت کو خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یقیناً عوام کا قانون کو ہاتھ میں لے لینا نامناسب تھا، لیکن یہ بھی

(باقی حاشیہ صفحہ ۴۳۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

Marfat.com

# تیسواں باب

## متصرفیہ جبل لبنان

**انتظامی تفصیلات** لبنان کا مسئلہ دو سال تک یورپی طاقتوں کے زیر غور رہا تھا۔ سنہ ۱۸۶۰ء ۔ سنہ ۱۸۶۱ء) لیکن انتظامی ضوابط کا جو خاکہ ان سے ملا، وہ بمشکل کاغذ کے دو صفحوں پر مشتمل تھا جس ملک کی تنظیم از سر نو ہوئی تھی، اس کا انتظام صرف سترہ ضوابط کی بنا پر چلنا یقیناً تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔[1] ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو ان ضوابط پر نظر ثانی کی گئی تو صرف چند معمولی ترمیمیں ہوئیں[2] مثلاً متصرف کی امداد تین سال سے پانچ سال کر دی گئی اور یہ بھی طے ہوگیا کہ اس میعاد کی تجدید ہو سکتی ہے۔ وہ براہ راست باب عالی کے رو برو جوابدہ تھا۔ حاکم اعلیٰ کی حیثیت میں وہ محاصل وصول کرتا تھا۔ ججوں (قاضیوں) کا تقرر اسی کے ہاتھ میں تھا۔ عدالتوں کے فیصلے نافذ کرتا تھا اور امن و نظم کا ذمہ دار تھا۔ ایک انتخابی انتظامی مجلس (مجلس ادارہ) بھی متصرف کی امداد کے لیے بنائی گئی تھی اس کے بارہ ممبر تھے اور یہ مختلف فرقوں سے چنے جاتے تھے۔ ان میں سے پانچ مسیحی تھے۔ جغرافیائی حد بندی کے سلسلے میں البقاع اور وادی التیم کو الگ کر لیا گیا تھا، جن کی زرخیزی پہاڑی علاقوں کی ہواؤں اور بارشوں پر موقوف تھی۔ اسی طرح پہاڑی علاقوں کی بالائی سطح کی مٹی نیچے پہنچتی تھی اور پہاڑوں ہی کے چشموں سے پانی لینے والی ندیاں اس علاقے کو سیراب کرتی تھیں۔ اسی طرح بیروت و صیدا کو الگ کر لیا گیا، حالانکہ مشتریہ سب لبنان کے اجزاء تھے۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۳) ظاہر ہے کہ جو کچھ ہوا، اس کی اصل ذمہ داری مسیحیوں کے غلط بلکہ غدارانہ طرز عمل پر تھی۔ یورپی طاقتیں کسی مسیحی کی نہیں، صرف اپنے اقتدار کی حامی تھیں۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے جو تصویر مصنف نے پیش کی ہے، وہ قطعاً درست نہیں سمجھی جا سکتی۔ نقصان جان ہوا، مگر اس لیے کہ مسیحی زور اقتدار اور یورپی طاقتوں کی حمایت کے بل پر ہر مشترک مصلحت سے بے پروا ہو گئے تھے اور جب کوئی گروہ خاص اسباب کی بنا پر ایسی غلط روش اختیار کرے تو دوسرے گروہ سے بھی مخالفانہ کارروائیوں میں اعتدال کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

۱ دیکھیے BRITISH & FOREIGN STATE PAPERS-1860-1861 جلد ۵۱ صفحہ ۲۸۸، ۲

۲ دیکھیے ٹامس ہالینڈ کی کتاب The Emopan Concat In The Eastern Question صفحہ ۲۱۲، ۸

بیروت، صیدا اور طرابلس لبنان کی طبعی بندرگاہیں تھیں۔ یہ تینوں براہ راست عثمانی حکومت کی تابعیت میں آ گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معنیوں اور شہابیوں کا لبنان نہ تھا بلکہ اس میں صرف پہاڑی علاقہ شامل رکھا گیا تھا۔ پھر اسے سات ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر ایک کے لیے ایک قائم مقام مقرر ہو گیا۔ ان کا فیصلہ ہر ضلع کی آبادی کی اکثریت کے مطابق ہوتا تھا۔ ان میں سے تین مارونی تھے، ایک دروزی، ایک مسلمان، ایک یونانی آرتھوڈکس، ایک یونانی کیتھولک۔ پھر ہر ضلع (قائم مقامی) کو چھوٹے چھوٹے انتظامی حلقوں میں بانٹ دیا گیا، جن میں سے ہر ایک کو پرسویہ کہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات ان شیخوں کی تحویل میں دے دیے گئے، جنھیں یا تو حکومت مقرر کر دیتی تھی یا عام لوگ چن لیتے تھے[1] جن مقدمات کا تعلق صرف پادریوں سے ہوتا تھا، ان کے ضمن میں کلیسائی اختیارات قائم رکھے گئے۔ نئے دستور میں جاگیرداری کے خاص حقوق منسوخ ہو گئے۔ تمام شہریوں کو مساوی شہری حقوق مل گئے۔ یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ مردم شماری کی جائے اور زمین کی پیمائش کرائی جائے۔ کوہستانی حکومت کا اپنا محکمۂ عدل قائم رہا اور اس کے فیصلوں کا انتظام مقامی ملیشیا کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ لبنان میں کوئی ترک فوج نہ رکھی گئی، نہ یہاں کے شہریوں پر فوجی خدمت لازم رہی، نہ باب عالی کو کوئی رقم بہ طور خراج دے دی جاتی۔ مقامی محاصل صرف مقامی ضروریات کے لیے عائد کیے جاتے تھے۔ اگر کچھ رقم بچ رہتی تو سلطانی خزانے میں پہنچا دی جاتی۔ کچھ کم رہ جاتی تو سلطانی خزانے سے اسے پورا کر دیا جاتا۔

## داؤد پاشا اور یوسف کرم

داؤد آفندی اصلاً ارمنی تھا اور مذہباً رومن کیتھولک۔ وہ قسطنطنیہ میں تار کے محکمے کا ناظم تھا اور اینگلو سیکسن قانون کے متعلق اس نے فرانسیسی میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اسے لبنان کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا اور بیت الدین میں بشیر کے محل کو اس نے اپنی مستقل قیام گاہ قرار دیا۔ بعبدا کی ایک عالیشان سرائے، جو تیسرے جانشین کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی، موسم سرما کی قیام گاہ کا کام دیتی رہی۔ اصل نظام میں اشارہ تک نہ تھا کہ خود کوئی لبنانی بھی گورنر جنرل مقرر ہو سکتا ہے۔ یوسف کرم برابر اس عہدے کا خواہاں تھا۔ داؤد پاشا نے یوسف کو جزین کی قائم مقامی پیش کی۔ اس نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ پاشا نے بشیر کے بیٹے مجید کو کسروان میں قائم مقام بنایا اور اس نے

---

[1] ان شیخوں سے مراد نہ تو موروثی جاگیردار ہیں اور نہ مذہبی شیخ بلکہ یہ الگ چنے جاتے تھے۔

Marfat.com

یہ منصب قبول کر لیا۔ یوسف نے ایک بیان میں جس میں روئے سخن ویٹیکن اور پیرس سے تھا[1] اس امر پر اعتراض کیا کہ گورنر لبنان کا باشندہ نہیں، اسے مطلق اختیارات دے دیے گئے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ بعض مسیحی ضلعوں کی حدبندی ٹھیک نہیں ہوئی اور لبنانیوں کے تجارتی جھگڑوں کا فیصلہ لبنان سے باہر (بیروت میں) کرنے کی دفعات موجود ہیں۔ نیز بجٹ میں خسارے کے وقت قسطنطینیہ سے روپیہ لیا جائے گا۔ یہ انتظامی پہلو ایسے ہیں، جن کی بنا پر ملک قسطنطینیہ کے تابع ہو جائے گا۔ اس نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور بعض خونریز لڑائیوں کا موجب بنا۔ لیکن ۱۸۶۱ء ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ فواد نے اسے گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ قسطنطینیہ لے گیا۔ یوسف اس زمانے میں بھی سمجھتا رہا کہ داؤد پاشا کی میعاد پوری ہو جائے گی تو خود اسے گورنر جنرل بنا دیا جائے گا لیکن ۱۸۶۴ء میں داؤد کی میعاد کی تجدید ہو گئی تو یوسف خفیہ خفیہ قسطنطینیہ سے نکل کر شمالی لبنان پہنچا اور کشمکش از سر نو شروع کر دی۔ اسے فرانس کی امداد حاصل تھی اور فرانس محافظ طاقتوں میں شامل ہونے کی بنا پر ہی قانوناً مداخلت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے فرانس ہی کے زیر سایہ پہلے جلاوطن کر کے الجزائر بھیج دیا گیا۔ وہاں سے وہ پیرس پہنچا اور پیرس سے نیپلز میں منتقل ہوا۔ وہیں ترسٹھ سال کی عمر میں فوت ہوا[2] (۱۸۸۸ء)۔ صرف فرانس ہی نے اس کی اعانت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی بلکہ پادری بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے، حالانکہ فرانس کی طرح پادریوں کی امداد پر بھی اس کا یکساں انحصار تھا۔ اس کی نعش وہاں سے منتقل کر کے احدن لائی گئی اور ایک گرجے میں رکھ کر سب کو دکھائی گئی۔ اسے ممی نہیں کیا گیا تھا لیکن اچھی طرح محفوظ تھی۔ اس کا مجسمہ گرجے کے صحن میں نصب ہے۔ اس کا نام شمالی لبنان کی رزمیہ کہانیوں میں دورِ حاضر کے ایک قومی ہیرو ہونے کی حیثیت میں محفوظ ہے۔

نئے نظام کی مخالفت ایک اور گوشے سے بھی ہوئی۔ یہ پرانے جاگیردار تھے، جن میں سے زیادہ تر دروزی تھے۔ چونکہ محاصل بہت بڑھ گئے تھے، اس لیے عوام بھی مخالفت میں ساتھ ہو گئے لیکن داؤد پاشا اس طوفان کے مقابلے میں کامیاب ہوا۔ اس نے امن قائم رکھا اور نئے دستور کو عمل میں لے آیا۔ اشرافِ لبنان کے روبرو ایک تقریر کرتے ہوئے اس نے یوں مثال دی:

[1] بطرس کرم کی کتاب قلائد المرجان فی تاریخ جبل لبنان جلد اوّل صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲۔ [2] دلبس تاریخ سوریہ جلد ہشتم صفحہ ۲۶، ۲۷، ۴۳۳۔ مصنف کو یوسف کرم سے ذاتی تعلق تھا اس کے مفصل سوانح حیات اسطیفان الیشعلانی کی کتاب لبنان و یوسف بے کرم میں دیکھیے صفحہ ۳۱۲ - ۴۴۶، نسیم نوفل کی کتاب بطل لبنان، صفحہ ۲۲۴ - ۲۲۸۔

Marfat.com

"ایک طبیب بیمار ہوگیا۔ اس نے اپنے ایک ہمسر کو علاج کے لیے بلایا اور اس سے کہا کہ ہم تین ہیں۔ اوّل تم ہو، دوم میں، سوم میری بیماری۔ اگر تم میری مدد کرو گے تو ہم بیماری پر قابو پالیں گے۔ اگر بیماری کی مدد کرو گے تو مجھ پر قابو پالو گے۔ اسی طرح ہم بھی لبنان میں تین ہیں۔ اوّل تم، یعنی عوام، دوم میں یعنی حاکم، سوم لبنان میں قوموں کی روایتی عداوت۔ میری مدد کرو گے تو ہم عداوت پر قابو پالیں گے۔ عداوت کو تقویت پہنچاؤ گے تو مجھے بھی تباہ کرو گے، خود بھی تباہ ہو جاؤ گے۔"[1]

نئے گورنر نے تعمیری وسائل اختیار کیے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ البقاع کو دوبارہ لبنان سے ملا دیا جائے۔ عبیدا نے رضا کارانہ طریق پر الحاق کی درخواست کی تھی، اسے قسطنطنیہ بھیج دیا۔ ۱۸۶۳ء میں ایک فرانسیسی کمپنی نے پانچ سال کی محنت سے دمشق اور بیروت کی شاہراہ مکمل کر دی۔ لبنان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی شاہراہ تھی۔ اب باقاعدہ خط آنے جانے لگے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان روزانہ ڈاک آتی جاتی تھی۔ ساٹھ میل تک پختہ سڑک بنانے میں چودہ سال صرف ہوگئے۔ اب بیروت میں گاڑیاں پہنچ گئیں۔ یہی سڑک نظام آمد و رفت میں ریڑھ کی ہڈی قرار پائی یعنی اس سے شاخیں نکل نکل کر تمام دیہات و بلاد کو ملاتی رہیں۔ سالہا سال تک اس کمپنی نے ہر خچر پر تین فرانک کا ٹیکس لگائے رکھا۔ اس وجہ سے خچر والے عموماً سڑک پر نہیں چلتے تھے اور پرانے پیچ و خم کھائے ہوئے اور کیچڑ سے اٹے ہوئے راستے پر چلتے تھے۔[2] ۱۸۶۷ء میں سلطان نے ایک قانون نافذ کیا جس کے مطابق اجنبیوں کو جائداد کے مالک بننے کی اجازت دے دی گئی۔ داؤد نے بیروت کو دیر القمر اور اپنے مرکز حکومت تک ایک سڑک کے ذریعے سے ملا دیا۔ اس میں اس کے دوسرے اور تیسرے جانشین نے مزید اصلاحات کیں تو یہ پکی سڑک بن گئی، جیسی سڑکیں اور بھی تھیں۔ یہ پہاڑی سلسلے میں پیچ و خم کھاتی ہوئی جاتی تھی۔[3] عبیہ میں داؤد نے ایک ہائی سکول کھولا (۱۸۶۲ء) اور دروزی وقف سے اس کے لیے مستقل امداد کا انتظام کر دیا۔ یہ اب تک اسی کے نام پر الداؤدیہ کہلاتا ہے اور آج لڑکوں لڑکیوں کی مشترکہ تعلیم کا ایک اچھا ادارہ ہے، جس میں کم و بیش تین سو طلبہ اور طالبات ہوں گے۔

---

[1] جسپ صفحہ ۲۲۶، ۲۶۷۔

[2] ہارپر کا نیو منتھلی میگزین جلد ۱۴ صفحہ ۵۳، نیز فرانسیسی کتاب صفحہ ۳۷، ۴۰۔

[3] ماس لبنان صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۵۱، جسپ صفحہ ۲۳۴۔

Marfat.com

**سات متصرف** داؤد سے متصرف کے عہد کا آغاز ہوا تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، مگر اس کی حیثیت بگڑتی گئی۔ اس کے صرف دوسرے جانشین رستم نے اہلِ ملک کی فلاح و بہبود سے دلبستگی کا مظاہرہ کیا۔ باقی تمام جانشین صرف بابِ عالی کی نظروں میں اعتبار حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ وہ اپنی میعاد پوری کر کے واپس گئے تو انھیں زیادہ اونچے اور گراں قدر تر مشاہروں والے عہدے مل گئے۔

داؤد نے دوسری میعاد کے اختتام سے ایک سال پیشتر استعفا دے دیا۔ غالباً یہ بابِ عالی کی طرف سے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اس کا جانشین نصری فرنکو (۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۳ء) تھا۔ یہ فواد پاشا کے عملہ میں بمقامِ بیروت خدمات انجام دے چکا تھا۔ یہ البتماع اور عبید کے الحاق کا مطالبہ دبا نہ سکا اور پر سے ہدایات آئیں کہ یہ مطالبہ جبراً ختم کر دیا جائے۔ اس کی گورنری کے ابتدائی زمانے میں سلطانی فرمان کے مطابق تمام مطبوعات پر شدید احتساب قائم کر دیا گیا۔ چھاپے خانے اور اخبار کوہستانی علاقے میں فروغ پانے لگے تھے۔ عدل کا نیا عثمانی ضابطہ، جو المجلہ میں شامل تھا، حنفی اصول پر مبنی تھا۔ بیع، کرایہ، قرضے اور اشتراک میں حنفی فقہ ہی کے ضوابط پر عمل ہوتا تھا۔ اس وقت تک شرعی عدالتوں کے ساتھ ساتھ سیکولر عدالتیں اور ضابطے نافذ ہو چکے تھے۔[۵]

رستم (۱۸۷۳ء تا ۱۸۸۳ء) اصلاً اٹلی کا ایک امیر تھا۔ پہلے سینٹ پیٹرزبرگ میں منیجر رہا، آگے چل کر لندن میں سفیر مقرر ہوا۔ اس نے مارونی پادریوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو دبانا شروع کیا۔ داؤد نے انھیں نئے نظام کا حامی بنا دیا تھا۔ مارونیوں کے جاگیردار امرا کا اثر و اقتدار گھٹا تو کلیسائی طبقے کا اثر و اقتدار بڑھ گیا۔ عثمانی سلطنت کے تمام مذہبی پیشواؤں میں سے صرف مارونی بطریقِ اعظم ہی کو یہ حق حاصل تھا کہ بابِ عالی سے رسمی اجازت لیے بغیر کام کرتا رہے۔ وہ اپنے اس حق پر مصر رہا اور بابِ عالی سے خلعتِ اقتدار لینے پر آمادہ نہ ہوا۔

رستم بجٹ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے پچیس ہزار ترکی پونڈ سالانہ سلطانی خزانے سے لیتا رہا۔ پھر اسے ہدایت کی گئی کہ یہ سلسلہ ختم کرے، چنانچہ اسے سرکاری مشاہروں میں نصف کے قریب تخفیف کرنی پڑی اور "بخشیش" کا دور شروع ہو گیا جو اس کے جانشین واصہ پاشا (۱۸۸۳ء تا ۱۸۹۲ء) کے عہدِ حکومت میں جو فروغ پذیر ہوا۔ خود واصہ بھی شک و شبہ سے بالا نہ تھا۔ اس کی حکومت کا ایک خاص

---

[۵] ہربرٹ لیبینی کا مقالہ "مشرقِ قریب کے ملکوں پر مغربی قانون کا اثر"، جو جارج واشنگٹن لا ریویو جلد ۲۲ بابت ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ صفحہ ۱۲۷ - ۱۴۱۔

Marfat.com

واقعہ یہ ہے کہ لبنان کے لوگ بڑی تعداد میں وطن چھوڑ چھوڑ کر سمندر پار جانے لگے۔ اس زمانے میں جو سڑکیں بڑے شہروں کو ملاتی تھیں، مثلاً زحلہ، عاصیہ، کفر شیما، دیر القمر سے بیروت، صیدا، بیت الدین جانے والی سڑکیں، گاڑیاں چلنے کے قابل بنا دی گئیں۔ شمالی جانب کی سڑک اس نے طرابلس کے جنوب تک پہنچا دی۔ ۱۸۸۸ء میں بیروت کو دمشق سے الگ کر کے ایک نئی ولایت قائم کر دی گئی۔ واصہ اور فرنیکو اپنی میعاد ختم ہونے سے پہلے مر گئے اور انھیں سرکاری اعزازات سے الحازمیہ میں دفن کیا گیا، جو بیروت و دمشق کی شاہراہ پر ہے۔ واصہ پاشا کا جانشین نعوم پاشا (۱۸۹۲ء تا ۱۹۰۲ء) تھا، جو فرنیکو کا داماد تھا۔ اس نے گورنری کی دو میعادیں پوری کیں، لیکن کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دیا۔ شمالی سڑک کو شمال میں طرابلس اور جنوب میں صیدا تک پہنچا دیا۔ اس کی حکومت کے پہلے سال فرانسیسی کمپنی نے بیروت کو دمشق اور حوران کے درمیان ریل کی سڑک بنانی شروع کی جو ۱۸۹۵ء تک مکمل نہ ہوئی۔[1] پھر مظفر پاشا (۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۷ء) گورنر مقرر ہوا۔ وہ اصل میں پولستانی تھا۔ اس کے عہد میں رشوت بہت بڑھ گئی۔ گورنر کے خاندان کے افراد پر بھی زمین اور عوام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام تھا۔ مظفر نے اقتصادی اور عدالتی اصلاحات کا وعدہ کیا، مگر اسے پورا نہ کر سکا۔ پھر یوسف فرنیکو گورنر مقرر ہو کر آیا، جو دوسرے متصرف کا بیٹا تھا (۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۲ء)۔ اس زمانے میں نوجوان ترکوں کے انقلاب (۱۹۰۸ء) کے ساتھ ہی طرح طرح کی ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ اس سے زیادہ ایجی ٹیشن اوہانس کیوم جیان کے عہد میں شروع ہوئی، جس کے بعد پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اوہانس اس سلسلے کا آخری متصرف تھا۔ پہلے متصرف کی طرح یہ بھی ارمن تھا۔ اگست ۱۹۱۵ء میں اس کی جگہ ایک ترک مقرر ہو گیا اور براہِ راست ترکی حکومت جنگ کے اختتام تک جاری رہی۔[2]

**خوشگوار پہلو**

اگرچہ گورنر فی الجملہ زیادہ لائق نہ تھے۔ رقبہ بھی گھٹ گیا تھا۔ زرخیز ساحلی علاقے اور اندرونی میدان چھن گئے تھے۔ بندرگاہوں پر تصرف حاصل نہیں رہا تھا، پھر بھی اس زمانے کو ثقافتی فروغ اور اقتصادی خوشحالی کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ یہ لبنانی عوام کی حسنِ لیاقت، سرگرمیِ عمل اور خوش تدبیری کی برکت تھی۔ لبنان نے حفاظت و استحکام کا وہ درجہ حاصل کیا، جو کوئی دوسرا عثمانی صوبہ حاصل نہ کر سکا، خواہ وہ یورپ میں تھا، یا ایشیا میں۔ لبنان کی پتھریلی ڈھلانوں پر جا بجا شہری آبادیاں قائم ہو گئیں۔ ان کے اردگرد باغات اور کشت زار تھے، جو دور سے معلق باغ معلوم ہوتے تھے تسلیم کر لیا گیا

[1] دائیل کوینے کی فرانسیسی کتاب "شام، لبنان اور فلسطین" صفحہ ۴۲، ۴۳، صفحہ ۳۶۰، ۳۶۲، جوپلین کی فرانسیسی کتاب مسئلۂ لبنان صفحہ ۵۵۱، ۵۵۲۔ [2] اس دور کے متعلق مزید معلومات کے لیے دیکھیے جارج سمنے کی فرانسیسی کتاب شام صفحہ ۲۰۹-۲۳۲، دلیس جلد ہشتم صفحہ ۶۸۵-۶۸۷، المسعودی، پولس مسعد کی کتاب الدولۃ العثمانیہ فی لبنان وسوریہ صفحہ ۴۷-۴۹۔

Marfat.com

کہ اس علاقے کا نظام حکومت سب سے بہتر تھا۔ اس نے بڑی خوشحالی حاصل کی اور مشرق قریب میں اس سے زیادہ پُرامن اور مطمئن علاقہ کوئی نہ تھا۔[1] چند عشروں میں جائدادوں کی قیمت سوگُنا بڑھ گئی۔ اس وقت یہ ضرب المثل وضع کی گئی اور عام ہوئی کہ "خوش نصیب ہے وہ شخص، جسے کوہستانِ لبنان میں بکری کے باڑے جتنی ملکیت بھی حاصل ہے"۔

۱۸۶۰ء کا تاریک بادل بد پہلے جانبے سے محروم نہ تھا۔ یورپی قوموں کے اتحاد نے لبنان کے لیے جو خاص سیاسی درجہ تجویز کرایا تھا، اس کی حقیقی حیثیت محض اتنی نہ تھی۔ اسی کی وجہ سے مغربی یورپ کے پراٹسٹنٹوں میں ہمدردی پیدا ہوئی اور ان کی دلچسپی بڑھی۔ اگست سے ستمبر تک بیروت کی ایک اینگلو سیکسن کمیٹی نے، جو زیادہ تر مقامی شہریوں پر مشتمل تھی، بیس ہزار پناہ گیروں کو امداد دی۔[2] جو نئے تعلیمی، خیراتی ادارے جاری کیے گئے، انھوں نے مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ فرانسیسی اور دوسرے کیتھولک ادارے پہلے سے چلے آتے تھے۔ ۱۸۶۰ء کے فسادات سے ان کا کاروبار معطل ہو گیا۔ اب پھر زور شور سے کام جاری ہوا۔ یسوعیوں نے جو درس گاہ غزیر میں قائم کی تھی (۱۸۴۴ء)، جہاں ارنسٹ رینان نے اپنی مشہور کتاب "حیاتِ مسیح" لکھی تھی (۱۸۶۰ء)، اس درسگاہ کو ۱۸۷۵ء میں بمقام بیروت منتقل کر دیا گیا اور اس نے آگے چل کر مشہور سینٹ جوزف یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ یسوعیوں نے لڑکوں کے لیے زحلہ، تعنائل، بکفیہ اور جزین میں بھی درسگاہیں قائم کی تھیں۔ ۱۸۴۶ء سے سینٹ جوزف (مارسائی) کی راہبات نے، ۱۸۷۱ء میں ناصرہ کی راہبات نے (لیونز)، پھر خاندان مقدس کی راہبات نے اور ایک چوپان کی راہبات نے سکول کھولے۔ ایسے بھی تھے، جہاں صرف تعلیم کا انتظام تھا اور ایسے بھی تھے، جن کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی تھے۔ علاوہ بریں یتیم خانے اور دوسرے خیراتی ادارے بیروت، صیدا، صور، حمّانا اور لبنان کے دیہات میں قائم کیے۔ ۱۸۵۳ء میں مقامی راہبات نے فرانسیسی نمونے کے پیشِ نظر جمعیت مریمات بنائی۔ اس کا صدر مقام بکفیہ تھا۔ آس پاس کے علاقے میں تقریباً بیس سکول کھول دیے۔ اس نظام اور زحلہ کے ایک دوسرے نظام کے ماتحت ۱۹۱۴ء میں چھ ہزار لڑکیاں تیس سکولوں کے اندر تعلیم پا رہی تھیں۔ اس وقت تک شام، لبنان اور فلسطین میں فرانسیسیوں کے کم از کم پانچ سو تعلیمی ادارے تھے، جنھیں بیس مختلف جمعیتیں چلا رہی تھیں۔ طلبہ و طا

---

[1] ولیم ملر کی کتاب The Ottoman Empire & its successors (۱۸۰۱ء-۱۹۲۷ء) صفحہ ۳۰۰، ۳۰۳، چارلس ملیک The Marquis of [illegible] & Age صفحہ ۵۹، جبیب صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲ +

[2] جبیب صفحہ ۲۵۱، ۸۱۱، اینڈرسن جلد دوم صفحہ ۳۵۰-۳۵۱ +

Marfat.com

کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔[1]

اکتوبر ۱۸۶۰ء میں برطانیہ کے شامی مشن نے اس میدان میں قدم رکھا یعنی بیروت، زحلہ، بعلبک، عین زحلتہ، شملان اور حاعبیّہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کے سکول کھولے۔ اسی سال بیروت میں لڑکیوں کے لیے ایک ٹریننگ کالج کھولا گیا۔ یہ اب تک ایک نہایت اہم تعلیمی ادارہ ہے، جہاں معلّمات تعلیم پاتی ہیں۔ سال ختم ہونے سے پیشتر قیصر ورتھ کی پروشوی مہتممات کے عمدفات نے عیدا میں ایک مرکز قائم کیا، جو بعدازاں بیروت منتقل کر دیا۔ انھیں یتیموں کی تربیت اور شفاخانوں کے کام کا بہت عمدہ تجربہ تھا۔ سینٹ جان کے نائٹس نے راس بیروت کے قریب ایک پہاڑی پر جاتیر ہسپتال قائم کیا تھا۔ یہ جگہ فواد پاشا نے انھیں دی تھی۔ پورے علاقے میں دورِ جدید کا یہ پہلا ہسپتال تھا۔ اس میں ماہر نرسیں رکھی گئیں۔ بعدازاں شام کے پراٹسٹنٹ کالج کا طبی عملہ یہاں پہنچ گیا۔ ۱۸۶۳ء میں امریکی مشن نے یہ کالج قائم کرنے کے لیے ووٹ لیے تھے۔ اب یہ بیروت کی مشہور امریکی یونیورسٹی ہے۔ اختتام سال سے پیشتر امریکی مشنوں نے جابجا مرکز قائم کر لیے اور ان کے ساتھ سکول بھی کھول دیے، مثلاً عبیہ، سوق الغرب، صیدا، حاعبیّہ اور طرابلس۔ ان میں سے تین اب تک جاری ہیں۔[2] ۱۸۷۷ء میں سوق کی درسگاہ کے ساتھ طلبہ کے قیام کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ اب خود اس درسگاہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک مجلس نے پورا انتظام سنبھال لیا ہے۔ دق کا ایک سینی ٹوریم معالمتین میں قائم کیا گیا (۱۹۰۹ء) جو جونیہ کے قریب ہے۔ یہ ڈاکٹر میری ایڈی نے قائم کیا تھا، جو ایک مشنری خاندان کی فرد تھی۔ یہ خاندان صیدا اور اس کے قرب و جوار میں سالہاسال کام کر چکا تھا۔ ڈاکٹر میری ایڈی سلطنت عثمانیہ میں غالباً پہلی مستند لیڈی ڈاکٹر تھی۔ پھر یہ سینی ٹوریم الشبانیہ منتقل کر دیا گیا، جو پہاڑی علاقے میں ہے۔ ۱۸۹۷ء میں دماغی علاج کے لیے پہلا سینی ٹوریم العصوریہ میں قائم ہوا، جو بیروت کے قریب ہے۔ اس کا بانی تھیوفلس والڈمیر نام ایک جرمن تھا، جس نے یروشلم کے فرینڈز مشن کی عمارت بنوائی تھی۔[3] سالہاسال تک قرب و جوار میں یہی دو سینی ٹوریم تھے اور ان میں علاج کے لیے ایران تک سے بیمار

---

[1] رسل ہیور صفحہ ۴، ۷، ۹۲، ۲۶۱، ۲۶۲۔ صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰، جارج سمتے صفحہ ۱۸۴، ۲۰۸، جنان صفحہ ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۶۵، ۲۶۴ بعد ۲۷۰، خیراللہ صفحہ ۲۴، ۲۶، تیز مارسمائی کی جیمبرآف کرس (زبان فرانسیسی)۔

[2] Reminiscences Waniel Bliss صفحہ ۱۶۶ بعد، جیسپ صفحہ ۲۵۴، ۸۱۱، راڈرک میچیوز اور متا اکرادی Education in Ahab Comntinesef the Neor Feast صفحہ ۴۹۹، ۵۰۲۔

[3] جیسپ صفحہ ۵۲۱، ۵۲۲۔

Marfat.com

آتے رہے۔ اس وقت تک (مغربی یورپ اور امریکہ میں ۱۸۵۰ء تک) بیمار شخص نیز ہتھکڑی اور بیڑی کو دماغی علاج کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ مارونیوں کا طریقہ یہ تھا کہ دیوانوں کو فرخیہ کی خانقاہ کے حجروں میں بند کر دیتے تھے اور امید یہ رکھتے تھے کہ راہبوں کی دعاؤں کی بدولت بیمار شخص سے نجات حاصل کر لے گا۔

مغرب کی طرف سے ترقی کے یہ محرکات پہنچے تو اہلِ لبنان نے بطیب خاطر اور بہ صمیم قلب ان کا خیر مقدم کیا اور اس باب میں وہ تمام ہمسایوں پر سبقت لے گئے مغربیوں کی آمد پر انھوں نے قناعت نہ کی اور خود مغرب جانے کی کوشش کرنے لگے ۱۸۶۰ء کے بعد فرزندانِ لبنان بہتر زندگی کی تلاش میں چار سو پہنچنے لگے نصف صدی کی مختصر سی مدت میں لبنان قرونِ وسطیٰ سے ترقی کر کے عہدِ حاضر کے دائرے میں پہنچ گیا۔ کرنل چرچل نے ۱۸۵۳ء میں غیر معمولی دور اندیشی اور ذہانت سے کام لے کر (صرف برطانوی تاثر کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) لکھا تھا:[1]

"جب کوہستانِ لبنان کا علاقہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا تو یا اسے انگریز سنبھال لیں گے یا یہ نئی آزاد دولت بن جائے گا، جو توسیع حدود کے محرکات یا فوجی اقدامات کے بغیر ہی اپنی عزت اور اپنا وقار قائم رکھ سکے گا۔ خصوصاً یہ اس بڑے مقصد کو پورا کرے گا جس کے لیے یہ وجود پذیر ہوا اور اپنی جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر یہ اس مقصد کے پورا کرنے کے بہترین اوصاف سے متصف ہے، یعنی مشرق میں تجارتی رسم و راہ کے وسائل پیدا کرنا، انھیں ترقی دینا اور قائم رکھنا۔ اس طرح انسانیت کی متخالف نسلیں اخوت و امن کے تعلقات استوار کرنے کے لیے یہ متحد و یک جا ہو جائیں گی۔"

---

[1] لبنان جلد اوّل صفحہ ۸۔

Marfat.com

## اکتیسواں باب

# یورپ کا اثر اور نئی بیداری

### مغربی اثرات

لبنان سمندر کے عین کنارے واقع تھا۔ آبادی میں مسیحی عنصر کی زیادتی تھی اور فونیقیوں کے زمانے سے اس کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ یہ سلسلہ رومیوں اور بزنطینیوں کے دور سے ہوتا ہوا فخر الدین اور بشیر کے زمانے تک چلا آیا۔ ان حالات کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ لبنان یورپ سے زیادہ خوشگوار اثرات اور نئے نتیجہ خیز افکار کی پذیرائی کے قابل بن گیا۔ عثمانیوں نے پہلے سے زیادہ سخت اور ناقابل گذر پردہ حائل کر دیا تھا، جس کے باعث لبنان باقی ملکوں سے منقطع ہو گیا۔ چونکہ عثمانی مشرق قریب کی ان شاہراہوں پر قابض ہو گئے تھے، جو مختلف براعظموں کے درمیان آمد و رفت اور حمل و نقل کا عام ذریعہ تھیں، اس لیے مغربی فرنگیوں کو ہندوستان اور مشرق بعید کے لیے نیا راستہ تلاش کرنا پڑا۔ سعی و تلاش میں انھوں نے نہ صرف نیا راستہ دریافت کر لیا جس میں جنوبی افریقہ کا چکر کاٹنا پڑتا تھا بلکہ حسن اتفاق سے اسی سلسلے میں انھوں نے نئی دنیا دریافت کر لی یعنی شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ اس طرح مشرقی عربی دنیا کا انقطاع زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باہر سے نئے افکار پہنچنے کی کوئی صورت نہ رہی اور جمود و تعطل شروع ہو گیا۔ عثمانی حکمرانی کا یہ سب سے زیادہ مضر اثر تھا۔ یہی زمانہ ہے، جب یورپ نے علمی اور فنی کارناموں میں قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ یوں اس میں اور مشرق میں مجلسی و اقتصادی خلیج کا پاٹ وسیع تر ہونے لگا۔ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے افتتاح سے مشرق و مغرب کے درمیان مستقیم بحری راستہ پیدا ہوا۔ پھر ریل جاری ہو گئی۔ موٹروں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے سے آمد و رفت ہونے لگی۔ یوں اس علاقے کی قدیم تاریخی حیثیت واسطے کے طور پر بحال ہو گئی اور یہ ترقی کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ آمد و رفت کے وسائل کو بجا طور پر جدید تہذیب کا اعصابی نظام قرار دیا جاتا ہے۔

اگرچہ طبعی اور نظریاتی اعتبار سے یورپ کے ساتھ لبنان کے تعلقات از روئے تاریخ برابر رہے، لیکن انیسویں صدی سے پیشتر یہ طریق زندگی میں وسیع تغیرات سے روشناس نہ ہوا۔

Marfat.com

اسی وقت سے مستقلاً ترقی و تجدد کا سفر شروع کیا۔ ثقافتی سرگرمیوں نے اس کے خط و خال میں تغیر پیدا کر دیا اور لبنان نے مشرقی و مغربی عناصر تہذیب کے امتزاج میں سب کے لیے ایک نمونے کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ پہلا ملک تھا، جس نے قدامت کا خول توڑا اور گرد و پیش کی سرزمینوں کے لیے مرکز تنویر بنا اسی لیے اسے بلد الاشعۃ کہتے ہیں۔ ترکی میں مغربی اداروں کا نفاذ اوپر سے شروع ہوا تھا اور ان کی مخالفت کو حکومت نے واجب التعزیر قرار دیا تھا۔ ایشیا اور افریقہ کی مختلف سرزمینوں میں اقتصادی یا سیاسی مداخلت کے ذریعے سے مغربی افکار و نظریات بروئے کار آئے تھے۔ ان سب کے برعکس لبنان نے بہ طور خود یہ سب کچھ اختیار کیا اور درجہ بدرجہ ترقی کی۔ یہاں سب سے پہلے ذہنی اور روحانی کارگاہوں میں یہ اثرات پہنچے۔ یہاں شہروں کو چھوڑ کر جاذب اور صحت بخش دیہات سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ نپولین کے حملے یا مصریوں کے فوجی قبضے کی وجہ سے وسیع تغیرات جاری نہیں ہوئے تھے بلکہ ثقافتی لہریں بہتی ہوئی اندر پہنچیں تو ان کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ اس طرح پیدا ہونے والے اثر کو علاقے کی قریبی تاریخ کا موثر ترین عامل سمجھنا چاہیے، جو بڑے واقعات یا تغیرات پیش آئے — سیاسی، مجلسی، اقتصادی، روحانی اور ذہنی — ان میں سے زیادہ تر بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی کا نتیجہ تھے +

**تعلیم و تدریس**

انیسویں صدی کی ذہنی بیداری کے لیے اصل محرک مشنریوں کی سرگرمیاں تھیں۔ سب سے پہلے کیتھولک پہنچے، جو زیادہ تر فرانسیسی تھے۔ پھر پروٹسٹنٹ آئے، یہ زیادہ تر امریکی تھے۔ ان سرگرمیوں سے اولاً مقامی مسیحیوں نے فائدہ اٹھایا۔ پھر وہ مغربی ثقافت کو جگہ جگہ پہنچانے کا وسیلہ بن گئے۔ جب یونانی علوم اور فلسفہ عربی دنیا میں پہنچے تھے تو ان مسیحیوں کے آبا و اجداد نے جو وظیفہ اس زمانے میں ادا کیا تھا، وہی مقامی مسیحیوں نے موجودہ زمانے میں ادا کیا۔ کیتھولک اداروں میں سے پہلی چیز سینٹ جوزف کی یونیورسٹی تھی، جس کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں بمقام بیروت رکھی گئی تھی۔ چھ سال بعد پوپ نے اس کی توثیق کر دی۔ ۱۸۸۳ء میں فرانس کی وزارت تعلیم نے ایک مستقل رقم نیز سالانہ رقم اس غرض سے مقرر کر دی کہ ایک طبی درسگاہ قائم کر دی جائے۔ پھر اس میں دوا سازی کے شعبے کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا، جب یسوعیوں کو فرانس سے خارج کیا جا رہا تھا، لہٰذا یہ عجیب اور متناقض معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں لیون یونیورسٹی کی سرپرستی میں انجینئری اور قانون کی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ دندان سازی کا افتتاح ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ فلسفے اور دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی

Marfat.com

آغاز میں مشرقی علوم وابستہ کی تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ اس وقت سے کتابیں فراہم ہونے لگیں اور ایک ایسا ذخیرہ مہیا ہو گیا، جو دنیا کے نہایت قیمتی ذخیروں میں شمار ہوتا ہے[۵۱]۔ ساتھ ہی تحقیق و تفتیش اور کتابوں کی تالیف و اشاعت ہونے لگی۔ ان کی تعداد اور وسعتِ علوم کی کوئی مثال مشرق میں موجود نہ تھی۔ پھر ۱۸۵۳ء میں ایک مطبع قائم کر دیا گیا اور آج یہ مشرقی عربی دنیا کے ان مطابع میں شامل ہے، جو بہترین سامانِ طباعت سے مزین ہے۔

برّاعظم یورپ کی روش کے مطابق یسوعی یونیورسٹی ڈگریاں دیتی تھی۔ جو لوگ علم، سائنس یا کسی پیشے کے لیے خاص تعلیم حاصل کرنا چاہتے، اس کا بھی انتظام تھا، لیکن اس وقت تک کسی ایسی یونیورسٹی کا تصور نہ تھا، جیسی آج کل پائی جاتی ہیں۔ فرانسیسی یونیورسٹی کے برعکس بیروت کی امریکی یونیورسٹی ۱۸۶۶ء میں شامی پراٹسٹنٹ کالج کے نام سے قائم ہوئی۔ یہ امریکہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا نہایت اونچا کارنامہ ہے۔ اس میں طلبہ کے لیے قیام و طعام، کھیلوں اور ایسی ہی دوسری مشغولیتوں کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ مشرق کی تعلیم گاہوں کے لیے یہ بالکل نئی چیزیں تھیں۔ امریکی ادارے میں کردار سازی پر خاص زور دیا جاتا تھا اور معلّم و متعلّم کے درمیان ذاتی تعلقات کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اصل مقصد یہ تھا کہ مقامی ثقافت کے مطالعے پر زور دیا جائے، چنانچہ عربی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ کچھ مدت کے تجربے کے بعد اسے ترک کرنا پڑا کیونکہ نہ ضروری اوصاف سے متصف پروفیسر ملتے تھے اور نہ نصاب کی موزوں کتابیں دستیاب ہوتی تھیں، جو طلبہ کی بڑھتی ہوئی لسانی ضروریات کو پورا کر سکیں[۵۲]۔ اس یونیورسٹی میں آرٹس، سائنس، طب اور دوا سازی کے علاوہ زمانۂ حال میں انجینئری اور زراعت کی درسگاہیں بھی قائم کر دی گئیں۔ ریاست ہائے متحدہ سے باہر یہ ایک اہم امریکی ادارۂ تعلیم بن گیا۔ مشرق میں عربوں کی قومی تحریکات کے لیے اسی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ نے نظریات و قیادت کا سامان بہم پہنچایا۔ اس کی آزاد پالیسی کا کلیدی نقطہ وہ تھا، جس پر اس کے پہلے صدر ڈینیل بلس نے بڑی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے وقت اپنی تقریر میں ذکر کیا تھا:

"یہ کالج رنگ، نسل، قوم اور مذہب کے امتیازات کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام جماعتوں اور گروہوں کے لیے ہے۔ کسی شخص کا رنگ

---

۵۱ Cinet صفحہ ۶۱، ۶۲۔ ۵۲ بلس مذاکرات صفحہ ۲۱۵۔

سفید ہو یا سرخ یا زرد، وہ مسیحی ہو یا یہودی یا مسلمان یا لامذہب، اس درسگاہ میں داخل ہو سکتا ہے اور تین یا چار یا آٹھ سال کے لیے اس ادارے کے تمام وسائل سے یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے اور وہ یہاں سے تعلیم پا کر جائے گا تو خواہ خدائے واحد کو مانے یا بہت سے خداؤں کو مانے یا کسی خدا کو نہ مانے، کالج کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ البتہ جو جو شخص لمبی مدت تک ہمارے ساتھ رہے گا، یہ ممکن نہیں کہ وہ نہ جانے ہم کس چیز کو حق سمجھتے ہیں اور کن وجوہ سے حق سمجھتے ہیں[1]۔"

امریکیوں کی اس کوشش میں خالص مذہبی پہلو بھی ابتداءً موجود تھا، لیکن وہ کامیابی کا متوقع درجہ حاصل نہ کر سکا کیونکہ متعلقہ اصحاب اپنے مشن کو ایسی اقدار کے رنگ میں پیش نہ کر سکے جو مخاطبین کے نزدیک معنی خیز اور قابل قدر ہو سکتی تھیں، لہٰذا مذہبی پہلو کو پیچھے ہٹا کر تعلیم کے بعد ثانوی درجہ دے دیا گیا۔ جن لوگوں نے نئی انجیل کا خیر مقدم کیا، وہ مسیحی گروہوں کے افراد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق آرتھوڈکس یونانیوں سے تھا۔ ان لوگوں نے یہ توقع کیا کہ اپنے معزز کلیساؤں سے تعلقات قائم رکھتے اور ان میں زندگی کی نئی روح پیدا کرتے۔ انھوں نے ۱۸۴۸ء میں ایک نیا سلسلہ قائم کر دیا، جس کا نام الکنیسۃ الانجیلیۃ القوریۃ تھا۔ مسلمانوں پر قطعاً کوئی اثر نہ پڑا۔ مارونی پادریوں نے بڑی شدت سے اور مسلسل مخالفت جاری رکھی۔ اسعد الشدیاق نے جو کنگ کو عربی پڑھائی تھی، وہ پروٹسٹنٹ بن گیا اور اسے قنوبین بلا لیا گیا۔ بطریق اعظم نے اس سے بحث کی۔ بحث ناکام ہوئی۔ اسے خانقاہ کے ایک حجرے میں بند کر دیا گیا، جہاں اس نے وفات پائی (تقریباً ۱۸۳۰ء)۔ مشنریوں نے فی الفور اسے "پہلا شہید" قرار دے دیا[2]۔

اسعد کے دو اور بھائی بھی بڑے ممتاز تھے۔ ایک طنوس الشدیاق (وفات تقریباً ۱۸۶۱ء) اور دوسرا فارس الشدیاق (۱۸۰۴ء تا ۱۸۸۷ء)۔ طنوس شہابی امیروں کے ماتحت جج تھا۔ اس نے لبنان کے جاگیردار خاندانوں کے وقائع مرتب کیے، جن سے اس جلد میں وسیع پیمانے پر فائدہ اٹھایا گیا[3]۔ ۱۸۶۰ء کے فتنہ و فساد میں اس کی پوری جائداد تباہ ہو گئی، جو اس کے وطن الحدث میں تھی اور ایک

---

[1] مجلس مذاکرات صفحہ ۱۹۸۔ [2] اینڈرسن جلد اوّل صفحہ ۵۲-۷۱، جیب صفحہ ۳۴-۳۵، گریگوری ولیبیٹ کی کتاب "شام اور شامی" جلد اوّل صفحہ ۵۳-۵۵، چرچل جلد اوّل صفحہ ۶۱-۶۳۔
[3] اخبار الاعیان فی جبل لبنان۔

ڈکشنری (لغات) بھی شائع ہوئی، جو اس نے مرتب کی تھی۔ رات کے وقت اوڑھنے کو اس کے پاس ایک لحاف بھی نہ رہا[1]۔ فارس نے عین ورقہ میں تعلیم پائی۔ مالٹا میں امریکی پریس کی مطبوعات ریڈٹ کیس اور پراٹسٹنٹ ہونے کا اعلان کر دیا۔ امیر تونیسیہ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا، جس سے امیر اتنا متاثر ہوا کہ ملازمت کے لیے اسے تونیسیہ بلا لیا اور ایک خاص جہاز اسے لانے کے لیے بھیج دیا۔ وہاں وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا اور احمد نام رکھ لیا۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے قسطنطنیہ سے "الجوائب" کے نام سے ایک عربی اخبار نکالا، جو عربی دنیا کے ابتدائی اخباروں میں سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے اخبار کے لیے "جریدہ" کا لفظ استعمال کیا۔ اس کے قلم نے شخصی و ادبی انتقاد میں تیزاب جیسی تیزی کی شہرت حاصل کر لی۔ وصیت کے مطابق اس کی میت الحازمیہ منتقل کر دی گئی، جو اس کا خاندانی وطن تھا[2]۔

## مطابع

یونیورسٹی کے قیام سے پیشتر امریکی مشن نے اپنا مطبع مالٹا سے بیروت میں منتقل کر دیا (۱۸۳۴ء)۔ اس کا پہلا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ بائیبل کا ترجمہ اس عربی زبان میں کیا گیا، جسے نئی کلاسیکی عربی کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے لیے پہلی مرتبہ براہ راست بائیبل کے مطالعے کا موقع پیدا ہوا۔ اس کام میں آٹھ سال صرف ہوئے اور اسے ایلی سمتھ نے انجام دیا جس نے ییل یونیورسٹی سے سند فراغت حاصل کی تھی۔ کارنیلیس وین ڈائیک اس کا رفیق کار تھا۔ یہ مشنریوں میں سب سے زیادہ عالم اور سب سے بڑھ کر محبوب تھا۔ تین اور مقامی عالم اس کام میں تعاون کرتے رہے۔

بیروت کی دو یونیورسٹیوں اور دو مغربی مطبعوں کے ذریعے سے دو ادبی اور علمی وسیلے پیدا ہو گئے اور علوم و فنون کا مبادلہ ہونے لگا۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا اور غیر ملکی عالموں نیز ادبی نقادوں کی ممتاز تصانیف عربی میں منتقل ہوئیں۔

امریکی مطبع اور کیتھولک مطبع سے پیشتر بھی لبنان میں طباعت کا سامان موجود تھا، مگر اعلیٰ درجے کا نہ تھا۔ کوہستان میں قزحیہ (سریانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں خزینۂ حیات) کے مقام پر ایک خانقاہ ہے، جو قادیشا کے نزدیک ایک وادی میں واقع ہے۔ مشرقی عربی دنیا کا سب سے پہلا مطبع یہیں قائم ہوا تھا۔ اس مطبع کی مشین غالباً کوئی مارونی طالب علم روما سے لایا تھا۔ ۱۶۱۰ء میں یہاں عربی زبور

---

[1] لوئی چیخو المخطوطات العربیہ لکتبتہ النصرانیہ صفحہ ۱۲۳، جبیب صفحہ ۱۸۳۔ [2] جرجی زیدان کی کتاب تراجم مشاہیر الشرق فی القرن التاسع عشر جلد دوم صفحہ ۴۷، ۸۳، لوئی چیخو الآداب العربیہ فی القرن التاسع عشر دوسرا ایڈیشن جلد دوم صفحہ ۸۶، ۸۸، فیلیب طرازی تاریخ الصحافۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۷، ۹۶، ۹۹۔

Marfat.com

سریانی (کرشونی) میں حروف چھاپے گئے[۵۱]۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک اور خانقاہ یعنی طامیش (کسروان) نے ترجیہ کی پیروی کرتے ہوئے پہلے سریانی پھر (۱۸۵۵ء) عربی مطبع قائم کیا[۵۲]۔ ۱۷۰۲ء میں حلب کے اندر ایک مطبع قائم ہوا، جو عربی حروف کا پہلا مشرقی مطبع تھا۔ اس کا بانی اتھناسیوس الدباس تھا، جو غالباً مطبع کی مشین ولاشیا سے لایا تھا۔ اس کے حروف ایک یونانی کیتھولک پادری عبداللہ ذاخیر (۱۶۸۴ء۔ ۱۷۴۸ء) نے ڈھالے تھے۔ یہ شخص اصلاً شامی تھا۔ مگر اس نے لبنان کو اپنا دوسرا وطن بنا لیا تھا۔ ۱۷۳۳ء میں عبداللہ اریوحنا الصائغ (سینٹ جان بپتسمہ دینے والا) کی خانقاہ واقع الشویر میں پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک نیا مطبع جاری کر دیا[۵۳]۔ شعیر کے حروف کا نمونہ سامنے رکھتے ہوئے یونس الجبیلی نے، جو ابو عسکر کی کنیت سے مشہور تھا، بیروت کے یونانی آرتھوڈکسوں کی خانقاہ میں ایک مطبع قائم کیا۔ یہاں بھی سب سے پہلے صحیفہ زبور ہی چھاپا گیا (۱۷۵۱ء)[۵۴]۔ اس سے بہت پہلے پوپ نے بمقام فانو (اٹلی) ایک عربی مطبع تیار کر لیا تھا۔ اس میں جو کتابیں چھاپی گئیں، ان میں سے دعاؤں کی ایک کتاب موجود ہے، جو ۱۵۱۴ء میں طبع ہوئی تھی۔ غالباً اسی اطالوی مطبع کو دیکھ کر ولاشیا والا مطبع تیار کیا گیا۔ ۱۸۲۰ء میں محمد علی پاشا نے قاہرہ میں مطبع بولاق کی بنیاد رکھی تو ایک شامی کو اس کی نگرانی کے لیے بلایا۔ اس شخص کا نام نقولا المسابکی تھا اور یہ چار سال اٹلی میں رہ چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان متحرک مشینوں والے مطبع کی سہولتوں سے استفادے میں متامل تھے[۵۵]۔ ان کے نزدیک فن کتابت ایک خاص تقدس اختیار کر چکا تھا کیونکہ ابتدا سے قرآن مجید کی کتابت ہی ہوتی آئی تھی۔ آج بھی مسلمان قرآن کے لیے پتھر کی چھپائی کے سوا ہر چھپائی پر معترض ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لبنان و شام کے مسیحیوں کو عرب مشرق میں فن طباعت کے احیا کا اعزاز حاصل ہو گیا اور ان کے تارکین وطن نے یہ فن دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ عربی کتابوں کی طباعت خانقاہوں میں شروع ہوئی اور لبنانی تارکین وطن اسے دنیا کے چھ بر اعظموں میں لے گئے +

راہب بہ طیب خاطر خانقاہوں کی خلوت گاہوں میں بند ہو گئے تھے۔ ان کی پوری زندگیاں مطالعے، دعا اور غور و فکر میں گزرتیں، یا وہ اپنے باغوں کی نگرانی کرتے اور کبھی کبھی ریوڑ بھی چراتے۔ یہ لوگ دنیوی شور و غل سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ آسمان کا شامیانہ ان سے قریب تر تھا

---

[۵۱] نصراللہ صفحہ ۱-۶، صفحہ ۱۴۰ + [۵۲] انطونیوس شبلی رسالہ المشرق میں جلد ۲۶ صفحہ ۵۹۵ +

[۵۳] نصراللہ صفحہ ۱۷، ۳۲ + [۵۴] لوئی شیخو رسالہ المشرق میں جلد سوم صفحہ ۵۰۱-۵۰۲ +

[۵۵] اے دمیرسمین I.B.L.A میں جلد ۱۷ صفحہ ۱-۲۶، صفحہ ۱۱۳-۱۴۰ +

اہل سپارٹا کی طرح بہت معمولی توشے پر ان کی زندگی کا انحصار تھا۔ آکسیجن سے بھری ہوئی ہوا میں وہ سانس لیتے تھے یہی لمبی ڈاڑھیوں والے لوگ تھے، جنھوں نے صدیوں تک مسیحی زندگی اور ثقافت کا چراغ روشن رکھا۔ عام حالات میں وقت کی رفتار خانقاہوں کی دیواروں پر چڑھ کر اندر جانا مشکل سمجھتی رہی، لیکن مطابع کے لیے یہ مشکل سدِ راہ نہ ہوئی۔

## کتب خانے اور کتابوں کی دکانیں

یونیورسٹیوں کے ظہور سے پیشتر کتب خانوں کی سہولتیں بالکل ناکافی تھیں۔ زیادہ تر کتابی ذخیروں کے مالک مختلف افراد تھے اور یہ خانقاہوں، مسجدوں یا امراء کے مکانوں میں بند رہتے تھے۔ نوجوان محمد امین ارسلان (۱۸۳۸ء–۱۸۶۸ء) نے، جو الجامعۃ العلمیۃ القوریہ کا صدر تھا الشویفات میں ایک خاصا بڑا کتب خانہ جمع کر لیا تھا جس میں تین سو قلمی نسخے تھے۔ یہ ذخیرہ اس کے بھائی مصطفیٰ ارسلان کو ملا، جو عین علوم میں رہتا تھا اور مصطفیٰ کی وفات کے بعد اس کے وارثوں میں تقسیم ہو گیا۔[۱] ویٹیکن کے قومی کتب خانے، نیز یورپ کے دوسرے کتب خانہ ہائے عام میں زیادہ تر کتابیں مسیحی خانقاہوں کے کتب خانوں سے پہنچیں۔ مالکانِ کتب اپنے مملوکات کو چوری سے محفوظ رکھنے کے لیے جو تدبیریں اختیار کرتے تھے، ان کی ایک مثال یہ ہے کہ کتابوں کے اوپر جو کاغذ چڑھایا جاتا تھا یا جن وثیقوں کے ذریعے سے کتابیں کسی کو دی جاتی تھیں، ان میں چور کے لیے بے تکلف لعنتیں درج ہوتی تھیں۔ یہاں جرمانوس فرحات (۱۶۷۷ء–۱۷۳۲ء) مارونی اسقف حلب نے ایک لائبریری کی بنیاد رکھی تھی اور وہ متعدد کتابوں کا مصنف تھا، جن میں سے ایک صرف و نحو کی کتاب بہت رائج ہوئی۔[۲] اس نے مندرجۂ ذیل تحریر کتب خانے کی حفاظت کے لیے مرتب کی تھی:

> "جو شخص اس کتب خانے سے کتاب لے کر واپس نہ کرے، خدا کرے
> اس کا گھر سدوم و عمورہ کی طرح آتش و سنگباری کا ہدف بنے۔
> خدا کرے اس کی جائداد تباہ ہو اور اس کے بچے تلاش معاش? ہو کر
> در بدر بھیک مانگتے پھریں۔"[۳]

اہلِ بیروت میں سے جن افراد نے ذاتی کتب خانے جمع کر رکھے تھے، ان میں سے بعض کے

---

[۱] فیلیب دی طرازی خزائن الکتب العربیہ فی الخافقین صفحہ ۲۶۵، ۲۶۶۔ [۲] بحث المطالب سرکیس صفحہ ۱۴۱–۱۴۳۔ [۳] ابراہیم حرفوش رسالہ المشرق میں جلد ۱۷، صفحہ ۲۲۔

Marfat.com

کتب خانے دارالکتب باللبنانیہ نے خرید لیے تھے، جس کی بنیاد فیلیپ دی طرازی نے ۱۹۲۱ء میں رکھی تھی۔

کتاب فروشوں نے اپنی تجارت کی توسیع اور علم کی افزائش کے لیے سہولتیں پیدا کرنے میں جو خدمت انجام دی، اس کا پورا اندازہ کرنا مشکل ہے کیونکہ دستاویزیں موجود نہیں۔ بعض کتاب فروش پھر پھر کر کتابیں بیچتے تھے۔ ایسا ہی ایک شخص یوسف سرکیس تھا (۱۸۵۶-۱۹۳۳ء) وہ خود پڑھا لکھا تھا اور بہت سی تصانیف چھوڑیں۔ ان میں سے ایک کا نام معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ یعنی مطبوعہ عربی کتابوں اور تراجم کا لغت، جو قاہرہ سے ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ زیر غور باب کی، اس کتاب سے بہت استفادہ کیا گیا۔ سرکیس دمشق میں پیدا ہوا۔ پہلے بیروت میں کام کرتا رہا، پھر قاہرہ چلا گیا، جہاں اس نے کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ مطابع جاری ہونے سے پیشتر لبنان میں کتب فروشوں کی دکانوں پر جو کتابیں ملتی تھیں، انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ یہ کتابیں تاریک کمروں یا حجروں میں بند رہتیں۔ تمام قلمی ہوتیں اور ان کے لیے عموماً زرد رنگ کا کاغذ استعمال کیا جاتا۔ کتابوں کا موضوع یا تو مذہب ہوتا یا زبان یا تاریخ اور تاریخیں بھی نیم افسانوی شخصیتوں کی ہوتیں، جیسے عنترہ اور الزیر۔ باہر سے بہت کم کتابیں منگائی جاتیں۔ اس سے بھی کم باہر بھیجی جاتیں۔ کسی کتاب کا ترجمہ شاید ہی ہوتا۔ طبی علوم پر کسی کتاب کی جستجو کرنے والے کو عموماً ابن سینا (وفات ۱۰۳۷ء) کی کوئی کتاب دی جاتی۔ گرامر کے طالب علم سیبویہ (وفات ۷۹۳ء) یا شرح ابن عقیل (وفات ۷۶۹ء) یا الفیۂ مالک (ایک ہزار اشعار) ملتی۔ باقی رہا علوم طبیعیہ، جغرافیہ یا دور حاضر کی تاریخ کی کتابیں تو یہ بالکل ناپید تھیں۔ مطابع کے جاری ہونے ہی صدی کے اختتام تک صورت حال بالکل بدل گئی اور یہ سب کچھ اس حالت میں ہوا کہ عثمانی احتساب کی کڑی نگرانی موجود تھی۔

## دورِ حاضر کی مقامی درسگاہیں

جب یہ اندازہ ہو گیا کہ مغربی وضع کی تعلیم پانے والے کا وقار بڑھ جاتا ہے اور روپیہ کمانے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو مقامی درسگاہیں بھی خواب سے بیدار ہوئیں۔ انھوں نے بھی لاطینی اور اینگلو سیکسن اداروں کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ انھوں نے فرانس یا امریکہ میں تعلیم پائے ہوئے اساتذہ ملازم رکھے۔ فرانسیسی یا انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا لیا۔ اس کی ایک مثال مدرسۃ الحکمہ ہے، جس کی بنیاد یوسف الدبس نے ۱۸۷۴ء میں رکھی تھی۔ یہی شخص مارونی اسقفی کو کوہستانی

Marfat.com

علاقے سے منتقل کر کے بیروت لے آیا تھا۔ یونانی آرتھوڈکس اسقف نے اپنا مدرسہ سوق الغرب (قائم شدہ ۱۸۵۲ء) سے اُٹھا کر بیروت پہنچا دیا۔ یہ مدرسہ ثلاثہ اقمار یعنی تین چاندوں میں سے ایک چاند ہو گیا۔ ان دو دانش گاہوں کی ہمسر بطریقیہ تھی، جو یونانی کیتھولک بطریق نے قائم کی تھی۔ یونانی کیتھولک کا ایک نظام زحلہ میں قائم ہوا تھا (۱۸۹۸ء) ایک دانش گاہ الکلیتہ الشرقیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے یہ تمام ادارے اب تک برسر فروغ ہیں مسلمانوں نے جو نئی درسگاہیں قائم کیں، انھوں نے بھی مغربی وسائل سے فائدہ اٹھایا اور فرانسیسی و انگریزی کی تعلیم جاری کی، مثلاً مدرسۃ العثمانیہ جو احمد عباس الازہری (۱۸۵۳ء-۱۹۲۷ء) نے بیروت میں قائم کی (۱۸۸۷ء)۔ احمد بیروت میں پیدا ہوا تھا، قاہرہ میں تعلیم پائی، جیسا کہ اس کے نام کے آخری جزو سے ظاہر ہے اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ بطرس البستانی کے سکول واقع عبیہ میں بطور معلم شروع کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں اس کا سکول واقع بیروت بند کر دیا گیا اور اسے قسطنطنیہ جلا وطن ہونا پڑا۔[1]

محض سکول ہی نہیں بلکہ ادبی اور علمی مجلسیں بھی رونما ہوئیں۔ ان میں سے الجامعہ علمیہ الصّوریہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اسے از سر نو ترتیب دے کر ۱۸۶۸ء میں سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس میں مختلف قسم کے افراد شامل تھے۔ مثلاً مسلمانوں میں سے حسین بیہم، دروزیوں میں سے محمد امین ارسلان، مسیحیوں میں سے بطروس البستانی اور ناصیف الیازجی۔ قاہرہ، قسطنطنیہ اور دوسرے ملکوں کے شامی و لبنانی باشندوں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میں جو مقاصد پیش نظر تھے، وہ محض نام سے ظاہر نہیں ہوتے۔ اس انجمن نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جس کا نام مجموعۃ العلوم تھا۔ صنعت، زراعت، سائنس اور ادب پر مقالے اور مضامین شائع کیے۔ اس سرزمین کی تاریخ میں عموماً اور عثمانی اقتدار کی تاریخ میں خصوصاً اہل علم نے پہلی مرتبہ ایسی اجتماعی کوششیں شروع کیں، جن سے سب کو فائدہ پہنچتا تھا اور ملک کی خدمت انجام پاتی تھی۔ اہل علم میں تمام مذاہب کے لوگ شریک تھے۔[2]

---

[1] ابراہیم المعوش اور منیر ابو ہیبہ کی کتاب نبذۃ تاریخیہ عن دارالکتب اللبنانیۃ صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴، جیفو آداب جلد دوم صفحہ ۶۶، ۶۷۔

[2] Georgs Antonius The Ar Awakening صفحہ ۵۳، ۵۴، جیفو آداب جلد اول صفحہ ۷۵، ۷۶۔

Marfat.com

**علوم حاضرہ کے علمبردار** جو تین فاضل بائیبل کے پراٹسٹنٹی ترجمے میں ایک دوسرے کے رفیق تھے، ان میں سے ایک بطرس البستانی تھا، دوسرا ناصیف الیازجی اور تیسرا یوسف الاسیر۔

بطرس البستانی (۱۸۱۹ء تا ۱۸۸۳ء) الدبیہ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین مارونی تھے۔ عین ورقہ میں تعلیم پائی۔ بیروت کے امریکی مشنریوں سے اس نے انگریزی کے علاوہ یونانی اور عبرانی سیکھی۔ اسی نے "عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید" ابتدائی زبانوں سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ الیازجی اور الاسیر نے اس پر نظر ثانی کی۔ پھر ایلی سمتھ اور وینڈائک نے اسے دیکھا۔ بطرس نے عبیہ میں ایک درسگاہ قائم کی جس کا نام الوطنیہ رکھا۔ ۱۸۶۳ء میں اسے بیروت منتقل کر دیا۔ وہاں یہ شامی پراٹسٹنٹ کالج میں شامل ہو گئی۔ وہ امریکی قنصل خانے میں ترجمان کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ علاوہ بریں وہ اخبار اور رسالے کا ایڈیٹر بھی تھا۔ نصاب کی کتابیں بھی لکھتا تھا۔ اس نے لغت بھی مرتب کی اور انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) بھی لکھا۔ یہ سرگرم اور قابل شخص یقیناً پورے عرب مشرق میں انیسویں صدی کے اندر لبنان کا سب سے بڑا عالم تھا اور سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اور عرب مشرق کے نہایت فاضل آدمیوں میں سے ایک تھا۔ اس نے گرامر اور ریاضیات کے متعلق نصاب کی جو کتابیں لکھیں، وہ اب تک رائج ہیں۔ اس کا عربی لغت محیط المحیط (دو جلدوں میں) بیروت سے شائع ہوا (۱۸۷۰ء) اور اس کی تلخیص قطر المحیط پر اگرچہ کبھی نظر ثانی نہ ہوئی، لیکن اب تک اس سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکا۔ بستانی سے پہلے بھی لغت تھے، لیکن وہ بہت ضخیم تھے۔ ان میں زیادہ تر متروک الفاظ بھرے ہوئے تھے۔ ترتیب اچھی نہ تھی۔ وہ تمام لغت الفاظ کے آخری حروف کی بنا پر مرتب ہوتے تھے۔ اس نے جو دائرۃ المعارف مرتب کیا، وہ چھ جلدوں میں شائع ہوا (بیروت ۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۲ء)۔ بستانی کے بیٹے سلیم نے سلیمان البستانی کے تعاون سے مزید پانچ جلدیں شائع کیں (بیروت ۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۰ء)۔ اس نوع کی دوسری کتاب انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا نامکمل ترجمہ ہے۔ البستانی نے سب سے پہلا اخبار نفیر صوریہ کے نام سے ۱۸۶۰ء میں نکالا۔ پھر دس سال بعد ایک ہفتہ وار رسالہ الجنان کے نام سے جاری کیا، جس کا ایڈیٹر اس کا بیٹا سلیم تھا۔ پھر ایک پانزدہ روزہ رسالہ الجنان کے نام سے نکالا۔ ۱۸۷۱ء میں ایک اخبار جاری کیا، جس کا نام الجنینہ تھا اور بستانی کا ایک رشتہ دار سلیمان البستانی اس کا ایڈیٹر تھا۔[1]

---

۱؎ زیدان تراجم جلد دوم صفحہ ۲۷، ۳۳؛ طرازی صحافہ جلد دوم صفحہ ۱۰، ۴۲، ۴۵؛ سرکیس صفحہ ۵۵۷، ۵۶۰؛ بروکلمان صفحہ ۷۶۷، ۷۶۸۔

Marfat.com

ناصیف الیازجی (۱۸۰۰ء تا ۱۸۷۱ء) قدیم و جدید دونوں کی حدوں پر رہا۔ ایک نظم میں اس نے چھری کا تنہا استعمال کرنے کے پہلے تجربے کی مثال یوں پیش کی، جیسے ایک بدوی عورت اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر چلنے کی کوشش کی۔ وہ کفرشیما میں پیدا ہوا۔ جب تک ۱۸۴۰ء میں بشیر اعظم کو جلاوطن نہ کر دیا گیا۔ ناصیف اس کا سکرٹری رہا۔ پھر اس نے بیروت میں اقامت اختیار کر لی۔ بطروس البستانی نے پراٹسٹنٹزم قبول کر لیا تھا۔ ناصیف نے اپنے آبائی کلیسا یونانی کیتھولک سے تعلق قائم رکھا۔ وہ اصلاً ادیب، شاعر اور نحوی تھا۔ اس کی کتابیں البستانی کی کتابوں کی طرح بعد کے نوجوانوں کے لیے نصاب کا کام دیتی رہیں۔ ان میں سے دو کتابوں پر اس کی شہرت کا زیادہ تر انحصار ہے۔ اوّل فصل الخطاب فی اصول لغۃ الاعراب، جو پہلے پہل مالٹا میں شائع ہوئی (۱۸۳۶ء)۔ پھر اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ دوسری مجمع البحرین، یہ ساٹھ مستقل مقالوں کا مجموعہ ہے، جو مقامات حریری (وفات ۱۱۲۲ء) کی پیروی میں لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب بیروت میں طبع ہوئی (۱۸۵۶ء)۔ دیوان المتنبی کی شرح بھی اس نے شروع کر دی تھی، جسے اس کے فرزند ابراہیم نے مکمل کیا (بیروت ۱۸۸۲ء)۔ ابراہیم (۱۸۴۷ء تا ۱۹۰۶ء) اپنے والد سے بھی بڑا ادیب اور نحوی تھا۔ اس نے یسوعی بائیبل کا عربی ترجمہ درست کیا (۱۸۷۲ء تا ۱۸۸۰ء) جو پراٹسٹنٹوں کے ترجمے پر فوقیت لے گیا۔ صحیفہ نگاری کے آغاز سے پیشتر ابراہیم بطریرقیہ بیروت میں عربی پڑھاتا تھا[۵]۔ اس کا مجسمہ شہر کے بڑے چوک کی زینت بنا ہوا ہے۔

یوسف الاسیر (۱۸۱۵ء تا ۱۸۸۹ء) صیدا میں پیدا ہوا۔ ازہر میں تعلیم پائی۔ طرابلس میں قاضی کے عہدے پر مامور رہا۔ داؤد پاشا کے ماتحت عکہ میں مفتی اور لبنان میں وکیل سرکاری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ قسطنطنیہ کے دارالمعلمین میں عربی کا پروفیسر بھی رہا۔ وطن واپس ہوا تو بطریرقیہ اور شامی پراٹسٹنٹ کالج میں پڑھاتا رہا۔ ساتھ ساتھ ثمرات الفنون کی ادارت کرتا رہا۔ یہ پہلا اخبار تھا جو مسلمانوں نے جاری کیا (۱۸۷۵ء)۔ علاوہ بریں وہ نجی طور پر بھی شریعت اسلامی کی تعلیم دیتا تھا۔ المجلہ کو اس نے ایڈٹ کیا اور اس کی شرح لکھی (بیروت ۱۹۰۴ء)۔ دوسری قانونی کتابیں بھی چھاپیں متعدد ممتاز قانون دان اس کے شاگرد تھے[۶]۔ دو پروفیسروں کا ذکر ضروری ہے، جو غیر ملکی تھے اور لبنان کی علمی زندگی کو تقویت پہنچائی۔ ان میں سے ایک امریکی یونیورسٹی میں تھا اور دوسرا یسوعی یونیورسٹی میں۔ کارنیلیس وان ڈائیک

---

۵ جیخو آداب جلد دوم صفحہ ۲۷ - ۴۳، زیدان تراجم جلد دوم صفحہ ۱۳ - ۲۱، معوّذ صفحہ ۵۵ - ۵۶۔

۶ زیدان تراجم جلد دوم صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵۔ جیخو آداب جلد دوم صفحہ ۷۵ - ۷۷، معوّذ ۵۳ - ۵۴، طرازی صحافت جلد دوم صفحہ ۲۵، سرکیس صفحہ ۴۴۹، ۴۵۰۔

Marfat.com

(۱۸۱۸ء تا ۱۸۹۵ء) طبیب بھی تھا، ریاضی دان بھی، ماہر لسانیات بھی تھا، ایڈیٹر بھی، مصنف بھی۔ یہ کچھ مدت تک امریکی یونیورسٹی میں علم الامراض اور علم الہیئت کا پروفیسر رہا۔ ساتھ ہی امریکی مشن کے مذہبی مجلہ "النشرہ" کا ایڈیٹر تھا۔ اسے عربی زبان پر قدرت حاصل تھی اور اس نے کم وبیش تیرہ کتابیں تصحیح کے بعد شائع کیں[51] یہ جغرافیے، ہیئت، ریاضیات (جبر و مقابلہ، مساحت اور (لوگارتم) اور طب (علم الامراض و علم التشخیص) سے متعلق تھیں۔ وہ اپنے اکثر رفیقوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد خیال اور کشادہ دل تھا۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ایک امریکی پروفیسر کو نظریہ ارتقاء کے اثبات پر (جو نیا نیا دریافت ہوا تھا) ملازمت سے جواب دے دیا گیا تھا۔ طلبہ نے اس پروفیسر کے معاملے کو اپنا لیا۔ وان ڈائیک نے طلبہ کی حمایت کرتے ہوئے پروفیسر سے ہمدردی ظاہر کی۔ اس جھگڑے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وان ڈائیک کو استعفا دینا پڑا اور اس نے بیروت میں یونانی آرتھوڈکس ہسپتال منظم کیا (۱۸۸۲ء)[52] وان ڈائیک عبا پہنتا تھا، نارجیلہ پیتا تھا اور اپنے پیچھے ایسا نام چھوڑ گیا جس سے زیادہ احترام کسی کا نہیں کیا جاتا۔ اس کے لبنان پہنچنے کی پچاسویں سالگرہ پر اس کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ یہ تقریب تشکر گزار اہلِ شہر نے جس شان سے منائی، اس کی نظیر رومی عہد کے بعد دیکھی نہ گئی تھی۔

لوئی شیخو (لوویس شیخو ۱۸۵۹ء تا ۱۹۲۸ء) ماردین کا باشندہ اور کلدانی کلیسا کا رکن تھا۔ سوسائٹی آف جیسز (انجمن یسوع مسیح) کے ساتھ وابستہ ہونے سے پیشتر اس نے لبنان اور یورپ میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں یسوعی یونیورسٹی بیروت میں عربی کا پروفیسر رہا۔ سالہا سال تک رسالہ المشرق کا ایڈیٹر رہا۔ یہ اس انجمن کا علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی ماہنامہ تھا۔ شیخو نے اسے اپنے مقالات کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اس نے یورپ کی بڑی بڑی لائبریریاں کھنگال ڈالیں۔ مخطوطات کی تلاش میں شام، العراق اور دوسری سرزمینوں کے سفر کیے۔ غرض یہ تھی کہ ایسی نادر کتابیں مل جائیں جنھیں چھاپ دیا جائے یا یونیورسٹی کی لائبریری کے لیے لے لیا جائے۔ اس نے تیس سے زائد کتابیں شائع کیں۔ یہ زیادہ تر ادبی تھیں (بعض بلا انتقاد) ان میں سے متعدد کتابوں کے حوالے زیرِ غور جلد میں آئے۔ اس کی سب سے زیادہ ضخیم اور مشہور ترین کتاب مجانی الادب فی حدائق العرب ہے[53]۔

ان عالموں اور علم و فضل کے دوسرے علمبرداروں کی تصانیف نہ محض دورِ حاضر کے لبنان بلکہ پوری

---

۵۱ مفصل فہرست کے لیے دیکھیے سرکیس ۱۹۶۳ تا ۱۹۶۵ء ۵۲ زیدان: یکتب قصۃ حیاتہ "الہلال" جلد ۶۲ صفحہ ۳۱، ۳۵۔ ۵۳ نو جلدیں بیروت میں شائع ہوئیں ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۳ء کم از کم اس کے سولہ ایڈیشن نکلے سرکیس ۱۱۶۷، ۱۱۷۰۔

Marfat.com

عربی دنیا کے ذہنی ڈھانچے کی بنیاد و اساس ہیں۔ انھیں نے طلبہ کے لیے نصابی کتابیں معلّمین کے لیے معاون کتابیں اور دائرہ تحقیق میں کام کرنے والوں کے لیے نمونے کی کتابیں تیار کیں۔ انیسویں صدی میں عربی دنیا کے اندر احیاءِ علوم کو انھیں سے تقویت پہنچی۔

## جرائد و رسائل

لبنان کے اندر صحافت کا آغاز ۱۸۵۸ء میں اس دن ہوا، جب الشویفات کے خلیل الخوری نے بیروت سے "حدیقۃ الاخبار" جاری کیا۔ حدیقہ سے پہلے صرف دو اخبار نکلے تھے۔ اوّل "الوقائع المصریۃ" جو محمد علی کا قائم کیا ہوا سرکاری اخبار تھا، جو ۱۸۲۸ء میں نکلنا شروع ہوا۔ عربی اور ترکی دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ دوم "مرآۃ الاحوال" جو ۱۸۵۴ء میں رزق اللہ حسّون حلبی نے قسطنطنیہ سے جاری کیا تھا۔ نپولین نے اپنے حملۂ مصر کے سلسلے میں ایک مدن کی اشاعت کا انتظام کیا تھا، لیکن اسے محض رسمی حیثیت کے سوا اخبار قرار دینا مشکل ہے۔ "حدیقہ" اس علاقے کا واحد اخبار تھا۔ فواد پاشا ۱۸۶۰ء کے فتنہ و فساد کے متعلق اپنے بیانات اور رودادیں بھی اس میں شائع کراتا رہا۔ فرینکو پاشا نے "لبنان" کے تعلق پر "حدیقہ" کو سرکاری اخبار بنا لیا۔ یہ اسی حیثیت میں ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔

جلد ہی اس کے علاوہ دوسرے اخبار جاری ہو گئے۔ ۱۸۶۶ء میں امریکیوں نے "النشرہ" کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک مذہبی رسالہ تھا، جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتا تھا۔ اس کا نام اور اشاعت کے اوقات بدل گئے لیکن یہ اب تک جاری ہے۔ چار سال بعد یسوعیوں نے "النشرہ" کے مقابلے کے لیے "البشیر" جاری کیا۔ یہ بڑا ذی اثر رسالہ بن گیا، جس میں مذہبی اور سیاسی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس کا دستور العمل یہ قول تھا: "تم سچائی سے واقف ہو گے اور سچائی تمھیں آزاد کرے گی"[1] یہ قول البشیر کی پیشانی پر چھپتا تھا۔ یہ رسالہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ دوسری جنگِ عظیم میں چند اور پہلی جنگِ عظیم میں بہت سے جرائد و رسائل برباد ہو گئے۔ جو پرچے اب تک باقی ہیں، ان میں سے ایک قدیم ترین پرچہ "لسان الحال" ہے، جس کی بنیاد خلیل سرکیس نے ۱۸۷۷ء میں بمقام بیروت رکھی تھی۔ زیادہ تر پرچے ہفتہ وار نکلتے رہتے۔ ان میں سیاسی، ادبی اور مجلسی خبریں چھپتی تھیں۔ صحافت نے مقناطیس کی طرح نئی نسل کی بعض بہترین ادبی صلاحیتیں اپنی طرف کھینچ لیں۔ پوری عربی دنیا میں جگہ جگہ اخبار نکل گئے اور عربی تارکینِ وطن انھیں دنیا کے مختلف حصوں میں لے گئے

---

[1] یوحنا کی انجیل باب ۸، آیت ۳۲۔

Marfat.com

"الہلال"[1] کے فراہم کردہ اعداد کے مطابق ۱۸۹۲ء میں بیروت کے اندر چودہ جرائد و رسائل تھے (ان سے پیشتر کے سولہ جرائد و رسائل یا تو اپنی اشاعتیں بند کر چکے تھے یا قاہرہ چلے گئے تھے)۔ پوری عربی دنیا میں اس وقت ایک سو سینتالیس جرائد و رسائل تھے، جن میں سے چوّن اب تک باقی ہیں۔ طرّازی[2] نے عربی صحافت کی تاریخ مرتّب کی۔ اس نے سینتیس سال بعد اعداد فراہم کیے تو تمام عربی کے جرائد و رسائل تین ہزار تیئیس نکلے۔ ان میں سے بعض بند ہو چکے تھے، بعض جاری تھے۔ لبنانی جرائد و رسائل چار سو چھبیس تھے، جن میں سے دو سو چون صرف بیروت سے نکلتے تھے۔ ان عربی جرائد و رسائل میں سے ایک سو دو شمالی امریکہ میں تھے، ایک سو چھیاسٹھ جنوبی امریکہ میں اور چودہ برطانیہ میں۔ چونکہ ان میں سے اکثر شخصی ملکیت تھے اس لیے بند ہونے والے جرائد و رسائل کی تعداد بھی بہت زیادہ رہی۔ جن جرائد و رسائل نے قومی یا قوم پرورانہ مقاصد سے وابستگی پیدا کر لی یا نئے سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار ہو گئے، وہ باقی رہے۔

بالکل ابتدائی دور کے علمی و ادبی رسالے المقتطف اور بالکل ابتدائی نیز عربی دنیا کے حد درجہ ذی اثر اخبار المقطّم کے بانی اور ایڈیٹر یعقوب صرّوف اور فارس نمر تھے۔ یہ دونوں شامی پراٹسٹنٹ کالج کے ابتدائی فارغ التحصیل طلبہ میں سے تھے اور وہاں معلّم بھی رہے۔ مقتطف (پسندیدہ انتخابات) نام ان کے اُستاد وینڈائیک نے تجویز کیا تھا۔ یہ ۱۸۷۶ء میں بیروت سے نکلنا شروع ہوا، پھر یہ قاہرہ منتقل ہو گیا اور ۱۹۵۲ء میں بند ہوا۔ اس کا پورا دور بڑا طویل اور امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں عربی زبان کے بڑے بڑے عالم مقالے لکھتے تھے اور بہترین علمی افکار دوسری زبانوں، زیادہ تر انگریزی سے، ترجمے کر کے چھاپے جاتے تھے۔ یہ رسالہ پشتوں تک عربی خواں اصحاب کے لیے وہ ذہنی غذا مہیّا کرتا رہا، جو اونچے درجے کی درسگاہوں میں مہیّا ہوتی ہے۔ ۱۸۸۹ء میں بمقام قاہرہ المقطّم کی بنیاد رکھی گئی۔ غالباً کسی عربی اخبار کی اشاعت اس کے درجے پر نہ پہنچ سکی۔ یہ بھی ۱۹۵۲ء میں بند ہوا۔ صرّوف اور نمر کے نام لاینفک حیثیت میں وابستہ ہو گئے اور یہ دونوں عربی صحافت کے شیخ مانے جاتے تھے۔ صرّوف حدث میں پیدا ہوا (۱۸۵۲ء) اور قاہرہ میں وفات پائی (۱۹۲۷ء)۔ اس نے عربی زبان کو موجودہ دور کے افکار کے لیے ذریعۂ اظہار بنانے میں تمام اہلِ علم سے بڑھ کر خدمت انجام دی

---

[1] جلد اوّل صفحہ ۱۲، ۱۴۔ [2] صحافہ جلد چہارم صفحہ ۴۸۸ - ۵۱۱۔

Marfat.com

دورِ حاضر کے علوم مثلاً کیمیا، طبعیات، حیاتیات، ریاضیات اور ہیئت کے متعلق مضامین پہلے پہل اسی نے شائع کیے۔ اس کی توجہ تمام تر "المقتطف" پر جمی رہی۔ نمر "المقطم" کے لیے وقف ہو گیا۔ ۱۸۶۰ء میں ایک غریب ماں اپنے چھ سال کے لڑکے اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ حاصبیہ سے صیدا پہنچی۔ حاصبیہ کے ہنگامۂ قتل میں اس کا شوہر موت کے گھاٹ اُتر چکا تھا۔ یہ چھ سال کا بچہ فارس نمر تھا۔ صیدا میں اس نے اینگلو سیکسن تعلیم پائی۔ پھر شامی پراٹسٹنٹ کالج میں پہنچا۔ یہی شخص تھا جو اپنی وفات تک (۱۹۵۲ء) المقطم کا رئیس و منتظم اعلیٰ رہا۔ اس نے سلطان عبد الحمید کے استبدادی دورِ حکومت اور سرکاری کارکنوں کی رشوت خوری کے خلاف مہمیں جاری کیں۔ دوسرے آزاد خیال ایڈیٹروں کی طرح عثمانی عدالت نے اس کے لیے بھی غیر حاضری میں موت کی سزا تجویز کر دی۔

"المقطم" کا مقابل "الاہرام" بھی قاہرہ ہی سے نکلا۔ اس کے بانی دو لبنانی بھائی تھے یعنی سلیم تقلا اور اس کا بھائی بشارہ۔ یہ اب تک نہایت زبردست عربی روزنامچہ ہے اور سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ سلیم (۱۸۴۹ء تا ۱۸۹۲ء) کفر شیما میں پیدا ہوا۔ عبیہ کی لبنانی درسگاہ میں تعلیم پائی۔ بطریرقیہ سے فارغ التحصیل ہو کر وہ مصر چلا گیا اور وہاں سے اخبار جاری کیا (۱۸۷۵ء) بشارہ (۱۸۵۲ء تا ۱۹۱۱ء) نے عین تورہ میں فرانسیسی درسگاہ کے اندر تعلیم پائی تھی۔

"الہلال" کی بنیاد بھی ایک لبنانی تارکِ وطن جرجی زیدان (۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۴ء) نے قاہرہ میں رکھی (۱۸۹۲ء)۔ یہ بھی "المقتطف" کی طرح اوّل درجے کے علمی عربی رسالوں میں شمار ہوتا رہا۔ اس کا خاص دائرہ تاریخ تھا۔ جرجی زیدان بیروت میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین عین علوم میں منتقل ہو گئے تھے۔ جرجی زیدان کے جو مذاکرات وفات کے بعد شائع ہوئے[1] ان میں وہ اپنی تعلیم کے لیے جدوجہد اور تگ و دو کا مفصل ذکر کرتا ہے۔ اس کا والد بالکل ناخواندہ تھا۔ وہ پہلے خباز (نان پز) رہا، پھر ایک چھوٹا سا چائے خانہ کھول لیا۔ اس طرح بمشکل کنبے کا گزارہ ہوتا تھا۔ جرجی زیدان شام کے پراٹسٹنٹ کالج میں طب کی تعلیم پا رہا تھا۔ وہ دوسرے سال میں تھا کہ اسے تعلیم چھوڑنی پڑی اور آئندہ سال (۱۸۸۳ء) وہ مصر چلا گیا۔ زیدان محض ایڈیٹر نہ تھا، اس نے عربی میں ایسی تاریخی کتابیں لکھیں جن میں انتقادی علمی طریقہ اختیار کیا۔ تہذیبی تجربات کا عربی ذخیرہ آپ اس درجہ بھر چکا تھا۔ تاریخی ناول بھی جرجی زیدان ہی نے شروع کیے۔ اس کی دو کتابوں کو شہکاروں کی حیثیت

---

[1] "الہلال" جلد ۶۲ صفحہ ۱۵ ببعد۔

Marfat.com

حاصل ہے۔ اوّل تاریخ التمدّن الاسلامی[1]، دوم تاریخ الآداب العربیہ[2] اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اوّل الذکر کتاب کُلّاً و جزواً انگریزی، ترکی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس نے جو "دارالطباعت" قائم کیا تھا یعنی "دارالہلال"، وہ آج مشرق کے کامیاب ترین اداروں میں سے ہے[3]۔

**ڈراما** عربی ڈراما ۱۸۴۸ء میں اس روز پیدا ہوا، جب ایک لبنانی الاصل عیسائی مارون النقاش (۱۸۱۷ء تا ۱۸۵۵ء) نے چند امیروں، قنصلوں اور دوستوں کو اپنے گھر (واقع بیروت) بلایا کہ "البخیل" نام ایک کھیل دیکھیں۔ مارونی اٹلی کا سفر کر چکا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس نے مولیئر کا ڈراما "لاوار" (بخیل) دیکھا اور اسی سے خود ڈراما لکھنے کی تحریک ہوئی۔ دو سال بعد اس نے ہارون الرشید کے نام سے ایک اور ڈراما لکھا۔ ابتدائی ڈراما اس قدر پسند کیا گیا کہ اس نے اپنے گھر کے پاس ہی عہد حاضر کے انداز کا ایک تھیٹر قائم کر دیا۔ ایکٹروں کو تربیت دی۔ اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ اس قسم کے مشاغل سے عوام کے اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔ ان میں سے بعض کو ابتداءً منت و سماجت کے ذریعے سے بلایا گیا کہ آ کر کھیل دیکھیں۔ اس اولین نمونے کی سوویں سالگرہ پر عربی زبان میں ڈراموں اور ناولوں کی تعداد نو سو تک پہنچ چکی تھی، جن میں سے زیادہ طبعزاد تھے اور بعض دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے تھے[4]۔ فرانسیسی ادب اپنے متنوع پہلوؤں کے ساتھ عربی دنیا کے ہمدرد و دلسوز فرزندوں کے لیے اینگلو سیکسن کے مقابلے میں زیادہ جاذب تھا۔ غالباً اس لیے کہ یہ بحیرۂ روم کی ثقافت کا پروردہ تھا۔ چنانچہ مولیئر، کارنیلی، ریسین، ہیوگو، دوما، روسو وغیرہ شیکسپیئر، ملٹن، ایمرسن اور گوئٹے کے مقابلے میں بہت پہلے ادبی عربی دنیا میں عام چرچا ہو گیا۔ خدیو اسمٰعیل نے نہر سویز کے سرکاری افتتاح کے وقت (۱۸۶۹ء) قاہرہ میں ایک اوپرا ہاؤس تعمیر کرایا تو اس طرح تھیٹر کو سرپرستی مل گئی اور پوری اسلامی دنیا میں اس فن کے لیے

---

۱؎ پانچ جلدیں مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۲ء۔ (مترجم) مصنّف نے اسے شہکار قرار دیا ہے۔ حالانکہ علمی نقطۂ نگاہ سے یہ کتاب پست بھی ہے اور غلط بھی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس پر زبردست انتقاد لکھا تھا، جس سے اس کتاب کی بے حقیقتی واضح ہوتی ہے۔ ۲؎ چار جلدیں مطبوعہ قاہرہ ۱۹۱۱ء۔ ۳؎ عربی صحافت کے مطالعہ کے لیے دیکھیے میکفیڈن کی کتاب DAILY JOURNALISM IN THE ARAB STATS

۴؎ زیدان تراجم جلد دوم صفحہ ۲۰۵ - ۲۰۶۔ ۵؎ یوسف داغر نے المشرق میں (جلد ۴۲ صفحہ ۳۴۴ - ۳۶۰) ان کی فہرست دی تھی، نیز دیکھیے جلد ۴۳ صفحہ ۱۱۸ - ۱۳۹، ۲۷۱ - ۲۹۶۔ انیس المقدسی کی کتاب اتجاہات الادب فی العالم العربی الحدیث جلد دوم صفحہ ۱۴۷ - ۱۵۲۔

Marfat.com

نیا محرک مل گیا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عربی دنیا میں جو کھیل چودھویں صدی سے دکھائے جاتے تھے، موجودہ ڈراما ان سے ارتقا پذیر ہوا۔

اس ذہنی بیداری کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ عربی زبان کی ہیئت بدل گئی۔ جو طویل مدت تک روایتی اور غیر ترقی یافتہ افکار کا زنگ خوردہ ذریعہ بنی رہی۔ یہ خانہ بدوشوں کی زبان تھی۔ پھر اس میں شاعری شروع ہوئی، بعد ازاں مذہب آیا۔ زیادہ تر لبنانی مصنفوں کے قلموں کی بدولت اس میں نئے حالات کے مقابلے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اس طرح اس نے بدلی ہوئی اور بدلتی ہوئی ثقافتی زندگی کے مطابق اپنے آپ کو بنا لیا اور بتدریج وہ حد درجہ قابل قدر دقیقہ سنجی کے ساتھ موجودہ دور کے فنی، فلسفیانہ، قانونی اور سائنٹیفک تصورات کے اظہار کا وسیلہ ہو گئی[۵۱]۔ مغربی دنیا بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دو چار ہوئی تھی۔ اس نے یونانی و لاطینی وسائل سے استمداد کی، لیکن عربی کو ایسی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس نے اجنبیوں سے کوئی چیز مستعار لینا گوارا نہ کیا اور اس سامی زبان نے اپنے سینے سے وہ خام سامان مہیا کر دیا جس سے مطلوب چیزیں تیار کر لی گئیں۔ اصطلاحیں بھی مستعار نہ لیں۔ کیونکہ وہ صوتی اعتبار سے ناخوشگوار اور صرف و نحو کے لحاظ سے ناقابلِ انجذاب تھیں۔ اس میں مادّوں کا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ اس سے کام لے کر سوابق، لواحق اور عطف کی بدولت ہر نئے مطالبے کی تکمیل کا سروسامان کر لیا۔ اس سے پہلے بھی عربی زبان نے نئے حالات کے حقائق کا مقابلہ کیا تھا، جب نویں صدی عیسوی میں یونان اور ایران کے علمی و ادبی ذخیرے بغداد پہنچے تھے۔

اس لسانی نشوو ارتقا کے ساتھ زمانے کی وہ روح، جو ۱۸۳۰ء سے پھونکی جانے لگی تھی، پوری سرزمین میں جاری و ساری ہو گئی۔ یہ روح مطبعوں کی مشینوں کے پہیّوں سے گزرتی ہوئی کتابوں اور موقت الشیوع رسالوں کے صفحات پر پھیلی۔ برقی تاروں کے ذریعے سے دُور دُور تک ضیاپاش ہوئی۔ ریلوں اور دوسری تیز رفتار سواریوں میں اس نے سفر کیا اور کوہستان کے دُور اُفتادہ ترین گوشوں میں داخل ہو گئی۔ تارکینِ وطن نے اس کے تیز شعلوں کو ہوا دی۔ قومیّت اور سیاسی جمہوریّت کے آتشگیر عناصر کے ذریعے سے اس نے لبنان کو عرب مشرق کی ایسی سرزمین بنا دیا، جو سب سے پہلے عہدِ حاضر کے اوصاف سے مزیّن ہوئی۔

---

[۵۱] (مترجم) عربی زبان کے متعلق یہ تحریر انتہائی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ یہ بدوی زبان نہ تھی بلکہ انتہائی ترقی یافتہ زبان تھی۔ جس کی تاریخ اب تک کی تحقیقات کے مطابق کم از کم پندرہ سو سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔

Marfat.com

# بتیسواں باب

# اقتصادی اور مجلسی انقلابات

**حیرت انگیز تغیّر** جن ادارات و افراد کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے، محض انھیں کی وجہ سے اُنّیسویں صدی کا لبنان اٹھارھویں صدی کے لبنان سے حد درجہ مختلف ہو گیا۔ البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان ادارات و افراد نے وہ روحانی فضا پیدا کی جو دوسری قوتوں کی کارفرمائی کے لیے ضروری تھی۔ جب متحرک ثقافت کا تصادم جامد ثقافت سے ہوتا ہے تو یہ مختلف عناصر میں بٹ جاتی ہے، ہر عنصر اپنا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور دوسروں کے ادخال کے لیے بھی سہولت پیدا کرتا ہے۔ اجنبی معاشرے میں اقتصادی تداخل بہرحال تیز رو ہوتا ہے اور مجلسی تداخل سے آگے نکل جاتا ہے۔ اس کی رفتار زیادہ ہے جو معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تکلیف کا احساس بھی نسبتہً کم پیدا کرتا ہے کیونکہ اس کی رفتار میں جذبات کا چنداں دخل نہیں ہوتا۔

اُنیسویں صدی کے اوائل میں کوئی مغربی سیاح لبنان پہنچتا تو مقامی منظر کی عجائب کاری سے بہت متاثر ہوتا۔ مرد ڈھیلی ڈھالی شلواریں (سروال) یا قنبار پہنے ہوتے۔ سروں پر طربوش یا ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں ہوتیں۔ عورتیں مسلمان ہوتیں یا مسیحی، نقاب اوڑھ کر باہر نکلتیں۔ جن کا مجلسی درجہ اونچا ہوتا، ان کے سروں پر قرن نما لمبے طنطور ہوتا۔ سب لوگ فرش پر شطرنجی یا قالین بچھا کر اور تکیہ لگا کر بیٹھتے۔ کھانا تھالیوں میں کھاتے۔ پانی پینے کے لیے چھوٹے چھوٹے ظرف ہوتے، جن میں ٹونٹیاں لگی ہوتیں۔ گھر کا سارا سامان خود ہی تیار کرتے۔ عربی کے سوا دوسری کوئی زبان بولنے والے شاذ ہی تھے۔ ان کی دنیا گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے سے زیادہ تیز رفتار نہ ہوتی۔ وہی سیّاح اُنیسویں صدی کے اواخر میں آتا تو کم از کم بیروت میں اسے اجنبیّت کا کوئی احساس نہ ہوتا، یہی سمجھتا کہ اپنے گھر آیا ہے۔[1]

**اقتصادی تبدیلی** ابتدائی دور میں اس سرزمین کے اقتصادی معاملات دوسری ہمسایہ سرزمینوں کی طرح چھوٹے چھوٹے، سادہ اور خود مختار اداروں کے ذریعے سے انجام پاتے تھے۔

---

[1] ہنری وین لینپ کی کتاب Bible Lands their Modem Customs & Mannees صفحہ ۵۲۸، ۵۳۰، ۵۲۶

Marfat.com

زراعت کوہستانی علاقے میں قوتِ لایموت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ اس سے اتنی ہی جنس پیدا ہوتی تھی، جتنی گزارے کے لیے کفایت کرے۔ اسے باہر بھیجنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ علاقہ لبقاع کے سوا ہر مقام کے کسان صرف اتنی جنس پیدا کر سکتے تھے جو کنبے کے لیے کافی ہوتی۔ دستکاری بھی گاؤں ہی کی بنیاد پر کام کرتے تھے۔ ہر گھر کے سامان میں ایک نمایاں چیز کھڈی ہوتی تھی۔ "کنبہ داری" نہیں تو ہمسائگی، مجلسی تعلقات کی طرح کاروباری تعلقات کی بھی امتیازی خصوصیت تھی۔ تجارت اور صنعت وحرفت کے معاملات دُور دُور انجام پاتے تھے۔ اکثر انسانی تعلقات میں ذاتی رنگ غالب تھا۔ کوئی شخص اجنبی کو پکارتا تو یا اخی (بھائی جان!) یا عمی (چچا میاں) کہہ کر پکارتا۔

بحری اور بری حمل ونقل کے وسائل کی اصلاح ہوئی تو یورپی سامان بکثرت مقامی منڈیوں میں آنے لگا۔ اس میں مانچسٹر کے کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے، پیرس میں مشینوں سے تیار شدہ فرنیچر اور اسی طرح دوسرے مرکزوں سے وسیع پیمانے پر بنی ہوئی چیزیں شامل تھیں۔ ان کی تجارت وتقسیم نئے طریقوں کی متقاضی تھی۔ نئے فنی طریقوں سے بنی ہوئی چیزوں کی اس بھرمار کے مقابلے میں مقامی اقتصاد، جس کی بنا زمانہ قدیم کی خوگر تھی، بالکل بے بس رہ گیا۔ بہت جلد بلادودیہات کی دستکاریاں ماند پڑ گئیں یا معدوم ہو گئیں۔ کپڑے رنگنے، بننے، ٹوکریاں بنانے اور ظروفِ گلی تیار کرنے کے سلسلے میں یہی مصیبت پیش آئی۔ یہ صرف چند چیزوں کا ذکر ہے، ورنہ افادی اور تزئینی صنعت وحرفت کا وسیع دائرہ تھا، جس میں لبنان کے مشتاق دستکار پشتوں سے ممتاز چلے آتے تھے۔ شہروں میں جو افادی چیزیں بنتی تھیں، جیسے فرنیچر، جوتے، لباس انھیں بھی اپنے دقیانوسی طور طریقے ترک کرنے پڑے یا وہ ختم ہو گئیں۔ ایسی چیزیں بھی بنتی تھیں جن کے خاص فنی خط وخال تھے، مثلاً الزروق (کسروان) کے شاندار پارچے، جن کے بیش قیمت لباس، میزپوش، پلنگ پوش، گدیلوں کے غلاف بنتے تھے۔ جزین کی چھریاں اور چاقو، جن کے دستے ہڈیوں کے ہوتے اور نہایت خوبصورت بنائے جاتے۔ یہ چیزیں مقامی خریدار بھی لیتے تھے۔ سیاح بھی تحفۃً لے جاتے تھے، باہر بھی بھیجی جاتی تھیں۔

دیہات کے تغیرات سے نہ صرف دستکاری متاثر ہوئے بلکہ زرعی کارکنوں کی تعداد پر بھی اس سے اثر پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں کی آبادی تیز رفتاری سے وسیع پیمانے پر بڑھنے لگی۔ ریشم کے کیڑوں کی پرورش ساحلی میدانوں اور کوہستان کی مغربی ڈھلانوں کی خاص چیز تھی۔ اس پر پہلی

Marfat.com

جنگِ عظیم تک کوئی بڑا اثر نہ پڑا، تاہم یورپ کے ساتھ (خصوصاً فرانس[1] کے ساتھ) نئے تعلقات کی وجہ سے اسے بڑا فائدہ پہنچا۔ تعلیم پھیلی تو ساتھ ہی اعلیٰ معیارِ زندگی کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ یہ بھی سمجھ لیا گیا کہ دیہات کے بجائے شہروں میں ان تقاضوں کو پورا کرنے کے زیادہ مواقع موجود ہیں۔ اس وجہ سے بھی شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ جو شہر سمندر کے کنارے واقع تھے۔ ان کی گزرگاہوں کے دونوں طرف ناگ پھنی کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ ان کی جگہ صاف ستھرے بازار بن گئے اور ان کی آبادیاں قرونِ وسطیٰ کی فصیلوں سے باہر نکل گئیں۔ بیروت کی آبادی صدی کے آغاز میں پانچ ہزار تھی اور صدی کے اختتام پر ایک لاکھ بیس ہزار ہو گئی[2]۔ جن شہروں کی آبادی بڑھی، ان میں کاروبار کرنے والوں کے ایک نئے گروہ کا ظہور ہوا۔ جس نے رفتہ رفتہ پوری اقتصادی قوت خود سنبھال لی۔ یہی لوگ تھے، جنھوں نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ ان کے ساتھ ہی نئی وضع کے قانون دان، طبیب اور معلّم پیدا ہوئے، جو مغرب یا مغربی وضع کے اداروں کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ تیسرا طبقہ تھا، جو مجلسی امارت کے اُفق پر نمودار ہوا۔ اب تک علاقہ کا معاشرہ صرف دو طبقوں پر مشتمل تھا، ایک اونچا طبقہ، جس میں حکمران، زمیندار اور مذہبی پیشوا شامل تھے۔ دوسرا نچلا طبقہ، یعنی ہل چلانے والے اور مزدور[3]۔ زندگی کی رفتار بدلنی شروع ہوئی۔ تفریح نے بھی فنِ لطیف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ اُس معزز ادارے کی صورت میں نمایاں ہوئی، جسے سہرہ کہتے تھے، یعنی شام کے وقت ایک بڑے کنبے کی شکل میں اکٹھے بیٹھنا، قہوہ نوش کرنا، نارجیلہ پینا، خشک انجیر اور اخروٹ کھانا اور مقامی مسائل پر بات چیت کرنا۔ نئے تغیرات نے اس پر بھی اثر ڈالا۔

## کشمکش اور تعیین مقام

اس زمانے میں خاندانی ادارہ بھی معرضِ شکست میں آ گیا۔ اس کی وضع و ہیئت پرانے زمانے کی تھی، جس میں خاندان کا سب سے بڑا آدمی پورے گھرانے کے نظم و نسق کا ذمّہ دار ہوتا تھا اور تین تین پشتیں ایک ہی چھت کے نیچے رہتی تھیں۔ کسی فرد خاندان کے کتنے ہی بچّے ہوتے، لیکن اس کے لیے بچّوں کی پرورش کبھی کوئی خاص مسئلہ نہ بنتی۔ خاندان کی تربیت مشترک ہوتی اور دادا اپنی وفات تک خود ہی اس کے انتظام کا ذمّہ دار ہوتا۔ اقتدار کی میزبان میں خود مختار ہونے کے بجائے دادا سے وابستہ رہنا

---

[1] دیکھیے جیکوبے دیلورس کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۱۸۵، ۲۶۵، سیوئے صفحہ ۲۱۹۔ [2] جلیب صفحہ ۲۵، ۳۸، سیوئے صفحہ ۵۳۔ [3] رنائل پٹائی کا مقالہ مڈل ایسٹ جرنل میں جلد نہم صفحہ ۶-۱۲۔

زیادہ اہم سمجھا جاتا۔ خاندان کا ڈھانچا معرضِ شکست میں آیا تو پرانے تعلقات اور پرانی قدریں بھی جو خاندان کے ساتھ وابستہ تھیں اور ان کی پرورش ہوتی رہتی تھی، اگر بالکل ٹوٹی نہیں تو کشاکش میں ضرور آگئیں۔ دیہاتی زندگی میں تین عاملوں کو سب سے اونچی حیثیت حاصل تھی۔ اوّل خاندان سے وابستگی، دوم آبائی مذہب کے لیے عقیدت، سوم زمین کے ساتھ رابطہ۔ یہ تینوں ایک دوسری سے وابستہ اور ایک دوسری پر منحصر تھیں۔ پوری قدیم ثقافت کو رشتہ داری کی ثقافت قرار دیا جا سکتا تھا۔ خاندان سے وابستگی یا اسے وسعت دے کر قبیلے سے وابستگی، نیز کلیسا سے وابستگی بہبود و کامیابی کے بہترین مواقع کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔ نئے روشن اوضاع کو یہ حیثیت حاصل نہ تھی[1] کسی فرد کے خلاف اس سے زیادہ رنج افزا کوئی معاملہ نہ تھا کہ اس کے مذہب پر حملہ ہوتا۔ اس کے بعد والدین پر حملہ آتا تھا۔ جب کنبے کا یونٹ چھوٹا ہو گیا یعنی حیاتیاتی، جو مغرب کی پیروی میں اختیار کیا گیا تھا تو نوجوانوں نے تنگ خاندانی دائرے سے باہر نکل کر بیویاں منتخب کرنے کے حق سے استفادہ شروع کیا اور بزرگوں کی رفاقت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پوری قوم کی مجلسی وحدت ٹوٹ گئی اور روایتی وابستگیوں کے لیے احترام میں کمی واقع ہو گئی۔

زوال پزیر قدامت پسندی کی اس دنیا میں، جس پر سورج غروب ہو رہا تھا، یہ طبعی امر تھا کہ بعض لوگوں کو نئے اقدار بھی اسی طرح ناخوشگوار اور تشویش افزا معلوم ہوتے، جس طرح نئے الفاظ و محاورات معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم مجلسی اور اقتصادی نظام میں مطلق العنان حکومت کا سا اقتدار ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ زمین پر مطلق العنان اقتدار کا نتیجہ یہ ہے کہ آسمان پر بھی کامل اور مطلق العنانی سے ملتا جلتا اقتدار تسلیم کیا جائے۔ مغرب سے نئے افکار کی طوفانی لہر پہنچی — یہ لہر عالمگیر تحریک میں محض ایک ہلکورے کی حیثیت رکھتی تھی — اب لبنان میں ایک نئی زندگی نمودار ہوئی، جو نہ پرانی تھی نہ نئی بلکہ دونوں کا مجموعہ تھی۔ یہاں قدیم و جدید کے امتزاج میں اتنی مشکلات محسوس نہ ہوئیں، جتنی دوسری عربی سرزمینوں میں محسوس ہوئیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے دوسرے حصوں میں اس مسئلے کا سامنا ہی نہیں کیا گیا۔

**ترکِ وطن** لبنان کی زمین کوہستانی تھی، خطہ اتنا زرخیز نہ تھا، جتنی آبادی بڑھ رہی تھی۔

---

[1] عفیف طنوس امریکی جرنل آف سوشیالوجی میں جلد ۴۸ صفحہ ۲۳۱، ۲۳۹ سمتھ سونین انسٹی ٹیوشن کی سالانہ روداد صفحہ ۵۳۶-۵۴۳، آنڈرے لیترن کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۲۳۰ بعد۔

Marfat.com

ان حالات میں بچاؤ کا راستہ صرف یہ تھا کہ دوسری سرزمینوں میں ہجرت کی جائے۔ آبادی کی افزائش حد سے بڑھ گئی۔ اگرچہ مراکش سے عراق تک تمام عرب ممالک میں سے صرف لبنان ہی ایسا خطہ تھا جس کی آبادی میں کوئی عنصر خانہ بدوش نہ تھا، جو آبادی کو تازہ خون دے سکتا۔ شام میں چالیس ہزار بدوی خیمے تھے یعنی پوری آبادی کا ۱/۲ حصہ ان پر مشتمل تھا۔ عراق میں بدوی آبادی کا تناسب چھپن فی صد اور پورے جزیرۃ العرب میں اسّی فی صد تھا۔ ممکن ہے مصر میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار لبنان سے بھی تیز تر ہو، لیکن بظاہر عام حالات پر بے اطمینانی کے نفسیاتی عناصر اور اصلاح کے تقاضے مصر میں ویسے زبردست نہ تھے، جیسے لبنان میں تھے۔ پھر لبنانیوں میں حرکت و عمل کی خاص روح اور بحالی کی قوت کا غیر معمولی جذبہ تھا، جس نے بروئے کار آکر نقل وطن کی شکل اختیار کی۔ لبنانی ہمیشہ دنیا بھر میں منتشر ہوتے رہے یہ سلسلہ فونیقیوں کے زمانے میں شروع ہوا۔ رومیوں اور بزنطینیوں کے زمانے میں جاری رہا۔ اس انتشار کی تاریخ کا آخری اور نہایت دلچسپ باب انیسویں صدی کے لبنانیوں نے مرتب کیا۔

اس کے لیے کشش کا پہلا مرکز وادیٔ نیل تھا۔ خدیو اسمٰعیل (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء) نے نہر سویز کا افتتاح کیا تو اپنے نظم و نسق کو دورِ حاضر کے مطابق لانے کا کام شروع کر دیا۔ صرف ایک ہمسایہ گروہ تھا، جس کی طرف وہ اس سلسلے میں متوجہ ہو سکتا تھا یعنی بیروت کی فرنگستانی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ۔ ۱۸۸۳ء میں انگریز مصر پر قابض ہوئے تو انھیں امریکی یونیورسٹی کے تربیت یافتہ نوجوان خدا کی ایک خاص نعمت معلوم ہوئے[۱]۔ ان لوگوں نے مصر و سودان کے نظم و نسق کے فوجی اور شہری شعبوں میں طبیبوں، دواسازوں، کلرکوں اور افسروں کی حیثیت میں ایسی خدمات انجام دیں کہ بہت سے برطانوی افسر بار بار اعتراف کرتے رہے، ہم مصر پر قابض ہو سکتے تھے مگر شامیوں اور لبنانیوں کی امداد کے بغیر یہ قبضہ قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ جن لوگوں نے علمی مشاغل اختیار کیے، ان کا اثر بہت جلد نہ محض مصر بلکہ پوری عربی دنیا میں محسوس ہونے لگا۔ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ صرف انھیں کی صحافتی سرگرمیوں کے باعث مشرقِ عرب کا چراغ از سرِ نو روشن ہوا۔ انھیں لوگوں نے حکومت اور خود عربوں کی تیار کی ہوئی زنجیروں سے آزادی حاصل کرنے میں مدد دی۔ انھیں لوگوں نے دورِ حاضر کی عربی ادبی تحریک کی بنیاد رکھی اور انیسویں صدی کی قومیت کے تصورات و نظریات جگہ جگہ پھیلائے۔ بلاشبہ محمد علی (خدیو مصر) اس سے پیشتر مصر کو تجدد کے راستے پر لگا چکا تھا، لیکن اس کے پوتے اور دوسرے جانشین عباس اوّل (۱۸۴۸ء تا ۱۸۶۳ء) نے تمام یورپی مشیر برطرف کر دیے تھے۔ مغربی وضع کے تمام سکول اور زیادہ تر

---

۱؎ لارڈ کرومر Modern Egypt جلد دوم صفحہ ۲۱۶، اس زمانے میں لبنانیوں کو شامی کہتے تھے۔

Marfat.com

دوسرے ادارے صفحۂ وجود سے محو کر ڈالے تھے۔ اہل علم کے ساتھ ساتھ لبنانی و شامی تاجروں اور کاروباری آدمیوں نے بھی مصر میں نئے گھر بنا لیے۔ ۱۹۰۰ء میں ان کی مجموعی ثروت کی مقدار پانچ کروڑ مصری پونڈ یا مصر کی پوری ثروت کا ۱/۱۰ حصّہ تھی۔[۱] سرکاری لبنانی اندازہ یہ ہے کہ لبنانی متوطنین اور ان کے اخلاف تین ہزار سے کم نہ تھے، لیکن نفع و خوش حالی کا حقیقی مرکز مزید مغربی جانب تھا۔ اُنیسویں صدی کے ساتویں عشرے کے اواخر میں لبنانی تارکینِ وطن امریکہ پہنچے۔ اس سے پیشتر اِکّا دُکّا آدمی گئے ہوں گے۔ پہلا شخص ۲۷ سالہ انطون بشعلانی ساکن سلیمہ تھا، جو ۱۸۵۴ء میں بمقام بوسٹن پہنچا اور دو سال بعد نیویارک میں فوت ہُوا۔[۲] اس کی صد سالہ یادگار منائی گئی تو جمہوریہ لبنان نے ۱۹۵۵ء کو وطن واپس آنے کا سال قرار دے دیا اور واپس آنے والے تارکینِ وطن، زائرین، کی تعلیم و تواضع کے لیے ماہانہ تقریبات کا انتظام کر دیا۔ لیکن اُنیسویں صدی کے آخری عشرے سے پیشتر نقلِ وطن کی تحریک نے زیادہ وسعت اختیار نہ کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان کوہستانِ لبنان کی آبادی میں ایک چوتھائی کی کمی صرف نقلِ وطن کی وجہ سے ہوئی یعنی ایک لاکھ کے قریب آدمی یہاں سے اُٹھ کر ربع مسکوں کے مختلف حصّوں میں پہنچ گئے۔ آج لبنان کے سولہ سو بلاد و دیہات میں سرخ ٹائلوں والا ایک بھی مکان نہیں، جو باہر کے کمائے ہوئے روپے سے نہیں بنا۔ اندازہ یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اڑھائی لاکھ اور برازیل میں ـــ جو سب سے بڑا مرکز ہے ـــ سوا تین لاکھ لبنانی ہوں گے۔ جنوبی امریکہ کے مقام ایلدورلیڈو (ارجنٹینا) میں پہلا عربی بولنے والا شخص ۱۸۸۰ء میں پہنچا تھا۔ یہ مزیارہ (البترون) کا ایک لبنانی تھا۔ لبنان کا سب سے زیادہ دولت مند خاندان ساؤپالو (برازیل، جنوبی امریکہ) میں متوطن ہے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ لوگ کینیڈا، میکسیکو، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، سینیگال پہنچ گئے۔ یہ صرف چند سرزمینوں کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کو کوئی امداد حاصل نہ تھی۔ کوئی ان کا رفیق نہ تھا۔ ان کے پاس پیسا بھی نہ تھا۔ انھوں نے پھیری سے مال بیچنا شروع کیا۔ ارضِ مقدس سے نوادر لے لیتے اور پھر پھر کر بیچتے۔ پھر ڈوری فیتے، جاپانی ڈریسنگ گاؤن، قالین وغیرہ کے سٹور کھول لیے یا کسی مقام پر بند آمد کے دفتر قائم کر لیے اور ان کی شاخیں نصف درجن شہروں میں پھیلا دیں جو مختلف بّرِاعظموں میں واقع تھے اور کمیشن پر کام کرنے لگے۔[۳] جو لوگ نیویارک میں مقیم ہوئے تھے، انھوں نے بیونس آئرس کے ہموطنوں سے کاروباری ربط و ضبط پیدا کر لیا۔ جس شخص نے آسٹریلیا میں سب سے زیادہ دولت فراہم کی، وہ صرف دو سال وہاں رہا، پھر اسے احساس ہوا کہ نیویارک نہیں پہنچا۔ نارسائی کی جہاز راں

---

[۱] برٹش اینڈ بیرسٹی ...... A ... Ra K ... ۱۱۶ صفحہ ...... [۲] ... کیں انگریزی صفحہ

۴۷-۴۸ [۳] اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے ... Speaking Amaricens ...

Marfat.com

کمپنی نے اسے غلط جہاز پر بٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ تاہم مسیحی آبادی سمندر پار مختلف سرزمینوں میں جا بسی۔ دروزیوں نے آہستہ آہستہ حوران کا رُخ کیا۔ مسلمانوں میں سے زیادہ آدمیوں نے ترکِ وطن کے ذریعے اپنی حالت درست کرنے کی کوشش نہ کی۔[1] ایک مصری شاعر نے لبنانیوں کی تحریکِ نقلِ وطن کا خلاصہ یوں پیش کیا ہے :

"ایک زمانے میں انھوں نے زمین کے تمام راستوں پر سفر کیا، تاکہ جتنی چیزیں کہیں تھیں، ان سے زیادہ چیزیں ڈھونڈ لیں۔ اب وہ کسی نایاب سیڑھی کی تلاش میں ہیں، جو انھیں ثریا پر لے جائے، جہاں تازہ تر ہوا ملتی ہے۔"

جن لوگوں نے وطن چھوڑا، خصوصاً ابتدائی دور کے لوگوں نے، دُہرا بوجھ اُٹھایا۔ اوّل وہ اپنی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ دوم ان سن رسیدہ عزیزوں کے گزارے کے لیے رقمیں بھیجتے تھے، جنھیں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ ایسا شخص شاذ ہی ملے گا، جس نے پیچھے کے تمام تعلقات ختم کر دیے ہوں۔ لبنانی حکومت کے فراہم کردہ اعداد سے کہ ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء میں تارکینِ وطن نے جو رقمیں خیراتی، مذہبی اور تعلیمی اداروں یا دوستوں اور عزیزوں کی امداد کے لیے بھیجیں، ان کی مقدار بالترتیب ایک کروڑ اسّی لاکھ ڈالر اور دو کروڑ بیس لاکھ ڈالر تھی۔ زحلہ میں ۱۸۸۵ء تک پتھر کی صرف ایک عمارت تھی اور وہ وہاں کا گرجا تھا۔ پچیس سال بعد اس میں ہر عمارت پتھر کی بن چکی تھی اور ایک بازار کا نام برازیل تھا۔ اس مقام کو لوگ پیار سے جارۃ الوادی کہتے ہیں۔ کیونکہ دورِ حاضر کے ایک مصری شاعر نے اسے یونہی پکارا تھا۔ یہاں سے جو مرد اور عورتیں باہر گئیں، ان کی تعداد پیچھے رہنے والوں کے مقابلے میں تین گنا تھی۔ جمہوریہ لبنان تارکینِ وطن کی بھیجی ہوئی رقوم کو ایک بڑا اقتصادی سرچشمہ سمجھتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی زبانوں پر دو لبنانوں کا ذکر رہتا ہے، ایک لبنان مقیم، دوسرا لبنان المغترب[2] یعنی باہر کے کسی ملک میں توطن اختیار کرنے والے لبنانی۔

بیشک اصل وطنوں سے واسطہ قائم رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ ہوئی، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جن سرزمینوں میں اہلِ لبنان توطن اختیار کر چکے تھے، ان کے متعلق فرائض و واجبات کے قبول میں سہل انگاری سے کام لیا۔ چونکہ موجودہ وضع کا قومی احساس چنداں قوی نہ تھا لہٰذا باہر جانے

---

[1] فرانسیسی انتدابی علاقے کے سرکاری امداد کے لیے دیکھیے تومن صفحہ ۳۳۴، ۳۳۷۔ [2] لبنانی گاؤں میں ترکِ وطن کی وجہ سے جو مجلسی تغیر ہوا، اس کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے دیکھیے عفیف طنوس کا مقالہ رورل سوشیالوجی میں جلد ہفتم صفحہ ۶۲، ۷۴۔

Marfat.com

والے لوگوں کو نئے وطنوں کے اندر گھر کا سا احساس پیدا کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی یہاں میں ہر قسم کی صلاحیت موجود تھی۔ ہر ماحول سے وہ مطابقت پیدا کر سکتے تھے۔ ان چیزوں کی بدولت وہ تمام مقامات پر سب کچھ ہو گئے، مثلاً مصر میں وہ مصری بنے، فرانس میں فرانسیسی، امریکہ میں امریکی اور ان وطنیتوں کو انھوں نے لبنانیت پر مقدم رکھا تاہم جب اپنے گھروں میں پہنچتے تھے تو بیروتی، زحلاوی، دیرانی، حسرونی، ہاتلانی یا مارونی، درزی، یونانی آرتھوڈکس اور متاولہ تھے۔ وہ نئے وطنوں میں جاتے تو سب سے پہلے اس سوال کا جواب دینا پڑتا کہ تمھاری قومیت کیا ہے اور یہ سوال سرسری طور پر کیا جاتا۔ اس وقت بھی بعض لوگ بے تکلف جواب دیتے کہ ہم صوری ہیں +

پہلے صرف ایک راستہ تھا، جو مغربی چیزیں مشرق پہنچاتا تھا۔ اب اس میں ایک اور راستے کا اضافہ ہو گیا، جس کے ذریعے سے مشرق کی چیزیں مغرب جانے لگیں۔ ان کے ساتھ ایسی چیزیں بھی جانے لگیں جو محسوس نہ تھیں۔ تارکین وطن نے اپنی کتابوں، رسالوں، خطوط کتابت و آمدورفت سے خود اختیاری، جمہوریت اور اپنے وطن قدیم کی آزادی کے اصول جاری نہ کیے تو انھیں تقویت ضرور پہنچائی۔ وہ پہلے اس کوشش میں رہے کہ ان کا وطن ترکوں سے نجات پائے۔ پھر فرانسیسیوں سے مخلصی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع ہو گئی۔ انھوں نے لبنان کو گھومنے والا دروازہ بنا دیا۔ مغربی مال و اسباب اور ثقافتی محرکات آتے تھے۔ ادھر سے مشرق قریب کا سامان اور اثرات بھیجے جاتے تھے۔ سلطان عبدالحمید کی حکومت میں جن عرب معتقوں کے لیے موت کی سزا تجویز ہوئی تھی، ان میں متعدد لبنانی تھے، جو قاہرہ اور نیویارک میں اخبار نویسی کر رہے تھے +

لبنانی جہاں گئے، اپنا کھانا پکانے کا طریقہ، کلیسا اور مطبع ساتھ لے گئے۔ نیویارک میں ایک ادبی دائرہ تھا، جس کا صدر پہلے خلیل جبران (جبران خلیل وفات ۱۹۳۱ء)، پھر امین ریحانی (امین الریحانی وفات ۱۹۴۰ء) تھے۔ اس کا اثر پوری عربی دنیا میں محسوس ہوا۔ جبران ایک فنکار، صوفی اور شاعر تھا۔ اسے ان لوگوں میں قائد کی حیثیت حاصل تھی، جنھوں نے عربی شاعری اور عمدہ نثر کو زنگ خوردہ بیڑیوں سے آزاد کیا۔ وہ مصنفین کے ایک نئے دبستان کا بانی ہوا۔ اس کے شاگردوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے، جنھوں نے اس کے اسلوب کی نقل کر لی، لیکن کوئی کام کی چیز نہ لکھ سکے۔ جبران کی تصانیف کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تو امریکا اور یورپی خوانندوں کے دلوں میں بھی

Marfat.com

ہمدردی کی لہر پیدا کی۔ ساؤ پالو میں اسی وضع کا ایک دائرہ قائم ہوا اس نے اپنا نام الاسوۃ الاندلوسیہ رکھا اور ایک ادبی رسالہ نکالا، جو بیسویں صدی کے چھٹے عشرے تک جاری رہا۔ لبنانی اپنے کوہستانی علاقے کے متعلق پر از شاعرانہ احساسات سے معمور رہے۔ نہایت عمدہ اور حد درجہ دل پذیر اشعار وہ ہیں، جن میں کوہستانی علاقے کے سحر انگیز مناظر کی ستائش کی گئی ہے۔ یہ اشعار انھیں لوگوں نے کہے، جو وطن چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے اور ان میں بعض لوگ شاعر بھی شامل تھے۔ لبنان کے اندر اور باہر ایسے رسالے بھی جاری ہوئے، جن میں لوک شاعری کی اشاعت ہوتی تھی۔ بیروت میں ایسے پانچ ہفتہ وار رسالے تھے[1] غالباً عربی بولنے والی کوئی دوسری جماعت ادبی عنصر کے ایسے اعلیٰ ارتقاء کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

**قومیت اور سیاسی جمہوریت** ۱۸۶۸ء میں بمقام بیروت اہل علم کی ایک انجمن کا خفیہ اجلاس ہُوا تھا، جس میں ایک ۲۱ سالہ شاعر نے اپنی نظم میں عربوں سے یوں خطاب کیا تھا:

"عربو! اُٹھو، خواب سے بیدار ہو جاؤ۔
ہم بدبختی کی دلدل میں گھٹنوں تک غرق ہو چکے ہیں"۔

اشارہ صاف طور پر ترکوں کی طرف تھا اور یہ شعر زباں زد خلائق ہو گیا اور نئی تحریک کے لیے صور اسرافیل بن گیا۔ شاعر کا نام ابراہیم الیازجی تھا۔ جس انجمن کے اجلاس میں یہ نظم پڑھی گئی، وہ شام کے اہل علم کی انجمن تھی[2] ذہنی بیداری کا طبعی نتیجہ یہی تھا کہ سیاسی بیداری پیدا ہو اور ترکوں کا جُوا اُتار پھینکا جائے۔ بہت جلد تحریک کا مرکز قاہرہ منتقل ہو گیا، جہاں انگریزوں کے ماتحت اخبارات اور سیاسی انجمنوں کو زیادہ آزادی حاصل تھی[3] لبنانی اور شامی اہل قلم نے جو چنگاری پیدا کی تھی، اس نے شعلے کی حیثیت اختیار کی، یہاں تک کہ آگے چل کر عرب قومیت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ پہلی مرتبہ نئی وضع کی ہوئی، اصطلاحیں یا ایسی اصطلاحیں، جنھیں نئے معنی کا لباس پہنا دیا گیا، کثرت سے استعمال ہونے لگیں، مثلاً وطن، وطنیہ، اُمّہ، استقلال، حقوق الانسان[4] بطروس البستانی نے ۱۸۷۰ء میں

---

[1] رفائیل نخلہ کا مقالہ المشرق میں جلد ۴۰ صفحہ ۳۶۱ - ۳۶۸ ۔ [2] انٹونیس صفحہ ۵۳ - ۵۴ ۔

[3] یہاں مصنف شدید مغالطے کا مرتکب ہُوا۔ انگریزوں کے ماتحت مصری اخبارات کو صرف اس حد تک آزادی تھی کہ ترکوں کے خلاف جو چاہیں لکھیں، خود انگریزوں کے خلاف لکھنے کی آزادی نہ تھی (مترجم)

[4] رئیف الخوری الفکر العربی الحدیثہ صفحہ ۲۱۴، ۲۲۳، نیز دیکھیے نکولا زیادہ کا مقالہ مڈل ایسٹ جرنل میں جلد ششم صفحہ ۴۶۸ - ۴۷۳۔

Marfat.com

ایک پانزدہ روزہ رسالہ "الجنان" کے نام سے جاری کیا۔ جس کی پیشانی پر لکھا جاتا تھا: "حُبّ الوطن من الایمان"۔ حُبِّ وطن کی اصطلاح اس سے پیشتر بھی ادبی تحریرات میں آ چکی تھی۔ مثلاً کلب کے جج ابن الوردی (وفات ۱۳۴۹ء) کی زبان زدِ عوام نظم میں، لیکن اس نے عقیدت کا اعلیٰ جذبہ یا وفاداری کا ایسا غیر معمولی احساس پیدا نہیں کیا تھا۔ بالکل یہی کیفیت اصطلاح "حریت" کی تھی جس نے اب ایک نئی جارحانہ قوت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۸ء میں ایک ہژدہ سالہ بیروتی الیاس صالح امریکی یونیورسٹی بیروت کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا اور ایک نظم میں کہا:[۱]

"اے انسان! تو آزاد ہے، اسے اپنی تعلیم بنا لے۔
آزادی کو ایسا نصب العین بنا لے، جس پر پہنچنا ضروری ہے۔
تو غلام نہیں، آزادی کی تعلیم حوصلہ مندانہ شروع کر دے۔
حکمران کا حقِ حکومت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

دوسری قومیتوں کی طرح عرب قومیت بھی دورِ حاضر کے مغرب سے روشناس ہوئی۔ یہ زیادہ تر فرانسیسیوں کے سیاسی فکر، خصوصاً انقلابِ فرانس اور تیسری جمہوریت سے پیدا ہوئی تھی۔[۲] پہلا تماسی ربط نپولین کا حملہ تھا، جس کی روداد دیر القمر کے ایک لبنانی نکولہ الترک[۳] (۱۷۶۳ء تا ۱۸۲۸ء) نے مرتب کی اور اس کے آغاز میں انقلابِ فرانس کی مختصر سی کیفیت دے دی۔ اسے مصر اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ حملے کے تمام حالات دیکھے اور ان کی روداد مرتب کرے۔ اس کے معاصر مورخ حیدر الشہابی (وفات ۱۸۳۵ء) نے اپنی "تاریخ لبنان" کا ایک حصہ انقلاب فرانس اور نپولین کے حملے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نکولہ اور حیدر ہی کی تحریرات سے لبنانی پہلے پہل انقلاب فرانس اور حملۂ نپولین سے متعارف ہوئے ہوں گے۔[۴] ۱۸۲۰ء اور ۱۸۴۰ء میں انطلیاس کے عامیّے ظہور میں آئے۔ اس نے وسیع بنیادوں پر کام شروع کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ عربی بولنے والے تمام افراد ایک قوم ہیں اور ان سب کو اسے عملی شکل دینے کے لیے جدوجہد شروع کر دینی چاہیے۔ اتحادِ عرب کی یہ نومولود تحریک بہت جلد خاص مقامی مسئلوں سے دوچار ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ مصر میں برطانوی تصرف کی مخالفت قومیت کا معیار بن گئی۔ وہاں مصری قومیت ظہور میں آ گئی۔ شام میں آگے چل کر تمام

---

[۱] زیدان تراجم جلد دوم صفحہ ۲۸۸، جستجو آداب جلد دوم صفحہ ۱۳۶۔
[۲] ہنس کہن A History of Nationalism in the East صفحہ ۲۷۱۔
[۳] بظاہر یہ قسطنطنیہ کے کسی یونانی خاندان سے تھا۔ اس کی روداد مذاکرات نکولہ ترک کے نام سے شائع ہوئی تھی۔
[۴] لبنان صفحہ ۲۱۳ بعد۔

Marfat.com

کوششیں فرانسیسی انتداب کے نظم ونسق اور قیام کے خلاف صرف ہونے لگیں۔ وہاں شامی قوت وجود پذیر ہوئی۔ اتّحادِ عرب کے بازو میں مزاحم تحریکیں گولی بن کر لگیں۔ ان میں پہلی نوجوان ترکوں کی تحریک تھی، جو تمام متصرّفہ علاقوں کو عثمانی بنا دینے کے درپے تھے۔ پھر عربیونی تحریک شروع ہوگئی۔ اسی زمانے میں اتّحادِ اسلام کی تحریک بروئے کار آگئی۔ یہ مسلمانوں کا حد درجہ قومی نصب العین تھا اور پہلے سے ان کے پیشِ نظر تھا۔ اس کا مدّعا یہ تھا کہ نہ زبان، نہ نسل اور نہ قومیّت بلکہ مذہب اتحاد کی پختہ اور پائدار بنیاد ہے۔ دورِ حاضر میں سیّد جمال الدّین افغانی (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۹۷ء) اتحادِ اسلام کے نہایت پُرتاثیر اور اَن تھک داعی بن گئے۔ شیخ محمد عبدہ سیّد کے رفیق تھے۔ وہ بہت بڑے معلم اور مصر کے مفتیِ اعظم تھے۔ سیّد جمال الدّین کی صدا یہ تھی کہ اسلام کسی وطنیّت کا قائل نہیں۔ ان کا عظیم القدر منصوبہ سب پر واضح تھا اور وہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کے تمام حلقہ بگوشوں کو ایک اسلامی حکومت کے تحت لایا جائے اور ان کا صرف ایک رئیسِ اعلیٰ یعنی خلیفہ ہو۔ یہ نصب العین سلطان عبدالحمید کے مقاصد کے عین مطابق تھا اور دورِ حاضر کی قومیّت اس تصوّر سے واضح طور پر متصادم تھی۔ اسلام کسی طبعی یا جغرافیائی حد کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف مذہبی حدود کا قائل ہے۔ اس کا نظریہ آفاقی، بین الاقوامی اور مافوق القومیّت ہے۔ اسلام اقتصادی قدروں کے بجائے روحانی قدروں پر زور دیتا ہے۔ دورِ حاضر کی قومیّت ایسی وفاداری کی متقاضی ہے، جو سب پر فائق ہو، بلکہ ضرورت پیش آجائے تو تمام دوسری وفاداریاں اس کے سامنے ہیچ رہ جائیں۔ مذہبی وفاداری کو بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ یہ قومیّت کسی فرقہ دار گروہ بندی کو تسلیم نہیں کرتی اور صرف سیکولر معاشرے میں فروغ پاتی ہے۔ اپنی انتہائی شکل میں یہ خود مذہب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے پہلی جنگِ عظیم تک عربی سرزمینوں میں کوئی ترقّی نہ کی۔ یہ عوام تک نہ پہنچ سکی اور ان میں حرکت پیدا نہ کرسکی۔ جب تک وہ جنگ کی تکلیفوں کے ہدف نہ بنے اور روڈرو ولسن نے اپنا نظریّۂ خود مختاری پیش نہ کیا۔ اس کے لیے موجودہ اصلاح یعنی قومیّت بیسویں صدی تک وضع ہی نہیں ہوئی تھی۔ پہلی عربی کانگرس ۱۹۱۳ء میں بمقام پیرس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں جو قراردادیں منظور ہوئیں، ان میں اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ بھی زیادہ دُور رس نہ تھیں۔ مثلاً مرکز سے اختیارات اجزاء کی طرف منتقل ہوں۔ عربوں کو انتظامی اور ثقافتی خود مختاری دی جائے۔ عثمانی پارلیمنٹ میں عربی کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ یہی عمل صوبوں میں ہونا چاہیئے جہاں کی زبان عربی ہے[۱]۔ یہ دراصل حزبِ لامرکزیہ کا پروگرام تھا، جس کی بنیاد ایک سال پیشتر قاہرہ میں رکھی

---

[۱] المؤتمر العربی الاوّل صفحہ ۱۱۳ - ۱۱۹ ۔

گئی تھی۔

نیویارک کی لبنانی نو آبادی سے بھی دو اخبار نویس اور ایک وائس پریذیڈنٹ نمائندے بنا کر کانگریس میں بھیجے گئے تھے۔ وہ ایک لبنانی کے پاس پہنچے جو پیرس میں مقیم تھا یعنی شکری غانم (۱۸۶۱ء۔ ۱۹۳۲ء)۔ شکری کا بھائی بیروت کی طرف سے اس عثمانی پارلیمنٹ کا ممبر تھا، جو ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید نے بنائی تھی۔ خود شکری نے فرانسیسی زبان میں عنتر پر ایک غنائیہ لکھا جو پیرس اور قاہرہ میں دکھایا گیا۔[۱]

قومی، بین الاقوامی اور مافوق القومی تموّج و تلاطم کے اس ہنگامے میں لبنان متحیّر رہا۔ دورِ جدید کے تعلیم یافتہ مسلمان اتحادِ عرب کے حامی تھے۔ بیروت کے ایک اخبار کی پیشانی پر اب تک چھپتا ہے: عربیت سب پر برتر۔ مذہبی علماء اتحادِ اسلام کی طرف راغب تھے۔ عوام کو دونوں اتحادوں میں کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ مسیحی لبنانی قومیّت کے داعی تھے، اگرچہ ان کے اہل علم میں سے متعدد عربیّت کی ترجمانی کر رہے تھے۔ دروزیوں کا رجحان بھی لبنانی قومیّت کی طرف تھا۔ شام کی کیفیت بھی یہی تھی، جہاں ۱۹۵۵ء میں ایک واعظ نے جامع اموی میں یہ اعلان کیا کہ انڈونیشیا کا ایک مسلمان مجھے میرے وطن کے مسیحی وزیر اعظم کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ کم از کم نظری اعتبار سے یہ موقف زیادہ محکم تھا۔ رسول اللہ صلعم نے یہی فرمایا تھا کہ "اسلام ایک وسیع برادری ہے"۔

## نوجوان ترک اور عثمانیت

اس اثناء میں ایک نئی وضع کی قومیّت صورت پذیر ہو رہی تھی۔ اس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔

جولائی ۱۹۰۸ء میں دنیا یہ سن کر سراپا حیرت بن گئی کہ ترکی فوج کے ایک میجر، نیازی نے قسطنطنیہ میں ایک کامیاب مسلح بغاوت کی قیادت کی اور نارضامند مستبد سلطان و خلیفہ سے ۱۸۷۶ء کے دستور کی بحالی کا اعلان حاصل کر لیا، جس کا مطلب تھا کہ پارلیمانی نظام بحال ہو جائے۔ نیازی نوجوان ترکوں کی اس جماعت کا نمائندہ تھا، جو ایک خفیہ انجمن یعنی انجمن اتحاد و ترقی کا فولادی بازو تھی۔ یہ انجمن سالہا سال سے عبدالحمید ثانی کے ارتجاعی نظام حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہی تھی اور اصلاحات کی طلبگار تھی۔ اس سلطان نے اپنی حکومت کے پہلے سال آزاد خیال وزیر اعظم مدحت پاشا کی تحریک سے ایک دستور جاری کیا تھا اور ایک نمائندہ پارلیمنٹ (مجلس مبعوثان) کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ان دونوں چیزوں کے سلسلے میں فرانس و بلجیم کے نمونے پیش نظر رکھے گئے تھے۔ اس کے بعد تنظیمات کا اعلان ہوا، جن کے مطابق

---

[۱] ماخوذ صفحہ ۱۵۵-۱۵۶۔

Marfat.com

عثمانی رعایا کے ہر طبقے کے لیے حریت و مساوات کا اعلان کر دیا گیا۔ آزادی جرائد کی ضمانت دے دی
گئی اور وضع قوانین کے دیوانوں کے سلسلے میں نمائندگی عامہ کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ دوسرے سال
کے اوائل میں عبد الحمید نے مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا اور آئندہ سال پارلیمنٹ توڑ دی۔ مدحت پاشا
کے حامیوں میں سے جو لوگ ملک چھوڑ کر باہر نکل گئے، ان میں ایک لبنانی نمائندہ خلیل غانم (۱۸۴۶ء تا
۱۹۰۳ء) بھی تھا جس نے پیرس میں پناہ لی اور وہاں سے البصیر نام ایک عربی اخبار جاری کیا۔ اس اخبار
میں حکومت کو حقیقی حالات پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ان میں ارمنیوں کے قتل کا واقعہ بھی تھا۔ فرانسیسی
اور ترکی اخباروں سے البصیر کے روابط تھے۔[1] بظاہر سلطان کے اعلان کا مقصد یہ تھا کہ اس کے
اقتدار پر تصرف کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس کا سدِ باب ہو جائے۔ پھر اس نے تقریر کی رہی سہی
آزادی بھی ختم کر دی۔ سنسر کا شکنجہ خوب کس دیا۔ جاسوسی کا جال ہر طرف پھیلا دیا اور مغربیت کی
لہر روک دی۔ اس کا دربار رشوت خور رجعت پسندوں اور فرمانبردار کارکنوں سے بھر گیا، جو آقا کے
ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار رہتے تھے۔ جن یورپی طاقتوں کے ماتحت مسلمان رعایا تھی، ان کے ساتھ
تعلقات میں اتحادِ اسلام کو عملے کے طور پر استعمال کیا گیا۔

جس طرح ۱۸۷۶ء کا عبد الحمید اپنے اعلان کی پابندی کا عازم نہ تھا، بالکل وہی کیفیت
۱۹۰۸ء کے عبد الحمید کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ اپنے حامی گروہوں کے
ساتھ مل کر جوابی انقلاب کے منصوبے تیار کر رہا ہے، چنانچہ اسے معزول کر دیا گیا اور اس کا بھائی
طویل نظربندی کے بعد محمد رشاد خامس کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

نوجوان ترکوں کی اس کامیابی کا استقبال تمام صوبوں میں لامتناہی جوش و خروش سے
کیا گیا، لیکن لبنان نے اپنی انتظامی کونسل کی وساطت سے ایوانِ قسطنطنیہ کے لیے نمائندے
بھیجنے کی دعوت مسترد کر دی۔ ایک لبنانی عالم، ادیب سلیمان بستانی (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۵ء) مترجم الیاڈ
نئی حکومت کے ماتحت اعلیٰ عہدے پر سرفراز تھا، جس میں وزارتِ زراعت بھی شامل تھی۔[2] عبد الحمید
کے عہدِ حکومت میں بھی ایک لبنانی سلیم ملحمہ (۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۸ء) بھی وزارتِ معدنیات و زراعت
کا حامل رہ چکا تھا۔ سلیم سترہ سال کا تھا، جب بیروت کے ایک والی کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا۔
والی کے بیٹے سے اس کی گہری دوستی تھی۔ نوجوان ترکوں کے سامنے بڑے نازک قومی اور بین الاقوامی

---

[1] طرازی صحافہ جلد دوم صفحہ ۲۶۱ - ۲۷۱، سرکیس (۱۴۰۵ء تا ۱۴۰۶ء)۔
[2] جارج سمنے صفحہ ۵۷۔ طرازی صحافہ جلد دوم صفحہ ۱۵۹ - ۱۶۸۔

Marfat.com

مسائل تھے، جو ان کے پیدا کردہ نہ تھے۔ وہ خود ناتجربہ کار اور نوآموز تھے، اس لیے وہ ڈانوا ڈول سفینہ سلطنت کو محفوظ ساحل پر نہیں لے جا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ حکومت نے ایک فریق کی ڈکٹیٹری کا انداز اختیار کر لیا، جو پیشرو سے بدتر نہیں تو کم ظالم اتنی بری ضرور تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سلطنت کے تمام قومی گروہوں کو ایک نام کے ماتحت متحد کر دیں یعنی عثمانیت۔ اس کوشش کا نتیجہ اُلٹا نکلا، یعنی علیحدگی کی جو تحریک پہلے سے جاری تھی، اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ عرب قومیت ایک حد تک عثمانی حکومت کے خلاف ردِّ عمل کا نتیجہ تھی۔ اسے اب نئی زندگی مل گئی۔ شام، لبنان، مصر، قسطنطنیہ، پیرس اور نیویارک میں خفیہ اور علانیہ انجمنیں قائم ہوگئیں۔ جنگِ عظیم شروع ہوئی تو نوجوان ترکوں نے وسطِ یورپ کی طاقتوں سے وابستگی پیدا کر لی۔ اس طوفانِ عظیم میں سلطنتِ عثمانیہ نے دم توڑا، ساتھ ہی عثمانی قومیت ختم ہوئی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی قومیت نے لے لی۔ وہ ترکی قومیت تھی۔ قدیم سلطنت کی خاکستر سے نئی ترکی پیدا ہوئی، جو یونانی، عرب اور دوسرے ملحقات سے بالکل پاک تھی۔ اناطولیہ اور اس سے ملحقہ یورپی علاقے تک محدود تھی، جہاں کے لوگ ترکی بولتے تھے۔ یہ تجدد پسند، سیکولر اور مغربیت مآب حکومت تھی، جس نے ایشیا کی طرف سے منہ موڑ کر یورپ کا رخ کر لیا۔ اس غرض سے سلطان خلیفہ محمد سادس کو ۱۹۲۲ء میں معزول کر دیا گیا اور اس کے چچیرے بھائی عبدالمجید کو صرف خلافت کا منصب دیا گیا۔ دو سال بعد خلافت بھی صفحۂ ہستی سے محو کر دی گئی۔ یوں اسلامی ریاستوں میں سب سے زیادہ پائدار و استوار سلطنت یعنی عثمانی سلطنت (۱۳۰۰ء-۱۹۲۲ء) ختم ہوئی۔ اس میں چھتیس سلطان برسرِ حکومت آئے اور اس سے بھی زیادہ پائدار نظام یعنی اسلامی خلافت کا نظام ختم ہوا، جو رسول اللہ صلعم کی وفات سے شروع ہوا تھا[1]۔ نئے نظام کا معمار نوجوان ترکوں کی جماعت میں سے ایک فوجی افسر تھا، جس نے جنگِ عظیم میں شامی محاذ پر حصہ لیا تھا۔ اس کا نام مصطفیٰ کمال تھا اور اسے اتاترک (بابائے اتراک) کا خطاب دیا گیا، جس کا وہ واقعی مستحق تھا۔

[1]
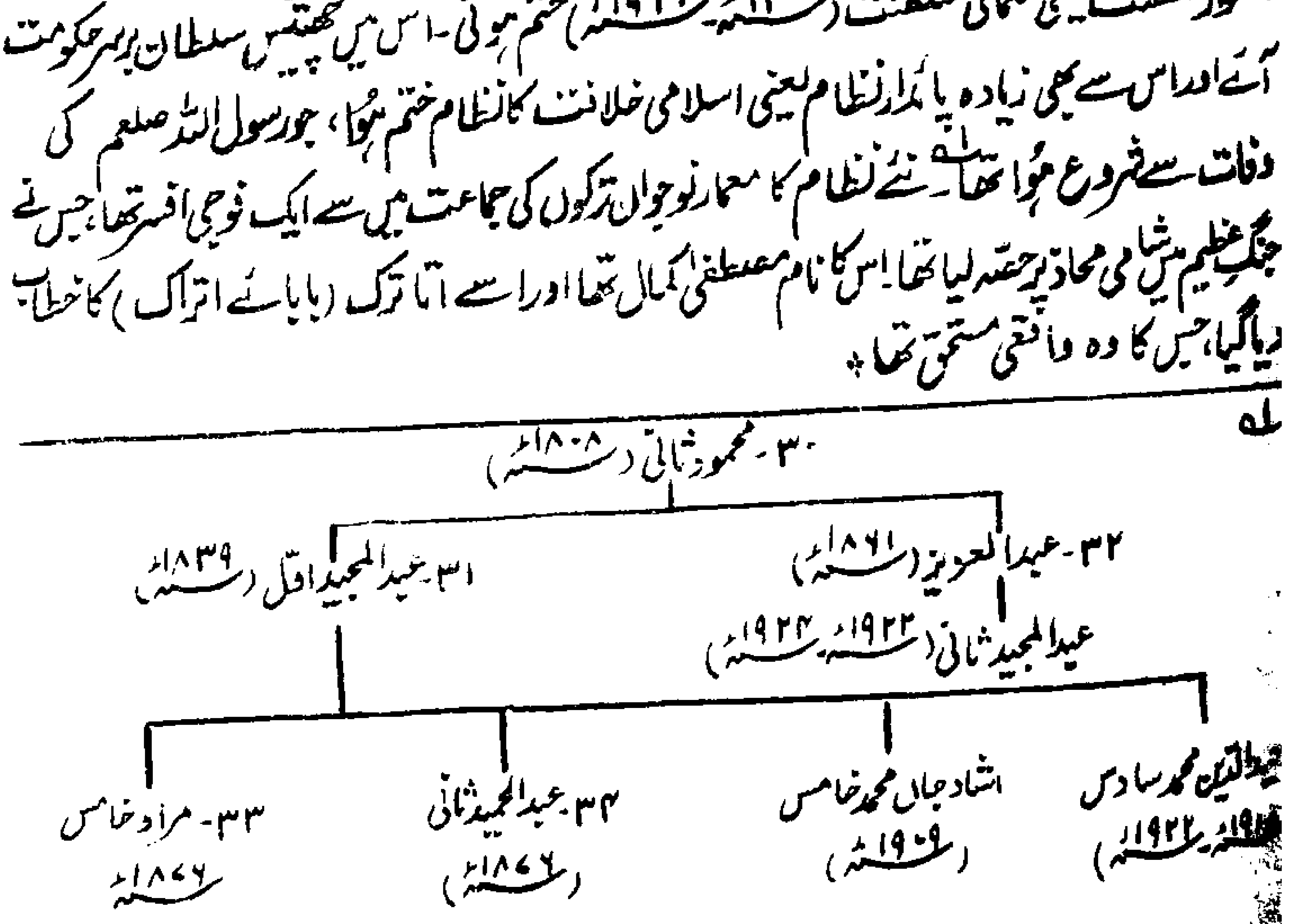


Marfat.com

## تینتیسواں باب

# دو عالمی جنگیں اور حکمداری

وسطی یورپ کی طاقتوں کی رفاقت میں ترکی کے شامل جنگ ہوتے ہی (اکتوبر ۱۹۱۴ء) جمال پاشا دمشق پہنچ گیا۔ وہ ارمنوں کے قتل کے متعلق نوجوان ترکوں کی تعبیر کا معتقد تھا۔ اسے چوتھی فوج کا سپہ سالار اور شام کا فوجی گورنر بنایا گیا تھا، کیونکہ شبہ تھا، اس علاقے کے جذبات عثمانیوں کے خلاف اور عربوں یا فرانسیسیوں کے حق میں ہیں۔ جمال نے پہنچتے ہی لبنان پر قبضہ کر لیا۔ خود مختاری منسوخ کردی اور دہشت کے ایک ایسے دور کا آغاز کیا، جس کے سامنے پہلے دور بھی ماند پڑ گئے۔ اس اثنا میں اجنبیوں کے متعلق امتیاز کا نظام منسوخ ہو چکا تھا۔ وہ خانقاہیں بھی جو بلند پہاڑیوں پر واقع تھیں اور ان کے دامن میں سمندر بہتا تھا، مثلاً مار اشعیا اور مار یوحنا القلعہ، قلعوں کی شکل میں تبدیل کردی گئیں۔ ان میں سے ایک کا نام جمال کے نام پر اور دوسری کا رشاد کے نام پر رکھا گیا۔ ۱۹۱۵ء کے موسم گرما میں متصرف اوہنیس پاشا (جس نے انتظامی مجلس بادل ناخواستہ توڑ دی تھی) کی جگہ علی منیف کو مقرر کر دیا گیا۔ یہ دوسرا ترک تھا جس نے عثمانیوں کے طویل عہد حکومت میں کوہستان لبنان کی کارفرمائی سنبھال لی۔ تین سال تک (اختتام جنگ تک) ملک براہ راست عثمانی حکومت کے ماتحت رہا۔ نہر سویز پر حملے کا ایک غیر مناسب منصوبہ تیار کیا گیا، جس کے لیے سروسامان کے سلسلے میں جمال نے جبری فوجی بھرتی کا قانون جاری کر دیا۔ باربرداری کے تمام جانور طلب کر لیے اور لوگوں کو حکم دیا کہ فوجوں کے لیے رسد مہیا کریں۔

بمقام عالیہ، جسے کوہستان لبنان کے گرمائی مقامات میں عروس کی حیثیت حاصل تھی، جمال نے ایک فوجی عدالت قائم کردی، جو ہر قسم کے مقدمات کا فوری فیصلہ کرتی تھی۔ یہ عدالت فوجی خدمت سے پہلوتہی کے سلسلے میں مصروف رہی۔ لبنان و شام کے مسلمانوں اور مسیحیوں کی ایک تعداد غداری کے شبہے کی بنا پر قید یا جلاوطن کی گئی یا بعض لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ بیروت کے فرانسیسی قنصل خانے سے خط و کتابت کے جو مرقعے ہاتھ آئے، ان سے الزامات کا خاصا مسالا

فراہم ہوگیا۔ ذاتی دشمنی کی بنا پر الزام تراشی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اگر کسی شخص کے متعلق تو اتنا کچھ بیان ہوتا کہ وہ ان میں سے کلبوں یا انجمنوں میں سے کسی ایک کا رکن ہوتا جنھیں ممنوع قرار دیا گیا تھا[۱] تو اسے قابل سزا سمجھا جاتا بلکہ ایک رشتہ دار نے باہر سے خط لکھتے ہوئے تنقیدی اشارہ کر دیا تو اسے بھی قابل مواخذہ قرار دے کر بیروت کے مارونی اسقف کو اناطولیہ جلا وطن کر دیا گیا۔ جس میں اس نے وفات پائی۔ بطریق اعظم کو بھی اسی قسم کی دھمکی دی گئی تھی۔ بعد ازاں زیادہ متین مشورے کامیاب ہوئے جب والی بیروت نے اسے دعوت دی کہ حاضر ہو کر سلطان کا فرمان وصول کرے تو بطریق اعظم نے بیماری کا عذر پیش کیا اور فرمان ایک قاصد کے ذریعے سے اسے پہنچا دیا گیا۔ شریف حسین والی مکہ کو عربی تعصب العین کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ اس مقصد سے اظہار ہمدردی یا فرانسیسیوں کی طرف میلان کی بنا پر ۶ مئی ۱۹۱۶ء کو چودہ مسلمان اور مسیحی بیروت میں اور سات دمشق میں پھانسی دے دیئے گئے[۲]۔ اس کے بعد جمال کو سفاح کا لقب دے دیا گیا۔ یہ یوم آج تک دونوں ملکوں میں یوم شہدا کے طور پر منایا جاتا ہے اور دونوں شہروں (بیروت و دمشق) میں شہدا کے چوک (ساحۃ الشہداء)[۳] موجود ہیں۔

**بے آباد دیہات**

شام و لبنان میں سے لبنان پر زیادہ مصیبتیں نازل ہوئیں۔ بلکہ شاید ہی کوئی دوسرا عثمانی صوبہ اتنی مصیبتوں کا ہدف بنا۔ سیاح اور موسم گرما میں لبنان آنے والے لوگ ناپید ہو گئے۔ باہر سے رشتہ دار اور دوست جو رقمیں بھیجتے تھے، ان کی وصولی میں برسوں نہیں تو مہینوں کی تاخیر ضرور ہو گئی۔ ارباب اغنیا باہر سے خوراک، دوائیں یا کپڑے منگانے کی کوئی کوشش اس عذر کی بنا پر نہ کر سکے کہ اتحادیوں نے ساحل کی شدید ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ درخت کاٹ کاٹ کر ان انجنوں میں ایندھن کے طور پر استعمال کیے گئے، جو فوجی ٹرینیں کھینچتے تھے۔ قیمتیں آسمان پر پہنچ گئیں۔ ترکی کے کاغذی سکے پہلی مرتبہ جاری کیے گئے، جن کی قیمت بہت کم تھی۔ ۱۹۱۶ء کے موسم سرما میں آبادی قحط سے دوچار ہوئی۔ دروزی جوان بھاگ گئے۔ جن بچوں کے ماں باپ نہ تھے، وہ صحرا میں چلے گئے۔ جہاں بدویوں نے انھیں اٹھا لیا۔ جو لڑکی عرب کے شاہی حرم میں داخل ہوئی، اس کا واقعہ مستثنیٰ ہے۔ سالہا سال بعد تک نوجوان مرد اور عورتیں بدوی لباس میں گدے ہوئے بازوؤں کے ساتھ ماضی کی دھندلی

---

[۱] دیکھیے چوتھی فوج کے فرانسیسی کمانڈر کی فرانسیسی کتاب، جس کا ترجمہ القائد العالی للجیش الرابع کی شکل میں شائع ہوا، اضافات صفحہ ۵ بعد۔ [۲] ان ناموں کے لیے دیکھیے القائد جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے، فرانسیسی صفحہ ۱۵۸، ۱۶۸، عربی ترجمہ صفحہ ۱۱۵-۱۲۵، جمال پاشا Memories of a Turkish Statesman صفحہ ۱۹۷، ۲۳۷۔
[۳] دیکھیے جامع حداد Fifty years of Modern Syria صفحہ ۴۸-۵۷۔

یادیں لے کر آتے کہ شاید انھیں کوئی پہچان لے اور ان کے عزیزوں کا صحیح نشان مل جائے۔ ایک لبنانی امریکی ماں جنوب مشرقی لبنان کے چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی، جو ایک لڑکے کی ولادت کے بعد فوت ہو گئی۔ پھر اس کے دوسرے رشتہ دار بھی وفات پا گئے اور وہ تنہا رہ گیا۔ آخر وہ آس پاس کی پہاڑیوں میں چلا گیا، جہاں درختوں کی جڑیں اور پتے کھا کر گزارہ کرتا۔ بھولی بھٹکی بکری چنتی پھرتی مل جاتی تو اس کا دودھ پی لیتا۔ خاصی مدت گزر جانے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ امریکی شہریت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ امریکہ پہنچا اور اپنی عجیب و غریب کہانی سنائی۔[۵۱] مندرجہ ذیل اقتباس میں بیروت کی امریکی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی روداد کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے:[۵۲]

"جو لوگ قوتِ لایموت کی تلاش میں اندرونِ ملک کی طرف بھاگ نہ سکے وہ شہر کے بھکاریوں کی روز افزوں فوج میں شامل ہوتے گئے۔ یہ لوگ اتنے قوی تھے کہ بازاروں میں پھر سکتے، دروازوں پر دستک دیتے یا وہاں پہنچ جاتے جہاں جانوروں کی اوجھڑیاں پھینکی جاتی تھیں یا مُردہ جانوروں کو تلاش کر لیتے تھے۔ جن لوگوں میں اتنی طاقت نہ تھی، وہ بازاروں میں ایک طرف لیٹ کر ہاتھ پھیلا دیتے، ان کے جسم تحلیل ہو رہے تھے۔ آوازیں بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ایسے بھکاری بھی تھے، جن میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔ وہ خود زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے البتہ ان کی نگاہیں مصیبت کی داستان سنا دیتی تھیں ...... ۱۹۱۸ء تک معاشرت کا نچلا طبقہ محو ہو چکا تھا اور درمیانی طبقے نے اس کی جگہ لے لی تھی"۔

اس اثنا میں لبنان کی پوری سرزمین بیماریوں کے جراثیم کا بہشت زار بن چکی تھی۔ جن سات طاعونوں سے مصر پر ضربیں لگی تھیں، وہ زیادہ مہلک نتائج کے ساتھ لبنان پر نازل ہوئیں۔ کھٹملوں نے ٹائیفائیڈ، جوؤں نے ٹائیفس اور چوہوں نے گلٹی والا پلیگ پھیلایا۔ ایک اور سرحائی بلا مچھروں کی تھی، جس کی وجہ سے موسمی بخار کے اموات میں بہت اضافہ ہو گیا۔ پینے کا پانی بہت خراب اور ناپاک تھا، اس نے پیچش پھیلائی۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں ٹڈی دل اس زور سے آئے کہ سورج کو ڈھانپ لیا۔ اندازہ کیا گیا ہے

---

۵۱ سلوم رزق (RIZK) کی کتاب Syrian Yankee ۔ ۵۲ جرجوس الخوری المقدسی کی کتاب "عزم حرب فی التاریخ" صفحہ ۵۳ - ۵۴ - ۸۱، نیز دیکھیے انطون یمین کی کتاب لبنان فی الحرب جلد اوّل صفحہ ۱۰۲-۱۰۵، صفحہ ۱۳۰ بعد، جلد دوم صفحہ ۵ بعد۔

کہ لبنان کے بہ حیثیت مجموعی ایک لاکھ آدمی مرگئے۔ اموات کی تعداد بہت بڑھ جاتی اگر تارکین وطن کی طرف سے امدادی رقمیں نہ پہنچتیں۔ جنگ کے صرف پہلے سال ان رقموں کی مقدار پچیس کروڑ نوّے لاکھ ڈالر تھی۔ ساتھ ہی نیویارک کے ایک شہر کلیولینڈ ایچ ڈاج نے اہل امریکہ کو رفاہِ عامہ کی طرف متوجہ کیا۔ یہ شخص اس خاندان کا رکن تھا، جو پشتوں سے پورے مشرق قریب کی تعلیمی اور اقتصادی بہبود میں دلچسپی لیتا رہا تھا۔ کلیولینڈ کا بیٹا بیرڈ ڈاج اس زمانے میں بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تھا۔ اس نے رفاہی رقمیں تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ ہزاروں اشوری اور ارمنی پناہ گزین ترکی سے لبنان پہنچ گئے صرف بیروت کے کیمپ میں پندرہ ہزار آدمی مقیم تھے اور آس پاس کے کیمپوں میں بھی اتنی ہی تعداد تھی امریکہ والوں نے مشرق قریب کی امداد کے لیے جو مجلس بنائی تھی، اس نے جنگ کے بعد بھی امدادی کام جاری رکھا (۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۹ء)۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دس کروڑ ڈالر تقسیم کیے ایک لاکھ چھتیس ہزار بچوں کو تعلیم دی۔ ایک کروڑ پچیس لاکھ افراد کی پرورش کا انتظام کیا اور ساٹھ لاکھ افراد کو طبی مدد دی[1]

ایک ساحلی شہر البترون کی آبادی آغازِ جنگ میں پانچ ہزار تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو کل آبادی تو دو ہزار رہ گئی۔ جنوبی لبنان اور صیدا کے علاقے میں امریکی مشنریوں نے حالات کی چھان بین کی تو ظاہر ہوا کہ ایک سو بیاسی گاؤں ایسے تھے جن میں دس ہزار مکانات تھے اور ستّر ہزار آبادی۔ جنگ کے چار سال میں اڑھائی ہزار مکان اور تینتیس ہزار باشندے تباہ ہو گئے، صرف چالیس ہزار باقی رہ گئے۔ ان میں سے سولہ ہزار چار سو قلاش محض تھے اور دو ہزار چھ سو یتیم بچے تھے۔ بہرحال ساڑھے چار لاکھ کی آبادی میں سے ایک لاکھ ختم ہو گئے[2]۔

## فرانسیسی حکمداری

مستقل امداد کا دن اس وقت طلوع ہوا، جب ستمبر ۱۹۱۸ء میں جنرل ایلنبی نے مصری مرکز سے اقدام شروع کیا اور فیصل بن حسین کی عربی فوجوں کی امداد سے شرق اردن میں سے ہوتے ہوئے[3] فلسطین پر قبضہ کیا اور لبنان و شام پر تصرف کا راستہ ہموار ہوا۔ اکتوبر کو فرانس کا ایک بحری لشکر بیروت میں لنگر انداز ہوا۔ دریائے کلب کے دہانے پر دو کتبے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں اس تاریخی واقعے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ مقام ہے جہاں سینکڑوں پہنچنے والی قومیں پہاڑی راستے سے گزرتی ہوئی اس چٹان پر اپنی مہریں ثبت کرتی رہیں۔ ستمبر کا مہینا ختم ہونے والا تھا

---

[1] فرینک اے راس، سی لوتھر فرائی اور ایلبرج سیلے: The Near East American Philanthropy صفحہ ۲۔

[2] مقدسی صفحہ ۵۹۔ [3] یہی مہمیں ہیں جن میں ٹی، ای لارنس نے جو "عربیت" کے انتساب سے معروف ہوا، درجۂ امتیاز حاصل کیا تھا، دیکھیے اس کی کتاب صفحہ ۱۴ ببعد، نیز Seven Pillars of Wesest صفحہ ۵۳۷ ببعد۔

Marfat.com

کہ فیصل برطانوی افواج کی مدد سے دمشق پہنچ گیا اور ترکی نے مدروس (واقع جزیرہ لمنوس) میں متارکے پر دستخط کر دیے اور تمام افواج کو فوراً جنگ ختم کر دینے کی ہدایت کر دی۔ طارس تک کا علاقہ اتحادیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں ایک کانفرنس بمقام سان ریمو (اٹلی) میں ہوئی۔ جس میں فرانس و انگلستان کو تقسیم شدہ ترکی سلطنت کے حصوں کا جائز وارث تسلیم کیا گیا، چنانچہ فرانس کو شام و لبنان پر اور برطانیہ کو فلسطین و عراق پر حکمداری دے دی گئی۔ چار مہینے کے بعد ترکی نے معاہدہ سیورلیے (فرانس) پر دستخط کر دیے جو صلح کانفرنس کی طرف سے اس کے حوالے کیا گیا تھا، جن علاقوں کے لیے حکمداری کا نظام تجویز ہوا تھا، ان کے تمام حقوق سے دست برداری اختیار کر لی اور ان کے آئندہ انتظام کی تصدیق کر دی۔ دو سال بعد حکمداری کے نظام پر لندن میں دستخط ہو گئے۔ یوں جمعیت اقوام کی سرپرستی میں فرانس و لبنان کے درمیان نئے تعلقات کا آغاز ہوا۔ اس اثنا میں دمشق کے باہر میسلون کی لڑائی ہو چکی تھی (۲۴۔ جولائی ۱۹۲۰ء)۔ اس میں شامیوں نے فیصل کے تخت کے لیے (فرانس کی) مزاحمت کی تھی۔ وہ مزاحمت ختم ہو گئی اور فرانس کا اقتدار شام پر پوری طرح بحال ہو گیا۔

حکمداری کا نظام حکومتوں کے درمیان باہمی تعلقات کا ایک بالکل نیا نمونہ تھا۔ عموماً بیان کیا جاتا ہے کہ یہ جنوبی افریقہ کے جنرل سمٹس اور ووڈرو ولسن صدر جمہوریہ امریکہ نے تجویز کیا تھا۔ اسے عائد کرنے سے پیشتر پریذیڈنٹ ولسن نے ایک کمیشن ان علاقوں کے لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، جن کے لیے یہ نظام تجویز ہوا تھا۔ امریکی یونیورسٹی کے صدر ہوورڈ الیس بلس نے صلح کانفرنس کے سامنے کمیشن کی تجویز پیش کی تھی اور ولسن نے خود مختاری کے اصول پر جو خاص زور دیا تھا، یہ کمیشن اس کے بھی مطابق تھا۔ برطانیہ نے بھی ایک مشترکہ بیان میں (جو شام و لبنان پر فوجی قبضے کے تھوڑی سی دیر بعد — ، نومبر ۱۹۱۸ء — جاری کیا گیا تھا) اس عزم کا اعلان کیا تھا کہ یہاں قومی حکومتیں قائم کی جائیں گی، جو مقامی آبادی کی رائے اور تجویز کے مطابق بنیں گی۔ یہ اصول آگے چل کر جمعیت اقوام کے میثاق کی ایک دفعہ میں بھی شامل کر دیا گیا تھا اور حکمداری کے نظام میں بھی اسے دہرا دیا گیا تھا، لیکن اس وقت انگلستان، فرانس اور اٹلی نے کمیشن کے لیے اپنے اپنے نمائندے مقرر نہ کیے۔ امریکی مشن کی رپورٹ یہ تھی کہ لبنانیوں کی اکثریت فرانس کے حق میں ہے اور اس کے حدود صور سے طرابلس تک بڑھا دینے چاہئیں۔ شام سے اسے بالکل الگ کر دینا چاہیے[1]۔

---

[1] اس کمیشن کی رپورٹ کبھی شائع نہ ہوئی۔ یہ پہلے پہل "ایڈیٹر اینڈ پبلشر" (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھیے)

حکمداری کا نظام دونوں ملکوں کے لیے ایک تھا۔ ایک دفعہ کے مطابق اجنبیوں کے لیے امتیازی سلوک منسوخ کر دیا گیا۔ ایک اور دفعہ کے مطابق حکمدار طاقت کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ مذہبی مشنوں پر اس کی نگرانی صرف امنِ عامہ اور حسنِ نظم کے قیام تک محدود رہے باقی دفعات میں فرانسیسی اور عربی دونوں کو سرکاری زبانیں تسلیم کیا گیا، لیکن صاف صاف کہہ دیا گیا کہ تعلیم مقامی زبان میں دی جائے۔ یہ دستاویز بڑی عجلت میں تیار کی گئی تھی اور غیر محتاط طریق پر لکھی گئی تھی۔ اس میں توازن ناپید تھا۔ یہ صرف اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ پورے نظام کی بیس دفعات میں سے دفعہ ۱۴ — جس کا تعلق آثار قدیمہ سے تھا — کی تشریح و تقسیم آٹھ حصّوں پر مشتمل تھی۔ اسی نے پورے متن کا ⅕ حصّہ گھیر لیا تھا۔[۵۰] بہر حال یہ حکمداری درجہ الف (A) ایک ہی تھا۔ اس میں بڑا اچھا تصوّر اور بلند نصب العین پیشِ نظر رکھا گیا تھا، جو استعماری معاملات میں اس وقت تک تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ جمعیّت اقوام نے اس کی بنیادی حیثیت کی تشریح میثاق کی دفعہ ۲۲ میں یوں کی تھی:

> بعض قومیں، جو پہلے ترکی سلطنت سے متعلّق تھیں، نشوو ارتقاء کے اس مرحلے پر پہنچ چکی ہیں، جہاں خود مختار قوموں کی حیثیت میں ان کا وجود مشروط طریق پر تسلیم کیا جا سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ حکمدار طاقت انھیں اس وقت تک انتظامی معاملات میں مشورے اور امداد دے۔ جب تک وہ بہ طورِ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ حکمدار طاقت کے انتخاب میں ان قوموں کی خواہشات کو مقدّم رکھا جائے۔[۵۱]"

تاہم اصل نظام میں اس مقصد کو پورا کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نہ خاص میعاد مقرر کی گئی تھی، جب حکمدار طاقت الگ ہو جائے اور نہ کوئی معروضی معیار مقرر کیا گیا تھا، جس کی بنا پر لوگوں کی صلاحیتِ خود مختاری کا فیصلہ کیا جا سکے۔ تنہا عملی معیار بظاہر یہی رہا کہ حکمدار علاقوں کے

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جلد ۵۵ میں King Crave Refsort on the Near East کے زیر عنوان (نیویارک ۲۔ دسمبر ۱۹۲۲ء) شائع ہوئی۔ تجزیہ عمومی کے لیے دیکھیے ہیری این ہوارڈ کا مقالہ ...American Experiment in Peace Making جو The Muslim World جلد ۳۲ (۱۹۲۲ء) میں شائع ہوا صفحہ ۱۲۲، ۱۴۶۔

[۵۰] فرانسیسی متن کے لیے دیکھیے دی جمعیۃ اقوام (فرانسیسی)، انگریزی متن کے لیے جمعیۃ اقوام (انگریزی) Mandate for Syria & Lebanon صفحہ ۱-۷، عربی متن کے لیے ملاحظہ فرمایئے ادبیرا بیلا کی کتاب: "طوار الحکم فی لبنان" صفحہ ۵-۱۲۔

[۵۱] Government of League of Nation صفحہ ۱۲-۱۳۔

Marfat.com

باشندے اپنے حقوق کے مؤثر مظاہرے کا ثبوت دے سکیں یا خود حکمدار طاقت سیاسی مصلحت کی بناء پر اس طرف متوجہ ہو جائے۔ یہی طریقہ پہلے سے چلا آرہا ہے۔

حکمداری کے متن سے بھی زیادہ اہم اس کے اطلاق کا مسئلہ تھا۔ پہلے تین ہائی کمشنر فوجی جرنیل تھے، جو پہلی جنگِ عظیم میں درجۂ امتیاز حاصل کر چکے تھے۔ ان کی امداد کے لیے جو لوگ منتخب ہوئے، وہ مستعمرات سے لیے گئے تھے۔ حکمدار طاقت کی کارفرمائی براہِ راست جاری تھی اور داخلی خود مختاری کا جو پیمانہ تجویز ہوا، وہ حکمداری کے دورِ ماقبل سے بھی یقیناً کمتر تھا۔ یہ واضح رہے کہ فرانس لبنان پہنچا تو یہ ملک اقتصادی، سیاسی، مجلسی اور روحانی لحاظ سے اپنی پوری تاریخ کے پست ترین درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ فرانس کو انتظامی اور عدالتی ادارے نئے سرے سے قائم کرنے پڑے۔ بندرگاہیں درست کیں۔ سڑکوں کی مرمت کرائی۔ تعلیم کے وسائل مہیا کیے۔ حفظانِ صحت اور امورِ عامہ کے محکموں کی بنیاد رکھی[1]۔ شہری کاروبار کے لیے دورِ حاضر کے جدید ضوابط جاری کیے۔ عثمانیوں کے عہد کا قانونِ بلدیات (منظورہ ۱۸۷۷ء) فسوخ کرکے (۱۹۲۲ء) نیا قانون جاری کیا، جس کے مطابق تقریباً ایک سو بیس بلاد و دیہات نے ایک حد تک مقامی خود مختاری حاصل کر لی[2]۔ ساتھ ہی ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت بحال کی، جو بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ مقامی سکے فرانسیسی فرانک سے وابستہ کر دیے گئے، جس کی قیمت پہلے سے گھٹ چکی تھی۔ بیروت کی بندرگاہ پر خاص توجہ کی گئی۔ یہ بندرگاہ ایک فرانسیسی کمپنی نے ۱۸۸۹ء ۱۸۹۴ء میں بنائی تھی۔ پھر اس سے غفلت برتی گئی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ فرانس کی توجہ عموماً انتظامی مشینری اور سیاسی فارمولے تجویز کرنے پر جمی رہی۔ مقصد یہ تھا کہ خود فرانس کی حیثیت مستحکم رہے۔ یہ نہ تھا کہ ملک کے طبعی وسائل بروئے کار آئیں اور ملکی لیڈروں کو خود مختاری کی تربیت ملے۔ اسی طرح رائے عامہ بھی اعلاً حریفانہ سیاسیات پر متوجہ رہی، جن کی حیثیت زیادہ تر ذاتی و شخصی تھی[3]۔

**لبنانِ کلاں** | ہائی کمشنروں میں سے پہلا شخص جنگ "مارنے" کا یکدست ہیرو جنرل ہنری گوراؤ تھا، جس کے الٹی میٹم اور تیز اقدام نے میسلون کی جنگ میں فرانسیسی اقتدار

---

[1] جین ایلبرٹ سورل کی فرانسیسی کتاب صفحہ ۲۲۱، ۲۲۲۔ مفصل رودادوں کے لیے دیکھیے وزارتِ امورِ خارجہ کی رپورٹیں (فرانسیسی میں) متعلق شام و لبنان۔
[2] والٹرایچ رشر Ritsher کی کتاب Municipal Govt صفحہ ۱۔
[3] ایڈورڈ ایف نکولے Nicholey کی کتاب A Journey of ... in the Trade of ... Economic Condition ... by G. صفحہ ۲-۳۔

قائم کر دیا تھا۔ گوراؤ شام و لبنان کی مسلح افواج کا سالار اعظم بھی تھا، جن میں زیادہ تر فرانسیسی اور مستعمراتی سپاہی تھے۔ ان کے ساتھ چند مقامی جیش بھی تھے اور انھیں "افواج خاص لیوانت" کہا جاتا تھا۔ اس کے افسر بھی فرانسیسی تھے اور ان کی تربیت بھی فرانسیسیوں ہی نے کی تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۲۰ء کو گوراؤ نے بیروت میں لبنانِ کلاں کا اعلان ان ہنگامہ خیز الفاظ میں کیا:

"ان پرشکوہ پہاڑوں کے دامن میں، جو تمھارے ملک کے لیے قوت کا سرچشمہ اور مذہب و آزادی کے ناقابل تسخیر قلعے ہیں، بے شمار افسانوں کے اس سمندر کے کنارے، جو فونیقیہ، یونان اور روما کے سہ منزلہ جہاز دیکھ چکا ہے اور اب ایک عالی قدر و قدیم دوستی کی توثیق اور فرانسیسی امن کی برکات تمھارے لیے لایا ہے..... میں حکومت جمہوریہ فرانس کے نام پر لبنان کلاں کی عظمت و خوش حالی کے لیے سلامی پیش کرتا ہوں"۔

اسی اثنا میں عارضی دستور کا اعلان کر دیا گیا[۱] جس کا تعلق نئی دولت کے نظم و نسق اور حدود کے تصفیے سے تھا۔ ساحلی شہروں — بیروت — جو نیا دارالحکومت بنا، طرابلس، صیدا اور صور — نیز اندرونی اضلاع کا الحاق عمل میں آیا، مثلاً بعلبک، البقاع، حاصبیہ، راشیہ، مرج عیون، یہ اضلاع جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے لبنان کے تھے۔ شہابی اور معنی امیر عموماً ان پر کسی نہ کسی وقت قابض رہے تھے۔ اس طرح ملک کا رقبہ دگنا ہو گیا اور اس کی آبادی تعداد میں بڑھ گئی، یعنی دو لاکھ[۲]، جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ان میں شیعہ بھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ ثقافت کی نچلی سطح پر تھے۔ ۱۹۱۳ء میں لبنان کی آبادی کا اندازہ چار لاکھ چودہ ہزار آٹھ سو کیا گیا تھا اور اس میں سے تین لاکھ انتیس ہزار چار سو بیاسی مسیحی تھے (مسیحیوں میں سے دو لاکھ بیاسی ہزار تین سو ساٹھ مارونی تھے)۔ دس سال بعد آبادی چھ لاکھ اٹھائیس ہزار آٹھ سو تریسٹھ ہو گئی۔ ان میں سے ڈیڑھ لاکھ بیروت میں رہتے تھے، تیس ہزار طرابلس میں اور تیرہ ہزار صیدا میں۔ ملک کے رقبے میں یقیناً اضافہ ہوا لیکن اس کی ہم آہنگی کو نقصان پہنچا۔ جغرافیائی اور اقتصادی اعتبار سے وہ بہتر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا، مگر اس کا داخلی توازن قائم نہ رہا۔ مسیحیوں کی بھاری اکثریت میں کمی آ گئی۔

---

[۱] متن کے لیے دیکھیے جمعیتہ اقوام، Permanent Mandate Commission، آٹھویں اجلاس کی کارروائی صفحہ ۱۹۲، ۱۹۵۔ [۲] سعید حماوہ کی کتاب Economic Organization of Syria، صفحہ ۶، ۱۰، ۲۱۱۔

دونوں جنگوں کے درمیانی دور میں جمہوری قومی خطوط پر مستقل ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۳ مئی ۱۹۲۶ء کو لبنان میں جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔ اس نے سہ رنگ قومی جھنڈا اختیار کیا جس کے پرچم کی زمین سفید تھی اور اس پر سبز رنگ کا دیودار کڑھا ہوا تھا۔ پھر اس میں ترمیم کر دی گئی اور تین افقی پٹیاں بنائی گئیں۔ سرخ، سفید، سرخ اور دیودار کو وسط میں رکھ دیا گیا۔ اس کے لیے جو دستور بنا، اس میں یہ انتظام بھی کر دیا گیا کہ پارلیمانی ادارے قائم کر لیے جائیں اور نظامِ حکومت جمہوری ہو۔ جس حصے میں لبنان واقع ہے، وہاں کی دنیا میں یہ پہلی جمہوریت تھی۔ فرانس کی طرف سے جو پہلا غیر فوجی ہائی کمشنر مقرر ہو کر آیا، وہ ہنری دجوونیل تھا۔ اس کی درخواست پر نمائندوں کی مجلس نے مغربی نمونے کا دستور تیار کیا، جس میں جمہوریت کے لیے رئیس کے انتخاب، ذمہ دار کابینے کا تقرر اور دو ایوان کی پارلیمنٹ کے قیام کا انتظام تھا۔ ایوان بالا آگے چل کر ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس دستور میں کئی مرتبہ ترمیمیں ہوئیں اور فرانس کے اربابِ اقتدار نے ایک سے زیادہ مرتبہ اسے معطل بھی کیا، تاہم یہ فی الجملہ آج تک قائم ہے۔[1] یہ تمام ہمسایہ ممالک کے دساتیر سے زیادہ آزاد ہے۔ کیونکہ اس میں نہ حکومت کا کوئی مذہب قرار دیا گیا ہے اور نہ رئیس جمہوریت کے لیے کسی خاص مذہب کی قید رکھی گئی ہے۔ گویا یہاں آزادیِ عبادت نے حقیقت کی حیثیت اختیار کر لی۔ البتہ یہ دیرینہ روایت قائم رکھی گئی جس میں مختلف ملتوں کو اپنے ارکان کے شخصی معاملات سے تعلق رکھنے والے امور کے سلسلے میں حقِ نظم و نگرانی دے دیا گیا، خواہ وہ مسیحی ہوں یا مسلمان۔ رفتہ رفتہ یہ معمول بن گیا کہ جمہوریت کا رئیس مارونی، وزیر اعظم سنّی، ایوان مندوبین کا صدر شیعہ اور وزیر دفاع دروزی ہو۔ اس طرح آبادی کے بڑے عناصر میں توازن کا انتظام ہو گیا۔ پہلا مارونی رئیس حبیب السعد (۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۶ء) تھا، جسے فرانسیسی ہائی کمشنر نے نامزد کیا تھا۔ جو پہلا رئیس ایوان نے چنا تھا[2] وہ امیل اِدّی (ایمل ایڈی ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۱ء) تھا۔

---

[1] متن کے لیے دیکھیے ہیلن ملر ڈیوس کی کتاب: Constitutions, Electoral Laws Treaties of States in the Near Middle East دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲۹۱، ۳۰۵۔ ایضاً صفحہ ۱۳-۳۹۔

[2] رؤسائے جمہوریت کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ شارل دبّاس (۲۶- جون - یکم جنوری ۱۹۳۴ء)
۲۔ حبیب السعد (۳۰- جنوری ۱۹۳۴ء - ۲۰- جنوری ۱۹۳۶ء)
۳۔ اِمل ادّی (۳۰- جنوری ۱۹۳۶ء - ۴- اپریل ۱۹۴۱ء)
(دوبارہ عارضی طور پر ۲۱- نومبر ۱۹۴۳ء)
۴۔ الفرد نقّاش (۲۴- نومبر ۱۹۴۱ء - ۲۸- مارچ ۱۹۴۳ء)
۵۔ ایوب ثابت (۱۸- مارچ - ۲۱- جولائی ۱۹۴۳ء)
۶۔ پترا طراد (۲۲- جولائی - ۲۱- ستمبر ۱۹۴۳ء)
۷۔ بشارہ الخوری (۲۱- ستمبر ۱۹۴۳ء - ۱۸- ستمبر ۱۹۵۲ء)
۸۔ کمیل شمعون (۲۳- ستمبر ۱۹۵۲ء)

Marfat.com

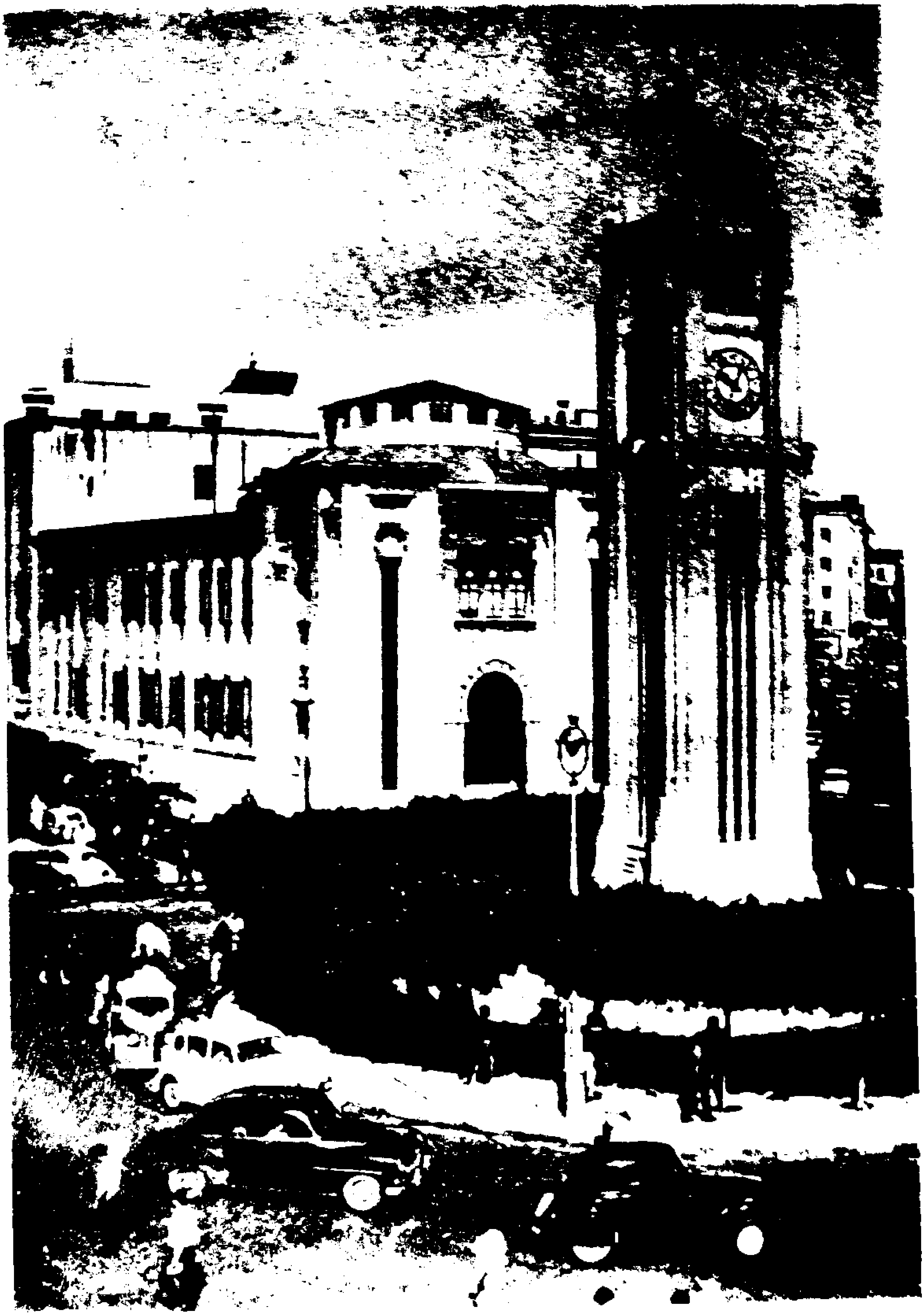

پارلیمنٹ کی عمارت
جمہوریہ لبنان کا پارلیمانی ایوان (بیروت)

Marfat.com

درحقیقت یہ پہلا لبنانی تھا، جو انتخاب سے منصب صدارت پر پہنچا۔ اب فرانس کا اقتدار بالواسطہ رہ گیا۔ یہ مشیروں کے ذریعے سے عمل میں آتا تھا، لیکن وہ لوگ عملاً مشیروں سے زیادہ صاحبِ اختیار تھے۔ ایک خاص شعبہ، جو خبر رساں کارندوں کے خاصے بڑے گروہ پر مشتمل تھا، قائم رکھا گیا۔

## برائے نام آزادی

قومی ترقی کے راستے کا ایک سنگِ میل وہ تھا، جب نومبر ۱۹۳۶ء میں صدر اِدّی اور ہائی کمشنر (دمیان دی مارتل) کے درمیان پچیس سال کے لیے دوستی اور اتحاد کا معاہدہ ہوا۔ اس میں لبنان کی خود مختاری تسلیم کی گئی اور یہ وعدہ بھی کر لیا گیا کہ اسے جمعیّت اقوام میں شامل کر لیا جائے گا، لیکن خارجی اور فوجی معاملات بدستور ہائی کمشنر کی تحویل میں رکھے گئے۔ یہ معاہدہ ویسا تھا، جیسا کہ شام کے ساتھ ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا، شام کے تعلق میں طے ہو چکا تھا کہ فرانسیسی افسر شامی فوج کو ترتیب دیں گے۔ لبنان کے تعلق میں یہ قرار پایا تھا کہ مسلح فرانسیسی فوج مدّت معاہدہ کے دوران میں قائم رہے گی اور باہمی رضامندی سے اس معاہدے کی تجدید ہو سکے گی، لیکن فرانس کے ایوانِ مندوبین نے نہ فرانس و شام، نہ فرانس و لبنان کے معاہدے کی توثیق کی اور ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی جو تیزی سے بگڑتے ہوئے تعلقات میں اصلاح کی موجب نہیں ہو سکتی تھی[1] مگر لبنان میں حکمداری کے ماتحت بے چینی کی وہ کیفیت پیدا نہ ہوئی، جو ہمسایہ ملک (شام) میں رونما تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لبنان کے باشندے تاریخی ہواؤں کے ہر تغیّر کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کے ماہر ہو گئے تھے۔ شام میں جو عام بے چینی پیدا ہوئی تھی اس کے شعلوں کو قومی مقاصد پورے نہ ہونے کے باعث ہوا ملتی رہی۔ کبھی ملک بھر میں ہڑتالیں اور مظاہرے شروع ہو جاتے اور بعض اوقات مسلح بغاوتیں بھی ہوئیں۔ سب سے پہلے زیادہ خوفناک بغاوت جولائی ۱۹۲۵ء کی تھی، جو جبل الدروز سے شروع ہوئی اور ۱۹۲۷ء کے موسمِ گرما تک فرو نہ ہو سکی۔ ساتھ ساتھ دمشق، حما اور دوسرے مرکزوں میں بھی پہنچ گئی۔ اس بغاوت کا صرف خفیف سا اثر جنوبی لبنان میں پہنچا۔ انگریزوں نے عراق کے تعلق میں نسبتۃً فراخ دلانہ روش اختیار کی تھی۔ اس مثال نے شام کی حد درجہ اشتعال پذیر آگ پر تیل کا کام دیا۔ اس اثنا میں زیادہ وسیع،

---

[1] زیرِ حکمداری لبنان جن سیاسی مراحل سے گزرا، ان کے متعلق مفصّل روداد کے لیے دیکھیے پیرا وندو کی فرانسیسی کتاب "لبنان کے سیاسی ادارے" صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱۔ نیز اے ایچ حورانی کی کتاب شام و لبنان (انگریزی) صفحہ ۱۷۹، ۲۳۰، لوئی جعدیرت کی فرانسیسی کتاب شام و لبنان صفحہ ۳۰۔۴۰۔

زیادہ تاریک اور دُور دُور تک چھا جانے والے بادل نے بین الاقوامی افق کو ڈھانپ لیا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا بادل تھا۔

**مارشل لا**

۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہائی کمشنر گیبریل پیاو نے مارشل لا کا اعلان کردیا[1]۔ پھر اس نے دستور کے تعطل، پارلیمنٹ کی برطرفی اور صدرِ جمہوریت کے اختیارات کی تحدید کے انتظامات کیے۔ ایک وزیر کابینہ کے خاص وظائف انجام دینے کے لیے مقرر ہوگیا۔ میکسیم ویگاں پہلی جنگِ عظیم کا ہیرو تھا اور گوراؤ کے بعد شام ولبنان کا ہائی کمشنر رہ چکا تھا۔ اب اسے مشرقی بحیرۂ روم کے حلقے کی تمام متحدہ افواج کا سالار بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۰ء کے موسم بہار میں اسے یورپ میں متحدہ افواج کی کمانداری سونپ دی گئی۔ اس منصب پر وہ فرانس کی آخری شکست (موسم گرما ۱۹۴۰ء) تک فائز رہا۔ جس شخص کو مشرقِ قریب میں ویگاں کی جگہ بھیجا گیا، اس نے پیرا کے تعاون سے حکومتِ وشی[2] کے ساتھ وفاداری کا اعلان کردیا اور جرمنی واٹلی کے خلاف جنگ بند کردی۔ لیوانت کے فرانسیسی افسر عموماً انگریزوں کے خلاف رہے تھے۔ مذکورہ بالا اقدام بھی ایک حد تک اسی روایتی مخالفانہ احساس کا نتیجہ تھا۔ برطانیہ کی پوزیشن فلسطین، عراق اور مصر میں پہلے ہی غیر محفوظ تھی، اب خیال پیدا ہوا کہ اگر محوری طاقتوں نے شام ولبنان کو جنگی کارروائیوں کا مرکز بنا لیا تو سخت خطرہ پیدا ہوجائے گا، لہٰذا برطانیہ نے جون ۱۹۴۱ء میں اپنی فوجیں آزاد فرانسیسی فوجوں کے ساتھ شام ولبنان میں بھیج دیں۔ وہاں سے حکومتِ وشی اور محوری طاقتوں کی فوجیں نکالی گئیں اور ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا گیا۔ پوری کارروائی میں ایک مہینا صرف ہوا۔ اس اثناء میں ساحل کی ناکا بندی رہی۔ شہروں اور ہوائی اڈوں پر بم برسائے گئے۔ شام ولبنان مشرقِ وسطیٰ کے برطانوی سپہ سالار کے دائرۂ اختیار میں شامل ہوگئے۔

---

[1] ہائی کمشنروں کی فہرست درج ذیل ہے:

| نام | تاریخ تقرر |
|---|---|
| ۱۔ جنرل گوراؤ | ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء |
| ۲۔ جنرل میکسیم ویگاں | ۹۔ مئی ۱۹۲۳ء |
| ۳۔ جنرل مارس سیریل | ۲۔ جنوری ۱۹۲۵ء |
| ۴۔ ہنری دی جوونیل | ۳۔ دسمبر ۱۹۲۵ء |
| ۵۔ ہنری پانو | ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء |
| ۶۔ دمیاں دی مارتل | ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء |
| ۷۔ گیبریل پاؤ | ۱۲۔ جنوری ۱۹۳۸ء |

[2] حکومتِ وشی سے مراد وہ حکومت ہے جس نے مارشل پتیاں کی سرکردگی میں ہٹلر سے صلح کرلی تھی اور پیرس کی بجائے وشی کو دارالحکومت قرار دیا تھا۔ جنرل دی گال نے آزاد فرانس کا پرچم بلند رکھا۔ گیبریل پاؤ کی کتاب (فرانسیسی) صفحہ ۲۰۵، ۲۱۸۔

Marfat.com

فلسطین میں صہیونیوں کے داخلے کے باعث ہنگامہ جاری تھا اور عراق رشید علی الگیلانی کی سرکردگی میں منحرف ہو چکا تھا[۵]

لبنانیوں کے دلوں میں پہلی جنگ کی تلخ یادیں تازہ تھیں۔ دوسری جنگ سے سابقہ پڑا تو ان پر خوف و لرزہ طاری تھا، لیکن جب ان کا ملک برطانوی تجارت کے حلقے میں شامل کر لیا گیا تو انھوں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ جہازوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی تو امریکہ اور انگلستان نے مشرق وسطیٰ کے لیے ضروری چیزیں بہم پہنچانے کا جو مرکز قاہرہ میں قائم کر رکھا تھا، اس نے امداد کا انتظام کیا۔ مقامی پیداوار کو بڑھانے میں مدد دی اور پورے علاقے کی اقتصادی زندگی کے متعلق منصوبہ بندی کا انتظام کر لیا۔ اس طرح نہ صرف غذائی صورتِ حال بہتر ہوئی بلکہ افراطِ زر کا خطرہ بھی کم ہو گیا اور قیمتِ زر میں تخفیف کا رجحان رُک گیا۔ ملک جنگی خوش حالی کے دور میں داخل ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجیں موجود تھیں، ان کے لیے غذائی جنسیں وسیع مقدار میں بہم پہنچانے کی ضرورت تھی۔ نئے عمارتی منصوبے عمل میں آئے، جن کے لیے مزدوروں اور کارکنوں کی وسیع تعداد درکار تھی۔ پھر ملک میں سے تجارتی سامان کی آمد و رفت وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی، جس سے زرعی اور صنعتی پیداوار کو تقویت پہنچی اور کاروباری سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ حفظانِ صحت کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر قائم رکھا گیا۔ چند سال پیشتر کی ایسی ہی صورتِ حال سے یہ کیفیت سراسر مختلف تھی۔ فوجی مقاصد کے لیے ریل کی نئی لائنیں بنیں۔ بیروت کو شمال میں طرابلس سے اور جنوب میں حیفہ سے ملا دیا گیا۔ لبنان میں سے مصر، ترکی، عراق اور شام کے ساتھ براہِ راست تعلقات قائم کر لیے گئے۔

## آزادی کامل

آزاد فرانسیسی حکومت نے ہائی کمشنر کی جگہ ایک عہدہ دار مقرر کیا جس کا نام ڈیلیگیٹ جنرل (نائب عام) رکھا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو جارج کاترو سالار افواج لیوان ڈیلیگیٹ جنرل اور مختارِ اعظم فرانس آزاد (جنرل ڈیگال) نے اپنی حکومت کے نام پر اور اس کے حلیف برطانیہ عظمیٰ کی رضامندی سے لبنان کی آزادی اور سیادت کا رسمی اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی حکمداری کے خاتمے کا اعلان ہو گیا۔ یہی دن اس وقت سے سال بہ سال بہ طور آزادی منایا جاتا ہے۔ شام کی آزادی ۲۷ مئی ہے۔ کیونکہ اس کی آزادی کا اعلان اسی دن ہوا تھا۔ برطانیہ نے فوراً دونوں جمہوریتوں کو تسلیم کر لیا امریکہ پہلے بڑے ملکوں میں سے ہے، جس نے سفارتی نمائندہ اور قنصل جنرل مقرر کیا۔ باقاعدہ دستوری زندگی عود کر آئی تو لبنان نے ستمبر ۱۹۴۳ء کے انتخابات میں ایسے نمائندے منتخب کیے، جو زبردست قومی

---

[۵] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے حورانی صفحہ ۲۳۰ - ۲۴۰۔

Marfat.com

رجحانات اور عربیت کے لیے ہمدردی سے معمور تھے۔ البوان نے لشارہ الخوری کو صدر منتخب کیا، جس نے فرانس میں قانون کی تعلیم پائی تھی اور اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہ چکا تھا۔ ریاض الصلح کی وزارت عظمیٰ کی تصدیق کی۔ ریاض ان لوگوں میں سے تھا، جنھیں جمال پاشا نے عربوں کے حق میں جدوجہد کی بنا پر دوامی جلاوطنی کی سزا دی تھی۔ کابینہ وزارت نے دستور کی وہ تمام دفعات ختم کرنے کے لیے قدم اٹھایا، جو نئی حیثیت سے متصادم تھیں۔ چنانچہ ایک قرارداد کے مطابق وہ تمام دفعات حذف کر دی گئیں، جن میں فرانس کو حکمران طاقت قرار دیا گیا تھا۔ فرانسیسی مندوب نے ایسے قوانین کو قابلِ اعتراض سمجھا۔ ایک اور وجہ نزاع یہ پیدا ہوئی کہ نظم و نسق میں جو فرانسیسی داخل تھے، ان پر کسے اقتدار حاصل ہو۔ اس وقت تک یہ معاملہ ہائی کمشنر اور اس کے جانشین کی تحویل میں تھا۔ ان ملازمین میں خاص فوجی اور انتظامی افراد کے علاوہ لبنان و شام کے مشترکہ افراد خصوصاً چنگی، علاقوں میں کام کرنے والی کمپنیاں، تمباکو کا اجارہ اور سرحدی چوکیدار بھی شامل تھے۔ لبنانی اربابِ اختیار اپنے عزم پر قائم رہے۔ فرانسیسی ڈیلیگیٹ جین ہیلیو نے دستور معطل کر دیا۔ صدر، وزیر اعظم اور ارکانِ وزارت کو گرفتار کر کے راشیا کے قلعے میں بھیج دیا۔ مارشل لا کا اعلان کیا اور سخت احتساب قائم کر دیا؛ رائے عامہ کو اشتعال میں لانے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ فسادات، مظاہرے اور ہڑتالیں ہوئیں۔ پوری عرب دنیا میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ جو لبنانی تارکین وطن ریاستہائے متحدہ امریکہ، برازیل اور دوسرے ملکوں میں تھے، انھوں نے اپنی اپنی حکومتوں کو احتجاج کا ہدف بنا لیا۔ داخلی و خارجی دباؤ کے ماتحت فرانس کو جھکنا پڑا۔ تمام اسیر گیارہ روز کی قید کے بعد ۲۱۔ نومبر کو واپس ہوئے[۱]۔ قانونی اقتدار کی بحالی کے ساتھ ہی دستوری ادارے معمول کے مطابق کام کرنے لگے۔

۱۹۴۴ء کے اختتام پر فرانس کی طرف سے تمام اختیارات اور عہدے اہلِ ملک کے حوالے ہو گئے۔ صرف خاص فوجیں مستثنیٰ رہیں۔ ان کی حوالگی پہلے ایک معاہدے پر دستخط کرنے سے مشروط کر دی گئی اور آئندہ سال غیر مشروط طریق پر حوالگی عمل میں آئی۔ ۲۷۔ فروری کو لبنان نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ آئندہ مہینے انجمن اقوام متحدہ کے منشور پر

---

[۱] ابو شدد (Abouchdid) کی کتاب Thirty years in Lebanon & Syria صفحہ ۱۲۱، ۱۲۸۔ مصنف اس وقت بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس نے قریباً روزانہ واقعات کا مرقع پیش کیا ہے۔

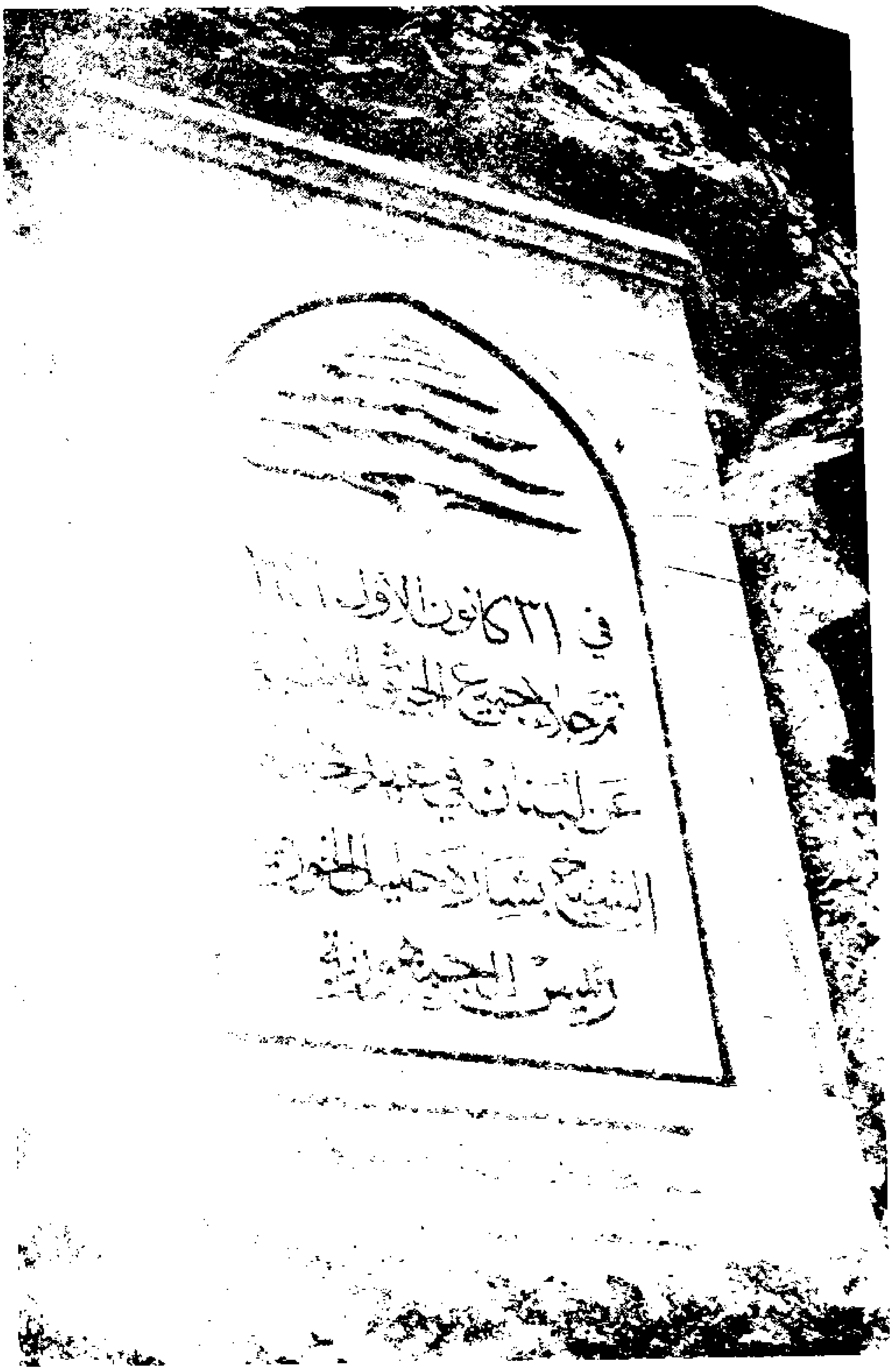


## کتبہ جمہوریہ لبنان

غیر ملکی افواج کے کامل تخلیے کی یادگار (نہر الکلب دہانہ پر کتبہ)
۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو آخری غیر ملکی فوجیں
شیخ بشارہ خلیل الخوان رئیس جمہوریہ کے عہد میں لبنان سے نکل گئیں

Marfat.com

Marfat.com

دستخط ثبت کر دیے۔ اس طرح اس بین الاقوامی انجمن کی پہلی کانفرنس میں لبنان شامل ہوا، جو سان فرانسسکو میں منعقد ہوئی تھی۔ جو چٹان بیروت کے شمال میں کتبات کا مرکز چلی آتی ہے۔ اس کی ایک کندہ لوح پر یہ تحریری الفاظ ثبت ہیں:

"۳۱۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لبنان سے تمام اجنبی فوجوں کا تخلیہ الشیخ بشارۃ الخوری رئیس جمہوریہ کے عہد میں پورا ہوا"۔

فرانس نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر جو وعدہ کیا تھا، وہ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام تک پورا نہ ہوا۔

Marfat.com

# چونتیسواں باب

# صنوبری پرچم کے سائے میں

## مسائل و اقدامات

### مسائل اور ان کا حل

لبنان کی نو مولود جمہوریت رقبے میں یلو سٹون نیشنل پارک[1] سے زیادہ بڑی نہیں اور اس کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے۔ آبادی امریکہ کے کسی عام سے شہر مثلاً بالٹی مور یا کلیولینڈ سے زیادہ نہیں۔ یہ جمہوریت آزادی اور استقلال کے سفر پر روانہ ہوئی تو پیچیدہ سیاسی، اقتصادی اور مجلسی مسائل سے گھری ہوئی تھی، جو اس کی جغرافیائی حیثیت میں مضمر تھے۔ تاریخ نے اسے بہ طور میراث دیے تھے اور آبادی کے مختلف الاوضاع قومی و مذہبی عناصر ترکیبی کا نتیجہ تھے۔ اپنے استقلال کے بارہ سال میں یہ جمہوریت سیاسی مسائل کے حل میں خاصی آگے نکل گئی۔ اقتصادی خوش حالی میں اس کے قدم اور بھی آگے بڑھ گئے، لیکن مجلسی ترقی کے دائرے میں یہ پیچھے رہ گئی۔ ابھی تک یہ اپنے شہریوں میں وفاداری کا وہ معیار پیدا نہیں کر سکی جو تنگ صوبائی اور فرقہ وار وفاداریوں سے بلند و بالا ہوتا ہے +

### سیاسی دائرہ

ہمسایوں سے ربط و تعلق کے سلسلے میں دو بنیادی عامل پیشِ نظر رہے۔ اوّل عربی زبان اور اسلامی آبادی کی خاصی بڑی تعداد، جن کی وجہ سے یہ عربی حکومتوں کے حلقے کی طرف کھنچی چلی گئی۔ دوم مغربی اوضاع و اطوار اور مسیحی عناصر کی زیادتی۔ اس وجہ سے اس نے احتیاط کا راستہ اختیار کیا تاکہ ملک کا تشخص بحال رہے اور کسی ضم ہونے کا امکان پیدا نہ ہو۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ تعلیم اور ترکِ وطن کرنے والوں کے باعث لبنان

---

[1] Yellow-Stone National Park، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ویومنگ (Wyoming) جو مانٹانا، ڈکوٹا، نبراسکا، کلریڈو، اوٹا اور اڈاہو کے درمیان ہے۔ اس میں ایک جھیل اور نیشنل پارک ہے، جس کا رقبہ تین ہزار تین سو پچاس مربع میل ہے اور لبنان کا رقبہ تین ہزار چار سو ستر مربع میل ہے۔ گویا یہ ملک یلو سٹون نیشنل پارک سے صرف ایک سو بیس مربع میل زیادہ ہے۔ لبنان کا طول بالاوسط ایک سو بیس میل اور عرض بالاوسط اُنتیس میل ہے +

Marfat.com

دوسری عرب حکومتوں کے مقابلے میں مغرب کے ساتھ زیادہ قریبی ہمدردی کا مرجع رہا ہے۔ اندر اور باہر سے کئی خطرے پیدا ہوئے۔ جنوبی جانب شاہ عبداللہ (والیٔ اردن) تھا، جو کلاں تر شام کے خواب دیکھ رہا تھا، جس کا رئیس وہ خود ہونا چاہتا تھا۔ لبنان کے متعلق پالیسی یہ تھی کہ اسے اختیار دے دیا جائے، وہ سب سے الگ تھلگ رہے یا باقی عرب ملکوں میں ضم ہو جائے[۵۱]۔ عبداللہ کے اس منصوبے نے متعدد شامی گروہوں کے رئیسوں کی نظروں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ دوسری طرف عراق کے سیاسی لیڈر تھے، جو "ہلال زرخیز" کو ایک بادشاہی کے ماتحت لانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور اپنے بادشاہ کو اس وسیع مملکت کا تاج پہنانا چاہتے تھے[۵۲]۔ دوسرے شامی فریقوں کے رئیسوں کے ہمنوا تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ایک نوجوان لبنانی نے، جو برازیل سے آیا تھا، ایک منظم جماعت بنالی۔ یہ نظم و ترکیب کے لحاظ سے مرکزی اختیارات کے تابع تھی، جو لیڈر کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے اس نظریے کا اعلان کر دیا کہ شامی ایک الگ قوم ہیں اور جو لوگ شمالاً جنوباً کوہستان طارس و سوئیز اور غرباً شرقاً بحیرۂ روم اور دجلہ کے درمیان رہتے ہیں، وہ سب اسی قوم میں شامل ہیں اور انھیں اس کا وفادار رہنا چاہیے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے شامی قوم کی جداگانہ حیثیت کا تصور پیش کیا اور اس پر زور دیا۔ ایسے علاقے میں اس کے لیے زبردست حامی پیدا ہو گئے۔ حکومت لبنان نے ۱۹۴۹ء میں اس جماعت کے بانی اور لیڈر کو موت کی سزا دی، کیونکہ وہ تحفظ دولت کے خلاف سازش کر رہا تھا[۵۳]۔ جمہوریت مسلسل اپنی سہ گونہ پالیسی پر جمی رہی، یعنی اپنی سیادتِ کاملہ کا تحفظ، متعلقہ حکومتوں سے دلی تعاون اور مغرب کے ساتھ دوستانہ و ثقافتی تعلقات کا قیام۔ ان تینوں پہلوؤں میں موافقت قائم رکھنا حد درجہ نازک مسئلہ تھا۔

وضع قوانین کے دائرے میں جمہوریت نے لمبی جستیں لگائیں۔ عثمانی عہد کے تمام دقیانوسی قوانین ٹھکرا دیے گئے۔ تعزیری و تجارتی ضوابط کو دور حاضر کے پیمانے پر لایا گیا اور آزادانہ مجلسی قوانین جاری کیے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں عورتوں کو حق رائے دے دیا گیا کیونکہ ان کی طرف سے مطالبہ پیش ہوا تھا اور ایوان مندوبین کی خواہش بھی یہی تھی۔ مشرق قریب میں یہ ایسا واقعہ تھا، جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ مذہبی گروہوں کی متناسب نمائندگی کے مطابق مندوبین کے انتخاب کا نظام ختم کرنے کی کوشش

---

۵۱ دیکھیے مذاکرات عبداللہ بن الحسین صفحہ ۲۵۲۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ۲۵۵، حکومت اردن نے ایک سرکاری کتاب شائع کی تھی بنام الکتاب الاردنی الابیض، صوریہ الکبریٰ۔ اس میں تمام متعلقہ دستاویزیں شامل تھیں۔

۵۲ دیکھیے ملفورڈ ہاسکنز کی انگریزی کتاب "شرق اوسط" صفحہ ۱۵۱۔

۵۳ وزارت الانباء لبنان، "قضیۃ الحزب القومی صفحہ ۶۳ بیعد۔

Marfat.com

قبل از وقت ثابت ہوئی۔ یہی طریقہ تھا، جسے عام طور پہ ایجابیت کہا جاتا تھا۔ اسی طرح قانون دان اصحاب کی طرف سے شخصی معاملات پر کلیسائی اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔

بین الاقوامی دائرے میں لبنان کے کام کا ایک ایسا ریکارڈ مہیّا کیا اور اتنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا، جو اس کے رقبے کے تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ نیویارک میں انجمن اقوام متحدہ کے حلقوں کے اندر یا واشنگٹن، لندن اور پیرس کے بڑے بڑے مرکزوں میں لبنان کے نمائندے آزاد دنیا کے مقاصد کی حمایت میں زیادہ امتیاز حاصل کرتے رہے۔ انجمن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی (مجلس عامہ) کے اجلاسوں میں لبنانی ترجمان برابر دوسری عرب حکومتوں کی حمایت کرتے رہے۔ انھوں نے تقسیم فلسطین کے منصوبے کی سخت مخالفت کی۔ ۱۹۴۸ء میں صہیونیوں سے جنگ شروع ہو گئی تو لبنان نے ان کے خلاف پانچ ہزار آدمی میدان میں بھیجے، جن کا مدعا یہ تھا کہ ان سے حفاظتی فوج کا کام لیا جائے۔ دو سال بعد کوریا میں جنگ چھڑی تو حکومت لبنان نے پچاس ہزار ڈالر کی رقم نشانِ امداد کے طور پر انجمن اقوام متحدہ کی فوجوں کے لیے منظور کی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اسرائیل کی پیدائش پر دایہ گری کی جو خدمت انجام دی تھی اس کی وجہ سے عربوں میں سخت تلخی پیدا ہو گئی تھی، لیکن اتنی نہیں کہ فنی امداد یا قرضے قبول نہ کیے جاتے۔ ان سرزمینوں میں امریکیوں کی ذہنی تصویر کچھ اس قسم کی تھی کہ یہ لوگ خیال پسند، مخلص مسیحی اشراف ہیں، جنھوں نے اتوار کا بہترین لباس پہن رکھا ہے اور وہی طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں، لیکن مایوسی کا احساس ایک ایسے دھچکے کی شکل اختیار کر گیا، جس کے اثرات سے لوگ اب تک نہیں سنبھل سکے۔

جب برطانیہ عظمیٰ کی تائید سے مارچ ۱۹۴۵ء میں "جمعیت دولِ عرب" قائم ہوئی تو لبنانی جمہوریت بھی اس کے دستخط کنندوں میں تھی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر کوئی دولت چاہے تو الگ ہو جائے[۵] حقیقت یہ ہے کہ لبنانی نمائندوں نے میثاق کی ترتیب میں خاصا حصہ لیا اور اس وقت سے ان کا طریقہ یہ رہا کہ مختلف دولتوں میں جھگڑے پیدا ہوں تو ان کے درمیان مصالحت کرا دی جائے۔ اس جمعیت نے عہد کیا تھا کہ ہر رکن دولت کی سیادت و آزادی کی حفاظت کی جائے گی اور اگر کوئی جھگڑا ان میں پیدا ہو گا تو اس کے حل کرنے کے لیے قوت استعمال نہیں کی جائے گی۔ اس جمعیت کے بننے سے عربی بولنے والے لوگوں میں اتحاد کے بڑھتے ہوئے احساس کا مظاہرہ ہوا اور ایک دوسرے سے تعاون کی ضرورت کا اندازہ ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء میں لبنان نے مصر، شام، دولت سعودیہ اور یمن کے ساتھ مشترکہ تحفظ کے میثاق پر دستخط کیے۔ صہیونی جنگ میں ناکامی کے باعث جمعیت دولِ عرب پر کاری ضرب لگی۔ جب

---

[۵] احمد موسیٰ کی کتاب میثاق جامعۃ الدول العربیہ صفحہ ۶۱، ۶۲۔

Marfat.com

فرانس نے [illegible] میں ترکی [illegible] دے دیا تو شامیوں کو سخت دھکا لگا۔ [illegible]
جس سے عرب اور [illegible] تعلقات [illegible] کے خلاف [illegible] تحریک پیدا ہو گئی [illegible]
حوالہ لبنان کا رحجان بھی [illegible] تھا۔ اس وجہ سے [illegible] سعودیہ [illegible] سے
[illegible]
[illegible] تھے۔

## تجارت اور حمل و نقل

شام و لبنان کے [illegible] وقت [illegible] پالیسی کے باعث [illegible] دونوں جمہوریتوں کی سرحد [illegible] کے [illegible] مشترکہ مفاد [illegible] سے [illegible] میں [illegible] کے شروع میں دونوں جمہوریتوں نے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ [illegible] سے وصول ہونے والے [illegible] کو منتقل کرے۔ [illegible] فی صد لبنان اور [illegible] فی صد شام کو جائے۔ اس کمیشن میں دونوں جمہوریتوں کے تین تین نمائندے شریک تھے۔ شام نے رفتہ رفتہ حفاظتی محاصل کی پالیسی اختیار کر لی۔ جو آزاد تجارت کے خلاف تھے اور لبنان نے اپنی بڑی بندرگاہ کے سلسلے میں آزاد تجارت ہی کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اس طرح چنگی کا مسئلہ وجہِ نزاع بن گیا۔ شام نے اس کنونشن کو ختم کر دیا، جس کے مطابق کمیشن معرضِ وجود میں آیا تھا اور بعد ازاں شام میں یکے بعد دیگرے فوجی حکومتیں برسرِ کار آتی رہیں۔ جنھوں نے وقتاً فوقتاً سرحد کے تمام دروازے بند کر دیے اور اقتصادی مقاطعہ عائد کر دیا۔

لبنان زمانہ قدیم سے مشرق و مغرب کے درمیان حمل و نقل اور آمد و رفت کا واسطہ ہے۔ یہ ایک تجارتی جمہوریت ہے جس نے فونیقیہ کی شہری ریاستوں کے مسلک کو دوگونہ تقویت پہنچائی اور یہ برابر آزاد تجارت کی پالیسی پر کاربند ہوتی ہوئی خوش حالی حاصل کرتی رہی۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے تمام بڑے بڑے ہوائی جہازوں اور ریلوں کے راستے اس میں سے گزرتے ہیں۔ اس کے طبعی وسائل کچھ نہیں، البتہ مناظر بڑے دلکش ہیں۔ جغرافیائی موقع اور محل کے لحاظ سے جنگی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں۔ لوگ نسلہا پُشت سے تجارت کے ماہر چلے آتے ہیں اور ان میں خاص کاروباری روح موجود ہے۔ ان حالات میں لبنان کا انحصار بین الاقوامی منڈیوں میں زیادہ تر جنسیں پہنچانے ہی پر رہا۔ اس کی آمدنی کے خاص وسائل یہ ہیں: ملک میں سے گزرنے والے تجارتی مال سے یافت۔ باہر سے آنے والے سیاح اور موسمِ گرما اس کے کوہستانوں میں بسر کرنے والے لوگ۔ ان کے علاوہ تارکینِ وطن باہر سے

رقمیں بھیجتے ہیں، نیز تعلیمی اور مذہبی اداروں کے لیے باہر سے اعانتی رقمیں آتی ہیں۔ اس طرح درآمد و برآمد کی تجارت میں توازن پیدا ہوتا ہے اور یہاں کے باشندوں کا معیارِ زندگی ایسا ہو گیا ہے، جو متعلقہ ہمسایوں میں سے ایک کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں لبنان میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ سیاح آئے۔ ان میں سے پچیس ہزار اہلِ امریکہ اور اہلِ کینیڈا تھے۔ ان کی وجہ سے ملک کو تین کروڑ ڈالر ملے۔ اگست ۱۹۵۵ء میں رئیس جمہوریت نے جو تقریر کی تھی، اس میں لبنان کی آمدنی ایک ارب اڑتیس کروڑ لبنانی پونڈ (فی پونڈ ۲۰ء۳ ڈالر) تھی اور امید کی جاتی تھی کہ یہ ایک ارب، چوالیس کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ مشرق قریب میں یہ سب سے زیادہ فی کس آمدنی تھی۔ اسی تقریر میں رئیس جمہوریت نے بتایا تھا کہ قومی آمدنی کا سینتیس فی صد حصہ تجارت سے حاصل ہوا۔ اُنتیس فی صد زراعت سے اور سولہ فی صد صنعت و حرفت سے۔

لبنان مدت سے موسم گرما بسر کرنے کا ایک خوش گوار مقام چلا آتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں موسم سرما کے کھیلوں کے لیے ایک خاص میدان بنا دیا گیا۔ اس طرح لبنان گرما و سرما دونوں موسموں کے لیے ایک تفریح گاہ بن گیا۔ اس کے باشندوں کو فخر ہے کہ قدرت نے ان کے وطن کو اتنی زیادہ اور گوناگوں خصوصیتیں عطا کی ہیں، جو اتنے رقبے کے کسی دوسرے خطے کو حاصل نہیں۔ وہ کہتے ہیں، کونسا ایسا ملک ہے، جہاں ایک ہی دن میں سمندر کے اندر تیرا بھی جائے اور بلند پہاڑ کی برفانی چوٹیوں پر لکڑی کی کھڑاویں پہن کر اچھلا کودا بھی جائے۔ ملک میں لکڑی کی کھڑاؤں کے ذریعے سے کھیل کود کے سات مرکز ہیں۔ سب سے اچھا مرکز وہ ہے جو دیلودارول کے مشہور جھنڈ سے قریب ہے۔ یہ بیروت سے تقریباً نوّے میل ہے اور چھ ہزار تین سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ سرمائی کھیلوں کا مذاق رکھنے والے لوگ کرسیوں پر بیٹھ کر نو ہزار نو سو فٹ کی بلندی تک پہنچ سکتے ہیں اور لبنان کے دیلودار نہایت پُر تاثیر منظر پیش کرتے جائیں گے۔

دولتِ سعودیہ، بحرین، کویت اور عراق میں تیل کے نکلنے کی وجہ سے بہت دولت آ گئی اور لوگ موسم گرما میں بہ تعدادِ کثیر پہاڑوں پر پہنچنے لگے۔ ۱۹۵۳ء میں دو لاکھ پچاس ہزار مہمانوں کی تواضع کی گئی تھی۔ ایسے گرمائی مقامات میں سے زیادہ اچھے یہ ہیں:

| مقام | فاصلہ | بلندی |
|---|---|---|
| ۱۔ عین صوفر | بیروت سے پندرہ میل | چار ہزار دو سو پینسٹھ فٹ |

Marfat.com

۲۔ عَالَیہ — بیروت سے نو میل — دو ہزار سات سو نوّے فٹ
۳۔ ظہور الشویر — بیروت سے پندرہ میل — چار ہزار پچاسی فٹ

ایک مرغوب مقام بحمدون ہے، جو عالیہ اور صوفر کے درمیان ہے۔ ایک سوق الغرب ہے، جو عالیہ سے جو دو میل جنوب میں ہے اور اتنی ہی بلندی پر ہے۔ ایک برمانا ہے، جو بیروت سے گیارہ میل مشرق میں ہے اور اس کی بلندی دو ہزار چھ سو فٹ ہے موسم گرما میں بیروت کی شبینہ کلبیں اور مہمانداران مقامات کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ ہر جگہ خاصے آرام دہ ہوٹل ہیں یا ایسے مکانات، جہاں لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ پہاڑ کی خوشگوار ہوا گرد و پیش کے میدانوں اور صحرا کی گرم ہواؤں سے خوشگوار آسائش کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔ اس کے فرحت افزا اور ٹھنڈے پانی کے چشمے مزید کشش کا باعث ہیں۔ طلوع و غروب کا نظارہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی کرنیں بلند برفانی چوٹیوں پر پڑتی ہیں۔ ڈوبتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زرّیں طشت آہستہ آہستہ دُور اُفق پر سے بحیرہ رُوم کے نیلے پانیوں میں گُم ہو رہا ہے۔ یہ مناظر فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ ان کے علاوہ آثارِ قدیمہ بھی کشش کا ایک سامان ہیں۔ مثلاً بعلبک کے رومی کھنڈر سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ بائیبل کے آثار مثلاً دلیودار، تاریخی آثار، جن میں ببلوس، صیدا اور صور کے فونیقی مقامات نیز صلیبی دور کے قلعے، جن میں سے پہلا درجہ بیلفورٹ کو حاصل ہے۔

تیل کے گزر کی آمدنی بھی معمولی حیثیت نہیں رکھتی۔ مشرقی بحیرۂ روم میں دو لبنانی شہروں پر تیل کی پائپ لائن ختم ہوتی ہے۔ اوّل طرابلس، دوم صیدا۔ ۱۹۵۴ء میں روزانہ تیل کے آٹھ لاکھ پیپے بالواسطہ ان مرکزوں پر پہنچتے ہیں۔ پہلا مرکز طرابلس میں بہ زمانہ عکمداری بنا تھا۔ اس سے ملک کو زیادہ آمدنی نہیں ہوتی۔ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو عراق پٹرولیم کمپنی نے تیل صاف کرنے کے ایک نئے کارخانے کا افتتاح کیا تاکہ کرکوک اور طرابلس کے درمیان نئی پائپ لائن لگا کر زیادہ تیل مہیا کیا جا سکے۔

صیدا میں دولتِ سعودیہ کا تیل پہلے پہل ماورائے عرب پائپ لائن کے ذریعے سے دسمبر ۱۹۵۰ء میں پہنچا۔ یہ پائپ لائن ایک ہزار اڑسٹھ میل لمبی ہے اور دنیا کی طویل ترین پائپ لائن ہے۔ امریکی کمپنی نے، جو اس کی مالک ہے۔ حکومت لبنان کو ایک لاکھ بارہ ہزار ڈالر حقِ گزر کے لیے اور ایک لاکھ چھبیس ہزار ڈالر پولیس کی حفاظت کے لیے دینے شروع کیے۔

Marfat.com

عیدا میں جو تیل آتا ہے، اس پہ حکومت تین فی صد محصول پہ آمد وصول کرتی ہے اور اس نے یہ حق بھی محفوظ کر رکھا ہے کہ ہر سال دو لاکھ ٹن تیل محض خرچ دے کر خرید لے۔ عربی امریکی آئل کمپنی (ارکمو) جتنا تیل نکالتی ہے، اس میں اڑتیس فیصد اس پائپ لائن کے ذریعے سے آتا ہے، جو تیس اکتیس انچ چوڑی ہے اور خلیج فارس سے شروع ہو کر پورے صحرا میں سے گزرتی ہوئی یہاں پہنچتی ہے۔ لبنانی ساحل سے یہ تیل ٹینکروں کے ذریعے زیادہ تر مغربی ممالک کو جاتا ہے۔ یکم فروری ۱۹۵۵ء کو ایک اور کمپنی نے عیدا کے جنوب میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ جاری کیا، جس میں کیلیفورنیا ٹکساس (کال ٹیکس) کے حصے پچاس فی صد ہیں۔ یہ کمپنی اسی لاکھ ڈالر کے خرچ سے قائم ہوئی اور میڈیٹرینین ریفائننگ کمپنی (میڈریکو) اسے چلاتی ہے۔ لبنان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے یہ کارخانہ قائم ہوا۔ شہر (عیدا) عدیوں تک خواب سنگیں میں مبتلا رہا۔ اب چوبیس گھنٹے اس میں عمل کا ہنگامہ بپا رہتا ہے اور یہ خام تیل ٹینکروں میں سوار کرنے کی سب سے زیادہ مشغول بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔

## مشرق کا دروازہ بیروت

بیروت مشرق و مغرب کے درمیان واقع ہے۔ یہ بیحد مصروف، دورِ حاضر کے وسائل سے بہترین طریق پر مزین اور مشرقی بحیرۂ روم کا نہایت پُر تکلف شہر ہے۔ فنکاری اور تجارت کا یہ ترقی پذیر مرکز ہے۔ اسے جمہوریہ لبنان میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی، جس طرح جمہوریہ لبنان کو گرد و پیش کے علاقے میں کاروباری سرگرمیوں کے اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دنیا میں سکوں کے کنٹرول کا مسلک جاری ہے اور تجارت پہ پابندیاں عائد ہیں۔ لبنان کا دارالحکومت اس دور میں ان چند آزاد منڈیوں میں سے ایک ہے، جہاں جنسوں کی قیمت (اور اس سے غیر ملکی سکے بھی مستثنیٰ نہیں) رسد و طلب کے پرانے قانون کی بنا پر متعین ہوتی ہے۔ سرکاری فرامین کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ جس حد تک کاروباری حلقوں کا تعلق ہے، بیروت کو مالی اور تجارتی معاملات میں گرد و پیش کے علاقے کے لیے معلومات کا بہترین مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اہل بیروت کی فی کس آمدنی عربی دنیا میں سب سے زیادہ ہے[1]۔ اس کے بین الاقوامی

---

[1] چارلس ڈبلیو چرچل کا مقالہ الکلیہ میں جلد ۲۹ (۱۹۵۴ء) صفحہ ۱۰۔

Marfat.com

ہوائی اڈے کی اصلاح ۱۹۵۴ء میں ہوئی تھی اور سال بھر میں وہاں تیرہ ہزار تین سو اٹھاون ہوائی جہاز اُترے تھے۔ مشرق قریب میں یہ نہایت وسیع اور بہترین ساز و سامان سے لیس اڈوں میں سے ایک ہے اور ہوائی راستوں میں درجۂ اوّل حاصل کرنے کے لیے قاہرہ سے پہلو مارتا ہے۔ جس حد تک ریلوے کا تعلق ہے، بیروت شام میں سے ریلوں کے اس نظام کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، جو مشرقی جانب بغداد اور مغربی جانب ترکی اور یورپ جاتا ہے۔ چند سال پیشتر یہ بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر تنہا محفوظ بندرگاہ تھا، جہاں جہاز ٹھہر سکتے تھے۔ پختہ سڑکوں کے ذریعے اسے آس پاس کے شہروں اور موسم گرما بسر کرنے کے مقامات سے ملا دیا گیا ہے۔ گزشتہ دس سال میں اس کی آبادی ایک لاکھ اسّی ہزار سے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ آبادی میں افزائش کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ لوگ دیہات چھوڑ کر شہر میں آ بسے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ صنعت و حرفت اور تجارت کے سلسلے میں یورپ اور امریکہ سے لوگ آ گئے۔ پورے ملک کی آبادی روبہ افزائش ہے۔ ۱۹۴۴ء میں کُل آبادی گیارہ لاکھ تھی، ۱۹۵۵ء میں چودہ لاکھ ہو گئی، یعنی چار سو تین آدمی فی مربع میل۔ مصر کے بعد یہاں زراعت درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ لبنان مشرق میں سب سے زیادہ آبادی رکھنے والے ملکوں میں سے ایک ہے۔ آبادی میں یہ اٹلی، جرمنی، برطانیہ اور آئرلینڈ کا بخوبی مقابلہ کرتا ہے۔ فرانس سے بہت آگے ہے[۱]۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ یہاں آس پاس کا سب سے اونچا پہاڑ واقع ہے، تاہم اس کی آبادی اتنی زیادہ ہے۔

## زراعت

زراعت کو لبنان کی اقتصادیات میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔ زیادہ تر لوگ ایسے کاشتکار ہیں، جن کی اپنی زمینیں ہیں، صرف البقاع اور عکار میں اب تک جاگیرداری موجود ہے، لیکن کوہستانی علاقے اور ساحلی میدان میں زیادہ تر زمینیں کاشتکاروں کی ملکیت ہیں۔ شرق اُردن اور العراق میں میں فی صد زمینیں کاشتکاروں کی ہیں۔ شام و فلسطین میں یہ تناسب کسی قدر اونچا ہے۔ ان تمام ملکوں کی اقتصادیات میں بمقابلہ لبنان زراعت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے وقت سے لبنان کے زرعی طور طریقوں میں تغیر پیدا ہوتا رہا اور نئے زمانے کے طور طریقے اختیار کیے جاتے رہے، جو نئی جنسوں کی کاشت کے لیے موزوں تھے۔ پھلوں،

---

[۱] دیکھیے انجمن اقوام متحدہ کی ڈیلو گرافک ایر بک ۱۹۵۴ء (سالنامۂ پیدائش و اموات) صفحہ ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۰۷۔

Marfat.com

غلّوں اور سبزیوں کی کاشت بڑھ گئی۔ توت اور زیتون کے درختوں کی کاشت کم ہوگئی۔ ریشم کے کیڑے پالنے کا سلسلہ سابق کا محض ایک حصّہ رہ گیا۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر پایہ بہ پایہ کھیت اور باغات بنے ہوئے ہیں اور ہر قابلِ زراعت ٹکڑے کو زیرِ کاشت لے آئے ہیں۔ پھلوں میں سے سیب کے پودے کی کاشت بہت کامیاب رہی۔ سیب کی بہت سی قسمیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے لاکر کاشت کی گئیں۔ ۱۹۵۴ء میں وزارتِ زراعت نے اعداد مہیّا کیے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ سیب کے تیس لاکھ درخت تیئس ہزار کنبوں کا کم از کم جزوی گزارہ ضرور کر رہے تھے۔ ان سیبوں کی مانگ مصر اور عرب کی منڈیوں میں بہت زیادہ ہے۔ یہ پھل لبنان کے لیے نیا نہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے ممتاز عرب شاعر المتنبّی کا یہ شعر اکثر سُنا جاتا ہے کہ "میں شام گیا تو وہاں کی تین مرغوب چیزوں سے بہت محظوظ ہوا۔ اوّل عارض، دوم لبنان کے سیب، سوم حمص کی شراب"۔

۱۹۵۱ء کے موسمِ بہار میں حکومتِ لبنان نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ایک معاہدہ کیا، جس کے مطابق جامع دیہاتی پروگرام کے سلسلے میں رہنمائی کا فیصلہ ہوا۔ لبنان میں ایک مجلسِ ارتقار بنائی گئی، جس نے تقریباً تیس خاص منصوبے تیار کیے، جن کا تعلق زراعت، آبپاری، اصلاحِ دیہات، تعمیرِ مکانات، تعلیم اور صنعت و حرفت سے تھا۔ اگرچہ عام پروگرام کا تعلق زیادہ تر دیہات ہی سے تھا، لیکن اس میں بندرگاہِ بیروت کی توسیع، طرابلس کی اصلاح اور بڑی سڑکوں کی درستی بھی شامل تھی۔ دیہاتی منصوبوں کے سلسلے میں ایک اہم منصوبہ یہ تھا کہ دریائے لیطانی سے پانی اور بجلی حاصل کی جائے۔ یہ دریا ایک سو پچیس میل لمبا ہے اور البقاع کو شمالاً جنوباً دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر مڑ کر صور کے شمال میں بحیرۂ روم کے اندر گرتا ہے۔ یہ دریا پورے کا پورا لبنانی علاقے میں واقع ہے۔ ملک امدادی پروگرام[1] کے مطابق ماہرین نے دیکھ بھال اور پیمائش میں تین سال صرف کر کے اسے اختتام پر پہنچایا اور پانچ بند تعمیر کرنے کا نقشہ تیار کیا۔ پہاڑ میں سے ایک ہزار نو سو ستّر فٹ لمبی سرنگ سٹر تا عزبا کھودنے کی تجویز پیش کی تاکہ البقاع اور صور و بیروت کے درمیانی علاقے میں اٹھارہ ہزار چھ سو ہیکٹار[2] اراضی کی پوری پوری اور

---

۱ یہ پروگرام پریذیڈنٹ ہیری ٹرومین نے جنوری ۱۹۴۹ء کے افتتاحی خطبے میں پیش کیا تھا۔

۲ یہ زمین کا ایک پیمانہ ہے جو عرب ممالک میں رائج ہے۔ ایک ہیکٹار ۲ر۴۷۱ ایکڑ کے برابر ہوتا ہے۔

Marfat.com

دو ہزار نو سو ہیکٹار اراضی کی جزوی آبیاری ہو سکے۔ اس طرح ملک کے پورے مزروعہ رقبے میں ۲/۵ کا اضافہ ہو جائے گا۔ لمبی مدت پر پھیلے ہوئے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں پچیس سال صرف ہوں گے اور ان پر ایک ارب ڈالر خرچ آئے گا۔ اگست ۱۹۵۵ء میں انٹرنیشنل بنک فار ڈیولپمنٹ اینڈ ریکنسٹرکشن (نشو و ارتقاء اور تعمیر جدید کے لیے بین الاقوامی بنک) واقع واشنگٹن سے دو کروڑ ستر لاکھ ڈالر قرضہ حاصل کیا گیا۔

**صنعتی ترقی**

دریائے لیطانی والے منصوبے کے علاوہ پن بجلی کے چھ مرکز بنانے کی تجویز ہے، جن سے ایک لاکھ اکاسی ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہو گی۔ اس طرح ملک کی جدید صنعتوں کو بہت فائدہ پہنچے گا، جو ابھی تک ابتدائی دور میں ہیں۔ خام مال کی کمی، سرمایے کی قلت اور فنی ماہروں کی کمیابی ان صنعتوں کی ترقی میں حائل ہے۔ پارچہ سازی سوتی، اونی، ریشمی — صنعتوں میں سب سے بڑا عنصر ہے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل صنعتوں کے کارخانے آتے ہیں، جو بیروت کے اندر یا اس سے قریب واقع ہیں: سیمنٹ، دباغی، تیل، غذا، لکڑی کا فرنیچر، الکحل، صابون، دیا سلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ دو ہزار کارخانوں میں سے زیادہ تر بیروت ہی میں ہیں۔ جسے بھاری صنعت کہا جاتا ہے، اس کا وجود ہی نہیں۔

اگرچہ مشرقِ قریب کے اکثر ملکوں سے لبنان میں اجرتیں زیادہ ہیں، مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کارخانوں یا کھیتوں کے عام مزدور عمومی خوشحالی سے اپنا جائز حصہ وصول کر رہے ہیں۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں بعض قوانین منظور ہوئے تھے، جن کے مطابق فیصلہ ہو گیا تھا کہ مزدور سے آٹھ گھنٹے کام لیا جائے۔ عورتوں کو زچگی کی اور بیماروں کو بیماری کی رخصت دی جائے۔ جن مزدوروں کو کام سے ہٹایا جائے، انھیں ساتھ معاوضہ دیا جائے۔ تیرہ سال سے کم عمر کے بچوں کو مزدوری پر نہ لگایا جائے۔ حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ علاوہ بریں دوسرے تحفظات بھی تھے، لیکن یہ قوانین پوری ضروریات پر حاوی نہ تھے۔ مثلاً اجتماعی بیمے، مجلسی تحفظ اور بیکاروں کی امداد کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نیز ان قوانین کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا معاملہ مشتبہ تھا۔ عوامی اور نجی کوششوں کے ذریعے سے ان لوگوں کی حفاظت کی گئی اور ان کی امداد کی گئی، جو ضرورت مند تھے۔ ان میں یتیم بچے، بوڑھے، جسمانی اعتبار سے ماؤف لوگ بھی شامل تھے۔ اگرچہ مجلسی معاملات کے لیے بھی ایک وزارت قائم کر دی گئی ہے، تاہم ابھی تک پوری ضروریات کے وقت امداد کا مسئلہ پوری اہمیت اختیار نہیں کر سکا۔ مزدوروں کی یونینوں کی شکل میں منظم کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

اس سلسلے میں کمیونسٹوں کی مداخلت شروع ہوگئی ہے۔ اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے، لیکن ملک فکر و تقریر و عمل کی انتہائی آزادی سے مستفید ہے۔ اس لیے چند مصنف، طبیب اور دوسرے اہلِ علم کو چھیڑا نہیں گیا۔ وہ اگرچہ "سرخ" نہیں، مگر "ارغوانی" ضرور ہیں۔ یہ واقعہ بھی ہے کہ اب تک کوئی کمیونسٹ یا کمیونسٹوں کا ہمنوا کسی اہم سرکاری عہدے پر نہ مامور ہوا، اور نہ اسے منتخب کیا گیا۔

**ایک مؤثر اور پُرامن انقلاب** کاملاً آزاد لبنان نے اب تک دو حکومتوں کا تجربہ کیا ہے۔ پہلی بشارۃ الخوری کی حکومت، جس کے ماتحت ملک نے کامل آزادی حاصل کی تھی اور سہ گونہ پالیسی اختیار کی۔ الخوری ۲۷ مئی ۱۹۴۸ء کو مزید چھ سال کے لیے رئیس منتخب ہوا۔ یہ اس کی ملکی خدمات کا اعتراف تھا، اگرچہ اس کی اصل میعاد اکتوبر ۱۹۴۹ء میں ختم ہوئی تھی۔ اسے دوبارہ منتخب کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اسرائیل سے کشمکش شروع ہوگئی تھی، مگر اس کی حکومت میں آہستہ آہستہ اپنے آپ کو مستقل بنا لینے کی خواہشات کے آثار نمایاں ہوئے اور اس کے خلاف دوست نوازی، خویش پروری، رشوت، نظم و نسق اور عدل میں تساہل کے الزامات میں اضافہ ہوتا گیا۔ بار بار کے احتجاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اعلیٰ عہدوں کے سلسلے میں خویش پروری مشرقِ قریب کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، جہاں کنبے کے افراد اور دوسرے اقربا قدیم قبائلی وحدت کے باقیات کی شکل میں اب تک موجود ہیں اور ان سے وفاداری کا سلسلہ قائم ہے۔ رشوت بھی اس معاشرے کے ساتھ مختص ہے، جس کی حکومت ابتدا سے قانون کے بجائے شخص پر منحصر رہی اور جہاں دوسروں سے حسنِ سلوک کی بنا پر اچھا کہلانے کا جذبہ بہت اونچی قدر و قیمت رکھتا ہے؛ لیکن اہلِ لبنان کی شہری حس اس وقت تک خاصی ترقی کرچکی تھی، جب اصلاحِ حال کے لیے عوام کے پُرزور مطالبات ناکام رہے تو لبنان کے تمام مخالف فریق عارضی طور پر متحد ہوگئے اور انھوں نے عوامی مظاہروں کی سرپرستی کی۔ بیروت میں عام ہڑتال کرادی۔ بیروت سے شورش دوسرے شہروں اور قصبوں تک جا پہنچ گئی۔ وزیر اعظم نے استعفیٰ دے دیا۔ دوسرے ارکانِ وزارت نے علیحدگی اختیار کرلی۔ کوئی ذمہ دار لیڈر نئی وزارت نہ بنا سکا۔ رئیس جمہوریہ نے مجبور ہوکر فوج بلائی تاکہ ہڑتال جبراً ختم کی جائے اور امنِ عامہ بحال کردیا جائے، لیکن فوج کے کمان افسر نے انکار کردیا۔ یہ طرزِ عمل اس سے بالکل مختلف تھا، جو العراق، شام اور مصر میں اختیار کیا گیا یعنی خود فوجی افسروں نے

Marfat.com

شورش کی حمایت کی اور اختیاراتِ اعلیٰ پر قبضہ جما لیا۔ آخر ۱۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو الخوری اس عامہ کے سامنے جھک گیا اور اس نے استعفا دے دیا۔ پانچ روز بعد ایوانِ مندوبین نے کمیل شمعون کو رئیس منتخب کیا۔ یہ حزبِ مخالف کا لیڈر تھا۔ از روئے پیشہ بیرسٹر تھا، از روئے عقیدہ مارونی۔ فرانس میں تعلیم پائی تھی۔ متعدد وزارتوں میں وزیرِ داخلہ اور وزیرِ مالیات رہ چکا تھا۔ اس نے انجمن اقوامِ متحدہ میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کی تھی اور لندن میں بھی سفیر رہ چکا تھا۔ حزبِ مخالف کے لیڈروں میں سب سے زیادہ شور مچانے والا ایک دروزی جاگیردار خاندان کا نوجوان رکن تھا، جس نے اپنی زمین کا ایک حصّہ کاشتکاروں میں بانٹ دیا تھا اور ایک اشترا کی پارٹی بنائی تھی۔ ایک اور لیڈر شیعہ تھا، جو آگے چل کر ایوانِ مندوبین کا صدر بن گیا۔ باقی لیڈر سُنّی تھے یا مختلف عقیدوں کے مسیحی۔ یہ خونریزی سے بالکل پاک شہری انقلاب تھا۔ اور دستوری حدود سے سرمو تجاوز نہ کیا گیا۔ یہ ایسا ہم صرف جمہوری طریقوں سے کام لے کر ایک حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور اس کی جگہ دوسری حکومت بٹھا دی گئی۔ مشرقِ قریب کی معاصر تاریخ میں یہ غالباً اپنی نوعیت کا یگانہ سیاسی تجربہ تھا۔ باقی رہا نئی حکومت کا معاملہ تو اسے آئندہ باب کا موضوع سمجھنا چاہیے ✦

صنوبری پرچم کے تحت لبنان نے جو ترقی کی، وہ جوہری قوّت اور جیٹ طیاروں کے دور میں بہت ہی معمولی ہوگی۔ یہی سمجھا جائے گا کہ گھونگے کی سی چال اختیار کی گئی، لیکن اس میں ایسے امکانات نظر آتے ہیں، جنھیں عارضی قدر و قیمت اور علاقائی اہمیت سے زیادہ وقعت دینی چاہیے مثلاً ممکن ہے کہ اس سے مشرقِ قریب اور مغربی یورپ کے اطوارِ حیات میں مصالحت کا مسئلہ حل ہونے کی کوئی صورت نکل آئے اور اس میں موجودہ دور کے اسلام اور مسیحیت کا پہلو بہ پہلو پُرامن زندگی بسر کرنا بھی شامل ہے۔ لبنان نے جو منصوبے تیار کیے، وہ نمونے کے منصوبے بن سکتے ہیں۔ جو پُل وہاں تعمیر ہو رہے ہیں، وہ دوسرے سلسلوں میں بھی عبور کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں ✦

Marfat.com

# سوانح و تاریخ

| نام کتاب | مختصر تفصیل | قیمت |
|---|---|---|
| سیرۃ ائمہ اربعہؒ<br>رئیس احمد جعفری | حضرت امام ابو حنیفہؒ ۔ امام شافعیؒ ۔ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مفصّل، مکمل اور مستند سوانح حیات ۔ سائز ۵½" × ۹"<br>ضخامت ۴۲۰ صفحات | ۷/۵۰ |
| فاطمہ بنت محمدؐ<br>سیّد رئیس احمد جعفری | سیّدۃ النساء العالمین کے حالاتِ زندگی، سائز ۵½" × ۹"<br>ضخامت ۲۲۰ صفحات | ۳/۲۵ |
| ڈھاکہ پچاس برس پہلے<br>حبیب الرحمٰن شروانی | ڈھاکہ کی ناقابلِ فراموش مصوّر تاریخ ۔ سائز ۵" × ۷½"<br>ضخامت ۱۸۴ صفحات | ۲/۲۵ |
| تاریخ اسلام<br>عبدالحکیم نشتر جالندھری | ابتدائے اسلام سے آج تک اسلامی دنیا کی مکمل و مفصل تاریخ پانچواں نو ترمیم ایڈیشن ۔ سائز ۶½" × ۱۰" ۔ ضخامت ۱۰۸۰ صفحات | ۱۲/- |
| امام مالکؒ<br>مصنفہ :۔ محمد ابو زہرہ<br>ترجمہ و حواشی :۔ عبداللہ قدسی | امام الک دار الہجرت حضرت امام مالک کے سوانح حیات پر جامع اور مفصل کتاب ۔<br>سائز ۶½" × ۱۰" ۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات ۔ بہترین ڈسٹ کور | ۱۰/- |
| نشانِ حیدری تاریخ ٹیپو سلطان<br>تصنیف :۔ سید میر حسن علی کرمانی<br>ترجمہ :۔ محمود احمد فاروقی | سلطان شہید کی شہادت کے صرف آٹھ سال بعد لکھی گئی ۔ اس تذکرے کے تمام حالات و واقعات چشم دید، مستند اور مفصّل ہیں، جو بلا کسی رنگ آمیزی کے قلم بند کیے گئے ہیں ۔ سائز ۶½" × ۱۰" ۔ ضخامت ۴۴۸ صفحات | ۱۰/- |
| کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی<br>تالیف : رائے بہادر وی ۔ پی ۔ مینن<br>ترجمہ و تہذیب<br>رئیس احمد جعفری | تقدیر کس طرح بدلتی ہے؟ واقعات کس طرح پلٹا کھاتے ہیں؟ اور انقلاب کا چکر کس طرح چلتا ہے؟ کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی اسی اجمال کی تفصیل ہے ۔ سائز ۶½" × ۱۰"<br>ضخامت ۳۰۰ صفحات ۔ نقشے ۲ ۔ | ۶/- |

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب کشمیری بازار لاہور ۔ کراچی ۔ پشاور ۔ حیدر آباد

Marfat.com

| نام کتاب | مختصر تفصیل | قیمت |
|---|---|---|
| حیدرآباد۔ جو کبھی تھا<br>رئیس احمد جعفری | سقوط حیدرآباد کی سبق آموز اور افسوسناک کہانی کے اہم منشی اور دی۔ پی مینن کی خود نوشت داستان۔ منشی مینن کے افکار و خیالات پر سیر حاصل تبصرہ۔ سائز ½۶" × ۱۰"۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات علاوہ رنگین و سادہ تصاویر کے ساتھ | ۱۰/- |
| حیات امیر خسرو<br>مرتب:<br>نقی محمد خاں خورجی | برصغیر پاک و ہند کے جامع الصفات بزرگ امیر خسرو کے سوانح ان کے ادبی، علمی، فنّی، ظاہری اور باطنی کمالات کا دلکش مرقع سائز ۵" × ½۷"۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات | ۳/۵۰ |
| سیرۃ النبیؐ (کامل)<br>مرتب: ابن ہشام<br>ترجمہ: عبدالجلیل صدیقی<br>نظر ثانی و تہذیب:<br>مولانا غلام رسول مہر | سیرت رسالت مآبؐ پر اس سب سے اہم اور قدیم ترین عربی کتاب کو پہلی مرتبہ سلیس اور دلکش ترجمے کا لباس پہنایا ہے۔ حواشی میں ضروری تشریحات، ہر مقام کے نقشے بھی شامل ہیں۔ اس کی اشاعت اردو ادب میں نہایت اہم اضافہ ہے۔ سائز ½۶" × ۱۰"۔ ضخامت ۱۶۰۰ صفحات | ۳۲/- |
| تاتاریوں کی یلغار<br>تصنیف: لڈلیم<br>ترجمہ: عزیز احمد | تاتاریوں کی مکمل سرگزشت۔ لڈلیم کی شہرہ آفاق کتاب THE MARCH OF THE BARBARIAN کا مکمل اور مستند اردو ترجمہ۔ سائز ½۶" × ۱۰"۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات | ۱۲/- |
| انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم<br>پہلی جلد تاریخ اسلام<br>مرتبہ: ولیم ایل لینگر<br>ترجمہ و حواشی: غلام رسول مہر | انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کی پہلی جلد جس میں شروع سے آج تک کی پوری تاریخ اسلام کا انسائیکلوپیڈیا درج ہے سائز ۵" × ½۷"۔ صفحات ۴۵۰ نقشے و شجروں سے مزیّن | ۱۲/- |
| انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم<br>جلد دوم تاریخ عمومی<br>مرتبہ: ولیم ایل لینگر<br>ترجمہ و حواشی: غلام رسول مہر | ابتدا سے عہد نپولین تک جس میں انقلاب فرانس بھی شامل ہے مع ضروری حواشی، نقشہ جات و شجرے سائز ۵" × ½۷"۔ صفحات ۵۱۰ نقشے ۸، شجرے ۱۷ | ۱۲/- |

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب کشمیری بازار لاہور، کراچی، پشاور، حیدرآباد

Marfat.com

| نام کتاب | مختصر تفصیل | قیمت |
|---|---|---|
| انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم<br>جلد سوم تاریخ عمومی<br>مرتبہ:- ولیم ایل لینگر<br>ترجمہ و حواشی: غلام رسول مہر | جس میں انقلاب فرانس سے لے کر اب تک کے حالات درج ہیں<br>سائز ۵" × ۷½"<br>ضخامت ۵۰۰ صفحات<br>نقشے ۹، شجرے ۱۷ | ۱۴/- |
| سید احمد شہید<br>مولانا غلام رسول مہر | سرزمین پاک و ہند میں تحریک احیاء دین کی مکمل سرگزشت<br>سائز ۶½" × ۱۰"۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ | ۱۵/- |
| جماعت مجاہدین<br>مولانا غلام رسول مہر | سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے تنظیمی حالات اور ان کے اکابر رفقاء کے سوانح<br>سائز ۶½" × ۱۰"۔ ضخامت ۳۲۵ صفحات۔ کتابت و طباعت دلفریب | ۷/- |
| بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد<br>سید رئیس احمد جعفری | ۱۸۵۷ء کی عالم آشوب تحریک انقلاب کی مکمل، مستند اور مفصل<br>انسائیکلوپیڈیا (دوسرا ایڈیشن)۔ سائز ۶½" × ۱۰"<br>ضخامت ۱۲۶۴ صفحات۔ ۱۳ رنگین و سادہ تصاویر کے ساتھ | ۳۰/- |
| سرگزشت مجاہدین<br>مولانا غلام رسول مہر | سید احمد شہیدؒ کے سلسلے کی چوتھی اور آخری جلد۔ سائز ۶½" × ۱۰"<br>ضخامت ۶۸۰ صفحات۔ کتابت و طباعت دلفریب | ۱۲/- |
| ۱۸۵۷ء<br>مولانا غلام رسول مہر | جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر اردو زبان میں پہلی اور یگانہ کتاب سائز ۷½" × ۹"<br>ضخامت ۴۷۹ صفحات بعض مفید اور ضروری حواشی کے ساتھ | ۷/۵۰ |
| ۱۸۵۷ء کے مجاہد<br>مولانا غلام رسول مہر | پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لینے والوں کی مکمل<br>سرگزشت کسی بھی زبان میں اس موضوع پر آج تک کوئی بھی کتاب نہیں<br>دیکھی گئی۔ سائز ۵½" × ۹"۔ ضخامت ۳۲۸ صفحات۔ نادر نقشہ جات<br>اور تصاویر سے مزین اور ضروری اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن | ۴/۵۰ |
| واجد علی اور ان کا عہد<br>سید رئیس احمد جعفری | عہد واجد علی شاہ کی مکمل، مستند انسائیکلوپیڈیا۔ سائز ۶½" × ۱۰"<br>ضخامت ۷۲۲ صفحات۔ متعدد تصاویر | ۱۲/۵۰ |
| سیرت محمد علی<br>رئیس احمد جعفری | بعض سربستہ رموز کے انکشافات کے ساتھ<br>سائز ۵" × ۷½"۔ ضخامت ۷۰۰ صفحات | ۶/- |

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب کشمیری بازار۔ لاہور، کراچی، پشاور، حیدرآباد

Marfat.com

| نام کتاب | مختصر تفصیل | قیمت |
|---|---|---|
| **کمال اتاترک**<br>استاذ محمد توفیق مصری<br>ترجمہ: کرم الٰہی خاموش | دنیا میں کمال اتاترک کی سوانح اس سے اچھے پیرایے میں کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔<br>سائز ۵" × ۷½" ضخامت ۴۶۸ صفحات (ساتواں ایڈیشن) | ۴/۷۵ |
| **رحمۃ للعالمین**<br>مولانا قاضی محمد سلیمان سلیمان منصور پوری | مقبول عام سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین جلدوں میں۔<br>سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت جلد اول ۳۸۰ صفحات | ۴/- |
| | جلد دوم ۴۷۸ صفحات | ۶/۵۰ |
| | جلد سوم ۴۸۴ صفحات (کتابت وطباعت نفیس) | ۶/۵۰ |
| **سرورِ عالم**<br>مولانا غلام رسول مہر | سیرۃ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہایت اعلیٰ، پاکیزہ اور مکمل کتاب<br>سائز ۵" × ۷½" ضخامت ۳۳۸ صفحات | ۲/۵۰ |
| **انوارِ انبیاء**<br>ادارہ تصنیف وتالیف | انبیاء کرام کے حالات زندگی جس کا ذکر قرآن کریم، احادیث صحیحہ، بائیبل و دیگر تاریخی کتب میں آیا ہے۔<br>سائز ۶½" × ۱۰"، ضخامت ۴۵۶ صفحات۔ طباعت آفسٹ | ۱۰/- |
| **انوارِ اصفیاء**<br>ادارہ تصنیف وتالیف | دنیائے اسلام کے نو سے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے مکمل حالات ہر شخص کے بیان میں ولادت اور رحلت کی تاریخیں، جائے پیدائش اور وفات، سلسلہ طریقت وشخصیت ذاتی زندگی سائز ۶½" × ۱۰" ضخامت ۱۰۵۰ صفحات | ۱۰/- |
| **زندگی کے نمونے**<br>ابویحییٰ امام خاں نوشہروی | سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے عملی نمونے<br>سائز ۵" × ۷½"، ضخامت ۱۴۴ صفحات | ۱/۵۰ |
| **تذکرہ غوثیہ**<br>مولوی شاہ گل حسن | مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی کے حالات، ملفوظات، طیبات<br>سائز ۶½" × ۱۰"، ضخامت ۵۰۰ صفحات، آفسٹ طباعت | ۶/- |
| **جوزفین**<br>مولانا غلام رسول مہر | اس میں نپولین کی زندگی کے حالات، اس کا معاشقہ، ملکی خدمات اور ضروریات کے مقابلے میں حسین ترین صنفِ نازک کے عشق کی قربانی کی روئیداد پیش کی گئی ہے۔ | ۲/- |
| **انقلابِ روس**<br>شیر جنگ | روس کے اقتصادی انقلاب کا تاریخی پس منظر<br>سائز ۵" × ۷½"، ضخامت ۲۸۴ صفحات | ۴/۵۰ |

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران وتاجران کتب کشمیری بازار، لاہور، کراچی، پشاور، حیدرآباد

Marfat.com

| نام کتاب | مختصر تفصیل | قیمت |
|---|---|---|
| کارل مارکس اور اسکی تعلیمات<br>شیر جنگ | کارل مارکس کے بنیادی اصول اور اُن کا عملی تجربہ<br>سائز ۵" × ۷½" ، ضخامت ۶۶۸ صفحات | زیر طبع |
| وارن ہیسٹنگز اور انگریزی سامراج<br>ترجمہ اولاد علی گیلانی | ہندوستان میں انگریزی حکومت کا خون آشام دور<br>سائز ۵" × ۷½" ، ضخامت ۳۸۶ صفحات | ۳/۷۵ |
| تاریخ انقلابات عالم<br>ادارۂ تصنیف و تالیف | دنیا کی تاریخ، سیاست اور معیشت پر ایک مستقل انسائیکلوپیڈیا<br>سائز ۵½" × ۹" مکمل از سر نو ترتیب دی گئی ہے | ۶/- |
| الفاروق<br>مولانا شبلی نعمانی | سیرت فاروقؓ پر مستند و معتمد کتاب<br>سائز ۵" × ۷½" ، ضخامت ۵۴۴ صفحات | ۶/- |
| انوار اولیاء<br>رئیس احمد جعفری (ندوی) | بزرگان دین کی سیرت و کردار کا انسائیکلوپیڈیا (تیسرا ایڈیشن)<br>سائز ۷½" × ۱۰" ، ضخامت ۶۰۰ صفحات | ۱۰/- |
| خواجہ غریب نواز<br>ادارہ تصنیف و تالیف | حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مکمل و مستند سوانح<br>سائز ۵½" × ۹" ، ضخامت ۲۰۰ صفحات | ۳/- |
| حکمائے عالم<br>تصنیف، قطفی<br>ڈاکٹر غلام جیلانی برق | ۴۱۱ ، اسلامی و یونانی فلاسفہ اور حکما کے حالات کا مرقع<br>سائز ۵½" × ۹"<br>ضخامت ۶۰۸ صفحات مع اشاریہ | ۱۰/- |
| حسینؓ ابن علیؓ<br>پروفیسر نکہت شاہجہانپوری | سیرت امام حسین نفسیاتی زاویہ نگاہ سے<br>سائز ۵¾" × ۸½" ، ضخامت ۱۰۸ صفحات | ۲/- |
| ہمارا قائد<br>زیڈ، اے سلہری | قائد اعظم کی ناقابل فراموش خدمات پر تبصرہ<br>سائز ۵" × ۷½" ، ضخامت ۲۲۰ صفحات | ۲/۵۰ |
| دید و شنید<br>رئیس احمد جعفری | زندہ جاوید ہستیوں کا بے نظیر مرقع<br>سائز ۵" × ۷½" ، ضخامت ۵۷۶ صفحات | ۶/۵۰ |
| تذکرۃ الاولیاء | شیخ فریدالدین عطار کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ، جس میں تمام اولیاء اللہ کے حالات زندگی نہایت عام فہم زبان و انداز میں لکھے گئے ہیں۔ سائز ۷½" × ۱۰" | ۳/- |



Marfat.com

آپ کے کتب خانے کی زینت کے لیے

# تازہ ترین کتابیں

## مذہب

خدا موجود ہے ۔ ترجمہ :۔ عبدالحمید صدیقی ۲/۵۰ روپے

خدا ہمارے ساتھ ہے ۔ترجمہ :۔ مولانا صلاح الدین احمد ۱/۲۵ روپے

## اسلامیات

اسلام اور قانون جنگ و صلح ۔ ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر ۹/۰ روپے

## انسانیات

قدیم تہذیب اور جدید انسان ۔ ترجمہ :۔ سید قاسم محمود ۳/۵۰ روپے

مستقبل کا انسان ۔ 〃 〃 〃 ۶/۰ روپے

ثقافت کا مسئلہ ۔ 〃 〃 〃 ۱/۰ روپے

---

فرینکلن پبلی کیشنز ۔ لاہور

## تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم۔ ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر
جلد۔ اوّل ۱۲/۰ جلد دوم ۱۲/۰ جلد سوم ۱۴/۰ روپے
تاریخ بھی مزے کی چیز ہے۔ ترجمہ :۔ عبد المجید سالک ۱/۵۰ روپے
عرب دنیا۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین ۱۲/۰ روپے
صلیبی جنگیں۔ ترجمہ :۔ سید رئیس احمد جعفری ۵/۰ روپے
سو تاریخی واقعات۔ ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر ۷/۰ روپے
حیوانی زندگی کا ماضی و حال۔ ترجمہ :۔ ڈاکٹر نذیر احمد ۵/۰ روپے
تاتاریوں کی یلغار۔ ترجمہ :۔ عزیز احمد ۱۲/۰ روپے
قدیم علوم اور جدید تہذیب ترجمہ :۔ سید ہاشمی فرید آبادی ۱/- روپے

## سوانح عمری

سلطان صلاح الدین ایوبی۔ ترجمہ :۔ پروفیسر محمد یوسف عباسی ۱۷/۵۰ روپے
آئن سٹائن کی کہانی۔ ترجمہ :۔ سید رئیس احمد جعفری ۴/۰ روپے
چنگیز خاں۔ ترجمہ :۔ عزیز احمد ۶/۰ روپے
سقراط۔ ترجمہ :۔ آنسہ صبیحہ حسن ۲/۵۰ روپے
غریب لڑکے جو نامور ہوئے۔ ترجمہ :۔ مولانا عبدالمجید سالک ۴/۰ روپے
لڑکیاں جو نامور ہوئیں۔ ترجمہ :۔ اختر عزیز احمد ۵/۰ روپے
نور محل۔ (طبع دوم) ترجمہ شبلی بی کام و حبیب اشعر دہلوی ۷/۵۰ روپے

---

فرینکلن پبلی کیشنز۔ لاہور

Marfat.com

سلیمان عالیشان۔ ترجمہ :۔ اختر عزیز احمد ۸/۵۰ روپے

سو بڑے آدمی۔ ترجمہ :۔ عبدالمجید سالک ۵/۰ روپے

ایڈیسن۔ ترجمہ :۔ محمد سعید ۳/۵۰ روپے

چند عظیم علمائے جراثیم۔ ترجمہ :۔ عبدالمجید قریشی ۱۰/۰ روپے

غازیان تہذیب۔ ترجمہ :۔ سید ہاشمی فرید آبادی ۵/۰ روپے

مشہور موجد اور ان کی ایجادیں۔ ترجمہ :۔ ابوالحسن نغمی ۲/۷۵ روپے

## سائنس

مشہور مہمات سائنس۔ ترجمہ :۔ محمد فاروق ۴/۵۰ روپے

موسم کی کہانی۔ ترجمہ :۔ بشیر احمد ساجد ۴/۵۰ روپے

آنکھوں سے کام لیجیے۔ ترجمہ :۔ محمد سعید ۱/۵۰ روپے

آواز کی کہانی۔ ترجمہ :۔ مسعود احمد خاں ۱/۲۵ روپے

بچوں کے لیے سائنسی تحقیق کی نئی راہیں۔ ترجمہ :۔ محمد فاروق ۲/۵۰ روپے

تمہارا جسم کیونکر کام کرتا ہے۔ ترجمہ :۔ خلیق ابراہیم خلیق ۴/۵۰ روپے

ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ ترجمہ :۔ ذوالفقار علی بخاری ۴/۵۰ روپے

عجائبات کیمیا۔ ترجمہ :۔ محمد فاروق ۴/۵۰ روپے

سائنس کے نئے افق۔ ترجمہ :۔ سید علی ناصر زیدی ۵/۰ روپے

سمندروں کی دنیا۔ ترجمہ :۔ ڈاکٹر نذیر احمد ۴/۵۰ روپے

کیمیا کے رومان۔ ترجمہ : پروفیسر حمید عسکری ۵/۰ روپے

جوہری توانائی اور اس کا مستقبل ترجمہ : پروفیسر محمود احمد خاں ۴/۵۰ روپے



Marfat.com

| | | |
|---|---|---|
| دنیا پر پہلی نظر | ترجمہ: سیدہ نسیمہ ہمدانی | ۱/۵۰ روپے |
| زمین کی سرگزشت | ترجمہ: سید علی ناصر زیدی | ۴/۰ روپے |
| سائنس باتوں میں | 〃 〃 〃 | ۴/۰ روپے |
| ستاروں کی دنیا | 〃 〃 〃 | ۵/۰ روپے |
| سائنس کی حیرت انگیز باتیں | 〃 〃 〃 | ۲/۵۰ روپے |
| مصنوعی سیّارچہ | 〃 〃 〃 | ۲/۵۰ روپے |
| سائنس کے تجربات | ترجمہ: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید | ۵/۰ روپے |
| خلا میں سفر کی پہلی کتاب | ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر | ۲/۵۰ روپے |

## بُنیادی سائنس کا سِلسلہ

انسانی مشین ۔ آواز ۔ پرندے ۔ پھول پھل اور بیج چاند حرارت ۔ روشنی ۔ زندہ اشیاء ۔ ستاروں سے آگے کشش ثقل ۔ کیڑوں کی سماجی زندگی ۔ مٹی ۔ مشینیں ۔ مقناطیس ۔ موسم ۔ ترجمہ: مولانا صلاح الدین احمد ۔ ہر کتاب کی قیمت ۱/۵۰ روپے

## فنّی معلومات

| | | |
|---|---|---|
| بجلی کی پہلی کتاب ۔ | ترجمہ سید علی ناصر زیدی | ۲/۵ روپے |
| ٹیلیفون کیسے کام کرتا ہے ۔ | ترجمہ ۔ خلیق ابراہیم خلیق | ۱/۲۵ روپے |
| طیاروں کی پہلی کتاب ۔ | ترجمہ ۔ غلام رسول مہر | ۲/۵۰ روپے |
| موٹروں کی پہلی کتاب ۔ | 〃 〃 〃 | ۲/۵۰ روپے |

---

فرینکلن پبلی کیشنز لاہور

Marfat.com

## معاشیات

عظماء کے معاشی نظریات ۔ ترجمہ : ڈاکٹر ایس ایم اختر — ۶/۰ روپے

آبادی کا مسئلہ ۔ ترجمہ : شبلی ایم کام — ۱/۵۰ روپے

خوراک کا مسئلہ ۔ 〃 〃 — ۱/۵۰ روپے

## والدین اور اساتذہ کی رہنما کتابیں

آپ کے بچے کی وراثت ۔ ترجمہ : شاہد احمد دہلوی — ۱/۰ روپے

بچوں کی بدتمیزیاں ۔ 〃 〃 〃 — ۱/۰ روپے

بچوں کے کھیل ۔ 〃 〃 〃 — ۱/۵۰ روپے

بچے کی اخلاقی قدریں ۔ 〃 〃 〃 — ۱/۵۰ روپے

کامیاب باپ ۔ (بارسوم) 〃 〃 — ۱/۵۰ روپے

معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی ۔ 〃 〃 — ۱/۵۰ روپے

والدین اور معلمین ۔ 〃 〃 〃 — ۱/۵۰ روپے

## طب اور صحت

بچہ اور اس کی دیکھ بھال ۔ ترجمہ : ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان — ۲/۵۰ روپے

آپ کے بچے کی صحت ۔ ترجمہ : شاہد احمد دہلوی — ۱/۶۲ روپے

میرے اندر کیا ہے ؟ ترجمہ : غلام رسول مہر — ۱/۵۰ روپے

بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو ۔ ترجمہ : سید وقار عظیم — ۱/۶۲ روپے

فرینکلن پبلی کیشنز ۔ لاہور

Marfat.com

# فلسفہ

داستانِ فلسفہ۔ ترجمہ :۔ سید عابد علی عابد

جلد اوّل -/۸ جلد دوم ۸/۰ روپے

ناقابلِ تسخیر ذہن انسانی۔ ترجمہ :۔ محمد صفدر میر ۲/۵۰ روپے

فلسفے کی نئی تشکیل۔ ترجمہ :۔ انتظار حسین ۲/۰ روپے

فلسفے کا نیا آہنگ۔ ترجمہ بشیر احمد ڈار ۳/۵۰ روپے

مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا۔ ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی ۱/۷۵ روپے

آدمی کی انسانیت۔ ترجمہ مولانا محمد بخش مسلم ۷/۵۰ روپے

# فنون لطیفہ

شاہکار تصاویر۔ ترجمہ و مرتبہ :۔ سید امتیاز علی تاج ۷/۵۰ روپے

# علم سیاست

اقوام متحدہ۔ ترجمہ :۔ فضل حق قریشی -/۴ روپے

امریکہ کا سیاسی نظام۔ ترجمہ : مولانا صلاح الدین احمد ۳/۵۰ روپے

# جغرافیہ اور سیاحت

کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن ترجمہ :۔ میجر آفتاب حسن ۱/۷۵ روپے

عرب اور اہل عرب۔ ترجمہ غلام رسول مہر -/۶ روپے

نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز۔ ترجمہ :۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود ۳/۵۰ روپے

---



Marfat.com

## عمرانیات

| | |
|---|---|
| کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے۔ ترجمہ کپتان عبدالواحد | ۱/۷۵ روپے |

## ناول، افسانے، ڈرامے

| | | |
|---|---|---|
| انجان راہی۔ | ترجمہ: شان الحق حقی | ۳/۵۰ روپے |
| بادبان۔ | ترجمہ: سید قاسم محمود | ۶/۰ روپے |
| بشر ہے کیا کہیئے۔ | ترجمہ: سید عابد علی عابد | ۶/۵۰ روپے |
| پہلا خون۔ | ترجمہ: غلام حسین | ۲/۵۰ روپے |
| چنگیز خاں کے سنہرے شاہین۔ | ترجمہ: اشفاق احمد | ۶/۰ روپے |
| دھوپ چھاؤں۔ | ترجمہ: ولی اشرف صبوحی | ۷/۰ روپے |
| زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ | ترجمہ: رئیس احمد جعفری | ۳/۵۰ روپے |
| شہر پناہ۔ | ترجمہ: ابن انشا | ۳/۵۰ روپے |
| گھاس کا سمندر۔ | ترجمہ: سید قاسم محمود | ۱/۵۰ روپے |
| قیامت کی رات۔ | ترجمہ: سید عابد علی عابد | ۷/۰ روپے |
| مفرور۔ | ترجمہ رئیس احمد جعفری | ۴/۰ روپے |
| ننھی بیلیاں۔ | ترجمہ: حجاب امتیاز علی | ۵/۵۰ روپے |
| نئے پرانے۔ | ترجمہ: محمد یوسف عباسی | ۴/۰ روپے |
| ہمیں چراغ ہمیں پروانے۔ | ترجمہ: قرۃ العین حیدر | ۱۰/۰ روپے |
| ویران ہے دل۔ | ترجمہ: فیضی رامپوری | ۶/۰ روپے |
| اندھا کنواں۔ | ترجمہ: ابن انشا | ۷/۵۰ روپے |
| انوکھی کہانیاں۔ | ترجمہ: شاہد احمد دہلوی | ۵/۰ روپے |
| بڑا ریچھ۔ | ترجمہ: ولی اشرف صبوحی | ۳/۵۰ روپے |



Marfat.com

| | | |
|---|---|---|
| پاپ کی نگری | ترجمہ :۔ سیدہ نسیم ہمدانی | ٦/٠ روپے |
| حیرت ناک کہانیاں | ترجمہ :۔ شاہد احمد دہلوی | ۴/٠ روپے |
| خزانے کی تلاش | ترجمہ : شبلی ایم کام | ٢/٥٠ روپے |
| سورج کے ساتھ ساتھ | ترجمہ : عشرت رحمانی | ٦/٥٠ روپے |
| قصص الحمراء | ترجمہ : وقار عظیم | ٧/٥٠ روپے |
| لاکھوں کا شہر | ترجمہ ۔ ابن انشا | ٣/٥٠ روپے |
| ایک حمام میں | ترجمہ :۔ عشرت رحمانی | ٣/٠ روپے |

## نئی کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے ؟ | ترجمہ :۔ پروفیسر عبدالواحد | ١/٧٥ روپے |
| کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن ، | ترجمہ :۔ میجر آفتاب حسن | ١/٧٥ روپے |

فرینکلن پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ٣٦٩ ۔ لاہور

Marfat.com